

# جدید عصری مسائل کے حل میں تصوف کا کردار تحقیقی مقالہ

برائے پی ایچ ڈی (اسلامیات)

نگران مقالہ

مقالہ نگار

ڈاکٹر پروفیسر نور الدین جامی

سید محمد منزل شاہ کاظمی

چئیرمین شعبہ علوم اسلامیہ



اگست سیشن 2003ء

ادارہ شعبہ علوم اسلامیہ

بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی ملتان



# القرآن

لقد من الله على المؤمنين اذ بعث فيهم رسولا من انفسهم يتلوا عليهم  
آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتب والحكمة وان كانوا من قبل لفي ضلل مبين  
سوره آل عمران ٣ : ١٦٣

بے شک اللہ کا بڑا احسان ہوا مسلمانوں پر کہ ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا  
ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے اور وہ ضرور اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔





عن ابی ہریرۃ قال کان النبی ﷺ بارزاً یوماً للناس فاتاہ رجل فقال  
ما الاحسان قال ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک  
رواہ البخاری

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا کہ ایک دن حضور ﷺ لوگوں میں بیٹھے ہوئے تھے،  
اتنے میں ایک شخص آیا اور پوچھنے لگا، احسان کیا ہے۔ آپ نے فرمایا، احسان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایسی  
عبادت کرے جیسے تو اس کو دیکھ رہا ہے۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو خیر، اتنا تو خیال رکھ کہ وہ تجھ کو دیکھ رہا ہے۔  
بخاری جلد اول 127

بسم الله الرحمن الرحيم

تحقیقی مقالہ

برائے

پی ایچ ڈی

جدید عصری مسائل کے حل میں

تصوف کا کردار



رہنمائے تحقیق

ڈاکٹر پروفیسر نور الدین جامی  
چئیرمین شعبہ علوم اسلامیہ

مقالہ نگار

سید محمد منزل شاہ کاظمی

شعبہ علوم اسلامیہ

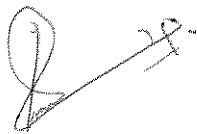
بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی ملتان

اگست سیشن 2003ء

# حلف نامہ

میں مسمی سید محمد مزمل شاہ کاظمی اس امر  
کا حلفیہ اقرار کرتا ہوں کہ یہ تحقیقی مقالہ بعنوان  
"جدید عصری مسائل کے حل میں تصوف کا کردار" پی ایچ ڈی  
کی ڈگری کے لیے پیش کیا گیا ہے میں نے اس سے قبل اس موضوع  
پر کوئی تحقیقی کام نہیں کیا اور میرے علم کے مطابق نہ ہی کسی اور  
یونیورسٹی میں اس موضوع پر کسی ڈگری کے  
لیے مقالہ لکھا گیا ہے۔

سید محمد مزمل شاہ کاظمی



## فہرست عنوانات

صفحہ نمبر

عنوان

مقدمہ

### باب اول

۱	(1) تصوف کا مفہوم
۵۴	(2) آغاز
۶۰	(3) مقصد و پس منظر
۸۸	(4) مختصر تاریخ
۱۱۹	(5) اصلاحی پہلو سے تصوف کا تاریخی کردار
۱۲۶	(6) اسلامی تصوف اور دیگر مذاہب کے راہبانہ کردار کا فرق و امتیاز۔
۲۳۶	حوالہ جات

### باب دوم: جدید عصری مسائل کا ایک جائزہ۔

۲۴۶	فصل اول: دینی و روحانی مسائل
۲۴۶	(1) سیکولرزم و مادیت پرستانہ رجحانات
۲۵۲	(2) انکار مذہب کی تحریک
۲۵۶	(3) مذہب بیزاری
۲۵۷	(4) خوف خدا کا فقدان
۲۶۰	(5) ذہنی سکون کا فقدان یا بے سکونی
	فصل دوم: فکری مسائل
۲۶۲	(1) فکر کا مفہوم
۲۶۶	(2) فکری مسائل سے کیا مراد ہے؟
۲۷۰	(3) انسانی زندگی کی بے مقصدیت
۲۷۱	(4) تعلیمی شعبہ میں بے مقصدیت
۲۷۲	(5) کسل مندانہ رجحانات
۲۷۳	(6) عدم رواداری و تشدد پسندانہ رجحانات
۲۷۴	(7) جہالت

۲۷۵	فصل سوم: معاشرتی مسائل
۲۷۵	(1) خاندانی مسائل
۲۷۸	(2) گروہی تعصبات
	(لسانی، علاقائی، نسلی، مذہبی)
۲۵۰	(3) ذہنی دباؤ

۲۸۲	فصل چہارم: معاشی مسائل
۲۸۶	(1) تحریک مادیت کے اثرات
۲۹۳	(2) خود غرضانہ رجحانات
۲۹۳	(3) غربت، اور اس کے اسباب (افراط زر، ارتکاز دولت، بے روزگاری، کسل مندی)
۲۹۵	(4) استحصالی رجحانات
۳۰۱	(5) ناجائز ذرائع آمدنی
۳۰۲	(6) عیش پرستی و اسراف و تبذیر
۳۰۵	حوالہ جات

## باب سوم: تربیت نفس اور اصلاح فکر میں تصوف کا کردار

۳۱۰	فصل اول: انسانی زندگی پر عقائد اسلامی کے مطلوبہ اثرات
	(توحید، آخرت، رضا و محبت الہی کا حصول، خوف خدا، تعلق باللہ کی مضبوطی، تقویٰ کا حصول)
۳۱۴	ان مطلوبہ مقاصد کے حوالے سے ہماری موجودہ حالت کا جائزہ، ان کے حصول میں تصوف کا مجوزہ کردار۔
۳۵۰	

## فصل دوم: مذہب بیزار رجحانات کے انسداد میں

۳۵۶	تصوف کا مطلوبہ کردار۔
۳۶۲	فصل سوم: سکون قلب کا حصول اور تصوف
	حاصل بحث۔ مذکورہ بالا پہلوؤں میں تصوف کے علمی اثرات کا جائزہ اور اصلاح کے لئے تجاویز۔
۳۶۸	حوالہ جات
۳۹۱	

## باب چہارم: مسلمانوں کے سہمی و تعلیمی مسائل

### اور تصوف

۴۰۰

فصل اول: صوفیاء کے افکار کی روشنی میں علم کی اہمیت

۴۰۰

فصل دوم: صوفیاء کے افکار کی روشنی میں جہالت

۴۱۶

کی مذمت

فصل سوم: علم کے فروغ کے لئے صوفیاء کی کاوشیں

۴۲۵

(۱) فکری (۲) علمی

فصل چہارم: صوفیاء کے افکار کی روشنی میں مقاصد علم

۴۳۸

کا تعین۔

فصل پنجم: اس شعبے میں صوفیاء کے کردار کا ناقدانہ

۴۴۶

جائزہ۔

۴۵۱

حوالہ جات

باب پنجم: انسانی زندگی کی فعالیت کے اسلامی تصور

۴۵۸

کی تشکیل اور تصوف

(فعال زندگی کے اسلامی تصور کی وضاحت)

فصل اول: صوفیاء کے افکار کی روشنی میں انسان

۴۶۰

کے درست مقام و مرتبے کے شعور کی بیداری۔

فصل دوم: صوفیاء کے افکار کی روشنی میں انسان کے مطلوبہ

۴۶۵

کردار کے شعور کی بیداری۔

فصل سوم: انسانی زندگی سے بے مقصدیت کے خاتمے اور

نصب العین کے تعین کے سلسلے میں صوفیاء کی

۴۷۰

تعلیمات۔

فصل چہارم: انسانی کردار میں جرات اقدام کی صلاحیت کی

تشکیل اور صوفیاء کی تعلیمات مذکورہ بالا

پہلووں سے موجودہ صورت حال اور اصلاحی

۴۷۷

لاائحہ عمل۔

## باب ششم: معاشی رویوں کی تشکیل میں تصوف

### کا کردار

(منفی رویوں کا انسداد اور مثبت رویوں کے حصول کے لئے تصوف کا کردار)

فصل اول: صوفیاء کے افکار کی روشنی میں تحریک

۵۱۶ مادیت کے اثرات اور ان کا انسداد۔

فصل دوم: صوفیاء کے افکار کی روشنی میں استحصالی

۵۲۵ رجحانات کی بجائے احسان و ایثار کا فروغ۔

فصل سوم: صوفیاء کے افکار کی روشنی میں تحریک

۵۳۶ ماقبیت اور اس کا انسداد۔

فصل چہارم: صوفیاء کے افکار کی روشنی میں ارتکاز دولت

۵۴۱ کی بجائے انتشار دولت۔

(Circulation of wealth)

فصل پنجم: صوفیاء کے افکار کی روشنی میں پر تعیش

۵۴۷ انداز زندگی کی بجائے سادگی۔

فصل ششم: صوفیاء کے افکار کی روشنی میں خود

۵۵۲ انحصاری، کفایت شعاری و قناعت۔

فصل ہفتم: خلاصہ بحث، تصوف کا موجودہ کردار،

۵۵۹ مسائل اور اصلاحی تجاویز

باب ہفتم: موجودہ سائنسی و تکنیکی حالات کے تناظر

۵۷۶ میں انسان کردار کی تشکیل اور تصوف

فصل اول: زوال پذیر ذہنیت کی جگہ خود اعتمادی

فصل دوم: انسانی فکر میں ارتقاء و جمود کا خاتمہ۔ ۶۰۲

فصل سوم: فکر انسانی کو ارتقاء کی راہ پر گامزن کرنا۔ ۶۱۲

فصل چہارم: عصر حاضر کے عمومی حالات کے تناظر

۶۲۰ میں انسانی کردار کی تشکیل اور تصوف

فصل پنجم: عالم اسلام کے استحکام و بقاء کے لئے مطلوبہ ۶۳۲

انسانی کردار اور تصوف

۶۳۸

حوالہ جات

باب ہشتم: عصر حاضر میں تصوف کے کردار میں حائل

۶۴۱ مشکلات اور ان کا تدارک

فصل اول: مسائل و مشکلات۔ ۶۴۴

فصل دوم: ان مسائل کا پس منظر۔ ۶۴۶

فصل سوم: تدارک ۶۷۱

فصل چہارم: نتائج بحث۔ ۶۷۵

فصل پنجم: مصادر و مراجع۔ ۶۸۷

۶۹۲ حوالہ جات



## ”امتنان و تشکر“

### الحمد لله ربّ العلمین

”جدید عصری مسائل کے حل میں تصوف کا کردار“ کا موضوع عصری اثرات اور انسانی زندگی کے فکری و عملی دھاروں سے منسلک ہونے کی وجہ سے اہم بھی ہے اور پیچیدہ بھی! میں نے بتوفیق الہی اس مشکل مرحلہ کو اپنی استطاعت کے مطابق طے کرنے کی کوشش کی۔ فی الحقیقت اتنا بڑا کام اللہ کی نصرت کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس تحقیقی سفر میں کچھ مخلص و ہمدرد خیر خواہوں کا تعاون اور رہنمائی میرے لئے قیمتی سرمایہ رہی۔ ان کے لئے تشکر کے احساسات کا الفاظ میں اظہار ضروری سمجھتا ہوں۔ موضوع کے انتخاب اور ابتدائی راہنمائی کے علاوہ کام کو جلد مکمل کرنے کی تحریک و تاکید اور عملی معاونت کے سلسلہ میں محترم اقبال صاحب ایڈووکیٹ، ڈاکٹر نوروز بگٹی، ڈاکٹر عطیہ شمشاد کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ممنون ہوں۔ ان کے لئے ڈھیروں دعائیں۔ استاذ مکرم پروفیسر ڈاکٹر نور الدین جامی کی راہنمائی تحقیقی عمل میں، حسن و خوبی کا باعث بنی۔ ان کا شکریہ الفاظ سے ادا کرنا مشکل ہے۔ میں ان احباب کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے وقتاً فوقتاً آراء سے نوازا۔ ان میں حاجی یار محمد صاحب، ڈاکٹر اعجاز احمد لانگو صاحب اور ڈاکٹر یکٹر محمد حسن سرپرہ صاحب شامل ہیں۔ آخر میں ان تمام احباب کا ممنون ہوں جنہوں نے اس مقالہ کی تیاری میں میری معاونت فرمائی۔ خاص کر محترم محمد آصف لانگو، امداد چشتی، علی گل سرپرہ، شائین بارانزئی اور محترمہ ثویبہ رمضان لیکچرر بلوچستان یونیورسٹی کا بے حد ممنون ہوں۔ جنہوں نے مقالہ ہذا کی کمپوزنگ بڑی محنت اور جانفشانی سے کی۔

”جزاهم اللہ فی الدارین احسن الجزاء“

والتوفیق الالباب

مقالہ نگار

سید محمد مزل شاہ کاظمی

## مقدمہ

اے پروردگار تیری حمد و ثنا ہے کہ تو نے صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق ارزانی فرمائی۔ تو ہی مالک اور عمدہ چارہ ساز ہے اور تیرے حبیبِ اعظم رحمۃ اللعالمین ﷺ انسانیت کے نجات دہندہ و ہادی سیدنا محمد الرسول ﷺ کی بارگاہ میں ہدیہ درود و سلام پیش کرتے ہیں جو اسوہ حسنہ اور مثالی نمونہ ہیں۔ اور آپ ﷺ کی آل پر اور آپ کے صحابہ کرامؓ پر جو تزکیہ نفس کی دولت سے بہرہ ور ہو کر کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوئے۔ انہوں نے اپنے بھائیوں کو نصیحت کی تو انہیں بھرپور فائدہ پہنچا۔

اللہ رب العزت نے اپنے محبوب کریم ﷺ کو بے شمار شانوں اور ان گنت کمالات سے بہرہ ور فرما کر مبعوث فرمایا۔ یہ کمالات عالیہ حد احصار سے باہر ہیں۔ انہیں میں سے ایک خصلت یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ ”دلوں کا تزکیہ فرماتے ہیں“ دل جو دنیاوی خواہشات سے آلودہ ہو چکے ہوں اور ان کی دھڑکنوں کا مرکز و محور بدل گیا ہو۔ جو اپنے خالق و مالک کے ذکر کی حلاوت سے محروم ہو چکے ہوں۔ شیطان کی وسوسہ اندازیوں اور نفس کی دسیسہ کاریوں کی آماجگاہ بن چکے ہوں۔ جب ایسے پراگندہ دل آپ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوں گے اور آپ کی نگاہ لطف ان کی جانب اٹھ جائے گی تو ان دلوں کو وہ طہارت نصیب ہو جائے گی کہ قدسیان السموات بھی ان پر رشک کریں گے۔ اب شیطانی حربے ان کی دلوں پر اثر انداز نہیں ہو سکیں گے بلکہ وہ توانو اور ربانی کے مہبط و مرکز بن چکے ہوں گے۔

ہمارے پاک و پاکیزہ سرشت پیغمبر ﷺ کے فیض پاک نے دلوں کی اجڑی ہوئی دنیا کو بہار آشنا کر دیا۔ ایسی سردی و داغی بہار کہ وہ اس کے بعد کبھی بھی خزاں کی ستم رانیوں کا شکار نہیں ہو سکتی۔

نبی اکرم ﷺ کی فیض بخششوں کا یہ سلسلہ اولیائے کرام کی صورت میں آج بھی جاری و ساری ہے۔ ان نفوس قدسیہ کے روحانی تصرفات اور باطنی فیوضات نے ہمیشہ دنیا میں خیر کی روایت کو زندہ رکھا۔ عصیان اور لغزشوں سے آلودہ دلوں کو حق و راستی کے انوار سے روشن و منور کرنے کا سلسلہ ہمیشہ ان پاکان امت نے اپنی شبانہ روز کاوشوں سے بحال رکھا۔ اولیائے کرام کی ان مساعی کے صدقے میں اس امت میں ایسے ارفع و اعلیٰ کردار اور ایسی برگزیدہ ہستیوں پیدا ہوئی ہیں کہ دنیا کی کوئی قوم ان جیسے نادر روزگار وجود پیش نہیں کر سکتی۔

جب سے فجر اسلام طلوع ہوئی ہے اسے انتہائی شدید مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ مخالفوں نے مختلف اسالیب و وسائل کے ذریعے اس کی پر شکوہ و بلند و بالا عمارت کے انہدام کے لئے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ آج بھی ہمیں الحادی موجوں کا سامنا ہے جو مشرق و مغرب سے ابھر رہی ہیں اور بھیانک انجام کے ذریعے ہمارے فکری و اعتقادی مستقبل کو تہہ و بالا کر رہی ہیں۔ امت مسلمہ ایک خطرناک گڑھے میں گرا چاہتی ہے۔ اور ایک سنگین شرکی نذر ہو رہی ہے۔ اس فکری انحطاط کی فضا میں ہمارے لئے رب ذوالجلال کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے، فروعی و اجتہادی اختلافات سے دستکش ہونے اور دلوں کو تجلیات انوار الہیہ کا مہبط و محور بنانے کے سوا چارہ کار نہیں ہے تاکہ ہم اس سے قوت و طاقت، سکون و طمانیت، عزت و افتخار اور اعزاز و کرامت حاصل کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو روح اور جسم کے دو مختلف عناصر کا مجموعہ بنا کر اس کی سرشت میں فطری طور پر دونوں قسم کی ضرورت کا داعیہ رکھ دیا ہے جس طرح جسم کی بقا و سلامتی کے لئے مادی ضروریات کا حصول ضروری ہے اس طرح روح بھی ایک مخصوص خوراک اور ماحول کا تقاضا کرتی ہے۔ انسان کیلئے اس دنیا میں دونوں اقسام کی ضروریات کی تکمیل کا قدرتی نظام موجود ہے جسم کی خوراک، خورد و نوش، لباس، رہائش اور دیگر ضروریات زندگی کے لئے قدرتی وسائل موجود ہیں اور روح کی خوراک عبدیت کے تقاضاؤں کی تکمیل ہے جس کیلئے انبیائے کرام کے ذریعے اللہ تعالیٰ مکمل اصول و ضوابط مہیا فرماتا رہا۔ حتیٰ کہ حضور سید عالم نور محمد ﷺ تشریف لائے اور قرآن حکیم کی صورت میں انسانیت کو ایک واضح نصب العین عطا کیا۔ اسلام نے روح اور جسم کے تقاضوں میں مضمر فوائد و نقصانات کو بھی واضح کر دیا۔ پھر انسان کو عقل، تدبیر اور تفکر کی نعمت سے نواز کر اسے پورا پورا اختیار دیا کہ روحانی اور جسمانی ضروریات اور تقاضوں کی تکمیل میں جسے چاہے اولیت دے۔

اب چاہئے تو یہ تھا کہ انسان عقل سلیم کو استعمال میں لائے ہوئے روح اور جسم کے مطالبات میں توازن برقرار رکھتا اور دونوں کو مطلوبہ خوراک اور ماحول فراہم کرنے میں انصاف کرتا۔ مگر چونکہ جسمانی مفادات اور نفسانی خواہشات و داعیات انسانی طبیعت کیلئے بظاہر زیادہ مرغوب اور باعث لذت و سکون ہیں۔ اس لئے وہ مادی ضروریات کیلئے نسبتاً زیادہ مائل رہتا ہے۔ انسان کی مادیت پرستی کا دوسرا بڑا سبب شیطان کا جمالیاتی قرب ہے جو اذلی دشمنی کا باعث مستقل محرک کی حیثیت سے اس کے رگ و ریشے میں موجود ہوتا ہے۔ لیکن روح بہر حال ایک رحمانی قوت ہے، ایک میلان اور نورانی جذبہ ہے جو انسان کو وقتاً فوقتاً نیکی اور صالحیت کی طرف کھینچتی ہے۔ مذہب اگر معاشرتی اقدار کا محرک ہو تو انسان کو روحانی غذا ملتی رہتی ہے۔ لیکن مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے اور پورا معاشرہ ہی مادیت کے طوفان کی بھیٹ چڑھ جائے تو روحانیت دہتی چلی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کیلئے خیر و شر، نیکی اور بدی کے سارے فرق ختم ہو جاتے ہیں۔ آج انسانیت اس موڑ پر کھڑی ہے۔ اس وقت انفرادی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر مادیت پرستی نے انسان سے خیر و شر کے تمام امتیازات چھین لئے ہیں۔ جدید ترقی یافتہ مغرب نے جس قدر سائنسی ترقی کی اس قدر بے راہ روی اور بدکاری کی مرتکب ہو کر اخلاقی قدریں کھو چکی ہے۔ یہاں تک کہ آج کا پڑھا لکھا نام نہاد مہذب انسان حیوانات سے بدتر اخلاقی معیار پر پہنچ چکا ہے۔ سامان تعیش کی فراوانی اور عیش و عشرت کے باوجود لوگ پریشان ہیں۔ انہیں ذہنی سکون نہیں ملتا۔

یہ تو اہل یورپ اور اہل مغرب کی بات تھی جہاں اب برائی نے عروج پر پہنچ کر انسان کو سوچنے سمجھنے پر مجبور کر دیا ہے اور بہت سے لوگ اسلام کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں اور اسلام کے روحانی نظام بھل و جان تسلیم کرتے ہوئے صوفیائے اسلام کی کتب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ مگر بد قسمتی سے آج کا مسلمان یورپ کی نقالی کر رہا ہے جس تہذیب نے اہل مغرب کو مفلوج اور بے حس کر دیا اسی تہذیب کو اہل اسلام ایک دوسرے سے بڑھ کر گلے لگا رہے ہیں۔ بے دینی، بددیانتی، ضمیر فروشی، ہوس مال و زر اور اس سے بڑھ کر اخلاقی ظاہروی جیسے اثرات پوری طرح اسلامی سوسائٹی میں جڑیں پکڑ چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان انفرادی زندگی کی سطح سے لے کر قومی اور بین الاقوامی سطح تک باہمی منافرت، بے عملی، بے یقینی اور شکست خوردگی کا شکار ہیں۔ دنیا کی امامت کیلئے بھیجی جانے والی امت آج سراسر بے مقصدیت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔

یہی وہ حالات ہیں جن کے پیش نظر آج مذہبی طبقوں اور بالخصوص تبلیغ دین کے عظیم منصب پر فائز علماء و مفکرین کو اپنی اہم ذمہ داریوں کا احساس پہلے سے بڑھ کر کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ ایک طرف مغربی اقوام کی تباہ کاریاں، ان کا

احساس ندامت اور توبہ اسلام کے نظام روحانیت کی طرف گہرا رجحان اور دوسری طرف خود اس روحانی نظام کے حاملین کی عملاً مذہب سے بغاوت و سرکشی اور بے عملی دو ایسے مختلف رخ ہیں جن پر غور و فکر کرنا ہر صاحبِ وردِ مسلمان کا اولین فرض ہے۔

اس وقت تغیر پذیر عالمی، سیاسی، سماجی، ثقافتی اور اقتصادی حالات و واقعات ملت اسلامیہ کے لئے امتحان کی گھڑی ہیں۔ مغرب میں آج بے چینی، لاقانونیت، اخلاقی پستی اور بدکاری کا بڑھتا ہوا طوفان اپنے عروج کی جن سطحوں کو چھو رہا ہے۔ اس کے اثرات نے اسلامی معاشرے کو اپنے پنجوں میں جکڑ رکھا ہے۔ ہمارے نوجوان بری طرح اس ثقافتی یلغار کا شکار ہو رہے ہیں اور عالم کفر امریکہ جیسی بے اصول شیطانی سپر طاقت کے زیر اثر پروان چڑھ رہا ہے۔

تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ایسے نازک مواقع تاریخ اسلام میں کئی بار آئے جب کفر و الحاد اور فسق و فجور کی سیاہ گھٹاؤں نے عالم اسلام کی فضا کو خوفناک حد تک گھمبیر کر دیا۔ لیکن اسلام چونکہ دین الہی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ ہر دور میں اپنے دین کو محفوظ کرنے کے انتظامات فرماتا ہے۔ حفاظت دین پر مامور ہونے والے خوش نصیب لوگوں میں سے اکثریت طبقہ صوفیاء کے رہی ہے جنہوں نے ہر باطل کا ہر سطح پر ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اسلام کی گرتی ہوئی ساکھ کو بام عروج تک پہنچا دیا۔ یہ اتنی بڑی حقیقت ہے کہ دشمنان اسلام بھی اس سے انکار کی جرات نہیں کر سکتے۔ پروفیسر ایچ آر گب جیسے یورپی دانشور کے یہ الفاظ اس سلسلے میں خاص طور پر قابل غور ہیں: ”تاریخ اسلام میں بارہا ایسے مواقع آئے ہیں کہ اسلام کے کلچر کا شدت سے مقابلہ کیا گیا لیکن اس کے باوجود مغلوب نہ ہو سکا اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ صوفیاء کا انداز فکر فوراً اس کی مدد کو آ جاتا تھا اور اس کی اتنی قوت و توانائی بخش دیتا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہ کر سکتی۔“

اسی طرح عصر حاضر کے معروف اور عظیم سائنس دان ڈاکٹر مارس بیوکائی کا یہ اعتراف بھی ناقابل فراموش ہے جو اس نے تہذیب مغرب کی تباہ کاریوں کے پیش نظر انسانیت کے مستقبل کے متعلق تنبیہ کرتے ہوئے اپنی مشہور کتاب ”بائبل، قرآن اور سائنس“ میں لکھا ہے۔

”موجودہ سائنس (کے تحت ہونے والی ترقی) نے انسانی دماغوں کو جس قدر ناپاک کر دیا ہے ان کو پاک کرنے کیلئے بڑی روحانی قوت کی ضرورت ہے اور وہ سائنس اسلام کی تعلیمات سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔“

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا روحانی نظام یعنی تصوف ہی موجودہ سائنس کی طرح انسان کو روحانی مشاہدات تک پہنچا کر اسے عین یقین اور حق یقین کے درجے پر فائز کر سکتا ہے اور مادیت زدہ ناپاک باطن اسی سے پاکیزگی کی نعمت سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔ مگر انتہائی قابل افسوس امر یہ ہے کہ اس پاکیزہ اور موثر روحانی تعلیمات پر مبنی نظام (تصوف) کے

ساتھ خود مسلمانوں نے دو انتہاؤں میں بٹ کر ظلم کیا۔ ان انتہاؤں میں بٹے ہوئے مسلمانوں کو اگر دو طبقے کہا جائے تو ان میں سے پہلا طبقہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو سرے سے اسلام کے روحانی نظام کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ وہ بیک جنبش قلم تصوف کو عجمی تصور کہہ کر دائرہ اسلام سے خارج کر دینے کو ہی اسلام کی حقیقی خدمت سمجھتے ہیں اور حتی المقدور صوفیائے اسلام کی ناقابل فراموش خدمات کی مختلف تاویلیں کر کے انہیں شرک کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگ فقہی مذاہب اربعہ (حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی) کی طرح سلاسل طریقت کے مختلف مکتبہ ہائے فکر (قادری، نقشبندی، چشتی، رفاہی، سہروردی وغیرہ) کی تقسیم کو بھی اسلام کے خلاف ”گھناؤنی سازش“ قرار دیتے ہیں۔

اس کے برعکس دوسرا طبقہ ان جاہل، بے عمل اور نام نہاد صوفیائے کما ہے جنہوں نے خانقاہی نظام کو بدنام کرنے میں بنیادی اور مرکزی کردار ادا کیا علم و عمل سے فارغ ایسے کاروباری پیر آج پر روپ میں ہر جگہ بکثرت پائے جاتے ہیں جو تصوف و طریقت کے پاکیزہ مشن کو باقاعدہ تجارتی دھندا سمجھتے ہوئے حصول شہرت و زر کی اعلیٰ منازل طے کر چکے ہیں۔ اس وقت بے شمار گدی نشین الاما شاء اللہ علیہ ہیں جو اقبالؒ کے مصرعے ”رہ گئے مجاور خانقاہوں میں یا گورکن“ کے حقیقی مصداق ہیں اور اکثر صاحبزادگان پر زانگوں کے تصرف میں عقابوں کے نشین، کی حقیقت فٹ آتی ہے۔

مذکورہ بالا باغی طبقہ دراصل ایسے ہی بے عمل، گنوار اور جاہل، ”صوفیاء“ کا ہی رد عمل ہے۔ دنیا و آخرت سے بے خبر یہ لوگ دراصل نفس پرستی کے جائیں گرفتار ہیں اور مادی دوڑ میں شریک دوسرے تمام طبقات سے زیادہ طریقت کے نام پر دین کے ساتھ منافقت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

برصغیر میں ان دو طبقات کے علاوہ ایک تیسرا طبقہ بھی موجود ہے جو تصوف کے تاریخی کارناموں سے انکار تو نہیں کر سکتا اور اس نظام کو کسی قدر برحق بھی سمجھتا ہے مگر عملاً صوفیائے اسلام کی تعلیمات سے نہ جانے کیوں الراجک ہے۔ ان میں سے بعض مفکرین کے نزدیک آج تصوف افیون یا ذیابطیس کی بیماری ہے جس سے قوم کو نجات دلانا ضروری ہے۔

حقیقت تو خیر حقیقت ہی ہوتی ہے اس کیلئے کسی کا انکار یا اقرار تصدیق کوئی معنی نہیں رکھتے۔ مگر آج جامد خانقاہیت ظواہر پرستی اور نفس پرستی پر مبنی، پیری مریدوں نے اسلام کی روح کو جتنا نقصان پہنچایا ہے۔ اس کا ازالہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ عملی تصوف کو روحانی تربیت کے ذریعے جدید تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے متعارف کرایا جائے تاکہ اس دور زوال میں امت مسلمہ کو پھر سے رازی، غزالی، رومی، جیلانی، جویری، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ اجمعین جیسے مردان حق میسر آسکیں۔ تاریخ کے اس اہم موڑ پر اس وقت تجدید و احیائے دین اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت

جیسی غیر معمولی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے والے افراد اور اداروں کو وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اسلام کی پیاسی اور روحانی سکون کیلئے ترستی ہوئی انسانیت کو اسلام کے چشمہ صافی تک پہنچانے کا فریضہ پوری دیانت اور خلوص سے سرانجام دینا چاہئے۔ ہر دور اور ہر زمانہ میں صوفیائے کرام نے اہل اسلام کو ظل رحمت یزداں سے بہرہ ور کرنے، اسکی مناجات کی نعمتوں اور قرب کی سعادتوں اور سرفرازیوں اور اسلام کی روحانیت لٹانے میں کوشاں رہے ہیں۔ دشمنان اسلام نے اس رخ زیا کو داغدار کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے۔ انہوں نے اس پر جمود کا الزام دھرا ہے۔ اس کے فداکاروں پر رجعت پسندی کا گھٹیا بہتان باندھا ہے۔ اسی طرح انہوں نے مختلف انداز سے نت نئے طریقوں سے حملے کئے ہیں۔ کبھی لوگوں کو ان کے فقہی مذاہب میں شکوک و شبہات کا شکار کیا ہے۔ کبھی رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام اور راویان احادیث کو مطعون کرنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان حرکات شیعہ کا ارتکاب انہوں نے اسلام کی تیخ کنی کے لئے کیا ہے۔ امت کے عقائد خراب کرنے کے لئے ایمانیات کے مسائل میں طرح طرح کے شبہات پیدا کرتے رہتے ہیں۔

جب ہم یہ سب کچھ مختلف ادوار میں دیکھ رہے ہیں تو جو چیز ہمارے لئے تازیانہ کا باعث ہے وہ تصوف اسلامی پر خطرناک حملے اور طعن و تشنیع ہے اور یہ تصوف اسلامی تو اسلام کا جوہر ہے۔ اس کی زینت اور بہار ہے۔ اس کی روح اور جان ہے۔

باطل پسندوں نے اس کے معاملہ اور صورت کو خیالی و فلسفی تصوف، کمزوری، زہد و خلوت بے ہودہ بدعت اور زندگی کی دوڑ دھوپ سے فرار جیسے الزامات سے داغدار کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی حفاظت، اس کی بقاء اپنے ذمہ کرم پر لے رکھی ہے۔ ان کے قلم ٹوٹ گئے۔ ان کے دعاوی کے غباروں کی ہوا نکل گئی اور سالکان طریقت کے لئے تصوف نیا رہ نور بنا ہوا ہے جو کہ اسلام کی نشر و اشاعت اور اسکی عمارت کو مضبوط کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔

دور حاضرہ میں صوفیائے کرام کی تعلیمات کو اہل انداز میں اور عصری مذاق کے مطابق نوجوان نسل اور تشکیک زدہ افراد کے سامنے پیش کرنا بہت ہی ضروری ہے۔ ان روایات کے احیاء کے بغیر امت مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ کا مقصد کبھی بھی پورا نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اسلاف کی درخشندہ اور حیات آفریں روایات کی پاسداری کا فریضہ سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

میں نے اس اہم کام کے آغاز سے پہلے جن کتب تصوف کا انتخاب کیا وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

قوت القلوب، احیاء العلوم، کتاب اللمع، کیمیائے سعادت، غنیۃ الطالبین، عوارف المعارف، حجة الله البالغة، سیر تصوف، فتوحات مکیہ فصوص الحکم، خزینہ معارف، التعرف لمذهب اہل تصوف، نفحات الانس، جوامع الکلم، انیس الارواح، التصوف الاسلامی فی الاداب و الاخلاق، کشف المحجوب، التکشف عن مهمات التصوف، مقابیس المجالس، دلائل السلوک، سیر تصوف، کتاب اللمع، سیر الاقطاب، تاریخ مشائخ چشت، حقیقت تصوف، عصر جدید اور مسائل تصوف، تاریخ تصوف، اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش، فقہ اور تصوف، اسلامی تصوف اور صوفیاء، سرحد، اسلامی تصوف میں مسائل السلوک کا مقام، جوامع الکلم، بہشت بہشت، تصوف اور سریت، مکتوبات امام ربانی، اسلام اور جدید ذہن کے شبہات، تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک، فلسفہ تصوف، مذہب اور جدید چیلنج، تصوف کے روشن حقائق، روح تصوف، تلخیص ابن خلدون۔

ہمارا ایمان ہے کہ صوفیائے اسلام کا طریقہ ہی وہ صحیح طریقہ ہے جو تمام ابلیسی و مادی خطرات سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک تصوف شریعت محمدی سے ہٹ کر کوئی الگ نئی چیز نہیں بلکہ حضرت شاہ ولی اللہ کے قول:

”جس طرح دین کے تمام اعمال کی ایک ظاہری شکل ہے اور ایک اس کی باطنی حقیقت۔ ظاہری شکل کے بغیر باطنی حقیقت کا تصور نہیں کیا سکتا اور باطنی حقیقت کے بغیر ظاہری شکل ایک بے جان جسم کی طرح ہے۔ بس یونہی دین کی ظاہری شکل کا تعلق شریعت سے ہے اور باطنی حقیقت کا تعلق طریقت یا تصوف سے۔“

اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو اسلام کے روحانی نظام کی پاکیزہ روحانی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ۔ اسلام میں صوفیاء کرام کا طبقہ کوئی نیا نہیں اور نہ ہی فکر اور رشد و ہدایت کا طریقہ کوئی الگ چیز ہے، یہ اسی کامل دین کی اتباع کرنے والے ہیں جس کی تکمیل رسول اللہ ﷺ پر ہوئی ہے۔ صوفیاء کرام کی فکر اور تعلیم قرآن و سنت سے الگ کوئی دستور العمل یا تصور حیات نہیں ہے بلکہ صوفیاء کرام کی زندگی میں عمل اور ان کی تعلیمات و فکر وہی ہے جس کا منبع و ماخذ دین مبین اور کتاب حق ہے جو پندرہ سو سال قبل حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل فرمائی گئی تھی سرکارِ



دو عالم سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ منجی اعظم ہیں آپ نے دین حق کی تبلیغ فرمائی آپ معلم اعظم ہیں آپ نے کتاب و حکمت اور دانائی کی تعلیم دی اور ان کے کردار کو اخلاقیات سے مزین کیا آپ مرشد اعظم اور مصلح اعظم ہیں آپ نے تزکیہ و تصفیہ فرمایا۔

تاکہ لوگوں کی باطنی بیماریاں دور ہو جائیں اور وہ مرکزی اور مظہر ہو جائیں۔ درحقیقت تزکیہ اور تصفیہ تصوف کی بنیاد ہے۔ صوفیاء کرام کی فکر آج بھی انسانی ذہنوں کو محبت و خلوص، آگہی ذات، ایثار اور قربانی، صلہ رحمی، آخرت کی فکر اللہ اور رسول کی اطاعت کا راستہ دکھا رہی ہے۔ وہ زندگی میں اللہ کے بندوں کو سچائی کا سبق دیتے رہے اور جبکہ وہ اپنے اللہ کے پاس ہیں ان کی فکر اور تعلیم اللہ کے بندوں کیلئے رہنمائی کا کام دے رہی ہے۔

میرے اس انتخاب کا مقصد بھی یہی ہے کہ صوفیاء کرام کی اعلیٰ خدمات کا ذکر کروں انہوں نے کیسی زندگیاں گزاریں، بنی نوع انسان کی کس طرح خدمت کی، تاجداروں کے ساتھ اپنے تعلقات کیسے رکھے، آیا انہوں نے سرفروشی میں نام پیدا کیا، یا دینی تعلیمات کو عوام میں اپنے حُسنِ عمل و فکر سے پھیلا یا گنما رہے۔ آج بھی اُن کے نورِ قلب کا سکھ لوگوں کے دلوں پر ہے۔

ان اصفیاء میں وہ بھی ہیں جنہوں نے نمازوں سے باہر آ کر لوگوں میں تبلیغ دین محمدی ﷺ کی۔ وہ بھی ہیں جنہوں نے تعلیمات اسلامی کو لطافت اشعار کا جامہ پہنایا۔ وہ بھی ہیں جنہوں نے بادشاہوں اور امراء کی بدعتیہ گئیوں کا اپنی زبان حتیٰ کہ تلوار سے بھی مقابلہ کیا۔ اور شاہی فوج کے چکھے چھڑائے۔ ان میں وہ بھی ہیں جنہوں نے بدعت، بد عقیدگی اور دینی غلو سے قلمی و سیفی جنگ کی۔ خواہ حریف کے روپ میں ہی کیوں نہ آیا ہو۔ ان صوفیاء کے خلفاء نے بھی اپنے مجاہدوں کو نقطہ عروج پر پہنچایا۔ اپنے شیوخ کیلئے مرٹے۔ ان کی تعلیمات کو گوشہ گوشہ پھر کر لوگوں تک پہنچایا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اندرونی و بیرونی سازشیں ان صوفیاء کرام کے ادوار میں ان کے اسلامی

قافلوں کو نقصان پہنچانے میں ہمیشہ سرگرم عمل رہی ہیں۔ اور یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ غیر اسلام قوتیں اسلام کو نقصان پہنچانے میں ہمیشہ سے متحرک رہی ہیں۔ لیکن اس سے بڑھ کر افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے ادوار اقتدار میں کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ غیر اسلام قوتوں کی مکمل تیخ کٹی کی جائے۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مسلمان حکومتوں کے عروج کے زمانہ میں بھی دشمنوں نے دوستی کے لباس میں اسلامی اتحاد و اتفاق کو پارہ پارہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

خود رسالت مآب ﷺ کو کفار کے مقابلے میں عبداللہ بن ابی منافق سے زیادہ محتاط رہنا پڑا۔ حضرت ابو بکر

صدیقؑ اور دور فاروقی کی ہیبت نے اسلام کے دشمنوں کو مایوس کئے رکھا۔ کیا اس بات کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے کہ فیروز نے حضرت عمر فاروقؓ کو اس وجہ سے شہید کیا کہ وہ اپنے حق میں آپ سے فیصلہ نہ کروا سکا۔ کیا حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت اور ملت اسلامی کا انتشار یہودی سازش کا نتیجہ نہیں تھا۔ جنگ جمل، جنگ صفین اور حضرت علیؓ کی شہادت بظاہر مسلمانوں کی باہمی صف آرائی نہیں اور اس کا ہر فرد صاحب خیر القرون تھا۔

لیکن وہ لوگ کون تھے؟ جنہوں نے حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ کے لشکروں پر شب خون مارا۔ اور باہمی رضا مندی سے مسئلہ طے کرنے کا موقع نہیں دیا۔

وہ لوگ کون تھے؟ خارجی عقائد کو ہوادی ثانیاً کر بلا کو برپا کرنے والے اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کو شہید کر کے احیاء خلافت راشدہ کے امکان کو نیست و نابود کرنے والے بظاہر مسلمان نظر آتے ہیں لیکن کیا یہ معلوم کرنا ضرور تھا کہ شک و شبہ اور غلط فہمیاں پیدا کرنے والے، بھائی کو بھائی سے لڑانے والے کون تھے؟

ابو مسلم خراسانی کی تحریک ہو یا فرقہ معز لہ کا قیام ان سب کی حقیقت آشنائی کیلئے پھر ایسے مطالعہ کی ضرورت ہے جس سے ملت کی تباہی اور اسلام کو مسخ کرنے کی سازشوں کو چلانے والوں کی نقاب کشائی ہو سکے۔

عباسی دور میں یہودی علماء و ادباء کلیدی عہدوں پر فائز ہو کر اپنی تصانیف و تراجم کے ذریعے مسلمانوں کی ایمانی اور وجدانی قوتوں پر عقلیات کی ضربیں لگائیں۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ، حضرت امام مالکؒ، حضرت امام احمد بن حنبلؒ اور بہت سے دوسرے اہل حق کو مسلمان حکمرانوں سے سخت سزائیں دلوانے کے محرک کون تھے؟ کیا حسن بن ضیاء کی جانب سے ایسے نائب مسلمانوں سے منتخب نہ کئے جاتے تھے جو خوشی سے مایہ ناز مفکرین، مدبرین اور مصلحین کو شہید کرتے تھے۔

اندلس میں مصری یمنی اور نو مسلم اندلسی میں تفریق کس طرح پیدا ہوئی؟

ان سب سوالوں کا صرف ایک جواب ہے۔ وہ یہ کہ مسلمان دشمن کا آلہ کار بن کر دانستہ اور نادانستہ طور پر ذاتی مفاد کی خاطر اپنے ہی گھر کو آگ لگاتے رہے۔

اس طرح خلافت عثمانیہؓ کی تباہی اور چھوٹے چھوٹے محکوم اسلامی ملکوں کی تشکیل میں یہودیوں اور عیسائیوں نے کیا زور نہیں لگایا؟

یہی صورت حال برصغیر پاک و ہند میں بھی رہی جے پال کی کاروائیاں، اندھ پال کی سازشیں، پرتھوی راج سے شہاب الدین کی جنگ ان تمام واقعات کی کڑیاں بہت دور تک جا کر ملتی ہیں۔ باطل کی ان چیرا دستیوں کو روکنے

کیلئے صرف علماء حق اور صوفیاء کرام ہی سینہ سپر ہوئے خصوصاً برصغیر میں سلطان محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کی فتوحات میں۔ حضرت خواجہ ابوالحسن خرقانی اور خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کا روحانی جہاد کا فرما ہے۔ اگر ایک طرف بابا فرید الدین گنج شکرؒ، شیخ نظام الدین اولیاءؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ، شاہ بوعلی قلندر اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلویؒ، اس برصغیر کے میدانی علاقوں میں اشاعت دین میں لگے رہے۔ تو دوسری طرف حضرت شاہ سلیمان تونسویؒ، حضرت شاہ شمس الدین سیالویؒ، خواجہ سید مراد علی شاہ صاحبؒ، حضرت خواجہ سید خواج محمد شاہ صاحبؒ، خواجہ پیر سید محمد شاہ صاحبؒ اور ان جیسے دیگر صوفیاء کرام نے اس خطے کے دور دراز علاقوں میں سنگلاخ پہاڑوں اور سرخوڑا دیوؤں میں اسلام کے خلاف داخلی و خارجی خطرات کے ساتھ ساتھ بیرونی تسلط کا خود اور اپنی جماعتوں کے ساتھ مردانہ وار مقابلہ کیا۔

اس تحقیق کا مقصد یہ بھی تھا کہ عالم اسلام پر صوفیاء کرام کی جدوجہد و مساعی، دین کی اشاعت کے سلسلے میں ان کا مجاہدانہ کردار کھل کر سامنے آئے۔ اور وہ عقائد جو آج تک پوشیدہ تھے اہل دنیا پر عیاں ہو جائیں بلکہ معلوم ہو جائے کہ صوفیاء کرام ہی تھے جنہوں نے بھنگی ہوئی انسانیت کو راہ ہدایت کی طرف رہنمائی کی۔

میرا یہ مقالہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ مقدمہ اور اختتامیہ اس کے علاوہ ہیں۔ پہلے باب میں مقدمہ کے طور پر صرف تصوف پر بحث کی گئی ہے۔ تاکہ صوفیاء کرام پر بحث کرنے سے قبل تصوف کا پس منظر، اس کی تاریخ اور دیگر مذاہب کے راہبانہ کردار سے اسکی امتیازی حیثیت کو آگاہ کیا جائے دوسرے باب میں جدید عصری مسائل کا ایک جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً دینی و روحانی مسائل، فکری مسائل، معاشرتی مسائل، معاشی مسائل، کی وضاحت کی گئی ہے۔

تیسرے باب میں تربیت نفس اور اصلاح فکر کے سلسلے میں صوفیاء کے کردار کو اجاگر کیا گیا ہے۔

چوتھا باب مسلمانوں کے علمی اور تعلیمی مسائل سے متعلق ہے کہ صوفیاء کرام نے اس سلسلے میں کیا کردار ادا کیا۔

پانچواں باب صوفیاء کرام کی فعال زندگی کے بارے میں ہے کہ کس طرح انہوں نے زندگی گزاری اور اس

کا دوسروں کو درس دیا۔

چھٹا باب معاشی رویوں کے سلسلے میں ہے، صوفیاء کرام نے اس سلسلے میں جو کردار ادا کیا ہے اسکی وضاحت

کی گئی ہے۔

ساتواں باب سائنسی اور تکنیکی حالات میں انسان کے کردار اور تصوف کے اثرات کے بارے میں ہے اور

آٹھویں باب میں تصوف کی راہ میں حائل مشکلات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اور اسکے تدارک کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ آخر میں عصارة التحقیق کے طور پر سارے عنوان کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔

میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اس اہم اور پیچیدہ نازک موضوع پر قلم اٹھانے کی توفیق عطا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے۔ آمین!

آخر میں اس بات کا عہد کرتا ہوں کہ صوفیاء کرام کی خدمات سے دنیا کو روشناس کرانے کا جو بیڑا میں نے اٹھایا ہے۔ اسے اپنی زندگی کا مشن بناؤں گا تا کہ ان حضرات کی قابل تقلید زندگیوں کو مشعل راہ بنایا جاسکے۔

اللہ تبارک تعالیٰ سے دعا ہے کہ مجھے بھی ان صوفیاء کرام کی طرح حضوا کر صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین اثم آمین! کیونکہ اسی میں دین و دنیا کی بھلائی ہے۔ جیسا کہ مفکر پاکستان حضرت علامہ محمد اقبالؒ نے فرمایا۔

کی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں  
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

# باب اول

تصوف کا مفہوم

## (۱) ”تصوف کا مفہوم“

تصوف وہ علم ہے جس میں ذات و صفات باری تعالیٰ کی نسبت بحث ہوتی ہے اور ان اعمال و اشغال کا ذکر کیا جاتا ہے جن میں تزکیہ و تصفیہ باطن ہو جو وصول الی اللہ کا ذریعہ ہو یا یوں سمجھو کہ تصوف، قرآن و حدیث سے نکلی ہوئی ایسی شاہراہ ہے جو افراط و تفریط کے عین درمیان میں واقع ہے جسے صراطِ مستقیم کہا جاسکتا ہے اور اس پر چلنے سے انسان خدا تک پہنچ جاتا ہے۔ (۱)

شریعت دراصل قرآن و سنت پر مبنی ادا امر و نواہی کا وہ نظام ہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے عمل کو منضبط کرتا ہے۔ جبکہ اس عمل کو حسن زینت اور حسن اخلاص کے کمال سے آراستہ کر کے اتباعِ شریعت کو درجہ احسان (۲) پر فائز کرنے کی سعی و تدبیر کا نام تصوف ہے۔ (۳)

فقہ کا تعلق انسان کے ظاہری عمل سے ہے وہ صرف یہ دیکھتی ہے کہ تم کو جیسا اور جس طرح حکم دیا گیا تھا اس کو تم بجالائے یا نہیں، اگر بجالائے ہو تو فقہ کو اس سے کچھ بحث نہیں کہ تمہارے دل کا کیا حال تھا۔ دل کے حال سے جو چیز بحث کرتی ہے اس کا نام تصوف ہے۔ قرآن میں اسی چیز کا نام تزکیہ اور حکمت ہے۔ حدیث میں اسے احسان کا نام دیا گیا ہے اور بعد کے لوگوں میں یہی چیز تصوف کے نام سے مشہور ہوئی۔ (۴)

شیخ الاسلام حضرت زکریا انصاریؒ فرماتے ہیں۔

تصوف وہ علم ہے۔ جس کے ذریعہ ان احوال کو پہچانا جاتا ہے جو تزکیہ نفوس، تصفیہ اخلاق اور دائمی خوش بختی کے حصول کی خاطر ظاہر و باطن کی تعمیر کے متعلق ہوں۔

شیخ احمد زروق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

تصوف وہ علم ہے جس کا مقصد دلوں کی اصلاح کرنا، اور ان کو محض اللہ کیلئے خاص کر دینا ہے۔ اور فقہ، عمل کی اصلاح اور پورے نظام کی حفاظت اور احکام میں مضمر حکمتوں کو آشکارا کرنے کا نام ہے اور علم توحید کا مقصد یہ ہے کہ مقدمات کو براہین و دلائل سے ثابت کیا جائے اور ایمان کو یقین کے زیور سے آراستہ کیا جائے۔ جیسا کہ طب کا مقصد اجسام کی حفاظت کرنا ہے اور علم نحو کا مقصد زبان کو اغلاط سے محفوظ کرنا ہے۔

شیخ الامام حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں۔

تصوف یہ ہے کہ ہر اچھی عادت اور طریقہ کو اپنایا جائے اور ہر برے طریقہ اور عادت کو ترک کیا جائے۔

کسی بزرگ کافر مان ہے کہ تصوف سراپا اخلاق ہے۔ پس جس نے تیرے اخلاق میں اضافہ کیا، اس نے تجھے تصوف پر عمل پیرا کر دیا۔

حضرت ابوالحسن شاذلیؒ فرماتے ہیں۔

”تصوف نفس کو عبودیت کے سانچے میں ڈھالنے، اور اسے احکام ربوبیت کی طرف لے جانے کا نام ہے۔ ابن عجبیہؒ فرماتے ہیں۔

کہ تصوف وہ علم ہے کہ جس کے ذریعے بارگاہ خداوندی تک رسائی، باطن کی رذائل سے صفائی اور اس کو مختلف فضائل سے آراستہ کرنے کی کیفیت معلوم ہو۔ اسکی ابتداء علم، وسط عمل اور انتہاء عنایت خداوندی ہے۔ صاحب کشف الظنون فرماتے ہیں۔

”یہ وہ علم ہے جس میں اہل کمال کی منازل سعادت میں ترقی کرنے کی کیفیت معلوم ہو۔“

آپ فرماتے ہیں کہ علم تصوف وہ علم ہے جسے عقلمند اور صاحب حال ہی جان سکتا ہے اسے وہی شخص جان سکتا ہے جسے اس کا مشاہدہ حاصل ہو۔ اور کورچم سورج کی روشنی کا کیسے مشاہدہ کر سکتا ہے۔ (۵)

شیخ زروق رحمۃ اللہ علیہ قواعد تصوف میں فرماتے ہیں کہ علم تصوف پر تقریباً دو ہزار تالیفات کی گئی ہیں اور ان تالیفات کا لب لباب صدق دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا ہے اور اس کی مختلف صورتیں ہیں۔

تصوف کا دار و مدار مادی آلائشوں سے دل کو صاف کرنے پر ہے اور اس کی بنیاد خالق حقیقی سے بندے کے تعلق قائم کرنے پر ہے۔ پس صوفی وہ ہے جس کا دل پاک اور اللہ تعالیٰ سے معاملہ صاف ہو، اور اس کی بارگاہ سے اسے خاص انعام و اکرام حاصل ہو۔

### لفظ تصوف کی لغوی تحقیق :-

تصوف کے مادہ اشتقاق میں بہت سے صرعی حضرات نے مختلف توجہیں بیان کی ہیں۔ خاص کر اس مادہ اشتقاق کے لحاظ سے لفظ تصوف کے بارے میں علمائے کبار کے مختلف اقوال ہیں۔ ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

قول اول۔ ”الصفاء“ :-

بعض علماء کے نزدیک تصوف کا مادہ اشتقاق ”الصفاء“ ہے۔ جس کے معنی صفائی اور پاکیزگی کے ہیں۔

اس مادہ اشتقاق کی رو سے کسی شے کو ہر طرح کی ظاہری و باطنی آلودگی سے پاک و صاف کر کے اُجلا اور شفاف

بنادینا تصوف ہے۔ (۶)

شیخ ابوالفتح رحمۃ اللہ علیہ تصوف کے مفہوم کے بارے میں فرماتے ہیں۔

”ان التصوف كلمة اشتقت من الصفاء“

تصوف وہ کلمہ ہے جو صفاء سے مشتق ہے۔ (۷)

قول ثانی۔ ”الصفو“:-

تصوف کا دوسرا مادہ اشتقاق ”الصفو“ بیان کیا جاتا ہے۔ جس کے معنی

”محبت اور دوستی میں اخلاص“ کے ہیں جیسا کہ صاحب المنجد اس مادہ کی بابت رقمطراز ہیں۔

”الصفو هو الاخلاص في المودة۔“

”الصفو“ کے معنی محبت میں اخلاص کے ہیں۔

”الصفی هو الصديق المخلص۔“

”الصفی“ سے مراد مخلص دوست کے ہیں۔ (۸)

اس مادہ کے اعتبار سے صوفی سے مراد وہ شخص ہے جس نے دنیا و آخرت کے اجر و جزا سے بے نیاز ہو کر محبوب

حقیقی سے بے لوث محبت اور دوستی کا رشتہ استوار کر لیا ہو اور جس کی تمام تر مساعی کا محرک فقط رضائے الہی کی طلب ہو۔

قول ثالث۔ ”الصوف“:-

تصوف کے باب میں تیسرا قول اس کے ”الصوف“ سے مشتق ہونے کا ہے جس کے معنی ”اون“ کے

ہیں۔ باب تفعل کے وزن پر تصوف کا معنی ہے۔ ”اس نے اونی لباس پہنا۔“ (۹)

امام ابوالقاسم قشیریؒ فرماتے ہیں۔

”تصوف اذا لبس الصوف كما يقال تصوف اس وقت کہا جائے گا جب کسی نے صوف کا

تقمص اذا لبس القميص۔“ (۱۰)

لباس پہنا ہو جیسے کسی کے قمیض پہننے پر ”تقمص“

کہا جاتا ہے۔



## قول رابع۔ ”الصوف“:-

اس مادہ اشتقاق کا ایک معنی ”یکسوشدن“ بھی بیان کیا گیا ہے یعنی کسی طرف پوری یکسوئی سے متوجہ ہونا، اس اعتبار سے تصوف کا مقصود و مطلوب ذات الہی کے ذکر و محبت میں اس قدر یکسوئی اور محویت حاصل کرنا ہے کہ ماسوی اللہ کی طلب و خواہش سے دھیان بالکل ہٹ جائے۔ علامہ غیاث الدینؒ فرماتے ہیں۔

می تواند کہ تصوف ماخوذ باشد از صوف کہ بمعنی یکسوشدن ہو سکتا ہے کہ تصوف ”صوف“ سے مشتق ہو جس کا معنی ہے روگردانیدن است چوں واصلان حق از ماسوی اللہ یکسوی یکسو ہو جانا اور (ہر طرف سے) منہ پھیر لینا چونکہ اللہ سے شند و روگردانند لہذا کارایشان را تصوف نامیدند۔ (۱۱) وصل کرنیوالے (ہر طرف سے کٹ کر) صرف اسی سے واصل ہوتے ہیں اور ماسوی اللہ سے روگردانی کرتے ہیں اسلئے ان کے احوال کو تصوف کہا جاتا ہے۔

## قول خامس۔ ”الصفہ“:-

بعض علماء نے تصوف کا مادہ اشتقاق ”صفہ“ کو قرار دیا ہے جس کے بارے میں شیخ ابوبکر بن اسحاق بخاری فرماتے ہیں۔

قال قوم انما سموا صوفیة لقرب اوصافهم ایک گروہ کا کہنا ہے صوفیہ کی وجہ تسمیہ ان کا باعتبار من اوصاف اهل الصفة الذین کانوا فی عهد اوصاف، اصحاب صفہ سے قریب تر ہونا ہے جو رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں موجود تھے۔ (۱۲)

اسی قول کی تائید میں شیخ احمد الحسینیؒ فرماتے ہیں۔

انه من الصفة اذ جملة اتصاف بالمحامد و یہ صفہ سے ماخوذ ہے کیونکہ تصوف تمام تر خوبیوں ترک الا و صاف المذمومة۔ (۱۳) سے متصف ہونے اور اوصاف مذمومہ کے ترک کر دینے

پر مبنی ہے۔

## قول سادس۔ ”الصف“:-

بعض علماء نے تصوف کو ”الصف“ سے مشتق قرار دیا ہے۔ اس سلسلہ میں امام ابوالقاسم القشیریؒ فرماتے

ہیں۔

انه مشتق من الصف فكا نها في تصوف صف سے مشتق ہے گویا صوفیاء کے قلوب باری الصف الاول بقلوبهم من حيث المحاضرة تعالیٰ کی حضوری کے اعتبار سے صف اول میں ہوتے ہیں۔  
من الله تعالى۔ (۱۴)

### قول سابع۔ ”صفت“ :-

کسی نے کہا، کہ یہ ”صفت“ سے مشتق ہے کیونکہ تصوف صفات حسنہ سے متصف ہونے اور اوصاف مذمومہ کو ترک کرنے کا نام ہے۔

### قول ثامن۔ ”صفوة“ :-

امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ ”صفوة“ سے مشتق ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ”صف“ سے ماخوذ ہے کیونکہ صوفیاء کرام اپنے مولیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہونے اور تمام عبادات کو بجالانے کیلئے صف اول میں ہوتے ہیں۔ اسی طرح بعض نے فرمایا کہ تصوف، سخت اونی کپڑے پہننے کی طرف منسوب ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ صوفیاء کرام اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے اس لباس کو ترجیح دیتے تھے۔

بہر حال لفظ تصوف اس قدر مشہور ہو چکا ہے کہ اس کی تعریف کیلئے کسی لفظی قیاس اور اشتقاق کی ضرورت نہیں۔ اور بعض لوگوں کا محض اس وجہ سے انکار کرنا کہ یہ لفظ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور تابعین کے زمانہ میں نہیں سنا گیا، یہ قول مردود ہے۔ کیونکہ بہت سی اصطلاحات صحابہ کرامؓ کے زمانے کے بعد معرض وجود میں آ کر مستعمل ہوئیں۔ جیسا کہ نحو، فقہ اور منطق وغیرہ۔

بہر حال ہمیں لفظی تعبیرات کی بجائے حقائق کی طرف توجہ دینی چاہیے کیونکہ جب ہم لوگوں کو تصوف کی دعوت دیتے ہیں تو اس سے ہمارا مقصد تزکیہ نفوس، تصفیہ قلوب، اصلاح اخلاق اور مرتبہ احسان تک رسائی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اور اسی کو ہم تصوف کا نام دیتے ہیں۔ اس کو اسلام کا روحانی، اخلاقی اور احسانی پہلو بھی کہا جاسکتا ہے یا اس کی حقیقت اور جوہر سے تعلق رکھنے والا کوئی دوسرا نام بھی ہو سکتا ہے۔ مگر علمائے امت کو سلف صالحین سے تصوف کا نام ہی ورثہ میں ملا ہے۔ اور یہی نام ان میں مشہور ہو گیا ہے۔ (۱۵)

## تصوف کے لغوی معنوں میں مشترک نکتہ:-

لغوی اعتبار سے تصوف کے جتنے معانی اور مطالب اوپر بیان کیے گئے ہیں ان سب میں ایک بات مشترک ہے اور وہ یہ کہ تصوف اللہ رب العزت سے ایسی بے لوث اور بے غرض دوستی اور محبت کا نام ہے جو نہ صرف دنیوی لالچ بلکہ اخروی طمع سے بھی یکسر پاک ہو اور اس راہ کے سالک کا قلب تعلق باللہ میں ہمہ نوع دنیوی و اخروی منفعتوں، مصلحتوں اور ہر قسم کے اندیشہ و خطرہ سے کلیتاً بے گانہ ہو جائے۔ جس کے نتیجہ میں اخلاص فی النیۃ والعمل کا جذبہ ظاہر و باطن میں اس قدر راسخ ہو جائے کہ انسان کی بندگی خالصتاً لوجہ اللہ ہو جائے نہ دنیا و آخرت میں انعام و جزا کی آرزو بندے کی عبادت کا محرک رہے اور نہ سزا و عتاب کا خوف۔ بقول شخصے۔

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے

اے بے خبر! جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے (۱۶)

لغت کے اعتبار سے تصوف کی اصل صوف ہوا کیے باشند اور حقیقت کے اعتبار سے اس کا رشتہ چاہے صفا سے جا ملے اس میں شک نہیں کہ یہ دین کا ایک اہم شعبہ ہے۔ جس کی اساس خلوص فی العمل اور خلوص فی المنیۃ پر ہے اور جس کی غایت تعلق مع اللہ اور حصول رضائے الہی ہے۔ قرآن و حدیث کے مطالعہ، نبی کریم ﷺ کے اسوہ حسنہ اور آثار صحابہ سے اس حقیقت کا ثبوت ملتا ہے۔

عہد رسالت اور صحابہ کرامؓ کے دور میں جس طرح دین کے دوسرے شعبوں، تفسیر، اصول، فقہ، کلام وغیرہ کے نام اور اصطلاحات وضع نہ ہوئی تھیں۔ ہر چند کہ ان کے اصول و کلیات موجود تھے اور ان عنوانات کے تحت یہ شعبہ بعد میں مدون ہوئے۔ اسی طرح دین کا یہ اہم شعبہ بھی موجود تھا۔ کیونکہ تزکیہ باطن خود حضور ﷺ کے فرائض میں شامل تھا۔ صحابہؓ کی زندگیاں بھی اسی کا نمونہ تھیں لیکن اس کی تدوین بھی دوسرے شعبوں کی طرح بعد میں ہوئی۔ صحابییت کے شرف اور لقب کی موجودگی میں کسی علیحدہ اصطلاح کی ضرورت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ کے لئے متکلم، مفسر، محدث، فقیہ اور صوفی کے القابات استعمال نہیں کئے گئے۔ اس کے بعد جن لوگوں نے دین کے اس شعبہ کی خدمت کی اور اس کے حامل اور متخصص قرار پائے۔ ان کی زندگیاں زہد و اتقاء اور خلوص و سادگی کا عمدہ نمونہ تھیں۔ ان کی غذا بھی اور لباس بھی موٹا کھر در اکثر صوف وغیرہ کا ہوتا تھا۔ اس وجہ سے وہ لوگوں میں صوفی کے لقب سے یاد کئے گئے۔ اور اس نسبت سے ان سے متعلقہ شعبہ دین کو بعد میں تصوف کا نام دیا گیا۔ قرآن میں اس کو تقویٰ، تزکیہ اور خشیۃ اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور حدیث شریف میں اسے ”احسان“ سے موسوم کیا گیا ہے۔ اور اسے دین کا حاصل قرار دیا گیا

ہے۔ جس کی تفصیل حدیث جبرائیل علیہ السلام میں موجود ہے۔ مختصر یہ کہ تصوف احسان، سلوک اور خلاص ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں۔ (۱۷)

نبوت کے دو پہلو ہیں۔ اور دونوں یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ کما قال اللہ تعالیٰ  
 ”لقد من الله على المؤمنين اذ بعث فيهم حقيقته في الله تعالى نے مسلمانوں پر بڑا احسان کیا ہے  
 رسولاً منهم يتلوا عليهم آياته ويزكيهم و جبکہ انہی میں سے ایک رسول ان میں بھیجا جو ان کو اس کی  
 يعلمهم الكتاب والحكمة۔“ (۱۸)  
 آیتیں پڑھ کر سنا تا ہے۔ اور انہیں پاک و صاف کرتا ہے  
 اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

نبوت کے ظاہری پہلو کا تعلق تلاوت آیات اور تعلیم و تشریح کتاب سے ہے اور اس کے باطنی پہلو کا تعلق تزکیہ  
 باطن سے ہے۔ جن نفوس قدسیہ کو فیضان نبوت کے ظاہری پہلو سے حصہ وافر ملا وہ مفسر، محدث، فقیہ اور مبلغ کے  
 ناموں سے موسوم ہوئے اور جنہیں اس کے ساتھ ہی فیضان نبوت کے باطنی پہلو سے بھی سرفراز فرمایا گیا۔ ان میں سے  
 بعض ابدالیت، قطبیت، غوثیت وغیرہ کے مناصب پر فائز ہوئے مگر ان سب کا سرچشمہ کتاب و سنت ہے۔  
 اللہ اور بندے کے درمیان علاقہ قائم رکھنے والی چیز، اعتصام بالکتاب و السنۃ ہے۔ یہی مدار نجات ہے۔  
 قبر سے حشر تک اتباع کتاب و سنت کے متعلق ہی سوال ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ محققین صوفیائے کرام نے شیخ یا پیر کے لئے  
 کتاب و سنت کا عالم اور عامل ہونا لازم قرار دیا ہے۔ (۱۹)

اگر کوئی شخص ہوا میں اڑتا آئے مگر اس کی عملی زندگی کتاب و سنت کے خلاف ہو تو وہ ولی اللہ نہیں بلکہ

جھوٹا ہے شعبہ باز ہے کیونکہ تعلق مع اللہ کے لئے اتباع سنت لازمی ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ

”قل ان كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم“ آپ ﷺ فرمادیتے کہ اگر اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے  
 اللہ۔ “ (۲۰)  
 ہو تو تم لوگ میری اتباع کرو۔ خدائے تعالیٰ تم سے محبت  
 کرنے لگیں گے۔“

اتباع سنت کا پورا پورا حق ان اللہ والوں نے ادا کیا جنہوں نے نبوت کے ظاہری اور باطنی دونوں پہلوؤں کی  
 اہمیت کو محسوس کیا اور ہمیشہ پیش نظر رکھا اور تبلیغ و اشاعت دین کو تزکیہ نفوس سے کبھی جدا نہ ہونے دیا۔ تمام کمالات اور

سارے مناصب صرف حضور ﷺ کی اتباع کی بدولت ہی حاصل ہوتے ہیں اور تصوف کا اصل سرمایہ اتباع سنت ہے۔

(۲۱)

## حقیقت تصوف مختلف مادہ ہائے اشتقاق کے حوالے سے

(۱) الصفاء:-

اگر تصوف کو ”صفا“ سے مشتق مانا جائے تو اس سے وہ طریق زندگی مراد ہے۔ جس کو اپنا کر قلب انسانی معصیت کی سیاہی اور اٹم وعدوان کی آلودگیوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے۔ آئینہ دل صاف و شفاف ہو کر فسق و فجور کے زنگ دور ہو جاتے ہیں۔ باطن سے غفلتوں اور نافرمانیوں کی ظلمتیں چھٹ جاتی ہیں اور نتیجتاً قلب صیقل ہو کر مہبط انوار الہی بن جاتا ہے۔ دل کی سیاہی اور آلودگی کا ذکر قرآن حکیم یوں کرتا ہے۔

”کلا بل ران علی قلوبہم ما کانوا یکسبوا ہرگز ایسا نہیں بلکہ (اصل وجہ ان کی تکذیب کی یہ ہے کہ) ان کے دلوں پر ان کے اعمال (بد) کا زنگ بیٹھ

ن۔“ (۲۲)

گیا ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پٹیؒ اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

والرین الغلبۃ یقال ران الخمر علی قلبہ و ”رین“ کا معنی ہے غلبہ (جیسے) کہا جاتا ہے شراب اس اذا غلب علیہ سکرہ والمعنی غلب علی کے دل پر غالب ہو گئی جب شراب غالب آجائے اور نشہ قلوبہم ظلمۃ ما کانوا یکسبون من المعاصی میں غرق کر دے تو معنی یہ ہوا کہ ان کے افعال بد کی وجہ صی حتی عمی قلوبہم عن التمییز بین الحق سے ان کے دلوں پر تاریکیاں چھا گئیں حتی کہ ان کے دل و الباطل۔ (۲۳)

حق و باطل کے مابین تمیز سے عاری ہو گئے۔

حضور ختمی مرتبت ﷺ کا ارشاد ہے کہ

المومن اذا اذنب كانت نكتة سواده في قلبه فان تاب و خزع و استغفر صقل قلبه منها وان زادت حتى تعلو قلبه فذلك الران الذي ذكر الله في كتابه كلا بل ران على قلوبهم ما كانوا يكسبون۔ رواه البغوی و کذا اخرج احمد والترمذی والنسائی وابن ماجه وابن حبان والحاکم۔ (۲۴)

جب کوئی مومن گناہ کا مرتکب ہو تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ مرتسم ہو جاتا ہے پھر اگر وہ توبہ کر لے گریہ وزاری کرے اور معافی مانگے تو اس کا دل اس سیاہی سے صقل ہو جاتا ہے اور اگر وہ معصیت میں زیادتی کرے تو اس پر اس سیاہی کا اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے یہی وہ زنگ اور سیاہی ہے جس کا ذکر اللہ نے اپنی کتاب میں اس طرح کیا کہ ہرگز ایسا نہیں بلکہ (اصل وجہ ان کی تکذیب کی یہ ہے کہ) ان کے دلوں پر ان کے اعمال بد کا زنگ بیٹھ گیا ہے۔

ارشاد گرامی کا مفہوم یہ ہے کہ مسلسل گناہ اور معصیت کبھی سے انسان کے دل پر ایک سیاہ نقطہ مرتسم ہو جاتا ہے اگر وہ معصیت سے باز نہ آئے اور برابر گناہ پہ گناہ کرتا چلا جائے تو اس کے لوح قلب پر سیاہی پھیلنے پھیلنے مکمل طور پر محیط ہو جاتی ہے جس کے باعث اس کا دل ظلمت کدہ بن جاتا ہے اس مرحلے پر فتنے و فجور میں مبتلا رہنے والا شخص اپنی خطاؤں اور سیاہ کاریوں پر احساس ندامت سے بھی عاری ہو جاتا ہے اور اس کے قلب و ضمیر پر موت طاری ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس جو شخص نیکی و بھلائی کا کام کرتا ہے اس کے دل پر نور کا ایک نقطہ نقش ہو جاتا ہے اور مسلسل نیکیاں کرنے کے باعث وہ نور پھلتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کا دل مصدر انوار بن جاتا ہے جو نہ صرف اس کی اپنی اقلیم بدن کو منور کر دیتا ہے بلکہ جو کوئی بھی صفائے قلب کے ساتھ اس کی معیت میں آ جاتا ہے منور ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو خود شعوری کی دولت سے بہرہ ور ہیں جنہیں دل کی ظلمت اور باطن کی سیاہی سے آگاہی میسر ہے اور وہ ہر لمحہ توبہ کے نور سے لوح دل کی تاریکیاں اجالوں میں بدلتے رہتے ہیں اور یہ سب کچھ اللہ کا فضل و کرم شامل ہوئے بغیر ممکن نہیں۔

پس صوفی وہ شخص ہے جس نے اپنے قلب و باطن کو گناہوں کی آلودگیوں سے پاک اور نفس کو زائل اخلاق کی تاریکیوں سے مبرا کر لیا ہو اور اس کے آئینہ دل پر معصیت کی پرچھائیاں بھی باقی نہ رہی ہوں۔ تزکیہ و تصفیہ باطن کی اس راہ کو تصوف کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جب صفا کا یہ معیار نصیب ہو جائے تو انسانی قلب و باطن ان کیفیات سے لذت آشنا ہو جاتا ہے۔ حضرت علی ہجویریؒ ارشاد فرماتے ہیں۔



انبیاء علیہم السلام کے صوف پہنے کے باب میں نبی اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ۔

مر بالصخرة من الروحاء سبعون نبيا حفاة ”روحاء“ چٹان کے پاس سے ستر انبیاء گزرے جن کے علیہم العباء یثومون البيت الحرام ۔ اوپر (اونی) چادریں تھیں پاؤں ننگے تھے اور بیت الحرام کی طرف جارہے تھے۔ (۲۸)

عوارف المعارف میں نبی اکرم ﷺ کا یہ قول مذکور ہے جب موسیٰ علیہ السلام اللہ سبحانہ سے ہم کلام ہوئے تو لباس صوف میں مبعوث ہوئے تھے۔

قال رسول الله ﷺ يوم كلم الله تعالى فرما رسول الله ﷺ نے جس دن موسیٰ علیہ السلام نے اللہ موسیٰ علیہ السلام کان علیہ جبة صوف و سبحانہ سے کلام کیا آپ کے بدن پر صوف کا جبہ صوف کا تہہ کمة من صوف نعلاہ من جلد حمار غیر بند، صوف کی چادر اور صوف کی ہی آستین تھی آپ کے نعلین مبارک گدھے کی برگئی کھال کے تھے۔ (۲۹)

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں۔

لقد ادرکت سبعین بدر یا کان لباسهم میں نے ستر بدری صحابہ کو دیکھا کہ ان کا لباس صوف کا تھا الصوف۔ (صوف کا لباس پہنے ہوئے تھے)

حضرت ابو ہریرہؓ اور فضالہ بن عبیدؓ کی روایت ہے کہ یہ بدری صحابہ فقر و فاقہ کے ہاتھوں اس قدر کمزور تھے کہ کانوا یخرون من الجوع حتی یحسبهم الا وہ بھوک سے نڈھال ہو کر گر پڑتے تھے حتیٰ کہ اہل عرب عراب مجانین و کان لباسهم الصوف حتی انہیں لگے سمجھنے لگے ان کا لباس صوف کا تھا حتیٰ کہ بعض ان بعضهم کان بعرق فی ثوبہ فیوجدی اپنے لباس میں پسینے سے شرا بور ہو جاتے اور جب بارش منه رانحة الضان اذا اصابه الغيث۔ پڑتی تو ان میں بھیڑ کی اون کی بو پائی جاتی تھی۔

حضرت سالم بن عبد اللہ بن عمرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ

یا کل الخبز و الزيتون زیتون کے تیل کے ساتھ روٹی

و یلبس الصوف۔ (۳۰) کھالیتے اور صوف کا لباس پہنتے۔

چنانچہ یہی وہ لباس تھا جسے تابعین اور تبع تابعین کے دور میں نیک نہاد بندگان حق نے سنت انبیاء و صحابہ کی پیروی میں ازراہ عجز و تواضع اور انکسار و تذلل اپنایا اور اسی لباس کی نسبت سے انہیں صوفیا کہا جانے لگا اور اس طریقہ



زندگی کو محبوب حقیقی کے ساتھ جی لو لگا کر اس کی محبت میں فنا ہو جانے سے تشکیل پایا، تصوف کا نام دیا جانے لگا۔ گویا لذات جسمانی سے کنارہ کشی اور علائق و نبوی سے دستبرداری کے ساتھ ساتھ محبوب حقیقی کی بارگاہ میں ظاہر و باطناً عجز و انکساری اور تواضع و تذلل سے عبارت طرز زندگی کو تصوف کا نام دیا گیا۔

صوفیاء نے اپنا تشخص ظاہری لباس کے حوالے سے قائم کیوں کیا؟

تصوف سراسر باطنی احوال اور روحانی کمالات سے عبارت ہے اور لفظ تصوف کے دیگر تمام مادہ ہائے اشتقاق انہی احوال و کمالات اور باطنی کیفیات پر دلالت کرتے ہیں لیکن یہ روحانی احوال اور کیفیات و کمالات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے بلکہ مسلسل تغیر پذیر ہوتے رہتے ہیں۔

اس لئے صوفیاء نے اپنا تشخص ایسے اسم کے حوالے سے قائم کرنا پسند نہ کیا جس کا مسمیٰ وہ گونا گوں کیفیات و کمالات ہیں جو ہر آن بدلتے رہتے ہیں بلکہ اپنے تشخص کی بنیاد اپنے مستقل معمول یعنی اوئی لباس کو بنایا۔ مزید برآں صوفیاء نے اپنا تشخص اپنے روحانی احوال اور باطنی کیفیات کے حوالے سے قائم کرنا اس لئے بھی پسند نہ کیا کہ وہ اپنے باطنی احوال و کیفیات کو چھپانا اپنا مقصود سمجھتے ہیں اور ان کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ ان کے اپنے باطنی احوال کسی پر منکشف نہ ہوں چنانچہ انہوں نے اپنا تشخص ایسے لفظ سے قائم کرنا پسند کیا جو ان کے ظاہری لباس سے متعلق و منسوب تھا۔ بالفاظ دیگر انہوں نے اپنی ظاہری علامت کو اپنے تشخص کی بنیاد قرار دیا اور ظاہری اعتبار سے اپنے تشخص پر دلالت کرنے والے لفظ پر اپنے باطنی احوال اور روحانی کیفیات کی پرچھائیاں تک نہ پڑنے دیں یہ ان کے کمال درجہ اخلاص اور صدق و صفا کی ایسی لطیف دلیل ہے جس کا اندازہ کوئی صاحب ذوق لطیف ہی کر سکتا ہے۔

## ۴۔ الصوف:

تصوف کو چوتھے مادہ اشتقاق ”الصوف“ سے مشتق مانا جائے تو لوح ذہن پر محبوب حقیقی سے محبت میں کامل یکسوئی اور انہماک و استغراق کا تصور ابھرتا ہے۔ اس مادہ اشتقاق کے اعتبار سے صوفیاء وہ خوش نصیب لوگ ہیں جن کو حضور حق سے یکسوئی کی دولت عطا کر دی گئی ہو اور جو ہمہ وقت اپنے رب سے عشق و شیفنگی کی کیفیت جذب میں محمور رہے ہوں جن کے لوح قلب سے ہر غیر کا نقش مٹ چکا ہو اور جن کے نہاں خانہ دل میں سوائے محبوب حقیقی کے کسی غیر کے تصور تک کا گزر محال ہو۔

غور کیا جائے تو تصوف حقیقت انسانی کی تکمیل اور امتیاز انسانیت کا مقام رفیع ہے۔

## تصوف اور انسان کی حقیقت۔۔۔۔۔ ایک لطیف نکتہ

ماہرین لغت میں سے بعض کے نزدیک انسان انس سے مشتق ہے یعنی دوستی جسے کسی سے انس ہو جائے جبکہ بعض نے لفظ انسان کا مادہ نسی بیان کیا ہے اسی سے نسیان یعنی بھول مراد ہے اسی لئے کہا جاتا ہے۔ ”الانسان مرکب من الخطاء والنسیان“ انسان خطا اور نسیان سے مرکب ہے اس بنا پر بھول چوک اور خطا کا عنصر انسان کی سرشت اور خمیر میں شامل ہے۔

درحقیقت اپنی خلقت کے اعتبار سے انسان پر ان دونوں معنوں کا اطلاق ہوتا ہے یعنی انسان ”انس اور نسیان“ دونوں ہی سے عبارت ہے۔ انس کے درجہ کمال تک پہنچنے کا لازمی نتیجہ نسیان ہے یعنی انسان جب کسی سے مانوس ہو جاتا ہے تو انس رفتہ رفتہ محبت و شفقتگی کا روپ دھار لیتا ہے اور اس کے خانہ دل میں ہمہ وقت یاد محبوب ہی گھر کئے رہتی ہے۔ پھر محبت کی بڑھتی ہوئی شدت جب انہماک اور استغراق کے مراحل سے گزرتی ہے تو محبت فنا فی المحبوب ہو جاتا ہے اس مقام پر غیر کا نقش اس کی لوح دل سے محو ہو جاتا ہے اور وہ اپنے محبوب کی یاد میں اس طرح سرشار و خود فراموش رہنے لگتا ہے کہ اسے ہر سو سوائے محبوب کے کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ گویا اس کی نظر میں محبوب کا خیر کلیتاً معدوم اور کالعدم ہو جاتا ہے۔ تصوف انسان کو فنا فی اللہ کی اسی منزل سے ہمکنار کر دینے کا نام ہے غور کیا جائے تو تصوف حقیقت انسانی کے حوالے سے جوہر انسانیت کی تکمیل اور امتیاز انسانیت کا نقطہ کمال ہے۔

## ایک ضروری وضاحت:

یہاں ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا مکمل انسان صرف وہی ہے جو محبوب حقیقی سے غایت درجہ مانوس اور غیر اللہ سے یکسر دست کش ہو جائے اور ہمہ وقت اسی کے ذکر و فکر میں یوں لگن رہنے لگے کہ بیوی بچوں کے حقوق اور دیگر معاشرتی و سماجی ذمہ داریوں سے کلیتاً دستبردار ہو جائے۔ نہیں نہیں! ایسا تصور تعلیمات اسلامی سے بے بہرہ ہونے کی دلیل ہے۔ اسلام میں انسان کامل سے مراد وہ انسان ہے جو محبوب حقیقی کی یاد میں رہتے ہوئے بھی اس کی مخلوق سے اپنا علاقہ و تعلق برقرار رکھے اور اس کے ساتھ تعلقات میں اپنے محبوب ہی کی پسند و ناپسند اور امر و نہی کا خیال رکھے اور زندگی کے تمام امور و معاملات میں اس کے ہر حکم کو بدل و جان بجالائے۔ یعنی نہ محبوب کو بھولے نہ اس کے ظلم کو اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو ایسے دعوائے محبت کو سوائے دجل و فریب اور منافقت کے اور کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔ دنیا میں رہتے ہوئے معاملات دنیوی میں ادا مروا ہی کی بالا التزام پابندی از روئے شریعت، محبوب حقیقی کی محبت کا اولین تقاضا اور تصوف کا

نصب العین ہے گویا تصوف سے مراد وہ طریق زندگی ہے جس میں انسان اللہ کی محبت میں اس قدر منہمک اور فنا ہو جائے کہ اس کے حکم کی سرتابی کا کوئی خیال بھولے سے بھی اس کے دل میں نہ آئے اور اضطراری یا غیر ارادی طور پر بھی اس کا قدم جادہ محبت و اطاعت سے ہٹنے نہ پائے۔

## ۵۔ صفہ :

تصوف کو اگر صفہ سے مشتق مانا جائے تو شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اور دیگر علماء و مورخین کے مطابق اس کا رشتہ اصحاب صفہ سے جا ملتا ہے جو مرنی کائنات رحمت دو عالم ﷺ سے براہ راست تربیت یافتہ جماعت تھی۔ جن کی تعداد چار سو تک بیان کی جاتی ہے۔ یہ لوگ گھریار اور بیوی بچوں کے جھنجٹ سے آزاد تھے اور شب و روز بارگاہ مصطفوی سے روحانی تربیت حاصل کرنے کیلئے مسجد نبوی کے قریب ایک چبوترے پر قیام پذیر رہتے تھے۔ چونکہ چبوترے کو عربی زبان میں صفہ کہا جاتا ہے اس لئے اس چبوترے پر قیام کرنے والے اصحاب صفہ کے نام سے مشہور ہوئے۔

اصحاب صفہ گواہل و عیال اور حصول معاش جیسی ذمہ داریوں سے آزاد تھے لیکن وہ تارک الدنیا ہرگز نہ تھے رحمت دو عالم ﷺ کے حکم سے وہ مختلف النوع ذمہ داریاں ادا کرتے اور محنت و مشقت کے متعدد کام کرتے، غزوات میں جہاد کے لئے حضور ﷺ کے دیگر صحابہ کے ساتھ شانہ بشانہ شریک ہوتے، فراغت کے اوقات مسجد نبوی میں گزارتے اور حضور ختمی مرتبت ﷺ کی ظاہری تربیت، روحانی فیض اور باطنی توجہات سے متمتع ہو کر تزکیہ نفس، تصفیہ باطن اور روحانی بالیدگی کا سامان حاصل کرتے تھے۔ حضور ﷺ کی نگاہ کرامت اثر اور باطنی توجہات کے فیضان نے انہیں باطنی کمالات کے رفیع الشان منازل پر فائز کر دیا تھا۔ ان اصحاب صفہ کے فقر و فاقہ اور مجاہدہ نفس کا یہ عالم تھا کہ مسلسل روزے رکھتے اور کئی کئی دن صرف کھجوریں کھا کر گزارہ کرتے بھوک اور پیاس سے نڈھال ہو جاتے لیکن صبر و شکیبائی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پاتا۔ حضور اکرم ﷺ کی حیات مقدسہ پر اختیاری فقر کا جو رنگ غالب تھا اصحاب صفہ بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ

لقد رايت سبعين من اهل الصفة	میں نے ستر اصحاب صفہ کو دیکھا کہ
يصلون في ثوب واحد، منهم من	وہ ایک ہی قسم کے لباس میں نماز
لا يلبع ركبتيه فاذا رقع احدهم	پڑھتے کسی کا لباس ان کے گھٹنوں
قبض يديه ان تبدو عورته وقال	تک نہ پہنچتا اور جب وہ رکوع کرتا

بعض اہل الصفة جننا جماعة الى  
رسول الله ﷺ وقلنا يا رسول الله ﷺ  
احرق بطوننا التمر فسمع بذلك  
رسول الله ﷺ فصعد المنبر ثم  
قال ما بال اقوام يقولون احرق بطوننا  
التمر اما علمتم ان هذا التمر هو  
طعام اهل المدينة وقد واسونا به  
وواسيناكم مما واسونا به والذي  
نفس محمد بيده ان منذ شهرين لم  
يرتفع من بيت رسول الله ﷺ  
دخان للخبز وليس لهم الا  
الاسودان الماء والتمر .  
(۳۱)

تو اپنے لباس کو مضبوطی سے پکڑ لیتا  
مبادا کہ اس کی شرمگاہ ننگی ہو جائے اور  
بعض اہل صفہ کا قول ہے کہ ہم گروہ  
کی صورت میں بارگاہ نبوی میں حاضر  
ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ  
کھجور نے ہمارے پیٹوں میں سوزش  
پیدا کر دی۔ آپ ﷺ منبر پر  
تشریف فرما ہوئے اور فرمایا کیا حال  
ہے ان لوگوں کا جو کہتے ہیں کہ  
کھجور نے ہمارے پیٹ جلادیئے ہیں  
کیا تم جانتے نہیں کہ یہی کھجور ہے  
جو کہ کھانا ہے اہل مدینہ کا اور اسی  
کے ساتھ انہوں نے ہماری  
غنمخواری کی اور اسی کے ساتھ ہم  
نے تمہاری غنمخواری کی اور قسم  
ہے اس ذات کی جس کے قبضہ  
قدرت میں محمد ﷺ کی جان ہے  
کہ دو ماہ تک اللہ کے رسول ﷺ  
کے گھر سے دھواں نہیں اٹھا اور  
ان کے لئے سوائے دو سیاہ  
چیزوں پانی اور کھجور کے کچھ نہیں۔  
(یہ بات تعلیم کے لئے کہی)

نبی اکرم ﷺ نے بر بنائے مصلحت یہ بات ظاہر فرمادی تاکہ ہر کوئی جان لے۔ اگر قربیت پانے والے مشقت کے

جاں گسل مرحلوں سے گزر رہے ہیں تو تربیت دینے والا بھی ان سے بدرجہا زیادہ سخت کیفیتوں سے گزرتا ہے۔  
اصحاب صفہ کو فاقہ کے باعث جو قابل رشک مقام بارگاہ الہیہ میں حاصل ہوا اس پر حضرت ابن عباسؓ کی یہ  
روایت دلالت کرتی ہے۔

وقف رسول اللہ ﷺ یوما علی اہل الصفة  
فرای فقرہم وجہدہم و طیب قلوبہم فقال  
ابشروا یا اصحاب الصفة فمن بقى منکم علی  
العت الذی انتم علیہ الیوم راضیا بما ہو فیہ  
فانہ من رفقاءئ یوم القیامہ (۳۲)  
ایک روز رسول اللہ ﷺ اہل صفہ کے درمیان کھڑے  
ہوئے اور ان کے فقر، جان کنی اور سرور قلب کو دیکھا  
تو فرمایا اے اصحاب صفہ! خوش ہو جاؤ کہ جو تم میں سے  
موجود صفات پر قائم رہا اور اسی حال پر راضی رہا وہ یوم  
قیامت میرے رفقاء میں سے ہوگا۔

قرآن حکیم میں ان نفوس قدسیہ کے بارے میں یوں ارشاد ہوتا ہے۔

للفقر اء الذین احصروا فی سبیل اللہ (اور جو خرچ کرتا ہے) ان فقراء پر جو اللہ کی راہ میں اس  
لا یستطیعون ضربا فی الارض۔ (۳۳) قدر مصروف ہیں کہ زمین میں معاشی جدوجہد کی استطاعت  
(فرصت) بھی نہیں رکھتے۔

یہ وہ اصحاب صفہ تھے جن کے قلب و باطن ”و یزکیہم“ کے کاملاً مصداق بن کر مشاغل حیات اور علاق  
دنوی سے کٹ کر کمال درجہ اخلاص کے ساتھ اللہ کی محبت میں مستغرق ہو گئے تھے چنانچہ وہ بندگان خدا جنہوں نے ان  
نفوس قدسیہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے لذات دنیوی سے کنارہ کش ہو کر محبوب حقیقی کی رضا ہی کو اپنا مقصود و مطلوب ٹھہرا  
کر اسی کے مکھڑے کے طلب گار بن گئے، صوفیا کہلائے اور ان کا طریق زندگی تصوف کے نام سے موسوم ہوا۔

## ۶۔ الصف:

تصوف کو اگر الصف سے مشتق قرار دیا جائے تو تصوف کی راہ کے سالک وہ صوفیا اور سعادت مند  
نفوس مراد ہوں گے جن کے دل بارگاہ ایزوی میں صف اول میں حاضر ہیں۔ یہی وہ پاک نہاد اور روشن ضمیر لوگ ہیں جن  
کے دل دنیا و مافیہا کی محبت سے بے نیاز ہیں اور ان کا رشتہ علاقہ دنیوی سے اس حد تک منقطع ہو چکا ہے کہ وہ مدام اپنے  
رب کے حضور دیدار محبوب کے طالب رہتے ہیں۔ اور خشوع و خضوع کے ساتھ کیفیات عشق و محبت کا لطف اٹھاتے  
ہوئے دیدار محبوب کے طالب رہتے ہیں۔ اس اعتبار سے بندے کا ہوا و ہوس اور علاقہ دنیوی کی صفیں چیرتے ہوئے  
حضور صمدیت میں پہلی صف میں حاضر ہو جانے کا نام تصوف ہے۔

## تصوف کے بارے میں

### حضرت شیخ سیدنا عبدالقادر جیلانی کے نکات عجیبہ

حضرت عبدالقادر جیلانی حروف تصوف کے حوالے سے تصوف کی حقیقت کو یوں عیاں کرتے ہیں۔

ولم یسمو اهل التصوف الاتصفیة باطنهم صوفیائے کرام کا اہل تصوف کے نام سے موسوم ہونا اس  
بنور المعرفة والتوحید او لانہم وجہ سے ہے کہ وہ نور معرفت اور توحید کے ذریعے

انتسبوا لا صاحب الصفة او للبسم الصوف اپنے باطن کو جملہ آلائشوں سے پاک صاف کرتے ہیں یا  
للمبتدی صوف الغنم و للمتوسط صوف المعز اس لئے اصحاب صفہ کی طرف منسوب ہیں کہ صوف  
و للمنتہی صوف المرعر و هو صوف المرقع (اون) پہننے کے اعتبار سے (کیونکہ سلسلہ تصوف میں)

وکذا حالاتہم فی الباطن علی حسب مبتدی (جو تصوف کے ابتدائی مراحل میں ہو) بکری کا  
مراتب احوالہم وکذا بالاطعمة والمطعم و کھر در صوف (لباس) پہننے ہیں متوسط (اوسط درجے کا  
المشرب قال صاحب التفسیر المجمع یلیق صوفی) بکری کا صوف جو نہ زیادہ نرم ہو نہ زیادہ سخت اور  
باهل الزهد کل خشن من الملبس والمطعم منتهی (کامل جو تصوف کے مدارج طے کر چکا ہو) نرم اون  
والمشرب وباهل المعرفة کل لبن منها فان کا لباس یعنی صوف مرقع (صوف کا لباس جس میں پیوند  
انزال الناس منازلہم من السنة لی لا تتعدی احد لگے ہوں) پہننے ہیں سی طرح باطن میں ان کے احوال ان کے  
طورہ لانہم فی الصف الاول فی الحضرة مراتب کے حسب حال

الاحدية فلفظ التصوف اربعة احرف تاء.

وصاد. وواو. وفاء. (۳۳)

ہوتے ہیں اور ان کا کھانا پینا بھی ان کے حالات اور مراتب کے مطابق ہوتا ہے۔ صاحب تفسیر مجمع نے لکھا ہے اہل زہد کو چاہئے کہ وہ کھر در لباس پہنیں اور جھوٹا موٹا کھائیں۔ اہل معرفت بہتر لباس پہنیں اور بہتر کھانا کھائیں، لوگوں کا اپنی منازل میں اپنے حسب حال رہنا سہنا سنت نبوی ﷺ کے مطابق ہو۔ (تاکہ کوئی اپنی حد سے تجاوز نہ کرے) کیونکہ وہ (یعنی اہل معرفت) بارگاہ ایزدی میں اعلیٰ مراتب والوں میں سے ہیں لفظ تصوف چار حروف پر مشتمل ہے۔

فالتاء:

من التوبة وهو على وجهين توبة الظاهر وتوبة (ت) سے مراد توبہ ہے اور وہ دو طرح کی ہے توبہ ظاہری الباطن فتوبة الظاهرية فهي ان يرجع بجميع اور توبہ باطنی۔ توبہ ظاہری یہ ہے کہ انسان قولاً وفعلاً اعضائه الظاهرية من الذنوب الذمانم الى اپنے تمام اعضائے ظاہری کو گناہوں اور برائیوں سے ہٹا الطاعات ومن المخالفات الى الموافقات کراطاعت کی راہ اختیار کرے نیز خلاف شریعت قولاً وفعلاً واما التوبة الباطنية فهي ان يرجع اعمال سے توبہ کر کے اس کے احکام کے مطابق عمل الى الموافقات بتصفية القلب فاذا حصل کرے۔ توبہ باطنی یہ ہے کہ انسان دل کو آلائشوں سے تبدیل الذميمة بالحميدة فقدتم مقام التاء۔ پاک رکھے اور شریعت کے موافق اعمال صالحہ کی طرف رجوع کرے پھر جب برائی نیکی سے بدل جائے تو ”ت“ کا مقام مکمل ہو گیا (یعنی اس کو کامل توبہ نصیب ہو گئی)

والصاد:-

من الصفوا وهو ايضا على وجهين صفاء القلب ص سے مراد صفائی ہے اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ۱۔ 19 صفاء السرفصاء القلب ان يصفى قلبه من کی صفائی ۲۔ مقام سر کی صفائی۔ قلب کی صفائی یہ ہے الكد ورات البشرية مثل العلائق التي تحصل کہ دل ان بشری کدورتوں اور آلائشوں سے پاک ہو فی القلب من كثرة الاكل و الشرب و المنام جائے جو عموماً دل کے اندر پائی جاتی ہیں مثلاً بکثرت و الکلام و الملاحظات الدنیویہ مثل حب زیادة کھانے پینے، سونے اور گفتگو کرنے کی خواہشات، الکسب و زیادة الجماع و زیادة محبة اولاد دنیوی رغبتیں مثلاً زیادة کسب اور کثرت جماع اور اپنے واهله و نحو ذالك و تصفية القلب من هذه اہل و عیال کی حد سے زیادة محبت وغیرہ ان مذکورہ عادات الخصال المذكورة لا يحصل الا بملازمة ذکر ذمیرہ سے دل کو پاک و صاف کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اللہ تعالیٰ فی التلقین جہراً فی الابتداء الی ان کہ ابتدا میں شیخ کامل کی تلقین سے ذکر الہی بالجہر اور یبلغ مقام الخفیہ کما قال اللہ تعالیٰ انما بالالتزام کیا جائے حتی کہ مقام ذکر خفی ہو جائے جیسا کہ المومنون الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبہم ای ارشاد باری تعالیٰ ہے ایمان والے وہی ہیں کہ جب اللہ کا خشیت والخشیة لا تكون الا بعد انتباه القلب ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں اور عظمت الہی من نوم الغفلة و تصفیہہ فینقش ببسبب کا خوف دل میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب قلب غفلت فیہ صورة الغیب من الخیر و الشر کما قال کی نیند سے بیدار ہو جائے اور آئینہ دل صیقل و نہ کے علیہ الصلوٰۃ والسلام العالم ینقش و العارف بعد اس قدر شفاف ہو جائے کہ اس میں خیر و شر ایک غیبی یصقل و اما صفاء السر فهو بالا جتناہ صورت میں منقش ہو جائے (یعنی نیکی و بدی صاف نظر عما سوی اللہ تعالیٰ و محبتہ بملازمة اسماء آنے لگے) چنانچہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”عالم نقش و نگار التوحید بلسان السرفی سرہ فاذا حصل لہ کرتا ہے اور عارف صیقل کرتا ہے“ یعنی عالم خیر و شر کی هذه الصفة فقد تم مقام الصاد.

عارف دلوں کے زنگ اتارتا ہے مقام سر کی صفائی اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے روگردانی اور اس کی محبت اور اسماء توحید کا زبان (باطنی زبان) سے دائمی ذکر کرنے سے حاصل ہوتی ہے پس انسان جب اس صفت کا حامل ہو جاتا ہے تو مقام ”ص“ مکمل ہو جاتا ہے۔



## واو:-

واما الواو فهو من الولاية وهي ترتب على "و" سے مراد ولایت ہے یہ ایک مرتبہ ہے جو تصفیہ التصفیہ کما قال اللہ تبارک وتعالیٰ الا ان اولیاء (صفائی قلب) کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد اللہ لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون - لہم باری تعالیٰ ہے خبردار بے شک اللہ کے دوستوں کے لئے البشری فی الحیوة الدنیا وفی الآخرة و نتیجہ نہ کوئی خوف ہے اور نہ کوئی غم ان کے لئے دنیا کی زندگی الولاية ان یتخلق باخلاق اللہ تبارک و تعالیٰ میں اور آخرت میں خوش خبری ہے۔ ولایت کا حاصل یہ کما قال علیہ ا لصلوة والسلام تخلقوا باخلاق ہے کہ انسان اپنے اندر اخلاق الہیہ پیدا کرے جیسا کہ اللہ تعالیٰ و یلبس بخلع صفات البشرية کما حضور ﷺ نے فرمایا اپنے اندر خدائی اخلاق پیدا قال تبارک و تعالیٰ اذا احببت عبداً کنت له کر اور جامع صفات بشریت اتار کر صفات الہی کا لباس سمعاً و بصرًا و لساناً و یذا و رجلاً بیسمع و بی پہنوں۔ حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب میں کسی بیصرو بیینطق و بی یبطش و بی یمشی بندے کو دوست رکھتا ہوں تو میں اس کے کان، آنکھ، فہم بوا کم سوی اللہ تبارک و تعالیٰ کما قال زبان، ہاتھ اور پاؤں بن جاتا ہوں پھر وہ میرے ہی واسطے جل و علاقل جاء الحق و زهق الباطل ان سے سنتا، دیکھتا، بولتا، پکڑتا اور چلتا ہے، ماسوا اللہ سے اپنے الباطل کان زهوا فحصل مقام الواو باطن کو پاک صاف کرو (جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اے حبیب پاک ﷺ فرما دیجئے حق آیا اور باطل کو مٹا ہی تھا۔ پس مقام "و" حاصل ہو گیا۔

## الفاء:-

"ف" سے مراد فنا فی اللہ ہرنا ہے

حب صفات بشری

سب اسبیریہ یعنی صعب الہ حد یہ  
 وهو سبحانه لا یفنی ولا یزول فبقی العبد الفانی  
 مع الرب الباقی یرضائه و یرقی القلب  
 الفانی مع السر الباقی ونظیرہ کما قال اللہ  
 تبارک وتعالیٰ کل شی ہالک الا وجہہ  
 یحتمل ان بالرضاء الی ما یوجہ الیہ من الاعمال  
 الصالحة لوجہہ و رضائہ فیبقی المرضی مع  
 الراضی و نتیجۃ العمل الصالح حیوۃ حقیقۃ  
 الانسان السمی بطفل المعانی کما قال اللہ  
 تبارک وتعالیٰ الیہ یصعد الکلم الطیب والعمل  
 الصالح یرفعہ فکل عمل یکون بغير اللہ تعالیٰ  
 فیہ شرکۃ فهو ہالک لعاملہ فاذا تم الفناء  
 لیہ حصل البقاء فی عالم القربۃ کما قال اللہ  
 تعالیٰ فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر وهو  
 مقام الا نبیاء والا ولیاء فی عالم اللاہوت  
 کما قال اللہ تبارک وتعالیٰ واللہ مع الصادقین  
 فالحدث اذا فترن بالقدیم لم یبق لہ وجود فاذا  
 تم الفقر یقی الصوفی مع الحق سبحانه و  
 تعالیٰ ابدًا کما قال اللہ تبارک وتعالیٰ  
 اصحاب الجنة ہم فیہا خالدون و کما قال  
 اللہ تبارک وتعالیٰ واللہ مع الصابرين۔ (۳۵)

تتا ہو جائی ہیں وصفات باری تعالیٰ باقی رہ جاتی ہیں چو بندہ  
 اس ذات پاک کو نہ زوال ہے اور نہ ہی فنا۔ لہذا عبد  
 فانی کو اس غیر فانی ذات کے ساتھ اور اس کی پسندیدگی  
 اور قبولیت سے باقی باللہ کامر تبہ حاصل ہو جاتا ہے اور  
 قلب فانی کو سر باقی کے ساتھ بقا حاصل ہو جاتی ہے اس  
 کی مثال جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا۔ اس کی  
 ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے لہذا اس کی ذات اور  
 خوشنودی کے لئے اعمال صالحہ کی کوفت برداشت  
 کرے۔ جب بندہ اللہ تعالیٰ کی رضا پالیتا ہے تو اس  
 برگزید ہو پسندیدہ بندے کو راضی ہونے والی ذات  
 (یعنی اللہ تعالیٰ) کے ساتھ بقا حاصل ہو جاتی ہے اور  
 اعمال صالحہ کا حاصل یہ ہے کہ وہ انسان حقیقی (جو اس  
 کے باطن کے اندر ہے) جسے طفل المعانی کہتے ہیں  
 زندہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے اسی  
 طرف چوہتا ہے پاکیزہ کلام اور جو نیک کام ہے وہ اسے  
 بلند کرتا ہے ہر عمل جس میں شرکت غیر اللہ ہو۔  
 عامل کی ہلاکت کا باعث ہے مکمل فنا کے بعد عالم قرب  
 میں بقا حاصل ہو جاتی ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا  
 ہے سچ کی مجلس میں قدرت والے بادشاہ کے حضور یعنی  
 اس کی بارگاہ کے مقرب ہیں اور یہ مقام عالم لاہوت میں  
 انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کے لئے مخصوص ہے  
 جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے اللہ تعالیٰ صادقوں کے  
 ساتھ ہے پس حادث جب قدیم سے ملت ہے تو اس کا اپنا  
 وجود باقی نہیں رہتا جب فقر مکمل ہو جاتا ہے تو صوفی کو  
 ہمیشہ کے لئے بقا بالحق کا مقام حاصل ہو جاتا ہے جیسا کہ  
 اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اہل جنت ہمیشہ اس میں رہیں گے  
 نیز فرمایا اللہ تعالیٰ صابروں کے ساتھ ہے۔

## تصوف کا مفہوم (حروف تصوف کی روشنی میں)

جیسا کہ قبل ازیں حضور غوث الاعظم سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے حوالے سے لفظ ”تصوف“ کے حروف کی روشنی میں تصوف کے معانی و معارف بیان ہوئے۔ یہاں عربی عبارت نقل کئے بغیر ہم اس سے حاصل شدہ نکات اور کچھ ضروری عنوانات کے تحت دوبارہ یہی گفتگو کریں گے تاکہ مقصود کھل کر سامنے آسکے۔

آپ کے نزدیک تصوف کی تمام تر تعلیمات کا نچوڑ لفظ تصوف کے چار حروف میں موجود ہے۔ سلوک، شریعت، طریقت و حقیقت کی ساری منزلیں، ان کے سارے آداب ان چار حروف سے ماخوذ تصورات کی تفصیل ہیں۔ ان چاروں حروف کا مفہوم سمجھ لیا جائے تو سارے تصوف کا ماحصل معلوم ہو جاتا ہے تو ایسے غوث الثقلین کے ارشادات کی روشنی میں ان حروف کے معانی کا جائزہ لیں تاکہ حقیقت تصوف نکھر کر ہمارے سامنے آجائے۔ پہلا حرف ”ت“:

آپ فرماتے ہیں کہ لفظ تصوف کا پہلا حرف ”ت“ توبہ سے لیا گیا ہے اور توبہ گناہوں کی آلودگیوں سے اللہ رب العزت کے احکامات کی اطاعت و فرمانبرداری کی طرف ظاہری اور باطنی طور پر رجوع کرنے کو کہتے ہیں۔

چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔

وتوبوا الى الله جميعا ايها المومنون لعلكم تملكون  
تفلحون۔ (۳۶)

اس آیت مبارکہ میں رب ذوالجلال نے فلاح دارین کو توبہ پر منحصر قرار دیا ہے کہ اے گروہ مومنین! تم سب کے سب اللہ کی طرف لوٹ آؤ تاکہ اس کے ذریعے سے تمہیں دنیا و آخرت کی فوز و فلاح نصیب ہو جائے۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوا۔

يا ايها الذين امنوا اتوبوا الى الله توبة  
نصوحا۔ (۳۷)

باقی نہ رہے۔

مسلمانوں کو اللہ کی بارگاہ میں سچی اور خالص توبہ کرنے کا حکم ہے کہ ایسی صاف ستھری توبہ کہ جیسے پانی سے گندے کپڑے کی میل دھل جاتی ہے اسی طرح ندامت کے آنسوؤں سے تمام گناہوں کی سیاہیاں دھل جاتی ہیں اور بندہ مومن کا دل اس کے ذریعے اس طرح پاک صاف اور ہر قسم کے زنگ سے مجلی و مصفیٰ ہو جاتا ہے کہ معصیت و نافرمانی کا کوئی داغ دل پر باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا۔

التائب من الذنب کمن لا ذنب له۔ (۳۸) گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کی طرح ہو جاتا ہے جس نے کبھی کوئی گناہ نہیں کیا۔

گویا توبہ ایسا پانی ہے جو قلب و باطن کو گناہوں سے اس طرح دھو کر پاک صاف کر دیتا ہے کہ گناہ کا اثر ایک ذرہ برابر بھی باقی نہیں رہتا یہاں تصوف کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس قدر مجرب و موثر توبہ اس کا نقطہ آغاز ہے۔

حضرت دات گنج بخش علی ہجویریؒ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے گناہ نہ کرنے کا عزم کیا پھر غلطی ہو گئی اور توبہ ٹوٹ گئی اس نے دوبارہ توبہ کی کچھ عرصہ بعد پھر توبہ پر قائم نہ رہ سکا اور توبہ توڑ دی۔ تیسری بار پھر توبہ کی کچھ عرصہ بعد پھر اس کے عزم میں کمزوری آ گئی اور توبہ توڑ دی اس طرح توبہ کرتے اور توبہ توڑتے عرصہ گزر گیا حتیٰ کہ ستر مرتبہ توبہ کی اور توڑ دی اس کے بعد ایک دفعہ تنہائی اور خلوت میں بیٹھا تھا کہ اسے توبہ کا خیال آ گیا اور اللہ کی بارگاہ سے اسے شرم و حیا آ گئی لیکن سوچنے لگا کہ میں نے ستر بار توبہ کر کے توڑ دی۔ خدا جانے اب وہ میری توبہ قبول بھی کرے گا یا نہیں۔

اس مایوسی کا خیال آنا تھا کہ غیب سے آواز آئی۔ اے میرے بندے مایوس نہ ہو۔ یہ تیرا ظرف تھا کہ تو ستر بار توبہ کرتا رہا اور توبہ توڑتا رہا۔ مگر میرے ظرف کو دیکھ کہ تو نے تو صرف ستر بار توبہ توڑ دی اگر اس سے کہیں زیادہ مرتبہ توبہ کر کے توڑ دے گا تو پھر بھی توبہ قبول کروں گا۔

صوفیاء کرام کے نزدیک راہ حق کے طالبوں کا پہلا قدم ہی توبہ ہے اگر آپ تصوف کی راہ پر چلنا چاہیں، سلوک کی منزلوں کو طے کرنے کا ارادہ کریں اور اپنے خالق حقیقی سے ٹوٹنا ہو ا تعلق جوڑنے کے لئے اللہ کی راہ کا مسافر بننا چاہیں تو بارگاہ خداوندی میں صدق و اخلاص کے ساتھ توبہ ہی اس سفر کا نقطہ آغاز ہے۔

**توبہ کے مدارج ثلاثہ باعتبار محرمات:-**

توبہ کے تین محرمات ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر توبہ کے تین درجے بنتے ہیں اور انہی محرمات توبہ کی وجہ سے

تصوف کی دنیا میں چلنے والوں کو مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے اور اس کی بنیاد پر ہی ان کا مقام و مرتبہ متعین ہوتا ہے۔

## ۱۔ عذاب آخرت کے خوف کی وجہ سے توبہ (عوام الناس کی توبہ)

توبہ کی ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ بندہ جب گناہ کر بیٹھتا ہے تو اس کے نیچے میں عذاب آخرت کا خوف اس کے دل پر غالب آجاتا ہے اور خوف کا یہ تصور اس کی توبہ کا اس طرح محرک بن جاتا ہے کہ وہ بارگاہ رب ذوالجلال میں اس خوف کی وجہ سے اپنے اعمال پر نادم ہو کر توبہ کرتا ہے۔ یہ توبہ کا پہلا درجہ ہے اور ایسی توبہ کرنے والے کو تائب کہا جاتا ہے جس کے متعلق حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ”التائب من الذنب کمن لا ذنب له“ کہ جو گناہوں سے تائب ہو جاتا ہے وہ ایسا پاک و صاف ہو جاتا ہے جیسے اس نے گناہ کا ارتکاب ہی نہ کیا تھا۔ توبہ کی یہ صورت عوام کی توبہ کہلاتی ہے۔

## ۲۔ اجر و ثواب سے محرومی کے خوف کی وجہ سے توبہ (خواص کی توبہ)

توبہ اس پہلے درجے تک محدود ہو کر نہ رہ جائے بلکہ اس کا درجہ بلند ہو۔ توبہ کی دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ اللہ کی نعمتوں اور اس کی بارگاہ سے اور قربت کے مقام حاصل ہونے والے اجر و ثواب اور مرتبہ و مقام کا تصور دل پر غالب آجائے کہ اگر میں اسی حالت پر قائم رہا تو اللہ کی نعمتوں سے محروم کر دیا جاؤں گا۔ بلند تر اجر و ثواب سے محرومی اور مزید طلب نعمت کے خیال کا غلبہ اس کے موجودہ مرتبہ و مقام پر قائم رہنے پر ندامت کا سبب بن جاتا ہے اور اس موجودہ مقام پر قائم رہنے سے توبہ کرتا ہے تو جو شخص اس اخروی انعام و اکرام کو چاہے جس کا ذکر اللہ رب العزت نے جانجا اپنے بندوں کے لئے فرمایا ہے۔ ان نعمتوں کو مد نظر رکھے جو حکم الحاکمین نے اپنی بندگی کرنے والوں اور اس کی بارگاہ میں جھکنے والوں کے لئے مختص فرمائی ہیں۔ اس بلند و بالا مقام کو مد نظر رکھے جسے خالق حقیقی نے گناہوں سے رجوع کرنے والوں کے لئے اجر کے طور پر عطا فرمانے کو اپنے ذمہ کرم پر لیا ہوا ہے اور وہ اس اجر و ثواب انعام و اکرام اور نعمتوں کے حصول کے محرک کی وجہ سے اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرے تو توبہ کی اس شکل کو ”انابت“ کہتے ہیں اور ایسی توبہ کرنے والا شخص منیب کہلاتا ہے۔ چنانچہ ایسے ہی شخص کے بارے میں اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا۔

من خشى الرحمن بالغيب وجاء بقلب منيبين جو اللہ سے بن دیکھے ڈر اور رجوع کرنے والا دل لے کر  
ادخلوها بسلم ذالك يوم الخلود۔  
آیا اس کو حکم ہو گا۔ داخل ہو جاؤ اس جنت میں سلامتی

کے ساتھ۔ وہ ہمیشہ رہنے کا دن ہے۔ (۳۹)

### ۳۔ خالص رضائے الہی کے حصول کی وجہ سے توبہ (انحصار الخواص کی توبہ)

تصوف کی ”تا“ جس توبہ کی طرف راہنمائی کرتی ہے وہ فقط یہی مذکورہ بالا توبہ کی دو صورتیں نہیں بلکہ  
اس سے بھی آگے مزید قدم بڑھانے کی تحریک پیدا کرتی ہے تصوف بندہ مومن کو صرف تائب و نسیب کے درجے پر  
محدود نہیں رکھنا چاہتا بلکہ اس سے مزید آگے بڑھنے کا داعیہ پیدا کرتا ہے کہ توبہ کا کمال فقط انابت کے مقام کو  
پا کر نسیب بن جانے میں ہی نہیں ہے۔ اللہ کے عذاب کے خوف اور اخروی نعمتوں کے حصول کے محرک کی وجہ سے  
ہی توبہ نہیں ہوتی بلکہ اس سے بھی آگے توبہ کا ایک درجہ ”اوابیت“ ہے کہ بندہ آخرت کے خوف اور نعمتوں کے  
پھم جانے کے خوف سے ماوراء ہو کر خالص اور محض رضائے الہی کے حصول کی خاطر اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرے  
۔ تصوف کی تعلیمات سالک سے تقاضا کرتی ہیں کہ اس کی نگاہ صرف عذاب کے ڈر تک محدود نہ ہو اور نہ صرف  
نعمتوں کے حصول کو مطمع نظر بنا کر اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرے بلکہ اس کے پیش نظر صرف خالق حقیقی کو راضی  
کرنا ہو۔ اس کی خوشنودی اس کا مقصود بن جائے جب بندے کے دل میں اللہ سے ایسی محبت اور اس کے قرب کی  
ایسی آرزو پیدا ہو جائے اور ہر حال میں اس کو راضی رکھنے کا ایسا احساس جاگزیں ہو جائے کہ وہ ہر لمحہ اپنے سابقہ  
مقام کو اپنے لئے گناہ تصور کرے اور اللہ کی خوشنودی کا جو یا بن کر بس اسی کے مکھڑے کا طلب گار بن جائے تو وہ  
توبہ کے مقام اوابیت پر فائز کر دیا جاتا ہے اور اس کو اواب کہتے ہیں۔

گویا جب اللہ کی محبت اور اس کی رضا کے حصول کی طلب کی بناء پر انسان نادام ہو جائے اور اس کو اپنے  
اعمال پر حیا آجائے اور اس ندامت کے باعث توبہ ہو تو ایسی توبہ کرنے والے کو اواب کہتے ہیں۔ اللہ رب العزت  
نے ارشاد فرمایا۔

نعم العبد انه اواب (۴۰)

وہ بہت خوب بندہ تھا درحقیقت وہ (ہر حال میں ہماری

طرف) رجوع کرنے والا بندہ تھا۔

یہ مقام اوابیت توبہ کا تیسرا درجہ ہے جہاں توبہ کا محرک صرف رضائے الہی کا حصول ہوتا ہے۔ انبیاء

کرام کو یہ درجہ حاصل رہا جن کا ذکر قرآن مجید میں جگہ جگہ فرمایا گیا۔

## توبہ کے تین درجات اور حضرت رابعہ بصریؒ:-

حضرت بی بی رابعہ بصریؒ تصوف کی دنیا میں بہت بلند مقام پر فائز تھیں۔ قرب خداوندی کا جو شرف آپ کو نصیب ہوا وہ کسی کسی کو میسر ہوتا ہے اس لئے عرفاء کاملین اور صوفیاء اصلین میں آپ کو ممتاز مقام حاصل ہے جس کا اندازہ حضرت علی المرتضیٰؑ کے شاگرد رشید حضرت امام حسن بصریؒ جو جلیل القدر تابعی اور اکابر ائمہ کرام میں سے ہیں کے اس قول سے لگایا جاسکتا ہے کہ میرا جب کبھی دل چاہتا کہ اللہ کی باتیں سنیں اور اللہ کی معرفت سے دل کو روشن و منور کروں تو ہم حضرت رابعہ بصریؒ کی بارگاہ میں حاضری دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک رات میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ساری رات اللہ جل مجدہ کی معرفت کی باتیں ہوتی رہیں، خالق حقیقی کی رفعتوں، عظمتوں اور شانوں کے تذکرے ہوتے رہے۔ صبح جب آپ کی بارگاہ سے اٹھ کر واپس آیا تو اللہ کی عزت کی قسم! ایسے محسوس ہوا کہ اللہ کی معرفت کے بارے میں حضرت رابعہ بصریؒ سمندر ہیں اور میرا دامن ایک قطرے سے بھی تر نہیں اور میری حیثیت ان کے بحر معرفت کے مقابلے میں ایک قطرہ سے بھی کم ہے۔

چنانچہ کتب تذکرہ میں معرفت الہی میں اس قدر بلند مقام کی حامل حضرت رابعہ بصریؒ کے متعلق کہا جاتا ہے ایک ہاتھ میں پانی اور دوسرے میں آگ اٹھا کر تیز تیز دوڑتی جا رہی ہیں۔ آپ سے عرض کیا گیا، ماجرا کیا ہے؟

آپ نے فرمایا کچھ لوگ دوزخ کے ڈر سے اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ دوزخ کو اس پانی سے بجھا دوں اور کچھ لوگ جنت کے حصول کی خاطر عبادت کرتے ہیں اگر ہو سکے تو اس آگ سے اس جنت کو جلا دوں تاکہ کوئی دوزخ کے ڈر سے اللہ کی عبادت نہ کرے اور جنت کے حصول کی لالچ میں کوئی اظہار بندگی نہ کرے بلکہ جو بھی عبادت کرے وہ فقط اللہ کی رضا کے لئے کرے۔ عبادت کا محرک صرف اور صرف اللہ کی رضا و خوشنودی ہو۔ اللہ کی محبت اور اس کی بارگاہ کا قرب باعث عبادت ہو۔ بندوں کی تین اقسام:-

حضرت امام زین العابدینؑ نے فرمایا کہ بندے تین قسم کے ہوتے ہیں پہلی قسم ان بندوں کی ہے جو بظاہر تو مرد ہیں مگر حقیقت میں ان میں مردانگی نہیں بلکہ وہ عورتیں ہیں۔ دوسری قسم ان بندوں کی ہے جو نہ مرد ہیں نہ عورتیں بلکہ وہ مخنث ہیں اور تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو حقیقتاً مرد ہیں۔

## پہلی قسم:-

وہ بندے جن کی نگاہیں طلب دنیا تک محدود رہتی ہیں اور ان کے سامنے صرف اور صرف دنیا کا حصول اور دنیا کی کامیابی مقصود ہوتی ہے وہ طالب دنیا ہیں اور جو دنیا کا طلب ہو وہ عورت ہے۔

## دوسری قسم:-

کچھ ایسے بندے ہیں کہ دنیا ان کا مطمع نظر نہیں ہوتی بلکہ وہ ہمیشہ آخرت کے طلب گار ہوتے ہیں۔ ان کا مقصود جنت اور اس کی نعمتوں کا حصول ہوتا ہے ان کی ساری کوششیں اور کاوشیں دنیا کے لئے نہیں بلکہ عقبیٰ کے حصول کے لئے ہوتی ہیں وہ لوگ طالب دنیا نہیں بلکہ طالب عقبیٰ ہوتے ہیں۔ بندوں کی یہ قسم اہل تصوف کے نزدیک مخنث ہے کہ وہ نہ تو طالب دنیا کی طرح عورتیں ہیں اور نہ طالب مولیٰ کی طرح مرد ہیں گویا وہ نہ مرد ہیں نہ عورتیں بلکہ مخنث ہیں۔

## تیسری قسم:-

اللہ کے کچھ بندے ایسے ہوتے ہیں کہ جن کے سامنے نہ تو دنیا کی طلب ہوتی ہے اور نہ عقبیٰ کے طلب گار ہوتے ہیں۔ ان کی عبادتیں ریاضتیں، دنیوی نعمتوں کے حصول کے لئے ہوتی ہیں اور نہ اخروی نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کے لئے بلکہ طلب دنیا و عقبیٰ سے صرف نظر کر کے صرف اور صرف اپنے مولا کی رضا و خوشنودی کو پیش نظر رکھتے ہیں وہ صرف طالب مولیٰ ہوتے ہیں۔

حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ اگر میرے دل میں دنیا کا خیال آجائے تو وضو کر لیتا ہوں تاکہ وہ خیال مٹ جائے اور دل دنیا کی طلب اور اس کے تصور سے پاک صاف ہو جائے اور اگر کبھی آخرت اور اس کا اندیشہ دل میں آجائے تو میں غسل کرتا ہوں کیونکہ دنیا کا اندیشہ آخرت کے مقابلے میں کم ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی فکر لاحق ہو جائے تو وہ آسانی سے نکل جاتی ہے مگر آخرت کی فکر اور اندیشہ اس کے مقابلے میں مشکل سے نکلتا ہے اس لئے وضو سے بڑی طہارت یعنی غسل کرتا ہوں تاکہ یہ بڑا اندیشہ دور ہو جائے۔

گویا تصوف کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح بندہ دنیا کا طالب نہ رہے کہ دنیا غیر ہے اس طرح وہ اخروی نعمتوں اور جنت کے حصول کا طالب بھی نہ ہو کہ توحید کے اس مقام پر پہنچ کر آخرت اور اس کا حصول بھی غیر تصور کیا جاتا ہے۔ انسان دنیا کی طلب بھی دل سے نکال دے اور آخرت کی طلب کو بھی لوح قلب سے کھرچ کر



صاف کر دے جب دل کی تختی دونوں طرح کے ان نقوش سے پاک و مصفی ہو جاتی ہے اور فقط مولیٰ کی طلب باقی رہ جاتی ہے اور اس کے مکھڑے کی طلب اور اس کی رضا کے حصول کی تمنا باقی رہ جاتی ہے تو پھر وہ بندہ مرد حق اور مرد حرم بن جاتا ہے اور یہی وہ بندہ ہے جو روحانی اعتبار سے مرد کہلانے کا حقدار ہے اور صوفیا کی نگاہ میں اسی کو مرد تصور کیا جاتا ہے اگرچہ مادی اور جسمانی طور پر وہ عورت ہی کیوں نہ ہو۔

## قرآن اور تصور مردانگی:-

اہل تصوف کے ہاں مرد کا جو تصور اوپر بیان کیا گیا ہے یہ صرف ان صوفیاء عرفاء کا قول نہیں بلکہ یہ قرآن مجید سے ماخوذ ہے اور اللہ رب العزت نے ایسے لوگوں کو ہی ”مرد“ کہا۔  
چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔

رجال لاتلہیہم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ۔ ایسے مرد (مومن) کہ جن کو سوداگری اور خرید و فروخت اللہ کی یاد اور ادائیگی نماز اور ادائیگی زکوٰۃ سے غافل نہیں کرتی۔ (۴۱)

کچھ ایسے لوگ ہیں جو تجارت اور خرید و فروخت میں مصروف ہوں تو ان کی یہ تجارت و کاروبار اور بیع و شراء انہیں اللہ رب العزت سے غافل نہیں کر سکتی اور وہ اس حالت میں بھی اپنے مولیٰ کی عبادت اس کی یاد اور اس کی محبت میں مست و بے خود ہوتے ہیں تو جس شخص پر اللہ رب العزت کی طلب اتنی غالب ہو کہ اسے نہ تو تجارت اللہ کی یاد سے غافل کر سکے۔ اور نہ دنیا کی کوئی مصروفیت اس کی راہ میں حائل ہو سکے وہ اللہ کی نگاہ میں مرد ہے۔ قرآن ایسے لوگوں کو مرد مانتا ہے کہ یہ رجال یعنی مرد ہیں اگرچہ جسمانی طور پر وہ عورتیں ہی کیوں نہ ہوں۔ گویا قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ جو لوگ یہ مقام و مرتبہ حاصل نہ کر سکیں اور اللہ کی یاد میں اس حد تک مستغرق، مست اور بے خود نہ ہوں وہ مرد نہیں بلکہ عورتیں ہیں کہ مرد صرف وہی ہیں جو اس بلند مقام پر فائز ہیں اور اس کے لئے جسمانی طور پر مرد یا عورت ہونے کی کوئی تفریق نہیں۔

## توبہ اور اس کے تین طریقے:

توبہ جس سے تصوف کا پہلا حرف ”تا“ مکمل ہوتا ہے یہ توبہ تصوف کا سفر اولین ہے اور اس سفر معرفت کا نقطہ آغاز اور پہلا قدم ہے۔ اس توبہ کے تین طریقے ہیں۔

- (۱) توبہ کا پہلا طریقہ خطا سے صواب کی طرف توبہ کرنا۔
- (۲) توبہ کا دوسرا طریقہ صواب سے صواب کی طرف توبہ کرنا۔
- (۳) توبہ کا تیسرا طریقہ خودی سے خدا کی طرف توبہ کرنا۔

### توبہ کا پہلا سفر:

توبہ کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ انسان سے غلطی اور گناہ سرزد ہونے کی صورت میں وہ اللہ جل مجدہ کی بارگاہ بے نیاز کی طرف رجوع کرے اور غلطی سے توبہ کرتے ہوئے معافی کا خواستگار ہو جس کے نتیجے میں اس کے گناہ معاف کر دیئے جائیں اور وہ ”التائب من الذنب کمن لا ذنب له“ کا مصداق بن جائے اور ہر قسم کے گناہ کی آلودگی سے پاک و صاف ہو جائے تو توبہ کے اس سفر کو خطا سے صواب کی طرف توبہ کرنا کہتے ہیں۔

### توبہ کا دوسرا سفر:

توبہ کا دوسرا سفر صواب سے صواب کی طرف ہوتا ہے۔ یعنی انسان پہلے بھی گناہ پر نہ ہو اس سے کوئی غلطی اور خطا سرزد نہ ہوئی ہو بلکہ خوب سے خوب تر کی تلاش و آرزو میں اپنے پہلے مقام و مرتبہ سے توبہ کر کے بلند و بالا اور زیادہ با عظمت مقام کی طرف رواں دواں ہو اور اس اگلے مقام رفیع کی وجہ سے پہلے مقام پر رکے رہنے کو گناہ تصور کر کے اس سے اللہ کی بارگاہ میں معافی مانگے اور اس پہلی حالت صواب سے دوسری حالت صواب کی طرف توبہ کرے اسی مقام قرب کے متلاشی لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے۔

”حسنات الابرار سنیات المقربین“ (عام نیک لوگوں کی نیکیاں مقربین کے نزدیک گناہ ہوتے ہیں) گویا یہ مقام بر سے مقام قرب کی طرف سفر ہے اور اس سفر کا اہم مقام بر سے مقام قرب کی طرف توبہ کرنا ہے۔

### توبہ کا تیسرا سفر:

توبہ کا تیسرا سفر خودی سے خدا کی طرف ہوتا ہے اہل محبت جب مقام قرب و محبت پر پہنچتے ہیں اور ان کا تعلق محبت محبوب کے ساتھ جخت ہو جاتا ہے تو اس محبت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ اس محبت کے آداب بحال لاتے ہوئے اپنی خواہش و آرزو سے بھی دستبردار ہو جائیں تاکہ وہ اپنی ہستی اور اس کے جملہ تقاضوں سے دستکش ہو کر اپنی مرضی کو محبوب کی مرضی میں فنا کر دیں۔ اور فنا فی اللہ کے منصب پر فائز ہو جائیں یہ توبہ کا وہ سفر ہے جہاں خودی ختم

ہو جائے انسان کا اپنا وجود اور اس کی کوئی خواہش باقی نہ رہے اور محبوب کی رضا میں اپنے آپ کو اس طرح گم کر دے کہ وہ اپنی آرزو کے ساتھ فانی ہو جائے اور محبوب کی مرضی و رضا کے ساتھ باقی ہو جائے۔

اس مرحلہ توبہ کی وضاحت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ملتی ہے کہ جب آپ کوہ طور پر تشریف لے گئے تو اللہ رب العزت کی بارگاہ میں اپنی آرزو کا اظہار کیا۔

قال رب ارنی انظر الیک۔ (۴۲) موسیٰ علیہ السلام نے دیدار کی آرزو میں عرض کی اے

میرے رب تو مجھ کو (اپنا جلوہ) دکھا دے تاکہ میں تجھ کو دیکھ (بھی) لوں۔

محبوب حقیقی کے کلام سے متمتع ہونے کے بعد دل میں خواہش دیدار پیدا ہوئی اور اس حسن حقیقی کو دیکھنے کے اشتیاق کا اظہار کر دیا۔ دیدار حسن لم یزل کی خواہش آرزو بن کر زبان پر چل گئی تو ادھر سے جواب ملا۔ ”لن ترانی“ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے اور جب رب ذوالجلال نے کوہ طور پر ایک تھلی کا پر تو ڈالا تو آپ بے ہوش ہو کر گر پڑے جو نہی ہوش آیا تو سب سے پہلے فوراً اللہ رب العزت کی بارگاہ میں عرض کی۔

تبت الیک۔ (۴۳) مولیٰ! میں تیری بارگاہ کی طرف توبہ کرتا ہوں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جل مجدہ کے نبی اور رسول ہیں۔ (انبیاء خطا سے پاک ہوتے ہیں) آپ نے کبھی کسی غلطی کا ارتکاب نہ کیا تھا جس سے توبہ کی جاتی لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ یہ توبہ کس چیز سے فرما رہے ہیں؟

صاف ظاہر ہے کہ آپ نے کوئی معصیت و نافرمانی کا ارتکاب نہیں کیا تھا بلکہ آپ راہ صواب و حق پر ثابت تھے اور آپ کی یہ توبہ اپنی خواہش و آرزو سے توبہ تھی کہ احکم الحاکمین تیری بارگاہ میں دیدار کی تمنا کر بیٹھا اس اختیار سے توبہ کرتا ہوں اس آرزو کو چھوڑتا ہوں اور اپنی مرضی سے تیری مرضی کی طرف دستبردار ہوتا ہوں۔

گویا اس سفر کے راجی خود کو اپنے محبوب کے اس طرح سپرد کر دیتے ہیں کہ محبوب کے دیدار کی آرزو بھی اپنے بس میں نہیں رکھتے۔ محبوب کے حسن کے نظارے کی تمنا سے بھی تائب ہو جاتے ہیں۔ یہاں دنیا اور آخرت کی آرزو، درجات اور اجر و ثواب کی آرزو تو بہت نیچے رہ گئی۔ انسانی آرزوؤں میں سے سب سے بڑی خواہش تو دیدار محبوب حقیقی کی خواہش ہے اور اسی خواہش کا اظہار موسیٰ علیہ السلام نے ”رب ارنی“ کے الفاظ سے فرمایا تھا

لیکن جب خودی سے خدا کی طرف توبہ کا مرحلہ آیا تو پھر عرض کی کہ باری تعالیٰ اس آرزو کو اختیار کرنے سے بھی توبہ کرتا ہوں۔

توبہ کا یہ درجہ سرور کون و مکان رحمت دو جہاں علیہ السلام کی ذات گرامی کو بہ تمام و کمال حاصل تھا۔ آپ نے اپنی خواہش و آرزو کو اپنے خالق حقیقی کی رضا و خوشنودی میں اس طرح فنا کر دیا کہ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا۔

وما ينطق عن الهوى ان هو الا وحى يوحى - اور وہ اپنی (یعنی نفس کی) خواہش سے بات ہی نہیں کرتے وہ تو وحی فرماتے ہیں جو اللہ کی طرف سے ان پر وحی کی جاتی ہے۔ (۴۴)

کہ آپ کا بولنا بھی اپنی مرضی سے نہیں دن کی جلوت ہو یا رات کی خلوت، سفر میں ہوں یا حضر میں، خوشی کی حالت میں ہوں یا حالت غم میں، اپنوں کی محفل میں ہوں یا مخالفین کے پاس ہر حال میں آپ کی زبان سے اپنی مرضی سے تو ایک کلمہ بھی نہیں نکلتا بلکہ آپ کا تکلم و سکوت سب کچھ اللہ رب العزت کی رضا کے تابع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دفعہ حضور علیہ السلام نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ نماز ادا فرمائی اور دو رکعت کے بعد سلام پھیر دیا۔ آپ کی خدمت میں عرض کی گئی۔

یا رسول اللہ ﷺ انسیت ام قصرت الصلوة یا رسول اللہ ﷺ آپ بھول گئے یا نماز میں کمی کر دی فقال لم انس قلم تقصر۔ (۴۵) دی گئی۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ نہ تو میں بھولا ہوں اور نہ ہی نماز میں قصر کی گئی ہے۔

آپ کی حالت نماز بھی آپ کی اپنی مرضی سے متعین نہ ہوتی تھی بلکہ عبادت کی حالت بھی احکم الحاکمین کی رضا و مرضی کے مطابق تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حضور علیہ السلام ایک دن میں ستر ستر بار توبہ فرماتے تھے اور مسلم شریف میں ہے کہ آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا میں دن میں ۷۷ توبہ استغفار کرتا ہوں۔ اس توبہ و استغفار کا کیا معنی تھا؟ یہ گناہوں اور غلطیوں سے توبہ نہ تھی بلکہ یہ ہر قدم پر آرزو اور خواہش کے اختیار کرنے سے توبہ ہوتی تھی۔ (۴۶)

ایک شبہ کا ازالہ :-

توبہ صرف گناہوں سے ہی نہیں ہوا کرتی بلکہ توبہ اعلیٰ ترین سفر آرزو سے دستبردار ہونے سے عبارت

ہے اور آپ ﷺ کو توبہ یہی ہوا کرتی تھی کیونکہ آپ گناہوں اور غلطیوں کے ارتکاب سے معصوم تھے۔ چنانچہ اللہ رب العزت نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا۔

لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ۔ کیونکہ اللہ آپ کی اگلی اور پچھلی لغزشوں کو معاف فرما (۲۷) چکا ہے۔

یہاں ”ذنب“ کا لفظ قابل توجہ ہے اس کے دو معنی ہیں۔ ایک معنی تو وہ ہے جو اعلیٰ حضرت عظیم المرتبت الشاہ احمد رضا خاں قدس سرہ العزیز نے فرمایا:

تا کہ محبوب تمہاری خاطر اللہ رب العزت تمہارے اگلوں اور پچھلوں کو بخش دے۔ یہ معنی نہایت محتاط اور آداب کے تقاضوں کے عین مطابق اور برحق ہے مگر بعض لوگوں نے یہاں ذنب سے مراد گناہ لیا ہے اور معاذ اللہ حضور ﷺ کے لئے گناہ ثابت کیا ہے حالانکہ یہاں ”ذنب“ سے مراد آپ کا گناہ ہرگز نہیں ہے بالفرض ایک لمحہ کے لئے اس کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو گناہ کا وجود نہیں بنتا کیونکہ گناہ سے توبہ کی صورت میں گناہ پہلے ہوتا ہے اور مغفرت اس کے بعد ہوا کرتی ہے اور اس مغفرت کی وجہ سے گناہ کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے۔

التائب من الذنب کمن لا ذنب له گناہوں سے توبہ کرنے والا ایسا ہے گویا اس کا گناہ تھا ہی نہیں۔

گناہ سے توبہ کرنے والے کا گناہ ہوتا ہے مگر توبہ کی وجہ سے مغفرت کے بعد گناہ مٹ جاتا ہے لیکن حضور ﷺ کی توبہ کا یہ عالم ہے کہ اللہ رب العزت آپ کے گناہ کے وجود سے پہلے ہی مغفرت عطا فرمادیتا ہے مطلب یہ کہ ابھی گناہ ہوتا ہی نہیں کہ مغفرت پہلے عطا کر دی جاتی ہے اور مغفرت آجائے تو گناہ کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے تو جب گناہ کے وجود سے بھی پہلے حضور ﷺ کو مغفرت عطا فرمادی گئی تو وہاں گناہ کا گزر کیسے ہوگا؟

گویا اس آیت مبارکہ میں اللہ جل مجدہ نے اپنے محبوب کریم ﷺ سے ارشاد فرمایا کہ پیارے محبوب تیری توبہ ایسی ہے کہ گناہ کا وجود ہی تیری زندگی مطہرہ کے قریب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ تجھے تو پہلے ہی سے مغفرت کی خیرات عطا فرمادی گئی ہے۔ جب گناہ حضور ﷺ کی زندگی میں باقی ہی نہیں رہنے دیا گیا تو آپ کی توبہ کیسی اور کس لئے تھی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی توبہ درجات کی بلندی کے لئے ہوتی تھی۔ اس کی وجہ سے اللہ رب العزت ہر لمحہ آپ کے درجات بلند سے بلند تر فرماتا ہے جس کی وضاحت قرآن مجید کی یہ آیت مبارکہ فرما رہی ہے۔

وللاخرة خير لك من الاولى۔ (۴۸) اور حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کی ہر کچھلی حالت اگلی حالت

سے بہتر ہے۔ (آپ کو عروج ہی عروج ہے)

آپ کی ہر آنے والی گھڑی پہلی گھڑی سے بہتر ہے حضور ﷺ توبہ فرماتے جس کے ذریعے ہر لمحہ آپ کے درجات بلند ہوتے اور یہ سلسلہ ساری حیات طیبہ میں جاری و ساری رہا۔

**خلاصہ کلام:-**

حضور غوث الثقلین محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ تصوف کا پہلا نکتہ یہ ہے کہ انسان اللہ رب العزت کی بارگاہ کی طرف راغب و متوجہ ہو جائے۔ تصوف کا پہلا حرف ”التا“ ہے جس کا معنی توبہ ہے۔  
**توبہ کی دو قسمیں ہیں۔**

(۱) ظاہری توبہ (۲) باطنی توبہ

**توبہ ظاہری:**

توبہ ظاہری یہ ہے کہ انسان قولاً و فعلاً اپنے تمام اعصائے ظاہری (آنکھ، ناک، کان، ہاتھ اور پاؤں وغیرہ) کو گناہوں اور برائیوں سے ہٹا کر اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کی طرف راغب کر دے۔ نیز شریعت مصطفویٰ علی صاحبہا الصلوٰت و التسلیمات کے مخالف افعال سے توبہ کر کے اس کے احکامات کے مطابق عمل پیرا ہو۔

**توبہ باطنی:**

توبہ باطنی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان دل کو گناہوں کی غلاظتوں اور آلائشوں سے پاک کر کے شریعت کے موافق ہو جائے اور قلب و باطن بھی امر ایزدی کی اطاعت میں ڈھل جائے اور برائی نیکی سے بدل جائے تو تصوف کی ”ت“ مکمل ہوگی اور اس کو کامل توبہ نصیب ہوگی۔

**تصوف کا دوسرا حرف ”ص“:**

اب ہم لفظ تصوف کے دوسرے حرف ”الصا“ کی تشریح و توضیح کر رہے ہیں۔ قبل ازیں تفصیلاً ذکر ہو چکا ہے کہ تصوف کے حرف ثانی یعنی ”ص“ سے مراد صفا ہے اور صفا کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) صفائے قلب (۲) صفائے سر

## صفائے قلب:

قلب کی صفائی سے مراد یہ ہے کہ دل ان بشری کدورتوں اور آلائشوں سے پاک صاف ہو جائے جو عموماً دل کے اندر پائی جاتی ہیں اور دل پر اثر انداز ہوتی ہیں مثلاً زیادہ کھانے پینے، سونے اور زیادہ گفتگو کرنے کی خواہشات نیز دنیوی رغبتیں مثلاً زیادہ کمائی، کثرتِ جماع اور اہل و عیال کی حد سے زیادہ محبت۔ اسی طرح دیگر خواہشات نفسانی تکبر و غرور، حسد و کینہ، بغض و عناد، سرکشی و عداوت اور منافقت و کدورت ایسے رذائل اخلاق جن سے دل سیاہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اگر دل ان تمام مذمومہ اخلاق سے منزہ و مبرا ہو جائے تو اسی کو صفائے قلب کہتے ہیں۔

## صفائے سر:

علم و روحانیت میں قلب، جسم کا باطن ہوتا ہے اور سر، قلب کا بھی باطن ہوتا ہے جیسا کہ اوپر پہلے بیان ہو چکا ہے کہ دل (قلب) کا رذائل اخلاق سے پاک ہو جانا صفائے قلب کہلاتا ہے جبکہ صفائے سر (مقام سر کی صفائی) سے مراد یہ ہے کہ نہ صرف دل کی ظلمتیں دھل جائیں بلکہ دل اللہ تعالیٰ کے سوا کے خیال سے اس طرح پاک ہو جائے کہ اللہ کے غیر کا تصور بھی ختم ہو جائے تو جب ماسویٰ المحبوب ہر چیز کے تصور و گمان سے دل بے نیاز ہو کر محبوب حقیقی کے انوار و تجلیات میں اس طرح گم ہو جائے کہ غیر کا تصور بھی گوارا نہ ہو تو اس کو صفائے سر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جب انسان مقام سر کی صفائی حاصل کر لیتا ہے تو اس کے دل و دماغ میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا تصور و خیال بھی نہیں آنے پاتا بس صرف مالک حقیقی کے مکھڑے کی طلب اور اس کی رضا و خوشنودی کا حصول ہر لمحہ مقصود و مطلوب بن کر اس طرح چھا جاتا ہے کہ صبح و شام یہی ایک چیز ان کا وظیفہ حیات بن جاتی ہے ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ وحدہ لا شریک ارشاد فرماتے ہیں۔

واصبر نفسك مع الذين يدعون ربهم بالغدوة اور (اے رسول ﷺ) آپ اپنے آپ کو انہیں کے والعشی یریدون وجہہ - (۴۹)

ساتھ رو کے رہیں جو اپنے پروردگار کو صبح و شام (رات دن ہر وقت) یاد کرتے رہتے ہیں جو اس کی رضا کے طالب ہیں۔

یہ لوگ دن رات اپنے رب کریم کو پکارتے رہتے ہیں ان کے اس عمل میں کسی غیر کا خوف دل میں جاگزیں نہیں ہوتا اور نہ ہی غیر کے احساس کو قلب و باطن پر اثر انداز ہونے دیتے ہیں نہ کوئی طلب انہیں دامن گیر ہوتی ہے اور نہ کسی چیز کا طمع و لالچ ان کے دل میں جگہ پاسکتا ہے اللہ کی مخلوق کی بھلائی کے کام میں مصروف ہوں یا کاروبار و تجارت میں محو، اپنوں کی محفل میں ہوں یا بیگانوں کی مجلس میں بہر حال ان کے ہر عمل کا مقصود اللہ کی رضا ہوتا ہے۔

اپنے محبوب کی طلب رضا کے اس راستے پر چلتے چلتے ان کا مقام سر اتنا صاف اور اجلا ہو جاتا ہے کہ انہیں مقام توحید میسر آ جاتا ہے۔ جہاں پہنچ کر غیر خدا کے خیال اور ماسویٰ محبوب کے تصور سے مکمل طور پر آزاد ہو کر فنا فی اللہ کی منزل میسر آ جاتی ہے۔

حضور علیہ السلام اور صفائے سر:

بعض عرفاء نے مقام سر میں اللہ رب العزت کے تعلق کی کیفیت بیان کی ہے۔ مقام سر او مقام توحید جو صفائے سر سے نصیب ہوتا ہے وہاں اللہ کی ذات کے ساتھ ایک ایسا تعلق قائم ہو جاتا ہے کہ اس تعلق کے ہوتے ہوئے چشم تصور و خیال میں کسی اور کا خیال گور نے نہیں پاتا اور توحید کا درجہ مکمل ہو جاتا ہے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ ارشاد فرماتی ہیں کہ ایک رات میں بیدار ہوئی اور حضور علیہ السلام کو دیکھا کہ آپ بستر پر نہیں ہیں۔ میں تلاش کرتے کرتے آپ کی خدمت میں پہنچ گئی دیکھا کہ آپ عبادت میں مشغول و مصروف ہیں میں آپ کے پاس بیٹھ گئی اور آپ کی خدمت میں کچھ عرض کیا کہ آپ نے میری آواز سن کر ارشاد فرمایا ”من انت“ تو کون ہے؟ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں میں نے عرض کی۔ ”انا عائشہ یارسول اللہ ﷺ یا رسول اللہ ﷺ میں عائشہ ہوں۔ حضور علیہ السلام نے یہ سن کر فرمایا۔ ”من عائشہ؟“ کون عائشہ؟ آپ فرماتی ہیں کہ میں گھبرا گئی لیکن پھر سنبھل کر جواب دیا۔ ”انا عائشہ بنت ابی بکر“ میں ابو بکرؓ کی بیٹی عائشہ ہوں۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔

”من ابوبکر؟ کون ابوبکر؟ میں نے جواباً عرض کیا۔

”ابوبکر بن قحافہ یارسول اللہ یا رسول اللہ ابوبکر ابوقحافہ کے بیٹے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ ”من ابوقحافہ؟“ کون ابوقحافہ؟ آپ فرماتی ہیں کہ جب نوبت یہاں تک پہنچی تو میں گھبرا کر واپس پلٹ آئی۔

تصوف کا تیسرا حرف ”و“



تصوف کا تیسرا حرف ”د“ ولایت سے لیا گیا ہے۔ ولایت کو عرف عام میں ”دوستی“ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور صاحب ولایت کو ولی کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے ولی اللہ کا معنی ہوا اللہ کا دوست۔

## ولی اللہ اور عام بندہ میں فرق:

بندہ ہونے کے اعتبار سے تو تمام انسان اللہ کے بندے ہیں مگر تمام بندے ایک جیسے نہیں ہوتے کیونکہ بعض لوگ بندہ ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ رب العزت کے دوست بھی ہوتے ہیں جنہیں یہ مقام میسر آتا ہے ان میں اور عام بندوں میں بہت فرق ہوتا ہے کیونکہ بندہ ہونے کے اعتبار سے تو کائنات عالم کی ہر چیز اللہ کا بندہ ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔

ان کل من فی السموات والارض الا اتی (حقیقت تو یہ ہے کہ) آسمانوں اور زمین میں کوئی بھی الرحمن عبدا۔ (۵۰)

ہے (طوق بندگی سے کوئی باہر نہیں سب اس کے بنائے ہوئے ہیں اور) سب (اللہ) رحمن کے روبرو بندے کی حیثیت سے حاضر ہوں گے۔

مگر اللہ کے دوست وہی بندے ہیں جو اپنے رب سے دوستی کا رشتہ استوار کرتے ہیں۔ اس طرح ”ولی اللہ“ اللہ کا دوست بن جاتا ہے اور اللہ رب العزت اس بندے کا دوست بن جاتا ہے تصوف اسی ولایت کے حصول کا ذریعہ ہے اور اس کی جملہ تعلیمات بندے کو مقام ولایت پر فائز ہونے کا راستہ بتاتی ہیں کہ بندہ اللہ کا دوست بن جائے اور رب بندے کا دوست بن جائے۔ اس دو طرفہ تعلق کو قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔

ان اولیائہ الا المتقون ولكن اکثر ہم اس کے متولی تو صرف پرہیزگار لوگ ہیں لیکن ان کی لایعلمون۔ (۵۱)

اکثریت اس حقیقت کو نہیں جانتی۔

ایسے متقی افراد جو مقام ولایت کے حامل ہوتے ہیں وہ ایک طرف تو اللہ کے دوست ہوتے ہیں جس کا سابقہ آیت مبارکہ میں بیان کیا گیا ہے اور دوسری طرف اللہ ان لوگوں کا دوست ہوتا ہے جس کو قرآن مجید میں دوسری جگہ بیان فرمایا گیا ہے۔

اللہ ولی الذین امنوا یخرجہم من الظلمات الی اللہ ایمان والوں کا مددگار ہے وہ ان کو تاریکیوں میں النور۔ (۵۲)

سے نکال کر روشنی میں لے آتا ہے۔

پہلی آیت میں بندہ ولی اللہ تھا اور اس آیت میں اللہ رب العزت ولی العبد ہے ادھر بندہ اللہ کا ولی ہے



## ولایت اور تقویٰ کا باہمی تعلق:

سورہ الانفال کی مذکورہ آیت مبارکہ میں اللہ کے دوستوں اور ولایت کے مقام پر فائز ہونے والوں کی ایک صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ متقی ہوتے ہیں۔ یعنی ولایت اور تقویٰ دونوں باہم لازم و ملزوم ہیں۔ تقویٰ کے بغیر ولایت کا تصور گمراہی ہے اور جو مقام ولایت کو پانا چاہتا ہے اسے تقویٰ کے لباس کو پہنا ضروری و لازم ہوتا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بھنگ، چرس پینے والے اور شریعت مطہرہ کی مخالفت کرنے والے مقام ولایت پر کبھی فائز نہیں ہو سکتے۔ نمازوں کے تارک شیطان کے دوست تو ہو سکتے ہیں اللہ کے دوست نہیں ہو سکتے۔ اللہ رب العزت نے اپنے دوستوں کی پہچان کروادی ہے کہ وہ متقی <sup>تہ</sup> <sup>تہ</sup> <sup>تہ</sup> <sup>تہ</sup>، پرہیزگار اور شریعت مطہرہ کی پابندی کرنے والے ہوتے ہیں۔

اس آیت نے اس تصور کو مکمل طور پر باطل کر دیا جو جہالت کی بنا پر ہمارے اندر رواج پا گیا ہے کہ فلاں شخص نماز روزے کا پابند تو نہیں ہے مگر ہے بڑا کامل ولی اللہ شریعت کی پابندی و پاسداری کو اپنے اوپر لازم نہیں سمجھتا مگر پہنچا ہوا اور بہت بزرگ ولی ہے۔ یہ سوچ سراسر اسلام کے خلاف اور دین دشمنی پر مشتمل ہے۔

مجبذب (مدہوش) شریعت کا مکلف نہیں ہوتا اس لئے اس سے شریعت کے احکامات کی پابندی <sup>ساکھت</sup> ہو جاتی ہے مگر صاحبان ہوش کے لئے مقام ولایت پر فائز ہونے کے لئے شریعت کی پابندی ہی اصل بنیاد ہے اور جو شریعت کا پابند نہ ہو شیطان کی بارگاہ میں پہنچا ہوا تو ہو سکتا ہے اللہ کی بارگاہ کا قرب اسے میسر نہیں آ سکتا وہ ولی شیطان تو ہو سکتا ہے ولی اللہ نہیں ہو سکتا۔

آج تصوف، طریقت اور سلوک کے نام پر بڑا دجل و فریب اور مکاری و عیاری ہو رہی ہے جس نے بزرگوں کے طریقوں اور طریقت و روحانیت کو بدنام کر دیا ہے جس کے نتیجے میں نوجوان نسل اور پڑھا لکھا جدید تعلیم یافتہ طبقہ صوفیاء بزرگوں اور کاملین کے طریقہ زیست کی طرف جانے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس پورے سلسلے میں دھوکہ و فریب ہے اس لئے اس حقیقت کو واضح کر دینا ضروری ہے تاکہ طریقت و روحانیت کا چہرہ نکھر کر سامنے آجائے۔ جہاں شریعت محمدی علی صاحبہا الصلوٰت کی پابندی اور حضور ﷺ کی سنت کی اتباع و اطاعت موجود نہ ہوگی وہاں ولایت کا وجود ناممکن ہوگا۔ اس کتاب میں انشاء اللہ اس اصل ولایت کی پہچان کرائی جائے گی جس سے دجل و فریب پر مشتمل، عیاری و مکاری کا پردہ چاک ہو جائے گا۔ اور حق کے متلاشی حقیقت تصوف سے آگاہ ہو کر روحانیت و طریقت کی حقیقتوں سے بہرہ ور ہو سکیں گے۔

## لفظ ولی کا معنی و مفہوم:

یہ واضح ہو چکا کہ بندہ اللہ کا ولی ہے اور اللہ بندے کا ولی ہے اس دو طرفہ تعلق کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ضروری تھا کہ لفظ ولی کا معنی و مفہوم سمجھ لیا جائے تاکہ دو طرفہ تعلق میں ولی اللہ اور ولی العبد کا معنی واضح ہو سکے۔

لفظ ولی ولایت (واؤ پر زیر) اور ولایت (واؤ زبر) دونوں سے مشتق ہے۔ ولایت کا معنی تصرف اور ملکیت ہے۔ جب بچہ چھوٹا اور نابالغ ہوتا ہے اور اپنے امور سرانجام نہیں دے سکتا تو اس کا باپ دادا یا بھائی اس کا ولی بن جاتا ہے اور اس کو ولایت حاصل ہوتی ہے یعنی وہ ولی اس بچے کی جگہ اس کے مال جاہ و املا میں تصرف کرتا ہے اور اس ولی کا فعل اسی بچے کا کام تصور کیا جاتا ہے وہ خرید و فروخت کرے یا معاہدہ کرے عقد نکاح کرے یا اس کی طرف سے کوئی اور کام وہ سب کچھ اسی بچے کا ولی ہونے کی وجہ سے بچے کا عمل تسلیم کیا جاتا ہے۔

اسی طرح یہ لفظ ولی ولایت سے بھی اور ولایت کا معنی امارت، بادشاہی اور حکمرانی ہے اس سے ماخوذ ہونے کی بنا پر ولی کا معنی حکم چلانے والا حکمران و بادشاہ ہو گا چنانچہ کہا جاتا ہے کہ فلاں ملک کی ولایت فلاں شخص کے پاس ہے یعنی فلاں ملک کی حکمرانی اس کے پاس ہے۔

اب ان دونوں حصوں کی رو سے ولی کا مفہوم یہ ہوا کہ جس کا جو ولی ہو وہ اس کے حق تصرف رکھتا ہے اور اسی طرح وہ شخص جو کسی پر حکمران یا بادشاہ ہو وہ بھی اپنے محکوم کا ولی ہے۔

## ولی اللہ اور ولی العبد:

جیسا کہ پہلے واضح ہو چکا ہے کہ ولی معنی تصرف کرنے والا اور حکمران و بادشاہ کے ہیں مگر اس کا تعین اس کے مضاف الیہ کا تعین کرنے سے ہوتا ہے۔ مضاف الیہ کے مختلف ہونے سے لفظ ولی کی کئی مختلف صورتیں بنتی ہیں مگر اس وقت ہمارے پیش نظر صرف دو صورتیں ہیں۔

(۱) ولی اللہ۔ جبکہ ولی مضاف الیہ لفظ اللہ ہو۔

(۲) ولی العبد۔ جبکہ ولی کا مضاف الیہ لفظ عبد ہو۔

کیونکہ یہ دو صورتیں زیر بحث ہیں کہ بندہ اللہ کا ولی جس کو الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون اور ان اولیائہ الا المتقون میں بیان کیا گیا ہے اور اللہ بندے کا ولی ہے جس کو اللہ ولی الذین امنوا کے ذریعے بیان کیا گیا ہے اور ان دونوں صورتوں میں ولی کا معنی و مفہوم کیا ہے اس کا جاننا اور سمجھنا

ضروری ہے تاکہ اس کی وضاحت ہو سکے کہ بندہ کا ولی کیسے اور کس معنی میں ہوتا ہے۔

## ولی العبد کا معنی و مفہوم:

اللہ رب العزت بندے کا ولی ہے اور ولی العبد کا معنی ولی کے پہلے معنی کی رو سے یہ ہوا کہ بندے نے اپنا تصرف کا مقام حق ختم کر کے اسے اللہ کی بارگاہ میں پیش کر دیا اور اس نے اپنی زندگی کے جملہ معاملات میں اپنے ارادے اور مرضی سے دستبردار ہو کر اپنے تمام معاملات کو اللہ کے سپرد کر دیا اور اللہ نے اسے قبول کر لیا تو رب اپنے بندے کا ولی ہو گیا اب اس بندے کے تمام معاملات وہ خود نبھائے گا کیونکہ بندے نے اپنے تمام امور اپنے مولا کریم کو تفویض کر دیئے ہیں اور اعلان کر دیا ہے۔

وافوض امری الی اللہ میں اپنا معاملہ اللہ رب العزت کے سپرد کرتا ہوں۔

میں اپنی زندگی کے جملہ امور کو اپنی مرضی سے نکال کر تیری مرضی کی تحویل میں دیتا ہوں۔ اپنے اختیار سے دستبردار ہو کر اپنا سب کچھ تیرے اختیار کے حوالے کرتا ہوں۔

قل ان صلوٰتی ونسکی و محیای و مماتی للہ آپ فرما دیجئے کہ میری نماز اور میری قربانی (مناسک حج) اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کے لئے ہے جو رب العالمین۔ (۵۷)

سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔

جب بندہ اپنا جینا، مرنا، کھانا، پینا، اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا، عزت و آبرو، شہرت، ناموری، بیماری و صحت سب کچھ اللہ رب العالمین کے سپرد کر دیتا ہے تو اللہ فرماتا ہے لوگو! میں اپنے اس بندے کا ولی ہوں اس کے جملہ معاملات میں نے اپنے ذمے لے لئے اور اپنے وہ معاملات جو بندوں کی رشد و ہدایت اور ان کی اصلاح احوال سے متعلق تھے وہ اپنے اس بندے کو دے دیئے تو اب سن لو کہ اس کے تمام معاملات میں خود نبھاؤں گا۔

ولی کے دوسرے معنی کی رو سے ولی العبد کا معنی یہ ہوا کہ اس بندے پر اگر حکمرانی ہے تو وہ صرف اللہ کی ہے اس بندہ نے اپنے آپ کو اللہ کی حکمرانی میں دے دیا ہے اب دنیا کا کوئی فرد اس پر حکمران نہیں ہوتا اس پر حکمرانی صرف اپنے رب کی ہوتی ہے نہ وہ کسی سے خوف کھاتا ہے بلکہ ڈرتا ہے تو صرف اپنے رب سے، وقت کا بڑے سے بڑا فرعون اور قارون بھی اپنے مال و دولت اور سرمایہ سے اسے خرید نہیں سکتا کیونکہ وہ اپنے رب کے حضور اپنے آپ کو شیخ چکا ہوتا ہے اس لئے وہ کسی غیر کی حکمرانی تسلیم نہیں کرتا۔ وہ صرف اس طرف چلتا ہے جدھر رب چلاتا ہے وہاں جھکتا ہے جہاں رب جھکتا ہے اس نے اپنے اوپر صرف رب کی حکمرانی قائم کی ہوتی ہے اور اللہ

اسے دنیا کا نجات کی حکمرانی دے دیتا ہے اللہ اس کا ولی ہو جاتا ہے اور وہ اللہ کا ولی ہوتا ہے اور بندے کا ولی کیسے اور کس معنی میں ہوتا ہے۔

”من كان لله كان الله له“ جو اپنے آپ کو اللہ رب العزت کے لئے وقف کر دے اور اپنے معاملات کو بھول جائے تو اس کے معاملات کی ادائیگی اللہ رب العزت اپنے ذمہ کرم پر لے لیتا ہے۔

حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے کسی نے سوال کیا کہ آپ کے کام زیادہ ہوتے ہیں۔ خلافت کی مصروفیات لوگوں کے مسائل، جہاد کے معاملات وغیرہ اتنے زیادہ کام آپ کیسے سرانجام دے لیتے ہیں۔ ان تمام کے لئے آپ وقت کیسے نکالتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں اپنی بساط کے مطابق اپنے رب کے کام کرتا رہتا ہوں اور جب کبھی میرے ذاتی کام اور اللہ کے کام میں تعارض پیدا ہو یعنی ایک وقت میں یا اللہ کا کام ہو سکتا ہے یا اپنا کام تو ایسی حالت میں میری زندگی کا معمول یہ ہے کہ میں اپنا کام چھوڑ دیتا ہوں اور اللہ رب العزت کا کام کرتا ہوں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میرا کام میرا رب اپنے ذمہ لے لیتا ہے جبکہ میں اس کا کام اپنے ذمہ لیتا ہوں کیونکہ ایسی صورت میں اللہ رب العزت اپنے بندے کا ولی بن جاتا ہے اور اس کا سرانجام دیا ہوا کام ہر قسم کے نقص و کمی سے محفوظ ہوتا ہے اور وہ بندے کے سرانجام دینے کی نسبت ہزار گنا بہتر ہوتا ہے۔

## ولی اللہ کا معنی و مفہوم:-

بندہ اللہ کا ولی ہے ولی کے پہلے معنی کی رو سے ولی اللہ کا معنی یہ ہوا کہ وہ بندہ جو اللہ کی طرف سے تصرف کا حق رکھتا ہے اللہ رب العزت نے اس کو تصرف کا حق دے دیا ہے اور وہ جو کچھ کرتا ہے اللہ رب العزت کی طرف سے کرتا ہے لیکن اللہ رب العزت تو ہر قسم کے نقص یا کمزوری سے پاک ذات ہے تو بندہ اللہ کا ولی کس معاملے میں بنتا ہے؟ اللہ کو کسی معاملہ میں بھی کسی دوسرے کی ولایت کی حاجت نہیں وہ اس سے پاک اور بے نیاز ذات ہے لیکن اس نے محض اپنے فضل و احسان سے اپنے خاص بندوں کو نوازنے کے لئے بنی نوع انسان کی رشد و ہدایت، ان کی اصلاح احوال کے بہت سے معاملات ان کے سپرد فرما دیئے ہیں۔ اللہ کی طرف سے بندے کو ان معاملات کی سپردگی کو ولایت کہتے ہیں۔ اور یہ معاملات جس کے سپرد کیے جاتے ہیں اس کو ولی اللہ کہتے ہیں۔

اگر وہ ولایت میں کامل ہو تو جو فیصلہ وہ کرتا ہے وہی رب کا فیصلہ ہوتا ہے چونکہ وہ اللہ کا ولی ہے اور اللہ نے ان امور پر اس کو متصرف بنایا ہے اس لئے اسے اللہ رب العزت ارشاد فرماتا ہے کہ میرے بندے جو تیرا فیصلہ ہو گا وہی میرا فیصلہ ہو گا جو تیرا کہنا ہو گا وہ تیرا کہنا نہیں میرا کہنا ہو گا۔

گفتہ او گفتہ اللہ بود

گر چہ از حلقوم عبد اللہ بود

یہ مقام ولایت جس کو عطا کیا جاتا ہے اس کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا۔

من عادل و لیا فقد اذنتہ بالحرب (۵۷) جس نے میرے ولی سے عداوت رکھی میرا اس کے ساتھ اعلان جنگ ہے۔

کیونکہ اس کا معاملہ اس کا معاملہ ہی نہیں بلکہ وہ تو میرا معاملہ ہو گیا ہے اس سے محبت کرو گے تو مجھ سے محبت ہوگی اس سے دشمنی کرو گے تو مجھ سے دشمنی ہوگی۔ وہ میرا بندہ ہے میں نے اپنے دین کا کام اپنی مخلوق کی بھلائی کے کام ان کی رشد و ہدایت کے کام جو کچھ اس کے سپرد کرنا تھا کر دیئے اور وہ کام اس بندہ نے اپنے ذمہ لے لئے وہ بندہ میرا ولی ہو گیا اور اس بندہ نے اپنے سارے کام میرے سپرد کر دیئے تو میں اس کا ولی ہو گیا۔

### حضرت اویس قرنیؓ اور مقام ولایت:

ایک شخص حضرت اویس قرنیؓ کے پاس زیارت کے لئے حاضر ہوا تو اس نے دیکھا کہ ایک بھیڑیا آپ کی بھیڑیوں اور بکریوں کی حفاظت کر رہا ہے اور آپ خود دریا کے کنارے ریت پر مصروف عبادت ہیں۔ وہ شخص یہ منظر دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا وہ آپ کے پاس بیٹھ گیا جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو اس سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ بتاؤ کس کام سے آئے ہو۔ اس نے کہا کہ اپنا کام تو بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے اس کا مفہوم سمجھائیں جو میں نے مشاہدہ کیا ہے۔ آج تک تو سنتے آئے تھے کہ بھیڑیے بکریوں کو چیر پھاڑ جاتے ہیں اور آج یہاں بھیڑیے کو بکریوں کی حفاظت و نگہبانی کرتے دیکھا ہے یہ ماجرا کیا ہے؟

آپ نے فرمایا بات سادہ سی ہے کہ جو بندہ رب کے کام میں لگ جائے رب کی مخلوق اس کے کام میں لگ جاتی ہے میں اللہ کے کام میں مشغول ہو گیا اللہ نے اپنی مخلوق کو میرے کام پر لگا دیا۔ اگر میں نماز نہ پڑھ رہا ہوتا تو بکریوں کی حفاظت کرتا میں اس کی عبادت میں مشغول ہو گیا تو اس نے بھیڑیے کو میری بکریوں کی حفاظت پر مامور فرما دیا۔

ہم اس مفہوم کی وضاحت کر رہے ہیں جس کے تحت ولی وہ ہوتا ہے جس کے معاملات اللہ کے سپرد ہو جائیں اور اللہ نے اپنے بندوں کے معاملات اس کے سپرد کر رکھے ہوں۔ اس لئے اللہ کے ولی کے پاس جانا ان سے تعلق و ارادت قائم کرنا گویا اللہ کے غیر کے پاس جانا نہ ہو بلکہ اللہ ہی کی بارگاہ کی طرف رجوع ہوا اور یہ جو۔

مفاطلہ پیدا کیا جاتا ہے کہ آپ اللہ کے ولیوں کے پاس کیوں جاتے ہیں؟ اللہ کے پاس کیوں نہیں جاتے۔ یہ مغالطے اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ ولی اور ولایت کا مفہوم نہیں سمجھا گیا۔ کیونکہ وہ اللہ کے ولی ہیں اور اللہ ان کا ولی ہے انہوں نے اپنے سارے معاملات بھی رب کے حوالے کر دیئے ہیں تو ان کی بارگاہ اللہ کے غیر کی بارگاہ بھی نہیں بلکہ وہ تو اللہ ہی کی بارگاہ ہے۔

اسی طرح ولی اللہ کا دوسرا مفہوم (جبکہ ولی ولایت واؤ کی زیر سے مشتق ہو جس کا معنی حکمرانی و بادشاہی ہے) یہ ہو گا کہ جب بندہ اللہ کا ولی بننا ہے تو وہ اپنے بندے کو صاحب ولایت بنادیتا ہے اور ولایت دینے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ رب لعزت یہ اعلان کرتا ہے کہ لوگو! میں نے اس بندے کو تمہارا حکمران بنادیا ہے میری طرف سے میرا یہ بندہ تمہارا بادشاہ بنادیا گیا ہے۔ اب اگر حضرت ابراہیم بن ادھم دریا کی مچھلیوں کو حکم دے گا کہ میری سوئی لے کر نکل آؤ تو مچھلیاں فوراً اسی حکم کی تعمیل پر نکل آئیں گی۔ کیونکہ یہ مچھلیوں پر بھی حکمران ہے دریاؤں کی لہریں اور تمہارے دلوں کی سر زمین سب اس کی حکمرانی میں داخل ہیں۔

### حضور غوث الثقلین رضی اللہ عنہ اور مقام ولایت:

حضرت غوث الاعظم سید عبدالقادر جیلانی کی مجلس وعظ میں ہزاروں کا مجمع ہوتا اور بغیر سپیکر کے آپ کی آواز تمام لوگوں تک برابر پہنچتی۔ جس طرح پہلی صف والے لوگ سنتے آخر میں بیٹھنے والے بھی اسی طرح آپ کی آواز سے مستفیض ہوتے جب آپ باہر تشریف لاتے تو مجمع کھڑا ہو جاتا اور آپ کی زیارت کے لئے لوگوں کے جذبات قابل دید ہوتے اور ہنگامہ سا برپا ہو جاتا مگر ایک دن ایسے ہوا کہ آپ مجمع کو چیرتے ہوئے مجمع کے درمیان آگئے اور آپ کے استقبال کے لئے ایک شخص بھی کھڑا نہ ہوا۔ کسی خادم نے دریافت کیا کہ حضور کیا بات ہے؟ تو آپ نے فرمایا لوگوں کے دلوں پر حکمرانی ہمارے پاس ہے ہم چاہیں تو اٹھنے دیں اور چاہیں تو نہ اٹھنے دیں۔ اس سے اتنی سی بات آہستہ سے کہی اچانک سارا مجمع کھڑا ہوا۔ فرمایا نہ اٹھنے کا رنگ بھی دیکھ لیا اب اٹھنے کا رنگ بھی دیکھ لو۔

جب اللہ اپنے کسی بندے کو مقام ولایت عطا فرماتا ہے تو اسے خلق خدا کے دلوں پر حکمرانی عطا فرماتا ہے اور یہ حکمرانی ہماری دنیا کی حکمرانی سے مختلف ہوتی ہے۔ دنیا کا حکمران جب تک کرسی پر رہتا ہے لوگ سلام کرتے ہیں اور جب کرسی سے ہٹ جاتا ہے تو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ ہزار ہا حکمران دنیا پر حکمرانی کرتے رہے مگر ان کا نام لینے والا کوئی نہیں۔ بلکہ ان کی حیات میں جب اقتدار و حکمرانی ان سے چھن لی گئی تو لوگوں نے ان کا چہرہ بھی



پہچاننے سے انکار کر دیا۔

دوسری طرف اللہ کے دل کی حکمرانی ہے کہ حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کو اس دنیا سے پردہ فرمائے بھی تقریباً ایک ہزار سال گزر گئے مگر آپ کے مزار پاک پر جا کر دیکھیں لوگوں کے دلوں پر آپ کی حکمرانی نظر آئے گی حضور غوث الاعظمؒ، حضرت خواجہ خواجگان خواجہ امیرؒ، حضور بابا فرید الدین گنج شکر اور دیگر بے شمار اولیاء کرام جن کو وصال فرمائے بھی صدیاں گزر گئیں۔ مگر ان کی حکمرانی جو اللہ نے انہیں انسانوں کے دلوں پر عطا کی وہ اب بھی قائم ہے اور قیامت تک قائم رہے گی۔

### مفہوم ولایت حدیث قدسی کی روشنی میں:

حضور غوث الاعظمؒ نے اپنی کتاب سر الاسرار میں ولایت کا ماحصل اور نتیجہ یوں بیان فرمایا ہے کہ انسان اپنے اندر اخلاق الہیہ پیدا کرے جیسا کہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے۔

تخلقوا باخلاق اللہ (۵۸) اپنے اندر خدائی اخلاق پیدا کرو۔

اور بشری صفات کا لباس اتار کر صفات الہی کا لباس پہن لو۔

جب انسان بشری لباس اتار بھینکے اور اخلاق الہیہ کا لباس پہن لے۔ بشریت کا رنگ ختم کر کے اپنے آپ کو اللہ کے اوصاف اور اللہ کے اخلاق کے رنگ میں رنگ لے اور ”تخلقوا باخلاق اللہ“ کا رنگ پوری طرح چوڑھ جائے تو اسی کو ولایت کہتے ہیں۔ اس مقام کو ایک حدیث قدسی کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔

لابز ال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرے قریب ہوتا چلا جاتا احببته فکننت سمعه الذی یسمع به وبصره ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا الذی یبصر به ویدہ التی یبطش بها ورجله ہوں۔ پس میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ التی یمشی بها ولان سا لنی لا عطینہ و لئن سئتا ہے اور اسکی بصارت بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔ استعاذنی لاعیذ نہ۔ (۵۹)

اور اس کے پاؤں (کی قوت) بن جاتا ہوں جس سے وہ

چلتا ہے اگر وہ مجھ سے کوئی سوال کرے تو اس کے سوال

کو ہر صورت پورا کروں گا اور اگر وہ میری پناہ طلب

کرے تو میں یقیناً اسے پناہ دوں گا۔

اوصاف بشریت کا لبادہ اتار کر انسان جب اخلاق خداوندی کا جامہ زیب تن کر لیتا ہے تو سستا انسان ہے مگر سننے کی قوت اللہ رب العزت کی ہوتی ہے دیکھتا بندہ ہے مگر دیکھنے کی قوت اللہ رب العزت کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ پکڑتا بندہ ولی ہے مگر گرفت اللہ رب العزت کی ہوتی ہے بولتا انسان ہے مگر قوت گویائی اللہ کی طرف سے عطا کی جاتی ہے۔ چلتا بندہ ہے مگر پاؤں کی قوت اللہ کی طرف سے ہوتی ہے گویا اس حدیث قدسی کی روشنی میں ولایت کا معنی یہ ہے کہ انسان قرب کی منزل طے کرتا ہو اللہ کی بارگاہ میں اس طرح قرب حاصل کر لے کہ بندہ خدا کا ہو جائے اور خدا بندے کا ہو جائے۔ بندہ اللہ کا ولی ہو جائے اور اللہ اپنے بندہ کا ولی بن جائے۔

### قرب نوافل، قرب فرائض اور جمع بین القربین:

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی کتاب ”الانتباء فی سلاسل الاولیاء“ میں قرب نوافل، قرب فرائض اور جمع بین القربین کے نام سے قرب خداوندی کی تین منازل میں ولی اللہ کے تین مختلف احوال کا ذکر فرماتے ہیں کہ قرب نوافل تو یہ ہیں کہ بندہ کو اللہ رب العزت کی بارگاہ میں مقام حاصل ہوتا ہے کہ تمام افعال کا فاعل بندہ ہوتا ہے جبکہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا تعلق قرب بطور آلہ اس عمل و فعل کا ذریعہ ہوتا ہے جیسا کہ حدیث قدسی میں ”بی یسمع، بی یبصر، بی ینطق، بی یبطش اور بی یمشی“ الفاظ سے معلوم ہو رہا ہے کہ سستا، دیکھنا، بولنا، پکڑنا اور چلنا انسان کا فعل ہوتا ہے مگر تمام افعال کا محرک اور ذریعہ اللہ رب العزت کی ذات ہوتی ہے میں اسکے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے ان افعال کا فاعل انسان ہی ہوتا ہے اور ذرائع آلہ افعال و اعمال خود خدا ہوتا ہے یہ قرب نوافل ہے اور اس سے ترقی کر کے جب انسان قرب فرائض کے مقام پر پہنچتا ہے تو حالت بدل جاتی ہے کہ یہاں بندہ صرف آلہ رہ جاتا ہے فاعل خود رب ذوالجلال ہوتا ہے۔ قرب نوافل میں فاعل خود بندہ تھا اللہ تعالیٰ کا تعلق اس فعل کا آلہ تھا مگر یہاں قرب فرائض کے مقام پر پہنچ کر انسانی عمل و فعل کا فاعل خود اللہ تعالیٰ ہو جاتا ہے اور انسان صرف آلہ اور ذریعہ رہ جاتا ہے قرب نوافل میں اللہ رب العزت نے فرمایا کہ میں کان بننا ہوں سستا بندہ ہے، میں زبان بننا ہوں تو بولتا خود بندہ ہے مگر قرب فرائض میں ترتیب بدل جاتی ہے کہ سستا میں ہوں کان بندے کے ہوتے ہیں بولتا میں ہوں زبان بندے کی ہوتی ہے حضور ﷺ نے سیدنا فاروق اعظمؓ کے متعلق قرب فرائض کے مقام کو ان الفاظ میں بیان فرمایا۔

ان الله جعل الحق على لسان عمرو قلبه. بیشک اللہ رب العزت نے (حق بات) کو حضرت عمر کی زبان پر اور ان کے دل میں رکھ دیا ہے۔ (۶۰)

قرب فراخص یہ ہوا کہ زبان عمر فاروق کی ہوتی ہے اور بولتا اللہ رب العزت ہے پھر ولایت ترقی کرتی چلی جاتی ہے۔ رب کی دوستی انسان کو اللہ کی بارگاہ کے قریب سے قریب تر کرتی چلی جاتی ہے۔ بشریت کا رنگ اترتا چلا جاتا ہے اور صفات الہیہ کا نیارنگ چوھتا چلا جاتا ہے اور یوں اس راہ پر ترقی کرتے کرتے قرب کا تیسرا درجہ جمع بین القربین بن جاتا ہے جہاں بندہ نہ فاعل رہتا ہے اور نہ آلہ و ذریعہ بلکہ فاعل بھی اللہ رب العزت خود ہوتا ہے اور آلہ کار بھی وہ خود ہوتا ہے یہاں بندے کا پنا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ بس خالی بندہ خالی بندہ ہی رہ جاتا ہے مگر اس میں ساری قوتیں رب کی کار فرما ہو جاتی ہیں گویا بندہ مقام محبوبیت کو پالیتا ہے اپنے ارادہ و فعل کو اللہ کے ارادہ و فعل میں گم اور فنا کر دیتا ہے تو یہ تیسرا درجہ جمع بین القربین کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔

اب وجود تو انسان کا ہے مگر اس کی ساری قوتیں معدوم ہو گئیں اس کے ارادے نیتیں اور فاعلیت سب کچھ عدم ہو گئے اب فاعلیت بھی رب کی ہے ارادہ بھی اسی کا ہے۔ نیت بھی اسی کی ہے اور فیصلہ بھی اسی کا ہے یہ بندہ تو ایک قسم کا پتلا ہے جدھر رب چلا رہا ہے چل رہا ہے بھگ رہا ہے جارہا ہے وہ ہنسا رہا ہے تو ہنس رہا ہے وہ لا رہا ہے تو رو رہا ہے اس کے ظاہر پر تصرف اللہ رب العزت کا ہے یہ مقام جمع بین القربین ہے اللہ نے اپنے حبیب ﷺ کی ذات میں یہ تینوں قرب جمع فرما دیے۔

قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے۔

و ما رمیت اذ رمیت ولكن الله رمى (۶۱) اور (اے رسول ﷺ) جس وقت آپ نے مٹھی

بھر خاک دشمن پر پھینکی تھی۔ آپ نے نہ پھینکی تھی بلکہ اللہ نے پھینکی تھی۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے تینوں مقامات کا ذکر فرمایا۔

و ما رمیت اے محبوب ﷺ آپ نے کنکریاں نہیں پھینکیں۔ یہ قرب خداوندی ہے۔

اذ رمیت جب آپ نے پھینکی تھیں۔ اس میں قرب نوافل کا بیان ہے ولكن الله رمى بلکہ وہ تو اللہ نے مارے۔

حضور ﷺ نہ آلہ فعل رہے نہ فاعل رہے بلکہ فاعل بھی اللہ رب العزت اور آلہ فعل بھی وہ خود ہو گیا

تو قرب کا مقام جمع بین القربین ہے۔

لفظ تصوف کا چوتھا اور آخری حرف ”فا“ ہے ایک بندہ جب توبہ اور صفائے قلب و باطن کے جملہ مراحل طے کر کے ولایت کے درجے پر فائز ہو جاتا ہے تو یہاں سے اس کی اعلیٰ منازل شروع ہو جاتی ہیں۔ ”فا“ سے تو بعض صوفیاء نے فقیر بھی مراد لیا ہے لیکن حروف تصوف میں سیدنا غوث اعظمؒ نے فنایت کا مقام مراد لیا ہے اور حقیقت یہ ہی کہ یہی وہ ارفع و اعلیٰ مقام ہے جہاں ولایت تام ہوتی ہے۔ دیدار ذات یعنی مشاہدہ محبوب کے بعد محبوب کے جلودں میں گم ہو جانا ہی بندگی کی معراج ہے۔ وہ اس مقام رفیع پر زمانی و مکانی حدود و قیود سے آزاد ہو کر حسن ازلی کے نشے میں مستغرق ہو گئے ہیں۔ (۶۲)

### چوتھا حرف ”فا“:

#### ف سے فنا کا تصور اہل صفا کی نظر میں

اللہ رب العزت کا یہ ارشاد گرامی کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ کم ہونے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی ہمیشہ رہنے والا ہے فنا و بقا کے تصورات کی اساس ہے۔ حضرت علی ہجویریؒ المعروف داتا گنج بخشؒ ”کشف المحجوب“ میں فنا کے مقدمات کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس جہاں کی ابتداء عدم سے ہوئی اور انتہاء عدم پر ہے اور جو ان دونوں صورتوں کے درمیان ہے وہی بقا ہے۔ بقا سے مراد دوام و ابدیت وجود ہے وہ علم جو اس دنیا میں ہے فانی ہے اور باقی علم وہی ہے جو کہ عقیقی اور اخروی زندگی پر دار و مدار رکھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اہل ولایت بقا و فنا کے علم کو تصوف کا ایک درجہ کمال جانتے ہیں اور اسے اس مقام کے سوا اور کہیں استعمال نہیں کرتے۔ (۶۲)

اہل صفا مقام حال کے تغیرات سے رہائی اور مطلوب کو حاصل کر لینے کے بعد فنا کو پہنچتے ہیں اور وہ ہر اس محسوس شے سے بے نیاز ہو جاتے ہیں جو باصرہ اور سامعہ کے راستے ان پر وارد ہوتی ہے۔ فنایت کے اس درجے میں وہ استغاثہ نکل جاتے ہیں کہ خواہشات کا کائنات بھی ان کے دل سے یکسر نکل جاتا ہے حتیٰ کہ صادر ہونے والی کرامتیں بھی ان کے نزدیک حجاب بن جاتی ہیں۔ پھر اپنی خواہشات کی اپنے وجود سے نفع کر کے وہ اپنے اوصاف کو فنا کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ اوصاف کا فنا کر دینا گویا بقا کے دوام کا دروازہ ہے جس سے گزر کر ان کی فنا بقا کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے اور وہ قرب و بعد، ہوش و مدہوش، صحو و سکر، فراق و وصال سب کیفیات سے بے

خبر ویرگانہ ہو جاتے ہیں۔ (۶۳)

کم علم اور نادان لوگ اپنی کم فہمی کی بنا پر فنا کی حقیقت و ماہیت سمجھنے سے قاصر ہیں اس لئے کہ فنا ایک ایسی صفت ہے جو بقا کو مستلزم ہے اور یہ دونوں صفتیں مل کر ہی مقام عبودیت کی تشکیل کرتی ہیں۔ فنا کا عین مراد لیا جانا امر محال ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ فنا میں مجاہدے کا عمل دخل ہوتا ہے۔ جب کہ بندہ صفاتی طور پر ماسوی اللہ سے فانی ہو جاتا ہے تو اس کے اوصاف ناسوتی فنا ہو جاتے ہیں اور اسے بقائے لاہوتی میسر آ جاتی ہے اور وہ بقا کے مقام پر پہنچ جاتا ہے جو بقاء الہی کا مظہر ہے جہاں پہنچ کر اس کے اوصاف بھی بقا کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ جو چیز کسی کے ساتھ ملی ہوگی تو وہ دونوں چیزیں فی الاصل ایک ہوں گی۔ فنا اور بقا دونوں ہماری صفتیں ہیں ہمارے اوصاف کی تحقیق میں فنا اور بقا دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ لیکن یہ کہنا روا ہوگا کہ فنا اور بقا یکسر جداگانہ صفتیں ہیں اس لئے کہ فنا سے ذکر غیر اور بقا سے ذکر حق مراد ہو گا وہ جو اپنے آپ سے فانی ہو جائے حق کے ساتھ باقی رہتا ہے فنا بندے کا اپنی عبودیت کے اعتبار سے فانی ہو جانا ہے اور بقا بندے کا حق پر باقی رہنا ہے اگر کوئی بندہ اپنے مقامات بندگی میں الجھ جائے اور اس کی بندگی اسے اپنی نگاہوں میں چھپنے لگے تو وہ مقام بندگی کو کھونے لگتا ہے۔ بندہ اپنی بندگی کی حقیقت تک تب ہی پہنچتا ہے۔ جب اس کا عمل اس کی نگاہوں میں چھج ہو جائے اور ہمہ وقت ذات حق کا مشاہدہ ہی اس کی نگاہ میں رہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ بندے کے تمام اعمال و افعال اس کے اپنے ارادہ اور طاقت کی طرف منسوب کرنے کی بجائے ذات حق تعالیٰ کی طرف منسوب ہوں۔ بندے کا ہر فعل ناقص اور فاعل حقیقی کا ہر فعل کامل ہوتا ہے چنانچہ جب بندہ غیر اللہ کے تعلقات سے فانی ہو جاتا ہے تو وہ فنا بمعیت سے آگے گزر کر بقائے دوام کی منزل کو پا لیتا ہے۔ (۶۴)

آخر میں یہ بات دھیان میں رہے کہ فنا و بقا کے سرچشمے اخلاص و وحدانیت سے پھوٹتے ہیں یہی عبودیت کی جان ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ زندہ قہی ہے جب بندہ اپنے آپ کو حکم حق مقہور اور ہر اعتبار سے مغلوب و عاجز تصور کرنے لگتا ہے تو عجز و انکسار اس کی سرشت میں شامل ہو جاتا ہے اور وہ فنا کی وادیوں سے گزر کر مملکت بقائے دوام میں جا نکلتا ہے جو شخص فنا کو عین فنا اور بقا کو عین حق سمجھتا ہے وہ حقیقی تصوف سے دور نصاریٰ اور زندقہ کے مذاہب پر عمل پیرا ہے جب بندے کے دل پر عظمت حق منکشف ہوتی ہے تو وہ اپنے دل سے دنیا و ماسوا کا ہر تصور مٹا دیتا ہے اور تمام مقامات یہاں تک کہ کرامات کا ظہور بھی اس کی نگاہوں میں چھج ہو جاتا ہے۔ فنا سے فنا ہو جانا گویا حق سے ہم کلام ہونا ہے۔ جس میں جسم و جان اور قلب و روح سر تاپا عجز و فر دہی سے ہمکنار ہو جاتے

ہیں۔ (۶۵)

## تصوف کا اصطلاحی مفہوم:

گزشتہ سطور میں ہم نے مختلف حوالوں اور جہتوں سے تصوف کے مفہیم و معانی پر لغوی و سناظر میں بحث کی ہے اب ہم اس کے اصطلاحی معنی و مفہوم کی طرف آتے ہیں۔ غور کیا جائے تو بیان کردہ لغوی معانی میں الفاظ کے اختلاف کے باوجود ایک قدر ظاہر و باطناً مشترک نظر آتی ہیں اور وہ یہ کہ تصوف کا مقصود و حاصل قلب و باطن کی صفائی و طہارت سے عبارت ہو یا اللہ سے مخلصانہ دوستی اور محبت و مودت کا تعلق قائم کرنے سے بارگاہ الوہیت میں عجز و نیاز مندی اور تذلل کا اظہار ہو یا ادنیٰ لباس کے پہناوے میں اللہ سے محبت پر مبنی تعلق میں یکسوئی پیدا کرنے سے عبارت ہو یا اصحاب صفہ کا طرز زندگی اپنانے سے یہ سارے کے سارے احوال و کیفیات ایک خاص جہت کی نشاندہی کر رہے ہیں جو زندگی کے ظاہر و باطن کو اس قدر منزہ اور پاک و صاف کرنے کی متقاضی ہے کہ جس میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی ادنیٰ سے ادنیٰ نافرمانی تک کا شائبہ بھی باقی نہ رہے زندگی کا ظاہر بھی اللہ کی رضا کے تابع ہو جائے اور باطن بھی رذائل اخلاق و معصیت و غفلت اور اثم و عدوان کے میل کچیل سے پاک صاف ہو جائے کہ انوار و تجلیات الہی کا مہبط بن جائے نتیجتاً دل اللہ کی محبت میں اس قدر یکسو اور مستغرق و منہمک ہو جائے کہ اس ذات سے دوستی و تعلق کی حلاوت میں نہ دنیا کی حرص خلل انداز ہو اور نہ آخرت کی طلب، حاصل کلام یہ کہ ہر قسم کے لوٹ و غرض سے پاک اور کامل اخلاص پر مبنی طرز زیست کا نام تصوف ہے۔ (۶۶)

حضرت مخدوم علی جویری المعروف داتا گنج بخش نے کشف المحجوب میں شیخ محمد بن احمد المغربی کے حوالے سے تصوف کی اصطلاحی تعریف یوں بیان فرمائی۔

التصوف اقامة الاحوال مع الحق (۶۷) تصوف احوال کو حق کے ساتھ قائم رکھنے کا نام ہے۔ تصوف اس طرز زندگی کا نام ہے جس میں بندہ غیر اللہ سے منہ موڑ کر اپنے معبود و محبوب حقیقی کے ساتھ بے لوٹ رشتہ قائم کر لیتا ہے نتیجتاً اس تعلق بندگی سے اسے وہ روحانی لذت و انبساط اور لطف نصیب ہوتا ہے جسے اقبال کی زبان حقیقت ترجمان نے اس طرح ادا کیا۔

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو

عجب چیز ہے لذت آشنائی

جن خوش نصیب لوگوں کو محبوب حقیقی کے ساتھ تعلق آشنائی استوار ہو جاتا ہے انہیں اس تعلق کی حلاوت و

کیفیت دنیا و مافیہا سے بے نیاز کر دیتی ہے اور اس کے صلے میں جو یک گوشت و لذت و یکسوئی نصیب ہوتی ہے اس کے دوام کو تصوف کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اس کا صحیح ادراک وہی کر سکتے ہیں جو ان قلمی واردات و روحانی تجربات سے عملاً گزرتے ہیں۔ حق بات تو یہ ہے کہ تصوف سراسر حال سے عبارت ہے اور اس کی ماہیت و حقیقت کا ادراک محض قائل سے ممکن نہیں۔

امام معروف کرخیؒ فرماتے ہیں۔

التصوف هو الاخذ بالحقائق و الياس ممافی تصوف حقائق کو لینا اور مخلوق کے ہاتھوں میں جو کچھ ابدی الخلائق (۶۸) ہے اس سے بے نیاز ہو جانے کا نام ہے۔

اگر تمسک بالحقائق اور استغناء عن الخلق انسان کا حال بن جائے تو اس کی زندگی کا ہر لمحہ ان کیفیات عظمیٰ سے ہمکنار ہوتا ہے جو توحید کا نقطہ کمال ہے۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

شیخ الاسلام زکریا انصاریؒ فرماتے ہیں۔

التصوف هو علم تعرف به احوال تزكية النفوس تصوف وہ علم ہے جس سے ابدی سعادت کے حصول کی و تصفية الاخلاق و تعمير الظاهر و الباطن لنيل غرض من تزكية نفس، تصفية اخلاق اور تعمیر ظاہر و باطن کا السعادة الابدية. (۶۹) طریقہ معلوم کیا جاتا ہے۔

یعنی تصوف انسان کی ابدی سعادتوں کی شاہ کلید ہے جو اس پر عظمتوں اور رفعتوں کے دروا کرتی چلی جاتی

ہے۔

دل اگر اسی خاک میں زندہ و بیدار ہو

تری نگہ توڑ دے آئینہ مہر و ماہ

شیخ ابو بکر اسحاق بخاریؒ فرماتے ہیں۔

قال بشر ابن الحارث الصوفي من صفا قلبه بشر بن حارث کہتے ہیں کہ صوفی وہ ہے جس کا قلب اللہ کے لئے صاف ہو جائے۔ (۷۰)

یعنی جس کا دل ماسوا اللہ کے خیال تک سے پاک ہو جائے۔

ضمیر پاک و نگاہ بلند و مستی شوق

نہ مال و دولت قارون نے فکر افلاطون

لوئیس معلوف ایسوی یوں رقم طراز ہیں۔

الصوفی من كان فانيا بنفسه باقيا بالله تعالى صوفی وہ ہے جو اپنے نفس میں فانی مگر اللہ کی ذات کے مستخلصا من الطباع متصلا بحقیقة الحقائق. ساتھ تعلق میں باقی ہو طباع انسانی سے غیر متعلق اور ذات حقیقہ سے متصل ہو۔ (۷۱)

سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا قول ہے۔

التصوف الصدق مع الحق و حسن الخلق مع تصوف حق کے ساتھ سچائی ہے اور مخلوق کے ساتھ بھلائی الخلق. (۷۲) سے پیش آتا ہے۔

صوفی کی تعریف میں آپ نے یہ بھی فرمایا ہے۔

الصوفی من كان صافيا من افات النفس خاليا صوفی وہ ہے جو آفات نفس سے پاک اس کے دفاع سے من مذمو ماتھا سالما لحمید مذاہب ملازما خالی اس کے اچھے راستوں پر چلنے والا اور حقائق سے للحقائق غیر ساکن قلبہ الی احد من الخلائق متمسک ہو اور مخلوق میں سے کسی کے ساتھ دلی وابستگی نہ رکھے۔ (۷۳)

شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے صوفی اور تصوف کی ایک ہزار سے زائد تعریفیں بیان کی ہیں جن کا احاطہ یہاں ممکن نہیں۔ ان کے علاوہ متعدد دائمہ اور مشائخ نے جن میں معروف کرخیؒ، شیخ الاسلام، زکریا انصاریؒ، شیخ محمد بن احمد المغربیؒ، شیخ ابوبکر بن اسحاق بخاریؒ اور امام عبد الوہاب شعرانیؒ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ تصوف اور صوفی کی تعریفیں بیان کی ہیں۔

المختصر تصوف اس طرز زندگی کا نام ہے جس میں تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن کے ذریعے معرفت ربانی کی تحصیل ہوتی ہے دوسرے لفظوں میں وہ طریق شریعت جس کے ذریعے تزکیہ نفس اور صفائے باطن کے آداب و احوال معلوم ہوں اور معرفت الہی کا نور میسر آئے۔ تصوف کہلاتا ہے۔

**تصوف و طریقت اور شریعت کے مابین کوئی تضاد نہیں:**

شریعت اور طریقت کے مابین تخالف و تضاد کا الزام محض سطح بینی کا نتیجہ ہے اگر بظہر عمیق دیکھا جائے تو یہ



حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ کمال شریعت کا نام ہی تصوف یا طریقت ہے خدا اور رسول کے احکام کا اتباع جب تک ظواہر تک محدود رہے اس کا نام شریعت ہے اور جب اس کے اثرات قلب و باطن پر مترتب ہونے لگیں اور باطن ان کی نورانیت سے منور ہونے لگے تو اسے فیضان تصوف سے تعبیر کیا جاتا ہے مثلاً جب کسی شخص نے کتب فقہ میں مندرج قواعد کے مطابق نماز پڑھ لی تو فقہاء کے نزدیک اس کی نماز ہو جائے گی مگر اہل طریقت اسے کافی نہ سمجھیں گے بلکہ ان کا مسلک یہ تقاضا کرے گا کہ جس طرح چہرہ کعبہ کی جانب متوجہ رہا قلب بھی رب کعبہ کی جانب متوجہ رہے اور جیسے جسم حالت نماز میں ظاہری نجاستوں اور آلائشوں سے پاک رہا، روح بھی باطنی آلودگیوں اور نجاستوں سے پاک رہے گویا تصوف و طریقت و شریعت کے مخالف و محارب نہیں بلکہ عین اس کے منشاء کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہیں۔

تصوف کے ذریعے کسی انسان کا روحانی بلند یوں کو پالینا دراصل اس درجہ احسان پر فائز ہو جانا ہے جس کا ذکر اس متفق علیہ حدیث میں کیا گیا ہے جسے محدثین کرام حدیث جبریلؑ کے اسم سے موسوم کرتے ہیں اس حدیث میں مرد مومن کے تین درجات ایمان، اسلام اور احسان بیان کئے گئے ہیں۔

حضرت جبریل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ عالیہ میں جب بصورت بشر حاضر ہوئے تو ایمان اور اسلام کے متعلق سوال کرنے کے بعد پوچھا۔

فاخبرنی عن الاحسان قال ان تعبد الله كانك پس (اے نبی ﷺ) مجھے احسان کے متعلق بتائیے تراہ فان لم تکن تراہ فانه يراك۔ (۷۴) فرمایا! یہ کہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرے گویا کہ تو اسے دیکھتا ہے اور اگر تو نہ دیکھ پائے تو کم از کم یہ کہ وہ تجھے دیکھتا ہے۔

پس کیفیت اول اخلاص فی العمل کا وہ درجہ کمال ہے جہاں طالب ”فنا فی المطلب“ ہو جاتا ہے اور کیفیت ثانی اس سے کمتر ہے ایمان اور اسلام، عقیدہ و عمل سے عبارت ہیں، اس سے ماوراء وہ مقام ہے جسے مذکورہ حدیث میں اصطلاحاً ”احسان“ تعبیر کیا گیا ہے تصوف ہی کا دوسرا نام ہے اور یہی احسان شریعت کا دوسرا نام ہے۔

## علم تصوف کی تعریف اور غایت:-

رسالہ قشیریہ کے حاشیہ پر حضرت شیخ الاسلام زکریا انصاری رحمۃ اللہ علیہ نے تصوف کے حسب ذیل معانی بیان

فرمائے ہیں جو کہ بالکل حضرات صوفیائے کرام کا مقصود ہے۔

التصوف هو علم تعرف به احوال تزكية تصوف وہ علم ہے جس سے تزکیہ نفوس اور تصفیہ اخلاق اور النفوس و تصفیة الاخلاق لتعمير ظاہر و باطن کی تعمیر کے احوال پہچانے جاتے ہیں۔ تاکہ الباطن والظاهر لنیل السعادة الابدية و سعادت ابدی حاصل ہو۔ نفس کی اصلاح ہو اور رب يحصل به اصلاح النفس و المعرفة للعلمین کی رضا اور اس کی معرفت حاصل ہو اور تصوف کا لرضاء الرب و موضوعه التزكية و موضوع تزکیہ، تصفیہ اور تعمیر باطن ہے اور اس کا مقصد التصفية والتعمير المذكورات وغايته بدی سعادت کا حصول ہے۔

نیل السعادة الابدية۔ (۷۵)

تعریف، موضوع، غایت کا بیان اس لیے کیا گیا ہے کہ ہر علم کی شان ان امور سرگاندہ سے واضح ہوتی ہے اور ہماری غرض یہ ہے کہ تصوف و سلوک کا دین اسلام میں جو مقام اور مرتبہ ہے وہ ظاہر ہو جائے اور کسی کے لئے اس امر کی گنجائش نہ رہے کہ محض اس احتمال سے یہ علم ظنی ہے وہ اسے قابل اعتنا نہ سمجھے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ دین کے دوسرے شعبوں میں ہزاروں مسائل ایسے ہیں جن کی حیثیت ظنی مسائل کی ہے۔ انہیں قبول کر لینا اور علم تصوف میں صرف ظنی کا احتمال پیدا کر کے اسے چھوڑ دینا اور اس عقیدہ میں غلو کرنا علمی دیانت سے بعید ہے۔ ایسا کرنا درحقیقت ارباب تصوف یعنی اولیاء اللہ سے عداوت کرنے کے مترادف ہے جس کے لئے ”من عاد لی ولیا فقد اذنتہ بالحرب“ کی وعید موجود ہے۔ اس لئے تصوف کے معاندین اپنی عاقبت کی فکر کریں۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ جو شخص کسی فن میں مہارت نہیں رکھتا، اسے اس فن اور اہل فن پر تنقید کا حق نہیں پہنچتا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فلاسفہ جنہیں علم و تحقیق پر بہت ناز ہے جب تصوف پر بحث کرتے ہوئے۔ مسئلہ کشف پر آتے ہیں تو انہیں اس عاجزانہ اعتراف کے بغیر اور کوئی راستہ نہیں ملتا کہ

هذا طور وراء طور العقل لا يدركه الا اصحاب یہ عقل سے وراء الوراہ طور ہے جس کا اصحاب معرفت قوة القدسية ۔

ہی اور اگ کر سکتے ہیں۔

**تصوف کیا نہیں:**

تصوف کے لئے نہ کشف و کرامات شرط ہے نہ دنیا کے کاروبار میں ترقی دلانے کا نام تصوف

ہے۔ نہ تعویذ گنڈوں کا نام تصوف ہے۔ نہ جھاڑ پھونک سے بیماری دور کرنے کا نام تصوف ہے۔ نہ مقدمات جیتنے کا نام تصوف ہے نہ قبروں پر سجدہ کرنے، ان پر چادروں کو چڑھانے اور چراغ جلا کر کا نام تصوف ہے۔ اور نہ آنے والے واقعات کی خبر دینے کا نام تصوف ہے۔ نہ اولیاء اللہ کو غیبی ندا کرنا، مشکل کشا اور حاجت روا سمجھنا تصوف ہے۔ نہ اس میں ٹھیکیداری ہے کہ پیر کی ایک توجہ سے مرید کی پوری اصلاح ہو جائے گی اور سلوک کی دولت بغیر مجاہدہ اور بدون اتباع سنت حاصل ہو جائے گی۔ نہ اس میں کشف و الہام کا صحیح احراز لازمی ہے اور نہ وجد و تواجید اور رقص و سرود کا نام تصوف ہے۔ عام طور پر یہ سب چیزیں تصوف کا لازمہ بلکہ عین تصوف سمجھی جاتی ہیں۔ حالانکہ ان میں سے کسی ایک چیز پر بھی تصوف اسلامی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ بلکہ اس قسم کی خرافات اسلامی تصوف کی عین ضد ہیں۔ (۷۶)

## (۲) ”تصوف کا آغاز“

جہاں تک اسلامی تصوف کے آغاز کا تعلق ہے تو اس کی ابتداء اس وقت سے ہوئی جب پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ نے دنیوی علائق سے الگ ہو کر غار حرا کی تنہائی میں اپنے خالق کی تسبیح و تہلیل میں مشغول ہونا شروع کیا۔ غار حرا میں گوشہ نشینی کا مقصد کائنات کی ماہیت اور خالق کائنات کی قدرت کا ملہ پر غور و خوض کرنا بھی تھا۔ آپ سوچا کرتے تھے۔

”کائنات کے خالق کی ذات و صفات کے بارے! مخلوق سے خالق کا کیا واسطہ ہے؟“

آپ ہر سال تھوڑے سے سامان خور و نوش کے ساتھ رمضان کا پورا مہینہ اس غار میں بسر کیا کرتے تھے۔ دنیا کے آرام و آسائش سے قطعی بے نیاز ہو جاتے تھے۔ مادی زندگی سے کچھ واسطہ نہیں رکھتے تھے۔ (۷۷)

آنحضرت ﷺ کی یہ زندگی گویا سراسر روحانی تھی۔ اس طرح کی زندگی ان مسائل کے لئے از حد ضروری ہے۔ جن کا تعلق معرفت خالق، معرفت کائنات اور معرفت نفس انسانی سے ہو۔ امر واقع یہ ہے کہ اپنے نفس کو پہچانے بغیر خدا کو پہچانا ممکن نہیں اس لئے حدیث شریف میں آیا ہے۔

من عرف نفسه فقد عرف ربه (۷۸) جس نے اپنے نفس کو پہچانا تو بیشک اپنے رب کو پہچانا۔

حضور ﷺ کو آئندہ چلکر نبوت کے منصب اعلیٰ پر فائز ہونا تھا اس لئے اس طرح عزلت گزریں و گوشہ نشینی ہو کر تزکیہ نفس کی خاص ضرورت تھی۔ جب تک انسان تزکیہ نفس کر کے بشریت کے تقاضوں کو ترک نہ کرے اس وقت

تک اس کے لئے معرفت خداوندی کا حصول ناممکن ہے۔ جہاں رسول اکرم ﷺ کی اس زندگی کا پروگرام آنے والے ایک بڑے مقصد کی تیاری تھا وہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تعلق باللہ اور حب الہی کی یہی کڑی اور یہ سلسلہ اسلامی تصوف کا آغاز تھا۔ (۷۹)

اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ تو قبل از اسلام کی زندگی ہے لہذا تصوف کی ابتداء اسلام سے کس طرح ہوئی؟ یہ اعتراض کسی طرح بھی معقول نہیں۔ اس لئے کہ نبوت کوئی کبھی شے نہیں بلکہ وہی ہے۔ اور نبی بعد میں نہیں بنتا بلکہ شروع ہی سے ہوتا ہے۔ لہذا نزول وحی سے قبل کی زندگی بھی نبی کی زندگی ہے جس کی ہر طرح سے اللہ تعالیٰ نے حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ آپ کی اس زندگی کو آئندہ زندگی کی تمہید یا مقدمہ کہا جاسکتا ہے۔

بعد ازاں جب وحی کی ابتداء ہوئی تو اسلام نے اپنے آغاز کے ساتھ اسلامی تصوف کی بھی ابتداء کی۔ یہ حیات روحیہ عبارت تھی۔ خوف خدا، احساس بندگی اور علائق دنیاوی سے بے نیازی کی جس کا بروئے کار لانا زہد و تقویٰ کی تکمیل کا آئینہ دار تھا جو اپنے ساتھ وہ تمام مظاہر لائی جو دنیا سے زیادہ بے نیازی اور دین سے زیادہ سے زیادہ رغبت کے موجب تھے۔ وہ دین جو آغاز اسلام میں تمام مسلمانوں کے دلوں میں عام تھا۔ روحانی زندگی کا یہ وہ نمونہ تھا۔ جس کا بہترین نمونہ رسول اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ کی حیات گرامی تھی۔ اس مبارک زندگی کے قول و عمل دونوں سے مسلمان کامل طور پر متاثر ہوتے تھے۔ یہی وہ نقش قدم تھا جس پر چلنا وہ اپنے لئے باعث فوز و فلاح سمجھتے تھے لیکن یہ کیفیت زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔ (۸۰)

ڈاکٹر احمد علوش فرماتے ہیں کہ بہت سے لوگ سوال کرتے ہیں کہ ابتداء اسلام میں تصوف کے عدم پھیلاؤ کا کیا سبب ہے۔ صحابہ و تابعین کے دور میں یہ دعوت ظاہر کیوں نہ ہوئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کے زمانہ میں اس کی ضرورت نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دور کے لوگ متقی و پرہیزگار، اصحاب مجاہدہ اور فطرتی طور پر عبادت پر کامل توجہ دیتے تھے۔ کیونکہ ان کا زمانہ حضور پاک ﷺ کے زمانے سے متصل و قریب تھا۔ وہ تمام امور میں بنی پاک ﷺ کی اتباع میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ان کی تربیت کے لئے کسی علم کی ضرورت نہ تھی جو ان کی ان اعمال کی طرف راہنمائی کرتا جن کو وہ فطرتی طور پر انجام دے رہے تھے۔ ان کی مثال اس خالص عربی النسل کی طرح تھی جسے عربی زبان اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملی ہو۔ اس کو عربی زبان میں اتنی مہارت ہوتی ہے کہ وہ فطری طور پر شعر کہنے لگتا ہے حالانکہ وہ لغت، اعراب اور نظم و نثر کے قواعد کو نہیں جانتا۔ اس قسم کے آدمی کیلئے ضروری نہیں کہ وہ علم نحو اور بلاغت سیکھے۔ کیونکہ ان علوم کو جاننا اس وقت ضروری ہوتا ہے جب لغت کی اغلاط عام ہو جائیں اور ضعف تعبیر غالب ہو جائے۔ یا اس

عجمی کیلئے قواعد کا جاننا ضروری ہے جو عربی زبان کو سیکھنا اور سمجھنا چاہتا ہے یا یہ علوم اس وقت ضروری ہوتے ہیں جب یہ معاشرہ کی ضرورت بن جاتے ہیں اور علم تصوف بھی دوسرے علوم کی طرح ہے جو مناسب اوقات میں معرض وجود میں آئے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اگرچہ متصوفین کے نام سے موسوم نہیں تھے لیکن حقیقت میں صوفی تھے۔ اور تصوف کا سب سے بڑا مقصد انسان کا اپنے رب کے لئے زندگی بسر کرنا ہے نہ کہ اپنے نفس کیلئے۔ اور اپنے آپ کو زہد، دائمی عبادت اور ہر لحظہ روح اور قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کرنا، اور ان تمام کمالات سے اپنے کو متصف کرنا ہے جن کی وجہ سے صحابہ کرامؓ اور تابعین نے اعلیٰ روحانی درجات کو حاصل کیا۔ انہوں نے ایمان اور فرائض اسلام کو ادا کرنے میں صرف اقرار پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ اقرار کو ذوق اور وجدان کے ساتھ ملا دیا۔ اور فرائض ادا کرنے کے ساتھ ساتھ ان نقلی عبادات پر مواظبت اختیار کی جن کا حکم حضور پاک ﷺ نے فرمایا تھا۔ وہ مکروہات کے قریب تک نہ گئے چہ جائیکہ محرمات۔ حتیٰ کہ ان کی بصیرت روشن اور تابناک ہو گئی۔ ان کے دلوں سے حکمت کے سرچشمے پھوٹے اور اسرار ربانیہ کی ان پر بارش ہوئی۔ یہی حال تابعین اور تبع تابعین کا تھا۔ یہی تینوں ادوار تاریخ اسلام کے بہترین اور خوبصورت ادوار ہیں۔ انہیں ادوار کے متعلق حضور پاک ﷺ نے فرمایا۔

خیر القرون قرنی هذا فالذی یلیہ والذی یلیہ۔ بہترین زمانہ میرا یہ زمانہ ہے اس کے بعد متصل آنے والا اور پھر اس کے بعد متصل آنے والا زمانہ ہے۔“ (۸۱)

پھر جب کافی وقت گزر گیا اور دین اسلام میں مختلف قومیوں میں داخل ہوئیں۔ اور علوم کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ اور یہ علوم ہر علم کے ماہرین کے درمیان تقسیم ہو گئے تو ہر فریق نے ان علوم و فنون کی تدوین کی جن میں انہیں مہارت حاصل تھی صدر اول میں نحو کی تدوین کے بعد علم فقہ، علم توحید، علوم حدیث، اصول دین، تفسیر، منطق اور علم میراث کی تدوین ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد یہ روحانی اثر بتدریج کم ہو گیا۔ اور لوگوں کی توجہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور روحانیت سے ہٹنے لگی تو ارباب ریاضت و زہد نے یہ ضرورت محسوس کی کہ وہ بھی علم تصوف کو مدون کریں۔ اور تمام علوم پر اس کی فضیلت اور شرف و عظمت کو ثابت کریں بعض مستشرقین کی یہ رائے غلط ہے کہ صوفیاء کرام نے دیکھا کہ علماء دوسرے علوم کی تدوین میں مشغول ہو گئے ہیں۔ انہوں نے احتجاجاً تصوف کی تدوین کی بلکہ اس علم کی تدوین روحانی کمی کو پورا کرنے اور زندگی کے ہر میدان میں ضروریات دین کو پورا کرنے کے لئے ضروری تھی۔ کیونکہ نیکی اور پرہیزگاری کے اسباب مہیا کرنے کیلئے باہمی تعاون بھی ضروری ہے۔

مفتد میں صوفیاء کرام نے تصوف کی بنیاد خاص اصولوں پر استوار کی۔ اور یہ تاریخ سے ثابت شدہ حقیقت ہے۔ تصوف کی تاریخ شیخ محمد صدیق غماری کے اس فتویٰ سے واضح ہوتی ہے۔ آپ سے تصوف کے موسس اول کے بارے میں سوال کیا گیا۔ اور دریافت کیا گیا کہ کیا اس کی بنیاد آسمانی وحی ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ طریقت کی بنیاد آسمانی وحی پر ہے۔ جس طرح کہ دوسرے کامل دین محمدی ﷺ کی بنیاد آسمانی وحی پر ہے۔ کیونکہ یہ بلاشبہ وہی مقام احسان ہے جو دین کے تین بنیادی ارکان سے ہے جن کو حضور پاک ﷺ نے دین قرار دیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

هذا جبرائیل علیہ السلام اتاکم یعلمکم دینہ جبرائیل علیہ السلام ہیں اور یہ تمہیں تمہارا دین ینکم۔ (۸۲) سکھائیائے ہیں۔

اس حدیث پاک میں دین سے مراد اسلام، ایمان اور احسان ہے۔ اسلام اطاعت اور عبادت کا نام ہے۔ اور ایمان نور اور عقیدہ کا نام ہے۔ اور احسان، مراقبہ اور مشاہدہ کا نام ہے۔ یعنی تو اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرے گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔ اور تو اسے دیکھ نہیں رہا تو یہ تصور ہو کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

شیخ محمد صدیق غماری اپنے رسالہ میں فرماتے ہیں کہ اسلام تین ارکان کا مجموعہ ہے جس نے مقام احسان (جسے طریقت بھی کہا جاتا ہے) ترک کیا، اس کا دین بلاشبہ ناقص ہے۔ کیونکہ اس نے ارکان اسلام میں ایک رکن کو ترک کر دیا۔ ایمان اور اسلام کی تصحیح کے بعد مقام احسان ہی وہ غایت ہے جس کی دعوت اہل طریقت دیتے ہیں۔

ابن خلدون فرماتے ہیں کہ علم تصوف کا شمار جدید علوم شرعیہ میں ہوتا ہے۔ صوفیاء گرام کا طریقہ، صحابہ کرامؓ، تابعین اور بعد میں آنے والے سلف صالحین کے نزدیک طریقہ حق اور ہدایت ہے۔ تصوف کا مقصد اصلی یہ ہے کہ انسان عبادت کی طرف متوجہ ہو کر کلیۃ اللہ کا ہو جائے۔ دنیا و مافیہا کی لغویات سے کنارہ کشی اور لذت دنیا، مال و جاہ جس کا عام دنیا دار حریص ہوتا ہے۔ اس سے اعراض کرے۔ اور مخلوق کو چھوڑ کر عبادت کیلئے گوشہ نشینی کو پسند کرے یہ تمام خوبیاں صحابہ اکرمؓ میں پائی جاتی تھیں۔ ان کے بعد لوگ دنیا کے شیدائی اور حریص ہو گئے۔ تو لفظ تصوف عبادت گزار لوگوں کا طرہ امتیاز بن گیا۔

ابن خلدون کی اس عبارت میں ہمارا مقصود آخری جملہ ہے جس میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ تصوف اور صوفیاء کرام کا ظہور لوگوں کے دنیا کی طرف متوجہ ہونے کا نتیجہ تھا۔ اور دوسری صدی ہجری میں صوفیاء کرام کی جماعت موجود تھی۔ اور یہ ان حالات کا تقاضا تھا کہ یہ عبادت گزار لوگ کسی ایسے اسم کے ساتھ متصف ہوتے جو انہیں ان عوام الناس سے ممتاز اور مخصوص کر دیتا جن کو اس فانی دنیا نے غافل کر دیا تھا۔

شیخ محمد صدیق غماری فرماتے ہیں کہ ابن خلدون نے لفظ تصوف کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کی تائید ”کندی“ کے قول سے ہوتی ہے۔ اس نے اپنی کتاب ”ولاء مصر“ میں دوسری صدی ہجری کے واقعات کا ذکر کیا ہے کہ سکندر یہ میں ایک جماعت ظاہر ہوئی ہے جو اپنے آپ کو صوفیہ کہتے ہیں یہ لوگ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں۔ اسی طرح مسعودی نے ”مروج الذهب“ میں یحییٰ بن ائثم سے نقل کیا ہے کہ وہ ایک دن خلیفہ مامون کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ کہ اچانک اس کا حاجب علی بن صالح آیا اور کہنے لگا کہ دروازے پر ایک آدمی کھڑا ہے جس نے سفید موٹے کپڑے پہنے ہیں اور مناظرہ کیلئے داخلے کی اجازت پا رہا ہے۔ یحییٰ بن ائثم کہتا ہے کہ میں نے جان لیا کہ صوفیاء میں سے ہے۔

یہ دونوں حکایتیں نشاۃ تصوف کی تاریخ کے بارے میں ابن خلدون کے قول کی موید ہیں اور ”کشف النطنون“ میں ذکر کیا گیا ہے کہ سب سے پہلے لفظ صوفی سے مشہور ہونے والے بزرگ ابو ہاشم صوفی (المتوفی ۱۵۰ھ) تھے۔ صاحب کشف النطنون نے تصوف کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے امام قشیری کے قول کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ نبی کریم ﷺ کے بعد مسلمان صحابی کے نام سے متصف تھے کیونکہ صحبت رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کوئی درجہ نہیں۔ اس لئے انہیں صحابہ کرام کے نام سے یاد کیا گیا۔ پھر لوگوں کے احوال اور مراتب مختلف ہو گئے۔ وہ خواص جو دین پر سختی سے کاربند تھے۔ انہیں زہاد اور عباد کہا جانے لگا۔ پھر جب بدعتوں کا ظہور ہوا اور مختلف گروہوں کے درمیان کشمکش ہو گئی اور ہر فریق دعویٰ کرنے لگا کہ ان کے گروہ میں زہاد اور عباد لوگ موجود ہیں تو اہلسنت و الجماعت کے خواص، مقررین بارگاہ اور غفلت سے اپنے دلوں کی حفاظت کرنے والوں کے ساتھ لفظ تصوف خاص ہو گیا، اور دوسری صدی ہجری سے پہلے ہی اس لفظ سے مشہور ہو گئے۔

اس مذکورہ بحث سے واضح ہو جاتا ہے کہ تصوف کوئی مستحدث جدید شے نہیں بلکہ نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ اور صحابہ کرام کی پاکیزہ زندگیوں سے ماخوذ ہے۔ یہ ان اصولوں سے ماخوذ نہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق ہی نہ ہو جیسا کہ اسلام دشمن مستشرقین اور ان کے شاگرد گمان کرتے ہیں۔ انہوں نے نئے نئے الفاظ وضع کیے ہیں اور وہ تصوف کو کبھی بدھ مت، رہبانیت اور کبھی نصرانی کمانیت اور کبھی ہندی شعبہ بازی قرار دیتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ بدھ مت، ہندی، نصرانی اور ایرانی یہ تصوف کی مختلف قسمیں ہیں۔

وہ اس سے ایک طرف تو لفظ تصوف کو بدنام کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف تصوف پر یہ تہمت لگانا چاہتے ہیں کہ اس کا آغاز قدیم اصول اور گمراہ کن فلسفیانہ نظریات سے ہوا۔ لیکن مومن کامل ان کے فکری جذبات کی رو میں نہیں

بہتا۔ اور ان کی مکارانہ چالوں میں نہیں پھنستا۔ وہ امور کو سمجھنے اور حقیقت کی تلاش میں غور و فکر سے کام لیتا ہے۔ اس کے نزدیک تصوف کا تعلق صرف اور صرف دین اسلام سے ہے۔ (۸۳)

## ”عہد صحابہ اور عہد رسالت کے تصوف کی بنیاد“ کس طرح پڑی؟

حضور ﷺ اور خلفائے راشدین کے بعد لوگ مختلف الرائے ہو گئے۔ راستے ہر ایک نے جدا بنالیے۔ نفسانی خواہشات کا غلبہ ہو گیا۔ زاہد اور متقی لوگوں کی بنیادیں ہل گئیں۔ جہالت نے غلبہ پالیا۔ عادتیں بگڑ گئیں۔ لوگ بد اعمالیوں میں گرفتار ہو گئے۔ یہ سب دنیا کی محبت میں پھنس کر رہ گئے۔ (۸۴)

ایسے ناشائستہ ماحول میں کچھ حضرات نے گوشہ نشینی کو اختیار کیا۔ اسباب کو چھوڑ کر ہمہ تن اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس ریاضت کے باعث ان میں صفائے فہم پیدا ہوئی اور علوم الہی کے قبول کرنے کے لائق ہو گئے۔ اس طرح ان کو ظاہری زبان کے ساتھ ساتھ باطنی زبان اور عرفان حاصل ہوا اور ایمان ظاہری کے ساتھ ایمان باطنی سے بہرہ ور ہوئے۔ جیسا کہ حضرت حارثؓ نے فرمایا۔ جب مجھے غیر معمولی ایمان کے مرتبہ کا کشف ہوا جو عام لوگوں میں نہیں پایا جاتا تو اس وقت میں حقیقی اور صحیح معنوں میں مومن بن گیا۔

ان گوشہ نشینوں نے علوم جدیدہ کے لئے ایسی اصطلاحات وضع کیں۔ جو ان کے خیالات کی ترجمانی کر سکیں۔ ان کے وجدان و باطنی کیفیات کو ظاہر کر سکیں۔ انہیں اصطلاحات کو تعلیمات تصوف کہا جانے لگا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا حتیٰ کہ ایک باقاعدہ علم و رسوم کی شکل اختیار کر لی۔ (۸۵)

حضور ﷺ کی صحبت حاصل کرنے والوں نے آپ کی صحبت کے سوا اسم علم یا اور کسی نام کو اپنے لئے پسند نہیں فرمایا۔ چنانچہ انہیں صحابہ کہا گیا۔ جب دوسرا زمانہ کے لوگ آئے تو صحابہ کی صحبت میں رہنے والوں کو تابعین کہا گیا۔ انہوں نے اس نام کو نہایت ہی شرف والا نام سمجھا۔

پھر ان کے بعد کے لوگوں کو اتباع التابعین کہا گیا۔ اسکے بعد لوگوں میں اختلاف پیدا ہوا اور جدا جدا مراتب پیدا ہو گئے۔ چنانچہ ان خاص قسم کے لوگوں کو جنہیں دینی امور کے ساتھ خاص لگاؤ تھا ”زاہد“ اور ”عابد“ کہنے لگے۔ پھر بدعتیں رونما ہونے لگیں۔ ہر فرقہ مدعی بن بیٹھا کہ ان میں ”زاہد“ پائے جاتے ہیں۔



چنانچہ اہلسنت میں سے ان خاص لوگوں نے جنہوں نے اپنے انفاس کو اللہ کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اپنے لئے ایک الگ نام ”تصوف“ رکھا۔ ان بزرگوں کے لئے یہ نام دوسری صدی ہجری سے پہلے مشہور ہو چکا تھا۔ (۸۶)

پھر کچھ مدت بعد غیر اسلامی اور اجنبی عناصر بھی اس تصوف کی پاکیزہ زندگی میں داخل ہو گئے۔ فلسفہ اور تصوف میں ایک قسم کا امتزاج پیدا ہو گیا۔ اور وہ سادگی اور اخلاص نہ رہا جو پہلے تھا۔ یہ دیگر عناصر جب اسلامی حیات روحیہ میں گھل مل گئے تو اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ روحانی زندگی نے مختلف اور متنوع قسم کی صورتیں اختیار کر لیں۔ اس طرح مقصد اور راستے بھی بدلتے گئے۔

اب تصوف اور روحانیت کا مدار اس پر نہ رہا کہ تصفیہ قلب و دماغ ہو، رب سے رشتہ مضبوط ہو، مادیت سے بے نیازی اختیار کی جائے۔ بلکہ یہ بجائے خود ایک دین اور مذہب بن گیا۔ جس پر فرقہ بندیاں بن گئیں اور نئے نئے گل بوٹے کھلنے لگ گئے۔

اب مقصد متاع دنیاوی سے بے نیازی جب جاہ سے نفرت اور رضوان اللہ کا حاصل کرنا نہ رہ گیا بلکہ یہ ہو گیا کہ اسے ایک دوسرے مقصد کے حصول کا وسیلہ بنالیا گیا۔ یعنی وجہ اللہ کا مطالعہ، جمال ازلی کا مشاہدہ، کچھ عرصہ بعد یہ رنگ بھی قائم نہ رہا یعنی انسان مطالعہ اور مشاہدہ پر قائم نہ رہا بلکہ اور آگے بڑھا۔ ریاضت اور مجاہدے سے تجاوز کر کے وہ فلسفہ کی دقیقہ کاری کا شکار ہو گیا اور اب تصوف کا مقصد یہ رہ گیا کہ انسان جب درجہ کمال کو پہنچے تو اپنی ذات کو فنا کر کے اپنے رب سے جا ملے۔ یہیں سے روحانی زندگی ایک نیا چولہا بدلتی اور جدید رنگ اختیار کرتی ہے۔

یہ تھا تصوف کے مختلف ادوار کا اجمالی خاکہ جس میں تصوف نے کئی رنگ بدلے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تصوف کی اصلیت بھی عمقا ہوتی گئی۔ (۸۷)

### (۳) ”تصوف کا مقصد و پس منظر“

تصوف ایک جامع ہمہ گیر تصور حیات ہے جو اپنے مقاصد کے اعتبار سے معراج حیات ہے۔ یہ فلسفہ جب کسی کی ذات میں عملاً متحقق ہو جائے تو اسے عروج و کمال سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ اگر روح تصوف کا فہم حاصل ہو جائے اور اس کی حقیقی تعلیم سے آگاہی میسر آ جائے تو اہل بصیرت کو یہ سمجھنے میں چنداں مشکل نہیں رہتی کہ فلسفہ تصوف اصلاً چھ بنیادی مقاصد کا مجموعہ ہے جن میں سے تین کا تعلق اعمال سے ہے اور تین کا احوال سے ہے۔ تین مقاصد عملی مشقت اور جدوجہد

جہد کا تقاضا کرتے ہیں جبکہ دوسرے تین مقاصد کیفیات قلبی اور باطنی سرور پر مبنی ہیں۔  
اگر ان کی تفصیل میں جائیں تو مقاصد تصوف کی تعداد ہزاروں سے بھی متجاوز ہو جائے گی لیکن یہ سارے کے سارے مقامات و احوال اور تمام تعلیمات کلی اعتبار سے ان چھ مقاصد کے ضمن میں آ جاتی ہیں۔ ان چھ مقاصد کو مرحلہ وار ان عنوانات کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے۔

### مرحلہء اولیٰ:-

(۱) تزکیہ نفس

(۲) صفائی قلب

(۳) اطاعت حق

### مرحلہء ثانیہ:-

(۱) محبت الہی

(۲) رضا الہی

(۳) معرفت الہی

اگر یہ چھ مقاصد متحقق ہو جائیں تو تصوف کی راہ میں سالک کی پوری جدوجہد اپنی تکمیل کمال کو پہنچ جاتی ہے ان میں سے کوئی مقصد اور تعلیم و فلسفہ نہ تو حرکت عمل اور انقلاب کے منافی ہے اور نہ ہی جمود و تعطل کی تعلیم پر مبنی ہے۔ کوئی ایک مقصد بھی ایسا نہیں جس میں جنگل اور غاروں میں زندگی برباد کر دینے کا تصور ہو یا رسم و رواج اور بے جان خانقاہی نظام سے چمٹ جانے کی تعلیم ہو۔ تصوف کی جدوجہد کا نقطہ آغاز تزکیہ نفس ہے۔

### ۱۔ تزکیہ نفس:-

تزکیہ نفس جو تصوف کی زندگی کا پہلا قدم ہے۔ انسانی زندگی کو اپنے من کی تمام آلائشوں اور کدورتوں سے پاک کر دینے کا نام ہے گویا تصوف کا نقطہ آغاز تقاضا کرتا ہے کہ نفس انسانی کذب و دروغ گوئی سے پاک ہو جائے۔  
ریا کاری و منافقت جیسے رذائل دور ہو جائیں کبر و نخوت اور غرور و تکبر کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ حسد و کینہ اور بغض و عناد کا خاتمہ ہو جائے۔ دنیا کی محبت اور لالچ سے انسانی قلب پاک ہو جائے۔ اور ان رذائل کی جگہ عجز و انکسار، خشوع و خضوع، تذل و تواضع، نفع بخشی و فیض رسانی، فہم و ذکا، جود و سخا اور محبت الہی جیسے فضائل انسان کے

قلب و باطن کو منور کر دیں۔ اور انسان کا نفس ہر قسم کے رذائل کا انکار کر دے اور ان سے بیگانگی محسوس کرے۔ جب انسان کا قلب و باطن پاک ہو جائے تو اس کا زوایہ نظر بدل جاتا ہے۔

تزکیہ نفس کا مقصود یہ ہے کہ انسان دوسروں کو خود سے بہتر تصور کرے اگر کوئی چھوٹا ہو تو اسے اس لئے خود سے بہتر سمجھے کہ اس کی عمر کم ہے لہذا اس نے مجھ سے کم گناہ کیے ہیں اگر کوئی بڑا ہے تو اسے اس لئے بہتر سمجھے کہ یقیناً زیادتی عمر کے باعث اس کی نیکیاں مجھ سے زیادہ ہیں۔

زدا یہ نظر کی یہ تبدیلی دراصل امثال ہے اس حدیث نبوی ﷺ کا آپ ﷺ نے دوسروں کے بارے میں گمان کرنے کے باب میں فرمایا۔

ظنوا للمومنین خیرا (۸۸) مومنین کے متعلق حسن ظن رکھو۔

گویا دوسروں کو اپنے سے بہتر جاننا اور اپنی ذات کے اندر موجود ہر قسم کے کبر و غرور اور خود پرستی کی نفی کر دینا تزکیہ نفس کا پہلا قدم ہے۔ جو انسان ہر وقت حصار ذات میں مقید رہتا ہے اسے غرور و نخوت اور احساس کبر غفلت میں مبتلا رکھتا ہے۔ ہر وقت ذاتی توصیف و آفرین کے چکر میں رہتا ہے۔ اور خیال کرتا ہے کہ میں دوسروں کی نسبت زیادہ عالم ہوں، باعمل ہوں، نیک ہوں، زیادہ خوبیوں اور صلاحیتوں کا مالک ہوں۔ اس لیے دوسروں سے بہتر ہوں۔

تزکیہ نفس کی پہلی ضرب اس خام خیالی پر پڑتی ہے اور خود پرستی کے اس بت کو پاش پاش کر دیتی ہے تزکیہ نفس تقاضا کرتا ہے کہ اگر تجھے تصوف اور حقیقت کی راہ پر چلنا ہے تو اپنی ذات کے حصار کو توڑ کر خود پرستی کے بت کو پاش پاش کر کے تجھے اپنے غرور و کبر سے نجات حاصل کرنا ہوگی ورنہ تم دین کے داعی بن کر جتنے بھی بت توڑو گے، تو حید کا علم بلند کرو گے، شرک کو نیست و نابود کرنے کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دو گے لیکن تمہارے من کا بت نہیں ٹوٹ سکے گا۔ اور جب حقیقت آشکار ہوگی تو تمہیں غالب کی زبان میں اعتراف کرنا پڑے گا۔

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں

ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

جو لوگ شریعت و طریقت کی راہ پر چلتے ہیں وہ اپنی راتیں عبادت و ریاضت میں گزارنے کے باوجود اس قدر منکسر ہوتے ہیں کہ شاہد ہماری عبادت میں کوتاہی کے باعث یہ بات گناہ بن گئی ہو وہ بارگاہ ربوبیت میں عرض پرداز ہوتے ہیں کہ اے مولا! جس ڈھب سے تیری عبادت کرنا تھی اس ڈھب سے تو ہم آگاہ نہ تھے۔ شاہد تجھے ہماری ریاضت کا یہ انداز پسند بھی آیا ہے یا نہیں! تو نے ہماری اس کاوش کو شرف قبولیت بخشا ہے یا نہیں! یہی وجہ ہے کہ وہ

عبادت کر کے بھی خود کو گناہ کا تصور کرتے ہیں اور ادھر بد نصیبی و خود فریبی کا یہ عالم ہے کہ محبت کی حلاوتوں سے بے بہرہ ہونے کے باوجود، اللہ سے جذباتی ربط کے فقدان کے باوجود خود کو اعلیٰ اور روح دین کے شناد گرداننے کا جنوں سوار ہے۔ یہی ہوا و ہوس، غفلت و کوتاہی، خود فریبی، خود پرستی اور غرور و کبریا کی کے بت ہیں جو اولاً خواہشات ہوتی ہیں ثانیاً ضروریات بن جاتی ہیں۔ اور پھر انکے ”واقع“ ہونے کا زعم ہو جاتا ہے۔ انسان ہوا و ہوس کے بت اپنے اندر پالتا ہے اور ان کی پرورش کر کے انہیں اپنا معبود بنا لیتا ہے۔ اور پھر شعوری اور لاشعوری دونوں سطحوں پر اس کی جبین نیاز ہوائے نفس کے ان بتوں کے آگے جھکنے لگ جاتی ہے۔ اس نفسانی کیفیت کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام مجید میں ارشاد فرمایا۔

اراءیت من اتخذالہہ ہواہ (۸۹) کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہشات کو اپنا معبود بنا لیا۔

جوزبان سے تو یہ کہتا ہے کہ میں اللہ کو اپنا رب مانتا ہوں لیکن درحقیقت وہ اللہ کو نہیں مانتا بلکہ اپنے ہوائے نفس کو عملاً اس نے خدا کے برابر لا کھڑا کیا ہے۔ ہم سے ہر شخص اپنے من کی دنیا میں جھانک کر دیکھے، خدا کی ذات اسے بصیرت بخش دے، اسے اپنے احوال کی خبر ہو جائے تو یہ دلخراش حقیقت سامنے آ جائے گی کہ ہم میں سے کوئی خود کو خدا کے برابر اور کوئی خدا سے بھی بڑھ کر تصور کرتا ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کا ایک واقعہ مفید مطلب اور آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ ایک عالم دین آپ کی خدمت میں بیعت کے لئے حاضر ہوئے۔ اور عرض کی حضرت! مجھے درس فقر دیجئے آپ نے فرمایا کہ ہم فقیروں کے پاس تو فقر کا ایک ہی سبق ہے اور وہ یہ کہ اگر اور کچھ بھی نہ ہو سکے تو اتنا ضرور کر دو کہ خدا کو اپنے سے بہتر نہ سمجھ سکو تو کم از کم اپنے جیسا ہی سمجھ لیا کرو۔

وہ عالم دین چونکے اور کہا ”استغفر اللہ“ آپ نے کیسی بات کہہ دی؟ یہ تو کفر ہے! ایک انسان کی کیا مجال کہ وہ خود کو اپنے خالق و مالک کے برابر تصور کرے۔ آپ نے فرمایا کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے فقیروں کے پاس تو یہی سبق ہے۔

پھر فرمایا مولانا! آپ رات مسافر خانہ میں قیام فرمائیں ان شاء اللہ! صبح ملاقات ہوگی اور پھر گفتگو کریں گے۔ رات کھانے میں مولانا کو دو روٹیاں بھیجی گئیں ایک تازی اور ایک باسی اور دو قسم کے سالن ایک تازہ اور ایک باسی۔ عالم دین موصوف نے کھانا شروع ہی کیا تھا کہ ایک محتاج دروازے پر آیا اور صدا لگائی کہ حضرت! مسافر ہوں۔ اللہ کے نام

پر کچھ مل جائے۔ انہوں نے باسی روٹی اور باسی سالن اٹھا کر اس محتاج کو دے دیا جبکہ تازہ روٹی اور تازہ سالن خود تناول فرمایا۔ صبح جب حضرت تونسویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے وہی والی باسی روٹی اور باسی سالن مولانا کے سامنے رکھ دیا اور فرمایا مولانا! اگر خدا کو اپنے جیسا ہی تصور کیا ہوتا تو خدا کے لئے باسی روٹی اور باسی سالن نہ دیا ہوتا اور تازہ سالن اور تازہ روٹی کو بھی برابر برابر تقسیم کر لیا ہوتا۔ آدھا کھانا خود کھا لیتے اور آدھا کھانا خدا کے نام پر مانگنے والے کو دے دیتے۔ یہ انتہائے نادانی ہے کہ ایک طرف تو لا خدا کو خود جیسا ماننے سے انکار ہے اور ایسا کہنے کو کفر گردانتے ہیں اور دوسری طرف عملاً خدا کو خود سے بھی۔۔۔ العیاذ باللہ! آپ نے فرمایا۔

اب بتاؤ! تم خود کو خدا کے برابر تصور کرتے ہو یا اس سے بھی بڑھ کر تصور کرتے ہو؟  
تصوف کی تعلیم تو یہ ہے کہ خدا سے بڑائی یا برابری کا تصور تو درکنار خدا کے کسی بندے کو بھی اپنے سے کمتر نہ سمجھو۔ تزکیہ نفس اسی وقت عمل میں آتا ہے۔ جب نفس انسانی ہر قسم کی برتری، بالاتری کے تصور سے پاک ہو جائے اور ہوائے نفس کے جتنے بت پال رکھے ہیں ان کو پاش پاش کر دے۔

ہوائے نفس کے بتوں کے آگے جھکنے سے انکاری ہو جائے اور اپنی جبین نیاز صوری و معنوی اعتبار سے صرف رب کائنات کے سامنے خم کر دے۔

اگر نفس انسانیت یہ کیفیت حاصل کر لے تو تصوف کا پہلا مقصد حاصل ہو جاتا ہے کیونکہ تزکیہ نفس نام ہے اس کیفیت کا جو بندے کو صحیح معنوں میں اللہ کا بندہ بنا دیتی ہے اور پھر انسان کی جبین کسی غیر کی دہلیز پر جھکنے کے بجائے صرف خالق حقیقی کی دہلیز پر جھکنے کا درس دیتی ہے اور وہ ذات الہی سے محبت کے اس نقطہ کمال کو پالیتا ہے جس کی طرف قرآن حکیم نے اشارہ کیا ہے۔

اننى وجهت وجهى للذى فطر السموات والارض میں نے تو اپنا منہ اسی ذات کی طرف یکسو ہو کر لیا جس  
حنیفا و ما انامن المشرکین (۹۰) نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

تعلیم تصوف کے اس پہلے مقصد کی تصدیق و توثیق قرآن مجید ان الفاظ میں کرتا ہے۔

ونفس وما سواها - فاللهمها فجورها و تقویہا اور نفس کی (یعنی انسانی جان کی) قسم اور اس کی (قدرت  
 قد افلح من زکھا وقد خاب ومن د سھا۔ (۹۱) حکمت کی) جس نے اس کو درست بنایا پھر اس کو اپنی  
 بدکاری (سے بچنے) کی سمجھ عطا کی یقیناً و ہر اد کو پہنچا جس  
 نے اپنے نفس کو پاک کر لیا اور نامراد ہوا جس نیاں (روح  
 ) کو خاک میں ملا دیا۔

گویا تصوف کا تو پہلا ہی قدم انسان کو تعطل، جمود، غفلت اور تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں سے اٹھا کر اس کے قلب  
 و باطن کو روشنی و حرارت عطا کر کے اسے وہ حرکت، وہ انقلاب، وہ تازگی، وہ جوش و عمل اور قوت کر دار عطا کرتا ہے کہ پھر  
 تصوف کی راہ کا سالک، محبت الہی سے سرشار ہو کر اپنے فکر و عمل کی ضیاء بار یوں سے دنیا کو روشن روشن کر دیتا ہے۔ اس کی  
 ذات وہ سیل بے پناہ بن جاتی ہے کہ  
 ر کے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ

پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ  
 پھر وہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے نہ جھکتا ہے نہ لرزتا ہے نہ بکتا ہے اور نہ گھبراتا ہے گویا فلسفہ  
 تصوف مرد مومن کو وہ راہ دکھاتا ہے کہ اس کی شخصیت ایک چٹان بن جاتی ہے اور ہر قسم کی آلائشوں کے طوفان، مخالفتوں  
 کے جھکڑ اور خواہشات کی آندھیاں اس سے سر بیخ بیخ کے دم توڑ دیتی ہیں لیکن اس کے پائے ثابت میں ذرہ برابر لغزش  
 پیدا نہیں ہو پاتی کیونکہ وہ اس محبوب کی یاد میں مگن ہوتا ہے جس کے عشق و محبت کے نشہ کو کوئی ترشی آمادہ زوال نہیں کر سکتی  
 اور اللہ کا یہ دیوانہ و مستانہ بزبان حال اٹھنے والے تمام طوفانوں اور آفتوں کو مسکرا کر جواب دیتا ہے کہ  
 موج خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے

آستان یار سے اٹھ جائیں کیا

(۹۲)

## ۲۔ صفائے قلب :-

تزکیہ نفس کے بعد تصوف کا دوسرا بنیادی مقصد صفائے قلب ہے۔ جب نفس انسانی گناہ کی آلائشوں،  
 آلودگیوں اور رذائل اخلاق سے پاک ہو جاتا ہے تو اس طہارت کے اثرات انسان کے قلب و باطن پر مترتب ہونا شروع  
 ہو جاتے ہیں۔ جب انسان کی قوت غصبیہ اس کے لطیف جذبہ رحم اور عنو و در گذر سے مغلوب ہو جاتی ہے تو شخصیت میں

جمالِ یاقی پہلو غالب آ جاتا ہے۔ اور عملی زندگی میں اس کے اثرات محسوس و مشہور ہوتے ہیں۔ انسان کے اندر سے لالچ اور حرص کے گھٹیا داعیات و جذبات کا خاتمہ ہو جاتا ہے تو انسان میں ماسوا اللہ سے بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے جو محبت الہی کا پیش خیمہ ہوتی ہے پھر جوں جوں یہ بے نیازی بڑھتی چلی جاتی ہے در محبوب سے نیاز مندی میں شدت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اور دل کی دنیا بدلتی جاتی ہے۔ جب غرور تکبر کا خاتمہ ہو جاتا ہے تو دماغ سے انا و لا غیر کی کاخناس نکل جاتا ہے پھر انسان کے دل میں نرمی و رقت اور رانت پیدا ہوتی ہے۔ جو تجلیہ اور تصفیہ قلب کا سامان بنتی ہے۔ جب تصوف کا یہ دوسرا مقصد تکمیل پذیر ہوتا ہے تو دین کا ایک اہم تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔ تجلیہ قلب قرآن حکیم کی بنیادی تعلیم ہے کیونکہ کار جہاں اس قدر دراز ہے کہ۔

قدم انسان کا راہ دھر میں تھرا ہی جاتا ہے

کوئی بچ کے چلے کتنا یہ ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے

جو لوگ اپنے کئے پر نادم ہوتے ہیں، روتے ہیں اور اللہ سے معافی کے طلبگار ہوتے ہیں انہیں معاف کر دیا جاتا ہے۔ انکے دل پر لگ جانے والی آلودگی دھو دی جاتی ہے۔ اور جو اپنے گناہ پر اصرار کرتے رہ جائیں ان کے دلوں کا زنگ اور سیاہی مستقل ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کیفیت کا نقشہ قرآن حکیم نے یوں کھینچا ہے۔

کلا بل ران علی قلوبہم کانوا یکسبون۔ (۹۳) کوئی نہیں، بلکہ ان کے دلوں پر ان کی کمائیوں نے زنگ چڑھا دیا ہے۔

اس زنگ اور سیاہی کا سبب انسان کے وہ افعال ہوتے ہیں جو اس کی فطرت سے متصادم و متخالف ہوتے ہیں چونکہ اسلام دین فطرت ہے لہذا اسلام سے بھی متصادم ہوتے ہیں۔ اولاً، انسان کی شخصیت اندر سے ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے، گناہ کا اثر اس کے قلب و باطن کو بے قرار و مضطرب کر دیتا ہے۔ لیکن جب ان افعال میں اصرار پیدا ہوتا ہے تو یہ زنگ دل پر اس قدر چھا جاتا ہے کہ ضمیر مردہ ہو جاتا ہے۔ کوئی بھی بری بات بری نہیں لگتی۔ نتیجتاً دل طہارت کے نور سے خالی اور محبت الہی کی روشنی سے محروم ہو جاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ان افعال کے اثرات کو نہایت خوبصورت انداز میں فرمایا۔

عن ابی ہریرۃ عن رسول اللہ ﷺ قال ان حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت فرماتے ہیں کہ العبد اذا خطا خطیئة نکنت فی قلبہ سوداء آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا بے شک بندہ جب غلطی کا فاذا هونزع و استغفرو تا ب صقل قلبہ و ان ارتکب کرتا ہے تو اس کے دل میں سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے پس عاد زید فیہا حتی تعلو قلبہ و هو الران الذی اگر وہ اس سے باز آجائے اور توبہ و استغفار کرے تو اس ذ کر اللہ کلا بل ران علی قلوبہم ما کانو کئے دل کو صاف کر دیا جاتا ہے اور اگر وہ اس غلطی کا دوبارہ ارتکاب کرے تو اس سیاہی میں اضافہ کر دیا جاتا ہے یہاں ایکسبون - (۹۴)

تک کہ وہ سیاہی اس کے پورے دل پر چھا جاتی ہے اور یہی وہ ”الران“ ہے جس کو قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے ذکر فرمایا۔ خبردار بلکہ یہ ان کے اعمال ہیں جو ان کے دلوں پر غالب آ گئے۔

گویا تصوف کا ایک مقصد ”دل“ کو اسکی حقیقی کیفیت میں لے آنا ہے۔ اگر دل زنگ آلود رہا تو فاجر ہے اور اگر پاک ہو گیا تو متقی ہے اور پھر ہدایت قرآنی بھی اسی دل پر اثر انداز ہوتی ہے جو اثر پذیر ہو۔ جس طرح صاف، تازہ اور شیریں دودھ کو کوئی بھی صاحب دانش غلیظ، زنگ آلود اور بدبودار برتن میں نہیں ڈالتا اسی طرح اللہ سبحانہ جو حکمت و دانش کا منبع و سرچشمہ ہیں۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہدایت قرآنی کے نور کو زنگ آلود دلوں میں ڈال دیں کیونکہ غلیظ برتن تو خوشبودار دودھ کو بھی متعفن کر دے گا۔ جس طرح بارش گندی زمین پر ہوتی ہے تو بجائے سبزہ کے بدبو اور تعفن اٹھتا ہے۔

بارش ایک ہی ہے جو آسمان سے نازل ہوتی ہے قطروں میں کوئی امتیاز نہیں لیکن اثر مختلف ہوتا ہے اگر زمین پاک صاف کر دی گئی ہو۔ اس میں صحت مند بیج بودیا جائے اور پھر مسلسل رکھوالی کی جائے تو بارش اس زمین سے سبزہ اگاتی ہے۔ اور اسے تروتازگی ملتی ہے۔ لیکن اگر زمین کو صاف کر کے گندگی کو ختم نہ کیا گیا ہو تو جب بارش کے قطرے گرتے ہیں وہاں سے تعفن پھوٹتا ہے۔ بیماری جنم لیتی ہے اور زمین قابل نفرت ہو جاتی ہے۔ اگر دل کبر و نخوت، حرص و لالچ، خود پرستی، حب جاہ، منصب اور جذبہ بغض و عداوت سے متعفن رہے تو وہاں قرآنی تعلیمات کی بارش سے بھی تعفن پیدا ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کو ایک تمثیل کے ذریعے قرآن حکیم نے خوب بیان کیا ہے۔



واتل علیہم نباء الذی اتیناہ ایتنا فانسلیخ اے محبوب! ان کے سامنے اسکا حال بیان فرمائیے جسے ہم  
منہا فاتبعہ الشیطان فکان من الغاوین ولو نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا مگر وہ ان سے (اپنے قلبی  
شیئنا لرفعنا بها ولكنه اخلد الى الارض زنگ کے باعث) بھاگ نکلا۔ آخر کار شیطان اس کے  
واتبع هواہ فمثله کمثل الکلب ان تحمل علیہ پیچھے لگ گیا اور وہ بھٹکنے والوں میں سے ہو کر رہا اگر ہم  
یلہث او تتر کہ یلہث ذالک مثل القوم الذین چاہتے تو ان آیات کے ذریعے اسے عظمتیں عطا کرتے  
کذبوا بایتنا فاقصص القصص لعلہم لیکن (اس کے ضمیر نے اسے نہ جھنجھوڑا) وہ تو زمین (کی  
یتفکرون۔ (۹۵) پستی) سے چمٹا چلا گیا۔ اسکی مثال کتے جیسی ہے اب تم اس

پر حملہ کرو تب بھی (اسکی ہوا و ہوس) کی زبان لٹکی رہے گی اور  
اگر چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رکھے گا۔ یہی مثال ان  
لوگوں کی ہے جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں۔ آپ ان  
سے قصے فرماتے جائیں شاید کبھی یہ سوچنے پر مجبور  
ہو جائیں۔

اگر دل کی دنیا ویران ہو تو آیات کا علم بھی انسان کو کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ دل متقی ہو چکا ہو تو قرآن اسے ہدایت  
و استقامت عطا فرماتا ہے کیونکہ قرآن ”ہدی للمتقین“ ہے جب دل ہر قسم کی آلودگی سے مجلی و مصفی ہو جائے تو اس  
وقت وہ قرآن کی نظر میں قلب کا درجہ پاتا ہے۔ اس بارے میں قرآن کا ہی فیصلہ ہے کہ  
ان فی ذالک لذکری لمن کان لہ قلب۔ (۹۶) بے شک اس (بیان) میں درس عبرت ہے اس کے لئے  
جس کے پاس قلب سلیم ہو۔

صفائے قلب قرآن و سنت کی بنیادی تعلیم ہے اور تصوف کا دوسرا مقصد اس تعلیم کا امتثال کئے بغیر ممکن نہیں کہ  
پورا ہو جائے۔ قرآن کے یہ تقاضے تعطل و جمود، رہبانیت اور ترک دنیا کیسے ہو سکتے ہیں، جب قرآن مقاصد تصوف کی  
تعلیم دیتے ہوئے قلب سلیم کا تقاضا کرتا ہے۔

یوم لا ینفع مال ولا بنون الا من اتى اللہ بقلب جس دن نہ انسان کے مال کام آئے گا نہ اولاد مگر جو اللہ  
سلیم۔ (۹۷) کے پاس پاک دل لے کر آئے گا۔

اللہ تعالیٰ کے انوار کا جلوہ اسی وقت دل میں ارتکاز کرتا ہے جب دل ہر قسم کے زنگ اور آلودگی سے مصفی

ہو جائے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔

ان فی الجسد لمضغة اذا صلحت صلح الجسد بيشك جسم میں ایک لوتھڑا ہے اگر وہ صحیح ہو جائے تو سارا جسم کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وہی القلب صحیح ہو جاتا ہے اور اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا جو خراب ہو جاتا ہے خبردار آگاہ رہو وہ دل ہے۔ (۹۸)

تصفیہ قلب کے حصول کے لیے تعلیم نبوی میں عملی ذرائع بھی بیان کئے گئے ہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد پاک ہے۔

لکل شیء صقالة و صقالة القلوب ذکرا لله ہر ایک چیز کے لئے صیقل ہوتی ہے دلوں کا صیقل اللہ رب العزت کا ذکر ہے۔ (۹۹)

جب دل صیقل ہو جاتا ہے تو امراض سے پاک ہو جاتا ہے۔ مصفیٰ اور مجبلیٰ ہو جاتا ہے۔ جس کا ذکر آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

ان هذه القلوب تصده كما يصدہ الحديد بے شک دل زنگ آلود ہو جاتے ہیں جس طرح لوہے کو زنگ لگ جاتا ہے لہذا تم اسکے زنگ کو اللہ کے ذکر سے دور فاجلو ہا بذکر اللہ۔ (۱۰۰) کرو۔

قرآن حکیم متعدد مقامات پر صفائے قلب کی تعلیم دیتا ہے اور یہی امر راہ تصوف کا دوسرا مرحلہ ہے۔ (۱۰۱)

### ۳۔ اطاعت حق :-

راہ تصوف کا تیسرا مقصد اطاعت حق کا تحقق ہے۔ جس کے بارے میں قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔

یا ایہا الذین امنوا اطیعوا اللہ اے ایمان والو! طاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو واطیعوا الرسول۔ (۱۰۲)

اللہ کے رسول کی۔ گویا اطاعت الہی ایمان کا تقاضا ہے۔ ایمان عقیدہ ہے تو اطاعت اسکے تقاضے پورے کرنے کی تصدیق و توثیق ہے۔

اطاعت حق اطاعت رسول ہی ہے۔ قرآن کا فرمان ہے۔

من يطع الرسول فقد اطاع الله. (۱۰۳) جس نے رسول ﷺ کی اطاعت کی اس نے یقیناً اللہ کی اطاعت کی۔

حضور ﷺ کی یہ اطاعت عین اطاعت الہی اس لیے ہے کہ یہ اللہ ہی کے حکم سے ہوتی ہے۔  
و ما ارسلنا من رسول الا ليطاع باذن الله۔ اور ہم نے تو ہر رسول کو اس لئے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔ (۱۰۴)

اطاعت الہی ایمان کا بنیادی تقاضا ہے اور تصوف کا مقصود اس اطاعت کو درجہ کمال تک پہنچانا ہے اور جب یہ درجہ کمال کو پہنچ جائے تو تصوف کا تیسرا مقصد تکمیل آشنا ہوتا ہے۔  
اطاعت حق کے کمال تک پہنچنے کی کیفیت یہ ہے کہ زندگی احکام الہی کی اس قدر پابند ہو جائے کہ اللہ کے حکم کی نافرمانی کا تصور بھی کبھی خیال میں نہ آ سکے۔

حضرت بایزید بسطامی کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے پوری زندگی خربوزہ کاٹ کر نہیں کھایا۔ کسی نے وجہ دریافت کی تو فرمایا میں کوشش کے باوجود آج تک معلوم نہ کر سکا کہ میرے آقا ﷺ نے خربوزہ کس طرح کاٹ کر کھایا اور مجھے ڈرتھا کہ کہیں الٹی سمت سے کاٹ کر نہ کھالوں۔  
گویا اطاعت حق زندگی پر اس طرح غالب اور حاوی ہو جاتی ہے کہ اس کے خلاف قدم اٹھانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اہل تصوف کی اطاعت کی یہی کیفیت راسخ ہو جاتی ہے۔

حضرت بایزید بسطامی کے پاس ایک شخص دور سے بیعت ہونے کے لئے آیا۔ کچھ عرصہ کے بعد بغیر بیعت ہوئے واپس جانے لگا تو حضرت نے پوچھا۔ میاں! کس طرح آئے تھے۔ کہنے لگا کہ بیعت کی غرض سے آیا تھا مگر چونکہ اتنی مدت سے آپ سے کسی کرامت کا ظہور نہیں دیکھا۔ اس لئے واپس جا رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا! اس دوران کوئی لمحہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی میں دیکھا ہے۔ کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا! ہمارے پاس اس سے بڑھ کر کوئی کرامت نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ صوفیاء کے ہاں یہ قول مشہور ہے کہ

الاستقامة خير من الف كرامة۔ استقامت ہزار کرامتوں سے بڑھ کر ہے۔

دین میں استقامت کرامت سے بڑھ کر ہے۔ اہل دل ہمیشہ اطاعت میں استقامت کے طلبگار ہوتے ہیں۔  
اور اگر ان سے کمال صادر ہو جائے تو اسے اپنا کمال تصور نہیں کرتے بلکہ اللہ کا احسان مانتے ہیں اس سلسلہ میں تخت بلقیس

کا واقعہ شاہد ہے۔

قال يا ايها الملوء ايكم ياتينى بعرشها قبل ان فرمايا اے سردارو! تم میں کون ہے جو اس کا تخت میرے یاتونی مسلمین۔ قال الذى عنده علم من سامنے لے آئے قبل اس کے وہ فرمانبردار ہو کر میرے الكتاب انا اتيك به قبل ان یرتد اليك طرفك۔ سامنے حاضر ہوں۔ (حضرت سلیمانؑ کے درباریوں میں فلما راہ مستقرا عنده قال هذا من فضل ربی سے) ایک شخص نے جس کے پاس علم کتاب کا تھا۔ کہا! میں آپ کو آنکھ جھپکنے سے قبل ہی اسے حاضر کر سکتا ہوں۔ (۱۰۵)۔

پھر جب (حضرت سلیمان علیہ السلام نے) اس (تخت) کو اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا تو فرمایا یہ میرے رب کا فضل ہے۔ حضرت سلیمانؑ اپنے مرید کے اس کمال کو اپنی ذات یا اس کی طرف منسوب کرنے کی بجائے فرماتے ہیں یہ میرے رب کا فضل ہے۔

اس آیت کریمہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فرق عادات اولیاء اللہ کے لئے اللہ کے فضل سے چنداں مشکل نہیں۔ ثانیاً: یہ آزمائش ہے کہ وہ استقامت کو ترجیح دیتے ہیں کہ کرامت کو۔ ثالثاً: وہ اس کا شکروا جب خیال کرتے ہیں اور شکر یہی ہے کہ اس کے کمال کو ذات باری تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے۔ رابعاً: جو کمال کو اپنی طرف منسوب کرتے ہیں وہ بارگاہ نبوت میں شرف قبولیت نہیں پاتے۔ جیسے جن نے کہا تو حضرت سلیمانؑ نے اس سے یہ خدمت نہیں لی۔

جب مرد مومن اطاعت حق کے اس درجے پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس کا عمل سر مو احکام الہی سے انحراف نہیں کرتا اور اس انحراف کا کوئی تصور اس کے ہاں باقی نہیں رہ جاتا تو وہ مرد مومن تصوف کے تیسرے مقصد ”اطاعت حق“ کا اپنی ذات کے اندر تحقق حاصل کر لیتا ہے۔ (۱۰۶)

## مرحلہ ثانیہ

تعلیمات و مقاصد تصوف کا مرحلہ ثانیہ جن کا تعلق احوال سے ہے وہ درج ذیل ہیں۔

- (۱) محبت الہی
- (۲) رضائے الہی
- (۳) معرفت الہی

## ۱۔ محبت الہی :-

قرآن کی تعلیمات سے یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ تعلیمات اسلامی کی روح عشق و محبت الہی ہے چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

والذین امنوا اشد حبالہ (۱۰۷)۔ ایمان والے اللہ تعالیٰ سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔

یعنی جو اللہ تعالیٰ کی ذات سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں تو پھر انہیں خواہ آتش نمرود میں ڈالو یا کونکوں کی جھلسی آگ میں اذیتیں دے دے کر بے ہوش کر دو، عالم بے خودی میں بھی ان کے لبوں سے احدا حد کی صدا کیں بلند ہوتی ہیں۔ (۱۰۵)

حضور ﷺ کی زندگی محبت الہی میں سرشاری کی زندگی تھی۔ آپ ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے۔

اللهم اجعل حبك احب الي من نفسي و اهلي الہی تو اپنی محبت کو میری جان سے میرے اہل و عیال سے ومن الماء البارد۔ (۱۰۸) اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیارہ میری نظر میں محبوب بنا۔

آپ ﷺ راتوں کو دیر تک عبادت کیا کرتے تھے۔ پائے مبارک میں ورم آ جاتا تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ آپ کی یہ عبادت خشیت الہی سے ہے اور چونکہ آپ سید المعصومین تھے اس لئے آپ کو ریاضت شاقہ کی ضرورت نہ تھی آپ نے اس شبہ کو رفع کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کی عبادتوں کا مقصد محبت الہی ہے۔ خشیت الہی نہیں اس لیے ارشاد فرمایا۔ جعلت لی قرۃ عینی فی الصلوۃ۔ (۱۰۹) میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

صوفیا کرام نے اسی محبت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا تھا۔ حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی نہایت سوز و گداز سے یہ رباعی پڑھا کرتے تھے۔

دنیا شر او قیصر و خاقان را دوزخ بد را بہشت مریکاں را

تسبیح فرشتہ را ثناء مر انسان را جاناں مار او جان ما جاناں را

صوفیہ کا کہنا ہے کہ محبت الہی ہی راز حیات ہے اگر اس کی آگ دل میں نہ ہو تو وہ گوشت کا ٹکڑا ہے اگر عشق کی گرمی ہو تو انوار ربانی کا محل ہے۔

سلامتی دل عشاق از محبت تست

وگر نہ این دل پر خوں چہ جائے منزل تست

محبت کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی زندگی سٹ کر ایک مرکز پر آ جائے اس کا بال بال یہ پکارنے لگے۔

ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی لله رب بے شک میری نماز اور میری قربانی میری زندگی اور میری موت سب ہی ایک عالم کے پروردگار اللہ کے لئے ہے۔ (۱۱۰) العلین۔

اس کو ایک لمحہ بھی بغیر اللہ کے چین نہ ملے شبلی کا یہ قول اس کے حالات کا آئینہ دار بن جائے۔

الفقیر لایستریح بشیء من دون الله۔ (۱۱۱) فقیر سوائے حق کے کسی چیز سے آرام نہیں پاتا۔

کامل فقیر وہی ہے جو ہر وقت اور ہر لمحہ محبت الہی میں محو ہو۔

اللہ تعالیٰ کی محبت میں غرق ہو جانے کا یہی وہ مقام ہے جس کو قرآن نے بیان فرمایا۔

لن تنال البر حتی تنفقوا مما تحبون (۱۱۲) تم نیکی (میں کمال) ہرگز حاصل نہ کر سکو گے۔ جب تک

اپنی پیاری چیزوں میں سے کچھ اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو۔

محبت رسول ہی محبت الہی ہے۔ اس امر کی تائید حضور ﷺ کے اس فرمان سے ہے۔

لایومن احدکم حتی اکون احب الیہ من تم میں سے کوئی شخص مومن کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں

والدہ و ولدہ والناس اجمعین۔ (۱۱۳) اسے اپنے والد، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ

ہو جاؤں۔

گویا ایمان کامل کا تحقق اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ انسان عشق و محبت میں توحید کے تقاضے پورے نہ کرے۔

## ۲۔ رضائے الہی :-

محبت الہی کا نقطہ کمال یہ ہے کہ انسان اللہ کی رضا پر راضی ہو جاتا ہے۔ رضائے الہی کا تحقق تصوف کا پانچواں

مقصد ہے۔ یہاں اللہ کے محبت کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

تراہم رکعاً سجداً یبتغون فضلاً من اللہ اے دیکھنے والو تو انہیں دیکھتا ہے کہ وہ کبھی رکوع اور کبھی

سجدہ میں ہیں ہر طرح اللہ سے اسکے فضل اور اسکی رضا مند

ورضوانا۔ (۱۱۴)

ی کے طلبگار ہیں۔

ان کی سعی و کاوش، عبادت اور شب بیداریاں ان سب کا مقصد وحید رضائے الہی کا حصول ہوتا ہے۔

مقام رضا دراصل وہ کیفیت عظمیٰ ہے جو توکل سے بھی بلند ہے۔ صبر سے بھی بلند ہے۔ اور یہ مقام تفویض سے

بھی بلند ہے۔ مقام رضا یہ ہے کہ محبوب جس حال میں بھی رکھے خوش رہے۔ اسے تکلیف بھی ہو تو وہ راحت کا سامان بن

جائے۔ (۱۱۵)

رضائے الہی کا علمبردار اپنے لئے رہنا چھوڑ دے۔ خدا کے لیے جینے لگے۔ کہنے کو تو یہ ایک معمولی سا جملہ ہے لیکن غور کیا جائے تو معلوم ہوگا ارتقاء انسانیت کی آخری منزل یہی ہے۔ خدا کے لیے جینا، نیت کا ایک زبردست انقلاب ہے۔ ایسا انقلاب جو انسانی زندگی کے مرکز و محور کو بدل دیتا ہے۔ انسان کا ہر کام کسی اعلیٰ مردان خدا ہرچہ کنند برائے خدا کنند نیت جو کچھ مردان خدا کرتے ہیں وہ خدا کے لئے کرتے ہیں۔

شان ہمہ حق باشد۔ (۱۱۶)

ان کی نیت سب حق کی خاطر ہوتی ہے۔

جب نیت یہ کی جائے تو انسان کا ہر کام عبادت بن جاتا ہے۔ عبادت کے اس مفہوم کو رسول مقبول ﷺ نے اس طرح سمجھایا کہ ایک مرتبہ حضرت سعدؓ نے ارادہ کیا کہ اپنی ساری دولت راہ خدا میں دے دیں تو فرمایا اے سعد! جو کچھ اس نیت سے خرچ کرو کہ اس سے خداوند تعالیٰ کی ذات مقصود ہو تو اس کا تم کو ثواب ملے گا۔ یہاں تک کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منہ میں دو اس کا بھی ثواب ہے۔ (۱۱۷)

### ۳۔ معرفت الہی :-

جب بندہ مرحلہء رضا کو طے کر لیتا ہے تو حجابات مرتفع ہونے لگتے ہیں۔ ذات الہی کی معرفت نصیب ہوتی ہے۔ پھر ہر شے میں اسے ذات الہی کا جلوہ نظر آتا ہے۔

تصوف کا مدعا یہ ہے کہ بندہ نابینا نہ رہے بلکہ بینا ہو جائے۔ اسے بصارت کے ساتھ بصیرت بھی حاصل ہو۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے جس وقت معرفت کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔

عرفت الله بالالله و عرفت مادرن الله بنور الله میں نے خدا کو اس کی مدد سے پہچانا اور ماسوی اللہ کو اللہ کے

نور سے پہچانا۔ (۱۱۸)

حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔

انقو فراسة المئومن فانه ينظر بنور الله - مؤمن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ (۱۱۹)

حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ پہلے یہ حالت تھی کہ جب کبھی اس کی تلاش میں نکلتا اپنے سوا کچھ نہ پاتا لیکن اب اس کے سوا کچھ نہیں پاتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جب انسان تعلیم تصوف کے نقطہ کمال معرفت الہی تک پہنچ جاتا ہے تو اس کی نظروں کے سامنے فنا کے سارے کے سارے پردے معدوم ہو جاتے ہیں اور ظاہر و باطن میں صرف وہی ذات باقی رہ جاتی ہے۔

تصوف محض اللہ اللہ کیسے جانے میں محدود نہیں بلکہ یہ ایک پیغام، عمل، پیغام انقلاب اور پیغام حرکت ہے۔

تصوف دنیا کی محبتوں کو چھوڑ کر اس مقام کو پالینے کا نام ہے۔

جب انسان تعلیم تصوف کے ان مرحلوں کو طے کرتا ہے تو نقطہ کمال پہ جا کر اسے معرفت الہی نصیب ہوتی ہے۔

اس کا تعلق باللہ استوار ہو جاتا ہے اور نسبت کا یہ اعزاز انسان کو ان عظمتوں سے ہمکنار کرتا ہے۔ جن کا مقابلہ دنیا کی کوئی عظمت نہیں کر سکتی۔ (۱۲۰)

### صوفیاء کا مقصد کتاب و سنت کی روشنی میں:

صوفیہ کرام اپنے عمل کا جواز قرآن و سنت سے پیش کرتے ہیں۔ تصوف کی بنیاد وہ چیزوں پر ہے محبت الہی اور معیت ذاتی صوفیہ کا کہنا ہے کہ کتاب اللہ میں خود محبت الہی کی دعوت دی گئی ہے اور بے شمار آیتوں میں اس کے نتیجہ کے طور پر معیت اور قرب ذاتی کا وعدہ کیا گیا ہے۔ یہی چیز ہے جس کو تصوف کی اصطلاح میں معرفت کہتے ہیں۔

(۱) مولانا ابوالکلام آزاد ترجمان القرآن میں فرماتے ہیں۔

”قرآن نے انسان کے لئے دینی عقائد و اعمال کا جو تصور قائم کیا ہے اس کی بنیاد بھی تمام تر رحمت و محبت ہی پر رکھی ہے۔ کیونکہ وہ انسان کی روحانی زندگی کو کائنات فطرت کے عالمگیر کارخانہ سے کوئی الگ اور غیر متعلق چیز قرار نہیں دیتا۔ بلکہ اسی کا ایک مربوط گوشہ قرار دیتا ہے۔۔۔۔۔ چنانچہ قرآن نے جا بجا یہ حقیقت واضح کی ہے کہ خدا اور اس کے بندوں کا رشتہ محبت کا رشتہ ہے اور سچی عبادت اسی کی عبادت ہے، جس کے لئے معبود صرف معبود ہی نہ ہو بلکہ محبوب بھی ہو۔

ومن الناس من يتخذ من دون الله انداداً اور (دیکھو) انسانوں میں سے کچھ انسان ایسے ہیں  
ایحبونهم كحب الله والذين امنوا اشد جوداً وسرى هستیوں کو اللہ کا ہم پلہ بنا لیتے ہیں۔ وہ انہیں  
اس طرح چاہنے لگتے ہیں جس طرح اللہ کو چاہنا ہوتا ہے۔  
حباً للہ۔ (۱۲۱)

حالانکہ جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں۔ ان کی زیادہ سے زیادہ محبت صرف اللہ ہی کے لیے ہوتی ہے۔



قل ان كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله (اے پیغمبر ان لوگوں سے کہہ) دو اگر واقعی تم اللہ سے  
 ویغفر لکم ذنوبکم واللہ غفور رحیم۔ (۱۲۲) محبت رکھنے والے ہو، تو چاہیے کہ میری پیروی کرو  
 (میں تمہیں محبت الہی کی حقیقی راہ دکھا رہا ہوں اگر تم نے  
 ایسا کیا تو صرف یہی نہیں ہوگا کہ اللہ سے محبت کرنے  
 والے ہو جاؤ گے بلکہ خود اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔

وہ جا بجا اس حیثیت پر زور دیتا ہے کہ ایمان اللہ کا نتیجہ اللہ کی محبت اور محبوبیت ہے۔  
 مولانا آزاد کی یہ عبارت صوفیہ کے مسلک کی بہترین وضاحت کرتی ہے قرآن محبت الہی کو دینی عقائد و اعمال  
 کا مرکزی نقطہ قرار دیتا ہے اور صوفیا اسی کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے تھے۔  
 ۲۔ قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے:

وانزل الله عليك الكتاب والحكمة وعلمك ما لم اور اللہ نے تم پر (اے محمد ﷺ) کتاب اتاری اور حکمت  
 تکن تعلم۔ (۱۲۳) نازل کی اور وہ باتیں بتائیں جو تم کو معلوم نہ تھیں۔

صوفیہ کا کہنا ہے کہ یہاں حکمت سے مراد علم باطن ہے۔ اسکی تعلیم رسول اکرم ﷺ نے انفرادی  
 طور پر کچھ صحابہ کو دی تھی۔ ان سے یہ سلسلہ جاری ہوا۔

۳۔ عبادت الہی میں انہماک پر صوفیہ زور دیتے تھے۔ اور قرآن حکیم کی ان آیتوں کو پیش کرتے تھے۔  
 وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون۔ (۱۲۴) اور میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ وہ  
 میری عبادت کریں۔

فاذكروا لله قياماً وقعوداً وعلى جنوبكم۔ پس تم اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے یاد کرو۔  
 (۱۲۵)

مقبول بندوں کے متعلق فرمایا جاتا ہے:

يذكرون الله قياماً وقعوداً وعلى جنوبهم۔ جو خدا کو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹے یاد کرتے ہیں۔  
 (۱۲۶)

تتجانی جنوبہم عن المضاجع يدعون ربہم جن کے پہلو (رات کو) خواب گاہوں سے علیحدہ رہتے  
خوفاً وطمعاً۔ (۱۲۷)

کو پکارتے ہیں۔

تراہم رکعاً سجداً یبلغون فضلاً من اللہ ورتہم ان کو دیکھو گے کہ رکوع میں جھکے ہوئے اور سجدہ  
میں پڑے ہوئے، خدا کے فضل اور خوشنودی کو تلاش

کرتے ہیں۔

ان ربك يعلم انك تقوم ادنی من ثلثی الیل بے شک تیرا رب جانتا ہے کہ تو وہ تہائی رات کے  
ونصفہ وثلثہ و طائفة من الذین معک۔ قریب اور آدھی رات اور ایک تہائی کے بعد اٹھتا ہے  
اور تیرے ساتھ ایک جماعت بھی اٹھ کر نماز پڑھتی ہے۔ (۱۲۹)

۴۔ قرب ذاتی یا معرفت جس کو صوفیہ اپنا منشاء و مقصد قرار دیتے ہیں، کلام پاک سے ثابت ہے، حضرت  
مجدد الف ثانیؒ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

اقربیت اوتعالیٰ بما ازماہ نص قطعی ثابت اللہ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ قرآن  
شدہ است۔ (۱۳۰)

کلام پاک کی جن آیتوں سے اس کی تائید ہوتی ہے وہ یہ ہیں۔

ادعونی استجب لکم۔ (۱۳۱)

تم مجھے پکارو میں تم کو جواب دوں گا۔  
وہو معکم اینما کنتم واللہ بما تعملون بصیر۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے۔ جہاں کہیں تم ہو۔ جو کچھ تم  
کرتے ہو وہ دیکھتا ہے۔ (۱۳۲)

نحن اقرب الیہ منکم ولا کن لاتبصرون۔ ہم اس سے تمہاری بہ نسبت قریب تر ہیں مگر تم  
نہیں دیکھتے۔ (۱۳۳)

ونعلم ماتوسوس بہ نفسہ ونحن اقرب الیہ ہم جانتے ہیں جو باتیں آتی رہتی ہیں اس کے جی میں اور  
من جل الوریث۔ (۱۳۴)

اس کے رگ و جان سے زیادہ قریب ہیں۔  
پھر صوفیہ کرام احادیث سے استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ ان  
کے لئے مکمل رہبر ہے۔ اور وہ جو کچھ کرتے ہیں اس کا جواز سنت میں موجود ہے۔

(۱) قرآن میں رسول ﷺ کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے:

ياايها المزمّل قم اليل الا قليلا. نصفه او انقص  
منه قليلا. اوزد عليه ورتل القرآن ترتيلا ط  
انا سنلقى عليك قولا ثقيلا. ان ناشئة اليل هي  
اشد وطاء وا قوم قيدا. ان لك في النهار  
سبحا طويلا. واذ كرا سم ربك وتبتل اليه  
تبتيلا ط (۱۳۵)

اے کملی اوڑھنے والے! تھوڑی دیر کے سوا تمام رات  
اٹھ کر نماز پڑھ آدھی رات یا اس سے کچھ کم و بیش، اور  
اس میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، ہم تجھ پر ایک بھاری  
بات اتارنے والے ہیں۔ بیشک رات کو اٹھ کر نماز  
پڑھنا نفس کو خوب زیر کرتا ہے اور موثر ہوتا ہے۔  
تیرے لئے دن کو بڑے فرصت ہے، اپنے پروردگار کا نام  
لے اور ہر چیز سے کٹ کر اسی کی طرف ہو جا۔

صوفیہ کا کہنا ہے کہ ”ہر چیز سے کٹ کر اس کی طرف ہو جانے“ کی جو ہدایت رسول اکرم ﷺ کو  
کی گئی تھی۔ وہ اسی پر عمل کرتے ہیں۔

(۲) احادیث نبوی ﷺ میں جس چیز کو احسان سے تعبیر کیا گیا ہے وہ تصوف ہی ہے ارشاد ہوتا

ہے۔

الاحسان ان تعبدالله كانك تراه فان لم تكن احسان يه ہے کہ تم اس طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو  
تراہ فانہ یراک. (۱۳۶)  
گو یا تم اس کو دیکھ رہے ہو اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے  
تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس حدیث نبوی پر بحث کرتے ہوئے بتلایا ہے کہ  
حقیقی تصوف یہی ہے۔

(۳) کشف المحجوب میں ہے کہ حارثہؓ ایک مرتبہ رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر  
ہوئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔

کیف اصبحت یا حارثہ قال اصبحت مومنا  
 بالله حقا فقال انظر ماتقول یا حارثہ ان لكل  
 شیء حقیقة فما حقیقة ایمانك فقال عرفت  
 نفسی عن الدنیا فاستوی عندی حجرها  
 وذهبها وفضتها و مدرها فاستهت انظر الی  
 اهل الجنة یتزاورون فیها وکانی انظر الی اهل  
 النار یتصارعون وفی رواية یتعادلون  
 - (۱۳۷)

یعنی اے حارثہ تو نے صبح کس طرح کی، کہا میں نے صبح  
 ایسی حالت میں کی کہ میں مومن تھا۔ اس پر  
 رسول ﷺ نے فرمایا کہ اے حارثہ! غور سے دیکھو کیا  
 کہتے ہو؟ ہر حق کے واسطے ایک حقیقت اور برہان ہوتا  
 ہے تیری اس بات کی برہان کیا ہے۔ حارثہ  
 نے جواب دیا یہ ہے کہ میں اس دنیا سے اپنے  
 بدن کو توڑ دوں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ سونا اور  
 پتھر اور ڈھیلہ میرے نزدیک سب برابر ہیں اور جہنم  
 میں دنیا سے جدا ہو گیا تو عقیقی میں مل گیا۔ یہاں تک کہ  
 بہشت دوزخ اور عرش کو دیکھ رہا ہوں اس پر آپ نے  
 فرمایا کہ تو نے پہچان لیا فالرم قلھا ثلثا یعنی اس کو لازم  
 پکڑا اور یہ آپ نے تین بار فرمایا۔

(۴) صحیح بخاری میں رسول ﷺ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”جو بندہ اپنی  
 طاعتوں سے میری قربت کو تلاش کرتا رہتا ہے، تو میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، یہاں تک کہ میں اس کا کان  
 بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، میں ہاتھ بن جاتا ہوں جس  
 سے وہ پکڑتا ہے، اور پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ (۱۳۸)

(۵) رسول ﷺ کے زمانے میں ا اھباب صفہ کا وجود، خود اس بات کا ثبوت ہے کہ  
 رسول ﷺ عبادت میں ہمہ وقت انہماک کو ایک خاص طبقہ کے لئے برائیں سمجھتے تھے۔ شیخ جویریؒ فرماتے  
 ہیں:

اندر وقت پیغامبر فقراء مسہاجرین بودہ اند،  
 آنانکہ اندر حکم آداب عبودیت حق  
 تعالیٰ وصحبت متابعت پیغمبر ﷺ نشسته  
 بووند، ”اندر مسجد وئے - واز اشغال جملہ  
 اعراض کروہ و ترک معارضہ بگفته  
 و خداوند تعالیٰ بدادن روزی خود باور  
 داشته - و توکل بروئے کردہ تار رسول ﷺ  
 مامور بودہ بصحبت و قیام کردن بحق  
 ایشان چنانکہ خدائے گفت قولہ عزوجل  
**ولا تطرد الذين يدعون ربهم بالغداوة**  
**اولعشى يريدون وجهه ونيز گفت - ولا**  
**تعد عينا لك عنهم تريد زينة الحياة**  
**الدنيا -** تار رسول علیہ السلام ہر کجایکے  
 از ایشان بدیدے گفتے، مادر پدرم فدائیان  
 باد کہ خداوند تعالیٰ از برائے ایشان باسن  
 عتاب کرد۔ (۱۳۹)

خود رسول ﷺ کے زمانے میں مہاجرین فقراء ایسے  
 تھے کہ خدا عبادت کے آداب اور حضور  
 پیغمبر خدا ﷺ کی محبت کا اتباع پورا پورا بجالاتے تھے  
 اور آپ کی مسجد یعنی مسجد نبوی میں بیٹھے رہتے تھے۔ اور  
 تمام اشغال اور جھگڑوں کو ترک کر دیا تھا اور اس  
 امر کا کامل یقین رکھتے تھے کہ خدائے تعالیٰ روزی  
 رساں ہے اور اس پر توکل تھا اسی وجہ سے رسول  
 ﷺ ان کی صحبت کے واسطے مامور تھے اور ان کے  
 حق کو قائم رکھتے تھے جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا  
 ہے۔ ان لوگوں کو جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں  
 اور اس کی ذات پاک کی خواہش رکھتے  
 ہیں دور مت کر اور فرمایا: اپنی آنکھیں یعنی توجہ کی  
 نگاہ ان کی طرف رکھ۔ اور ان کو نظر حقارت سے نہ  
 دیکھ کیا تو دنیا کی زندگی میں زینت چاہتا ہے۔ اسی  
 واسطے رسول اللہ جہاں کہیں ان کو دیکھتے تو فرماتے کہ  
 میرے ماں باپ تم پر قرباں ہوں خدائے تعالیٰ نے  
 تمہاری بابت مجھ پر عتاب فرمایا۔“

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب صفہ کے متعلق یہاں اجمالاً کچھ عرض کر دیا جائے۔ صحابہ کی اس مقدس  
 جماعت نے جو اصحاب صفہ کے نام سے مشہور ہے، اپنی زندگی صرف عبادت اور تعلیم قرآن پر وقف کر دی تھی۔  
 دنیوی معاملات سے ان کا کوئی سروکار نہ تھا۔ رات دن عبادت، تلاوت اور قرأت میں مصروف رہتے تھے۔ ان  
 بزرگوں کے بال بچے نہ تھے اور جب شادی کر لیتے تھے۔ تو اس حلقے سے نکل جاتے تھے۔ معاش کا زیادہ تر دار و مدار  
 صحابہ اور خود رسول اکرم ﷺ کی امانت پر تھا۔ اکثر انصار کھجور کی پکی ہوئی شاخیں توڑ کر لاتے اور مسجد کی  
 چھت میں لٹکا دیتے، جو کھجور ٹپک ٹپک کر گرتی، یہ لوگ ان کو اٹھا کر کھا لیتے۔ ان میں سے کچھ لوگ دن کو پانی

بھر لاتے، جنگل سے لکڑیاں چن لاتے اور ان کو بیچ کر جو آمدنی ہوتی اس کو وجہ معاش میں صرف کرتے۔ لیکن زیادہ تر ان بزرگوں کی گذراوقات صدقات پر ہوتی تھی۔ چنانچہ ابن کعب القرظی نے ”للفقراء الذین احصوا فی سبیل اللہ“ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ فقراء سے اصحاب صفہ مراد ہیں۔ ان کے حالات میں ابن الاعرابی احمد بن محمد البصری (الموتی ۴۰۳ھ) علامہ جلال الدین سیوطی، اور دیگر علماء نے رسالے اور کتابیں تصنیف کی ہیں۔ سورہ انعام اور سورہ کہف میں ان بزرگوں کی عبادت و ریاضت کی تعریف کی گئی ہے۔

### ۴ صوفیہ کا مقصد حیات:

تصوف کی تعریفیں مشائخ کی کتابوں میں کثرت سے ملتی ہیں لیکن ان تعریفوں کی بنا پر صوفیہ کرام کے مقاصد کے متعلق کچھ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت شیخ ابو الحسن قوشچہ فرمایا کرتے تھے۔  
التصوف اليوم اسم ولا حقيقة. وقد كان حقيقته تصوف آج کل ایک بے حقیقت نام ہے پہلے حقیقت بلا نام ولا اسم۔ (۱۴۰) کے تھا۔

اس لئے مناسب یہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ خود صوفیہ کرام کی زندگی میں تصوف کے معنی تلاش کئے جائیں۔ اور ان کے مقاصد کا تعین اسی کی بناء کیا جائے۔

### محبت الہی:

حضرت شیخ نظام الدین اولیاء ایک خط میں مولانا فخر الدین مزرہی کو لکھتے ہیں۔  
اتفاق اصحاب طریقت و ارباب حقیقت اصحاب طریقت اور ارباب حقیقت کا اس باب میں است کہ اہم مطلوب و اعظم مقصود از اتفاق ہے کہ انسان کی پیدائش کا اہم مطلوب اور بڑا خلقت بشر محبت رب العالمین است مقصود رب العالمین کی محبت ہے۔ (۱۴۱)

ضروری ہے کہ قرآن حکیم اور احادیث نبوی کی روشنی میں محبت الہی کی نوعیت اور اہمیت سمجھا جائے۔ قرآن نے ایمان کی سب سے بڑی علامت اور خاصیت محبت الہی کو قرار دیا۔ ارشاد ہوتا ہے۔  
والذین امنوا اشد حبالہ (۱۴۲) اور جو ایمان لائے وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھتے ہیں۔

پھر ایک جگہ تنبیہ کی جاتی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ائْتُوا بِنُفُسِكُمْ ۖ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ مِنْكُمْ ۖ فَاذْكُرُوا يَوْمَ تُنْفَخُ الْأَشْجَارُ ۖ وَمَنْ كَانَ لَهُ مِثْقَلُ ذَرَّةٍ مِنْ نِعْمَةٍ ۖ يَنْتَفِئْ بِهَا ۖ فَيُكْفَرُ بِهَا ۖ وَيُجْزَىٰ ۖ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ مِنْكُمْ ۖ فَاذْكُرُوا يَوْمَ تُنْفَخُ الْأَشْجَارُ ۖ وَمَنْ كَانَ لَهُ مِثْقَلُ ذَرَّةٍ مِنْ نِعْمَةٍ ۖ يَنْتَفِئْ بِهَا ۖ فَيُكْفَرُ بِهَا ۖ وَيُجْزَىٰ ۖ (۱۴۳)  
 دینہ اے پیروں دعوت ایمانی! اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے فسوف یا تئ اللہ بقوم یحبہم ویحبونہ۔ (۱۴۳) دین کی راہ سے پھر جائے گا۔ (تو وہ یہ نہ سمجھے کہ دعوت حق کو اس سے کچھ نقصان پہنچے گا) عنقریب اللہ ایک گروہ (سچے خدا پرستوں کا) پیدا کر دے گا جنہیں اللہ کی محبت حاصل ہوگی اور وہ اللہ کو محبوب رکھنے والے ہوں گے۔ خود رسول اکرم ﷺ کی زندگی، محبت الہی میں سرشاری کی زندگی تھی، آپ دعا فرمایا کرتے تھے۔

اللهم اجعل حبك احب الى من نفسي واهلي الہی تو اپنی محبت کو میری جان سے میرے اہل و عیال سے، اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ میری نظر میں محبوب بنا۔

حضرت شیخ نظام الدین اولیاء نے ایک دن بابا فریدؒ کو دیکھا کہ بندہ حجرے میں پشت پر دونوں ہاتھ رکھے ہوئے کھڑے ہیں۔ قبلہ کی طرف چند قدم بڑھتے ہیں اور یہ اشعار پڑھ کر وجد کرتے جاتے ہیں:  
 خواہم کہ ہمیشہ در ہوا کے تو زیم  
 مقصود من بندہ ز کوئین توئی  
 خاکے شوم و بیزیر پائے تو زیم  
 از بہر تو میرم ز بر آئے تو زیم  
 صوفیہ کا کہنا ہے کہ محبت ہی راز حیات ہے۔ اگر اس کی آپ دل میں نہ ہو۔ تو وہ گوشت کا ایک بے جان ٹکڑا ہے۔ اگر عشق کی گرمی ہو تو انوار ربانی کا محل۔

محبت کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی زندگی سمٹ کر ایک مرکز پر آ جائے۔ اس کا بال بال یہ پکارنے لگے:  
 ان صلاتی ونسکی ومحیایی ومماتی للہ رب بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اسی ایک عالم کے پروردگار اللہ کے لئے ہے۔

خدا کے لئے جینا:

کہنے کو تو ایک معمولی سا جملہ ہے، لیکن اگر اس پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ارتقاء انسانیت کی آخری منزل یہی ہے۔ ”خدا کے لئے جینے“ کے معنی یہ نہیں کہ انسان دنیا و مافیہا سے قطع تعلق کر لے اور ایک گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر عبادت کرنے لگے۔ وہ شادی بھی کرے، کھائے بھی۔ اللہ کی مخلوق سے ملے بھی لیکن اس طرح کہ وہ علاقہ کے ہجوم اور تعلقات کے ازدحام میں گرفتار ہو کر اپنے معبود حقیقی کو نہ بھول جائے۔ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں سے مستفید ہو۔ لیکن دنیا کی محبت اس کے دل میں جگہ نہ حاصل کرنے پائے۔ وہ ہر کام میں رضائے الہی کا طلب گار ہو خدا کے لئے جینا، نیت کا ایک زبردست انقلاب ہے۔ ایسا انقلاب جو انسانی زندگی کے مرکز و محور کو بدل دیتا ہے۔ انسان کا ہر کام کسی اعلیٰ مقصد کی تکمیل کے لئے ہونے لگتا ہے۔ وہ دنیا کا ہر کام کرتا ہے۔ لیکن اسکی نیت عام انسانوں سے مختلف ہوتی ہے۔ فوائد الفواد میں حضرت محبوب الہیؑ سے اور خیر الجبارس میں حضرت چراغ دہلویؒ سے دو حکایتیں نقل کی گئی ہیں جن سے بہتر خدا کے لئے جینے، کے مفہوم کی وضاحت ممکن نہیں۔

ہفتہ کا دن ہے۔ اور ذیقعدہ (۱۰ھ) کی ساتویں تاریخ۔ حضرت محبوب الہیؑ کے سامنے تفسیر امام ناصری رکھی ہوئی ہے۔ دین میں استغراق کا ذکر کرتے ہوئے فرمانے لگتے ہیں۔

ایک بزرگ شیخ دریا کے کنارے رہا کرتا تھا۔ اس کی ایک عورت تھی۔ ایک روز عورت سے کہا کہ کھانا لے کر دریا کے پار جا، اس فقیر کو جو وہاں بیٹھا ہے دے آ۔ عورت نے کہا۔ پانی گہرا ہے، عبور کس طرح کروں گی۔ شیخ نے کہا دریا کے کنارے جا کر کہنا کہ میرے شوہر کی حرمت سے جس نے کبھی مجھ سے صحبت نہیں کی تجھے راہ دے۔ عورت حیران رہ گئی اور اپنے دل میں کہا کہ اس سے میرے یہاں اتنے بچے پیدا ہوئے اور یہ کہتا ہے کہ میں نے صحبت ہی نہیں کی آخر شوہر کے فرمان کے مطابق دریا کے کنارے پہنچی، اور وہی کہا، تو دریا نے راستہ دیا۔ اور وہ پار ہو گئی۔ وہاں پہنچ کر درویش کے سامنے کھانا رکھا۔ اس نے کھالیا تو سوچنے لگی کہ اتنی مرتبہ تو اس طرح آئی۔ اب جاؤں کس طرح۔ درویش نے پوچھا۔ کس طرح آئی تھی؟ عورت نے ساری بات کہہ سنائی۔ درویش نے کہا۔ اچھا اب جا کر یہ کہنا کہ اے دریا اس شیخ کی حرمت سے جس نے تیس برس سے کسی قسم کا کھانا نہیں کھایا مجھے رستہ دے۔ عورت حیران رہ گئی کہ میرے سامنے ابھی اس نے کھانا کھایا ہے اور ابھی اس طرح کہتا ہے۔ خیر اس نے دریا کے کنارے ایسا ہی کیا۔ رستہ مل گیا اور اپنے شوہر کے پاس پہنچ گئی۔ اور کہا کہ مجھے ان دونوں باتوں کا بھید بتلا کہ تو نے کئی سال مجھ سے صحبت کی اور اس درویش نے بھی میرے سامنے کھانا کھایا اور یہ دونوں جھوٹی باتیں کہہ کر میں نے دریا سے رستہ لیا۔ اس میں کیا حکمت ہے؟ شیخ نے کہا تجھے واضح رہے



کہ میں نے ہوائے نفسانی سے کبھی تجھ سے صحبت نہیں کی۔ اسی طرح اس درویش نے بھی کبھی نفسانی طمع سے کھانا نہیں کھایا۔ بلکہ محض عبادت و طاعت کی خاطر۔ اس لحاظ سے اس نے کبھی کھانا نہیں کھایا۔

یہ حکایت بیان کرنے کے بعد حضرت محبوب الہی، نے فرمایا:

”این بود معنی ہر دوسرخ یعنی مردان خدا ان دونوں باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ مردان ہرچہ کنند برائے خدا کنند نہایت شان خدا کرتے ہیں وہ خدا کے لئے کرتے ہیں ان کی نیت ہمہ حق باشد (۱۴۶) سب حق کی خاطر ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ حضرت چراغ دہلویؒ نے شیخ عبد اللہ حقیف کا قصہ سنایا کہ:

”شیخ عبد اللہ حقیف کو کہیں دعوت میں بلایا گیا۔ وہاں قسم قسم کے کھانے تھے حلوائے لوزینہ سب کھانوں سے زیادہ شیخ کے قریب تھا۔ شیخ نے صحنک سے ایک لوزینہ اٹھا کر نوش کیا۔ اچھا معلوم ہوا۔ لہذا دوسرا بھی اٹھا کر کھایا۔ اس وقت خیال ہوا کہ یہ دوسرا لوزینہ خدا کے واسطے نہیں کھایا۔ لذت کو کھایا کہ دل کو پسند آیا تھا۔ سہنوز وہ لوزینہ منہ میں تھا کہ شیخ نے اپنی زبان چاب لی۔ خون نکلنے لگا۔ معتقدین پریشان ہوئے۔ سب دریافت کیا تو فرمایا۔ میں نے پہلے ایک لوزینہ کھایا تھا بہت لذیذ تھا، دوبارہ پھر وہی کھایا۔ خیال آیا یہ کھانا خدا کے واسطے نہیں، لذت کو تھا۔ لہذا سزا کے نفس کو اپنی زبان چاب لی ہے۔ (۱۴۷)

جب زندگی اس طرح بسر کی جائے تو اس کی اساس ہی بالکل بدل جاتی ہے۔ انسان کا ہر کام عبادت بن جاتا ہے۔ ”ایک مرتبہ حضور سرور کائنات ﷺ نے ابو مسعود انصاری سے فرمایا: مسلمان اگر ثواب کی نیت سے اپنی بیوی کا نفقہ پورا کرے تو وہ بھی صدقہ ہے۔ یہ ہے خدا کے لئے جینا، اور یہ ہے نیت کا وہ انقلاب جو انسان کی زندگی میں ایک بنیادی تغیر پیدا کر دیتا ہے۔

جب خدا کے لئے چپے کا یہ وسیع مفہوم تسلیم کر لیا جائے تو پھر انسان کا ہر دنیوی کام عبادت بن جائے۔ بلکہ اس کی پوری زندگی ہی عبادت الہی ہو جائے۔

صوفیہ کا کہنا ہے کہ زندگی صرف ہی ہے جو یاد حق میں بسر کی جائے۔ باقی سب سراب ہے اور دھوکا، حضرت محبوب الہی، فرمایا کرتے تھے۔ کہ زندگی تو عبارت ہی یاد حق سے ہے۔

حیات آنست کہ درویش بذکر حق زندگی وہ ہے کہ درویش اللہ کی یاد میں مشغول رہے۔

مشغول باشد۔ (۱۴۸)

اس کی وضاحت میں انہوں نے یہ قصہ بیان فرمایا جو بڑا نصیحت آموز ہے۔

”ایک درویش میرک نامی تھا۔ ایک اور درویش کو اس کی زیارت کا شوق ہوا اس درویش میں یہ کرامت تھی کہ جو خواب دیکھتا، سچ ہوتا، اس کی تعبیر عین وہی ہوتی تھی جو وہ دیکھتا تھا۔ جن سے اشتیاق غالب ہوا تو زیارت کے لئے روانہ ہوا۔ اثنائے راہ میں ایک منزل پر خواب میں سنا کہ میرک گرامی فوت ہو گیا۔ صبح اٹھ کر کہا افسوس میں نے اتنی راہ اس کی زیارت کے لئے قطع کی اور وہ بھی مر گیا۔ اب کیا کرنا چاہئے۔ چلو وہاں چل کر اس کی قبر کی بھی زیارت کر میں گے۔ وہاں پہنچ کر پوچھنا شروع کیا کہ میرک گرامی کی قبر کہاں ہے۔ سب نے کہا کہ وہ تو زندہ ہے اور تم قبر کی بات پوچھتے ہو۔ وہ درویش حیران رہ گیا۔ اس نے کہا۔ اے خواجہ فی الواقع تیرا خواب ٹھیک تھا۔ کیونکہ میں ہمیشہ یاد خدا میں مصروف رہتا تھا۔ آج کی رات اس کے علاوہ کسی اور چیز میں مشغول ہو گیا تھا، پس عالم میں منادی ہو گئی کہ میرک گرامی مر گیا۔ (۱۴۹)

### محبت الہی کا اثر انسانی زندگی پر:

محبت الہی کا جذبہ جب انسان کے دل میں گھر کر لیتا ہے۔ تو فکر و عمل کا کوئی گوشہ اس سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

(۱) محبت الہی کا سب سے بڑا اور گہرا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی میں مرکزیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ مرکزیت نظام ربوبیت کی ایک شان اور خدا کی وحدانیت پر کامل ایمان کا لازمی نتیجہ ہے۔ شرک، انسانی فکر و عمل کی مرکزیت کو فنا کرتا ہے اس لئے کوئی انسانی گناہ اس سے بڑھ کر شدید نہیں ہو سکتا پھر جو چیز اس مرکزیت کو جو ایمان کی اصلی شان ہے برقرار ہی نہیں بلکہ صحیح معنی میں پیدا کرتی ہے وہ محبت ہے۔

(۲) اللہ سے سچی محبت کا رشتہ رکھنے والا انسان ہر وقت اپنے آپ کو اسکی بارگاہ میں پاتا ہے۔ خدا کی موجودگی کا یقین اس کو اس طرح سے ہوتا ہے گویا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔ مرخورد نے حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کے متعلق لکھا ہے کہ وہ خدا کی طرف اس محویت کے ساتھ متوجہ رہتے تھے۔ گویا اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

جب انسان ذات باری تعالیٰ کو اس طرح اپنے نزدیک محسوس کرنے لگتا ہے تو معصیت کی تمام راہیں اس کی زندگی میں بند کر دی جاتی ہیں۔ وہ گناہ کرنے کے قابل ہی نہیں رہتا ”مالک یوم الدین“ کا دربار ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔ وہ اپنے محبوب میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ گناہ کرنے کی فرصت ہی اس کو نہیں

ملتے، حضرت شیخ علی ہجویریؒ نے لکھا ہے کہ صرف یہ علم کہ خدا دیکھ رہا ہے انسان کو معصیت سے روکتا ہے۔  
چوں بندہ عالم بود کہ خداوند جب بندہ یہ بات یقین کی رو سے جان جائے گا کہ خدا  
دوناطراست کارے نکند کہ از و شرم دارد اس کو دیکھ رہا ہے تو وہ ہرگز ایسا کام نہ کرے گا جس سے  
بقیامت۔ (۱۵۰)

پڑے۔

لیکن جب معبود حقیقی کی ذات ہر وقت آنکھوں کے سامنے ہو، تو زندگی کے انقلاب کا اندازہ لگانا مشکل

ہے۔

(۳) جب محبت الہی کا پوری طرح غلبہ ہوتا ہے، تو انسان کی نظر میں سونا اور چاندی برابر ہو جاتا ہے۔  
(۱۵۱) مادی دنیا کی کشش اسکے لئے بے اثر ہو جاتی ہیں خیر الحباس میں لکھا ہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ نے ایک  
رات کو بارگاہ خداوندی میں التجا کی کہ اے اللہ مجھے یہ بتا دے کہ بہشت میں میرا راز اور مصاحب کون ہوگا۔ آواز  
آئی۔ فلاں چرواہا، حضرت جنید بغدادیؒ اس چرواہے سے جا کر ملے اور کئی دن اس کا حال دیکھنے کے بعد پوچھا تم بچ  
وقتہ نماز جماعت سے پڑھتے ہو۔ اس کے سوا کوئی کام ایسا نہیں کرتے جو اس قدر قبولیت کا باعث ہو۔ شاہد یہ اعلیٰ  
مرتبہ جو تمہیں ملا ہے۔ وہ تمہارے کسی باطنی معاملہ کے سبب سے ہے چرواہے نے جواب دیا۔ اے خواجہ جنید! میں  
ایک جاہل آدمی ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ معاملہ کس کو کہتے ہیں اور باطن کیا ہوتا ہے۔ البتہ مجھ میں دو خصلتیں  
ہیں ایک یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ ان سب پہاڑوں کو سونے کا کر دے اور میرے قبضہ تصرف میں ہوں اور وہ سب  
میرے پاس سے جاتے رہیں تو مجھ کو ان کے نہ ہونے کا رنج و غم نہ ہوگا۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی مجھ پر جفا کرے یا  
مجھ سے احسان و وفا کرے تو میں وہ جفا و وفا اس کی طرف سے نہیں جانتا بلکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے جانتا  
ہوں۔ (۱۵۲) یہ سب کیفیات محبت الہی سے پیدا ہوتی ہیں۔

(۴) جب محبت الہی اس درجے پر پہنچ جائے کہ:

و کلت الی المحبوب امری کله فان شاء احيانی میں نے اپنا کام اپنے محبوب کے حوالہ کیا، خواہ اب وہ مجھے  
وان شاء اتلفانی (۱۵۳)

زندہ رکھے یا مار ڈالے۔ تو انسان میں توکل و استغنا کی  
ایک عجیب کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب دنیا کی جاہ و  
حشمت، دولت و ثروت اس کے سامنے آتے ہیں تو وہ یہ  
کہہ کر منہ موڑ لیتا ہے:

الیس اللہ بکاف عبده (۱۵۴) کیا اللہ بندے کے لئے کافی نہیں۔

اللہ کی ربوبیت پر کامل ایمان رکھنے والا انسان اپنے رزق کی طرف سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ وہ اللہ کے اس وعدے  
پر پورا یقین رکھتا ہے کہ

من یتق اللہ يجعل له مخرجا ويرزقه من حيث هو تقوی اختیار کرتا ہے اللہ اس کے لئے راستہ نکالتا ہے  
لا یحتسب ومن یتوکل علی اللہ فهو او را ایسی جگہ سے رزق فراہم کرتا ہے جہاں کسی کا سان  
حسبہ (۱۵۵)

گمان بھی نہیں ہوتا، جو اللہ پر توکل کرتا ہے اللہ اس کے  
لئے کافی ہے۔

یہ ہی وہ یقین ہے جو اس کو دارا و سکندر سے اونچا اٹھا دیتا ہے۔ اقبال نے سچ کہا ہے۔

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک

اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دار و جم

کشف المحجوب میں لکھا ہے کہ ایک بادشاہ نے ایک فقیر سے کہا کہ مجھ سے کچھ مانگ، جو اب دیا میں  
اپنے غلاموں کے غلام سے کیا مانگوں۔ بادشاہ نے کہا۔ یہ کیا کہا غلاموں کا غلام کیسا۔ جواب دیا۔

مراد و بندہ اند کہ آن ہر دو خداوندان تواند میرے وہ بندے ہیں اور وہ دونوں تیرے آقا ہیں۔  
یکے حرص و یگرامل (۱۵۶) ایک حرص دوسرے امید۔

انسانی کردار کے نشو و نما اور تشکیل میں اس احساس کا کہ وہ اپنی روزی کیلئے کسی دنیوی طاقت کا محتاج ہے  
بڑا مہلک اثر پڑتا ”تعمیری خودی“ اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک انسان اپنے پورے ایمانی جذبہ کے ساتھ حق  
تعالیٰ کو اپنا روزی رسا نہ مان لے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اگر اللہ کی محبت، انسان کے دل میں جاگزیں ہو جائے تو اس کی زندگی کا سانچہ ہی بدل



اصطلاح ان مسلمانوں کے لئے استعمال ہوتی ہے جو رسول اکرم ﷺ کے آثار اور آپ کے اصحاب اطہار کے طریقے کی پیروی کرتے ہیں۔ (۱۵۸)

اس بیان سے مستنبط ہوتا ہے تصوف کا ماخذ و مصدر نبی اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے پاکیزہ اخلاق اور اعمال صالحہ ہیں۔ امام قشیری کے اس بیان کی تائید میں مندرجہ ذیل حقائق و شواہد کتب احادیث میں ملتے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا۔

”میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے سنا کہ رسول اللہ ﷺ رات بھر عبادت فرمایا کرتے تھے، یہاں تک کہ آپ کے پائے مبارک میں ورم کر آتے تھے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ اتنی مشقت کیوں گوارا فرماتے ہیں جب کہ خدا نے آپ کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیے ہیں۔ آپ ﷺ نے جواب دیا کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟ (۱۵۹)

”آں حضرت ﷺ رمضان کا آخری عشرہ اعتکاف میں بسر فرماتے تھے یہاں تک کہ آپ نے اس دنیا سے کنارہ کیا۔“ (۱۶۰)

آں حضرت ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا۔

”جب تم کسی ایسے آدمی کو دیکھو جو دنیا سے نفرت کرتا ہے تو اس کا قرب حاصل کرو، وہ تمہیں حکمت بتائے گا۔“ (۱۶۱)

”اللہ جب اپنے بندے کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے تو اسے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے۔ دنیا کی نفرت اسکے دل میں پیدا کر دیتا ہے اور دنیا کے عیوب اس کے سامنے کھول دیتا ہے۔“ (۱۶۲)

”اے اللہ میں تجھ سے صحت، عافیت، انابت، حسن خلق اور رضا بالقدر طلب کرتا ہوں۔“ (۱۶۳)

مذکورہ بالا احادیث کے مطالب زیادہ، عباد اور صوفیہ کے مسلک کی پرزور حمایت کرتے ہیں اور اس امر کی شہادت فراہم کرتے ہیں کہ ان بزرگوں کے مسلک کا اصل اصول ہر اعتبار سے اتباع سنت ہی تھا۔ اسی طرح صحابہ رضوان اللہ علیہم کے اقوال و اعمال کی مطابقت سے ہی مسلک کی دینی حیثیت زیادہ معتبر اور موثق ہوتی ہے۔

”حضرت ابو بکر صدیقؓ آں حضرت ﷺ کی زندگی میں آپ ﷺ سے سب سے زیادہ قریب تھے۔ اور وفات نبی ﷺ کے بعد پہلے خلیفہ آپ ہی منتخب ہوئے۔ آپ کی زندگی بھی سراپا زہد و ورع تھی۔ تقویٰ آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ دنیا اور دنیا کی رعنائیاں آپ کو ذرا بھی اپنی طرف متوجہ نہ کر سکیں۔ آپ فرمایا کرتے تھے۔

وجدنا الكرم فى التقوى والغنافى اليقين تقوى كاتجہ كرم ہے، یقین کا غنا اور تواضع کا شرف۔  
والشرف فى التواضع (۱۶۴)

ڈاکٹر مصطفیٰ حلمی نے حضرت عمرؓ کی دینی زندگی کے بارے میں تحریر کیا ہے۔

”کیا حضرت عمرؓ کی دنیاپزاری کا اس سے بڑھ کر کوئی اور ثبوت ہو سکتا ہے کہ خلافت کے منصب پر فائز ہو چکنے کے بعد خطبہ دے رہے تھے۔ اور حالت یہ تھی کہ آپ کی ازار میں بارہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ قمیص پر چار پیوند تھے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے اکثر و بیشتر حضرت عمرؓ اپنا لباس خود اپنے ہاتھ سے دھولیا کرتے تھے۔ کیا حضرت عمرؓ ہی کا یہ مقولہ نہیں ہے کہ ”زندگی کی بہترین چیز صبر ہے۔“ (۱۶۵)

اسی طرح حضرت عثمانؓ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب موصوف کا بیان ہے۔

”حضرت عثمانؓ کا زیادہ وقت عبادت اور ریاضت میں صرف ہوتا تھا۔ آپ کی زندگی سراپا زہد و تقویٰ تھی۔ آپ ہمیشہ یاد الہی میں مستغرق رہتے تھے۔ قرآن مجید کی ذوق و شوق سے تلاوت فرمایا کرتے۔ دن ہو یا رات، یہ محبوب مشغلہ برابر جاری رہتا۔“ (۱۶۶)

یہی حالت اور کیفیت حضرت علیؓ کی تھی۔ ڈاکٹر حلمی فرماتے ہیں۔

”حضرت علیؓ کی زندگی بھی سواہ تقویٰ اور عبادت کے کچھ نہ تھی۔ آپ کا زہد و ورع سب سے بڑھا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ آپ کی بیوند لگی ہوئی قمیص دیکھ کر کسی نے سوال کیا۔ ”یا امیر المومنین یہ کیوں؟“ آپ نے فرمایا۔ تاکہ دل خدا سے ڈرتا رہے۔“ (۱۶۷)

خلفائے راشدین کی متابعت کے ساتھ ساتھ اصحاب صفہ بھی طریق زندگی میں صوفیہ کے مطاع و مقتدا تھے۔ تاریخ اسلام کا ہر طالب علم اصحاب صفہ کے طریق زندگی سے آشنا ہے۔ یہ وہ بزرگ تھے جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت میں دنیا کی نعمتوں کو ٹھکرا دیا تھا اور اقل قلیل پر قناعت اختیار کر لی تھی۔

”اہل صفہ کا گروہ مقدس، ان انصار اور مہاجرین پر مشتمل تھا جو بالکل بے نوا تھے۔ یہ گویا رسول ﷺ کے مہمان تھے۔ ان کے پاس نہ اہل و عیال تھے۔ نہ مال و زر۔ زن و فرزند اور مال و زر کے بندھن میں انہوں نے اپنے تئیں پھنسنے ہی نہیں دیا۔ ان لوگوں کی یہ دنیاپزاری اور اہل دنیا سے بے تعلقی دیکھیے۔ مسجد نبوی کے نزدیک ایک چبوترہ بنا دیا گیا۔ یہ ساری دنیا و مافیہا سے بے پروا ہو کر ہمیں کے مکین بن گئے اور اپنا سارا وقت عبادت و ریاضت اور مجاہدہ نفس میں صرف کرنے لگے۔ انہوں نے دنیا سے منہ موڑ لیا اور کوئی واسطہ نہیں رکھا۔ انہوں نے صرف روح کی طرف توجہ کی اور ماسوا کو

یکسرفراموش کردیا۔“ (۱۶۸)

اصحاب صفہ جس انداز میں زندگی بسر کرتے تھے آں حضرت ﷺ اسے پسند فرماتے تھے۔ آپ ان سے محبت فرماتے اور ان کی دلجوئی کرتے تھے۔ ان کے ساتھ نشست و برخاست پسند فرماتے اور ان کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔ اس برگزیدہ گروہ نے مسلمانوں کی حیات روحیہ پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ صوفیہ کے لئے اصحاب صفہ کا طریق زندگی اور اسلوب حیات زبردست کشش رکھتا تھا اور کبار صوفیہ نے اپنی زندگی کو ان اصحاب رسول ﷺ کے نقش قدم پر چلنے کے لئے خود کو وقف کر دیا۔ ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو اصحاب صفہ اولین گروہ صوفیہ ہیں جنہوں نے انوار نبوت سے براہ راست فیض حاصل کر کے امت مسلمہ کی حیات روحیہ کو مستیز کیا۔ اس ضمن میں دائرہ معارف اسلامیہ کا یہ اقتباس قابل غور ہے جس سے امت مسلمہ میں اصحاب صفہ کی دینی حیثیت اور اہمیت قطعی طور پر واضح ہو جاتی ہے۔

”تصوف و زہد کی کتابوں میں انہیں زہدہ تقویٰ کی مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ علامہ ابن تیمیہ نے عبادت گزار زندگی کی حقیقت کا تصور مرتب کرتے وقت اصحاب صفہ کو نمایاں جگہ دی ہے۔“ (۱۶۹)

اصحاب صفہ کے علاوہ بعض اصحاب رسول ﷺ اور بھی ہیں جو اگرچہ اصحاب صفہ میں شامل نہیں تھے لیکن جن کی زندگی صوفیہ کے لئے ہمیشہ باعث ہدایت رہی ہے۔ ان میں حضرت تمیم داری، حضرت ابو ذر غفاری، اور حضرت حذیفہ الیمان رضوان اللہ علیہم کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر مصطفیٰ حلمی کا یہ تجزیہ امام قشیری کے مذکورہ بیان کی حقیقت اور صداقت کو واضح کرتا ہے۔

”جو مواد ہم نے پیش کیا ہے اس سے یہ بات پایہ ثبوت اور تحقیق کو پہنچ جاتی ہے کہ زہد و تصوف اسلام میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کے آثار ہم آں حضرت ﷺ کی حیات گرامی میں اس وقت دیکھتے ہیں جب آپ ابھی منصب نبوت پر فائز نہیں ہوئے تھے۔ پھر جب آپ منصب رسالت پر فائز ہوئے تو بھی آپ کی حیات گرامی سراپا زہد و تقویٰ ہی رہی۔ اس طرح وہ صحابہ کرام جو آپ کے بعد آپ کے جانشین بنے، تمام تر اللہ کی طرف متوجہ اور دنیا سے بیزار تھے اور یہی حال دوسرے صحابہ کرام کا تھا، وہ بھی زہد و ورع سے جتنا شغف رکھتے تھے، دنیا اور حب جاہ سے اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔“ (۱۷۰)

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ”ہمععات“ میں تصوف کے پہلے دور سے متعلق جن امور کی نشان دہی کی ہے وہ رسالہ قشیریہ میں بیان کیے نکات کی کما حقہ تائید کرتے ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

”رسول ﷺ اور آپ کے صحابہ کے زمانے میں چند نسلوں تک اہل کمال کی بیشتر توجہ زیادہ تر شریعت کے



ظاہری اعمال کی طرف رہی۔ ان لوگوں کو باطنی زندگی کے جملہ مراتب، شرعی احکام کی پابندی کے ذیل ہی سے حاصل ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ان بزرگوں کا احسان، یعنی حاصل تصوف یہ تھا۔ کہ وہ نمازیں پڑھتے تھے۔ ذکر اور تلاوت کرتے تھے۔ الغرض یہ بزرگ محض خدا کا حکم سمجھ کر شرعی احکام کی بجا آوری سے ان کے باطنی تقاضوں کی تسکین بھی ہوتی تھی۔“ (۱۷۱)

ڈاکٹر خلیق احمد نظامی نے صوفی کے پہلے طبقے کے رجحان کو تاریخی اصول اور ماحول کے تقاضوں کی روشنی میں دیکھا ہے۔ ان کے تجزیہ کا ماحصل یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں کے مادی، اخلاقی اور روحانی رویے میں تبدیلی کے آثار رونما ہونے لگے۔ طلب دنیا اور جاہ و حشم کی خواہش نے مسلم معاشرے کی روح کو مجروح کرنا شروع کا دیا۔ صوفیہ نے معاشرے کی اس اعتدالی کے خلاف دین اور اخلاق کو اختیار کرنے کی ترغیب دی وہ کہتے ہیں۔

”بصرہ اور کوفہ جہاں اموی گورنروں نے ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھائے تھے، تصوف کے سب سے پہلے مرکز بنے اور یہیں سے یہ تحریک اسلامی دنیا کے اور حصوں میں پھیلی۔ اس دور کے صوفیہ کی خصوصیات یہ تھیں:

(۱) ان بزرگوں پر خشیت الہی کا بڑا غلبہ تھا اور اس بنا پر وہ تو بہ پر بہت زور دیتے تھے۔ ان کی پوری زندگی تو بہ و استغفار کی کیفیت ظاہر کرتی تھی۔

(۲) ان بزرگوں نے اپنے طرز فکر کو اجتماعی شکل دینے کی کوشش نہیں کی۔ وہ انفرادی طور پر عبادت و ریاضت میں مصروف رہتے تھے۔ کوئی نئی اصطلاح یا کوئی نیا طریقہ کار ایجاد نہیں کیا۔ حب جاہ و حشم کے وہ مناظر جو مسلمانوں کی سیاسی زندگی کا طرہ امتیاز ہو کر رہ گئے تھے، رسول عربی کی تعلیم کے منافی تھے۔ اس دور کے صوفیہ کو ان سے ایک بنیادی اختلاف تھا۔

(۳) اس دور کے صوفیہ نے اپنے خیالات کا اظہار تصانیف میں بہت کم کیا ہے۔

(۴) اس دور کے صوفیہ نے جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے، حکومت سے قطع نظر کر لیا تھا۔ وہ سکاری

ملازمت اور خلفاء کی صحبت کو بری نظر سے دیکھتے تھے۔ اور ہمت کے ساتھ ان پر تنقید کرتے۔ (۱۷۲)

ڈاکٹر مصطفیٰ حلیمی نے ”الحیات الروحیہ فی السلام“ میں تقریباً وہی نقطہ نظر پیش کیا ہے جو ڈاکٹر نظامی نے تاریخی تجزیے کی بنیاد پر قائم کیا ہے وہ کہتے ہیں۔

غیر اقوام کی تہذیب اور ثقافت سے مقابلہ آراء ہونے کے بعد جب عام طور پر مسلمان دنیا کی طرف جھکے تو ایک موثر جماعت ایسی بروئے کار آئی جس نے غنا پر فقر کو ترجیح دے کر ایک نیا معیار زندگی پیش کیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو



این مقدمات قطعاً وقہراً انسان را بانز دا  
و تسلیم کامل بار اوہ الہی سوق می دہد و  
قدیم ترین شکل تصوف اسلامی ہمیں  
است کہ جماعتی در طلب نجات اخروی  
وترس از خسران ابدی از دنیا کنارہ گرفتند،  
وبواسطہ ضعف ارادہ کجی سلیقہ راہ  
افراط و مبالغہ پیمودند و می توان گفت کہ  
چوں در خورد آن قدرت رانمی دیدند کہ  
دربین ادارہ معاش و ادائی و ظائف اجتماعی  
ضمنانت تکالیف دینی وامور معادی خود ہم  
بپرد ازند، یکبارہ از دنیا و ہرچہ کہ ممکن  
است سبب آلودگی شود، چشم پوشیدند  
و از جادہ اعتدال و میانہ روی کہ دستور  
اساسی قرآن اس منحرف شدند۔ (۱۷۴)

خلاف ورزی کی۔“

یہ امر بدیہی ہے کہ ایک مسئلہ میں تمام ارباب علم کا کلی طور پر متفق ہونا علم اور تحقیق کی دنیا میں تقریباً ناممکن ہے۔  
نقطہ نظر کا یہ اختلاف بہت سے اسباب کا حامل ہوتا ہے۔ منجملہ دیگر اسباب کے ایک سبب یہ بھی ہے کہ اپنا نقطہ نظر پیش  
کرنے والے شخص کی نظر میں بعض پہلو بہت واضح بعض بہت کم اور بعض قطعی طور پر معدوم ہوتے ہیں۔ اس طرح پیش  
کروہ نقطہ نظر میں ایک خاص وضع کا نقص واقع ہو جاتا ہے چنانچہ اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر قاسم غنی کی نگاہ سے  
یہ پہلو پوشیدہ رہا کہ بعض معاملات میں افراط حصول مقصد کے لئے مستحسن بھی ہوتا ہے اور وہ لوگ جو اپنے سامنے کوئی  
مقصد یا نصب العین رکھتے ہیں، وہ افراط کو اس طرح معیوب نہیں سمجھتے جس طرح نصیب العین نہ رکھنے والے حضرات  
افراط کو غیر مفید یا معیوب خیال کرتے ہیں۔

حقیقت حال یہ ہے کہ کسی مخصوص معاشرے کے مختلف شعبوں سے وابستہ افراد کے وظائف اجتماعی کی نوعیت  
یکساں نہیں ہوتی۔ ایک معلم کا اجتماعی وظیفہ یہی ہے کہ وہ طالب علم کو جو ہر تعلیم سے مزین کرے در آمد و بر آمد کے

یہ امور (ظالم و جابر حکومت کا قیام اور رعایا کی بے بسی)  
لازم انسان کو زہد و عبادت اور تقدیر کے آگے سر تسلیم خم  
کرنے کی جانب مائل کر دیتے ہیں۔ اسلامی تصوف کی  
قدیم ترین شکل یہی تھی کہ مسلمانوں کے ایک گروہ  
نے آخرت کی نجات کی طلب میں اور ابدی خسران کے  
خوف کے احساس سے دنیا سے کنارہ اختیار کر لیا تھا اور  
قوت ارادی کی کمزوری اور حالات سے نمٹنے کا سلیقہ نہ  
ہونے کے باعث افراط اور مبالغہ کی راہ پر چل نکلا۔ کہا جا  
سکتا ہے کہ چوں کہ ان لوگوں میں معاشرے کے اجتماعی  
تقاضوں کو پورا کرنے کی قوت نہ تھی اس لئے انھوں نے خود  
کو دینی واجبات اور آخرت کے معاملات تک محدود کر لیا  
اور یک لخت دنیا اور آلائش دنیا کے معاملات سے علیحدہ  
ہو گئے اور قرآن کے اصول اعتدال، اور میانہ روی کی

اداروں کی تنظیم اس کے فرائض میں داخل نہیں ہوتی اور نہ وہ اس کا اہل تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کاشت کار یا صنعتی شعبے سے تعلق رکھنے والے فرد کو کسی دارالعلوم یا جامعہ کی سربراہی سپرد نہیں کی جاسکتی۔ ہر کارے و ہر مرد کا اصول ہمیشہ سے کارفرما رہا ہے اور کارفرما رہے گا۔

تصوف اور صوفیہ پر لکھنے والوں میں سے اکثر نے اس اصول کو نظر انداز کرتے ہوئے صوفیا کو انفعالیات اور سلیبت کا مرتکب قرار دیا ہے۔ یہ نقطہ نظر کہ صوفیہ اجتماعی وظائف کی استعداد سے حاری تھے اور انھوں نے ترک دنیا کے مسلک میں اپنے لئے پناہ تلاش کر لی تھی، تاریخ اور روایت سے مستبٹ ہونے والے حقائق پر مبنی نہیں ہے۔ ابھی چند صفحے پیشتر اصحاب صفہ رضوان اللہ علیہم کا ذکر کیا گیا ہے۔ مسجد نبوی کے نزدیک ایک چوترے کے یہ یکمین دنیا و مافیہا سے بے نیاز اپنا تمام وقت عبادت و ریاضت میں بسر کرتے تھے۔ متاع دنیا ان کے لیے قلیل تھی۔ اکثر تجرد کی زندگی گزارتے تھے۔ دنیاوی اعتبار سے بے نوا اور بے زر لوگوں کا دینی مقام یہ ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ ان اصحاب میں نشست و برخاست پسند فرماتے تھے۔ ان کی دنیوی تربیت میں مشغول رہتے تھے۔ ان کی تالیف قلب فرماتے تھے اور جیسا کہ ڈاکٹر مصطفیٰ حلیمی نے تحریر کیا ہے۔

”آں حضرت ﷺ کی پیروی میں آپ کے اہل بیت بھی ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے تھے اور ان سے گھلے ملے رہتے تھے اور ان کی صحبت میں اٹھنا بیٹھنا موجب فلاح و صلاح سمجھتے تھے۔ حضرت حسن بن علی بن ابی طالب اور عبداللہ بن جعفر وہ بزرگ تھے جو اہل صفہ کی محبت کو دین کی محبت سمجھتے تھے۔ ان سے اس لئے قرب حاصل کرتے تھے کہ اچھے اخلاق و آداب سیکھیں۔ (۱۷۵)

اگر اجتماعی زندگی کی ضرورتوں میں حسن خلق، حسن عمل، تقویٰ اور توکل کی اہمیت کو تسلیم کیا جائے تو اصحاب صفہ اس ضرورت کی تکمیل کا مستند اور مصدقہ ادارہ تھے۔ مستند اور مصدقہ ان معنوں میں کہ رسول اکرم ﷺ کی سند خوشنودی اور رضا انہیں حاصل تھی۔ کبار صوفیہ نے جن کی تعداد ان چودہ سو برسوں میں شاہد چودہ سو سے زائد نہ ہو۔ اگر امت کی روحانی اور اخلاقی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ایثار سے کام لیا تو اسلام کی روحانی تاریخ میں ان کی خدمات کو نظر انداز کرنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ پھر جیسا کہ حضرت شیخ نظام الدین محبوب الہی کا ایک قول گزشتہ صفحات میں درج کیا گیا ہے، صوفیہ کا ”ترک دنیا“ نیاگ اور سنیاں قسم کی چیز نہیں ہے بلکہ مال و دولت کی بے جا ہوس میں مبتلا نہ ہونا فقر و درویشی ہے۔ فوائدا لفراد میں ایک مقام پر ترک دنیا کے مفہوم کو واضح کیا گیا ہے۔

لختی سخن در ترک دنیا افتاد۔ دریں باب  
 نیک غلوفر سود، بوزبان مبارک راند کہ  
 اگر کسی روز بہابہ صیbam گزراند و شب بہابہ  
 قیام وزائرا لحرمین باشد اصل آن می باید  
 کہ دوستی دنیا در دل اون باشد، بعد از  
 گفت کہ ہر کہ دعوی دوستی خدا کند  
 و محبت دنیا در دل او باشد اد و راں دعوی  
 کذاب باشد۔ (۱۷۶)

بہر ترک دنیا کا ذکر ہوا۔ اس باب میں آپ نے بہت  
 کوشش و سعی کرنے کی تلقین کی۔ آپ نے فرمایا۔ بے  
 شک کوئی شخص دنوں کے روزے رکھے، راتوں کو نماز  
 پڑھے اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت کرے مگر ان  
 کاموں کی بنیاد یہ ہونی چاہیے کہ اس کے دل میں دنیا کی  
 محبت نہ ہو بعد ازاں ارشاد فرمایا، جو شخص خدا کی دوستی کا  
 دعویٰ کرے اور اس کے دل میں دنیا کی محبت بھی ہو تو وہ  
 اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہوگا۔“

ادب صوفیہ کے مطالعہ سے مستنبط ہوتا ہے کہ کبار صوفیہ میں اکثریت ان بزرگوں کی ہے جنہوں نے اتباع  
 سنت میں متاہل زندگی اختیار کی اور اس باب میں وہ تمام حقوق ادا کیے جو قرآن و سنت سے ہر مسلمان پر واجب ہوتے  
 ہیں۔ خواجہ حسن بصریؒ (متوفی ۱۱۰ھ) جو تصوف کے بعض سلاسل کے سرخیل ہیں باوجود اپنے زہد و انزاد کے متاہل  
 زندگی بسر کرتے تھے۔ جن دنوں حجاج بن یوسف کے ظلم و تشدد سے تنگ آ کر روپوش تھے تو ان کی صاحبزادی کا انتقال  
 ہو گیا۔ خواجہ حسن بصریؒ کی ایما کے مطابق محمد بن سیرین کو کہا گیا کہ مرحومہ کی نماز وہی پڑھائیں۔ (۱۷۷) تذکرۃ الاولیاء  
 کے مطالعہ سے تحقیق ہوتا ہے کہ مالک بن دینار (متوفی ۱۳۳ھ) حبیب عجمی جو حسن بصریؒ کے معاصر تھے، فضیل بن  
 عیاض (متوفی ۱۸۷ھ) عبداللہ بن مبارک (متوفی ۱۸۱ھ) سفیان ثوری (متوفی ۱۶۱ھ) صاحب اہل و عیال صوفیہ تھے۔  
 (۱۷۸) عزیز عرفی کی تحقیق کے مطابق سیدنا شیخ القادر الجلیؒ کے انچاس صاحب زادے، اور صاحب زادیاں تھیں۔  
 (۱۷۹) خواجہ معین الدین چشتیؒ جو برصغیر میں چشتیہ سلسلے کے بانی ہیں، متاہل زندگی گزارتے تھے۔ (۱۸۰) حضرت خواجہ  
 کے خلیفہ اول شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ بھی صاحب اہل و عیال تھے۔ (۱۸۱) خواجہ اجمیر کے ایک اور خلیفہ خواجہ  
 حمید الدین ناگوری (متوفی ۶۷۳ھ) جو سلطان التارکین کے لقب سے مشہور ہیں زن و فرزند رکھتے تھے ان کے ترک دنیا  
 کا یہ حال تھا کہ:

يك بيگهه زمين داشت، نيم بيگهه ازاں بدست مبارك بکلند راست کردے و چیزے بکاشتے، تا این غایت کہ آن رسیدے نيم بيگهه دیگرے راست کردے و بکاشتے - (۱۸۲)

ایک بیگہ زمین ان کے پاس تھی۔ آدھی بیگہ زمین خود کدال سے درست کرتے اور کوئی چیز اس میں بوتے۔ جب اس میں کچھ پیداوار ہو جاتی تو بقیہ آدھی بیگہ زمین کو ہونے کے لئے درست کرتے اور کوئی چیز اس میں بوتے۔

ان ہی سلطان التارکین سے متعلق ایک واقعہ تاریخ کی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے، جسے مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے نقل کیا ہے۔

”ناگور کے مقطع (صوبے دار) نے شیخ سے چاہا کہ کچھ امداد قبول کریں لیکن پذیرائی نہ ہوئی۔ اس نے بادشاہ غالباً ناصر الدین محمود یا التمش کو ان کے حالات لکھ بھیجے ولی سے، ”پانصد تنگہ نقرہ و فرمان یک و یہہ“ صوبے دار کے پاس آیا کہ فوراً شیخ کی خدمت میں حاضر کرو صوبے دار لے کر حاضر ہوا۔ آپ دیوان خانہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ صوبے دار نے حال سنایا۔ کچھ نہ بولے اندر زنانہ میں تشریف لے گئے بیوی سے جا کر واقعہ کا ذکر کیا۔ اس وقت بیوی صاحبہ کی اوڑھنی پھٹی ہوئی تھی۔ اور شیخ کی لنگی میں پیوند تھے۔ مگر سنتے ہو، اس حال میں بھی اسلام کی خاتون کا حال سنتے ہو۔ شیخ سن رہے تھے،

اے خواجہ توجہ می خواہی کہ فقرچندیں اے خواجہ! کیا آپ چاہتے ہیں کہ اپنے اتنے برسوں کے سالہ خود را باطل کنی۔ تو خاطر جمع دار، فقر و رویشی کو (اتنی جلدی) باطل کر دیں۔ آپ بالکل من دوسیر ریسماں بدست خود رشتہ ام۔ مطمئن رہیں میرے پاس دوسیر سوت موجود ہے جو میں ازاں مقصد ترا جامہ خواہد شد کہ ترافوطہ نے اپنے ہاتھوں سے کاٹا ہے۔ اس سے کپڑے بن (لنگی) و مرا دامنے (اوڑھنی) مرتب خواہد جائیے گے، آپ کے لئے لنگی اور میرے لئے اوڑھنی۔ شد۔“ (۱۸۳)

دائرة المعارف اسلامیہ کے مندرجات کے مطابق خود اصحاب صفہ رضوان اللہ علیہم کی جماعتی زندگی کا یہ حال تھا۔

”اصحاب صفہ نے بھیک کبھی نہیں مانگی۔ کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا جو کچھ ملا کھالیا ایک ٹولی کبھی جنگل جاتی اور لکڑیاں چن کر لاتی اور بیچ کر اپنے اور بھائیوں کے لئے کھانا مہیا کرتی۔“ (۱۸۴)

حقیقت حال جس طرح ڈاکٹر قاسم غنی نے پیش کی ہے۔ اس طرح نہیں ہے کہ صدر اول کے زہاد، عباد اور صوفیہ اجتماعی فرائض یا معاشرتی ضروریات پوری کرنے کی صلاحیت سے عاری تھے۔ اس لیے قرآن کے بنیادی اصول ”راہ اعتدال“ سے منحرف ہو کر دنیا اور اسباب دنیا سے کنارہ کش ہو گئے بلکہ اسلام کی حیات روحیہ اور نظام اخلاق میں ان کے اسلوب زندگی کی زبردست اہمیت ہے۔ ان کا ایثار اخلاقی عظمت کا حامل ہے اور ایثار و اخلاق کی یہ روایت کبار صوفیہ کے ساتھ وابستہ اور زندہ رہی ہے یہ الگ بات ہے کہ بعض ارباب علم صوفیہ کے طرز زندگی کو رہبانیت سمجھتے ہیں یا انفعالی نفس تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ خالص انسانی مسئلہ ہے جو انسانوں کے بہترین اخلاق کی درستی سے تعلق رکھتا ہے اور جس کا ایک رخ سعدی شرازی نے گلستان کے ان اشعار میں نمایاں کیا ہے۔ (۱۸۵)

نیم نانی گر خورد مرد خدای  
بذل درویشان کند نمی دگر  
ملک اقلیمی بگیرد پاد شا  
ہم چناں در بند اقلیمی دگر

اور یہ جملہ بھی شیخ نے ان اشعار کی اہمیت اجاگر کرنے اور درویشوں کے ایثار و کرم کی خصوصیات کو واضح کرنے کے لئے تحریر کیا ہے۔

دہ درویش در گلیمی بخسپند و دو پادشاہ در اقلیمی نگنجند ..... (۱۸۶)  
دنیا اور متاع دنیا کے بارے میں صوفیہ کا مسلک رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات اور سنت کے عین مطابق تھا یہاں مشارق الانوار سے دو حدیثیں بطور مثال نقل کی جاتی ہیں۔

عن انس قال قال رسول الله ﷺ لو كان بخاري اور مسلم میں انس سے روایت ہے کہ حضرت لابن ادم واديان من مال لا يتبغى ثالثا ولا علي بن ابي طالب نے فرمایا کہ اگر آدمی کے پاس دو جنگل بھر یملاء جوف ابن ادم الا للتراب ویتوب اللہ علی مال ہوتا تو ان کے ساتھ اور تیسرے جنگل کو بھی تلاش من تاب۔ (۱۸۷)

کرتا اور آدمی کا پیٹ سوائے خاک کے نہیں بھرتا اور خدا اسی پر رحمت سے متوجہ ہوتا ہے جو حرص اور لالچ سے توبہ کرتا ہے۔

عن ابی سعید الخدریؓ قال قال رسول اللہ ﷺ ابو سعید .. سے روایت ہے کہ حضرت محمد علیہ السلام ﷺ ما یکن عندی خیر فدن الآخره عنکم ومن نے فرمایا کہ جو میرے پاس مال ہوگا۔ اس کو میں تم یستغفر یغفرہ اللہ ومن یستغن یغفرہ اللہ ومن سے چھپا کر جمع کر کے نہ رکھوں گا اور جو سوال اور حرام یتصبرہ اللہ وما اعطی احد عطاء خیراً واکاموں میں سے آپ کو بچا دے پر ہیز گار بننے کے ارادے پر تو خدا اس کو سچا پر ہیز گار کر دے گا، اور جو دنیا وسع من الصبر۔ (۱۸۸)

سے بے پروا ہی کی نیت رکھے گا تو خدا اس کے دل کو دنیا کے مال سے بے پروا کر دے گا اور جو شخص کہ مصیبت اور بلا میں آپ کو بزور صبر والا بنادے گا۔ تو خدا اس کو سچا ہے بناوٹ صابر کر دے گا اور کسی کو بہتر اور کشادہ تو صبر سے کوئی نعمت نہیں ملی۔

صوفیہ کی تصانیف اور ملفوظات میں بے شمار واقعات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صوفیہ نے توکل وقناعت، ایثار و صبر کو اتباع سنت کے لئے اختیار کیا اور ان خوبیوں کو اپنی زندگی میں مستقل حیثیت دی۔ بادشاہوں اور امیروں سے کچھ لینا گوارا نہ کرتے تھے اور ان کو جو ”قوحات“ حاصل ہوتی تھیں انہیں غرباء اور مستحقین میں تقسیم کر دیتے تھے۔ صوفیہ نے متقدمین میں حبیب عجمی، فضیل بن عیاض، عبد اللہ بن مبارک، سفیان ثوری اور حارث محاسنی نے اسی طریق پر زندگی بسر کی۔ (۱۸۹) متاثرین میں بھی یہی روایت قائم رہیں۔ چند مثالیں فوائد الفوائد، خیر المجالس اور اخبار الانبیاء سے پیش کی جاتی ہیں۔

”آپ نے فرمایا ایک درویش انتہائی فقر و مسکنت کی حالت میں تھا۔ اس کا پیٹ بھوک کی شدت سے کمر سے جا لگا تھا۔ وہ ایک راہ پر چلا جا رہا تھا کہ خواجہ محمود پٹوہ نے کہا کہ ہمارے دوست نے اسے ایک دانگ (ایک معمولی سکہ) دیا۔ اس نے کہا آج میں نے تیل کی کھلی سیر ہو کر کھائی ہے اور میں غذا کے معاملے میں پوری طرح مستغنی ہوں۔ مجھے آج اس دانگ کی ضرورت نہیں۔ (۱۹۰)

”ایک بزرگ تھے جنہیں شیخ علی کہتے تھے ایک دفعہ وہ اپنا خرچہ سی رہے تھے۔ انہوں نے اپنے پاؤں پھیلا رکھے تھے۔ خرچہ کا ایک پلہ اپنی ران پر ڈالے اس میں پیوند لگا رہے تھے۔ اس دوران میں لوگوں نے ان سے کہا کہ خلیفہ آرہا ہے۔ انہوں نے اپنا انداز نہ بدلا۔ اسی طرح رہے جیسے کہ تھے اور کہا، اتار ہے خلیفہ آیا سلام کیا اور



بیٹھ گیا۔ شیخ نے سلام کا جواب دیا۔ خلیفہ کے حاجب (چوب دار) نے جو اس کے ساتھ تھا، کہا شیخ اپنے پاؤں سمیٹ لیجئے شیخ نے اس کی بات کی طرف بالکل دھیان نہ دیا۔ یہاں تک کہ حاجب نے یہی بات ایک دوبارہ ہرائی۔ الغرض جب خلیفہ واپس جانے لگا تو شیخ نے اپنے ایک ہاتھ میں خلیفہ کا ہاتھ اور دوسرے میں حاجب کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔ میں نے اپنے ہاتھ سمیٹ لیے ہیں اس لئے میرے لئے روا ہے کہ اپنے پاؤں نہ سمیٹوں۔

”پھر حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ (شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی) نے باب صبر اور نگاہداشت انصاف میں یہ حکایت بیان فرمائی ہے کہ مولانا فخر الدین مزوری سلطان الاولیاء قدس سرہ کے مرید تھے۔ کتابت کیا کرتے۔ بعد لکھنے کے وہ کتاب لوگوں کو دکھلا کر پوچھتے کہ یہ کتاب کتنی کی ہے وہ کہتے کہ ہر جزو اس کا ششکانی مزدوری رکھتا ہے۔ یہ کہتے اس کی قیمت فی جزو چار چیتل لوں گا نہ زیادہ۔ اگر کوئی بارہ پیسے دیتا نہ لیتے۔ وہی چار چیتل لیتے۔ جب یہ بوڑھے معمر ہوئے اور لکھنا ترک ہوا تو قاضی حمید الدین ملک التجار نے سلطان علاء الدین کی خدمت میں عرض کیا کہ اس شہر میں ایک بہت بڑے عالم و بزرگ ہیں۔ عمر بھر کتابت کرتے گزارہ کیا۔ اب کمر سنی کی وجہ سے نہیں لکھ سکتے، حسرت سے گزرتی ہے۔ بیت المال سے ان کا دوزینہ مقرر ہو جانا بہتر اور موجب برکت جان و مال سلطانی کا ہے۔ بادشاہ نے روزانہ ایک تنکہ مقرر فرمایا مگر انہوں نے نہ قبول کیا، بادشاہ نے بھولا چاری فرمایا۔ خیر جو یہ کہیں اتنا ہی دیا کرو۔ اس پر یاروں کی سعی و کوشش سے وہی ششکانی روزینہ قبول فرمایا۔ (۱۹۱) شیخ عبدالمحق محدث دہلوی نے شیخ نظام الدین محبوب الہی کی وفات کے حالات میں درج کیا ہے۔

”آخری وقت جب آپ اس دنیا سے جا رہے تھے تو پوچھنے لگے کہ نماز کا وقت ہو گیا اور کیا میں نے نماز پڑھ لی ہے؟ اس پر لوگ جواب دیتے کہ جی ہاں آپ نے نماز ادا فرما چکے ہیں تو ارشاد فرماتے کہ میں دوبارہ پھر پڑھتا ہوں۔ غرض کہ ہر نماز کو تکرار سے پڑھنے اور فرماتے کہ ہم جا رہے ہیں، ہم جا رہے ہیں۔ پھر خادم کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ اگر گھر میں کسی قسم کا کوئی سامان رہا تو کل قیامت کے روز اس کے متعلق جواب دینا پڑے گا۔ چنانچہ خادم نے سب کچھ لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ البتہ وہ غلہ رہنے دیا جو درویشوں کے کھانے کے لئے تھا۔ (آپ نے خادم سے) پھر فرمایا کہ مردہ مال کیوں رکھ چھوڑا ہے اس کو بھی نکال پھینکو اور گھر میں جھاڑو دے دو۔ تب خادم نے غلہ خانے کے دروازے کھول دیے اور لینے والے لوگوں کا ایک ہجوم جمع ہو گیا اور تمام غلہ لے گئے۔“ (۱۹۲)

صوفیہ کے طرز حیات اور طور زندگی سے متعلق جو حقائق و شواہد پیش کئے گئے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ

صوفیہ نے تاریخ کے ہر دور میں ایک مسلمان کی زندگی کے تمام محاسن اخلاق کی ترجمانی اور عکاسی کی ہے تصوف اور صوفیہ سے اختلاف رکھنے والے حیات و کائنات کے اس حکیمانہ نکتہ پر غور نہیں کرتے کہ کائنات کی ہر شے، جس میں انسان بھی شامل ہے، اپنی فطری صلاحیت اور جبلی شاکلہ کی حدود ہی میں وظیفہ حیات ادا کرتی ہے۔ قرآن حکیم نے اس اصول اور حقیقت پر ”قل کل یعمل علی شاکلتہ“ کی مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ (۱۹۳)

اپنے مخصوص مسلک اور طرز احساس کے باوصف صوفیہ اس اصول صداقت سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ انہوں نے تمام عرصہ حیات جیسا کہ فرض کر لیا گیا ہے۔ زادیوں، خانقاہوں اور صحراؤں میں طے نہیں کیا ہے بلکہ عام انسانوں کی طرح انہوں نے بھی جلی شاکلہ کے مطابق عملی زندگی بسر کی ہے۔ ان میں وہ بزرگ بھی تھے جو ترک و تجرید پر عمل پیرا تھے۔ وہ بھی تھے جنہوں نے اہل و عیال کے ساتھ اپنے کام کو جاری رکھا۔ ان میں متوکل بھی تھے۔ وہ بھی تھے جو ضروریات زندگی کے لئے کسب کرتے تھے۔ محمد ابن سیرینؒ (متوفی ۱۱۰ھ) کا پیشہ تجارت تھا۔ (۱۹۴)

ابو عبیدہ محمد حسان البصری کی گزران کا ذریعہ کاشت کاری تھا۔ (۱۹۵)

احمد نوری (متوفی ۲۹۵ھ) اپنے معاش کے لئے دکان کرتے تھے۔ (۱۹۶)

ستری سقطی (متوفی ۲۵۷ھ) جو جنید بغدادی کے شیخ تھے۔ تجارت کرتے تھے۔ (۱۹۷) عہد غزالی کے ایک بزرگ خواجہ محمد منکر بھی تجارت کے پیشے سے منسلک تھے۔ (۱۹۸)

شیخ احمد نہردانی کپڑا بناتے تھے۔ (۱۹۹)

عثمان حرب آبادی روٹی سالن فروخت کرتے تھے۔ (۲۰۰)

یہی نہیں بلکہ صوفیہ نے تقاضائے وقت کے مطابق جہاد بالسیف سے بھی دریغ نہیں کیا۔ حضرت عبداللہ بن مبارک، حاتم اصم اور شقیق بلخی نے باقاعدہ جہاد میں حصہ لیا۔ (۲۰۱)

انہوں نے زاویے اور خانقاہیں بھی قائم کی جہاں غرباء و مسکین کھانا کھانے جاتے تھے اور ان کی دوسری ضرورتوں کو پورا کیا جاتا تھا انہوں نے دینی تعلیم کے لیے مدارس و مکاتیب جاری کیے اور مسند علم پر بیٹھ کر تشنگان علم کو سیراب کیا۔ ڈاکٹر خلیق احمد نظامی نے اسلام کی حیات روحیہ میں صوفیہ کے کردار کی صحیح نشان دہی کی ہے وہ کہتے ہیں۔

”جب تاریخ کا کوئی طالب علم اسلام کا بہ حیثیت ایک مذہبی تحریک کے مطالعہ کرنا چاہتا ہے تو اس کو حضور سرور کائنات ﷺ اور خلفاء راشدین کے بعد ان ہی بزرگوں کی حیات طیبہ کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح یہ بزرگ اسلام کی دینی تاریخ کا جزو لاینفک بن گئے ہیں۔ ان کی زندگیوں کو غیر اسلام قرار دے کر اگر نظر انداز کیا جائے تو نہ صرف اسلام کی مذہبی تاریخ میں ایک خلا پیدا ہو جائے گا بلکہ اسلام کے دینی نشوونما کا صحیح مطالعہ ہی ناممکن ہو جائے۔ ”تکمیل اخلاق“ جو بحث نبوی ﷺ کا اہم مقصد تھا، ہمیشہ ان بزرگوں کا صحیح مطمح نظر رہا۔ (۲۰۲)

اس بحث کا ماحصل یہ ہے کہ تصوف کی اصل جناب رسالت مآب ﷺ، صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ کے عہد میں موجود تھی اسی اصل و اساس پر دور مابعد کے صوفیہ نے اس مسلک کو برقرار رکھا اور اس کی حفاظت کی، تاریخی مطالعہ کے اعتبار سے پہلی صدی ہجری کی خصوصیات تصوف یہ ہیں:

(۱) رسول اکرم ﷺ کے بعد چند نسلوں تک بزرگوں پر خشیت الہی کا غلبہ تھا۔ شرعی احکام کی بجا آوری سے ان کے باطنی تقاضوں کی تسکین ہوتی تھی اور ان کی زندگی توبہ و استغفار کی کیفیت سے لبریز تھی۔

(۲) تصوف سے اجتماعی طرز احساس کی صورت اختیار نہیں کی تھی۔

(۳) دوسری صدی ہجری سے پہلے اس مسلک کو تصوف کا نام دیا گیا۔

(۴) سرسری جائزے کے طور پر یہ کہنا کسی حد تک درست ہے کہ دور اول کی نمایاں خصوصیت، زہد، عبادت اور خشیت الہی کی جانب صوفیہ کا میلان ہے۔ لیکن یہ تاریخی تجزیہ کا ظاہری پہلو ہے۔ حقیقت یہ تھا کہ اس سے وری بلکہ مادرئی ہے اور وہ یہ ہے کہ صوفیہ نے اسی دور میں عشق و محبت کے نخل خوش ثمر کی تخم پاشی کی تھی۔ ان کی خشیت ان کا زہد، ان کی عبادت خوف و رجاء کے اس احساس کا نتیجہ تھا جو محبت و شوق کے باعث پیدا ہوتا ہے اور رضائے محبوب اس کا ثمرہ اور حاصل ہے۔ نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ اہل ایمان اللہ سے شدید محبت کرتے ہیں اور اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی ہیں۔ یہ دین کے وہ ثمرات ہیں جو محبت اور صرف محبت ہی سے حاصل ہوتے ہیں۔ وہ حضرات جو لفظ عشق کو بدعت خیال کرتے اور عہد مابعد کی ضلالت قرار دیتے ہیں وہ صورت لفظ ہی سے نا آشنا ہیں، معنی اور حقیقت ان سے دور بلکہ بہت دور ہے۔ مختصر یہ کہ صوفیہ کے احسانی رویے کی اصل دور اول ہی سے محبت الہی ہے۔

دوسری صدی ہجری سے چوتھی صدی ہجری تک:

اسلامی تاریخ کا یہ دور جو تین صدیوں پر محیط ہے، علمی، فکری، روحانی اور دینی اعتبار سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ علمی سطح پر اس دور میں تدوین حدیث کا اہم کام جو کلام الہی کے بعد دین کے لئے نص قطعی کا درجہ رکھتا ہے، تکمیلی مدارج تک پہنچا۔ (۲۰۳)

فقہ اسلامی کے مختلف مکاتب جن کا تعلق امام ابو حنیفہؒ (متوفی ۱۵۰ھ) امام مالکؒ (متوفی ۱۷۹ھ) امام شافعیؒ (متوفی ۲۰۴ھ) امام احمد بن حنبلؒ (متوفی ۲۴۱ھ) کی ذات ہائے گرامی سے ہے صورت پذیر ہوئے۔ فکری سطح پر معتزلہ اور اشاعرہ کے گروہ اسی زمانے میں منصہ شہود پر آئے۔ (۲۰۴)

تاریخ تصوف میں یہ دور دو نمایاں خصوصیات کا حامل ہے۔ اول یہ کہ اس مسلک نے اپنی تکمیل اور ارتقاء کے انتہائی اہم مدارج طے کیے اور اگرچہ اس کے ارتقاء اور تکمیل کو واضح طور پر مکمل اور منظم نہیں کہا جاسکتا۔ تاہم تصوف نے ایک ایسی صورت ضرور اختیار کر لی تھی کہ اسے عروج تک پہنچنے میں تو زیادہ عرصہ درکار نہ تھا۔ چنانچہ آئندہ دو صدیوں نے تصوف کے انتہائی عروج کو مفصل شہادت تاریخ کے اوراق میں محفوظ کر دی ہے دوسرے یہ کہ یونانی عقلیت اور فلسفہ کی متشککہانہ ژولیدگی سے پیدا ہونے والے تباہ کن اثرات کے مقابلے میں صوفیاء نے اس دور میں عشق و محبت اور وجدان و یقین سے حاصل ہونے والی کیفیات اور مثبت اثرات پر اصرار کیا۔ یہاں ان حقائق کو تفصیل سے پیش کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر قاسم غنی نے رسالہ قشیر یہ اور مقدمہ ابن خلدون کے حوالے سے تحریر کیا ہے۔

دو قرن دوم ہجری مخصوصاً	دوسری صدی ہجری میں خاص طور پر
درنمیثہ آخر آن یک دستہ	اس کے نصف آخر میں ملت اسلامیہ
مرومی دربین مسلمان ہادیدہ	میں ایک گروہ نظر آتا ہے جو ایک
مشمود کہ زندگی عجیب و خاصی	خاص اور عجیب انداز سے زندگی بسر/تاعما
دارند - بایں معنی کہ رفتار	و دوسرے لوگوں سے مشابہت
وظوا ہر حالات آن ہا ہیج	نہیں رکھتے چنانچہ لازماً اس گروہ کا
شبہ ہتی بسائر مردم ندارد وقہرا	کوئی نام بھی رکھا جانا چاہیے اور وہ نام
اسم مخصوصی می بایست	”صوفی“ تھا اور یہ اس مناسبت
بآنہادادہ می شود و آن نام ”صوفی“	سے کہ ان لوگوں کا لباس موٹے اور

کھر درے اون کا ہوتا تھا۔ ان میں  
سے بعض نے دور افتاد گوشوں میں اپنے  
لیے عبادت گاہیں بنالی تھیں اور  
وہاں رہتے تھے اور بعض غاروں میں  
گوشہ نشین تھے۔ اور بعض جنگل  
بیابانوں میں پھرتے رہتے تھے۔

یہ گروہ عہد اول کے زاہدوں سے  
ریاضت، زہد اور ترک دنیا کے رویے  
میں بہر حال آگے بڑھا ہوا تھا۔

اگر ہم بہت ہی غور و خوص سے اس عہد  
کے صوفیہ کی زندگی کا مطالعہ کریں اور  
انکے اقوال پر غور کریں تو ہم دیکھتے  
ہیں کہ حقیقی عرفان کے عناصر  
اور محبت الہی، اور وحدت الوجود  
کے اساسی اقوال جو صوفیہ سے خاص  
ہیں اور اس طرح کی اور باتیں معین  
اور واضح طور پر ان میں نظر نہیں آتیں  
اور اتفاقاً کوئی قول عشق و محبت،  
وحدت الوجود اور فنا کے بارے میں  
ملتا ہے تو ان قطعی اور پختہ معنوں

است بمناسبت آن کہ این مردم،  
بلباس، پشمینہ دھاتی خشنی ملبس  
اند۔ بعضی از آنہادر نقاط دور از  
جمعیت صوامعی برای خود ساخته  
در آن جازندگی می کنند، بعضی  
در مغارہ ہا گوشہ نشین شدہ و دستہ  
در صحرا ہامی گردند۔ (۴۵)

این دستہ در ریاضت وزئدہ ترک  
دنیا مرا حلی از زہاد عہد اول پیش  
افتادند۔ (۴۶)

چوں بہ قت شرح زندگی صوفیاں  
ایں عہد را ملا حظ کنیم و در گفتار  
آنها تامل نمائیم می بینیم کہ از عنا  
صرو واقعی عرفان و گفته ہائی اساسی  
صوفیہ از قبیل محبت الہی و وحدت  
الوجود و امثال آن بمشکل معین و  
روشن صحبتی در میان نیست  
و اگر ہم اتفاقاً سخنی از عشق و  
محبت و وحدت الوجود و فنا بہست  
بمسنائی پختہ قرنہائی بعد نیست  
(۴۷)

میں نہیں ہے جو اس کے بعد کی صدیوں  
میں سمجھے گئے یا کہئے گئے۔

ڈاکٹر قاسم غنی کے مذکورہ بیانات دوسری صدی ہجری کے حالات تک محدود ہیں، ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ زہاد و عباد کا وہ گروہ جو ”صوفی“ کے نام سے منسوب ہوا۔ ترک دنیا، ریاضت و زہد میں سابقین سے بڑھ گیا تھا۔ حتیٰ کہ ان میں بعض کا طرز زیست عام مسلمانوں سے منفرد اور جداگانہ تھا۔ آبادی سے دور صحراؤں اور خلوت کے گونگوں میں زندگی گزارتے تھے۔ تاہم عشق الہی اور وحدت وجود کے عرفانی نظریات کی واضح صورت اس صدی میں معین نہ ہوئی تھی۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے بارے میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔

در ابتدائی امر مفہوم تصوف	ابتدا میں صوفیہ کے ہاں تصوف کا
نزد صوفیاں بسیار سادہ بودہ	مضمون بہت سادہ تھا اور قرآن و
واحد قرآن و حدیث و تشبہ	حدیث اور رسول اکرم ﷺ اور
پیغمبر و اولیائی دین و زہد و تعبد	بزرگان دین کی پیروی زہد و عبادت
و مقدم شمرون آخرت بردنیا خارج	اور دنیا پر آخرت کو مقدم خیال کرنے
نمی شدہ۔ بتدریج این نظر شدت	کی حد سے آگے نہ بڑھا تھا۔ یہ باتیں
یافتہ بدرجہ مبالغہ و افراط رسیدہ۔	آہستہ آہستہ بتدریج شدت اختیار کرتی
بعد بمرور ایام مایہ ہای ذوق	چلی گئیں اور افراط و مبالغے تک پہنچ
پیداشدہ دامنہ تصوف وسعت	گئیں۔ مرور ایام سے متاع ذوق میں
یافتہ و صوفیان از منابع مختلف	اضافہ ہوا اور تصوف میں بھی وسعت
چیز ہاسی التقاد کردہ بآن	پیدا ہوئی اور صوفیہ نے مختلف
افزودہ اند۔ (۴۸)	سرچشموں سے بہت سی باتیں

مستعار لیں، اور ان میں خاصا اضافہ  
بھی کیا گیا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت جنیدؒ کے  
اسلاف کے اقوال میں بہت ہی اہم

گفتہ ہا با سخنان اسلاف جنید  
بخوبی می بینیم کہ تحول

فکری بسیار مہمی در بین آن  
 ہا پیدا شدہ وافکار تازہ ای  
 واصطلاحات و تعبیرات  
 مخصوصی بوجود آمدہ است از  
 قبیل عدم اغتنائی بمرقع و صورت  
 ظاہر درویشی و پشمینہ پوشی وہ  
 عقیدہ بآنکہ زہد و ترک دنیا و  
 عبادت منظور نہائی و غایت  
 مطلوب نیست بلکہ مقدمہ است  
 برائی منظور عالی تری - وعدم  
 اعتماد بر طاعت کہ گاہی خود آن  
 طاعت ممکن است حجاب راہ  
 شود ونیز اہمیت بسیار بعشق و  
 محبت ودل وبے خودی ودل یا  
 ختگی دادن ویکی دانستن عارف  
 ومعروف وبہمہ چیز را مظہر  
 حق دیدن - (۲۹)

فکری اثر پیدا ہو گیا تھا اور نیا فکر۔  
 یعنی اصطلاحیں اور مخصوص  
 تعبیریں وجود میں آ گئی تھیں۔  
 مثلاً دل (گدڑی) سے بے پروائی،  
 درویشوں کی سی ظاہری صورت  
 بنائے رکھنا، اونی کپڑے پہنا زہد  
 کامل اختیار کرنا، ترک دنیا اور  
 عبادت مقصودہ مطلوب نہیں ہیں  
 بلکہ اعلیٰ مقصود کی طرف لے جانے  
 والے ذرائع ہیں۔ یہ خیال بھی پیدا  
 ہو چلا تھا کہ طاعت پر اعتماد نہ ہونا  
 چاہیے کہ کبھی کبھی طاعت بھی حجاب راہ  
 بن جاتی ہے۔ علاوہ ازیں عشق و  
 محبت، دل کی سرشاری، عالم بے  
 خودی، ذوق و مستی نے بہت  
 زیادہ اہمیت حاصل کر لی تھی۔ یہ  
 لوگ عارف و معروف کو ایک ہی خیال  
 کرتے تھے اور تمام چیزوں کو حق  
 کا مظہر سمجھتے تھے۔

ڈاکٹر قاسم غنی اس امر کے معترف ہیں ابتدا میں صوفیہ کا طریق زیست قرآن و حدیث کے احکام کے مطابق تھا اور انہوں نے اپنی زندگی رسول اکرم ﷺ کی سنت اور اولیائے دین کے منہاج پر مستقیم کر لی تھی لیکن تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں مختلف منابع کے زیر اثر عمل کی یہ صورت قائم نہ رہی۔ اس کے بجائے صوفیاء نظر یا تی زندگی یا وجدانی اور ذوقی کیفیات میں محور بننے لگے، حتیٰ کہ وہ طاعت کو بھی حجاب راہ تصور کرنے لگے نتیجہ ان کے

ملکات طیبہ کا رخ عشق و محبت، بے خودی اور وارفتگی کی جانب مبذول ہو گیا۔

ڈاکٹر قاسم غنی کا یہ تجربہ بڑی حد تک سعید نفیسی کے ان نظریات سے مماثلت رکھتا ہے جو گزشتہ باب میں زہرِ بحث آچکے ہیں اپنے تجربہ میں ڈاکٹر قاسم غنی نے واضح طور پر نہ سہی دے الفاظ میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ صوفیاء دینی عبادات (نماز، روزہ، حج وغیرہ کی) پابندیوں سے احتراز کرنے لگے تھے اور نظریاتی زندگی میں سکون و طمانیت کے متلاشی تھے۔ یہ تجربہ حد درجہ مغالطہ انگیز ہے اور تاریخ کی تحریری شہادتوں کے علی الرغم پیش کیا گیا ہے۔ گزشتہ صفحات میں اس امر کے بین ثبوت پیش کیے گئے ہیں کہ صوفیاء ہمیشہ علوم دینی سے حسب ضرورت بہرہ ور ہوتے رہے۔ (۲۰) وہ مسائل شرعی سے کامل طور پر آگاہ اور دینی عبادات کے پابند تھے۔ ان میں سے اکثر کی زندگی عامۃ المسلمین کے طریقوں کے مطابق تھی۔ وہ کسب حلال سے معاش پیدا کرتے تھے۔ اکثر نے ازدواجی زندگی بسر کی۔ رہا عشق و محبت، بے خودی اور وارفتگی کا بے پناہ رجحان، تو یہ رویہ بھی رسول اکرم ﷺ و صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مبارک زندگیوں سے مستفاد تھا۔ اس میں جس شدت اور تندگی کی جانب مورخین نے اشارہ کیا ہے اس کے تاریخی عوامل ہیں اور اس صورت حال کو اسی تناظر میں رکھ کر دیکھنا چاہیے لیکن قبل اس کے کہ ان تاریخی عوامل کی نشان دہی کی جائے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ڈاکٹر مصطفیٰ حلیمی کے بیانات سے آگاہی حاصل کر لی جائے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

”حضرت جنیدؒ جو گروہ صوفیاء کے سرخیل ہیں ان کے زمانے میں یا ان سے کچھ پہلے تصوف کے ایک اور رنگ کا ظہور ہوتا ہے۔ اس زمانے میں یہ ہوا کہ اہل کمال میں سے عام طبقہ تو اسی طریقہ پر کاربند رہا جس کا ذکر پہلے دور کے ضمن میں ہو چکا ہے۔ لیکن ان میں سے جو خواص تھے انھوں نے بڑی بڑی ریاضتیں کیں۔ دنیا سے قطع تعلق کر لیا اور مستقل طور پر ذکر و فکر میں لگ گئے۔ اس سے ان کے اندر ایک خاص کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس کیفیت سے مقصود یہ تھا کہ دل کو تعلق باللہ کی کیفیت حاصل ہو جائے اس دور کے اہل کمال کا تصوف یہ تھا کہ وہ خدا کی عبادت دوزخ کے عذاب سے ڈر کر یا جنت کی نعمتوں کے طمع میں نہ کرتے تھے بلکہ ان کی عبادت کا محرک خدا کے ساتھ ان کی محبت کا جذبہ ہوتا تھا۔“ (۲۱)

ڈاکٹر مصطفیٰ حلیمی کہتے ہیں۔

”دوسری صدی ہجری میں ہم ایک اور مکتب خیال کو ابھرتے اور نمایاں ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں اور وہ یہ کہ زہد میں محبت کی آمیزش شروع ہوئی۔ اس اہم اصول کو رابعہ حدویہؒ نے ایجاد کیا۔ اس محبت کی اصل یہ تھی



کہ خوف، جہنم اور طمع جنت سے بے نیاز ہو کر خدا کو اس لئے یاد کیا جائے کہ وہ خدا ہے۔ اس کی ذات سے بے انتہا اور الہانہ محبت کی جائے یہ محبت کسی دوسرے جذبے کے تابع نہ ہو۔“ (۲۲)

تصوف نے مختلف مراحل میں سے کسی مرحلہ میں بھی اس بنیاد و اساس کو نہیں چھوڑا۔ جو تصوف اور اسلام دونوں کے لئے بہ منزلہ عبادت تھی۔ یعنی قرآن و سنت ہر دور میں آخری منتہائے نظر رہا یعنی رضائے الہی اور رضائے الہی بھی اسوہ رسول ﷺ کی تقلید کے ساتھ۔ (۲۳)

شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ اور ڈاکٹر مصطفیٰ حلیمی کے بیانات قطعی واضح ہیں اور مزید توجیہ و تعبیر کے محتاج نہیں ہیں۔ ان بیانات سے ڈاکٹر قاسم غنی اور سعید نفیسی کے مثنوی تجزیوں کی بھی نفی ہو جاتی ہے کہ اس دور کے صوفیاء نے اپنی عبادات کو حجاب راہ خیال کیا اور غیر اسلامی منابع سے مختلف عناصر لے کر صدر اول کی زہد و تصوف کو علیٰ حالہ نہ رکھایا بہت سی نئی باتوں کا اضافہ کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی تحریک یا تاریخی عمل کی حیثیت کا تعین دو صورتوں میں ہوتا رہا ہے۔ بعض مثنوی اثرات کی نشان دہی کرتے ہیں لیکن تاریخ اپنی داخلی اور خارجی، تحریری اور غیر تحریری شہادتوں کے ساتھ حقیقی صورت حال کو زندہ و پائندہ رکھتی ہے، جس تک رسائی حاصل کرنا چنداں دشوار نہیں ہے۔ تاریخ تصوف بھی عام تاریخی حقائق کی مانند کسی استثنائے حاصل نہیں ہے اس لیے حقیقی صورت حال سے آگاہی بہر حال ممکن ہے۔

تصوف کے دور اول کے سلسلے میں یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اسلام نے قرآن حکیم اور سنت نبوی ﷺ کی اساس پر جس طرز زندگی کی دینی حیثیت کو تسلیم کیا ہے اس میں دنیا پرستی، جاہ طلبی اور اقتدار پسندی کو اخلاق حسنہ میں شامل نہیں کیا ہے۔ چنانچہ خلافت راشدہ کے بعد جب مسلمانوں کی زندگی میں ان ناپسندیدہ اخلاق کا ظہور ہوا تو ان معاصب نے جو میں پکڑنی شروع کیں تو ایک گروہ نے اس رویے کے خلاف رد عمل کا اظہار کیا۔ اس گروہ نے زہد و اتقا، ریاضت و قناعت، ترک و توکل کے شعائر جنہیں قرآن و سنت نے مستحسن قرار دیا ہے اختیار کیے۔ تاریخی عمل اس رد عمل کا مقتضی تھا اس لیے صوفیاء نے تاریخ کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے روایت (قرآن و سنت) کی اہمیت کو برقرار رکھا۔

دور ثانی یعنی دوسری صدی سے چوتھی صدی ہجری کے حالات و واقعات ایک دوسرے کے متقاضی رہے اور صوفیاء نے وجدانی بصیرت سے کام لیتے ہوئے اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کی جدوجہد جاری رکھی اور اس طرح اسلام کو ایک ایسے فن سے محفوظ رکھنے میں کامیاب ہوئے جو فتنہ تاتار سے مہلک اور تباہ کن ثابت

ہوتا۔ یہ فتنہ یونانی علوم اور فلسفے کے تواہم کی ترویج اور اشاعت کے بعد پوری شدت سے رونما ہوا۔ حتیٰ کہ خلفائے بنی عباس نے سیاسی مصالح کی بناء پر خلق قرآن کے مسئلے میں ظلم و طغیان کی ایسی نظیر قائم کی جس کی مثال اسلام کی تاریخ میں بغداد کے علاوہ کہیں نہیں ملتی۔ اور ٹھیک ٹھیک اسی طرح استقامت فی الدین کی مثال امام احمد بن حنبل نے قائم کی جس کے نمونے ان مقدس بزرگوں کی زندگی میں نظر آتے ہیں جو امام احمد بن حنبل کی تقلید میں استقامت فی الدین کے لئے کھڑے ہوئے۔

صوفیاء نے عقلیت اور فلسفہ طرازی کی اس بے یقینی اور انتشار فکر کے مقابل عشق و محبت کا چراغ روشن کیا جسے مستشرقین نے اپنی کم نگاہی کے سبب غیر اسلامی عنصر قرار دیا ہے حالانکہ یہ رویہ قرآن و سنت کی اساس سے علیحدہ نہیں ہے اور جس کی جانب گزشتہ باب میں اشارات کیے گئے ہیں ڈاکٹر خلیق احمد نظامی نے اس دور کے مخصوص حالات اور صوفیاء کے رد عمل کے سلسلے میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ یہاں چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

”عقلیت کا جو سیلاب مامون کے دربار سے نکلا تھا، مسلمانوں کی زندگی میں لامرکزیت پیدا کرنے کا باعث بن گیا۔ اعتقاد کی ساری بنیادیں ہل گئیں اور ملت کی ذہنی زندگی میں انتشار پیدا ہو گیا۔“ (۱۱۳)

”عقلیت کے ساتھ ساتھ ”وضعیت“ کا طوفان آنا بھی ناگزیر تھا۔ اس کی وضعیت کا سب سے بڑا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مذہب کی آواز دل تک نہیں پہنچتی اور جب دل ہی متاثر نہ ہو تو مذہب کی حقیقی روح سے آشنا ہونا ناممکن ہے۔“ (۱۱۵)

”اس عقلیت کے مہلک اثرات نے مسلمانوں کی دینی زندگی کے کسی گوشے کو نہیں بخشا۔ ذات و صفات خداوندی، خلق قرآن، دوزخ، جنت، معجزات، معراج، غرض ہر ہر مسئلہ عقل کی کسوٹی پر پرکھا گیا۔ آیات قرآنی کی ایسی تاویلات کی گئیں جن سے یونانی فلسفہ کی تائید ہو سکے۔“ (۱۱۶)

”اس دور کے صوفیاء نے معتزلہ اور دیگر عقلیت پسند گروہوں کی وضعیت سے متاثر ہو کر عشق الہی پر زور دیا اور خود محبت الہی میں سرشاری کی زندگی بسر کی۔“ (۱۱۷)

”اس دور کے صوفیہ نے فلسفہ کی پیدا کی ہوئی ذہنی لامرکزیت کو قلمی کیفیات کے ذریعے دور کرنے کی کوشش کی۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ دل کو اگر ایک مرکز پر لگا دیا جائے تو ذہن کی الجھنیں خود بخود دور ہو جائیں گی۔ حضرت معروف کرخی نے استغراق پر زور دیا۔ حضرت سری سقطی نے توحید کا نظریہ پیش کیا جس نے بعد

کو وحدت الوجود کی شکل اختیار کی۔ حضرت ذوالنون مصری نے اپنی تصانیف میں حال و مقام پر بحث کی۔ اگر بغور دیکھا جائے کہ ان نظریات نے عملی طور پر مسلمانوں کے ذہن پر کیا اثر ڈالا تو معلوم ہوگا کہ ان کے ذریعے عقلیت کے پیدا کیے ہوئے ذہنی ہیجان کو دور کرنے اور اس کے بنائے ہوئے سانچوں کو توڑنے کا سامان مہیا ہو گیا۔“

طوالت کلام کے خوف سے اس بحث کو جس کے تمام پہلوؤں پر گفتگو ہو چکی ہے، ختم کیا جاتا ہے اور اس دور کے تصوف کے خارجی پیکر اور ہیولی سے متعلق بعض امور اجمالی طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

اسپنسر ٹرمنگھم SPENCER TRIMINGHAM نے ادب صوفیہ کے اولین منابع کے مطالعہ کی بنیاد پر یہ تجزیہ پیش کیا ہے۔

”طریقہ تصوف عملی طریقہ کار تھا جس کے لئے دوسری اصطلاحات مثلاً مذہب، رعایت اور سلوک بھی مستعمل تھیں اس اسلوب کی علت غائی یہ تھی کہ طالب کو مقام و احوال کے ذریعے حقیقت کا مشاہدہ کرنے کی تعلیم دی جائے۔ ابتداً طریقہ تصوف سادہ مفہوم حقیقت الحقائق اور روح کی آزادی کے اسرار کی فہمید کا تدریجی طریق کار ہی تھا۔ طلباء کی جماعتیں ایک مستند معلم کی رفاقت اور صحبت میں تربیت حاصل کرنے کے لئے جمع ہوتی تھیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ طالب کسی معلم یا راہ نمائے آغاز تعلیم میں طاعت یا دینی بیعت کا کوئی عہد کرتا تھا۔“

(۲۸)

اسپنسر ٹرمنگھم کی اس عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ تصوف کے سلاسل کی تشکیل و ترویج بحث دور تک نہ ہوئی تھی۔ البتہ طلباء کی مختلف جماعتیں مختلف مشائخ سے کسب فیض کرتی تھیں اور مقام و احوال کا عرفان حاصل کرتی تھیں۔ جہاں تک کوئی تصوف کے معروف سلاسل کے معرض وجود میں آنے کا تعلق ہے ٹرمنگھم کا بیان وثوق کی حد تک درست ہے۔ اس لیے کہ سلاسل تصوف کی تشکیل امام غزالی کی وفات کے بعد کا واقعہ ہے۔ (۲۹) امام موصوف کی وفات ۵۰۵ھ میں ہوئی۔ لیکن تصوف کے مختلف مسالک اور اسالیب ضرور منصفہ شہود پر آچکے تھے شیخ ہجویریؒ نے کشف المحجوب میں ایسے تمام مسالک پر جو مختلف مشائخ تصوف سے منسوب ہیں۔ سیر حاصل بحث کی ہے اور ہر مسلک کی امتیازی خصوصیت پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ داتا صاحبؒ کے نزدیک دس اسالیب مقبول و معروف ہیں جن کی تفصیل ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔ لیکن اس تفصیل سے قبل شیخ ہجویریؒ کا یہ بصرہ قابل لحاظ ہے کہ یہ فرق و اختلاف محض روحانی واردات اور وجدانی کیفیات تک محدود ہے۔ شرع و توحید کے اصول و فروع

کے بارے میں صوفیاء میں کوئی اختلاف نہیں۔ (۲۲۰)

- |            |                               |   |
|------------|-------------------------------|---|
| نام جماعت  | کس بزرگ سے منسوب ہے           | امتیازی خصوصیت                                  |
| ۱۔ محاسبیہ | حارث محاسی (متوفی ۲۲۳ھ)       | رضا کو مقام نہیں سمجھتے بلکہ حال کہتے ہیں۔      |
| ۲۔ حکیمیہ  | عمر بن حکیم (متوفی ۲۵۵ھ)      | ان کا خیال ہے کہ اولیاء حقیقت کا علم رکھتے ہیں۔ |
| ۳۔ طیفوریہ | ابو سعید طیفوری (متوفی ۲۵۱ھ)  | شکر کی جانب راغب ہیں۔                           |
| ۴۔ قصاریہ  | محمد بن قصار (متوفی ۲۷۱ھ)     | ملاط کو ظاہر کرتے ہیں۔                          |
| ۵۔ خرازیہ  | ابو سعید خراسانی (متوفی ۲۷۷ھ) | فنا و بقا کی کیفیات کے معترف ہیں۔               |
| ۶۔ سہیلیہ  | سہیل بن عبد اللہ (متوفی ۲۸۳ھ) | اجتہاد اور نفس کے مجاہدے پر اصرار کرتے ہیں۔     |
| ۷۔ نوریہ   | احمد بن نوری (متوفی ۲۹۵ھ)     | گوشہ نشینی سے پرہیز اور ایثار کرنا۔             |
| ۸۔ جنیدیہ  | حبیبہ بن ہادی (متوفی ۲۹۷ھ)    | شکر کی بجائے صحو پر اصرار کہتے ہیں۔             |
| ۹۔ سیاریہ  | ابو العباس سیاری (متوفی ۳۱۲ھ) | جمع اور تفرقہ کی کیفیات کے معترف ہیں۔           |
| ۱۰۔ خفیفیہ | محمد بن خفیف (متوفی ۳۹۱ھ)     | غیب و حضور کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔        |

شیخ علی ہجویریؒ نے اس دس مکاتیب کے علاوہ دو اور فرقوں کا بھی ذکر کیا ہے جو عقیدہ حلول پر یقین رکھتے

ہیں۔ ان کی نسبت انتہائی غیر معروف اور مجہول اشخاص سے ہے۔ ایک کانام ابو حلمان دمشقی اور دوسرے کافارس تھا۔ چوں کہ صوفیہ نے حلول اور اتحاد کو کفر والحاد قرار دیا ہے۔ اس لیے تاریخ تصوف میں ان کے عقائد سے بحث کرنا کسی استنباط یا افادہ کا حامل نہیں شیخ علی جویری نے ان فرقوں سے متعلق واضح طور پر اسی رائے کا اظہار کر دیا ہے۔

ومن کہ علی بن عثمان الجلابی ام می دور ثانی کے سلسلے میں جو گزارشات پیش کی گئی ہیں، گویم کہ من نہ دانم کہ فارس و ابوسلمان ان کا ماحصل یہ ہے کہ دوسری صدی ہجری سے چوتھی کہ بودند و چہ گفتند۔ اما ہر کہ قایل باشد صدی ہجری تک تصوف کے مختلف مسالک و مکاتب بمقالتی کہ خلاف توحید و تحقیق بود، وی معرض وجود میں آچکے تھے لیکن ان کی صورت یہ نہ تھی را اندردین ہیچ نصیب نہ باشد۔

(۳۱)

جو سلاسل کی شکل میں آج موجود ہے۔ اس ضمن پر زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس دور میں تصوف تنظیم و ترتیب کے مرحلے سے گزر رہا تھا۔ جس کی تکمیل آئندہ صدیوں میں ممکن ہو سکی۔ علاوہ ازیں تاریخی حالات و حوادث کے زیر اثر ایک ایسے رجحان نے مداومت اور استمرار حاصل کیا۔ جس کی ترغیب و ترہیب خود قرآن و سنت سے ثابت ہے اور جسے صوفیہ کی اصطلاح میں عشق و محبت کہتے ہیں اور جو تصوف کے تمام سلاسل کی تعلیمات میں آج بھی اساسی حیثیت کا حامل ہے۔

دور ثانی کا ایک اور اہم واقعہ وہ آوینرش اور نزاع ہے جو علماء کے طبقے نے صوفیاء کے خلاف جاری رکھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس نزاع کی کوئی نہ کوئی صورت تاریخ اسلام کے ہر دور میں نظر آتی ہے لیکن مذکورہ صدیوں بالخصوص تیسری صدی ہجری میں اس مناقشے نے انتہائی سنجیدہ صورت اختیار کر لی تھی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے ”مقالات احسانی“ میں خطیب بغدادی (متوفی ۳۶۳ھ) کے حوالے سے دو واقعات کا ذکر کیا ہے۔ ایک مشہور صوفی بزرگ حاتم اصم (متوفی ۲۳۷ھ) اور قاضی محمد بن مقاتل سے متعلق ہے اور دوسرا واقعہ امام احمد بن حنبل : (متوفی ۲۴۱ھ) اور حارث محاسی (متوفی ۲۴۳ھ) سے تعلق رکھتا ہے۔ پہلے واقعے کا اجمال یہ ہے کہ حاتم اصم حج کے لئے بلخ سے جا رہے تھے۔ اثناء راہ میں شہر رے سے گزرے۔ معلوم ہوا کہ شہر کے ایک عالم

قاضی القضاة محمد بن مقاتل بیمار ہیں۔ یہ ان کی عیادت کے لیے ان کے مکان پر پہنچے۔ دیکھا کہ ایک عظیم الشان ڈیوڑھی ہے۔ اندر گئے، دیکھا کہ ایک طرف پھولوں کا چمن ہے۔ فوارے سے پانی اچھل رہا ہے ہر کمرے میں پردے پڑے ہیں اور خدام کا ایک مجمع موجود ہے اور قاضی صاحب ایک مکلف گدے پر آرام فرما رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ حاتم اصم اس داد و عیش کی زندگی پر غم و غصہ کا اظہار کر کے چلے آئے۔

دوسرے واقعے کی حقیقت یہ ہے کہ حارث محاسی کی کتابوں پر علماء بالخصوص حافظ ابو ذر عہ رازی (متوفی ۲۶۰ھ) نے بڑی لے دے کی ہے۔

بہر حال جب عام لوگوں میں ہلچل پیدا ہوئی تو امام احمد بن حنبل نے اصولی طور پر تحقیق حال کی زحمت گوارا فرمائی۔ چنانچہ طے ہوا کہ امام کے ایک عقیدت مند اسمعیل بن اسحاق السراج جو حارث محاسی کے بھی دوست تھے، اپنے مکان پر حارث محاسی کو ضیافت پر بلائیں گے اور امام احمد بن حنبل بغیر سامنے آئے حارث محاسی کی باتیں سنیں گے۔ ایک دن اس عینی شہادت کے لئے مقرر ہو گیا۔ خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ حارث محاسی کے احوال کے ذاتی مشاہدے کے بعد امام نے اس رائے کا اظہار فرمایا۔

”نہ میں نے حارث کے اصحاب کی مانند دیکھے ہیں اور نہ علم ہائے حق پر اس شخص کی گفتگو جیسی گفتگو میں نے سنی ہے۔“

اس نزاع کے بنیادی اختلافات کو سمجھنے کے لئے حافظ ابو ذر عہ رازی کا یہ قول نقل کیا ہے جو خطیب بغدادی کے حوالے سے ”مقالات احسانی“ میں درج کیا گیا ہے۔

”یہ ساری کتابیں صرف خود ساختہ بدعات اور گمراہیاں۔ اللہ کی کتاب جس میں چونک (عبرت) نہ پیدا ہو تو ان کتابوں سے اس میں چونکہ پیدا نہ ہوئی لوگوں کو بتایا کہ مالک بن انس، سفیان ثوری، اوزاعی یا ان ہی جیسے دوسرے ائمہ جو پہلے گزرے ہیں، ان بزرگوں نے اس قسم کے مسائل جن سے (حارث) اپنی کتابوں میں بحث کرتے ہیں یعنی وسادس، خطرات اور ہوی باتیں جو وہ کرتے اور لکھتے ہیں، کیا کسی نے ان جیسی کتابیں لکھی ہیں۔ صوفیوں کا گروہ اہل علم (طبقہ علماء) کے خلاف چل رہا ہے۔“

صوفیہ ہر دور میں اسی نوعیت کی مخالفانہ تنقید کا نشانہ بنے رہے، اور آج بھی علماء کی جانب سے تصوف اور صوفیہ کے خلاف جو اعتراضات وارد کیے جا رہے ہیں، ان میں بنیادی استدلال وہی ہے جو حافظ ابو ذر عہ کی مذکورہ تقریر کا اہم نقطہ ہے۔ شیخ عبد الوہاب شرانی (متوفی ۹۳۳ھ) نے اس قدیم اعتراض کا مدلل جواب دیا

ہے۔ جس سے صوفیہ کے طرز احساس کی تفہیم میں بہت مدد ملتی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

”فقہ کے ائمہ مجتہدین جیسے کتاب و سنت کے کلیات سے جزئیات پیدا کر کے ان پر فرض و واجب، سنت و مستحب یا حرام و مکروہ و خلاف اولیٰ ہونے کا حکم لگاتے ہیں۔ آخر تصوف کے ائمہ عارفین کتاب و سنت کے اس حصے میں جن سے ان کے متعلق مسائل کا تعلق ہے، اگر جزئیات پیدا کریں اور ان پر حکم لگائیں تو اس پر تعجب کیوں کیا جائے۔

لیس ایجاب مجتہد با جتہادہ نسیالہ یصرح یعنی شریعت میں جن امور کے وجوب کی تصریح نہیں الشرلحیۃ بوجوبہ اولیٰ من ایجاب ولی اللہ ملتی لیکن ایک امام مجتہد اپنی اجتہادی کوششوں سے تعالیٰ حکما فی الطریق لم تصرح الشریعة ان کے وجوب کا حکم اگر بتلا سکتا ہے تو اسے اپنے طریقہ خاص (یعنی تصوف) کے متعلق اللہ کا ولی کسی ایسے مسئلہ بوجوبہ،

پردہ جوبی حکم اگر لگاتا ہے جس کی تصریح

شریعت میں نہیں پائی جاتی تو دونوں میں سے ایک کو

ترجیح دینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔“

کچھ اس قسم کے خیالات کا اظہار شاہ اسماعیل شہیدؒ نے طبقات میں فرمایا ہے۔

اجتہاد کا کاروبار ہمارے نزدیک اسی فن کے لیے مختص نہیں ہے جس کا اسلامی نام فقہ رکھ دیا گیا ہے بلکہ ہر (دینی) فن میں لوگوں نے اجتہاد سے کام لیا ہے۔ البتہ شریعت میں جن امور کی تصریح کی گئی ہے ان کے ساتھ ان مسائل اور قوانین کے مربوط کرنے میں جن کا تصریح ذکر شرعی نصوص میں نہیں ملتا یعنی مسکوت کو منطوق کے ساتھ مربوط کرنے میں ہر فن کے لوگوں کا خاص خاص طریقہ ہے یعنی فقہ ہو یا تصوف یا کلام، یہ سارے علوم شرعی ہیں اور ان دینی علوم کے سارے ائمہ کی تائید غیب سے کی گئی ہے۔ ان کی تقلید کرنے والے حق ہی کے پیرو ہیں۔“ (۲۲۲)

بہر حال جب اہل علم کی جانب سے صوفیہ پر سخت تنقید نے سکین صورت اختیار کر لی تو صوفیہ اپنے موقف کی وضاحت اور تائید میں تحریروں تصنیف پر مائل ہوئے۔ صوفیہ کی جانب سے اس سلسلے میں جو کچھ تحریر کیا گیا وہ نہ صرف تاریخ تصوف بلکہ مسلمانوں کی علمی تاریخ میں انتہائی قدر و قیمت کا حامل ہے۔ اس عہد کی تحریروں میں برات اور دفاع کے عناصر سے قطع نظر ایسے معیار اور اصول قائم کر دیے گئے ہیں جو حقیقی اور غیر حقیقی تصوف

کے درمیان ہمیشہ خط امتیاز باقی رکھیں گے۔ یہی نہیں بلکہ ان تصانیف نے اصول تنقید کے ایسے پیمانے فراہم کر دیے ہیں جو تصوف کے اہم مسائل کی تفہیم میں مدد و معاون رہیں گے۔ علاوہ ازیں ان تصانیف کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جاسکتا ہے کہ گزشتہ سات آٹھ صدیوں میں صوفیہ کے قلم سے جو کتب و رسائل تحریر ہوئے ان میں دور ثانی کی ان تصانیف کے اصول و مبادی سے سرمو تجاوز نہیں کیا گیا ہے۔ اس دور میں جو تصانیف کے اصول و مبادی سے سرمو تجاوز نہیں کیا گیا ہے۔ اور اس دور میں جو تصانیف معرض وجود میں آئیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

نام مصنف	نام کتاب	کیفیت
۱۔ شیخ ابو سعید ابن العربی (متوفی ۵۶۸ھ)	طبقات	یہ کتاب اب ناپید ہے۔
۲۔ شیخ ابو محمد الخلدی (متوفی ۶۹۷ھ کے حکایات الاولیاء کے بعد)		یہ کتاب بھی اب ناپید ہے۔ جدید کے اصحاب میں سے تھے۔ شائع ہو چکی ہے۔
۳۔ شیخ ابو نصر سراج (متوفی ۳۷۸ھ)	کتاب اللمع فی التصوف	یہ کتاب اب ناپید ہے۔
۴۔ شیخ ابو طالب مکی (متوفی ۳۸۶ھ)		یہ کتاب اب ناپید ہے۔
۵۔ شیخ ابو بکر (متوفی ۳۹۰ھ)	کوا قوت القلوب فی معاملۃ المحبوب	یہ کتاب اب ناپید ہے۔
۶۔ ابو عبد الرحمن السلمی (متوفی ۴۲۲ھ)	العرف لمذہب اہل التصوف	یہ کتاب اب ناپید ہے۔
	طبقات الصوفیہ	

اس کے مطالب نفحات الانس جامی میں آگئے ہیں۔ جے پیڈرسن اس کتاب کو مرتب کر رہے ہیں۔

دور ثانی میں اگرچہ تصوف کے معروف سلسلے معرض وجود میں نہ آئے تھے، تاہم مختلف منہاج و مسالک یقینی طور پر منمنشکل ہو چکے تھے اور طلاب اپنے ذوق اور شوق کے مطابق مشائخ سے استفادہ کرتے تھے۔ فلسفہ کی ترویج اور عقلیت پسندی کے رجحان نے ملت میں جو فکری انتشار پیدا کر دیا تھا اس کے مقابلے میں صوفیہ نے



عشق و محبت کے نظریے کو فروغ دیا اور اس طرح انفرادی اور اجتماعی زندگی کو پارہ پارہ ہونے سے محفوظ رکھا۔ اسی دور میں صوفیہ نے جارحانہ تنقید کے جواب میں اپنے مسلک اور طریق کی وضاحت کے لیے ایسی بنیادی کتابیں تحریر کیں جو تصوف کی تفہیم میں نہ صرف مدد و معاون ثابت ہوئیں بلکہ ان کے باعث تصوف کا ظاہری اور باطنی پیکر بطور وحدت کلی برقرار رہا۔ یہ تصانیف آج بھی تصوف اور صوفیہ کے راہ نما اصول کی حیثیت رکھتی ہیں اور آئندہ بھی ان کی حیثیت برقرار رہے گی۔ (۲۲۳)

### دور ثالث: (پانچویں صدی تا آٹھویں صدی ہجری)

تاریخ تصوف کا تیسرا دور چار صدیوں پر محیط ہے۔ اس اعتبار سے یہ طویل ترین دور ہے۔ طوالت دور سے قطع نظر خود اسلامی تاریخ میں اس دور کی بے حد اہمیت ہے۔ اس دور نے اسلامی تاریخ پر بہت گہرے اور دیرپا اثرات قائم کیے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ چوتھی صدی ہجری تک تصوف اور صوفیہ مسلم معاشرے کے موثر عوامل کی حیثیت حاصل کر چکے تھے اور تصوف کی انتہائی اہم اور بنیادی تصانیف اس مسلک کی دینی اور شرعی حیثیت کو واضح کرنے کے لئے تحریر کی جا چکی تھیں۔ جن میں بعض کی تفصیل گزشتہ صفحات میں آپ ملاحظہ کر چکے ہیں، تاہم اس ادارے کی حیثیت نیم تنظیمی موثر کی تھی لیکن چھٹی صدی کے اختتام سے قبل یہ ادارہ ایک مکمل تنظیم بن چکا تھا اور تصوف کے مختلف سلاسل اپنی ابتدا اور تکمیل کے مراحل سے بھی اسی دور میں گزرے۔ (۲۲۴) یہ دور تصوف کی عمومی مقبولیت کے اعتبار سے اس کا عہد زریں کہا جاسکتا ہے۔ ہر سلسلے کے بانی اور اس کو ترقی دینے والے اکابر اسی دور میں منصفہ شہود پر آئے اور اپنی روحانی قوت اور توفیق الہی کی مدد سے جریدہ عالم پر ثبت دوام بنے۔ ان اکابرین میں دو ایسی عظیم ہستیاں ہیں جو اگرچہ کسی سلسلے کے بانی تو نہیں ہیں لیکن تمام اہل سلسلہ کے نزدیک قابل احترام ہیں اور ان کی تعلیمات کو آج بھی استناد کا درجہ حاصل ہے اور تمام مشائخ سلسلہ ان کے احوال و مقام کی اہمیت اور عظمت کو تسلیم کرتے ہیں اور ان کی تائید کرتے ہیں۔ مراد حضرت امام غزالیؒ اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ سے ہے جن کی تعلیمات کا تفصیلی مطالعہ مناسب مقام پر کیا جائے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔

اسی دور میں صوفیہ نے نظم و نثر میں ایسے شاہکار تخلیق کیے جن کی گونج چار دہائیوں کے عالم میں پھیلی اور آج بھی صدیاں گزر جانے کے باوجود اپنی جاذبیت، خوش بیانی، گہری معنویت، سادہ اظہار اور فکر انگیزی کے سبب دنیا کے علم و عرفان میں اہم حیثیت رکھتی ہیں۔ اور اہل نظر میں ان کی مقبولیت کا آج بھی وہی عالم ہے جس کے لیے کہا گیا ہے۔

ۛ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

مذکورہ سطور میں اس دور کی تین اہم خصوصیات کا اجمال پیش کیا گیا لیکن اپنی اہمیت اور دوامیت کے اعتبار سے یہ دور زیادہ تفصیل اور تجزیہ کا متقاضی ہے۔ آئندہ صفحات میں ان خصوصیات کو شرح و بسط کے ساتھ بیاں کیا گیا ہے۔ اس کی ترتیب اس طرح ہے

(۱) اس دور میں تصوف کی ہمہ گیر مقبولیت اور اس کے اسباب۔

(۲) ادب صوفیہ کی ترویج و اشاعت۔

(۳) (الف) بانیان سلسلہ کے مختصر حالات اور تاریخ تصوف میں ان کی اہمیت۔

(ب) حضرت امام غزالی اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربی قدس اللہ سرہ کی تعلیمات کے نمایاں پہلو اور ان کا مختصر جائزہ۔ (۲۲۵)

ڈاکٹر عبدالرشید نے اپنے مقالے ”اسلامی تصوف اور صوفیاء سرحد“ میں تاریخ تصوف کو مختلف ادوار میں تحریر کیا ہے۔ تصوف کے ان مختلف ادوار کا اجمالی خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

پہلا دور:-

نبی کریم ﷺ، خلفائے راشدین، اصحاب صفہ اور دیگر صحابہ کا زمانہ تصوف کا پہلا دور ہے۔ تصوف کی حقیقت اس دور میں تھی۔ اس دور میں تصوف، توحید، بندگی و عبادت، غور و فکر، ذکر و تلاوت، توبہ، زہد و فقر، صبر و رضا، اخلاص، خشوع و خضوع، توکل و بھروسہ، سخاوت، قناعت، ایثار و ہمدردی، حب الہی و عشق رسول، خوف و رجاء، حق پرستی و حق گوئی، گریہ و زاری، حیاء و عصمت، علم و معرفت اور سادہ زندگی سے عبارت تھا۔

دوسرا دور:-

تصوف کا دوسرا دور 34ھ تا 150ھ کا دور ہے جو تابعین کا دور ہے۔ ڈاکٹر خلیق احمد نظامی اس طبقہ کے صوفیہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ماحول کے اثر کی وجہ سے ان پر خشیت الہی کا بڑا غلبہ تھا۔ اس لیے وہ توبہ پر زیادہ زور دیتے تھے۔ اس دور کے ممتاز صوفیوں میں اولیں قرنی، عامر بن عبداللہ بصری، حسن بصری، جابر بن حیان، مسروق بن عبدالرحمن، ربیع بن خثیم زیادہ مشہور ہیں۔

تیسرا دور:-

تصوف کا یہ دور ۱۵۰ھ تا ۳۵۰ھ کا ہے۔ اس دور میں تصوف ایک باقاعدہ اور جدا گانہ نظام کی حیثیت سے

روشناس ہوا۔ اسی دور میں ”صوفی“ کی اصطلاح کا اطلاق ”ابوالہاشم کوفی“ پر ہوا۔ یہ دور تبع تابعین کا ہے۔ ابوالہاشم نے سب سے پہلی خانقاہ تعمیر کی۔

جنید بغدادی، شبلی، بشر حافی، داود طائی، سری سقطی، معروف کرخی، اما شافعی، امام احمد بن حنبلؒ اس دور کے ان ۶۴ بزرگوں کے علاوہ ہیں جو کشف المحجوب میں بیان کیے گئے ہیں۔

### چوتھا دور:-

تصوف کا یہ دور پانچویں صدی ہجری تا ساتویں صدی ہجری کا ہے۔ گوکہ تبع تابعین کے دور میں علم تصوف اپنی جداگانہ حیثیت میں بھرپور انداز میں نہ صرف روشناس ہو چکا تھا۔ بلکہ علمی پہلو سے اسے کافی وسعت حاصل ہو گئی تھی۔ تاہم تبع تابعین کے بعد آسمان تصوف پر مزید روشن ستارے نمودار ہوئے جن کی بدولت اس کی تابانی میں مزید اضافہ ہوا اور وہ عقدے جو ابھی تک لانیخل سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ حل کیے۔ اس دور میں جو صوفیا ءے کرام نمایاں نظر آتے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ شیخ ابوالحسن ہجویریؒ، امام غزالیؒ، شیخ محی الدین ابن العربیؒ، جلال الدین رومیؒ، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، ابوالحسن خرقانیؒ، ابوعلی رودباریؒ، ابوالقاسم قشیریؒ وغیرہ۔

### پانچواں دور:-

یہ دور ساتویں صدی ہجری تا آٹھویں صدی ہجری کا ہے۔ اکثر محققین نے اسے تصوف کا دور انحطاط شمار کیا ہے مگر اس دور میں بعض مشہور صوفیائے کرام گزرے ہیں۔ جن کا ذکر تمام تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ عبدالکریم الجلیلی ایرانیؒ، مولانا عبدالرحمن جامیؒ، عبدالوہاب شعرانیؒ اسی دور کی شخصیت شیخ احمد سرہندی بھی تھے۔ جنہوں نے وحدت الوجود کے مقابلہ میں وحدت الشہود کا نظریہ پیش فرمایا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ نے جاہل عوام کے ذہنوں سے شبہات فاسدہ کا ازالہ کر کے شریعت و طریقت کو پھر سے یکجا کر دیا۔ اس امر کی طرف اشارہ شیخ مجدد نے اپنے بیٹے خواجہ محمد معصومؒ کے نام خط میں کرتے ہیں۔

الحمد لله الذي جعلني صلة بين البحرين و خداوند تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے دو سمندروں کو مصلحا بین الفتین۔ ملانے اور دو جماعتوں میں صلح کا ذریعہ بنایا۔

اگرچہ یہ دور اور اسکے مابعد کا دور انحطاط کا دور کہلاتا ہے مگر اس میں بھی ایسی شخصیات کی کمی نہیں جو سلسلہ تصوف کو اس نچ پر چلا رہے ہیں جو قرون اولیٰ میں تھا۔ خاص کر مجدد مآہ حاضرہ شاہ احمد رضا خان کی مساعی اس سلسلہ میں قابل

تعریف ہیں۔ علاوہ ازیں آج تک اکثر صوفیائے کرام اتباع سنت کی پیروی کرتے ہوئے مختلف مقامات پر لوگوں کو دین حق پر چلنے کی تلقین کر رہے ہیں۔ تصوف حضور ﷺ کے زمانے سے رواں دواں ہے اور تاقیامت جاری و ساری رہے گا۔ ان شاء اللہ۔ (۲۲۶)

## (۵) ”اصلاحی پہلو سے تصوف کا تاریخی کردار“

۱۔ تصوف کے دور اول میں رسول اکرم ﷺ نے مسلمانوں کی اصلاح کے لئے جو سیاسی نظام ترتیب دیا وہ مکمل طور پر اسلام کے اصول مساوات کا آئینہ دار تھا۔ حاکم و محکوم کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ حکومت کا سارا کام مسلمانوں کے مشورے سے ہوتا تھا۔ بیت المال قوم کا مشترکہ سرمایہ تھا۔ رسول اکرم ﷺ اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے اونٹ کے ایک بال سے زیادہ کا بھی مستحق نہیں سمجھتے تھے۔ قانون تعزیرات بڑے اور چھوٹے سب کے لیے یکساں تھا۔

حضور ﷺ کے عدل و انصاف کے آگے ان کی لخت جگر حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا اور ایک عام مجرم دونوں برابر تھے۔ آپ کی بارگاہ میں سلمان فارسیؒ، صہیبؒ، رومی اور بلالؓ وہی مرتبہ رکھتے تھے جو روسائے قریش۔ آپ کے دروازے پر نہ حاجب ہوتے نہ پہرہ دار۔ مدینہ کی گلیوں میں غریبوں اور بے کسوں کی امداد کے لئے آپ اکثر گھومتے ہوئے نظر آتے تھے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر حضور سرور کائنات ﷺ نے ناقہ کے اوپر سے خطبہ ارشاد فرمایا جو اسلامی تاریخ کا سب سے اہم خطبہ ہے۔

”لوگو! توجہ سے سنو اور یاد رکھو، ممکن ہے کہ آئندہ مجھے تم سے ملنے کا موقع نہ ملے۔ جاہلیت کے تمام دستور میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ جس طرح تم اس دنیا، اس مہینہ اور اس مقام کی حرمت کرتے ہو۔ اسی طرح ایک مسلمان کا خون و مال اور آبرو دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے ہر کام کا حساب لے گا۔ دیکھو میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ باہم ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔ جس طرح تمہارے حقوق عورتوں پر ہیں اسی طرح عورتوں کے حقوق

تمہارے اوپر ہیں۔ ان کے ساتھ نرمی کرنا اور مہربانی سے پیش آنا۔ اور اللہ سے ڈر کر ان حقوق کا لحاظ کرنا۔ غلاموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ جو خود کھاؤ وہی ان کو کھلانا اور جو خود پہننا وہی ان کو پہنانا۔ ان سے کوئی خطاء ہو تو درگزر کرنا یا ان کو جدا کر دینا۔ وہ بھی اللہ کے بندے ہیں۔ ان پر سختی روا نہ رکھنا۔

نہ عربی کو عجمی پر فضیلت ہے نہ عجمی کو عربی پر، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم خاک سے بنے تھے۔ تمہارے کسی بھائی کی کوئی چیز تمہارے لئے اس وقت تک حلال نہیں جب تک وہ رضا مندی سے نہ بخش دے دیکھو نا انصافی نہ کرنا۔

میں نے تمہارے درمیان ایک چیز چھوڑی ہے جس کو اگر تم مضبوط پکڑو گے تو میرے بعد کبھی گمراہ نہیں ہو گے یاد رکھو وہ قرآن ہے۔

لوگو! عمل میں خلوص، مسلمان بھائیوں کی خیر خواہی اور جماعت میں اتحاد یہ تین باتیں ایسی ہیں جو سینہ کو پاک رکھتی ہیں۔ جاہلیت کے تمام خون (یعنی انتقام خون) باطل کر دیے گئے اور سب سے پہلے میں (اپنے خاندان کا خون) ربیعۃ بن الحارث کے بیٹے کا خون معاف کرتا ہوں۔

جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کر دیے گئے ہیں اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کا سود، عباس بن عبدالمطلب کا سود باطل کرتا ہوں۔

یہ صدائے دلنواز جو ناقہ پر سے بلند ہوئی تھی۔ دنیا میں اخوت و مساوات اور عدل کا پہلا اور آخری پیغام تھا۔ اسلامی سماج اور سیاست جن اصولوں پر منظم ہونی تھی وہ پوری وضاحت کے ساتھ یہاں بیان کر دے گئے تھے۔ آنے والی نسلوں کے لئے سرور کائنات ﷺ کا یہ خطبہ چراغِ راہ کی مانند تھا۔

حضور ﷺ کے بعد خلفائے راشدین نے پوری طرح اس اعلان نبوت کی پاسداری کی۔ انہوں نے نظام خلافت، منہاج سنت پر ترتیب دیا اور اپنے طریقہ کار میں راہِ نبوی کا اتباع کیا۔

۲۔ خلافت راشدہ کے بعد جب ملوکیت کا دور شروع ہوا تو صوفیائے کرام نے مسلمانوں کی اصلاح کے

لئے خانقاہیں قائم کیں۔ اور ایک جامع نظام تربیت کے ذریعے کام کیا۔ (۲۲۷)

## صوفیاء کا نظام تربیت

صوفیائے کرام کا نظام تربیت اچھا شہری تیار نہیں کرتا۔ بلکہ ان کے نظام تربیت کا مقصد ”اچھا انسان“ (انسان صالح) تیار کرنا ہے۔ وہ انسان جو مکمل انسان ہو۔ جس میں انسانیت کے سارے پنہاں جو ہر نمایاں ہو گئے

ہوں، اور جو صرف جغرافیائی حدود میں ایک وطن کا اچھا شہری نہ ہو بلکہ وہ پوری روئے زمین کا اچھا شہری، بہترین باشندہ اور ”انسان“ ہو۔

ظاہر ہے کہ صوفیاء کے نظام تربیت کا یہ مقصد دنیا کے جملہ نظام ہائے تربیت کے مقاصد سے نہایت ارفع اور اعلیٰ ہے اور اس مقصد رافع کے سامنے ہر مقصد نیچ، بے وزن اور رایگاں ہے۔

مکی دور کو لیجیے۔ چند ناکس و بے کس مسلمان ہیں، جن کی تعداد کم ہے اور دشمن زیادہ، جن کے پاس نہ کوئی قوت ہے اور نہ طاقت اور جن کا کوئی سہارا نہیں ہے سوائے اللہ جل شانہ کی ذات کے، مگر اسی مکی دور میں دعوت اسلامی کے آغاز ہی میں قرآن کریم اپنی دعوت کا مخاطب ساری انسانیت کو قرار دیتا ہے۔ اور بباغ دہل اعلان کرتا ہے۔

ان هو الا ذکر للعالمین۔ (۲۲۸) یہ تو سارے جہان والوں کے لیے نصیحت ہے۔

پہلے ہی مرحلے میں قرآن نے اس حقیقت کو جتلا دیا کہ قرآن کی دعوت کے مخاطب صرف قریش، محض اہل مکہ اور اہل عرب ہی نہیں ہیں۔ بلکہ اس عالمی دعوت کی مخاطب پوری دنیائے انسانیت ہے اور اس مخاطب میں رنگ و نسل اور زبان و وطن کا کوئی فرق نہیں ہے۔۔۔۔۔ اگر کوئی فرق ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ کون اس دعوت پر لبیک کہتا اور متقیوں کے زمرے میں داخل ہوتا ہے۔

وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکر ہم نے تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک مکم عند اللہ اتقاکم۔ (۲۲۹) دوسرے کو پہچانو۔

درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

یہ قرآنی دعوت عام ہے۔ یہ وطن کی حد بندیوں، زبان کے دائروں، رنگوں کے تفاوت اور نسل کے امتیازات میں محدود نہیں ہے۔ یہ دعوت انسانیت کو گردہوں اور طبقوں میں تقسیم نہیں کرتی۔ ان کورنگوں اور نسلوں کے امتیازات میں نہیں بانٹتی۔ بلکہ یہ قرآنی دعوت براہ راست نفس انسانی میں نفوذ کر کے انسان کے اندر پوشیدہ جوہر انسانیت کو ابھارتی اور بروئے کار لاتی ہے۔

تقویٰ شعار، عبادت گزار انسان:

صوفیائے کرام نے انسان کو میدان زندگی میں حیران و پریشان نہیں چھوڑا بلکہ ان کے سامنے زندگی کے تمام پہلو اور نفس کے تمام گوشے اجاگر کر کے اس کے سامنے ایک مفصل منہاج واضح کر دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ یہ منہاج کس طرح انسان کو ”انسان“ بنانے کا مقصد عطا کرتا ہے اور کس طرح زندگی کو ”انسان صالح“ (اچھا انسان) اور متقی

انسان بنا دیتا ہے۔

ان اکرمکم عند اللہ انقاکم۔ (۴۳۴) یہ انسان صالح اور متقی انسان وہ ہے جو صرف اللہ جل شانہ کی بندگی کرتا ہے اور زندگی کے ہر معاملے میں صرف اللہ ہی سے راہنمائی حاصل کرتا ہے۔

وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون۔  
میں نے جن اور انسان کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔ (۲۳/۱)

## عبادت کا مفہوم:

صوفیاء کے نزدیک عبادت کے معنی صرف مذہبی رسوم کی ادائیگی نہیں ہے۔ بلکہ عبادت کا لفظ بڑے وسیع معنی میں مستعمل ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اسلام میں اس کے معنی زندگی کے ہر لحظے میں، عمل کے ہر پہلو میں، فکر کے ہر گوشے میں، شعور کے ہر زاویے میں اللہ سبحانہ سے راہنمائی حاصل کرنے اور اس کی ہدایت پر عمل کرنے کے ہیں۔ غرض پوری زندگی اللہ کی رضا اور اس کی منشاء کے مطابق گزارنا اور وہ تمام امور جو خدا کی رضا کے ہوں ان پر عمل کرنا اور ان تمام امور سے بچنا جو خدا کی ناراضگی کا باعث ہوں، عبادت ہے۔ عبادت کے اس معنی اور مفہوم کے لحاظ سے انسان کی پوری زندگی کا مصدر اور منبع ذات الہی ہے اور اس کے شعور و عمل کے تمام پہلو ہدایت ربانی کے تابع ہیں۔

فاما یاتینکم منی ہدی فمن تبع ہدی      فلا بھرجو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو  
خوف علیہم ولا ہم یحزنون -      جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے انکے لیے کسی  
(۲۳۲)      خوف اور رنج کا موقعہ نہ ہوگا۔

## خلافت الہیہ:

صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ یہی وہ انسان ہے جو زمین میں خلافت الہی کے منصب کو سرانجام دیتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

واذ قال ربك للملائكة اني جاعل في الارض جب تمھارے رب نے فرشتوں سے کہا۔ کہ میں زمین  
خلیفہ۔ (۲۳۳) میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

اسی طرح دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا۔

ولقد کرمنابنی آدم و حملنا هم فی البر و یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی  
البحر و رزقنا هم من الطیبات و قُضِلنا هم اور انہیں خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو  
علیٰ کثیر ممن خلقنا تفضیلاً (۲۲۲) پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر  
نمایاں فوقیت بخشی۔

لیکن خلافت الہی کی شرط یہ ہے کہ انسان اس تکریم الہی کے تقاضوں پر اور معیار انسانیت پر پورا اترے تو اس  
فضیلت کا بدستور سزاوار ہے جو اللہ سبحانہ نے اس کو بخشی ہے۔ اسی شرط پر خلافت موقوف ہے اور خلافت کی تعمیر و ترقی کی  
ذمے داریاں وابستہ ہیں کہ اگر انسان خلافت کی اس شرط کو پورا کرے اور ان کی ذمے داریوں سے بخوبی عہدہ برآ ہو تو  
اللہ سبحانہ اس کو اپنے طیبات رزق سے عطا فرماتا ہے اور کائنات کی قوتیں اور طاقتیں اس کے تابع فرمان بنادیتا ہے۔ اور  
انسان اللہ سبحانہ کی عطا کردہ ان نعمتوں کو تقویٰ کی حدود اور منہاج الہی کی راہنمائی میں رہتے ہوئے اپنے منصب جلیل کی  
تکمیل میں استعمال کرتا ہے۔ (۲۳۵)

صوفیائے کرام نے ہر دور میں اس کے حالات کے مطابق مسلمانوں کی اصلاح کے لئے مختلف طریقے  
اختیار کئے مثلاً تصوف کے دور ثانی میں صوفیہ پر خشیت الہی کا غلبہ تھا۔ لوگوں کو توبہ کا درس دیتے تھے۔ اور اسوۂ حسنہ پر  
چلنے کی تلقین کرتے تھے۔ اگرچہ اس دور کے صوفیاء گوشہ نشین تھے۔ ارباب حکومت سے میل جول کو پسند نہیں فرماتے تھے  
مگر ان کا یہ طرز عمل حکومت کی بے راہ روی کے خلاف احتجاج تھا۔ اگر یہ صوفیائے کرام باطنی اصلاح و تربیت، تزکیہ  
نفس، عبادات وغیرہ پر زور نہ دیتے تو اسلام محض ایک سیاسی پروگرام بن کر رہ جاتا۔  
تاریخ کا طالب علم اگر ”اسلام کا بحیثیت ایک مذہبی تحریک“ مطالعہ کرنا چاہے تو اسکو حضور ﷺ اور خلفائے راشدین کے  
بعد ان ہی صوفیائے کرام کی حیات کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

۳۔ تصوف کے دور ثالث میں یونانی فلسفہ و علوم کی ترویج کے باعث ”عقلیت“ کا طوفان اٹھا۔ مامون  
اس کی زد میں آ کر معتزلی المذہب ہو گیا۔ عقلیت کے علاوہ صنعت کا بھی زور شور ہو گیا۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں۔  
”فطرت“ سے جب بُعد ہو جاتا ہے اور صنعت کا استغراق طاری ہو جاتا ہے تو طبیعتیں اس پر راضی نہیں ہو  
تیں کہ کسی بات کو اس کی قدرتی سادگی میں دیکھیں وہ سادگی کے ساتھ حسن و عظمت کا تصور کر ہی نہیں سکتیں۔ وہ جب کسی  
بات کو بلند اور عظیم دیکھنا چاہتی ہیں تو کوشش کرتی ہیں کہ زیادہ سے زیادہ صنعت اور ضاعت کے بیچ و خم پیدا کریں۔



اس دور کے صوفیائے کرام نے معتزلہ اور دیگر عقلیت پسند گردہوں کی صنعت سے متاثر ہو کر ”عشق الہی“ پر زور دیا۔ خود بھی محبت الہی میں سرشار تھے۔

معروف کرنی نے استغراق پر زور دیا۔ سری سقطی نے وحدت الوجود اور ذوالنون مصری نے حال و مقام پر زور دیا۔  
۴۔ تصوف کے اس چوتھے دور میں جب فتوحات کا دور دورہ ہوا تو نئے ممالک اسلامی حکومت میں داخل ہونے کی وجہ سے اجتہاد و استنباط کی ضرورت پڑی۔ یہ دور تدین فقہ کا ہے۔ امام اعظم، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل نے اپنی اپنی دینی بصیرت کو استعمال کر کے مختلف مسائل میں اپنی اپنی رائے پیش کر کے چار مذاہب کی بنیاد ڈالی۔

اسلامی معاشرہ کی ایک زبردست ضرورت کو ان بزرگوں نے پورا کیا۔ فقہی مسائل میں حیلہ بازی کا سلسلہ جو شروع ہوا اسکو ”کتاب الجلیل“ کے باب لکھ کر بند کیا۔

صوفیہ کا وہ طبقہ جو ان حالات میں پیدا ہوا۔ اس نے مذہب کی حقیقی روح کو بیدار کرنے، باطن کی اصلاح اور اخلاق کی درستگی کی طرف خاص توجہ کی جو فقہی مسائل کی گتھیوں میں الجھے ہوئے تھے ان سے للکار کے کہا۔

درکنز و ہدایہ نتوال دید خدا را

آئینہ دل ہیں کہ کتابے بہ ازیں نیست

۵۔ یہ تصوف کی گیارہویں صدی عیسوی کا دور تھا۔ اس دور میں صوفیائے کرام نے مسلمانوں کی اصلاح کے لئے بہت کتا ہیں تصوف کے موضوع پر تصنیف کیں۔

رسالہ کشمیریہ اسی دور میں تصنیف کیا گیا جس میں مصنف موصوف نے ثابت کیا کہ تصوف قرآن و سنت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ معترضین کی زبانیں بند ہو گئیں۔ حضرت علی ہجویریؒ نے کشف المحجوب لکھ کر مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی اصلاح کا اہتمام فرمایا۔ شیخ عبداللہ ہروی جو اہل بدعت کے مخالف تھے۔ انہوں نے ”منازل السائرین“ طبقات الصوفیہ، کتاب جامع الاحکام، مناجات لکھ کر تصوف پر اعتراضات کو نہ صرف باطل کیا بلکہ اس کے ذریعے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا بھی اہتمام فرمایا۔

۶۔ بارہویں صدی عیسوی میں تصوف اسلامی کو ایک مستقل فن کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ بعض سلاسل روحانی کی داغ بیل پڑی۔ حضرت امام غزالی نے احیائے العلوم اور کیمائے سعادت لکھ کر مزید نظام اصلاح کا اہتمام فرمایا۔ امام غزالی نے اپنی اخلاقی تعلیم کی بنیاد تین چیزوں پر رکھی۔

۱۔ صحیح مذہبی وجدان ۲۔ حکمت ۳۔ نفسیات۔

جو کچھ فرماتے۔ اس میں ایک نفسیاتی گیرائی ہوتی جس سے ایک صحیح مذہبی وجدان پیدا ہو جاتا تھا۔  
امام صاحب نے تصوف کی اصطلاحات کا مفہوم متعین فرمایا اسی صدی کی ایک عظیم شخصیت شیخ عبدالقادر جیلانی ہیں جنہوں نے امام غزالی کی علمی تحریک کو عملی شکل دے کر اس تحریک میں مزید جان ڈال دی۔ ارشاد و تلقین کا جو ر و شور آپ نے برپا کیا۔ اسلامی تصوف میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ شیخ نجیب الدین سہروردیؒ نے بھی اصلاح و تربیت کا کام بڑے پیمانے پر سرانجام دیا۔ ابن خلکان لکھتا ہے۔

”ظہرت برکۃ علی تلا مذہ“

یعنی ان کے فیوض و برکات تمام شاگردوں پر ظاہر ہوئے۔

اس صدی کے آخر میں دو عظیم شخصتیں پیدا ہوئیں۔ جنہوں نے تصوف کی تحریک کو وہ کچھ دیا جس کی اس کو ضرورت تھی۔ حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ۔  
شیخ اکبرؒ کے فلسفہ کا مرکزی نقطہ وحدت الوجود ہے۔ شیخ سہروردیؒ نے عوارف المعارف لکھ کر مسلمانوں کے نزکیہ نفس اور تعلیم و اخلاق کی اصلاح کا بندوبست فرمایا۔ ان ارباب تصوف نے اپنے اپنے دور میں نہ صرف علماء مسلمانوں کی اصلاح کی اور معرفت الہی کے درس دیے بلکہ ارباب حل و عقد کو بھی انکی غلطیوں پر جھنجھوڑا اور دعوت اصلاح دی۔

۷۔ تیرھویں صدی عیسوی میں اسلامی تصوف کے روحانی سلاسل معرض وجود میں آئے۔ ان سلاسل نے اس دور کے ان مسلمانوں کی اصلاح کی جو سیاسی اور سماجی نظام کی ابتری کا شکار تھے۔

عطاء ملک جوینی کا بیان ہے کہ اگر خوارزم شاہ سو۔۱۰۰ افوجی افسروں کو طلب کرتا تو دس حاضر ہوتے۔ ہر طرف لوٹ مار، قتل و غارت گری کا دور دورہ تھا۔ بغداد کے وہ علاقے جو تجارت کا مرکز تھے۔ کبوتر بازوں کے اڈے بن گئے تھے۔ اخلاقی زبوں حالی نقطہ عروج پر تھی۔

ان حالات میں صوفیائے کرام نے مسلمانوں کے ذہنی انتشار کو دور کرنے کے لئے سلاسل کی تنظیم شروع کی۔ سلسلہ قادریہ، سلسلہ فردوسیہ، سلسلہ چشتیہ، سلسلہ سہروردیہ، سلسلہ نقشبندیہ۔ ان سلاسل کے بزرگوں نے مسلمانان عالم کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی کوشش کیں۔ انہیں اخلاق حسنہ کی تعلیم سے آراستہ کیا۔ ذہنی انتشار دور کر کے ایک ذات کی محبت کے مرکز پر جمع کر دیا۔ حضرت خواجہ خواجگان معین الدین چشتی اجمیریؒ پر تھوی راج میں ہندوستان تشریف لائے اور منکرین خدا کو خداوند تعالیٰ کی توحید اور حضور ﷺ کی محبت سے سرشار فرمایا۔

اسکے بعد سہروردیہ سلسلہ ہندوستان پہنچا۔ حضرت شیخ بہاوالدین زکریا نے ملتان میں خانقاہ بنائی اور یہاں سے سندھ تک کے غیر مسلموں کو اسلام کی دولت سے مالا مال کیا اور مسلمانوں کے ظاہر و باطن کی اسلام کی روشنی میں اصلاح کی۔ پندرہویں صدی کے وسط میں قادریہ اور شطاریہ سلسلے ہندوستان میں قائم ہوئے۔ قادریہ سلسلہ کے شاہ نعمت اللہ قادری بانی ہوئے۔ شطاریہ سلسلہ کو شاہ عبداللہ شطاری نے قائم کیا۔ اکبر کے دور حکومت میں خواجہ باقی باللہ نے نقشبندیہ کا سلسلہ قائم کیا۔ اسکو بعد میں شیخ سرہندی نے عروج پر پہنچایا۔ اس طرح سے ان بزرگوں نے یہاں پر خانقاہیں قائم کیں اور نہ صرف مسلمانوں کی اصلاح و تربیت کا بندوبست کیا بلکہ غیر مسلموں کو بھی اللہ تعالیٰ سے واصل کیا۔ اگر مسلمانان ہند کی مذہبی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی روحانی زندگی کی اصلاح و تربیت کا کام انہی چھ سلسلوں نے سرانجام دیا ہے۔ (۲۳۶)

## (۶) ”اسلامی تصوف اور دیگر مذاہب کے راہبانہ کردار کا فرق و امتیاز“

دیگر مذاہب کی راہبانہ تعلیمات کو تصوف کا ماخذ قرار دینے کی جسارت سے پہلے ان باتوں پر غور کرنا

پڑے گا۔

۱۔ دیگر مذاہب یعنی عیسائیت، یہودی مذہب، ہندو مذہب، بدھ مذہب اور فلسفہ یونان کی روحانی بلندی کی آخری حد کیا ہے۔ یعنی ان کی راہبانہ تعلیمات سے کیا کچھ ان کو حاصل ہوا اور اسلام کی روحانی بلندی کہاں تک تھی یعنی ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آیا دیگر مذاہب کے لوگ زیادہ بلندیوں تک پہنچے تھے یا مسلم ارباب روحانیت؟ کیونکہ عطا وہی شخص کر سکتا ہے جس کے پاس زیادہ ہو جو خود مفلس ہو وہ دولت مند کو کیا عطا کر سکتا ہے۔

۲۔ دوسرا سوال جو قابل غور ہے وہ یہ ہے اور یہ سوال یورپ کے چند غیر متعصب اور انصاف پسند ارباب عقل و دانش نے اٹھایا ہے کہ تاریخ کے جس دور میں مسلمانوں کو دیگر مذاہب کی روحانیت سے استفادہ کرنے کا الزام لگایا جاتا ہے آیا اس دور میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا کوئی تاریخی میلان بھی ممکن تھا یا یوں ہی گمان کر لیا گیا ہے۔

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے یہ ہم مسلمانوں کی طرف سے اٹھایا گیا ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں اور یورپ کے مصنفین نہیں جانتے کہ مسلم اولیائے کرام نے قرب و معرفت حق میں جن بلند منازل و مقامات تک رسائی حاصل کی ہے۔ اس کی گرد تک نہیں پہنچ سکتے۔ دیگر مذاہب کے ارباب روحانیت اس کی گرد تک نہیں پہنچ سکتے مختصر یہ کہ ہندو، بدھ، عیسائی اور یونانی روحانی سسٹم کا مطالعہ کیا جس میں ان کی روحانی ترقی کا معیار فناء فی اللہ ہے جبکہ مسلمان صوفیائے کرام فناء اللہ سے آگے بقاء باللہ کے مقام پر فائز ہیں لیکن اسکے علاوہ ”الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی“ کے اعلان ربی کی رو سے مسلم اولیائے کرام کو جو کچھ عطا ہوا وہ دیگر مذاہب کے لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہے اور نہ تھا۔ جس روحانی عروج کی طرف بنی نوع انسان مختلف انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعے تدریجی ترقی کرتے رہے تھے۔ پیغمبر آخر الزمان ﷺ نے اس سے بڑھ کر انہیں روحانی ترقی کرائی۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ حضور ﷺ سے پہلے جتنے انبیائے کرام علیہم السلام تھے ان میں جزوی کمالات تھے کیونکہ وہ نہ پوری بنی نوع انسان کے لئے تھے نہ ہمیشہ کے لئے۔ لیکن حضور ﷺ کی تعلیمات ساری بنی نوع انسان کے لئے تھیں اور ہر زمانے اور ہر دور کے لئے مخصوص تھیں اسلئے آپ ﷺ کی تعلیمات میں روحانی ترقی کی بلند ترین منزل کی نشان دہی کے ساتھ جامعیت کا ہونا بھی لازمی تھا چنانچہ اسلامی تعلیمات میں جہاں مقام فناء فی اللہ میں بلند ترین منزل کی نشان دہی کر دی گئی ہے تکمیل انسانیت کے لئے بقاء اللہ کی منزل بھی دکھادی گئی ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ دیگر روحانی طرائق میں صرف فناء فی اللہ اور وہ بھی کم درجہ کا حصول ممکن ہے لیکن اسلام میں بلند ترین درجات فناء فی اللہ کے علاوہ مقام بقاء باللہ بھی بتا دیا گیا جو دیگر مذاہب میں نظر نہیں آتا۔

جو لوگ تصوف پر دوسرے مذاہب سے اخذ روحانیت کے الزام لگاتے ہیں۔ ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ صوفیائے کرام اور دیگر مذاہب کے درمیان شدید قسم کے اختلافات موجود ہیں جن کی نوبت کفر اور شرک تک پہنچ جاتی ہے۔

## صوفیاء اور فلسفہ یونان کے مابین اختلافات

صوفیائے کرام اور مسلم فلاسفوں مثلاً بوعلی سینا، ابونصر فارابی اور ابن رشد وغیرہ کے درمیان شدید اختلافات پائے جاتے تھے۔ اسلامی عقائد اور فلسفہ یونان میں پہلا بنیادی اختلاف یہ ہے کہ اسلام میں خداوند تعالیٰ کے سوا سب کچھ فانی ہے۔ ”کل من علیہا فان“ ہر چیز کو فنا ہے۔ لیکن فلسفہ یونان میں خدا کے ساتھ مادہ اور روح کو بھی قدیم کہا گیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ نوافلاطونیت (NEB-PLATONISM) میں ذات حق میں فنا ہو جانا آخری مقام ہے۔ اور پلاطینوس (PLOTINUS) جس کی تعلیمات کو (نوافلاطونیت) کہتے ہیں کا موقف بھی یہی ہے کہ آخری مقام فنا ہے لیکن اسلامی روحانی تعلیمات کی رو سے آخری مقام بقا باللہ ہے جس کا پلاطینوس نے ذکر نہیں کیا کہ اس کا کوئی وجود بھی ہے۔ جب ہم عیسائیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس پر بھی فلوپین کے فلسفے کا اثر گہرہ نظر آتا ہے۔

( ۲۳۷ )

### عیسائیت پر فلوپین کا اثر

مس گریس ٹرن بل، جس نے افلوپین کی ”السنعات“ کا خلاصہ شائع کیا ہے، اس کے مقدمے میں لکھتی ہے کہ یوگین (Eucken) کی طرح ڈین انج کا خیال بھی یہی ہے کہ فلوپین سے بڑھ کر، عیسائیت پر کسی فرد بشر کا اثر مرتب نہیں ہوا اور ٹرولش (Troeltsch) کا جو جرمنی میں اپنے عہد کا (۱۸۶۵ء تا ۱۹۲۳ء) سب سے بڑا مفکر تھا، یہ عقیدہ تھا کہ اگر انجیلی عیسائیت کو نوافلاطونیت سے خارج کر دیا جائے تو عصر حاضر کے تمام مسائل کا حل دستیاب ہو سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عیسائی کلیسا نے غیر شعوری طور پر تمام کے تمام نوافلاطونی فلسفے کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ اور فلوپین کی شخصیت اس روحانی قافلے میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے جس میں سقراط، افلاطون، ارسطو، آگسٹن، ٹامس اکیوناس، بروٹو (شہید علم و صداقت) پینسگل، اور اسپنوزا جیسے نامور حکماء شامل ہیں۔ یورپ میں جتنے صوفی گزرے ہیں، سب فلوپین ہی کے شاگرد اور ہم نوا ہیں۔ نیز ڈالٹے، مانکل، ایتھیلو، شلر، بلیک (Blake) اسپنسر، کالرج، ورڈسورتھ، ایمرسن اور ٹینیسن وغیرہ ہیں، سب نے اسی کے افکار و خیالات کی ترجمانی کی ہے۔ علمی دنیا جن حکما کو ”کیمرج کے پیروان افلاطون“ کے نام سے جانتی ہے مثلاً کڈورتھ (Cudworth) اور اس کے ساتھی یہ سب فلوپین کے روحانی شاگرد تھے۔ اور آج بھی برگسان اور وہائٹ ہیڈ کے افکار میں فلوپین کی شخصیت اور اس کے بنیادی فلسفے کی جھلک نظر آتی ہے۔

انجیل میں لکھا ہے کہ انسان صرف روٹی ہی سے زندہ نہیں رہتا لیکن فلوپین نے اس سے بلند تر مقام پر پہنچ کر یہ کہا کہ انسان صرف علم (فلسفہ) ہی سے زندہ نہیں رہتا۔ وہ نعمت جس کی بدولت اطمینان قلب حاصل ہو سکتا ہے، صرف اس عالم میں پائی جاتی ہے جو عقل سے بالاتر ہے۔

فلوپین ہمیں عقلی استدلال کی تنگنائی سے نکال کر روحانی دنیا کی وسعت سے روشناس کرتا ہے۔ یہ دنیا

اقدار مطلقہ کی دنیا ہے، خیالات مقدسہ کی دنیا ہے، افکار پاکیزہ کی دنیا ہے، روحانی سرور اور اطمینان قلب کی دنیا ہے اس دنیا میں داخل ہونے کے لیے فلوطین ہمیں مشورہ دیتا ہے کہ ظاہری آنکھوں کو بند کرو تا کہ باطنی آنکھیں کھل سکیں۔ لیکن فلوطین صرف نیک بننے ہی کی تلقین پر اکتفا نہیں کرتا، وہ کہتا ہے کہ ”اگر ہم خدا کے نیک بندوں کو اپنے لیے نمونہ بنانے پر اکتفا کر لیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ظل کے ظل، یا عکس کے عکس پر قناعت کر لی (نیک انسان خدا کا ظل یا عکس ہے)۔ لیکن یہ تو پستی ہمت کی دلیل ہے۔ ہمارا نصب العین محض معصوم عن الخطاء بننا نہیں ہے بلکہ خدا کو اپنی آغوش میں لے لینا یا بالفاظ واضح تر خود خدا بن جانا ہے۔ جیسے مولانا رومی نے فرمایا۔

ماز فلک برتریم وز ملک افزون رہم

زیں دو چراغکذریعہ منزل ما کبریا ست

اسی طرح ڈاکٹر اقبال نے بھی فرمایا ہے

در دشت جنون من جبرئیل زبوں صیدے

یزداں بکمند آوراے ہمت مردانہ

اس کی صورت یہ ہے کہ سب سے قطع نظر کر کے اپنی خودی میں غور کرو۔ خود نگری اختیار کرو۔ اگر تمہیں اپنے اندر جمال نظر نہ آئے تو سنگ تراش سے سبق لو۔ وہ انتہائی دیدہ ریزی سے کام لیتا ہے، اور مسلسل اصلاح (حک و اضافہ) کے ذریعے سے اپنے مجسمے کو جمیل بناتا ہے۔ اسی طرح تم اپنی خودی کو غور سے دیکھو اور یہ دریافت کرو کہ اس میں کہاں کہاں کیا کیا ہے عیوب اور اسقام ہیں۔ پھر انتہائی جدوجہد سے کام لو اور اسے حسین و جمیل بناؤ اور اپنی خودی کے اسٹیچو (مجسمہ یا تمثیل) کی اس وقت تک مسلسل نوک پلک سنوارتے رہو جب تک وہ جمیل نہ ہو جائے یعنی جب تک اس میں خدائی صفات پیدا نہ ہو جائیں اور وہ کامل خیر میں تبدیل نہ ہو جائے۔

## روح فکر فلوطینی:

- (۱) ”ہستی کی تمام صورتیں اور شائیں، الواحد سے صادر ہوتی ہیں اور اپنے مبداء یا اپنی اصل سے واصل ہونے کے لیے اور ہمیشہ اسی کے قریب رہنے کے لئے ساعی رہتی ہیں۔ (مثنوی معنوی اسی تصور کی شرح ہے)۔
- (۲) فلوطین نے الواحد کو موجود اول یا الاول یا المطلق یا الخیر یا لا متناہی یا الالب کے القاب سے بھی یاد کیا ہے۔

(۳) اس الواحد سے عقل کلی کا صدور ہوا۔

(۴) اس عقل کلی سے نفس کلی کا صدور ہوا۔

(۵) اس نفس کلی سے کائنات کا صدور ہوا۔

نوٹ:

عیسائیت نے اپنے مد مقابل مذہب متھرانیت کی تمام رسوم اپنے اندر داخل کر لیں۔ چونکہ دعویٰ بلا دلیل عندالغلاء درخور اعتناء نہیں ہوتا اس لیے سطور ذیل میں اس بارے میں عرض کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر جیمس کے فیمل مان پر ویسٹر طولان یونیورسٹی کی بلند پایہ تصنیف موسومہ ”مذہبی فلاطونیت“ (Religious Platonism) ۱۹۵۹ء لندن سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے صفحات نمبر ۱۴۶:

۱۴۳ کا خلاصہ ہدایتناظرین کرتا ہوں۔

”متھرا ازم ایک قدیمی مذہب تھا۔ اس کا بنیادی تصور، آفتاب پرستی تھا۔ اس مذہب اور عیسائیت میں شدید مماثلت پائی جاتی ہے۔

مثلاً:

(۱) دونوں مذہبوں میں ہتھمہ دینے کا رسم ہے۔

(۲) دونوں کے یہاں ”پاک رفاقت“ کی رسم ہے۔

(۳) دونوں کے یہاں ”عشار بانی“ کی رسم ہے۔

(۴) دونوں مذہبوں میں ”منجی عالم“ ۲۵ دسمبر کو پیدا ہوا۔

(۵) دونوں اتوار کو سبت قرار دیتے ہیں۔

(۶) دونوں مذہبوں میں رہبانیت کی تعلیم دی گئی ہے۔

(۷) دونوں مذہبوں میں لوگاس (Logos) کا عقیدہ موجود ہے اور یہ لوگاس، خدا اور بندوں کے مابین

واسطہ یا شفیع ہے۔

(۸) دونوں کا منجی مصلوب ہو کر بندوں کے گناہوں کا کفارہ ہو گیا۔

جب قسطنطین نے عیسائیت کو سلطنت کا سرکاری مذہب قرار دیا تو عیسائیوں نے پیروان متھرا کو مشق ستم بنایا۔ لیکن جب

قیصر جولین نے عیسائیت ترک کر کے متھرائیت قبول کر لی تو اس مذہب کو دوبارہ عروج حاصل ہو گیا۔ اس کی وفات کے

بعد عیسائیت بھرپور اقتدار آگئی اور چوتھی صدی میں عیسائیوں نے متھرائیت کو بزور شمشیر ختم کر دیا۔

## فلوٹین کے فلسفے کا اجمالی خاکہ

(۱) فلوٹین کے فلسفے کی بنیاد، وحدت وجود پر ہے۔ اس کی رائے میں وجود، جزئی حقیقی ہے اور الواحد میں

منحصر ہے۔

(۲) یہ الواحد (جو اخیر الاول بھی ہے) وحدت مطلقہ ہے، بسیط ہے اور لا متناہی ہے۔ جسمائیت اور

صورت سے پاک ہے۔ وہ تمام صفات اور تعریفات سے بالاتر ہے۔ جب ہم اس سے تمام صفات کی نفی کر دیں تو وہ کسی حد تک قرین عقل ہو سکتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم وحدت اور اخیر کے تصورات بھی اس سے منسوب نہیں کر سکتے کیونکہ ان سے بھی اس کی ذات کی تحدید لازم آتی ہے۔

(۳) تمام کثرت (کائنات) اسی الواحد سے صادر ہوئی ہے۔ لیکن اس صدور کا یہ مطلب نہیں ہے کہ

الواحد، کائنات کی کثرت میں گم ہو گیا یا کائنات میں متبدل ہو گیا یا یہ کائنات الواحد (خدا) بن گئی۔ بالفاظ دیگر فلوٹین بھی شکر کی طرح، نظریہ، حلول یا اتحاد کا اشد مخالف ہے۔ اس کا فلسفہ Pantheism یا مخلول نہیں ہے بلکہ وحدت وجود ہے۔ الواحد، ہمہ (کائنات) میں مبدل نہیں ہوتا، بلکہ وہ ہمیشہ ”ہمہ“ (کائنات) سے وراء الراء رہتا ہے۔ علامہ شبستری نے اسی خیال کو یوں نظم کیا ہے۔

حلول واتحاد ایں جا محال است

کہ در وحدت، دوئی عین ضلال است

(۴) الواحد کو اس اعتبار سے ”ہمہ“ کہہ سکتے ہیں کہ تمام اشیاء اسی سے صادر ہوئی ہیں لیکن وہ مجملہ اشیاء

یا یکے از اشیاء نہیں ہے۔ کیونکہ مجملہ اشیاء کائنات اس کے بعد ہست ہوئی ہیں اور ان کے ہست ہو جانے کے بعد وہ بدستور ان سے مافوق اور بالاتر ہے۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ کثرت (کائنات) الواحد سے بصورت تقسیم ذات ظاہر ہوتی ہے کیونکہ اس صورت میں الواحد کی وحدت ختم ہو جائے گی اور یہ محال ہے۔

(۵) الواحد سے کثرت کا ارتقائی ظہور، صدور کے طریق سے ہوا ہے، یعنی الواحد کی ذات میں، کثرت

نے صدور سے کوئی کمی یا نقص واقع نہیں ہوتا۔ چنانچہ فلوٹین کہتا ہے کہ ”الواحد اپنے ذاتی کمال کی معموری کی وجہ سے وجود کے ادنیٰ مراتب کے ظہور کو روک رکھتا ہے۔ مگر یہ ادنیٰ مراتب خود اس کی ذات میں داخل نہیں ہیں۔“

(۶) یہ صدور اس لیے ممکن ہو سکا کہ یہ مبداء الاول، الواحد ہی نہیں ہے، بلکہ اخیر الاول بھی ہے اور اخیر کی

ذات کا اقتضاء یہ ہے کہ وہ افاضہ وجود کرے، خیر اگر افاضہ وجود نہ کرے تو وہ خیر ہی نہیں ہے پس الواحد کے لئے ضروری



ہے کہ وہ الخیر ہونے کی حیثیت سے افاضہ وجود کرے۔ یعنی اپنا غیر پیدا کرے یا کسی کو صادر کرے جس پر جو دو کرم کی بارش ہو سکے۔

(۷) یہ شے جو الواحد سے صادر ہوگی، وحدت نہیں ہو سکتی بلکہ کثرت ہوگی کیونکہ یہ مصدر، مبداء یا اصل اول نہیں ہے جس کے لیے وحدت شرط ہے۔ بلکہ مبداء اول کی ہستی کا نتیجہ ہے۔ اس لیے اس میں کثرت کی شان کا پایا جانا لازمی ہے۔

(۸) الواحد سے جو شے بلا واسطہ صادر ہوتی وہ عقل (Nous) ہے جو الواحد کا عکس (Image) ہے۔ یہ عکس الواحد کے گرد ہالہ نور کی طرح منتشر ہے۔ بذات خود یہ عکس واجب الوجود ہے یعنی منصف بوجود ذاتی ہے، لیکن اپنی حقیقت سے آگاہ ہونے کے لیے یہ وجود حقیقی اپنے مبداء کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس فعل توجہ کی بدولت صاحب ادراک بن جاتا ہے، یعنی اس پر عقل کا اطلاق صادق آ جاتا ہے۔ جب اس صادر اول یا عقل کو اپنی ذات کا ادراک حاصل ہو جاتا ہے تو اس میں ثنویت (Dualiy) کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ اگرچہ حصول علم ذات میں عالم اور معلوم، دراصل دونوں ایک ہی ہوتے ہیں مگر ہم ان میں بحالت تفکراتیاز کر سکتے ہیں۔

الغرض اس طرح ذات عقل میں، تفریق یا غیریت کی اصل داخل ہو جاتی ہے کیونکہ عالم اور معلوم میں کم از کم ایک خیالی امتیاز تو ضرور ہو سکتا ہے۔ پس اگر الواحد، خدائے اعلیٰ ہے تو عقل یا روح کلی، اس خدائے اعلیٰ کا پر ہے جس میں الوہیت پائی جاتی ہے۔

(۹) اس عقل کلی سے نفس کلی کا صدور ہوا اور نفس کلی سے کائنات مادی کا صدور ہوا۔ واضح ہو کہ عقل اور نفس یہ دونوں الواحد کے مراتب داخلی ہیں۔ دراصل ایک ہی ذات مطلق ہے جس کی تین شانیں ہیں یعنی الواحد، عقل اور نفس۔ اب ہم اس بحث کو قدرے وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں۔

(۱) جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، وحدت وجود، فلوطن کے مذہب کی اساس ہے، یعنی الواحد تمام اشیاء کی حقیقت ہے لیکن وہ خود مجملہ اشیاء نہیں ہے۔ حقیقت، واحد ہے اور یہی حقیقت واحد، منشاء وجود ہے۔ تمام موجودات، بطریق تجلی و فیضان، اس سے صادر ہوئے ہیں اور انجام کار اسی مبداء اول کی جانب بطریق رجوع لوٹ کر چلے جائیں گے۔

(۲) الواحد ہی ہستی مطلق ہے اور کائنات ”نمود بے بود“ ہے یا ”نہیست ہستی نما“ ہے۔

(۳) الواحد (خدا) ہر منطقی حد اور تعریف سے وراء الراء ہے۔ خدا اگرچہ مصدر ہمہ اشیاء ہے یعنی ہر شے

سے صادر ہوئی ہے لیکن وہ اشیائے مصدورہ میں سے نہیں ہے۔ ہر تعبیر از قبیل موجود و جوہر و حیات ناقص ہے۔ خدا ان سب سے بالاتر ہے۔ اس کا تصور محال ہے۔

(۴) ہم خدا کے حق میں فکر اور ارادے کے قائل بھی نہیں ہو سکتے، کیونکہ فکر و چیزوں کو مستلزم ہے؛ ایک مفکر دوسری وہ چیز جس میں فکر کی جائے۔ اسی طرح ارادہ اس بات کو مستلزم ہے کہ ارادہ کرنے والا ایسی حالت کا طالب یا منتظر ہے جو اس کی موجودہ حالت سے مختلف ہے۔ ان دونوں باتوں میں ثنویت پائی جاتی ہے حالانکہ خدا، واحد ہے۔ اور اس کے لیے کسی حالت منتظرہ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

(۵) ہم جس بات کو یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ:

(الف) خدا واحد ہے، واجب الوجود ہے، کامل ہے، تجزیہ، تجمیع اور تعدد سے مبریٰ ہے، علی کل شیء محیط ہے، لامحدود ہے۔ اس کے ساتھ ہر نسبت اور اضافت، خلاف توحید ہے، مثلاً اس کے ساتھ علم و ادراک کی نسبت غلط ہے اور منافی توحید ہے کیونکہ اس کی ذات کے علاوہ اور کسی شے کا وجود ہی متحقق نہیں ہے کہ اس کو معلوم یا مدرک ہو سکے۔

(۶) اگرچہ فلوطین خدا کے لیے مختلف اوصاف کا اثبات کرتا ہے لیکن ہر تعبیر اور وصف کو غلط قرار دیتا ہے اور اسے خدا کی ذات لامحدود کے حق میں تحدید سمجھتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ یہ کہتا ہے کہ اسے وجود بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ وجود سے بھی بالاتر ہے اور وجود بھی اس کے فیوضات میں سے ایک فیض ہے۔

(۷) خدا کو حواس اور عقل کے ذریعے سے نہیں پاسکتے۔ اس تک پہنچنے کا ذریعہ اشراق یا شہود یا وجدان ہے۔

(۸) خدا مبداءِ خیر و فیض ہے۔ تمام کائنات اس کے فیض سے ظاہر یا پیدا ہوتی ہے۔ ہر شے جس قدر اس کے فیض سے قریب ہے اسی قدر کامل ہے، اور جس قدر دور ہے اسی قدر ناقص ہے۔ قرب، معیار کمال ہے۔

(۹) جو شے خدا سے سب سے پہلے صادر ہوئی وہ عقل کلی ہے، اور خدا کے بعد تمام اشیاء میں کامل ترین ہے۔ مجازاً کہہ سکتے ہیں کہ یہ صادر اول خدا کا بیٹا ہے۔ اس نے اپنے باپ (خدا) سے تمام کمالات اخذ کیے ہیں۔

(۱۰) عقل کلی (صادر اول) میں بھی قوت انتاج ہے اگرچہ باپ سے کمتر ہے اور اس سے جو شے صادر ہوئی وہ نفس کلی ہے۔ الواحد، عقل کلی اور نفس کلی کو الوہیت کے اقامتِ ثلاثہ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

(۱۱) جس طرح عقل کلی، خدا سے کسب فیض کرتی ہے اسی طرح نفس کلی، عقل کلی سے مستفیض ہے بایں

معنی کہ مبداء موجود، بمنزلہ خورشید ہے، عقل بمنزلہ زمین ہے اور نفس بمنزلہ ماہتاب ہے۔

(۱۲) جس طرح عقل خدا اور نفس کے درمیان واسطہ ہے، اسی طرح نفس، عالم روحانی اور عالم جسمانی کے مابین واسطہ ہے۔

(۱۳) نفس کل نے ہر جسم میں حلول کیا ہے اور ہر جسم نے اپنی استعداد کے موافق، نفس سے حصہ پایا ہے اور اس طرح نفس کلی تمام نفوس جزئیہ شخیصہ کا منشا ہے۔ اسی کی بدولت نفوس جزئیہ کا تحقق ہوا ہے۔

(۱۴) اجسام اور ابدان، آفتاب حقیقی یعنی خدا کا ہست ترین اور ضعیف ترین پرتویا ظل یا عکس ہیں۔

(۱۵) حقیقت اجسام، صورت ہے جو ان کے وجود کے لیے بمنزلہ مایہ ہے اور مادہ اس صورت کو قبول کرنے والا ہے۔

(۱۶) صورت، اجسام اور ابدان کا وجودی رخ یا پہلو ہے اور مادہ، ان کا عدمی رخ یا پہلو ہے۔ اسی لیے عالم جسمانی کو وجود اور عدم سے تساوی کی نسبت ہے یا یوں کہو کہ یہ عالم مذہب بین وجود و عدم ہے یعنی ایک اعتبار سے یہ عالم موجود ہے، دوسرے اعتبار سے معدوم ہے۔

(۱۷) اس بات کو یوں سمجھو کہ یہ عالم اپنی حقیقت کے اعتبار سے تو معدوم ہے لیکن اس اعتبار سے کہ پرتویا ظل ہے آفتاب حقیقی کا، اسے موجود کہہ سکتے ہیں۔

(۱۸) نفس کلی سے ان موجودات کا صدور، جو جسم اور ماہیات امکانیہ سے متصف ہیں، دراصل لانہایت سے نہایت کی طرف انتقال ہے۔

(۱۹) خدا اور جسم (مادہ) درجات کمال کے دو کنارے ہیں اعلیٰ ترین درجہ خدا ہے اور ادنیٰ ترین درجہ جسم ہے۔ خدا وحدت ہے، کائنات یا جسم کثرت ہے۔

(۲۰) جسم ہمیشہ تغیر اور تبدل کی حالت میں ہے، اس لیے اس پر ”بود“ یا ”ہست“ کا اطلاق نہیں ہو سکتا بلکہ وہ ”بود“ ہے۔ بالفاظ دیگر۔ جسم ہمیشہ واقع شدن یا صیرورت (Becoming) کی حالت میں رہتا ہے؛ اس پر ”بودن“ یا وجود (Being) کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

(۲۱) صورت، متضمن حقیقت موجودات ہے اور بغیر و جمال و کمال و وحدت سے عبارت ہے۔

(۲۲) مادہ وہ شے ہے جس سے اجسام متکون ہوتے ہیں اور وہ بے صورتی، شر، زشتی، نقص اور کثرت سے عبارت ہے۔ صورت اور مادہ آپس میں ضد یک دیگر ہیں۔ چونکہ خدا نے اپنی قدرت کاملہ سے دونوں کو جمع کر دیا ہے، اسی لیے خدا کو جامع الاضداد کہتے ہیں۔

(۲۳) عقل کلی اور نفس کلی اگرچہ مبدا وجود سے صادر ہوئے ہیں لیکن مادے سے تماس یا وابستگی کی وجہ سے ناقص ہو گئے اور قید تکثر میں مبتلا ہو گئے۔

(۲۴) عالم ملکوت سے عالم ناسوت کی طرف نفس کلی کے اس تنزل کو اور عالم کثرت سے اس کی آلودگی کو، حرکت در قوس نزول سے تعبیر کرتے ہیں۔

(۲۵) اس حرکت نزولی کے مقابل دوسری حرکت بھی ہے یعنی ہر شے میں جو الواحد سے صادر ہوتی ہے، اس الواحد (اصل) کی طرف رجعت کا میلان پایا جاتا ہے۔ مصدر اول کی طرف رجوع کی یہ آرزو، معرفت کی بدولت پیدا ہوئی ہے یعنی جب انسان کو اپنی اصل کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو اس میں اپنی اصل کی طرف بازگشت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جذب کی شدت، معرفت کی شدت پر موقوف ہے۔ اس حرکت رجعی کو حرکت در قوس صعود کہتے ہیں۔

(۲۶) جو شخص اپنی ساری توجہ مادیات (جسمانیات) پر مبذول رکھتا ہے اور حرکت رجعی کو فراموش کر دیتا ہے، وہ تباہ ہو جاتا ہے۔ اور جو شخص مادیات سے اعراض کرتا ہے اور اپنی توجہ عالم بالا پر مرکوز کر دیتا ہے وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔

(۲۷) ان دو حرکتوں (حرکت ہبوطی اور حرکت عودی) کا یہ نتیجہ ہے کہ ارواح انسانی، خدا کی طرف سے دنیا میں آتی رہتی ہیں اور پھر واپس جاتی رہتی ہیں۔

(۲۸) اس واپسی (سیر وسلوک) کے تین مرحلے ہیں۔

(الف) مقامات سیر وسلوک۔ (ب) محبت۔ (ج) معرفت۔

(الف) ”مقامات سیر وسلوک“ کا مطلب ہے حقیقت کی طلب اور اس تک پہنچنے کے لیے مجاہدہ کرنا۔

(ب) محبت ایک ”حال“ ہے جو مشاہدہ حقیقت سے سالک پر طاری ہو جاتا ہے۔

(ج) ”معرفت“ (Gnosis) حقیقت نامہ تک پہنچ جانے کا نام ہے۔ یہاں پہنچ کر عارف انسان کامل بن جاتا ہے، اور کمال ہی غایت وجود ہے۔

(۲۹) ہر موجود اس کمال کے حصول کی طرف طبعی میلان رکھتا ہے۔ یعنی اس طلسم رنگ و بو سے رہائی

حاصل کرنا اور اپنے وطن کی بازگشت یعنی اپنے مبدا سے اتصال۔

(۳۰) یہ سیر قدموں کے ذریعے نہیں ہوتی: اس کی صورت یہ ہے کہ ظاہری آنکھوں کو بند کرو اور دل کی

آنکھوں کو کھولو۔ خودی (نفس یا اہنکار) سے قطع نظر کرو اور بے خودی کے ذریعے اسے اپنے اندر دریافت کر لو۔

(۳۱) خدا نے یہ عالم خیر کے لیے خلق کیا ہے کیونکہ وہ خود سراپا خیر ہے۔ اس میں جو شر نظر آتا ہے وہ وجودی نہیں ہے بلکہ عدی ہے یعنی اس لیے ہے کہ روح، مادیات میں گرفتار ہو کر اپنی حقیقت سے غافل ہو گئی اور یہ غفلت باعث شر بن گئی۔ بالفاظ دیگر نزول روح گویا ہیوط ہے اور ہیوط سے شر کا ظہور ہوا اور اس میں مصلحت یہ ہے کہ خیر، شر سے متقابل ہو کر نمایاں ہو جائے۔ جس طرح ظلمت نہ ہو تو نور کی خوبی واضح نہیں ہو سکتی۔ تاہم یہ شر بتدریج زائل ہو رہا ہے اور کائنات کا ہر قدم خیر کی طرف اٹھ رہا ہے۔

(۳۲) فلوٹین تناخ ارواح کا قائل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ارواح (نفوس ناطقہ) چونکہ ازلی اور ابدی ہیں اس لیے وہ اجسام کی قید میں آنے سے پہلے موجود تھیں اور جو لوگ نفس امارہ کی غلامی کرتے ہیں ان کے مرنے کے بعد ان کی ارواح حیوانات کے قالب میں چلی جاتی ہیں۔ جو لوگ نیک ہیں ان کی وفات کے بعد ان کی ارواح دوبارہ انسانوں کا قالب اختیار کرتی ہیں۔

(۳۳) چونکہ نفوس جزئیہ، نفس کلی اور اجسام مادی کے مابین مذہب حالت میں ہیں اس لیے ان کی تین قسمیں ہو گئیں:

(الف) وہ نفوس سماوی جو خدا کے لیے زندہ رہتے ہیں اور مشاہدہ جمال میں دائمًا مستغرق رہتے ہیں۔  
(ب) وہ نفوس جو سرگردان رہتے ہیں مثلاً ملائکہ اور شیاطین۔ ملائکہ ہمیشہ خیر کی طرف مائل رہتے ہیں اور شیاطین شر کی طرف۔

(ج) نفوس بشری جن کا اصلی وطن تو عالم قدس تھا مگر وہ اجسام سے وابستہ ہو گئے۔ اب اگر وہ ہمت اور اختیار سے کام لیں تو پھر دوبارہ اپنے اصلی وطن کو واپس جاسکتے ہیں۔

(۳۴) غایت حیات اور کمال مقصود، مبدأ اصلی کی طرف بازگشت ہے اور اس بازگشت کا طریقہ عشق ہے، جس کی بدولت نفس امارہ تمام عیوب سے پاک ہو جاتا ہے اور فضائل اربعہ (عفت، عدالت، شجاعت اور حکمت) سے متصف ہو جاتا ہے۔

(۳۵) خدا سے واصل ہونے کا طریقہ عشق ہے، کیونکہ خدا محبوب حقیقی ہے۔ وہ حسن و جمال میں کامل ہے۔ وہی اس لائق ہے کہ اس سے محبت کی جائے اور چونکہ وہ خود سراپا عشق یا مجسم عشق ہے اس لیے اس تک پہنچنے کی صورت صرف عشق ہے۔ چنانچہ فلوٹین کہتا ہے:

”خدا نہ زمان میں ہے نہ مکان میں ہے، نہ وہ محدود ہے نہ محصور ہے۔ نہ اس کو کوئی صورت ہے نہ شکل۔ وہ تمام

اضافوں اور نسبتوں سے پاک ہے، وہ خود بخود، یا خود در خود موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ سزاوار محبت بھی ہے۔ وہ اس لائق ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔ وہ محبوب ہے بلکہ خود عشق ہے اور واجب الوجود ہے۔ (۳۶) چونکہ خدا حسن بھی ہے اس لیے کائنات میں جہاں کہیں حسن ہے، وہ اسی کے حسن حقیقی کا عکس ہے۔ فلوپین لکھتا ہے:

”مادی اشیاء میں جس قدر حسن و جمال ہے وہ سب اس خیال سے رابطہ پیدا کرنے کی بدولت ظہور پذیر ہوتا ہے جو ذات حق سے سرزد ہوتا ہے۔ روح (Soul) بذات خود حسین و جمیل ہے مگر جب جسم سے وابستہ ہوتی ہے تو اس کا جمال پوشیدہ ہو جاتا ہے۔ اگر وہ علائق مادی سے آزادی حاصل کر لے تو اس کا اصلی جمال اسی طرح ظاہر ہو جاتا ہے جس طرح سونے کو آگ میں تپا کر میل کچل دور کر دیا جائے تو وہ دیکھنے لگتا ہے۔“

(۳۷) یہ کائنات بمنزلہ آئینہ ہے بلکہ ہر موجود بمنزلہ آئینہ ہے اور خدا اس میں جلوہ گر ہے اور اس سے ظاہر ہو رہا ہے۔ یہ آئینے ”نمود“ ہیں۔ خدا وجود ہے یعنی حقیقی معنی میں وہی موجود ہے۔ ہستی یا وجود دراصل صرف اسی کے لیے ثابت ہے۔ (۲۳۸)

### فلوپین بحیثیت صوفی

فلوپین محض فلسفی ہی نہیں بلکہ صوفی بھی ہے۔ اس کے افکار کا مقصد خدا کو جاننا نہیں ہے بلکہ اس کو دیکھنا ہے۔ بالفاظ صحیح تر وہ ایک مذہبی فلسفی ہے اور اس کا مذہب بقول ڈین انج ”فلسفیانہ فکر اور ذاتی مشاہدہ ان دو مستقل عناصر سے مرکب ہے۔ اس لیے ہم ذیل میں اس کے صوفیانہ افکار کا خلاصہ ہدیہ قارئین کرتے ہیں۔

(۱) وجود، کلی طبعی نہیں ہے بلکہ جزئی حقیقی ہے اور فرد واحد میں منحصر ہے جسے وہ ”الاول“ کہتا ہے جو واجب الوجود ہے۔ تمام موجودات اسی کے ظہورات کے مراتب ہیں۔ یہ حقیقت حقہ، احد اور صمد ہے۔ یہ حقیقتہً اقصیٰ محیط کل ہے۔ کوئی شے وہ (خدا) نہیں ہے۔

(۲) فلوپین اس الاول کو کبھی الواحد سے تعبیر کرتا ہے کبھی الخیر سے، کبھی فکر مجرد سے اور کبھی فعل تام سے، لیکن اس نے اس بات کی صراحت کر دی ہے کہ وہ ذات پاک ہمارے وہم و قیاس و گمان و عقل و خیال سے بالاتر ہے۔

(۳) فلوپین نے مثل افلاطونی (Platonic Ideas) کو تسلیم کیا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ افلاطون یہ کہتا ہے کہ خیر مطلق عالی ترین مرتبہ، مثل ہے لیکن فلوپین کا خیال یہ ہے کہ خیر مطلق، تمام مثل سے بالاتر ہے۔ اسی کو وہ مصدر اول (خدا) کہتا ہے۔

(۴) یہ مصدر یا مبداء اول چونکہ کامل ہستی ہے اور اس میں بخل راہ نہیں پاسکتا، اس لیے تخلیق اس کی ذات کا تقاضا ہے۔ وہ بلاشبہ زائدہ اور فیاض ہے۔ افاضہ وجود (تخلیق) اس کے لیے ضروری ہے۔ تمام موجودات اس سے صادر ہوئی ہیں۔

(۵) صادر اول، عقل اور عالم معقولات ہے۔ اس عقل سے نفس یا روح کا صدور ہوا۔ الاول، عقل اور نفس یہ اقامت ثلاثہ ہیں اور ہر اقنوم لاہوتی ہے مگر یہ عقل اور نفس، الاول ہی کی دو شانیں ہیں اس لیے خدا ایک ہی ہے، تین نہیں ہیں۔

(۶) نفس کل، منشاء نفوس جزئیہ ہے۔ وہ اجسام میں داخل ہے اور یہ عالم جسمانی، ذات احدیت کا ضعیف ترین پرتو ہے۔

(۷) سیر مراتب و تنزلات میں ہم وجود کو ایک قوس سے تشبیہ دے سکتے ہیں جس کے ایک جانب وجود ہے دوسری جانب مادہ ہے۔

مبداء اصلی کی طرف رجوع کے لیے دوسری قوس فرض کر لو اور ان دو قوسوں (کمانوں) کو ملا کر فرضی دائرہ وجود بن سکتا ہے۔ قوس اول کو قوس نزول اور قوس دوم کو قوس صعود کہتے ہیں۔

(۸) نفس یا روح انسانی، قوس نزول میں، عالم مجردات و ملکوت سے عالم ناسوت میں نزول کرتی ہے۔ اور مادے میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ اب اگر وہ مادیات میں بکلی منہمک ہو جائے تو سعادت اخروی یا ابدی سے محروم ہو جاتی ہے اور صعود کے بجائے ادنیٰ مراتب میں نزول کرتی ہے۔ مثلاً مرتبہ حیوانات۔

جو ارواح لذات مادی میں بکلی منہمک نہیں ہوتیں۔ بلکہ خدمت خلق بھی کرتی ہیں اور کچھ خوبیاں بھی اپنے اندر پیدا کر لیتی ہیں وہ جسم کی فنا (موت جسمانی) کے بعد دوبارہ انسانی اجسام سے متعلق ہو جاتی ہیں۔

اور جن لوگوں کی ارواح اپنے اصلی وطن کی طرف واپس جانے کا شوق رکھتی ہیں وہ قوس صعودی کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے لازم ہے کہ وہ عالم مادی اور علاقہ دنیوی سے تبتل (قطع نظر) اختیار کریں اور تہذیب و تزکیہ نفس میں منہمک ہو جائیں۔

(۹) تزکیہ نفس کے تین مراتب ہیں۔

(الف) تصفیہ نفس:

اس سے مراد ہے نفس کو تمام صفات رذیلہ سے پاک کرنا۔

## (ب) تجلیہ نفس:

یعنی میل کچیل دور کر کے نفس کو صیقل کرنا۔ اس کو جلا دینا تاکہ وہ صفات جمیلہ قبول کر سکے۔

## (ج) تحلیہ نفس:

یعنی نفس کو صفات حمیدہ سے آراستہ کرنا۔

(۱۰) سلوک معنوی کے تین مرحلے ہیں:

## مرحلہ اول۔ ہنر یا آرٹ:

ہنر سے مراد ہے طلب حقیقت و زیبائی۔ یہ دونوں (Truth and Beauty) ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ کیوں کہ جو حقیقی ہے وہ جمیل یا زیبا بھی ہے۔ حقیقت کے بغیر جمال کا کہیں وجود نہیں ہے۔ حقیقت ہی جمال ہے اور جمال ہی حقیقت ہے۔

جمال دراصل صورت ہے جو مادے پر متصرف ہو کر اسے وحدت عطا کرتی ہے۔ جمال دراصل تابش روح ہے جو اجسام پر ضوئیں ہوتی ہے اور اسی تابش (چمک دمک) کی بدولت ان میں دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور روح پر تو عقل ہے اور عقل پر تو ذات حق ہے، اور ذات حق منبع حسن و جمال ہے۔ ذات حق سے عقل میں شان جمال پیدا ہوئی، عقل سے نفس میں اور نفس سے اجسام مادی میں یہ شان جلوہ گر ہوئی۔

زیبائی یا جمال کا مشاہدہ کرنے سے روح یا نفس میں جو شوق و اشتیاق و الفت و وجد کے جذبات پیدا ہوتے ہیں ان کا سبب صرف یہ ہے کہ اسے (نفس یا روح کو) دوسری اشیاء میں اپنا ہم جنس نظر آتا ہے۔ جو خوبی اس میں ہے، جب وہی خوبی اپنے مقابل میں پاتی ہے تو خود بخود اس کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ قصہ مختصر طلب حقیقت (جمال) ہر شخص میں موجود ہے۔ یہ دوسری بات ہے کسی میں کم کسی میں زیادہ۔

## مرحلہ دوم۔ عشق:

سیر و سلوک نفوس پاکیزہ کا دوسرا مرحلہ عشق ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ارباب ذوق و ہنر، ہمیشہ تجلیات محسوس جمال کی جستجو کرتے رہتے ہیں۔ لیکن واضح ہو کہ جمال و زیبائی محسوس، جمال حقیقی کا پر تو ہے اور ایک امر معقول ہے، جس کا ادراک عقل کی وساطت سے ہو سکتا ہے کیوں کہ صورت و زیبائی کی اصل اور حقیقت ہے۔ جمال جسمانی نفس یا روح کی بدولت ہے اور جمال نفسی یا روحی عقل کی بدولت ہے اور عقل خود عین جمال ذات یا صورت صرف ہے۔



اس لیے اہل ذوق و ہنر کے دل میں جو شوق و اشتیاق، جمال ظاہری کے مشاہدے سے برپا ہوتا ہے اہل معنی کو وہی ذوق و شوق، جمال معنوی اور فضائل و کمالات روحانی کے مشاہدے سے حاصل ہوتا ہے۔ لیکن یہ عشق کا ناقص مرتبہ ہے، یعنی ابھی عشق کامل نہیں ہوا۔

### مرحلہ سوم۔ حکمت:

حکمت یا عشق کامل یہ ہے کہ سالک کی نگاہ، مادیات کے حسن و جمال سے بلند تر ہو کر خالق مادہ و اجسام کے جمال پر مرکوز ہو جائے۔ جب عشق میں پختگی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے تو سالک یہ محسوس کرتا ہے کہ میرا مطلوب یا مقصود، مادی حسن و جمال نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس ہستی سے متحد ہونا چاہتا ہے جو خالق جمال ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا حقیقی وطن ”وحدت“ ہے اس لیے اسی کی طرف بازگشت ہماری سب سے بڑی آرزو ہے۔ پس ظاہری آنکھوں کو بند کرو اور دل کی آنکھوں کو کھولو۔

جب ہم دل کی آنکھیں کھولیں گے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ جس کی طلب میں ہم سرگردان ہیں وہ ہم سے دور نہیں ہے بلکہ ہمارے اندر موجود ہے۔

اگر خواہی خدا را فاش بینی

خودی را فاش تر دیدن بیا موز

یہ ”وصل بالحق“ وہ حالت ہے جو ایک طالب کو مجاہدے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس حالت کو بے خودی (Ecstasy) کہتے ہیں۔ اس حالت میں سالک ہر شے سے حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی بیگانہ اور بے خبر ہو جاتا ہے۔ جسم و جان سے بے خود، زمان و مکان سے بے خبر، غور و فکر سے مستغنی، عقل و خرد سے آزاد۔ سراپا مستی، سراپا ذوق و شوق۔ اس حالت میں وہ اپنے آپ اور اپنے محبوب (خیر مطلق) میں کوئی واسطہ نہیں دیکھتا۔ جمال یا ربے پردہ دیکھتا ہے۔ اس کے اور اس کے محبوب کے درمیان کوئی پردہ باقی نہیں رہتا۔

یہ وہ عالم ہے جس کی جستجو مجازی عاشق اور مجازی معشوق (عورت اور مرد) قوت و اہمہ کی وساطت سے کرتے ہیں اور بعض لوگ اسے وصل جسمانی میں تلاش کرتے ہیں۔ لیکن یہ عالم، ربوبیت سے مختص ہے اور نفس انسانی، جب تک بدن (مادے) سے متعلق ہے۔ اس عالم (حالت) میں باقی رہنے کی تاب نہیں لاسکتا۔

قصہ مختصر یہ عالم بہت دیر یاب ہے چنانچہ فر فریوس کہتا ہے کہ فلو طین کو مدۃ العمر میں صرف چار مرتبہ یہ حالت نصیب ہوئی۔

فلوٹین لکھتا ہے کہ میں بعض اوقات بدن سے قطع تعلق کر کے جوہر مجرد بن جاتا ہوں، اور اس حالت میں اپنے اندر ایسا جمال دیکھتا ہوں کہ حیران رہ جاتا ہوں، اور اس حالت وقت مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ میں عالم بالا سے تعلق رکھتا ہوں۔ پھر اس حالت کو ترقی دیتا ہوں اور عالم فوق العقول میں چلا جاتا ہوں (جسے سیر عالم لاہوت کہتے ہیں)۔ وہاں ایسا نور دیکھتا ہوں کہ زبان اس کی توصیف سے عاجز ہے۔

خلاصہ کلام اس کہ فلوٹین کی تعلیمات کو بغور مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ اس کے فلسفے کا مقصود اصلی، تہذیب و تکمیل روح ہے۔ اور اس تہذیب و تکمیل کا طریقہ برہانی یا عقلی نہیں ہے بلکہ وجدانی اور کشفی ہے۔

( ۲۳۹ )

## ہندو ازم

راجگو پال اچاریہ نے خاص اسی موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے

Hinduism: Doctrine and Way of Life. اس کتاب میں انہوں نے دکھایا ہے کہ آج کی دنیا کچھ

روحانی تہذیبی بنیادوں کی طالب ہے اور وہ اخلاق اور کلچر جس کی جڑیں دیدانت میں اتری ہوئی ہیں، بلاشبہ اس ضرورت کو پوری کر سکتا ہے۔ (۲۵۹) صنعتی انقلاب جو مسائل پیدا کئے ہیں، عمل اور اخلاقی قدروں کے درمیان آج جو علیحدگی نظر آتی ہے، سوسائٹی کے خود غرض عناصر جس طرح قانون کے ذریعہ استحصال کی کوشش کر رہے ہیں اور سیاسی اور معاشی میدانوں میں اس کو ناجائز کامیابی کے لئے استعمال کرتے ہیں متضاد مقاصد کے درمیان انسانی طاقت جس بری طرح ضائع ہو رہی ہے، ان تمام خرابیوں کا ذکر کرنے کے بعد وہ سوال کرتے ہیں کہ کیا دنیا کو ایک ایسا مذہب پیش کیا جاسکتا ہے جو سائنس کا مخالف نہ ہو اور عملی زندگی اور ریاستی معاملات کو حق پرستی کی بنیاد پر تعمیر کر سکے۔ اور اس کے بعد خود ہی کہتے ہیں کہ Vedanta is the answer یعنی دیدانت اس سوال کا جواب ہے۔ ”واضع لفظوں میں“ وہ لکھتے ہیں۔ ”دعویٰ“ یہ ہے کہ ایک اخلاقی کوڈ اور اقدار کا ایک نظام ہندو مفکرین نے مذہبی فلسفے سے تیار کیا ہے جس کو دیدانت کہا جاتا ہے جو نہ صرف یہ کہ سائنس کے مطابق ہے بلکہ ایک بہتر اور مستحکم سماجی تنظیم کی نہایت عمدہ اور موزوں بنیاد بن سکتا ہے جس کی تمام دنیا کے بہترین لوگ تمنا رکھتے ہیں اور اس کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔“

ہندو ازم موجودہ ترقی یافتہ سماج کی ضرورتوں کو کس طرح پورا کر سکتا ہے اسکی ایک مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

بھاگو دگیتا میں یہ بات نہایت واضح طریقے پر بیان کر دی گئی ہے کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے عمل اور سماجی ذمہ

داریوں کو اپنی حیثیت کے مطابق انجام دے، نہ کہ منافع کی غرض سے، ہم کو اب سماجی اور اقتصادی مصلحین بتا رہے ہیں

کہ اسٹیٹ اس بات کی نگرانی کرے گی کہ مرد اور عورت محض اپنے ذاتی مقاصد کے لئے کام نہ کریں۔ بلکہ اجتماعی مفاد کو بھی سامنے رکھیں اور یہ بالکل وہی بات ہے جو بھاگو دگیتا میں کہی گئی ہے۔ اس میں نہایت واضح طریقے پر بار بار بتایا گیا ہے کہ تمام کام دیانت داری اور بے غرضی کے ساتھ اجتماعی بہبود (لوگ سنگرہ) کے لئے کیا جائے نہ کہ شخصی تمناؤں کی تسکین کے لئے۔ درحقیقت گیتا نے تمام سوشلسٹ اصولوں کو نہایت عمدہ طریقے پر پیش کر دیا ہے۔ (۲۲۵)

## ہندو فلسفہ روحانیت اور اسلامی تصوف

ہندو فلسفہ روحانیت میں خدا، روح اور مادہ کو قدیم مانا گیا ہے۔ لیکن اسلام میں خداوند تعالیٰ کے سوا کسی اور چیز کو قدیم ماننا کفر ہے۔ نیز ہندو فلسفہ روحانیت میں بھی آخری مقام فنا فی اللہ ہے بقا باللہ اور عبدیت کا انہوں نے نام بھی نہیں سنا لیکن اسلامی روحانیت میں فنا اللہ سے گذر کر بقا باللہ اور عبدیت کو آخری مقام قرار دیا گیا ہے۔ ہندو مذہب میں تنازع یعنی آواگون ایک بنیادی عقیدہ ہے۔ جس کا اسلام اور اسلامی تصوف سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ ایسا عقیدہ رکھنا اسلام کے نزدیک صریح کفر ہے۔ اسلامی تصوف میں بقا باللہ کا مقام پانے کے لئے محنت شاقہ، ریاضت اور مجاہدے کی ضرورت ہوتی ہے اور ریاضت اور مجاہدے میں کثرت سے اللہ تعالیٰ کے ذکر و تسبیح کی ضرورت ہوتی ہے۔

**ذکر و تسبیح:** تمام انبیاء و حکمائے عالم اس حقیقت پر متفق ہیں کہ تمام مسرتوں، لذتوں اور نعمتوں

کا سرچشمہ اللہ ہے اور جب تک اس سے رابطہ نہ پیدا کیا جائے، یہ چیزیں حاصل نہیں ہو سکتیں، رابطہ کیسے پیدا ہو؟ یہ ہے وہ سوال، جس پر تمام نسل انسانی کے اہل علم و نظر نے صدیوں سوچا، مختلف تجربے کیے اور بالآخر کچھ اصول منضبط کیے جو بلا استثناء ہر جگہ ایک ہیں، صرف طریق کار کا فرق ہے۔ اسلامی و عیسائی تصوف ہو یا ہندی و تبتی یوگا، سب میں چند چیزیں مشترک ہیں۔ یعنی پاکیزگی افکار و اعمال، ذات الہی میں محویت، ذکر و تسبیح، فرق صرف یہ ہے کہ مسلمان جسم و روح دونوں کے جائز تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور ایک یوگی تمام جسمانی و مادی خواہشات کو جھٹک کر کسی غار میں جا بیٹھتا ہے۔ اس افراط و تفریط کے باوجود صوفی و یوگی روحانی لذات سے برابر برابر متمتع ہوتے ہیں۔ جسم لطیف میں پرواز کی طاقت دونوں کو ملتی ہے۔ حدود زمان و مکان دونوں ہی کو پھلانگ جاتے ہیں۔ اور دونوں کی نظر مجربات و دفاؤں کو دیکھ سکتی ہے۔

ہندوؤں فلسفہ روحانیت میں بھی ریاضت کی جاتی ہے جس کو وہ یوگا کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ان کے چند اصولوں میں جو درجہ ذیل ہیں۔

ہندوؤں کا یوگا: ہندی یوگا کے چند اصول یہ ہیں۔

(1) نیا ما:

تمام جسمانی و مادی لذات سے اعراض، مال و زر سے کامل استغناء۔

(2) آ سنا:

عبادت و ریاضت کے وقت اس طرح بیٹھنا کہ جسم کو تکلیف نہ ہو، یوگیوں کے ہاں اس قسم کے چوراسی آسن ہیں، مثلاً پاؤں پھیلا کر بیٹھنا، پالتی مارنا وغیرہ۔

(3) پران یا ما:

سانس روکنے کی مشق، یوگیوں کا خیال ہے کہ ہوا میں ایک طاقت ”پران“ کے نام سے موجود ہے۔ جب سانس روک لی جاتی ہے تو یہ طاقت جسم کے مختلف حصوں میں پھیل جاتی ہے۔ ساتھ ہی وہ لوگ اسمائے الہیہ کا ورد کرتے ہیں اور اسی طرح مختلف روحانی مراکز (جو جسم میں موجود ہیں) میں ایک حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔

(4) پرت یا ہارا:

دماغ سے وہ اللہ کے تمام خیالات نکال کر سکون دیک صوفی پیدا کرنا۔

(5) دھرنا:

یکسوگی کے بعد تمام توجہ ذات باری پر مرکوز کرنا۔

(6) دھیان:

یہ یقین پیدا کرنا کہ کائنات میں صرف ایک ہی حقیقت موجود ہے، اور اپنے آپ کو اسی حقیقت کا جز سمجھنا۔

(7) سادھی:

اپنے علم کو خدائی علم کا ایک حصہ سمجھنا۔ اسی حالت کو انگریزی میں Cosmic Consciousness کہتے

ہیں۔

ان یوگیوں کے ہاں قوت و آگاہی کے کئی مراکز ہیں۔ جن میں عبادت و ریاضت سے زندگی و توانائی پیدا کی

جاسکتی ہے۔ مثلاً: ۱۔ ریڑھ کی ہڈی کی جڑ ۲۔ دل ۳۔ گلا ۴۔ ابرھوں کے درمیان

۵۔ دماغ وغیرہ۔ ان میں سے ہر مقام مختلف قسم کی توانائی کا مرکز ہے۔ (۲۲۱)

## اپنشدوں کی تعلیم

### اپنشد کی قدامت:

اس بات پر دنیا کے تمام محققین کا اتفاق ہے کہ اپنشد، تصوف پر قدیم ترین تصانیف ہیں، جن میں تصوف کے تمام بنیادی اصول بیان کر دیے گئے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر روائس (Royce) نے اپنی مشہور تصنیف ”کائنات اور فرد“ جلد اول باب چہارم ص ۱۵۶ میں اعتراف کیا ہے کہ ”صوفیانہ عقائد کی پوری داستان ان کتابوں میں قلمبند کر دی گئی ہے۔“

### اپنشد کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم:

اپنشد کے لفظی معنی ہیں ”کسی کے پاس باادب بیٹھنا“ اور بقول شکر اچاریہ اس کے اصطلاحی معنی ہیں ”برہمہ گیان“ حاصل کر کے جہالت کا ازالہ کرنا۔

### اپنشد کی تعلیمات کا مرکزی تصور:

اپنشدوں کی تعلیمات کی روح ”عرفان حقیقت“ (برہمہ گیان) ہے۔ چنانچہ منڈک اپنشد میں یہ سوال کیا گیا ہے۔ ”وہ شے کیا ہے جس کا عرفان ہو جانے سے سارے جگت کا عرفان ہو سکتا ہے؟ اور اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ”وہ شے خدا ہے۔ اگر انسان کو اس کا عرفان حاصل ہو جائے تو ساری کائنات کا عرفان حاصل ہو جائے گا۔“

### اپنشدوں کی تعلیمات کا خلاصہ:

برہمہ سوتر میں اپنشدوں کی تعلیمات کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ شکر اچاریہ نے اس کی شرح بھی لکھی ہے جس کا ترجمہ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے انگریزی میں کیا ہے۔ انہوں نے، ص ۲۵۱ پر لکھا ہے کہ برہمہ سوتر کے پہلے چار سوتروں میں تمام اپنشدوں کا خلاصہ بایں انداز درج کر دیا گیا ہے۔

(۱) برہمہ گیان (خدا کا عرفان حقیقی) فلسفے اور مذہب دونوں میں آخری مسئلہ ہے۔

(۲) اس کائنات میں برہمن (خدائے واجب الوجود) اعلیٰ حقیقت ہے اور وہ ایکم ادوتیم (واحدہ

لاشریک) ہے۔

(۳) یہ عرفان بذریعہ وحی حاصل ہو سکتا ہے۔

(۴) برہمہ گیان سے اطمینان قلب اور ابدی سرور حاصل ہو سکتا ہے۔

## اپنشدوں کی تعلیمات:

اب ہم اپنشدوں کی اہم تعلیمات ذیل میں درج کرتے ہیں۔

(۱) حقیقت، الواحد ہے اور یہ کائنات اس ذات یکتا و یگانہ کا مظہر ہے۔ اس کے سوا کوئی شے حقیقی معنی

میں موجود نہیں ہے۔

(۲) وہ حقیقہ مطلقہ، ستیم (حق)، جنم (مدرک بالذات) اور انتم (لامتناہی) ہے۔

(۳) یہ کائنات جیسی نظر آتی ہے، ایسی کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا کی مرضی یوں ہی تھی۔ وہ

مختار مطلق ہے، کوئی شخص اس سے باز پرس نہیں کر سکتا۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

(۴) یہ کائنات سراسر غیر حقیقی (دھوکا) نہیں ہے بلکہ حقیقی بھی ہے اور غیر حقیقی بھی ہے۔ یہ کائنات اس

اعتبار سے حقیقی (خارج میں موجود) ہے کہ مظہر ذات حق ہے۔ اور اس اعتبار سے غیر حقیقی ہے کہ بذات خود، موجود نہیں

ہے، یعنی اس کی حقیقت، موجود نہیں ہے بلکہ عدم ہے۔ جب کہ حق تعالیٰ (برہم) کی حقیقت، وجود ہے۔ وہ بالذات

موجود ہے یعنی واجب الوجود ہے۔

(۵) یہ ذات واجب، یہ حقیقہ کبریٰ، پریم (مطلق) ہے، ستہ ستیم (حقیقہ الحقائق) ہے۔ جیو شتم جیو ش

(نور الانوار) ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے متھ کلپنا (موجود فی مرتبہ الوہم) ہے۔ وہ مخفی بھی ہے آشکار بھی ہے۔ باطن

بھی ہے ظاہر بھی ہے۔ وہ ذات پاک زمان و مکان و سلسلہ، علت و معلول سے بالاتر ہے۔ وہ اوے یکت (عیان) بھی

ہے۔ وہ سرو ویاپی (محیط کل) بھی ہے اور کائنات کے ہر ذرے میں انتریامی (جاری و ساری) بھی ہے۔ کوئی انسان

اس کی کنہ یا حقیقت کو نہیں پاسکتا۔ چنانچہ ”کین اپنشد“ میں مذکور ہے کہ ”نہ اسے آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں نہ لفظوں کے

ذریعے سے بیان کر سکتے ہیں نہ اس کی ذات کا تصور یا عقل کر سکتے ہیں۔“

(۶) یہ کائنات سراپا متھ (نمود) ہے بلکہ نمود بے بود ہے اور حق تعالیٰ سراسر ستہ (وجود) ہے۔

(۷) عرفان ذات حق، اس کے فضل و کرم پر موقوف ہے۔

(۸) دنیا میں رہو مگر اس سے دل مت لگاؤ۔ ویراگ (تبتل یا انقطاع عن ماسوی اللہ) بہترین

طرز حیات ہے۔

(۹) دنیا کی نعمتوں سے تمتع جائز ہے مگر انہیں مقصود حیات بنانا ناجائز ہے کیونکہ جو شخص فانی چیزوں سے دل لگاتا ہے وہ خود بھی فنا ہو جاتا ہے۔

(۱۰) انسان کے حقیقی دشمن باہر نہیں ہیں بلکہ اندر ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) کام (شہوة)۔ (۲) کرودھ

(غضب)۔

(۳) موہ (حرص)۔ (۴) لوبھ (طمع)۔

(۵) انکار (عجب)۔

(۱۱) جب تک ان دشمنوں (اور نفس امارہ، انہی کے مجموعے کا نام ہے) کو مغلوب نہیں کرو گے، عرفان (برہم گیان) حاصل نہیں ہو سکتا (نفس امارہ انہی پانچوں دشمنوں کے مجموعے کا نام ہے)۔

(۱۲) جسے برہم گیان حاصل ہو جاتا ہے وہ خود برہمن ہو جاتا ہے یعنی اس میں برہمن کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔

(۱۳) جب انسان، عارف ہو جاتا ہے تو اس میں یہ چار صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔

(۱) اطمینان۔ (۲) ہمت (۳) طاعت

(۴) خدمت خلق۔

پھر وہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے لئے جیتا ہے۔

(۱۴) عارف وہ ہے جو ہر شے میں اسی کا جلوہ دیکھتا ہے تو حید حقیقی بھی ہے دوسرے کا خیال دل سے نکل

جائے۔

(۱۵) الیشور (خدا) صرف انہی کو درشن دیتا ہے جو اس کے دیدار کے لئے بیتاب ہیں۔ اور اسے حاصل

کرنے کے لئے سراپا جتتو ہیں۔

(۱۶) اسے پانے کی شرائط حسب ذیل ہیں۔

(الف) دم (ضبط نفس)۔ (ب) دان (ایثار)۔ (ج) دیا (شفقت)۔ (د) جپ (ذکر)۔ (ه)

تپ (مجاہدہ)۔ (و) دھیان (مراقبہ)۔

(۱۷) الیشور، انسان کے پردے (قلب) میں وشرام (استراحت) کرتا ہے وہ اپنے عاشقوں کے دل

میں سکونت پذیر ہے۔

(۱۸) جو خدا کے سوا غیر سے دل لگاتا ہے وہ ابدی محرومی میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ انسان کی سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ وہ سنسار (دنیا) سے دل لگائے۔

(۱۹) مبارک وہ ہے جو جیتے جی عرفان حاصل کر لے، جو ایسا نہ کر سکے اس سے بڑا بدبخت کوئی نہیں۔

(۲۰) یاد رکھو! خدا کے سوا حقیقی معنی میں کوئی ہستی موجود نہیں ہے۔ ”برہم ستیم جگم مٹھیا“۔ خدا، حق ہے اور یہ کائنات ایک نمود بے بود ہے۔

(۲۱) وہ صرف ایک ہے، اکیلا ہے، یکتا ہے، یگانہ ہے۔ اکیم ستہ دو تینا سکتی۔ اللہ ایک ہے، دوسرا موجود نہیں ہے۔ (لا الہ الا اللہ)۔

(۲۲) دوئی ساری خرابیوں، غلط فہمیوں، جہالت اور نادانی کی جڑ ہے۔

(۲۳) برہمن ہی ساری کائنات کی اصل بنیاد ہے۔

(۲۴) معرفت باری صرف انوبھو (مشاہدے) سے حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ برہم جتناس (معرفت باری تعالیٰ)، دھرم جتناس (علم شریعت) سے بالاتر ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جو عالم شریعت ہے وہ عارف بھی ہو۔ علم کتابوں سے حاصل ہوتا ہے، معرفت عشق سے حاصل ہوتی ہے۔

(۲۵) عرفان حق، نہ کتابوں سے حاصل ہو سکتا ہے نہ عقل سے نہ استدلال سے نہ گفتگو سے نہ مناظرے سے۔ یہ نعت تو صرف عشق سے حاصل ہوتی ہے۔

(۲۶) خدا اپنے آپ کو صرف اپنے عاشقوں پر ظاہر کرتا ہے۔

(۲۷) اطمینان قلب صرف اسے حاصل ہو سکتا ہے جو ایو شور کا جلوہ اپنے اندر دیکھ لے۔

(۲۸) عرفان ذات سے انسان غیر فانی ہو جاتا ہے۔

(۲۹) عرفان، نہ پستکوں سے حاصل ہوتا ہے نہ حواس خمسہ سے۔ یہ نعت تو گرو (مرشد) کے چرنوں میں بیٹھنے سے حاصل ہوتی ہے۔

(۳۰) آزادی چاہتے ہو؟ عرفان الہی حاصل کر لو۔

(۳۱) ابدی اور حقیقی مسرت صرف غیر محدود سے ہم آغوش ہو کر حاصل ہو سکتی ہے۔ کوئی محدود (فانی) چیز آتما (روح) کو شانتی (اطمینان) عطا نہیں کر سکتی۔



(۳۲) فانی سے دل لگانا سب سے بڑی بادانی ہے۔

(۳۳) حقیقی علم وہ ہے جس کے ذریعے سے خدا کو پاسکو۔

(۳۴) گیان اور دھیان کا مقصد یہ ہے کہ خدا سے وصل نصیب ہو جائے۔ یعنی اس کا قرب حاصل

ہو جائے۔ خدا چونکہ ستیہ (حق)، چتہ (ادراک) اور اند (خیر مطلق) ہے اس لیے قدرتی بات ہے کہ جو اس سے وصل ہو جائے اس میں بھی صفات پیدا ہو جائیں۔

(۳۵) جس طرح آگ سے چنگاریاں نکلتی ہیں اسی طرح ایشور سے ارواح کا صدور ہوتا ہے اور انجام

کار یہ ارواح اسی کی طرف لوٹ جاتی ہیں۔

(۳۶) خدا سے ملنے کے آرزو مند ہو؟ خدا کے عاشقوں کی صحبت اختیار کرو۔ اس سے ملنے کا دوسرا طریقہ

نہیں ہے۔

(۳۷) خدا کا گیان صرف وجدان سے حاصل ہو سکتا ہے۔ حواس اور عقل دونوں حقیقتِ رسی سے قاصر ہیں۔

(۳۸) مقصد حیات، دیدار ہے۔ جسے دیدار حاصل نہ ہو سکا اس کا جیون اکارت گیا۔

(۳۹) الحق یا المطلق کو صرف اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ وہ یہ بھی نہیں ہے، یہ بھی نہیں ہے (ناایتی ناایتی

)۔ پھر وہ کیا ہے؟ اس کا بیان لفظوں کے ذریعے سے ناممکن ہے۔ جس طرح گنے کی مٹھاس کی ماہیت اور کیفیت کو

لفظوں سے نہیں سمجھا سکتے اسے کھا کر دیکھ لو۔ اسی طرح خدا کی ماہیت اور کیفیت کو لفظوں سے واضح نہیں کر سکتے۔ خدا

سے مل کر دیکھ لو۔ عرفان ذات، قیل وقال سے بالاتر ہے۔

(۴۰) برہمن (الحق اور المطلق) ایک زندہ حقیقت ہے۔ وہ اپنی شان اطلاق میں نوگن (خالی از صفات

) ہے مگر جب وہ مرقبہ خالق میں نزول کرتا ہے تو سوگن (صاحب صفات) کہلاتا ہے۔ برہمن (واجب الوجود) اور ایشور

(خالق) یہ ایک ہی ذات حق کی دو مختلف شانیں ہیں۔ یعنی جب مطلق اپنی فعلیت کا اظہار کرتا ہے تو اسے ایشور کہتے

ہیں۔

(۴۱) برہمن تو واجب الوجود ہے۔ یہ سنسار ممکن الوجود ہے ممکن کیا ہے؟ وہ ہستی جس میں برہمن کے

تصویرات بالفعل ظاہر ہوں۔

(۴۲) کائنات کو مستقل بالذات یا حقیقی سمجھنا ہی سب سے بڑی نادانی اور سب سے بڑا دھوکا ہے۔ یہ

کائنات خدا سے اسی طرح صادر ہوئی ہے جس طرح شعاعیں آفتاب سے صادر ہوتی ہیں۔

(۴۳) خدا ہر شے میں پوشیدہ ہے اور ہر شے میں جلوہ گر ہے اور ہر شے سے ظاہر ہو رہا ہے۔

(۴۴) اطمینان قلب تین چیزوں سے حاصل ہوتا ہے: اعمال حسنہ، عشق اور مراقبہ

(۴۵) دھرم (مذہب) کی روح کیا ہے؟ اس بات کا انکشاف کہ ایشور میرے اندر جلوہ گر ہے۔

(۴۶) مقصد حیات، برہمن کو پانا ہے یعنی اس سے ذاتی اتصال پیدا کرنا۔ اس کیفیت اتصال کو بذریعہ

الفاظ بیان نہیں کر سکتے۔ واصل ہو کر دیکھ لو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔

(۴۷) ذات مطلق (برہمن) نے جب تخلیق کا ارادہ کیا تو مرتبہ (۱) بطون (اوے یکت) میں نزول کیا۔

اس کے بعد (۲) مہاں آتما (روح) میں اس کے بعد (۳) بدھی (عقل) میں اس کے بعد (۴) من (دماغ) اس کے

بعد (۵) ارتھ (معلوم حواس) اسکے بعد (۶) اندریوں (حواس) میں۔

(۴۸) مرتبہ تنزیہ میں ذات باری، ناقابل فہم و افہام ہے۔ ہاں مرتبہ، تشبیہ میں اسماء و صفات کو اس سے

منسوب کر سکتے ہیں۔ ذات حق، جامع تشبیہ و تنزیہ ہے۔

(۴۹) علم کی دو قسمیں ہیں: (الف) علم استدلالی جو دنیاوی معاملات میں کارآمد ہے۔ یہ علم بقول شیخ

جیوری اور امام غزالی کتابوں اور منطقی قضایا سے حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اس سے روح کی اصلاح نہیں ہو سکتی، (ب) علم

روحانی یا علم الہی جس کی بدولت حق واضح ہو سکتا ہے۔ یہی حقیقی علم ہے اور یہ علم فضل رب پر موقوف ہے۔ یہ فیضان الہی

ہے جو عاشقوں کو حاصل ہوتا ہے اور اس کے حصول کا طریقہ تزکیہ نفس ہے۔ اس کے بعد مراقبہ کیا جاتا ہے۔ انجام کار مکا

شفہ نصیب ہو جاتا ہے۔

(۵۰) اپنشدوں میں بنیادی طور پر عقیدہ توحید (وحدۃ الوجود) کی تشریح کی گئی ہے، یعنی لا موجد الا اللہ جس

کا مطلب یہ ہے کہ حقیقی معنی میں اللہ (ایشور) کے سوا کوئی شے موجود نہیں ہے۔ یہ کائنات اس کا خیال ہے اور اس قادر

مطلق خدا نے اپنی قدرت کاملہ سے اپنے خیال کو خارج میں مشکل کر دیا ہے یعنی یہ کائنات اس کی قدرت کا کرشمہ ہے۔

(۵۱) کائنات کا وجود نہ تو خدا کے وجود کی طرح حقیقی ہے اور نہ عنقائیاں پر یوں کے وجود کی طرح غیر حقیقی بلکہ

اسے وجود حسی حاصل ہو گیا ہے کہ دیکھو تو موجود ہے غور کرو تو اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ جس طرح شعلہ جو الہ کی گردش

سے جو دائرہ پیدا ہو جاتا ہے اس کا وجود محسوس و مشہور تو ہے مگر دراصل اس کی کوئی اصلیت یا حقیقت نہیں ہے۔

(۵۲) حق تعالیٰ متحرک بھی ہے غیر متحرک بھی ہے۔ وہ چلتا بھی ہے ساکن بھی ہے۔ دور بھی ہے قریب بھی

ہے۔ وہ اندر بھی ہے باہر بھی ہے۔

(۵۳) یہ ساری کائنات برہمن ہی سے صادر (ظاہر) ہوئی ہے۔ جو اشیاء مشہود ہیں وہ بھی برہمن سے معمور ہیں اور جو غیر مشہود ہیں وہ بھی۔ مگر وہ اپنی ذات کے اعتبار سے جیسا تھا ویسا ہی ہے۔

## شری شنکرا چاریہ کا فلسفہ ویدانت

تمہید:

واضح ہو کہ اپنشدوں میں رشیوں (عارفوں) نے نہ تو کوئی فلسفیانہ نظام پیش کیا ہے، نہ کسی رشی نے اپنا فلسفہ مدون کیا ہے بلکہ اپنے واردات قلبی اور مشاہدات روحانی بعینہ قلم بند کر دیے ہیں۔ ان ذخائر معرفت میں جو صداقت مشترک ہے وہ یہ ہے کہ:

(۱) برہمن (خدا) ایک ہے اور ہر اعتبار سے ایک ہے۔ نہ کوئی اس کا مد مقابل ہے، نہ شریک ہے، نہ اس کی مثل ہے، نہ اس کا ہمسر ہے۔

(۲) صرف وہی ایک اکیلا برہمن، واجب الوجود ہے اور یہ کائنات ممکن الوجود ہے یعنی اس کا وجود خانہ زاد نہیں ہے بلکہ خدا کے ارادے اور اسی کی مرضی سے ظہور میں آئی ہے اور اسی کے سہارے سے قائم ہے اور ہر آن اپنے قیام کے لیے اسی کو محتاج ہے۔

لیکن خدا اور کائنات کی مزید وضاحت کے سلسلے میں رشیوں نے مختلف نظریات پیش کیے ہیں جن کی بنا پر اپنشدوں اور خصوصاً ”برہمن سوتر“ کے شارحین میں چار گروہ ہو گئے۔

(۱) قائلین عقیدہ ”ہمہ از اوست“۔

(۲) قائلین ”ہمہ با اوست“

(۳) قائلین ”ہمہ اوست“۔ (ممکنات کا وجود ظلی ہے)

(۴) قائلین ”ہمہ اوست“۔ (ممکنات کا وجود وہمی ہے)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذیل میں ان نظریات کی مختصر تشریح درج کر دی جائے۔

(۱) نظریہ ہمہ از اوست میں موجودات (مخلوقات) اعراض نہیں ہیں بلکہ موجود بالعرض ہیں یعنی بذات

خود قائم ہیں بخلاف اعراض کہ وہ بذات خود قائم نہیں ہو سکتے بلکہ اپنے قیام کے لیے ہر آن جوہر کے محتاج ہوتے ہیں۔

موجودات میں وجود حقیقہ پایا جاتا ہے یعنی خدا کی طرح وہ بھی موجود ہیں مگر ان کو وجود، خالقہ زاد نہیں کہتے۔

(۵۳) یہ ساری کائنات برہمن ہی سے صادر (ظاہر) ہوئی ہے۔ جو اشیاء مشہود ہیں وہ بھی برہمن سے معمور ہیں اور جو غیر مشہود ہیں وہ بھی۔ مگر وہ اپنی ذات کے اعتبار سے جیسا تھا ویسا ہی ہے۔

## شری شنکر اچاریہ کا فلسفہ ویدانت

تمہید:

واضح ہو کہ اپنشدوں میں رشیوں (عارفوں) نے نہ تو کوئی فلسفیانہ نظام پیش کیا ہے، نہ کسی رشی نے اپنا فلسفہ مدون کیا ہے بلکہ اپنے واردات قلبی اور مشاہدات روحانی بعینہ قلم بند کر دیے ہیں۔ ان ذخائر معرفت میں جو صداقت مشترک ہے وہ یہ ہے کہ:

(۱) برہمن (خدا) ایک ہے اور ہر اعتبار سے ایک ہے۔ نہ کوئی اس کا مد مقابل ہے، نہ شریک ہے، نہ اس کی مثل ہے، نہ اس کا ہمسر ہے۔

(۲) صرف وہی ایک اکیلا برہمن، واجب الوجود ہے اور یہ کائنات ممکن الوجود ہے یعنی اس کا وجود خانہ زاد نہیں ہے بلکہ خدا کے ارادے اور اسی کی مرضی سے ظہور میں آئی ہے اور اسی کے سہارے سے قائم ہے اور ہر آن اپنے قیام کے لیے اسی کو محتاج ہے۔

لیکن خدا اور کائنات کی مزید وضاحت کے سلسلے میں رشیوں نے مختلف نظریات پیش کیے ہیں جن کی بنا پر اپنشدوں اور خصوصاً ”برہمن سوتر“ کے شارحین میں چار گروہ ہو گئے۔

(۱) قائلین عقیدہ ”ہمہ از اوست“۔

(۲) قائلین ”ہمہ با اوست“

(۳) قائلین ”ہمہ اوست“۔ (ممکنات کا وجود ظلی ہے)

(۴) قائلین ”ہمہ اوست“۔ (ممکنات کا وجود وہمی ہے)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذیل میں ان نظریات کی مختصر تشریح درج کر دی جائے۔

(۱) نظریہ ہمہ از اوست میں موجودات (مخلوقات) اعراض نہیں ہیں بلکہ موجود بالعرض ہیں یعنی بذات

خود قائم ہیں بخلاف اعراض کہ وہ بذات خود قائم نہیں ہو سکتے بلکہ اپنے قیام کے لیے ہر آن جو ہر کے محتاج ہوتے ہیں۔

موجودات میں وجود حقیقتہً پایا جاتا ہے یعنی خدا کی طرح وہ بھی موجود ہیں مگر ان کو وجود، خالق زاد نہیں ہے۔

بلکہ خدائے واجب الوجود کا عطا کردہ ہے۔

تمام موجودات (مخلوقات) حق تعالیٰ سے منفصل ہیں۔ یہ مسلک ہے شری مدہوا چاریہ کا اور مسلمانوں میں متکلمین کا۔

(۲) نظریہ ہمہ از اوست میں ممکنات (مخلوقات) حق تعالیٰ کے ساتھ قائم ہیں۔ بذات خود قائم نہیں ہیں یعنی ممکنات اعراض ہیں اور حق تعالیٰ ان کے لیے بمنزلہ جوہر ہے۔ جیسے سطح نہ ہو تو مثلث یا مربع کا وجود ہی متحقق نہیں ہو سکتا۔ یہ مسلک ہے بہا شکر اور ولہ کا۔

(۳) نظریہ ہمہ اوست (شہودی) میں صرف حق تعالیٰ ہی حقیقی معنوں میں موجود ہے۔ ممکنات کا وجود حقیقی نہیں ہے بلکہ ظلی ہے۔ ہر شے مظہر حق ہے اور حق تعالیٰ مری فی الکل ہے یعنی ہر شے سے وہی ظاہر ہو رہا ہے۔ ہر شے میں اسی کا جلوہ ہے۔

یہ مسلک ہے رام اوج اچاریہ کا اور مسلمانوں میں حضرت اقدس شیخ احمد فاروقی سرہندی نقشبندی المعروف بہ ”مجدد الف ثانی“ کا۔

(۴) نظریہ ہمہ اوست (وجودی) میں صرف حق تعالیٰ ہی حقیقی معنوں میں موجود ہے۔ ممکنات کا وجود وہی ہے مثل دائرہ کہ شعلہ جو الہ کی گردش سرلیج سے پیدا ہو جاتا ہے۔ نظریہ آتا ہے مگر دراصل موجود نہیں ہے۔ دراصل صرف شعلہ موجود ہے۔

یہ مسلک ہے شری شکر اچاریہ کا اور مسلمانوں میں حضرت اقدس امام العرفاء محی الدین ابن عربی المعروف بہ شیخ اکبرؒ کا۔

آئندہ اوراق میں ہم شری شکر اچاریہ کے افکار کا خلاصہ ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

تعارف:

شری شکر اچاریہ کا شمار دنیا کے عظیم حکماء میں ہے۔ انہوں نے صرف ۳۲ سال کی عمر پائی لیکن اس مختصر مدت حیات میں انہوں نے دس ”اپنشدوں“، ”برہم سوتر“ اور شریمد ”بھگوت گیتا“ کی جو شروح لکھیں ان کی بدولت ان کا نام قیامت تک زندہ رہے گا اور توحید کے متوالے ان کی تصانیف سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

جن حکماء نے اپنشدوں کی شرح لکھی ہے ان میں باستینانے شکر حسب ذیل حکماء قابل ذکر ہیں۔

بہا شکر، یادو پرکاش، رامانج، مدہوا چاریہ، شری کٹھ، مبارک، شری پتی، ولہ، وجنان بھکشو اور بلد یو۔

لیکن ان میں سے صرف چار حکماء کے مدارس فکر مقبول ہوئے: (۱) شنکر (۲) رامانج (۳) مدھوا اور (۴) ولجھ۔ اور ان چاروں میں سے قبول عام کی سند صرف شنکر کو حاصل ہوئی۔

اس قبول عام کے علاوہ، مغرب کے بعض حکماء بھی ان کے افکار سے مستفید بلکہ متاثر ہوئے مثلاً اسپنوزا، لائبنز، فچٹے (Fichte)، ہیگل شوین پاور، ہارلنگٹون اور بریڈلے۔ شنکر اور فچٹے کے بنیادی افکار میں اس قدر مماثلت ہے کہ پروفیسر ریوڈ الف اولڈ نے اپنی تصنیف ”تصوف مشرقی اور مغربی“ میں لکھا ہے کہ ”اگر کوئی شخص فچٹے کے افکار کا بغور مطالعہ کرے گا تو اسے یہ محسوس ہوگا کہ اس جرمن مفکر کے قالب میں شنکر کی روح دوبارہ آگئی ہے۔“

نویں صدی عیسوی سے لے کر اس وقت تک ہندوستان میں جتنے ویدانتی گزرے ہیں ان کی اکثریت شنکر کی تبع نظر آتی ہے، اور ہمارے زمانے میں ڈاکٹر رادھا کرشنن۔

شنکر کا فلسفہ ”ادویت ویدانت“ کہلاتا ہے یعنی ویدانت کی وہ تعبیر جس میں دوئی (ثنویت) کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ شنکر نے اپنا فلسفہ، ویدانت پر مبنی کیا ہے اس لیے پہلے ہم ویدانت کے بنیادی اصول درج کرتے ہیں۔

(۱) صرف ایک حقیقۃ علیا ہے جس کا نام برہمن ہے جس سے یہ کائنات صادر ہوئی ہے۔ یہ حقیقۃ، واجب الوجود ہے اور صرف یہی ہستی ”ستی“ (الحق) ہے۔ غیر مخلوق اور غیر مولود اور غیر معلول ہے، ازلی ہے ابدی ہے، محیط گل ہے۔ کوئی شے ایسی نہیں جس کی بنیاد برہمن نہ ہو۔ برہمن سے جدا ہو کر ہر شے معدوم کا مصداق ہو جاتی ہے۔ کوئی شے مستقل بالذات نہیں ہے۔ ہر شے کی حقیقۃ، اصلیت اور واقعیت اضافی اور عارضی ہے۔

(۲) برہمن کے علاوہ جو کچھ ہے وہ است ہے۔ غیر حق ہے ہر شے موجود ہونے سے پہلے معدوم تھی اور کچھ عرصے کے بعد معدوم ہو جائے گی۔ اس لیے جو شے بین العدمین ہو اس کی ہستی محض اضافی اور اعتباری ہے۔ اسی لیے کائنات کو سنسار کہتے ہیں جس کے لغوی معنی ہیں حرکت اور تغیر۔ یعنی یہ کائنات ہر آن متغیر ہے اس لیے اس میں جو کچھ ہے اسے نہ ثبات ہے نہ قرار ہے نہ دوام ہے۔

(۳) برہمن، ست (حق) ہے، چیت (ادراک یا شعور) ہے، اور اند (سعادت) ہے۔

(۴) برہمن محیط کل ہے اور ہر شے کی اصل و بنیاد وہی ہے۔ ہر شے اسی کے سہارے قائم ہے (یعنی وہ القیوم ہے)۔

(۵) برہمن اس کائنات میں جاری و ساری بھی ہے اور اس کائنات سے جدا بھی ہے۔

(۶) برہمن غیر محدود ہے اور ازلی وابدی ہے۔

(۷) برہمن اگرچہ واحد ہے لیکن اس نے اپنی آزاد مرضی سے اپنے آپ کو کائنات کی کثرت میں ظاہر کیا

ہے۔

(۸) انسان کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے آپ کو سکھی بنائے یا دکھی۔ وہ اپنی تقدیر کا خود معمار ہے۔

(۹) برہمن، بدی کا خالق نہیں ہے۔ جب انسان اپنے وجود کے اعلیٰ قوانین سے منحرف ہوتا ہے تو گناہ یا

بدی کا ظہور ہوتا ہے۔

(۱۰) جب تک عرفان حاصل نہ ہو، یعنی جب تک یہ حقیقت انسان پر منکشف نہ ہو کہ میں جسے باہر تلاش

کر رہا تھا وہ میرے اندر پوشیدہ ہے یا انا نے مقید، بلحاظ وجود، عین انا نے مطلق ہے، اس وقت تک اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اس کائنات کو فریب نظر (Illusory) قرار دے کر، اعمال حسہ سے بے نیاز ہو جائے۔ جب تک دوئی کا احساس باقی ہے، سنسار (کائنات) کا خارجی وجود تسلیم کرنا لازمی ہے۔ اور سماجی قانون، اخلاقی، معاشرتی رسوم اور دھرم کے ضابطوں کی پابندی بھی ضروری ہے۔

لیکن تعین کے لحاظ سے اس میں اور مجھ میں غیریت ہے۔ اور اسی غیریت کی بنا پر من و تو یا خدا اور خودی میں امتیاز پیدا ہوتا ہے جسے انہوں نے انا نے مطلق اور انا نے مقید سے ظاہر کیا ہے۔ انا نے مقید کیا ہے؟ وہی انا نے مطلق ہے جو متعین ہو کر مقید ہو گیا ہے۔ کائنات میں ہر شے متعین ہے اس لیے ہر شے غیر خدا ہے۔ خلاصہ کلام اس کے شکر اچار یہ، شیخ اکبر، مرشد رومی اور ان کے مرید اقبال یہ سب حضرات عینیت کے ساتھ ساتھ غیریت کے بھی قائل ہیں۔ چنانچہ اسرار خودی کے آغاز میں انہوں نے عینیت اور غیریت دونوں کا اثبات کیا ہے۔

پیکر ہستی ز آثار خودی است  
 ہرچہ می بینی ز اسرار خودی است  
 صد جہاں پوشیدہ اندر ذات او  
 غیر او پیدا است از اثبات او  
 در جہاں تخم خصومت کا شتہ است  
 خویشتن را غیر خود پنداشتہ است  
 سازد از خود بیگر اغیار را  
 تافزاید لذت پیکار را  
 ساقی نامہ (بال جبریل) میں اس حقیقت کو یوں واضح  
 کیا ہے۔

یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر  
 مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر  
 یہ عالم یہ بت خانہ شش جہات  
 اسی نے تراشا ہے یہ سومات  
 پسند اس کو تکرار کی خونیں  
 کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں  
 من و تو سے ہے انجمن آفریں  
 مگر عین محفل میں خلوت نشین  
 چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے  
 یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے

## دوسری بحث

یہ تو ہوئے ویدانت کے وہ بنیادی اصول جو اپنشدوں کے تمام شارحین کے نزدیک مسلم ہیں۔ اب ہم ذیل میں



یہ واضح کریں گے کہ شری شکر کی رائے میں اپنشدوں کی تعلیم کیا ہے۔

(۱) جو کچھ بھی ہے دراصل ایک ہی ہے کیونکہ دراصل صرف ایک ہی ہستی موجود ہے جسے برہمن یا پریم آتماں کہتے ہیں۔

(۲) یہ وجود، کامل یکسانیت کا حامل ہے۔ اس میں کوئی امتیاز یا اختلاف نہیں ہے۔ یعنی وجود بحت یا وجود خالص ہے جسے دوسرے لفظوں میں شعور یا ادراک یا فکر خالص بھی کہہ سکتے ہیں۔

(۳) ادراک یا عقل یا فکر، برہمن کی صفت نہیں ہے بلکہ اس کا جوہر ذات ہے۔ یعنی برہمن کیا ہے؟ ادراک مطلق ہے۔ برہمن صاحب ادراک نہیں ہے بلکہ خود ادراک ہے، خود فکر ہے۔

(۴) برہمن ذات و صفات سے مرکب نہیں ہے۔ اس میں ترکیب کیسے راہ پاسکتی ہے؟ وہ بسیط ہے یعنی اجزاء سے پاک ہے۔

(۵) لیکن اگر ایک کامل بسیط وجود کے علاوہ اور کسی شے کا وجود نہیں ہے تو یہ دنیا کہاں سے اور کیسے موجود ہوگئی جو ہمیں اپنے چاروں طرف نظر آتی ہے اور جس میں ہم سب رہتے ہیں؟

(۶) اس کا جواب یہ ہے کہ یہ برہمن کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے جو انسانی عقل کی دسترس سے باہر ہے۔ اس قدرت کا اصطلاحی نام ”مایا“ ہے۔

(۷) یہ مایا نہ تو ست (وجود) ہے، کیونکہ وجود تو صرف برہمن کے لئے ثابت ہے، اور نہ است (عدم) ہے کیونکہ مظاہر (کائنات) کا سبب ہے۔ دراصل یہ مایا، مبداء تو ہم (Illusion) ہے۔

(۸) اس لیے کائنات کا وجود نہ تو پریم ارتھک (حقیقی یا وجود خارجی) ہے نہ پرتی بہاشک (وجود ذہنی جس کا مصداق خارج میں موجود نہ ہو) ہے بلکہ ویا وھارک (وجود حسی یا وجود وہمی) ہے یعنی بظاہر مشہود ہے مگر باطن معدوم ہے۔

(۹) مایا کے ذریعے سے برہمن نے اس کائنات کو جو دراصل معدوم ہے، ہمیں موجود کر کے دکھا دیا ہے۔

(۱۰) جب ہم برہمن کی شان تخلیق کا اعتبار کرتے ہیں تو اسی برہمن کو الیہ شور (خالق) کہتے ہیں۔

(۱۱) یہ کائنات نہ تو موجود ہے نہ معدوم ہے بلکہ متھ (موہوم) ہے چنانچہ شکر کہتا ”برہمن ستیم جگم متھیا“ برہمن موجود ہے اور یہ کائنات موہوم ہے۔

(۱۲) متھ کا مطلب یہ ہے کہ یہ کائنات قائم بالذات نہیں ہے بلکہ برہمن کے سہارے سے قائم ہے۔ جس طرح دائرہ آتشیں ہمیں اس لیے مشہود نہیں ہوتا کہ وہ قائم بذات خود ہے بلکہ اس کا وجود، شعلہ، جوالہ کو گردش دینے والے پر موقوف ہے۔ اگر وہ گردش دست کو ایک لمحے کے لئے بھی روک لے تو دائرہ نامعدوم ہو جائے گا۔

(۱۳) جس طرح دائرے کا وجود صرف مرتبہ وہم میں ہے اسی طرح کائنات کو وجود حسی یا وہمی یا مرتبہ، وہم ہی میں ملتا ہے۔

(۱۴) ویدانت میں حلول یا اتحاد کی تعلیم نہیں دی گئی ہے بلکہ ادویت (نفی دوئی) کی تعلیم دی گئی ہے۔

(۱۵) ویدانت (اپنشدوں) کی رو سے خدا ہر شے میں جلوہ گر ہے ہر شے سے ظاہر ہو رہا ہے مگر کوئی شے خدا نہیں ہے۔

(۱۶) برہما ہر جگہ ہے، ہر شے میں ہے۔ جہاں وہ نہیں وہاں کچھ نہیں ہے۔ کوئی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کائنات مظہر ذات ہے بذات خود موجود نہیں ہے۔

(۱۷) آتما کو فنا کرنے کو مطلب فنائے ذات نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب ہے آتما میں ایسا انقلاب پیدا کرنا کہ جیو آتما ساری کائنات کو اپنی آغوش میں لے لے۔

اھم ورتی (فنائے نفس) کا مطلب ہے کہ نفس امارہ کو نفس مطمئنہ میں تبدیل کرنا۔ یعنی آتما یا نفس کو اتنا بلند کرنا کہ وہ پریم آتما سے ہم آہنگ ہو جائے اور پھر یہ ساری کائنات قدموں میں آجائے۔ شری شکر فرماتے ہیں کہ جب نفس پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ خدا کے سوا اس کائنات میں کسی کا وجود نہیں ہے تو آتما تمام خواہشات سے پاک ہو جاتی ہے۔ اس کی نظر میں کوئی مادی شے اس لائق ہی نہیں رہتی کہ اس کی آرزو کی جائے۔ ایثار کی گیتائی کا کشاف اھم ورتی (خود پرستی) کو فنا کر دیتا ہے۔

(۱۸) اودیما کا مطلب جہالت نہیں ہے بلکہ وہ علم ہے جو استدلال سے حاصل ہوتا ہے اور یہ علم اودنی درجے کا علم ہے۔ اس کے ذریعے سے خدا تک نہیں پہنچ سکتے۔ ودیا یعنی حقیقی علم مراقبے سے حاصل ہوتا ہے، یعنی آفاق کے بجائے نفس میں غور کرنا۔ ہر وہ علم جو خدا تک نہ پہنچا سکے، اودیا (جہالت) ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ علم بالحواس، اودیا ہے۔ مشاہدہ باطن، ودیا ہے۔ جب انسان مراقبہ (دھیان) کرتا ہے تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ ہر شے میں الواحد جلوہ گر ہے۔ یہی حقیقی علم ہے۔ جب تک ہم کثرت کو حقیقی سمجھتے رہیں گے، جہالت (اودیا) میں گرفتار رہیں گے

## شرح اپنشد (ویدانت) بزبان شکر

### شکر اچاریہ کے فلسفے کی اہمیت:

شری شکر اچاریہ کی ادویت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بڑی مفکرانہ جرات اور منطقی ذکاوت پائی جاتی ہے۔ اس نے اپنے نظام فکر کی تدوین میں جس بلند پایہ عقلیت اور بے پناہ منطق اور حریت فکر کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی بناء پر، اس کا پیش کردہ نظام، دنیائے عقل میں نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر تھی باٹ (Thibaut) جیسے فاضل روزگار نے اس کے فلسفے پر حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے ”شکر کا فلسفہ، خالص فلسفیانہ زاویہ نگاہ سے ہندوستان کے بہترین مدارس فکر میں شمار کیا جاتا ہے۔ جرات اظہار، دقت نظر اور منطقی موشگافیوں کے اعتبار سے ویدانت کا کوئی مکتب فکر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ایلیٹ (Eliot) لکھتا ہے کہ: ہم آہنگی، کاملیت اور گہرائی کے لحاظ سے شکر کا فلسفہ، تمام ہندی مدارس فکر کا سر تاج ہے۔“

شکر کے فلسفے کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد، ایک طالب حق خواہ اس سے متفق ہو یا نہ ہو، اس بات کا اعتراف ضرور کرے گا کہ منطقی موشگافیوں اور فلسفیانہ نکتہ سنجیوں کے اعتبار سے ہندوستان کوئی نظام فکر، شکر کے پیش کردہ نظام کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بخوف طوالت، تفصیل سے قطع نظر کر کے، ذیل میں اس کے نظام فکر کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

### ۱۔ برہمن

برہمن کی منطقی تعریف نہیں ہو سکتی ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ (برہمن) نہ یہ ہے، نہ وہ ہے۔ عقل اس کی کنہ کو نہیں پاسکتی۔ وہ ایک ہے وہ وجود مطلق ہے وجود ازلی وابدی ہے، واجب ہے، قائم بالذات ہے، وہ لائانی ہے، یکتا ہے، مستقل ہے، متجانس ہے، اضافات و تعینات کی بناء پر یہ وجود مطلق، اشکال مختلفہ میں ظاہر ہوتا ہے اشیاء کائنات اسی وجود کے مظاہر ہیں۔

حقیقت اقصیٰ وجود اور ادراک ہے حقیقت اقصیٰ اگرچہ عالم اور معلوم کے امتیاز سے ماوراء ہے تاہم وہ ہمارے لیے بالکل مجہول نہیں ہے کیونکہ وہ ہماری خودی کی عین ہے جب ہم برہمن کا ذکر بحیثیت برہمن کرتے ہیں تو اسے زگن (بغیر صفات برہمن کہتے ہیں)

### کائنات کی حیثیت:

شکر کی رائے میں یہ کائنات حقیقی نہیں ہے لیکن وہ معدوم بھی نہیں ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ:

(۱) یہ کائنات ست (حقیقی) اس لیے نہیں کہ صرف ”برہمن ست (حقیقی) ہے۔ اس کے سوا کوئی

واجب بالذات نہیں ہے۔

(۲) یہ کائنات است (معدوم) اس لیے نہیں کہ وہ مشہود و محسوس ہے۔ عدم کو نمود حاصل نہیں ہو سکتا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کائنات محسوس تو ہے مگر درحقیقت موجود نہیں ہے اس کا وجود حقیقی نہیں ہے بلکہ حسی ہے یا

وہمی ہے۔

اس بات کو واضح کرنے کے لیے شکر نے وجود کی حسب ذیل اقسام بیان کی ہیں۔

(الف) پرمارتھک یا وجود حقیقی یا ست (Real) جیسے برہمن جو خالص ست ہے۔

(ب) ویا و بارک یا وجود حسی یا وہمی واقعی (Phenomenal) جیسے سنسار یا کائنات جو نہ ست

ہے نہ است بلکہ متھ ہے۔

(ج) برق بھاشک یا وجود ذہنی (Illusory) جیسے وہ صورتیں جو خواب میں نظر آتی ہیں۔ یہ بھی متھ ہیں۔

(د) است یا معدوم وہمی اختراعی (Unreal) جیسے بانجھ عورت کا بیٹا، کوہ قاف کی پری یا عنقا۔

یہ کائنات نہ تو ست (موجود) ہے نہ است (معدوم) ہے بلکہ متھ ہے یعنی موہوم (فریب نظر) ہے۔ اسی کو

”نمود بے بوڈ“ بھی کہتے ہیں۔ دیکھو تو نظر آتی ہے مگر غور کرو تو اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر بظاہر موجود ہے

باطن معدوم ہے۔

شکر نے فریب نظر کی دو مثالیں دی ہیں۔

(۱) ایک شخص نے اندھیرے میں کچھ دیکھا، اس لیے تحقیق نہ کر سکا کہ کیا ہے۔ گمان کیا کہ سانپ ہے

لیکن جب روشنی ساتھ لے کر پاس جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ دراصل رسی ہے جسے سانپ سمجھ لیا تھا۔

بالفاظ دیگر، سانپ معدوم ہے مگر اشتباہ نظر کی بنا پر رسی کو سانپ یقین کر لیا۔ اس کائنات کا حال بھی ایسا ہی

ہے۔ دراصل ظاہر تو ایسا شور مچا رہا ہے لیکن ہم اس کی تجلی یا اس کے ظہور کو کائنات سمجھ رہے ہیں یعنی جسے ہم کائنات کہتے

ہیں یہ دراصل جلوہ ذات ہے۔

(۲) ایک شخص سبز یا سرخ رنگ کی عینک لگا کر سفید گھونگھے کو دیکھتا ہے تو وہ اسے سبز یا سرخ نظر آتا ہے

لیکن جب وہ عینک اتار کر دیکھتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل وہ گھونگھا سفید ہے۔ اس کی سبزی یا سرخی محض فریب

نظر تھی۔

پہلی مثال میں سانپ معدوم ہے۔ دھوکے سے رسی کو سانپ سمجھ لیا تھا۔ اس دوسری مثال میں گھونگھا موجود ہے۔ صرف اس کی رنگت میں دھوکا لگ گیا۔ اگر عینک سبز یا سرخ نہ ہوتی تو ہم اس گھونگھے کو سبز یا سرخ نہ سمجھتے۔ یہی آتما کی مثال ہے، یعنی آتما (خودی) کائنات کی طرح فریب نظر یا دھوکا نہیں ہے بلکہ خود برہمن (خدا) ہی ہے جو ہم کو بشل آتما (خودی) نظر آ رہا ہے۔ یعنی تم جسے آتما سمجھ رہے ہو وہ دراصل پر م آتما (خدا) ہے جو تعین (اپادہی) کی وجہ سے آتما نظر آ رہی ہے۔ اگر تعین کا پردہ ہٹا دیا جائے (عینک اتار دی جائے) تو پر م آتما (خدا) نظر آنے لگے گا۔

جس طرح گھونگھا دراصل سفید ہے، ہم نے عینک کی وجہ سے اسے سبز یا سرخ سمجھ لیا اسی طرح دراصل خدا واقعی موجود ہے مگر ہم نے تعین سے دھوکا کھا کر اسے خودی سمجھ لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ لیلیٰ کے لباس میں خود خدا ظاہر ہو رہا ہے۔ حیو آتما یا خودی، کائنات کی طرح فریب نظر نہیں ہے بلکہ حق ہے۔ وہ دراصل برہمن (خدا) ہی ہے جو اپادی (تعین) کی وجہ سے بشل خودی ظاہر ہو رہا ہے۔

حیو آتما (خودی) سنسار (کائنات) کی طرح متھ یا فریب نظر نہیں ہے۔ اگر آتما بھی سنسار کی طرح غیر حقیقی یا موہوم یا فریب نظر ہوتی تو مکتی (نجات) کس کی ہوتی؟ اس صورت میں تو اپنشدوں کی ساری تعلیم ہی مہمل اور باطل ہو جاتی۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ ”انا“ باطل نہیں ہے بلکہ حق ہے۔

انسانوں نے اپنی اودیا (جہالت) کی وجہ سے اس انا کو، جو دراصل حق (خدا) ہے، غیر حق سمجھ رکھا ہے، جس طرح سفید گھونگھے کو سرخ سمجھ لیا۔ شکر کا اپدیش (پیغام) یہ ہے کہ انسان کا فرض اس اودیا (جہالت) سے باہر نکلنا ہے۔ جب انسان پر حقیقت منکشف ہوتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ آتما اور پر م آتما میں کوئی بھید (فرق) نہیں ہے۔ یعنی خودی غیر حق نہیں ہے؟ وہ حق ہی ہے جو مقید یا متعین ہو جانے کی وجہ سے غیر حق نظر آتا ہے۔

اگر انسان گیان (عرفان) اور دھیان (مراقبہ) اور سادھی (استغراق تام) سے کام لے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ میں وہ ہوں۔ چنانچہ اپنشدوں کے مصنفین یعنی مہارشیوں (عرفاء) نے صاف لفظوں میں یہ نوید سنائی ہے ”تت تو م اسی“ یعنی تو وہ ہے۔

شری شکر فرماتے ہیں کہ دوسرا تو موجود ہی نہیں ہے۔ وجود حقیقی تو صرف برہمن (اللہ) میں منحصر ہے۔ ”ایکم

ادویم، اس لیے وہی ذات واحد لاشریک، ہر شخص میں جلوہ گر ہے۔ برہم (خدا) ست (حق) ہے جگ (عالم) متھ (باطل) ہے اور آتما اور پر آتما میں کوئی بھید (فرق) نہیں ہے۔  
قصہ مختصر شکر کی تعلیم یہ ہے۔

(۱) برہم (خدا) ہی حقیقت اقصیٰ ہے، وہی واجب الوجود ہے۔ اس کے سوا کوئی حقیقی معنی میں موجود نہیں۔

(ب) وہی خدائے واحد اس سنسار (عالم) کے مشہود ہونے کا سبب ہے۔ یہ سنسار اس کی مایا (قدرت تخلیق) کا کرشمہ ہے۔ وہ اپنی مایا کے ذریعے سے نیست کو ہست کر کے دکھا رہا ہے۔ ”جیسے نقطہ“ آتشیں کو گردش دو تو دائرہ نظر آتا ہے۔ دراصل نقطہ موجود ہے مگر ہمیں دائرہ نظر آتا ہے۔ اسی طرح دراصل خدا موجود ہے، مگر ہمیں سنسار نظر آتا ہے۔ ہم اپنے ہاتھ کی گردش روک دیں دائرہ غائب ہو جائے گا۔ اسی طرح خدا اپنی مایا (تخلیق قدرت) روک لے، یہ عالم غائب ہو جائیگا۔

(ج) وہی خدائے واحد، موجود حقیقی، بشکل خودی ظاہر ہو رہا ہے۔ تعین کی وجہ سے ہم خدا کو خودی سمجھ رہے ہیں۔ جیسے غلط بنی کی بنا پر کسی سفید چیز کو سرخ سمجھ لیں۔

(۲) عالم، حق نہیں ہے بلکہ متھ (فریب نظر) ہے۔

(۳) خودی عین حق ہے یعنی خدا ہے جو متعین ہو جانے کی وجہ سے بشکل خودی، نظر آ رہا ہے۔ جس طرح بحر متعین ہو جانے کی وجہ سے موج نظر آتا ہے۔

شری شکر نے رسی اور سانپ کی مثال اس لیے دی کہ وہ یہ ثابت کر سکیں کہ کائنات اپنی ہستی یعنی اپنے وجود حسی کے لئے خدا کی محتاج ہے۔ لیکن خدا اپنی ہستی کے لئے کائنات کا محتاج نہیں ہے۔ اگر خدا نہ ہوتا تو یہ کائنات بھی نہ ہوتی۔ لیکن اگر کائنات فنا ہو جائے تو خدا بدستور باقی رہے گا۔

برہمن نہ ہوتا تو دنیا نہ ہوتی

جو دنیا نہ ہو تو برہمن رہے گا

یہ رابطہ یک طرفہ ہے۔ کائنات تو خدا کی محتاج ہے مگر خدا کائنات کا محتاج نہیں ہے۔

اس مسلک کو ”ویورت واد“ کہتے ہیں۔ ویورت کا مطلب ہے محض شہود جسے انگریزی زبان

میں Appearance کہتے ہیں جس کا مطلب ہے ظہور یا بروز۔ گویا سنسار ایٹور کو ظہور ہے۔ اسی کے مقابل خودی

(آتما) ایثور کی ایک شان یا تغیر یا تجدید ہے جسے انگریزی میں Modification کہتے ہیں۔

برہمن، کائنات کی اساس (Ground) ہے مگر کائنات سے وراء الراء ہے۔ کائنات میں ہر دم تغیر ہوتا رہتا ہے مگر برہمن غیر کائنات ہے، وراء الکا کائنات ہے اس لیے وہ اس تغیر سے متاثر نہیں ہوتا۔  
برہمن اس کائنات کی علت (Cause) نہیں ہے۔ علت و معلول کا سلسلہ بقول شکر، اس اقلیم مادی میں کارفرما ہے۔ برہمن کی ذات عالم مادی اور اس کے قوانین سے بالاتر ہے۔

ہم برہمن کو مجازاً علتہ کائنات کہہ سکتے ہیں مگر درحقیقت اسے علت نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ علت و معلول کے مقولے سے بالاتر ہے۔ اس کائنات کو خواب سے بھی تعبیر نہیں کر سکتے کیونکہ خواب میں کوئی نظم، اور ترتیب نہیں ہوتی لیکن اس کائنات میں نظم و ترتیب پائی جاتی ہے۔

مایا:

ہم نے اوپر بیان کیا کہ یہ سنسار (عالم) ایثور کی مایا ہے۔ اس لیے مایا کی وضاحت لازمی ہے۔ اسے شرعی شکر ہی کے الفاظ میں کہتے ہیں۔

”مایا، برہمن کی وہ شکستہ ہے جس کی بدولت اس دنیا کا ظہور ہوا۔ یہ مایا نہ ست ہے نہ است ہے تو پھر ہے کیا؟ ہم اس راز کو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ راز ”انرواچدیہ“ یعنی ناقابل بیان ہے۔

برہمن تو مادیات سے بالاتر ہے مگر یہ اس کی مایا کا کرشمہ ہے کہ ایک شے جو دراصل معدوم ہے ہمیں موجود نظر آتی ہے۔ چونکہ یہ کائنات حواس خمسہ سے محسوس ہوتی ہے اس لیے ہم اسے معدوم نہیں کہہ سکتے لیکن غور و فکر کرنے سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ دراصل معدوم ہے۔

اسی طرح مایا بھی نہ موجود ہے نہ معدوم ہے۔ یہ مایا اس وہمی واقعی دنیا کی علت ہے۔ یہ دنیا وہمی واقعی ہے۔ ہمیں نظر آتی ہے اسی لیے واقعی ہے۔ وہمی اختراعی نہیں ہے یعنی ہمارے ذہن یا تخیل کی اختراع نہیں ہے۔

ماہرین ویدانت نے یہ لکھا ہے کہ مایا کی تین شانیں ہیں:

(الف) اپنشدوں کی تعلیمات کی رو سے وہ غیر حقیقی ہے۔

(ب) اپنی ماہیت کے لحاظ سے ناقابل تشریح ہے۔

(ج) لیکن عملی (ویاویارک) زاویہ نظر سے بلاشبہ وہ ایسی شے ہے جو ہست کا مصداق ہے۔

بالفاظ دیگر یہ کائنات بھی جو مایا کی فعلیت کا کرشمہ ہے، عملی زاویہ نظر سے ہست یا موجود ہے۔

شری شکر نے اپنی قابل قدر تصنیف ”ویو یک چدامانی“ میں لکھا ہے کہ مایا، خدائے برترین، کی برترین طاقت ہے جس کا وقوف صرف عقلمندوں کو ہو سکتا ہے۔

علمائے ویدانت نے اس لفظ کو، شکر کے فلسفے کی تشریح میں مختلف معانی میں استعمال کیا ہے۔ ایک معنی یہ ہے کہ کوئی انسان ربط حادث بالقدیم کے مسئلے کو حل نہیں کر سکتا۔ نہ سائنسدان، نہ فلسفی، نہ منطقی، نہ متکلم، نہ پیر۔

وہ سوال آسان لفظوں میں یہ ہے کہ حقیقت اقصیٰ یا خدا کا جو واجب اور قدیم اور واحد ہے، اس کائنات خلقت سے کیا تعلق یا رابطہ یا سمبندھ ہے جو غیر حقیقی ہے، ممکن ہے، حادث اور کثیر ہے؟

شکر اور ان کے شارحین و تبعین متفق اللسان ہیں کہ ہم ہرگز اس ربط کو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ تو انسانی طاقت سے باہر ہے۔ کوئی شخص نہیں بتا سکتا کہ یہ دنیا خدا سے کیسے ظاہر ہوئی۔

چونکہ خدا اور کائنات میں یکسر بتائیں اور مخالف بلکہ تضاد کی نسبت ہے، اس لیے اس سلسلے میں انسان کی تمام عقلی کاوشیں بے کار ہیں۔ ہم عقل انسان کی عاجزی اور بے چارگی کو ”مایا“ سے تعبیر کرتے ہیں۔

یہ کائنات کیا ہے؟ اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ ایشور کی ”مایا“ ہے۔ یعنی اسکی ابتدا، اس کی انتہا، اس کی ماہیت، اس کی نوعیت، اس کا ظہور، اس کا فروغ، اس کا حسن و جمال، اور اس کی بے ثباتی۔ یہ سب باتیں فہم انسانی سے بالاتر ہیں۔ یا یوں کہہ دو کہ خود کائنات مایا ہے۔

دوسرا معنی یہ ہے کہ مایا، ایشور کی قدرت ہے جس کی وساطت سے وہ ہر شے سے ظاہر ہو رہا ہے۔ تیسرا معنی یہ ہے کہ مایا ”او یکت پر کرتی“ (صور علمیہ یا اعیان ثابتہ) کے مجموعے کا نام ہے جس سے ہستی یا کائنات بست و بود کا صدور یا ظہور ہوتا ہے۔

جیو آتما (خودی) مظہر ذات باری ہے۔ خودی اور خدا میں کیا ربط ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح خدا اور کائنات کا ربط باہمی فہم انسانی سے بالاتر ہے اسی طرح ہم منطقی انداز سے اس ربط کو بھی بیان نہیں کر سکتے جو خدا اور خودی میں پایا جاتا ہے۔

عرفان کا طریقہ منطقی استدلال نہیں ہے اگر عرفان ذات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اودیا کے طلسم کو باطل کرنا ہوگا جس کو وجہ سے ہم اپنے آپ کو غیر حق سمجھتے ہیں۔

مایا کے کارن (سبب) یہ سنسار جو دراصل نیست ہے ہمیں ہست معلوم ہوتا ہے۔

اودیا کے کارن، جیو آتما جو دراصل پر م آتما ہے، ہمیں غیر حق (غیر خدا) معلوم ہوتا ہے۔



مایا کا ابطال ہمارے بس میں نہیں ہے کیونکہ یہ لیا خود ایشور نے رچائی ہے اور کوئی شخص اس (ایشور) سے یہ نہیں پوچھ سکتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ اس کی مرضی ہمارے ہر سوال کا جواب ہے۔ وہ قادر مطلق ہے۔ جو چاہے کرے اسے کون ٹوک سکتا ہے؟

لیکن اودیا کا زائل کر دینا، یہ ہمارے بس میں ہے۔ اور جب ایک شخص اس طلسم (جہالت) کو باطل کر دیتا ہے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ انائے مقید اور انائے مطلق میں بلحاظ وجود عینیت ہے۔ یاں بلحاظ تعین غیریت ہے۔

اودیا کی وجہ سے ہم اپنے آپ کو غیر حق سمجھتے ہیں۔ اس اودیا کو مٹا دو۔ خالص برہمن رہ جائے گا۔ جس طرح جب مایا کا کھیل ختم ہو جائے گا تو خالص برہمن رہ جائے گا۔ جس طرح برہمن سے مایا مربوط ہوئی تو ایشور جلوہ گر ہو گیا، اسی طرح برہمن سے اویا مربوط ہوئی تو آتما جلوہ گر ہو گئی۔

انائے مقید دراصل انائے مطلق ہے۔ غیریت کا احساس اویا سے پیدا ہوا۔ لہذا مقصد حیات، عرفان (گیان) ہے، یعنی اس بات کا یقین حاصل کرنا کہ آتما اور پرما تم میں کوئی بھی نہیں ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے سورج گرہن کے وقت ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ سورج کو گرہن لگ رہا ہے حالانکہ یہ محض فریب نظر ہے۔ سورج میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ سارا فتور ہماری غلط بینی کا ہے۔ اور یہ غلط بینی ہماری غلط وضع سے پیدا ہوئی یعنی ہم ایسی جگہ بیٹھے ہیں کہ ہمارے اور سورج کے درمیان چاند کا پردہ حائل ہو گیا۔ جب چاند ہمارے اور سورج کے درمیان سے ہٹ جاتا ہے تو سورج ہمیں ویسا ہی نظر آنے لگتا ہے جیسا کہ وہ دراصل ہے۔

اسی طرح اگر ہمارے یعنی انائے مقید (خودی) اور انائے مطلق کے درمیان اودیا (جہالت) کا پردہ حائل ہو گیا ہے اس کو ہٹا دو تو صاف نظر آنے لگے گا کہ انائے مقید دراصل انائے مطلق ہے۔ (۲۲۲)

## شریمد بھگوت گیتا میں تصوف

### گیتا کی روح:

جن لوگوں نے گیتا کا عمیق مطالعہ کیا ہے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ گیتا کی روح یہ ہے کہ:

(۱) اس فانی دنیا کی دلچسپیوں اور لذتوں سے قطع نظر کر کے پر م آتما (خدا) سے لو لگاؤ اور صرف اسی کو اپنا

محبوب بناؤ۔ عمل صالح ضرور کرو مگر نیت یہ رکھو کہ دوسروں کو فائدہ پہنچانا میرا پر م دھرم ہے۔ کسی شخص سے اپنی نکوکاری کے صلے یا معاوضے کی توقع نہ رکھو۔ اسے شکام کرم (عمل بے غرض) کہتے ہیں۔

- (۲) خدا تک پہنچنے کے مختلف راستے ہیں لہذا کسی کو دوسروں پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔ اصل چیز محبت الہی ہے۔ جو شخص خدا کا سچا طالب ہے وہ کسی کو برا نہیں کہہ سکتا۔ سب کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتا ہے۔
- (۳) خدا کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہر اس انسان کا فرض ہے جو اس سے ملنا چاہتا ہے۔ اسے اصطلاح میں ”شرنا گئی“ کہتے ہیں۔
- (۴) خدا ہر شے میں پوشیدہ ہے اور ہر شے سے ظاہر ہے۔

### پر م آتما:

- گیتا یہ تعلیم دیتی ہے کہ اس کائنات میں کوئی شے حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے۔ جو کچھ ہے یہ سب ایک خدا کی جلوہ گری ہے یعنی گیتا میں وحدۃ الوجود کی تعلیم دی گئی ہے۔
- اس کائنات میں جو کچھ نظر آ رہا ہے یہ سب خدا ہی کا ظہور ہے۔ ہر شے مظہر ذات و صفات ہے مثلاً سورج میں وہی چمک رہا ہے، پھولوں میں وہی مہک دیا ہے، الغرض جس طرف دیکھو وہی نظر آ رہا ہے۔
- (۱) ”سورج کی چمک دمک میرا ہی نور ہے۔ چاند میں چاندنی میں ہی ہوں۔ آگ میں گرمی اور روشنی میرے ہی دم سے ہے۔“
- (۲) ”میں کائنات کی ہر شے کو سہارا دیتا ہوں اور یہ کائنات میرے ہی دم سے قائم ہے اور میں ہی پودوں کو زندہ رکھتا ہوں۔“
- (۳) ”میں سب کے دلوں میں پوشیدہ ہوں۔ انسانوں میں قوت حافظہ اور قوت ادراک مجھ ہی سے ہے۔“
- (۴) مٹی، پانی، آگ، ہوا، آکاش، من، بدھی اور خودی ان آٹھوں چیزوں سے میں ہی ظاہر ہو رہا ہوں۔ یہ میری ہی ذات کی تقسیم ہشت گانہ ہے۔ یعنی یہ آٹھوں میری ذات کے وہ مظاہر ہیں جن سے میں ظاہر ہو رہا ہوں۔“
- (۵) ”یہ تو میری ادنیٰ فطرت کے مظاہر ہیں لیکن میری ایک فطرت اعلیٰ بھی ہے اور جو آتما اسی کا مظہر ہے۔“
- (۶) تمام موجودات کی اصل، میری فطرت کے یہی دوا دنی اور اعلیٰ پہلو ہیں۔ میں ہی اصل کائنات ہوں۔ آغاز عالم بھی مجھی سے ہے اور اس کا انجام بھی مجھی میں ہے۔“
- (۷) ”اے ارجن! خوب سمجھ لے! میرے سوا کسی کا وجود حقیقی یا اصل نہیں ہے۔ جس قدر موجودات نظر

آتے ہیں یہ سب مجھ سے کم تر ہیں اور میں تمام مخلوقات کو قائم رکھے ہوئے ہوں۔ جیسے تاگا موتیوں کو ایک لڑی میں قائم رکھنا ہے۔ میں قیوم عالم ہوں۔“

(۸) ”اے ارجن! میں ہی پانیوں میں رس (ذائقہ) ہوں۔ چاند سورج میں نور ہوں۔ میں ہی ویدوں میں اوم ہوں۔ میں ہی فضائے کائنات میں آواز ہوں۔ میں ہی مردوں میں مردی ہوں۔“

(۹) ”میں ہی مٹی میں خوشبو ہوں۔ میں ہی آگ میں روشنی ہوں اور گرمی ہوں۔ ہر ہست میں زندگی ہوں اور زہدوں میں زہد ہوں۔“

(۱۰) ”نجم مان سر و بھوتا نم۔ بدھیں بدھی ماتم اسمی۔ تجس تجس و نام اہم۔“

(۱۱) ”اے ارجن! میں ہی تمام موجودات کا ازلی بیج (اصل کائنات) ہوں۔ میں ہی صاحبانِ ادراک میں ادراک (بدھی) ہوں اور میں ہی تابدار آشیاء کی تابش ہوں۔“

(۱۲) میں ہی طاقت وروں میں طاقت ہوں، مگر حرص و ہوا سے پاس ہوں۔ میں ہی انسانوں میں ایسی خواہش یا آرزو ہوں جو دھرم کے خلاف نہ ہو۔

(۱۳) موجودات کی جتنی حالتیں ہیں (اور وہ تین ہیں) خواہ ست گن (نیکی یا اطمینان یا اعتدال) کی حالت ہو یا رجس (جذبات) کی یا تمس (سستی کا بلی، برائی) کی ان سب حالتوں کا مبداء میری ہی ذات ہے مگر میں ان صفات سے بالاتر ہوں۔ یہ مجھ سے ضرور ہیں مگر میں ان میں سے متاثر نہیں ہوں۔

(۱۴) فطرت کے ان تین گنوں (پہلوؤں) سے دھوکا کھا کر لوگ مجھ سے غافل ہو جاتے ہیں۔ میں ان مادی صفات سے بالاتر ہوں اور غیر قابلِ فنا ہوں، لازوال ہوں۔

(۱۵) اے ارجن! خدا کی ذات ازلی اور ابدی ہے۔ نہ اس کی ابتدا ہے نہ انتہا اور وہ ست اور است دونوں مقولوں سے بالاتر ہے۔ اسی کا چہرہ چاروں طرف ہے۔ اسی کے ہاتھ پاؤں چاروں طرف ہیں۔ اس کے کان، اس کی آنکھیں ہر طرف ہیں وہ سارے عالم کو محیط ہے۔

(۱۶) مجھی سے سارے دیوتاؤں اور ریشیوں کی ہستی ہوئی ہے مجھی سے ہر شخص کو وجود ملا ہے۔

(۱۷) جو مجھے پہچان لیتا ہے، دھوکے اور بدی سے پاک ہو جاتا ہے۔ یعنی نہ وہ دھوکا کھا سکتا ہے اور نہ ہی بدی کر سکتا ہے۔

(۱۸) فہم، علم، معرفت، عفو، صبر، صداقت، ضبط نفس، اطمینان، راحت و رنج، لذت و الم، ہستی اور

نیستی، شجاعت اور خوف، قناعت اور زہد، تسلیم و رضا، (سنتوش) شہرت اور بدنامی یہ تمام بہاؤ (خواص) مجبھی سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کا مبداء میری ہی ذات ہے۔

(۱۸) ہے ارجن! میرے وبھوتوں (صفات) کی کوئی حد نہیں ہے۔ میں ہی ہر انسان کے اندر آتا ہوں۔

میں ہی سب پرانیوں (جان داروں) کی پران (روح) ہوں۔ میں ہی سب جانداروں کا اول، درمیان اور آخر ہوں۔

(۱۹) میں ہی وشنو میں ہوں، میں ہی سورج میں ہوں، میں ہی اندر میں ہوں، میں ہی من ہوں، میں ہی

انسانوں میں شعور ہوں، میں ہی سام وید ہوں، شکر میں ہوں، اگنی میں ہوں، میر و پر بت میں ہوں، سمندر میں ہوں،

میں زمان و مکان میں ہوں، میں پھولوں کی بہار ہوں، میں صداقت ہوں، میں دانائی ہوں، میں قوت و جلال ہوں، مجھی

سے یہ سارا جہاں معمور ہے، میرے ظہور کی کوئی انتہا نہیں ہے، میں قیوم کائنات ہوں۔ (۲۰) فاعل حقیقی

خدا ہی ہے۔ اگر تم اپنے آپ کو فاعل مختار سمجھنے ہو تو تم جہالت میں مبتلا ہو۔ ایسا سمجھنا تکبر کی نشانی ہے۔

(۲۱) انسان کو لازم ہے کہ اپنی زندگی خدا کے لئے بسر کرے۔

(۲۲) آتما (روح) قائم، دائم، لازوال ہے۔ حوادث سے متغیر نہیں ہوتی اور نہ اسے موت آتی ہے۔

(۲۳) سب راستے خدا تک پہنچا سکتے ہیں۔

(۲۴) انسان جس شے کو اپنا مقصود بنائے گا اسے حاصل کرنے گا۔ جو خدا کو اپنا مقصود بنائے گا وہ اے ضرور

پائے گا،

(۲۵) خدا سے محبت کے لئے کسی ذات کی قید نہیں ہے۔

(۲۶) جو اس لکتے کو سمجھ لیتا ہے کہ کثرت کا ظہور، وحدت سے ہوا ہے وہ انجام کار حق سے واصل ہو جاتا

ہے۔

(۲۷) عارف وہ ہے جس کی نظر میں سب یکساں ہوں، عارف وہ ہے جو دوسروں کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھے، جو

ہر دم اس کی یاد کرے۔

(۲۸) عارف کو اطمینان قلب حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی کو وصال کہتے ہیں۔

(۲۹) عرفان، دل کے توازن کا نام ہے۔

(۳۰) گیتا کی تعلیم یہ ہے کہ جب کوئی شخص یوگ (تصوف) اختیار کر کے تمام شرائط کی پابندی کرتا ہے یعنی

تزکیہ نفس کر لیتا ہے تو اسے خدا کا دیدار نصیب ہوتا ہے۔ اس کیفیت کو گیتا نے ”برہم استھ“ (قیام بالحق) سے تعبیر کیا

ہے۔ گیتا کہتی ہے کہ یہ عارف ہی انسان کامل کا مصداق ہے۔ اسے مختلف القاب سے یاد کیا گیا ہے مثلاً یوگی (واصل باللہ)، بھگت (طالب مولیٰ)، جنانی (عارف)، استتھ پر جیہ (مستوی علی الحکمۃ) اس کی تعریف اس طور کی گئی ہے:

”انسان کامل وہ ہے جس کی نگاہ میں سکھ اور دکھ دونوں برابر ہو جائیں۔ نہ اسے کبھی غصہ آئے، اور نہ وہ کسی سے ڈرے، اور نہ دنیا کی کسی شے سے دل لگائے۔ ہمیشہ خدا کی یاد میں مگن رہے اور اسی کی ذات میں قائم رہے۔“

میں نے گیتا کی تعلیمات کا خلاصہ مختصر لفظوں میں پیش کر دیا ہے۔ اس کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ گیتا دراصل اپنشدوں کی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ بعض علماء نے یہ لکھا ہے کہ اگر اپنشدوں کو ایک باغ فرض کیا جائے تو گیتا اس کے مختلف پھولوں کا گلہ ستہ ہے۔

گیتا میں ویدانتی تصوف کے تمام سرار و رموز بالوضاحت بیان کر دے گئے ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ:

- (۱) دنیائے فانی سے دل مت لگاؤ۔
  - (۲) خدا کو اپنا مقصود بناؤ۔
  - (۳) اس سے محبت کرو تا کہ اسے حاصل کر سکو۔
  - (۴) خدا اپنے عاشقوں کے دلوں میں رہتا ہے۔
  - (۵) جو اسے چاہتا ہے وہ اسے ضرور اپنے درشن دیتا ہے۔
  - (۶) ساری زندگی اس کے لیے بسر کرو۔
  - (۷) نیک اعمال بجالاؤ مگر نیت یہ ہو کہ خدا مجھ سے خوش ہو۔
  - (۸) سب انسانوں سے محبت کرو۔
  - (۹) یہ دنیا خدا کی جلوہ گاہ ہے۔ ہر شے مظہر خدا ہے۔
  - (۱۰) عارف کو ابدی مسرت اور سعادت حاصل ہو جاتی ہے۔
- یہی تصوف کی روح ہے اور یہی گیتا کا آپدیش ہے۔ (۲۲۳)

## عیسائیت

ابتدائی دور (حواریوں کا دور):

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے حواریوں نے ان کی تعلیمات کی تبلیغ شروع کر دی۔ وہ لوگ صرف یہودیوں ہی کو دعوت دیتے تھے اس دور میں عیسائیت ایک الگ مذہب شمار نہ ہوتی تھی۔ ابھی تک مذہبی اعتبار سے حضرت عیسیٰ کے پیرو یہودیوں میں شامل تھے عام یہودی بھی انہیں اپنے مذہب سے خارج نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے یہ عقیدہ اپنایا تھا کہ حضرت عیسیٰ بہت جلد ظاہر ہونے والے ہیں۔ یہ لوگ بھی خبردار کرتے رہتے کہ آسمانی بادشاہت کا ظہور قریب ہے۔ وہ یہ تبلیغ کرتے کہ بادشاہ کی برکات سے مستفید ہونے کے لئے گناہوں سے توبہ کرنا اور مسیح پر ایمان لانا ضروری ہے ان لوگوں نے اپنی ایک مذہبی برادری بنالی تھی جو لوگ اس برادری میں شامل ہوتے انہیں پسمہ دیا جاتا تھا اور ان مشترکہ کھانوں میں حصہ لینا پڑتا تھا جن میں حضرت عیسیٰ کی یاد تازہ کی جاتی تھی۔

یاد رہے کہ حضرت عیسیٰ کی زندگی میں جو لوگ ان پر ایمان لائے اور ان کی صحبت سے مستفید ہوئے اور انہوں نے اپنے آپ کو معاون مسیح کہا وہ لوگ ”حواری“ کہلائے۔ جب حضرت عیسیٰ پر کڑا وقت آیا تو وہ حواری انہیں دشمن کے سپرد کر کے بھاگ کھڑے ہوئے لیکن بعد میں نادم ہوئے اور اپنے گناہ کی تلافی کے طور پر حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کے مبلغ بن گئے۔ انا جیل کی رو سے ان کی تعداد بارہ تھی۔ ان میں سے پطرس، یوحنا، متی، برناباس اور فلپس نامی حواری مشہور ہیں۔

حواریوں میں سے پطرس نے ایک روز معبد میں ایک جذامی کا مرض دور کر دیا تو معبد کے نگرانوں نے پطرس سے سوال کیا کہ تم نے کس کے نام سے مریض کو اچھا کیا؟ پطرس نے جواب دیا کہ میں نے عیسیٰ مسیح کے توسط سے اس مرض کو دور کیا۔ اس واقعے سے معبد کے نگرانوں پر یہ بات کھل گئی کہ کلیلی کے جس باشندے (عیسیٰ) کو صلیب دی گئی تھی یہ لوگ اس کے ماننے والے ہیں اس پر عیسیٰ کے حواریوں کو منع کر دیا گیا کہ وہ معبد کی حدود میں اپنی مذہبی تبلیغ کا سلسلہ بند کر دیں۔

### پولوس عیسائیت کا دور:

پولوس کا اصل نام ”ساؤل“ تھا جسے ”پال“ کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اس نے حضرت مسیح سے کبھی ملاقات نہیں کی تاہم وہ تھیلیب مسیح کے وقت موجود تھا۔ وہ شروع میں عیسائیت کا زبردست دشمن تھا۔ اس نے تعذیب مسیح میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا وہ عقائد کے لحاظ سے شدید قسم کا فریسی یہودی تھا۔ وہ روم کے شہر تروسس کا رہنے والا تھا ایک عیسائی روایت کے مطابق وہ دمشق کی جانب جا رہا تھا کہ راستے میں حضرت مسیح نے اس پر ظہور فرمایا۔ غیب سے آواز آئی کہ: اے پولوس تو مجھے کیوں ستاتا ہے؟ اس نے پوچھا: خداوند تو کون ہے؟ آواز آئی: میں یسوع ہوں جسے تو

ستاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ ہی وہ اندھا ہو گیا۔ پھر وہ یسوع مسیح پر ایمان لے آیا تو حنیاہ شاگرد کی برکت سے اس کی بینائی لوٹ آئی۔ کچھ عرصہ بعد وہ دمشق سے یروشلم پہنچا اور اعلان کیا کہ دمشق کے راستے میں اس پر ایک نور چمکا اور آسمان سے عیسیٰ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس آواز نے اسے عیسیٰ پر ایمان لانے اور تبلیغ مذہب میں عیسیٰ کی نمائندگی کرنے کا حکم دیا تھا۔ حواریوں نے بادل ناخواستہ اسے اپنی برادری کا رکن بنا لیا اور وہ حواریوں کے ساتھ مل کر مذہب عیسوی کی اشاعت کرنے لگا۔

پولوس نے یونانیوں اور رومیوں میں عیسائیت کو قابل قبول بنانے کے لیے حضرت عیسیٰ کی اصل تعلیمات میں تحریف شروع کر دی۔ اس نے عقیدہ تثلیث، حلول اور کفارہ وغیرہ کو داخل مذہب کر دیا۔ وہ تہوار جو یونانی دیوتاؤں کے لئے مانے جاتے تھے اب عیسیٰ کے نام پر مانے جانے لگے۔ 25 دسمبر یونانی مشرکوں کے ہاں سورج دیوتا کی عبادت کا دن تھا۔ پولوس نے اسے ”عید مسیح“ بنا دیا۔ اس نے میلاد مسیح کی تاریخ اور مہینہ تک بدل دیا۔ اس نے یونانیوں کی خاطر ختنہ کا حکم منسوخ کر دیا اور حلال و حرام کی تفریق مٹا ڈالی۔

پولوس نے دعویٰ کیا کہ اس نے تعلیم براہ راست حضرت عیسیٰ سے حاصل کی ہے۔ اس نے تبلیغ عیسائیت کے لئے قبرص، ایشیائے کوچک اور یورپی ممالک کے دورے کئے اور کئی جگہوں پر گر بجے بنوائے۔ اس کی تعلیمات میں اہم ترین نظریہ ”نظریہ گناہ“ ہے۔ اس کے نزدیک ہر انسان پیدائشی طور پر گناہ گار ہے۔ سب سے پہلے حضرت آدم نے گناہ کیا پھر یہ گناہ ان کی اولاد میں موروثی حیثیت اختیار کر گیا ہے اس کا کہنا ہے کہ خدا نے اپنے بیٹے یسوع کے ذریعے سے نجات عطا فرمائی اور نجات ہی کی خاطر صلیب پر چڑھ گیا۔

### عیسائیت اور نصرانیت:

”عیسائی“ کا لفظ سب سے پہلے انطاکیہ کے یونانی الاصل پیروان مسیح کے لئے استعمال کیا گیا فلسطین میں عبرانی الاصل پیروان مسیح کو ”نصرانی“ کہا جاتا تھا۔  
زمانہ تہذیب و ابتلاء:

پیروان مسیح نے نہایت نامساعد حالات میں اپنی مذہبی تبلیغ کو جاری رکھا۔ پہلی صدی عیسوی میں ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی تھی اور وہ یونان، روم، شام اور فلسطین میں پھیل چکے تھے۔ 65ء میں شہنشاہ نیرو نے ان پر رومی سلطنت کی مخالفت کا الزام لگا کر قید، تصلیب، زندہ جلانے اور درندوں کے آگے ڈالنے اور دیگر بے پناہ مظالم کا نشانہ بنایا۔ 70ء میں طیطس نے یروشلم اور اقلدس کو تباہ و برباد کر دیا اور یہودیوں کے ساتھ بیستار عیسائیوں کو بھی تہہ تیغ کر دیا۔ اس

کے بعد 95ء میں رومی شہنشاہ ڈومیتین (Domitian) نے اور پھر 112ء میں تراجن (Trajan) نے عیسائیوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے۔ حتیٰ کہ چوتھی صدی کی ابتداء تک عیسائی مصائب و آلام کا شکار رہے۔

### عیسائیت کا فروغ:

چوتھی صدی عیسوی سے چھٹی عیسوی تک کا زمانہ عیسائیت کی اشاعت کا زمانہ ہے۔ رومی بادشاہ قسطنطین نے عیسائیت قبول کر کے 325ء میں مذہب تثلیث کو اصل عیسائیت اور سرکاری مذہب قرار دیا۔ اس بادشاہ نے عیسائیت کی تبلیغ کا بیڑا اٹھایا۔ ملک میں عبادت گاہیں بناوائی اور عیسائیوں کو بڑے بڑے عہدوں پر مامور کیا۔ اس نے نیقیہ میں ایک کونسل بلوائی جہاں انجیل کو مدون و مرتب کیا گیا۔ اس نے مختلف عیسائی فرقوں کو متحد کرنے اور ان کے عقائد کا اختلاف مٹانے کی بھرپور کوشش کی۔ اس نے غیر عیسائی رعایا پر تبدیل مذہب کے لئے ظلم و تشدد بھی کیا۔ اس نے ایسے احکام بھی جاری کیے جن کی رو سے حکام کو غیر عیسائی کا مذہب اور ثقافت مٹا دینے کے اختیار حاصل تھے۔ چنانچہ بت پرست رعایا اپنی جان بچانے کے لیے دھڑا دھڑا عیسائیت میں داخل ہونے لگے۔

### عہد مجالس (Age of Councils):

قسطنطین کے عہد میں نیقیہ (Nicaea) کے مقام پر منعقد کی گئی مجالس میں تثلیث کے عقیدہ کو عیسائیت کا بنیادی عقیدہ تسلیم کیا گیا۔ علاوہ ازیں اس مجلس میں جو عقائد مدون ہوئے وہ ”اتھاناسین کریڈ“ (Athanasian Creed) کہلاتے ہیں۔ یہ عقائد مبہم تھے ان کی تشریح و توضیح کے لئے کئی مجالس منعقد کی گئیں جو چوتھی اور پانچویں صدی پر محیط ہیں۔ اس لئے اس دور کو ”عہد مجالس“ یا ”عہد مباحثات“ (Controyersy Period) کہتے ہیں۔

### عیسائیت دو سلطنتوں میں تقسیم (مشرقی و مغربی عیسائیت):

قسطنطین سے گریگوری کے عہد تک عیسائی مذہب سلطنت روم پر غالب آچکا تھا۔ اسی اثناء میں عیسائیت دو سلطنتوں میں تقسیم ہو گئی جو ایک دوسری کی حریف تھیں۔

۱۔ مشرقی سلطنت جس کا مرکز قسطنطنیہ تھا اور اس میں بلقان، یونان، ایشائے کوچک، مصر اور حبشہ شامل تھے۔

یہاں کا سب سے بڑا مذہبی رہنما پطریک (Patriarack) کہلاتا تھا۔

۲۔ مغربی سلطنت اس میں روم اور یورپ کے بیشتر علاقے شامل تھے اس کا پایہ تخت روم تھا اس کا سب سے بڑا



مذہبی رہنما ”پوپ“ یا ”پاپا“ کہلاتا تھا۔

## پاپائیت:

قسطنطین شہنشاہ روم نے جب عیسائیت کو سرکاری مذہب بنا دیا تو مذہبی اور دنیاوی امور یکجا ہو گئے۔ اس دور میں کلیسا کا انتظام پانچ بڑے پادریوں کے سپرد کر دیا گیا۔ یہ پانچوں بڑے پادری ”پٹرائچ“ (Patriarchs) کہلاتے تھے۔ یہ لفظ انگریزی زبان میں ”فادر“ (Father) کا ہم معنی ہے۔ لاطینی زبان میں اسے ”پوپ“ کہتے ہیں۔

عیسائیت دو سلطنتوں میں بٹ جانے سے کلیسا بھی دو بن گئے۔ ایک مغربی کلیسا یعنی کلیسائے روم اور دوسرا مشرقی کلیسا یعنی کلیسائے قسطنطنیہ۔

رومی کلیسائے خود کو اس لئے معتبر سمجھتا تھا کہ پطرس اور پولوس نے روم ہی میں وفات پائی تھی اور وہی اصل روایت کے علمبردار تھے۔ دوسری طرف قسطنطنیہ کا کلیسا اپنے آپ کو اس لئے اہم سمجھتا تھا کہ سلطنتوں کی تقسیم سے قبل قسطنطنیہ ہی سلطنت روم کا دارالسلطنت تھا۔

ان دونوں کلیساؤں کی زبانیں مختلف تھیں۔ رومی کلیسا میں لاطینی اور قسطنطنیہ میں یونانی زبان مروج تھی۔ دونوں کلیساؤں کی تعلیمات کا ترجمہ جب ایک زبان سے دوسری زبان میں ہوتا تو مطالب و مفہوم میں اختلاف پیدا ہو جاتا اور دونوں میں بحث چھڑ جاتی۔ چنانچہ رفتہ رفتہ دونوں کلیساؤں میں اختلاف کی ایک وسیع خلیج حائل ہو گئی۔

گریگوری اول (540ء تا 609ء) نے پاپائیت کو مستحکم بنیادوں پر استوار کیا۔ اس عہد میں پوپ کو دینی اور دنیاوی دونوں طاقتوں کا منبع و سرچشمہ قرار دیا گیا اور اس سلسلہ میں اسے غیر محدود اختیارات عطا کر دیئے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی بادشاہوں کے لیے پوپ کی حمایت حاصل کرنا ضروری ہو گیا۔ بادشاہ کی تخت نشینی کے لیے پوپ اسے اپنے ہاتھ سے تاج پہنانے لگا۔ 800ء کے بعد سے پوپ ہی یورپ کا معنوی فرمانروا تھا۔ حتیٰ کہ سترھویں صدی عیسوی تک یورپ کے بادشاہوں کا تاج و تخت عملاً پوپ ہی کے ہاتھوں میں رہا وہ جسے چاہتا تخت پر بٹھا سکتا اور جسے چاہتا تخت سے محروم کر سکتا تھا۔

پوپ باقاعدہ ایک قیمتی اور مرصع تاج کا مالک ہوتا تھا اس کا ایک دربار بھی ہوتا تھا جو بڑے بڑے حکمرانوں کے دربار کو شرماتا تھا۔ وہ بہت بڑی جاگیر کا مالک بھی ہوتا تھا۔ اس کا اپنا ایک محل بھی تھا جو کئی ہزار کمروں پر مشتمل تھا۔ پاپائی نظام میں علم و عقل کو شجر ممنوعہ قرار دے دیا گیا۔ جو شخص بھی علمی اور عقلی بات کرتا اس کو گرفتار کر لیا جاتا اور

عبرت ناک سزا دی جاتی۔ پاپائے روم نے دین کے نام پر علماء پر بے شمار مظالم ڈھائے پوپ نے علم کی روشنی کو بجھانے کے لیے 1478ء میں مجالس ”تفتیش و احتساب“ (Cong unisation) قائم کر دیں۔ ان مجالس نے 1480ء سے 1808ء تک تین لاکھ چالیس ہزار آدمیوں کو مختلف قسم کی سزائیں دیں۔ ان میں سے 32 ہزار انسانوں کو زندہ جلادیا گیا۔ پوپ نے 1515ء میں حکم دے دیا کہ کلیسا کی منظوری کے بغیر کوئی کتاب نہ چھاپی جائے۔ جو شخص بھی حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کوئی کتاب چھاپے گا یا پڑھے گا اسے سزائے موت دی جائے گی۔ کلیسا نے کئی سائنس دانوں کو بھی اپنے مظالم کا تختہ مشق بنایا۔

”پوپ“ کے متعلق یہ عقیدہ پایا جاتا تھا کہ وہ خدا کے نائب اور حضرت عیسیٰ کا قائم مقام ہے اس کا کوئی فیصلہ غلط نہیں ہو سکتا اور اس کے کسی حکم پر تنقید نہیں کی جاسکتی۔ وہ گناہ گاروں کے گناہ بھی معاف کر سکتا ہے۔ گناہ معاف کرنے کے عقیدہ نے آہستہ آہستہ ”معافی ناموں“ (indulgences) کی شکل اختیار کر لی۔ ہوتا یوں تھا کہ پادری کچھ رقم وصول کر کے گناہ گاروں کو معافی نامہ لکھ دیتا تھا۔ معافی نامہ کی عبارت یوں ہوتی تھی:

”تم پر خداوند یسوع مسیح کی رحمت ہو اور وہ تمہیں اپنے مقدس ترحم سے (تمام گناہوں کی پاداش سے) آزاد کرے۔ میں اس کی اور اس کے بابرکت شاگرد پطرس، پولوس اور مقدس پوپ کی اس سند کی رو سے جو انہوں نے مجھے عطا فرمائی ہے تمہیں آزاد کرتا ہوں سب سے پہلے کلیسا کی تمام ملامتوں سے خواہ وہ کسی شکل میں ہوں پھر تمہاری ہر ایک حدود شکنی اور زیادتی سے، خواہ وہ کیسی ہی مہیب و شدید کیوں نہ ہو اور وہ سزا میں تم سے اٹھا لیتا ہوں جو تمہیں تمہارے گناہوں کی پاداش میں جہنم میں ملنے والی تھی تاکہ تم جب مرد تو جہنم کے دروازے تم پر بند ہوں اور جنت کی راہیں کشادہ، باپ بیٹے اور روح القدس کے نام پر“

معافی نامہ حاصل کرنے کے لیے مختلف گناہوں کی قیمتیں مختلف ہوتی تھیں۔ اسقاط حمل، چوری، زنا اور قتل کے لیے بھی معافی نامے جاری کیے جاتے تھے۔

اپنے ظلم و ستم، علم دشمنی، عیاشی اور خدا فروشی کے باعث پاپائیت بدنام ہو گئی چنانچہ چند حقیقت پسند ایسے مصلحین، کلیسا اور مسیحی مذہب کی اصلاح کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

**نفاق عظیم:**

نفاق عظیم (Great Schism) سے مراد ہے مشرق اور مغرب کے کلیساؤں کا وہ زبردست

اختلاف، جس کے باعث مشرق کلیسا ہمیشہ کے لئے رومن کیتھولک چرچ سے جدا ہو گیا اور اس نے اپنا نام بدل کر ”دی

ہولی آر تھوڈ رکس چرچ“ رکھ لیا۔

اس نفاق اور علیحدگی کی سب سے بڑی وجہ ان دونوں کلیساؤں کا نظریاتی اختلاف تھا۔ مشرقی کلیسا کا عقیدہ تھا کہ روح القدس کا اقنوم صرف باپ کے اقنوم سے نکلا ہے اور بیٹے کا اقنوم اس کے لئے محض ایک وسیلے اور واسطے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے برعکس مغربی کلیسیا یہ اعتقاد رکھتا تھا کہ روح القدس کا اقنوم باپ اور بیٹے دونوں سے نکلا ہے مشرقی کلیسا کے نزدیک بیٹے کا نام اور رتبہ باپ سے کم تھا جبکہ مغربی کلیسا دونوں کو مساوی درجہ دیتے تھے۔

نفاق کی دوسری وجہ مشرقی و مغربی کلیساؤں میں نسلی امتیاز بھی تھی۔ مغرب میں اطالوی اور جرمنی نسل تھی اور مشرق میں یونانی اور عیسائی شامل تھے۔ دونوں کلیساؤں کی زبانیں مختلف تھیں اور ان کے عقائد بھی مختلف ہو چکے تھے اس لئے دونوں میں بعد پیدا ہو گیا۔

## تحریک اصلاح مذہب:

جب پوپ پادریوں کے مظالم حد سے بڑھ گئے تو چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں عیسائی دنیا میں مذہبی اصلاح کے لئے کئی تحریک وجود میں آئیں۔ ان مصلحین میں سے پیٹر والڈو، جان ٹولر، جان والی کلف اور مارٹن لوتھر کے نام نمایاں ہیں۔

## پیٹر والڈو:

پیٹر والڈو (Peter Valdo) بارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں ایک دولت مند تاجر گزرا ہے جس نے اپنی تمام دولت غرباء میں تقسیم کر دی اور جگہ جگہ گھوم کر عیسائی تعلیمات کی اصل روح سے لوگوں کو آشنا کیا۔ اس کے پیروؤں کی تعداد جنوبی فرانس، شمالی اٹلی اور سپین میں خاصی بڑھ گئی تو کلیسا نے اسے عیسائیت سے خارج قرار دے کر اس کے حامیوں کو جلا وطن کر دیا۔

## جان والی کلف:

جان والی کلف (John Wy Cliffe) نے چودھویں صدی عیسوی میں پوپ کے خلاف آواز بلند کی۔ اس نے کہا کہ جو پادری خود گناہوں کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں ان کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ لوگوں کو تعلیم دیں اس نے اعتراف گناہ اور کفارہ پر بھی شدید تنقید کی۔ اس کی اس گستاخی کی پاداش میں اسے کئی بار نظر بند کیا گیا۔ اس کی وفات کے تیرہ سال بعد اس کی قبر کھود کر اس کی لاش کو جلا دیا گیا۔

## مارٹن لوتھر:

مارٹن لوتھر جرمنی کے ایک گاؤں ”آئل بین“ کا باشندہ تھا جو 1482ء میں پیدا ہوا وہ 25 سال کی عمر میں وٹن برگ یونیورسٹی میں دینیات کا معلم بن گیا۔ 1512ء میں وہ روم گیا جہاں اسے پوپ کی زندگی کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ اس مطالعہ سے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ پوپ نہ صرف مسیحی مذہب کی روح سے دور ہے بلکہ روحانیت اور اخلاق سے بھی عاری ہے۔ اس نے جرمنی واپس آ کر پوپ کی مخالفت شروع کر دی۔ 21 اکتوبر 1517ء کو لوتھر نے پوپ کے خلاف اعلانیہ طور پر بغاوت کر دی اور پادری ٹٹ زیل (Tetzel) کو جو پوپ کی طرف سے معافی نامے فروخت کر رہا تھا ہدف تنقید بناتے ہوئے کہا کہ وہ دین مسیح کے خلاف کام کر رہا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ اس بات پر مباحثہ کرنے کو تیار ہے کہ پاپائیت سرپا مسیح کے خلاف کام کر رہی ہے۔ اس نے دعوت مباحثہ کے بعد پچاس سوالوں پر مشتمل ایک سوالنامہ تیار کر کے مقامی گرجہ کے صدر دروازہ پر آویزاں کر دیا۔ اس سوال نامے نے جرمنی کے لوگوں میں ایک انقلابی روح پھونک دی اور بے شمار لوگ پوپ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

پوپ نے مارٹن لوتھر کو ملحد اور کافر قرار دیا۔ اسے بادشاہ کے سامنے طلب کیا گیا جہاں اس نے نہایت دلیری کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا اس نے کہا کہ جب تک کتاب مقدس اور عقل کی رو سے مجرم ثابت نہ کر دیا جائے میں اپنے ان خیالات سے باز نہیں آ سکتا۔ مارٹن لوتھر کو ایک سال تک ایک قلعہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ جہاں وہ ایک سال رہا۔ وہاں اس نے بائبل کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا۔

1520ء میں مارٹن لوتھر کی تقریروں سے متاثر ہو کر لوگوں نے رومن کیتھولک سے علیحدگی اختیار کر لی اس کے بعد جرمن میں ایک نیا کلیسا وجود میں آ گیا۔

## پروٹسٹنٹ:

(Protestant) انگریزی پروٹسٹ (Protest) کے معنی ہیں احتجاج کرنا، چونکہ مارٹن لوتھر کی اصلاح تحریک پاپائیت کے خلاف ایک احتجاج تھا اس لئے اس تحریک کے حامیوں کو ”پروٹسٹنٹ“ کہا جانے لگا۔

## زوئگی:

لوتھر کی وفات 1546ء کے بعد اصلاح کلیسا کا کام جاری رہا۔ ”ہل ریچ زوئگی“ (Hulrich Zwingli) (متوفی 1521ء) نے جو سوئزر لینڈ کا باشندہ تھا۔ اپنی تقریروں کے ذریعے کلیسا کی ابتر حالت کو عوام پر

ظاہر کیا۔ اس نے بائبل کی تعلیم پر عمل کرنے اور اسے زندگی کے ہر شعبہ میں اپنا رہنما قرار دینے پر بہت زور دیا۔ اس نے کہا کہ عشاءے ربانی کے ذریعے اس قربانی کا اعادہ نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کی یاد تازہ کی جاسکتی ہے اس نے پادریوں کی شادیوں پر زور دیا اور ہر قسم کے جلوس، تہوار اور تقریبات کی مخالفت کی اس نے کہا کہ جو حاکم یا عامل مسیح کی تعلیم کی خلاف ورزی کرتا ہے اسے اس کے عہدہ سے معزول کر دینا چاہیے۔

## کالونی:

اسی عہد میں جان کالون (John Calvin) (1509ء تا 1564ء) سامنے آیا۔ وہ فرانس کا رہنے والا تھا۔ اس نے پاپائیت کی تشدد کے خوف سے اپنا وطن چھوڑ کر جینیوا میں اصلاحی کام شروع کیا۔ اس نے ”عیسائیت کے مبادیات“ (Institutes of Christian Religion) نامی کتاب تصنیف کی جس پر اسے جینیوا سے نکال دیا گیا۔ تین سال بعد وہ دوبارہ جینیوا آیا اور ایک مذہبی جماعت کی بنیاد ڈالی۔ اس کے پیرو ”کالونی“ کہلائے۔

## اصلاح شدہ کلیسا:

زوٹگی اور کالون کے پیروؤں کے اتحاد سے ”اصلاح شدہ کلیسا“ (Reformed Church) وجود میں آیا۔ یہ اصلاح لوٹھر کے کلیسا کے تمیز کرنے کے لیے واضح کی گئی تھی۔

## جان ناکس:

وہ اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا رومن کیتھولک کا پادری تھا لیکن پادریوں کی بے راہروی سے متنفر ہو کر اس نے پادریوں کے خلاف تقاریر کا سلسلہ شروع کر دیا جس کی پاداش میں اسے جلاوطنی اور اسیری کی زندگی بسر کرنا پڑی۔ بالآخر اٹھارہ برس کی اسیری کے بعد ایڈورڈ ششم کی مداخلت سے اسے آزادی حاصل ہوئی۔ ملکہ میری ٹیوڈر کے عہد میں جب پروٹسٹنٹوں پر مظالم ڈھائے جانے لگے تو پروٹسٹنٹوں کے ہمراہ جان ناکس بھی جینیوا چلا گیا۔ جب الزبتھ انگلستان کی ملکہ بنی تو پروٹسٹنٹ واپس انگلستان لوٹ آئے۔ جان ناکس نے واپس آ کر کالونی طرز کے ایک کلیسا کی بنیاد رکھی یہ کلیسا ”پریسبی ٹیرینزم“ (Presby Terainism) کے نام سے مشہور ہوا اس نے سکاٹ لینڈ میں کیتھولک نظام کو بالکل ختم کر دیا اور ایک ایسے نظام کی بنیاد رکھی جس میں حکومت اور کلیسا دونوں شامل تھے اس نظام میں عوام کے حقوق کو محفوظ کیا گیا۔ اس میں اعمال خادم اور عوام مخدوم کی حیثیت رکھتے تھے۔

## رد عمل اصلاحی تحریک:

جب لوگ اصلاحی تحریک سے متاثر ہو کر کلیسا کو چھوڑنے لگے تو بعض مخلصین کلیسا نے یہ کوشش کی کہ کیتھولک چرچ میں اصلاح کی جائے اس اصلاحی کوشش کا نام ”ردِ عمل اصلاحی تحریک“ ہے۔

مخلصین کلیسا کی کوششوں سے آسٹریلیا کے مقام پر ٹرنٹ پر 1545ء اور 1552ء میں کونسلوں کا انعقاد ہوا جن میں دونوں کلیساؤں کے اختلاف دور کرنے پر فکر کیا گیا مگر کلیساؤں کے باہمی اتحاد کا مسئلہ حل نہ ہو سکا۔

”ردِ عمل اصلاحی تحریک“ کے زیرِ اہتمام ایک مجلس ”تفتیش و احتساب“ (Inquisition) قائم کی گئی جسے ”ردِ عمل اصلاحی تحریک کی تلوار“ (Sword of the Counter Reformation) بھی کہا جاتا ہے۔ ابتداء میں اس مجلس کے چھ بڑے پادری ممبر ہوتے تھے جو رومن امپائر میں کام کرتے تھے۔ ان لوگوں کے ذمہ یہ کام تھا کہ اس شخص کو گرفتار کر لیا جائے جس نے رومن کیتھولک چھوڑا ہے۔ اس کو ہدایت کی جاتی تھی کہ وہ رومن کیتھولک مذہب چھوڑنے والوں کو دوبارہ اپنے مذہب میں لوٹانے کی کوشش کریں۔ چنانچہ اس طریقہ سے پڑوسٹھوں پر بیشمار مظالم ڈھائے گئے اور انہیں سنگین سزائیں دی گئیں۔

### جیسویٹ سوسائٹی:

1524ء میں آگنیئس لویولا (Ignatius Luyula) نامی شخص نے ایک سوسائٹی تشکیل دی جو ”ڈرڈلر آف جیسویٹ“ (Drdler of Jesuits) کہلاتی تھی۔ اس سوسائٹی کے حسبِ ذیل شرائط طے کی گئیں: ۱۔ قائد کی اطاعت و فرمانبرداری۔

۲۔ تبلیغ کے ذریعہ اپنے نظریات کی اشاعت۔

۳۔ باعصمت اور مفلسی کی زندگی بسر کرنا۔

اس سوسائٹی کی جدوجہد سے فرانس اور جرمن میں کیتھولک مذہب دوبارہ قائم ہو گیا۔

### کلیسائے انگلستان (Church of England):

عیسائیت چھٹی صدی عیسوی میں انگلستان پہنچی سولویں صدی عیسوی تک انگلستان کا کلیسا رومی کلیسا کے زیرِ اثر رہا۔ ہنری ہشتم شاہ انگلستان کے زمانہ میں پوپ اور بادشاہ کے درمیان کش مکش شروع ہو گئی۔ ہنری چاہتا تھا کہ اپنی بیوی کیتھرائن کو طلاق دے دے لیکن پوپ کی اجازت کے بغیر یہ بات ناممکن تھی۔ چنانچہ ہنری نے انگریزی کلیسا کو رومی کلیسا سے الگ کر کے ”کلیسائے انگلستان“ کے نام سے ایک آزاد کلیسا کی بنیاد رکھی۔ اس کلیسا کے سربراہ خود شاہ انگلستان تھا۔

انگلستان میں جب کوئی کیتھولک فرقہ برسرِ اقتدار آجاتا تو وہ پروٹسٹنٹوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیتا اور جب کوئی پروٹسٹنٹ غالب آجاتا تو وہ کیتھولک پر مظالم ڈھانے لگتا

انا بسٹسٹس:

اسی اثنا میں انا بسٹسٹس (Anabaptists) تحریک وجود میں آئی جس کے لفظی معنی ہیں ”دوبارہ پتسمہ لینے والا“ اس تحریک کے ارکان بالغ لوگوں کو پتسمہ لینے پر مجبور کرتے تھے۔

بپٹسٹ:

1611ء میں تھامس ہلوولیس (Thomas Helwus) نے بپٹسٹ (Baptist) کلیسا کی بنیاد ڈالی جس کی پاداش میں اسے قید کر دیا گیا اور وہ قید خانہ ہی میں فوت ہو گیا اس کے بعد یہ فرقہ مختلف ذیلی فرقوں میں تقسیم ہو گیا۔

کوئیکر (Quacker):

اس فرقہ کا بانی فاکس تھا۔ فاکس کو جب ایک عدالت میں پیش کیا گیا تو اس نے حج سے کہا: ”خدا سے ڈرو“ اس وقت سے اس کے پیروکار ”کوئیکر“ کہلانے لگے۔ جس کے معنی ڈرنے والے کے ہیں۔ اس کے پیرواپنے آپ کو ”انجمن احباب“ (Society of Friends) یا ”احباب صداقت“ کہا کرتے تھے اس سوسائٹی کے نزدیک کسی کلیسیا یا پادری کی کوئی مذہبی وقعت نہ تھی۔ ان کا نظریہ تھا کہ مذہب انسان کے دل میں ہوتا ہے جس کو وہ ”نور داخلی“ کہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جس جگہ بھی چند نیک اور سچے عیسائی جمع ہو جائیں وہی جگہ مقدس بن جاتی ہے اس لئے گرجا کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ لوگ مذہبی رسوم کے قائل نہیں تھے ان کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاموشی سے ہم کلام ہونا ہی سب سے بڑی عبادت ہے اس فرقہ کو شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔

### نشاة ثانیہ:

عیسائی مذہب میں اٹھنے والی اصلاحی تحریکوں نے یورپ میں اقلیت کو بیدار کیا اور ”نشاة ثانیہ“ (Renoissance) کا دور شروع ہوا۔ اس دور میں یورپ نے سائنس، تکنیک مذہب مغلوب ہو کر رہ گیا لوگوں نے تحقیق علم، آزادی رائے اور فلسفہ کے نام پر وہ کچھ کیا کہ نتیجہ میں لادینیت، دہریت اور کمیونزم جیسی خطرناک بیماریاں وجود میں آئیں۔ لوگ مذہب اور خدا سے یکسر بیگانہ ہو گئے اور اخلاقی اقدار بھی ناپید ہو گئیں۔

## جدیدیت:

اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے بعض اعتدال پسند طبقوں نے مذہب کو بچانے کی خاطر تجدید یا جدیدیت کی تحریک اٹھائی۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مذہب میں کچھ ایسی تبدیلیاں کی جائیں کہ وہ سائنسی ایجادات اور نئے انکشافات کے ساتھ دینے کے قابل ہو سکے اس مقصد کے لیے فرانس کے فلسفی رد سو اور پروفیسر ہارنیک نے نمایاں کام کیا۔ (۲۲۲)

## تحریک احیائے عیسائیت:

انیسویں صدی عیسوی میں اقلیت پسندی کی تحریک کے مقابلہ میں عیسائیت کے احیاء کی ایک تحریک بھی اٹھی جس کا مقصد رومن کیتھولک مذہب کو اس کی اصلی اور ابتدائی شکل و صورت میں زندہ کرنا تھا لیکن یہ تحریک کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکی تاہم یہ تحریک عقلیت اور تجدید کی تحریکوں کے ساتھ ساتھ ابھی تک محسوس ہے۔

عیسائیت کو ماننے والے بڑے زور شور کے ساتھ اپنے مذہب کو مسائل کے حل کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں عیسائی مصنفین کی اچھی خاصی تعداد نے اسی قسم کے مضامین لکھنے کو اپنا مستقل موضوع بنالیا ہے۔ ان میں بعض چوٹی کے مفکرین بھی شامل ہیں۔ اس مقصد کے لئے اجتماعی کوششیں بھی ہو رہی ہیں۔ مثلاً سوزر لینڈ سے ایک تحریک اٹھی ہے جس کا نام ہے اخلاقی اسلحہ بندی (Moral Re-armament) اس کے بانی ڈاکٹر فرینک بک مین ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ خدا پرستی کے تحت اخلاقی قدروں کو رواج دیا جائے اور لوگوں کے سوچنے کے انداز میں تبدیلی پیدا کی جائے۔ خاص طور پر ایمانداری، پاکیزگی، بے غرضی، باہمی خیر خواہی اور محبت کو پھیلایا جائے۔ اسی طرح امریکہ میں خاص اسی مقصد کے لیے ایک ادارہ (Research Centre in Creative Altruism) کے نام سے ۱۹۴۹ء سے قائم ہے جس کو ایک پبلک فنڈ سے پندرہ ہزار ڈالر سالانہ کی امداد ملتی ہے۔ اس ادارے کے ڈائریکٹر پروفیسر سوروکن (Sorokin) ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں انہوں نے پہلی بار اپنے تحقیق و مطالعہ کے نتائج پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس وقت سب سے اہم کام انسان کے اندرون یا اس کے نتائج پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس وقت سب سے اہم کام انسان کے اندرون یا اس کے نفس کی اصلاح ہے۔ جس پر تمام تر خود غرضی کا تسلط ہو گیا ہے۔ اور یہ ضروری ہے کہ اس کے برعکس اس میں بے لوث محبت کے اس جذبے کو پیدا کیا جائے اور ابھارا جائے جو آفاقی ہو۔ فرد کی اصلاح کے بغیر جو انقلاب بھی لایا جائے گا وہ بالکل سطحی ہوگا اور ساری کوششیں رایگاں جائیں گی۔ موجودہ حالات کا علاج تجویز



کرتے ہوئے وہ اپنی کتاب (Crisis of our Age) میں لکھتے ہیں۔

”انسان کی پوری ذہنیت اور اس کے جملہ رجحانات میں اس تبدیلی کی ضرورت ہے جس کا رخ ان اصولوں کی طرف ہو جس کو پہاڑی کے وعظ میں پیش کیا گیا تھا۔ جب اس قسم کی تبدیلی ایک خاص حد تک ہو چکی ہوگی۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ اس نہج پر سیاسی اور اقتصادی شعبوں میں باسانی تبدیلی ہو سکے۔ لیکن اس تبدیلی کے بغیر کتنی ہی سیاسی اور اقتصادی بہتری اور میکانیکی نوعیت کی تعمیر کیوں نہ کی جائے اس سے خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں ہوں گے۔“ (۲۲۵)

### عیسائیت اور رہبانیت

۳۰۵ء میں کانستانتین تخت پر جلوہ فروز ہو گیا اور رومن سلطنت میں اسی کے نام کا سکہ چلنے لگا۔

اس دور کی تصویر ڈرامہ پران الفاظ میں کھینچتا ہے:

فاتح اور کامیاب جماعت کے ساتھ جو کوئی شریک ہوا اسے بڑے بڑے عہدے ملنے لگے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا دار لوگ جنہیں مذہب کی ذرا بھی پرواہ نہ تھی مسیحیت کے سب سے زیادہ جو شیلے حامی ہو گئے۔ چونکہ وہ بظاہر عیسائی اور باطن مشرک و بت پرست تھے۔ لہذا ان کے اثر کی وجہ سے عیسائیت میں بت پرستی و شرک کے عناصر کی آمیزش شروع ہو گئی

فلوٹین نے کہ وہ بھی انہی کا ہم مشرب تھا۔ کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جس سے ان کے اس منافقانہ طرز عمل کا سد باب ہو۔ فلوٹین کی ساری عمر سیاہ کاریوں میں گزری اور کہیں آخری وقت (۳۳۷ء) میں جا کر اس نے ان مذہبی مراسم کی پابندی کی جن پر عمل کرنے کی کلیسا ہدایت کرتا ہے۔

اگرچہ عیسائی جماعت اس قدر قوی ہو چکی تھی کہ جس شخص کو اس نے اپنے گون کا سمجھا اسے تخت پر بٹھادیا۔ لیکن یہ قدرت اسے پھر بھی حاصل نہ ہوئی تھی کہ اپنے حریر یعنی بت پرستی کا استیصال کر سکے۔ دونوں کی باہمی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے اصول شیر و شکر ہو گئے اور نیا مذہب پیدا ہو گیا۔ جس میں بت پرستی اور عیسائیت پہلو بہ پہلو جلوہ گر تھیں۔ عیسائیت اور اسلام میں اس بارے میں یہ بڑا فرق ہے کہ اسلام نے اپنے مد مقابل کو مطلق نیست و نابود کر دیا اور اپنے عقائد کو بلا کسی آمیزش کے شائع کیا۔

اس شہنشاہ کو جو محض دنیا کا بندہ تھا۔ اور جس کے مذہبی اعتقادات خس سے بھی کم وقعت رکھتے تھے۔ اپنا ذاتی فائدہ، سلطنت کی بہبودی اور دونوں مخالف جماعتوں یعنی عیسائیوں اور بت پرستوں کی بھلائی اس میں نظر آئی کہ جہاں تک ہو سکے ان میں یگانگت اور ارتباط پیدا کیا جائے۔ اور تو اور اسخ الاعتقاد عیسائیوں کو اس حکمت عملی سے چنداں

اختلاف نہ تھا اس لئے کہ شاید یہ سمجھتے تھے کہ نئی تعلیم کی شاخ میں اگر پرانے عقائد کا پیوند لگادیا گیا تو مذہب جدید کو بہت جلد ترقی ہو جائے گی اور آخر کار نجاستوں کی آمیزش سے پاس ہو کر سچا مذہب باقی رہ جائے گا۔

یہ بت پرستانہ عیسائیت۔ رومیوں کو اس حیوانی زندگی سے تو نہ نکال سکی جو وہ دور بت پرستی سے گزارتے آ رہے تھے۔ البتہ اس کی دوسری انتہا رہبانیت کو اختیار کر لیا۔ جس نے فطری میلانات، طبعی قوتوں اور تعمیر و خلافت کے انسان کے اساسی کردار کو ختم کر کے رکھ دیا۔ اس رہبانیت سے یہ تو نہ ہو سکا کہ انسانی وجود کی گہرائیوں میں اتاری ہوئی زبردست قوتوں کو بالکل ختم کر دیتی۔ البتہ اس نے زندگی کو محرکات اور ضوابط کی کشاکش میں مبتلا کر دیا۔ اور انسانی ضمیر ایک الم انگیز کشمکش و راجتماعی اور عمرانی زندگی تباہی سے ہمکنار ہو گئی۔

لیکن اپنی کتاب تاریخ اخلاق یورپ میں بیان کرتا ہے:

راہبوں اور زاہدوں کی مجموعی تعداد مورخین کے اختلاف بیان کی وجہ سے قطعی طور پر نہیں بتائی جاسکتی تاہم ان کی کثرت اور رہبانیت کی اشاعت و مقبولیت کا اندازہ اعداد ذیل سے ہو سکتا ہے۔ سینٹ جروم کے زمانے میں ایسٹری تقریباً پچاس ہزار راہبوں کا مجمع ہوتا تھا۔ چوتھی صدی میں صرف ایک راہب کی ماتحتی میں پانچ ہزار راہب تھے سینٹ سیراہین کی ماتحتی میں دس ہزار راہب تھے۔ اور چوتھی صدی کے خاتمے پر تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ جنتی خود مصر کی شہریوں کی آبادی تھی تقریباً اسی قدر ان زاہدوں اور راہبوں کی تھی۔

لیکن نے راہبوں کی حالت بیان کی ہے۔ اور ان کے انسانی فطرت سے دور ہونے اور زندگی سے فرار میں مبالغہ اور فطرت کے مقابلہ کی تفصیل بتاتی ہے۔ اس کا کچھ خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

دو چار سال نہیں کوئی پورے دو سو سال تک جسم کشی منہائے اخلاق سمجھی جاتی رہی۔ مورخین نے اس کی لرزہ خیز مثالیں پیش کی ہیں۔ سینٹ سیکرویس اسکندریہ کی بابت مشہور ہے کہ وہ چھ ماہ تک برابر ایک دل میں سویا کئے۔ تاکہ ان کے برہنہ جسم کو زہریلی کھیاں ڈسیں۔ نیز یہ کہ یہ ہمیشہ ایک من لوہے کو وزن اپنے اوپر لادے رہتے تھے۔ ان کے مرید سینٹ یوسیلپس تقریباً دو من لوہے کا وزن لادے رہتے تھے۔ اور تین سال تک ایک خشک کنوئیں کے اندر مقیم رہے۔ ایک مشہور راہب یوحنا کے متعلق منقول ہے کہ وہ مسلسل تین سال تک کھڑے ہو کر عبادت کرتے رہے اس مدت میں ایک لمحے کے لئے بیٹھے نہ لیئے۔ جب بہت تھک جاتے تو چٹان پر اپنے جسم کو سہارا دے لیتے۔ بعض زاہد لباس کسی قسم کا نہیں استعمال کرتے تھے۔ ستر پوشی کا کام اپنے جسم کے بڑے بالوں سے لیتے تھے اور چوپایوں کی طرح ہاتھ پیروں کے بل چلتے تھے۔ راہبوں کے مسکن علی العموم اس وقت مکانات نہیں ہوتے تھے بلکہ وحشی درندوں کے غار خشک کنوئیں یا

قبرستان ہوتے تھے اہل زہد کا ایک طائفہ صرف گھاس کھاتا تھا جسم کی طہارت روح کی پاکیزگی کے منافی سمجھی جاتی تھی اور جو زاہد مرقدہ زہد میں جتنی زیادہ ترقی کرتے جاتے تھے اسی قدر وہ مجسمہ عفونت و غلاظت ہوتے سینٹ ایتھینس نہایت فخر سے بیان کرتا ہے کہ سینٹ امینیونی بایں کبرسنی کبھی مدت العمر اپنے پیر دھونے کے عصیاں کا مرتکب نہیں ہوا۔

سینٹ ابراہام نے اپنی پیچاھ سالہ مسیحی زندگی میں اپنے چہرے یا پیر پر پانی کی چھینٹ نہ پڑنے دی۔ راہب الگرنڈر بڑے تأسف اور تحیر سے فرماتے ہیں کہ وہ ایک زمانہ تھا جب ہمارے سلاف ہنہ دھو۔ حرام جانتے تھے اور ایک ہم لوگ ہیں جو حمام جایا کرتے ہیں۔ راہب معلموں کا بھیس بدلے ہوئے پھرتے تھے۔ اور بچوں کو پھسلا پھسلا کر اپنے حلقے میں شامل کرتے تھے۔ والدین کا اپنی اولاد پر کوئی اختیار نہیں رہ گیا تھا۔ جو اولاد انہیں چھوڑ کر تارک الدنیا ہو جاتی تھی۔ اس کے نام پر پبلک میں ہر طرف واہ واہ ہوتی تھی۔ پہلے جو اثر و اقتدار بزرگ خاندان یا والد کو حاصل ہوتا تھا۔ وہ اب پادریوں اور راہبوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ پادری رہبانیت کے لئے لڑکوں کا اغوا کرتے تھے۔ سینٹ ایمر وز میں اس قسم کے اغوا کی قوت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ اسے دیکھ کر مائیں اپنے اپنے بچوں کو گھروں کے اندر بند کر دیتی تھیں۔ تحریک رہبانیت کا اخلاقی نتیجہ یہ ہوا کہ جتنے کمالات مردانگی و جوانمردی سے متعلق ہیں وہ سب یکسر معیوب قرار پا گئے۔ مثلاً زندہ دلی، خوش طبعی صاف گوئی فیاضی، شجاعت جرات کی عابدان مرتاض کبھی ان کے قریب بھی ہو کر نہیں گزرے تھے۔ دوسرا اہم نتیجہ رہبانی طرز معاشیات کا یہ ہوا کہ خانگی زندگی کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں اور دلوں سے اعزاء کا احترام و ادب کا فور ہو گیا۔ اس زمانے میں ماں باپ کے ساتھ احسان فراموشی اور اعزاء کے ساتھ قسادت قلبی کی جس کثرت سے نظیریں ملتی ہیں۔ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ یہ زہدان صحرا اور عابدان مرتاض اپنی ماؤں کی دل شکنی کرتے تھے۔ بیویوں کے حقوق کی پامالی کرتے تھے۔ اور اپنی اولاد کو یہ دغا دیتے تھے کہ انہیں بے والی وارث محض دوسروں کے ٹکڑوں پر چھوڑ دیتے تھے۔ ان کا مقصود زندگی تمام تر یہ ہوتا تھا کہ خود انہیں نجات آخروی حاصل ہو انہیں اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ ان کے متعلقین و ستوجہیں یا میریں۔

لیکن نے اس سلسلہ میں جو واقعات لکھے ہیں انہیں پڑھ کر آج بھی آنسو نکل آتے ہیں۔ عورتوں کے سائے سے وہ بھاگتے تھے۔ ان کا سایہ پڑ جانے سے اور راستہ یا گلی میں اتفاقاً سامنا ہو جانے سے وہ سمجھتے تھے کہ ساری عمر کی زہد و ریاضت کی کمائی خاک میں جاتی ہے اپنی ماؤں، بیویوں، اور حقیقی بہنوں سے بات کرنا بھی وہ معصیت کبیرہ سمجھتے تھے۔ لیکن نے اس سلسلہ کے جو واقعات لکھے ہیں۔ ان کو پڑھ کر کبھی ہنسی آتی ہے اور کبھی رونا۔

اب دیکھئے اس فطرت دشمنی اور میلانات اور فطری صلاحیتوں کے انسانی وجود سے اکھاڑ پھینکنے کے کیا نتائج

سامنے آئے؟

یہ سرکش انحراف کامیاب نہیں ہوا۔ بلکہ فطرت ہی غالب آ کر رہی۔ اور اس انتہا پسند رہبانیت نے رومیوں کے مادیت کے غلو اور ان کی بہیمانہ خواہشات پرستی میں کچھ اعتدال و تخفیف پیدا نہ کر سکی۔ بلکہ دونوں کے فساد نے مل کر ساری زندگی کو تباہ و برباد کر ڈالا۔

لیکن مسیحی دنیا کے اخلاقی انحطاط کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتا ہے۔

”اخلاقی رکاکت و پستی حد درجہ سرایت کر گئی تھی۔ دربار کی عیش پرستیاں، ارکان دربار کی غلام طینتی اور ملبوسات و زیورات کی تزئین و آرائش اپنے شباب پر تھی۔ دنیا اس وقت انتہائی رہبانیت اور انتہائی بدکاری کے تھپیڑوں کے درمیان جھونکے کھا رہی تھی۔ بلکہ بعض شہرجن میں سب سے زیادہ گرم بازاری تھی۔ غرض بدکاری اور توہم پرستی کا ایسا اجتماع ہو گیا تھا۔ جو انسان کی شرافت و عظمت کا قطعی دشمن ہے۔ رائے جمہور اس قدر ضعیف ہو گئی تھی کہ لوگوں کو بدنامی اور رسوائی کا مطلق خوف باقی نہیں رہا تھا۔ البتہ ضمیر کو مذہب کا دھڑکا ہو سکتا تھا۔ لیکن اے بھی اس اعتقاد نے مٹا دیا تھا کہ دعاؤں وغیرہ کے ذریعہ سے سارے گناہ معاف ہو سکتے ہیں۔ مکاری، دغا بازی، دروغ گوئی کی وہ گرم بازاری تھی، جو قیصرہ کے زمانے میں بھی نہ تھی۔ البتہ ظلم و تشدد شقاوت و بے حیائی اتنی نہ تھی لیکن اس کے ساتھ حریت فکر آزاد خیالی و جوش تو میت میں بھی کمی تھی۔“

اس وقت تو یورپ پر قیامت ہی ٹوٹ پڑی۔ جب کلیسا نے اپنی غلط علمی آراء خرافات اور دیومالا کو عقیدہ کا جزء قرار دیا۔ اور اس خرافات سے کلیسا نے اس تجربی اسکول کا مقابلہ کیا جو اسلامی درسگاہوں سے شائقین یورپ تک پہنچا تھا۔ اور ان علمی نتائج کے مد مقابل بن گیا جو اس تجربی اسکول سے حاصل ہوئے تھے۔ اور علماء یورپ جن تک رسائی حاصل کر چکے تھے۔ کلیسا نے سائنس دانوں کو زندہ آگ میں جلایا۔ اور ان کے طریقہ کار اور ان کے تجربات کے نتائج تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

یہی قیامت بھی جو یورپ پر ٹوٹی۔ اور جس کے نتیجے میں سائنسدان اور ان کے ساتھ سارا یورپ کلیسا کا دشمن ہو گیا۔ اور دشمنی و عداوت جداعتدال سے گزر گئی۔

اس وقت کے نظریات اور مسائل کے ساتھ ساتھ انسان کی تذلیل و تحقیر کا جذبہ بھی کارفرما رہا اور اسی جذبہ کے زیر اثر خسیس ترین شہوتوں کو بھی بغیر کسی حد اور کسی قید کے مباح قرار دیا گیا۔

یہ سیلاب تا حال سرکش لہریں لیتا چلا آ رہا ہے۔ یہ سیلاب جو ابتداء یورپ سے یورپ نژاد امریکہ پہنچا اور وہاں

سے تمام روئے زمین پر پھیل گیا۔ اور اب تک تباہیاں پھیلا رہا ہے۔

صحافت، سنیما، ڈرامہ، ادب، مصوری، سنگ تراشی اور دیگر فنون اس طوفان بے حیائی میں مزید صورت پھونک رہے ہیں۔ اور ان سب کے پس پردہ اصل محرک حکماء صیہوں کا ”لائحہ عمل“ (پروٹوکل) ہے جو بتاتا ہے کہ فی الحقیقت صیہونیت کا مقصد ہی یہ ہے کہ غیر یہودی دنیا کو اباحت کا شکار بنا کر تباہ کر دیا جائے تاکہ ان کی صیہوٹی اقتدار کے سامنے سرنگوں کرنا آسان ہو۔!

انسانیت بڑی تیزی سے ہولناک تباہی کی طرف جا رہی ہے۔ زندگی کی دوڑ مجنونانہ روش اختیار کر چکی ہے اور متعدد اسباب مل کر اس حرکت میں مزید اضافہ کر رہے ہیں۔ اس کے سوا اب کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس بٹھکی ہوئی مدہوش اور مجنونانہ قیادت سے ہٹ کر انسانیت کی قیادت کوئی اور قوت سنبھال لے۔ (۲۶)

## عیسوی تصوف:

عیسوی تصوف کے بنیادی اصول چھ ہیں:

(1) سکون: یعنی دماغ ہر قسم کے ہیجان سے آزاد ہو، اسے کسی قسم کا کوئی خیال یا فکر پریشان نہ کر سکے،

چند چیزیں سکون قلب کی دشمن ہیں۔ مثلاً: کینہ، غصہ، لالچ، غیبت، بدگوئی، سازش، خود غرضی، دوسروں کے دکھ درد سے بے اعتنائی، تعصب، نفرت، تنگ نظری، جنسی ہیجان، حسد، آلاش نگاہ وغیرہ، یہ روحانی امراض ہیں جن سے روح بے چین ہو جاتی ہے۔

(2) اقوال میں پاکیزگی: کہ منہ سے کوئی گندہ لفظ نہ نکلے۔

(3) نفرت سے بچنا اور ہر انسان سے محبت کرنا۔

(4) ہر قضا کو بخندہ پیشانی برداشت کرنا اور یہ ایمان رکھنا کہ خدا مجسم محبت ہے اور اس کی طرف سے آنے والی ہر چیز خالص رحمت ہے، خواہ بظاہر وہ دکھ ہی ہو۔

(5) صبر و استقلال: یعنی راستی و صداقت پہ پامروں سے جم جانا اور کسی ترغیب و ترہیب سے ادھر ادھر نہ ہونا۔

(6) یہ ایمان کہ مجھ میں نور خداوندی موجود ہے، جس کا ظہور پاکیزگی کردار و گفتار اور طاعت و عبادت پر منحصر ہے، عبادت سے مادیت کے کثیف و دبیز حجابات گھس جاتے ہیں اور وہ نور چھن چھن کر باہر آنے لگتا ہے اس مضمون کو آر۔ ڈبلیو۔ ٹران یوں پیش کرتے ہیں:

God is creating, working and ruling through the agency of certain laws. Every flower that blooms and every snow-flake that plays between the earth and the heavens are governed by certain unchangeable laws. There is a force which is known as Maker of Laws. We call Him God. He fills the Universe with Himself alone, so that all is from Him and in Him and there is nothing that is outside. When we bring our lives into harmony with these great laws we open ourselves to Divine Inflow.

(In Tune with the Infinite)

ترجمہ: اللہ، تخلیق، تدبیر اور حکومت کے فرائض بعض قوانین کی وساطت سے سرانجام دے رہا ہے، ہر پھول جو جنم میں کھلتا، اور برف کا ہر گالا جو فضا میں رقصاں ہے، ان ناقابل تبدیل قوانین کے زیر اثر ہے۔ اس کائنات میں ایک قوت کا فرما ہے جو ان قوانین کی وضع ہے، اسے ہم خدا کہتے ہیں۔ کائنات میں صرف اللہ ہی اللہ ہے۔ ہر چیز کا منبع و مسکن وہی ہے اور اس کی ذات سے باہر کچھ بھی نہیں، جب ہم اپنی زندگی کو ان قوانین کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں تو حریم دل کے پٹ کھل جاتے ہیں اور ہماری ہستی کے در و دیوار خدائی نور سے جگمگا اٹھتے ہیں۔

قرآن میں ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَآمِنُوا بِرَسُولِهِ ”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور اس کے رسول کو مانو،  
يُؤْتِكُمْ كَفْلَيْنِ مِنْ رَحْمَتِهِ، وَيَجْعَلْ لَكُمْ نُودًا تَتَمَيَّنُّ مِنْ رَحْمَتِهِ“ اللہ تمہیں وہ  
تمشون بہ ویغفر لکم واللہ غفور رحیم نور عطا کرے گا جس کی روشنی میں تم جاؤہ حیات کو طے کرو  
گے، اور تمہاری خطائیں معاف کر دے گا، وہ بڑا صاحب  
(۲۲۷)

رحم و کرم ہے۔

عیسائیت اور ہندو ازم

دونوں مذاہب پر تبصرہ

عیسائیت اور ہندو ازم کی طرف سے جو دعویٰ کیا گیا ہے اس کو میں بالکل بے بنیاد نہیں کہتا۔ مگر یقینی طور پر میں اس کو نہایت ناقص حل سمجھتا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ انجیل اور وید میں اخلاق کے اعلیٰ اصول لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ مگر انسان کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ محض خلائیات کی ایک فہرست نہیں ہے۔ اس قسم کی فہرست کا علم انسان کو بہت پہلے سے ہے اور اس سلسلے میں شاید ہم انسانی معلومات میں کوئی خاص اضافہ نہیں کر سکتے۔ آج انسان کو دراصل ایک ایسے محرک کی ضرورت ہے جو ان معلوم اخلائیات پر عمل کرنے کے لئے ابھارتا ہو۔ وہ اس کے اندر ایسا مضبوط داعیہ پیدا کرے کہ جو کچھ وہ جانتا ہے اس کو وہ کرنے لگے اور اس لحاظ سے دونوں مذاہب تقریباً خالی ہیں۔

مگر یہ خالی ہونا اس نوعیت کا نہیں ہے جیسا کہ اوپر ہم نے ”اخلاق کے نام پر اخلاق“ پیدا کرنے والوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ یہ مذاہب جس طرح اخلاق کے کچھ اصول بناتے ہیں۔ اسی طرح ان کی تعلیمات میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جو ان پر عمل نہیں کریگا وہ اس کے لازمی نتیجے کے طور پر ایک برے انجام سے دوچار ہوگا۔ دونوں مذاہبوں میں زندگی بعد موت کا تصور موجود ہے اور دونوں مرنے کے بعد کسی نہ کسی شکل میں اچھے یا برے انجام کی خبر دیتے ہیں۔ یہی دراصل دو چیز ہے جو آدمی کو بد عنوانیوں سے روکنے والی ہے۔ یہ تصور ہاں بھی آدمی کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے جہاں کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں ہوتا۔ اس طرح ان مذاہب میں وہ قدر بنیادی طور پر موجود ہے جس کو اوپر ہم نے محرک عمل کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا ایک کھلا ہوا ثبوت خود ان مذاہب کی تاریخ میں موجود ہے۔ سابق دور میں ان مذاہب کی بنیاد پر جو سوسائٹی بنی تھی وہ اخلاقی اعتبار سے صریح طور پر موجودہ مادہ پرست سوسائٹی سے بہتر تھی۔ مگر ان مذاہب کے ماننے والوں نے اپنے مذاہب کو صحیح شکل میں محفوظ نہیں رکھا اور ان کی تعلیمات اب میں شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں وہ اس قدر ناقص اور الجھی ہوئی ہیں کہ کسی وسیع اور پائدار اصلاح کی بنیاد نہیں بن سکتیں۔

عیسائیت کا حال یہ ہے کہ جس انجیل میں پہاڑی کا وعظ ہے اسی میں مسیحی مذہب کا یہ عقیدہ بھی درج ہے کہ نجات کے لئے کسی عمل ضرورت نہیں۔ صرف یسوع مسیح پر ایمان لانا کافی ہے۔ اس نظریے کے مطابق ساری دنیا خدا کے نزدیک سزا کے لائق ہے۔ کیونکہ سب نے گناہ کیا اور خدا کے جلال سے محروم ہو گئے۔ اس لئے خدا نے اپنے بیٹے کو دنیا میں بھیجا اور اس کو سولہ پر چڑھا کر ”اس کے خون کے باعث ایک ایسا کفارہ ٹھہرایا۔“ جس کو مان کر دوسرے لوگ اپنے گناہ بخشوا لیں۔ اب نجات کے لئے عمل کی ضرورت نہیں۔ بلکہ صرف ”خدا کے بیٹے“ کی اس حیثیت کو تسلیم کرنا کافی ہے کیونکہ ”انسان شریعت کے اعمال کے بغیر ایمان کے سب سے راست باز ٹھہرتا ہے۔“ (نئے عہد نامے کی چھٹی کتاب باب ۳) ایسی حالت میں کوئی شخص آخر کس لئے عمل کے جھنجھٹ میں پڑے گا۔ کفارہ کا عقیدہ تسلیم کرنے کے بعد وہ

کون سا محرک ہے جو آدمی کو نیکی کے لئے ابھارے اور برائی سے روکنے پر مجبور کرے۔

انجیل کا یہ تضاد ہمارے نزدیک سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیم کا تضاد نہیں ہے۔ مگر آج عیسائیت کے نام سے جو چیز موجود ہے وہ قطعی طور پر یہی ہے۔ آں جناب نے تو مذہب کو اس کی صحیح ترین شکل میں پیش کیا تھا۔ مگر آپ کے ماننے والے آپ کی تعلیمات کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ دوسروں کی تشریح و تعبیر میں شامل ہو کر اصل حقیقت گم ہو گئی۔ انجیل کو دیکھئے تو ایک طرف اس میں بہترین موثر انداز میں آخرت کا ذکر اور اعلیٰ اخلاقیات کی تعلیم ملے گی۔ جس کو پڑھ کر آدمی کی روح بیدار ہوتی ہے اور اس کے اندر عمل کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ مگر اس کے بعد جب وہ اگلے صفحات میں سینٹ پاک کا فلسفہ پڑھتا ہے تو اس کو یہ تمام چیزیں بے ضرورت معلوم ہونے لگتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کفارہ کے عقیدے نے عیسائی مذہب میں عمل کی بنیاد کو اسی طرح کمزور کر دیا ہے جیسے کسی ملک کے دستور میں لکھ دیا جائے کہ اگرچہ یہاں پولس اوع عدالت کا نظام قائم رہے گا مگر کسی کو اس کی غلط روی پر سزا نہیں دی جائے گی۔ کیونکہ آدمی پاک باز رہنے پر قادر نہیں ہے۔

ہندو مذہب کا معاملہ بھی تقریباً یہی ہے۔ بظاہر وہ صرف اخلاقی اپیل نہیں کرتا بلکہ مزا اور انعام کا بھی ایک نظریہ اپنے پاس رکھتا ہے جس کو ”کرم“ کہتے ہیں یعنی اپنے کئے کا پھل پانا۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ نظریہ بھی اپنی ابتدائی شکل میں ایک صحیح نظریہ ہوگا۔ مگر اب تو وہ نہایت ناقص صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ ہندو مذہب پر فلسفہ کا جو لمبا دور گزر رہا ہے۔ غالباً اس زمانے میں لوگوں کی ذہنی موٹنگا فیوں نے اس کی ہیئت بدل دی۔ اور ایک صحیح چیز نے غلط شکل اختیار کر لی۔ اب یہ نظریہ جس صورت میں ہمارے سامنے ہے اس کو آداگون یا پر جنم کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جیسا عمل کرتا ہے اسی کے لحاظ سے وہ اگلے جنموں میں اچھے یا برے جسم میں پیدا ہوتا ہے اور پیدائش کا یہ چکر برابر چلتا رہتا ہے۔ اس عقیدے کی رو سے آج جو وجود انسان، حیوان، پرند اور درخت، سبزی، گھاس یا کیڑے مکوڑے کی شکل میں نظر آ رہا ہے وہ سب پچھلے اعمال کے نتیجے میں ہے۔ پر جنم کا یہ نظریہ معمولی اختلاف کے ساتھ ہندو مذہب کی تمام شاخوں میں تسلیم کیا جاتا ہے۔

اس نظریے کے اوپر بھی ہماری تنقید وہی ہے جو عیسائیت کے سلسلے میں ہم لکھ چکے ہیں۔ یعنی جس کے اندر جو محرک ہے وہ نہایت ناقص اور محدود ہے۔ وہ آدمی کے اندر کوئی ایسا زور دار داعیہ پیدا نہیں کرتا جس کی رغبت سے وہ اچھائی کی طرف لپکے اور جس کا ڈرا سے برائیوں سے روکنے پر مجبور کرے۔ فرض کیجئے ایک کلرک کو ایک غلط کام کے لئے پچاس ہزار روپے رشوت میں مل رہے ہیں۔ کیا صرف اس لئے وہ ملتے ہوئے فائدے کو چھوڑ دے گا کہ مرنے کے بعد



جب اس کا دوسرا جنم ہوگا تو اس میں وہ مجھڑ مکھی ہو جائے گا یا آم اور ببول کی شکل میں پیدا ہوگا۔ اینٹی کرپشن قانون کے تحت ملنے والی سزا کا خوف اگر کو اس عمل سے نہیں روکتا تو اگلے جنم میں کیڑا مکوڑا یا درخت بن جانے میں وہ کون سی ہولنا کی ہے جو آدمی کو لرزادے اور اس کو جرم سے باز رکھے۔ اس نظریے کے مطابق وحشیانہ جرائم کی ایک بہت بڑی سزا جو منوسمرتی میں بتائی گئی ہے وہ یہ کہ ایسا آدمی دوسرے جنم میں چنڈال کے گھر میں پیدا ہوگا۔ چنڈال سے مراد پاسی، ملاح، دھوبی، ڈوم، چمار وغیرہ ہیں۔ ممکن ہے کہ کسی زمانے میں ان قوموں کی یہ حالت رہی ہو۔ مگر اب تو ان کا لقب ہریجن (خدا والے) ہے۔ ان کو وقت کے دستور میں دوسرے انسانوں کے برابر درجہ حاصل ہے۔ اور ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بنگلوں اور کاروں میں زندگی گزارتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک اچھوت لیڈر اگر پبلکیشن میں جیت جائے تو وہ وزارت کا عہدہ حاصل کر کے برہمن آبادی کے اوپر حکومت کرتا ہے اور ان کے لئے قانون بناتا ہے۔ آخر اس طرح کے انجام میں وہ کون سا بھیا نک پن ہے جو کسی کو جرم سے روکنے کا سبب بن سکے۔

اور بالفرض اگر اس سزا کی کوئی ایسی تعبیر کی جائے جس میں وہ بھیا نک نظر آنے لگے تو اس کے بعد بھی اس کے اندر ایک ایسا خلا باقی رہتا ہے جو آدمی کے جذبات کو سرد کرنے کے لئے کافی ہے۔ اگر آپ ایک تباہ حال آدمی کو لیں اور اس سے پوچھیں کہ تم نے اپنے پچھلے جنم میں کیا کیا تھا جس کے نتیجے میں یہ انجام بھگت رہے ہو تو وہ کچھ نہ بتا سکے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم میں سے کسی کو یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم اس سے پہلے دنیا میں آئے بھی تھے یا نہیں۔ پرنجم کے عقیدے کے مطابق انسان کو اس کے عمل کا بدلہ دینے کا معاملہ بالکل بے خبری میں انجام پاتا ہے۔ اور یہ بے خبری پرنجم کی تمام شکلوں میں موجود ہوتی ہے۔ ان احساسات رکھنے والے ایک وجود نے اپنی زندگی میں ایک کام کیا تھا۔ اس کو جب اپنے اس عمل کا انجام ملتا ہے تو وہ اپنے پچھلے وجود کو بھول چکا ہوتا ہے۔ کیا ایسے ایک واقعہ کو سزا کہا جاسکتا ہے۔ یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے بے ہوشی کا انجکشن دے کر کسی کی چیر پھاڑ کی جائے۔ بلکہ زیادہ ٹھیک لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے آج کے عمل کا بدلہ کل دوسرے شخص کو ملے گا اور میری آج کی بد اعمالیوں کی سزا کل کسی اور کو بھگتنی پڑے گی۔ مرنے کے بعد جب میں اپنے موجودہ شعور اور موجودہ احساسات کے ساتھ ختم ہو جاؤں گا تو اس کے بعد کی پیدائش کچھ میری پیدائش کیوں کہا جائے۔ پھر جس عمل کا انجام میرے بعد دوسرے انسان کو ملنے والا ہے اس کے لیے آخر میں کیوں کوشش کروں اور جس بد عملی کی سزا دوسرے وجود کو بھگتنی ہے اس میں کیوں ڈروں۔ پرنجم میں روح کے قالب ہونے کو جس شکل میں پیش کیا گیا ہے ممکن ہے اس کو منطقی استدلال اور فلسفیانہ بحثوں کے ذریعہ ایک انسان کا مختلف جنم قرار دیا جاسکے مگر قطعی طور پر یہ ایک لفظی استدلال ہوگا۔ حقیقت کے اعتبار سے یہ بات بالکل ناقابل فہم ہے کہ اس طرح کے

مختلف جنموں کو ایک انسان کو جنم کس بنا پر کہا جاتا ہے۔

اسی طرح اس نظر کے اندر انسانی کامیابی کا جو تصور دیا گیا ہے اس میں بھی ہمارے لئے کوئی کشش نہیں ہو سکتی۔ پر جنم کے مطابق انسان کی کامیابی یہ ہے کہ اس کی روح مختلف قابلوں میں پیدا ہو کر ارتقاء کرتی رہے یہاں تک کہ بالآخر خدا یا پر ماتما کے وجود میں گم ہو جائے جس کو نجات یا نروان کہا جاتا ہے۔ یہاں مجھے اس نظر کی علمی اور فلسفیانہ پہلوؤں سے بحث نہیں ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس طرح ایک کے ایک نظریے میں وہ کون سی کشش ہے جس کے لئے آدمی دنیا کے دکھ جھیلے اور زندگی بھر خواہ مخواہ ذمہ داریاں پوری کرنے اور حقوق ادا کرنے کا کھڑا گ اپنے سرمول لے۔ اس کامیابی میں انسان کو کیا ملا۔ اس کو زیادہ سے زیادہ پر ماتما کی اپنی تکمیل کہا جاسکتا ہے نہ کہ کسی انسان کا ارتقاء۔ پھر جس عمل کا فائدہ تمام تر دوسرے کو ملنے والا ہو اس میں آدمی کیوں محنت کرے۔ ممکن ہے کچھ مخصوص قسم کے فلسفیانہ ذوق رکھنے والے لوگوں کو اس طرح نامعلوم ارتقاء سے دلچسپی ہو۔ مگر عام انسان جن جذبات اور جن تمناؤں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے اس کے لئے اس میں کوئی کشش نہیں ہو سکتی اور صرف یہ واقعہ فلسفہ بروان کے خلاف فطرت اور خلاف واقعہ ہونے کا کافی ثبوت ہے۔

(۲۲۸)

## بدھ مت

### تعلیمات و نظریات:

گوتم بدھ کی زندگی تک بدھ مت کی تعلیم نہایت سادہ تھی۔ گوتم نے نہ تو کوئی کتاب لکھی، نہ عبادت گاہ بنوائی اور نہ ہی ریاضت کا کوئی خاص طریقہ تقرر کیا۔ ان کی وفات کے بعد بدھ مت مختلف گروہوں میں بٹ گیا اور ہر گروہ نے اپنے اپنے جداگانہ نظریات پیش کئے۔

بدھ مت میں خدا، اخروی زندگی، جنت و دوزخ، عذاب و ثواب، تناسخ، رسوم عبادات اور قربانی وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

بدھ نے اپنے پیروؤں کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔

(۱) **اپاسک :** وہ لوگ جو دنیا داری کے کاموں میں مشغول رہ کر بدھ کی تعلیمات پر عمل کرتے تھے۔

(2) بھکشو : راہب، جو مجردانہ زندگی بسر کرتے تھے۔

دنیا داروں کے لئے بدھ مت کی تعلیمات:

بدھ نے دنیا داروں کو مندرجہ ذیل قسم کی ہدایات دیں۔

۱۔ کسی جاندار کو قتل نہ کریں۔

۲۔ چوری نہ کریں۔

۳۔ زنا سے مکمل پرہیز کریں۔

۴۔ ہر قسم کی دروغ گوئی سے اجتناب کریں۔

۵۔ نشہ سے پرہیز کریں۔

۶۔ والدین اپنے بچوں کی اچھی تربیت کریں، انہیں نیک کاموں کی تلقین کریں، بہتر علوم و فنون کی تعلیم دلوائیں اور جوان ہونے پر ان کے لئے اچھے رشتے تلاش کر کے ان کی شادیاں کریں۔ بچوں کو ان کے والدین کے ترکہ میں بھی شامل کیا جائے۔

۷۔ اولاد کا فرض ہے کہ وہ والدین کی عزت اور خدمت کرے اور زندگی کی مصروفیات میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

۸۔ آپس میں دوستانہ مراسم پیدا کیے جائیں۔ دوستوں کو تحائف دیئے جائیں اور شادی وغنی میں شرکت کی جائے۔

دوست کی عدم موجودگی میں اس کے گھربار کی نگرانی کی جائے اور خطرہ کی حالت میں اسے پناہ دی جائے۔

۹۔ ملازمین سے ان کی طاقت کے مطابق کام لیا جائے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔

۱۰۔ خاوند پر فرض ہے کہ وہ بیوی کے ساتھ مہربانی سے پیش آئے اسے نان و نفقہ کے علاوہ مناسب کپڑے اور

زیورات بھی دے۔

۱۱۔ بیوی کا کام امور خانہ داری انجام دینا ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ خاوند کے رشتہ داروں کی مہمانداری کرے، خاوند

کی عدم موجودگی میں اپنی عصمت کی حفاظت کرے۔ گھریلو اخراجات میں کفایت شعاری سے کام لے اور تمام کام

ہوشیاری سے انجام دے۔

۱۲۔ استاد کا فرض ہے کہ شاگردوں کو ایسی تعلیم دے جس سے ان کا علم دیر پا ہو، شاگردوں کو خطرات سے محفوظ رکھے

اور ان کے ساتھ شفقت سے پیش آئے۔

- ۱۳۔ شاگرد کا فرض ہے استاد کی تعظیم و توقیر کرے اس کا حکم مانے اور اس کے نائب کی طرح کام کرے۔
- ۱۴۔ دنیا داروں کا فرض ہے کہ وہ بھکشوؤں (درویشوں) کی ضروریات پوری کریں اور ان کے ساتھ عزت اور محبت سے پیش آئیں۔

## درویشوں (بھکشوؤں) کے لئے بدھ کی تعلیمات

بھکشوؤں کے لئے جو قانون منضبط کیا گیا وہ چھ حصوں میں منقسم ہے:

### (1) مراقبہ:

- مراقبہ کے چار درجات ہیں۔
- 1- جسمانی کثافت دور کرنے کے لئے۔
  - 2- پر جوش حس کی پیدا کی ہوئی برائیاں دور کرنے کے لئے۔
  - 3- خیالات کا عدم استعمال۔
  - 4- کیفیات ہستی۔

### (2) جدوجہد:

- اس کے چار مراتب ہیں۔
- 1- برائیوں کی پیدائش کو روکنا۔
  - 2- موجودہ برائیوں کو دور کرنا۔
  - 3- غیر موجودہ نیکی پیدا کرنے کی کوشش کرنا۔
  - 4- پیدا کی ہوئی نیکی کو ترقی دینا۔

### (3) دینداری کے راستے:

اس کے بھی چار مراتب ہیں۔

- 1- دیندار بننے کی خواہش رکھنا۔
- 2- دیندار بننے کے لئے ضروری جدوجہد۔
- 3- دیندار بننے کے لئے نیت و ارادہ کی پختگی۔
- 4- دیندار بننے کے لئے تحقیقات۔

#### (4) اخلاقی طاقتیں:

اخلاقی طاقتوں کے پانچ مراتب ہیں۔

- (1) ایمان (2) ہمت (3) حافظہ
- (4) تصور (5) الہام و باطنی دانش۔
- (5) دانش:

اس کے سات مراتب ہیں۔

- (1) ہمت (2) حافظہ (3) تصور
- (4) تحقیقات کتب (5) نشاط (6) استراحت
- (7) سلیم الطبعی۔
- (6) اعلیٰ طبقے:

اعلیٰ طبقے آٹھ ہیں۔

- (1) صدق و عقیدت (2) صدق ارادت (3) راست گوئی
- (4) راستبازی (5) حلال روزی (6) عزم صمیم
- (7) سچی توجہ (8) صادق تصور۔

#### (7) چار صداقتیں:

بدھ مت میں مندرجہ ذیل امور کو ’صداقتیں‘ تصور کیا جاتا ہے:

- 1- زندگی مصیبت اور پریشانیوں کا مجموعہ ہے۔
- 2- زندگی پر یہ مصیبتیں اور پریشانیاں نفسانی خواہشات کی وجہ سے نازل ہوتی ہیں
- 3- ہر انسان اگر چاہے تو ان نفسانی خواہشات پر قابو پاسکتا ہے۔
- 4- نفسانی خواہشات پر قابو پانے کے لئے نفس کشی یا سخت ریاضت کی ضرورت نہیں بلکہ انسان کو اعتدال کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

(8) آٹھ اصول:

اعتدال کا راستہ اپنانے کے لئے آٹھ اصولوں پر عمل کرنا ضروری ہے:

- |     |                  |     |            |     |              |     |          |
|-----|------------------|-----|------------|-----|--------------|-----|----------|
| (1) | صحیح علم و عقیدہ | (2) | صحیح ارادہ | (3) | صحیح کلام    | (4) | صحیح عمل |
| (5) | صحیح سلوک        | (6) | صحیح کوشش  | (7) | صحیح یادداشت |     |          |
| (8) | صحیح غور و فکر   |     |            |     |              |     |          |

(9) نروان:

”نروان“ سے مراد ہے مکتی، موکش، نجات ہے۔ بدھ کی تعلیم کا مرکزی نکتہ نروان کا حصول ہے۔ بدھ کے نزدیک ہر برائی کی جڑ خواہش نفسانی ہے۔ جب انسان خواہشات نفسانی سے پاک ہو جاتا ہے تو وہ نروان حاصل کر لیتا ہے اور اسے ابدی سرور میسر آتا ہے۔

خواہشات نفسانی کو زیر کرنے کے لئے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے خیالات، اقوال، اعمال، ارادوں، کوششوں اور سوچ بچار میں سچائی کا راستہ اختیار کرے۔ اس سے ابدی خوشی حاصل ہوگی اور وہ بار بار مرنے اور پیدا ہونے کی مصیبت سے نجات پا جائے گا۔

نروان، بدھ کے نزدیک انسان کی منزل مقصود ہے جو پاکیزہ اور مبارک موت کی صورت میں انسانی وجود پر طاری ہوتی ہے اور انسان تمام دنیاوی مصائب سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ بدھ کا عقیدہ تھا کہ نروان دیوی دیوتاؤں کی پوجا یا قربانیاں کرنے سے حاصل ہو سکتا نوع انسانی کے ساتھ محبت کرنے، پاکیزہ زندگی بسر کرنے اور اپنے جذبات و خواہشات پر قابو پالینے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ (یاد رہے کہ نجات سے مراد عذاب اخروی سے نجات نہیں بلکہ خواہشات و شہوات کے بکھیروں سے نجات ہے۔)

## (10) اعمال (مسئلہ کرم):

بدھ کے نزدیک انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ برائی انسان خود کرتا ہے لہذا اس کا خراب نتیجہ بھی اسے خود برداشت کرنا ہوگا۔ انسان خود ہی برائی سے دور رہ سکتا ہے اور کوئی دوسرا اسے برائی سے نہیں بچا سکتا کیونکہ پاکیزگی اور نجاست دونوں ذاتی صفات ہیں۔ بعض بدھوں کا کہنا ہے کہ انسان اپنی قسمت کا آپ بنانے والا ہے۔ اگر وہ نیک کام کرے گا اور پاکیزہ زندگی گزارے گا تو مرنے کے بعد اس کا آئندہ جنم برتر ہوگا۔ اگر وہ برے اعمال اختیار کرے گا تو وہ پہلے سے کمتر درجہ میں جنم پائے گا یعنی ہر انسان کو اپنے اعمال کی سزا یا جزا ملے گی۔ جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔ جو بوئے گا سو کاٹے گا۔ (یاد رہے کہ تناخ کا نظریہ بدھ کی وفات کے بعد اپنایا گیا۔)

## (11) ممنوعات:

بدھ مت میں مندرجہ ذیل امور کے ممانعت ہے۔

- |                              |                           |                                   |
|------------------------------|---------------------------|-----------------------------------|
| (1) چوری                     | (2) جھوٹ                  | (3) زنا                           |
| (4) نشہ آور اشیاء کا استعمال | (5) خوشبو کا استعمال      | (6) دوپہر کے بعد کھانا تناول کرنا |
| (7) رقص و سرور               | (8) سونے چاندی کا استعمال | (9) گوشت خوری                     |
| (10) قربانی                  | (11) ستی کی رسم           | (12) بت پرستی                     |
| (13) ذات پات کی تفریق        | (14) کسی جاندار کا قتل    | (15) (۲۴۹)                        |

## بدھ مت اور اسلامی تصوف

بدھ مت فلسفہ روحانیت میں مادہ کو قدیم کہتے ہیں۔ جبکہ اسلامی تصوف میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات قدیم ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی چیز قدیم نہیں ہے۔ اگر کوئی ایسا عقیدہ رکھے گا تو وہ ہمارے نزدیک کافر ہوگا۔ اسی طرح بدھ مت فلسفہ روحانیت میں آخری مقام فنا ہے۔ لیکن اسلامی تصوف میں آخری مقام فنا فی اللہ کے بعد بقاء

باللہ ہے۔ (۱۰۰:۵)

جس طرح پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ اللہ تک پہنچنے کے لیے انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے بعد اولیائے کرام نے مختلف اوراد و وظائف بتائے ہیں جن کے ساتھ ریاضت و مجاہدہ کر کے معرفت الہی حاصل کی جاتی ہے۔ اس طرح مذاہب بدھ مت میں ریاضت اور مجاہدہ کے لیے ایک طریقہ کار مقرر ہے جسے یوگا سے موسوم کیا جاتا ہے وہ درج ذیل ہے۔

### تبت کا یوگا:

اس کے اہم پہلو یہ ہیں۔

#### (1) تساما:

سیاہ غاروں میں ساری زندگی گزار دینا۔

#### (2) چاڈ:

خوفناک جنگلوں میں جا بیٹھنا، ایسے یوگی کو عموماً درندے کھا جاتے ہیں۔ اس کا فلسفہ یہ ہوتا ہے۔  
 ”میں اپنا گوشت بھوکوں اور خون پیاسوں کے لئے پیش کرتا ہوں اپنی کھال ان کے حوالے کرتا ہوں جو برہنہ ہیں کہ میری کھال سے تن ڈھانک سکیں، اپنی ہڈیاں ان کو دیتا ہوں جو سردی سے ٹھہر رہے ہیں، تاکہ انہیں جلا کر آگ تاپیں، اور تمام مسرتیں ان کے حوالے کرتا ہوں جو ناشاد ہیں۔“  
 اس گروہ کا خیال ہے کہ روح جزو خدا ہے۔ اسے جسم کی آلائشوں سے پاک کرنا کمال بندگی ہے۔

#### (3) لنگم:

طویل مسافتیں یوں طے کرنا کہ تھکان نہ ہو، اس مقصد کے لئے یہ یوگی برسوں چلتے ہیں اور تب کہیں اس مقام پر پہنچتے ہیں۔

#### (4) ٹومو:

سانس کی بعض مشقوں سے جسم میں آگ بھڑکالینا۔

ان تمام مسالک کا مرکزی نقطہ اللہ کا دھیان، ماسوی اللہ سے اعراض، ترک خواہشات اور روح کی وسعت و بالیدگی ہے۔



ان جو گیوں کا اس حقیقت پر ایمان ہے کہ حقیقی و اساسی چیز روح ہے اور مادہ دخل در معقولات کی حیثیت رکھتا ہے۔  
(۲۷۶) آر تھر فنڈ لے کو قول ہے:

The real universe is the etheric, and physical matter is but an intrusion in what we call space where the real universe exists. We think it empty but it is full of life.

(On the Edge of the Etheric, p . 15)

ترجمہ: اصل کائنات (مادی نہیں بلکہ) ائیری ہے اور مادہ محض دخل در معقولات کی حیثیت رکھتا ہے۔ اصل کائنات اشیر میں آباد ہے، ہم اسے خالی سمجھتے ہیں لیکن دراصل یہ زندگی سے لبریز ہے۔ (۲۵۵)

## زرتشت

### عقائد اور تعلیمات:

اکثر محققین کا خیال ہے کہ زرتشت موحد تھا۔ زرتشت کے نزدیک خدا خالق اکبر ہے جو چھ صفات کا حامل ہے۔ ان صفات کو مجموعی طور پر ”ایشاسپنتا“ کا نام دیا گیا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ ممتاز صفات یہ ہیں۔

۱۔ آشا (صداقت، راستی)

۲۔ واہوما (نیک خیالات)

۳۔ آرا میتی (تقویٰ)

زرتشت کے نزدیک

۱۔ خدا خالق کائنات ہے۔

۲۔ خدا مالک کائنات ہے۔

۳۔ خدا ایک ہے مگر اس کی توحید عددی نہیں بلکہ احدیت ذاتی ہے۔

۴۔ اس کا کوئی ہمسر نہیں۔

۵۔ اس کا کوئی مثل نہیں۔

- ۶۔ وہ ماں، بیوی، اولاد، جگہ، جسم، راحت، جسمانیات اور رنگ و بو کے تحت ہے۔
- ۷۔ اسے نہ آنکھیں دیکھ سکتی ہیں اور نہ ہی خیالی گرفت میں لایا جاسکتا ہے۔
- ۸۔ وہ ظاہر و آشکار ہونے کے باوجود پوشیدہ و پنہاں ہے۔
- ۹۔ وہ پہلی ہستی ہے اس سے پیشتر کوئی ہستی نہیں ہو سکتی۔
- ۱۰۔ اس کی ہر صفت برتر ہے۔
- ۱۱۔ وہ غیر فانی ہے۔
- ۱۲۔ وہ عقل کل ہے۔
- ۱۳۔ وہ قوی ہے۔
- ۱۴۔ وہی حقیقت اعلیٰ ہے۔ اور وہی روح اعلیٰ۔
- ۱۵۔ وہ مخلوق کا محافظ ہے۔

### نظریہ تجسیم:

زرشتی مذہب میں اہورامزدا کی چند خصوصیات کی تجسیم کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جنہیں ”ایشا سپستا“ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ خصوصیات حسب ذیل ہیں:

- ۱۔ وہومانو۔
- ۲۔ اساوہستا۔
- ۳۔ کشتمر اور یا۔
- ۴۔ سپستا آریتی۔
- ۵۔ ہوروت۔
- ۶۔ امرپتا۔
- ۷۔ اہورامزدا۔

سات متبرک شخصیات:

زرشتی تصور معبود میں اہورامزدا کی بعض اہم خصوصیات کو متعین شخصیات کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ وہی شخصیات ہیں جنہیں ”خصوصیات“ بھی کہا گیا ہے اور ”ایشا سپستا“ کا نام دیا گیا ہے۔ یہ سات شخصیتیں ہیں جو درج

ذیل ہیں:

(۱) روح القدس (۲) درجہ کمال (۳) نظم کائنات و راستی (۴) اختیار و کامل (۵) نیک خیال (۶) اخلاص (۷) قائم و دائم۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ سات شخصیتیں درمیانی واسطہ کے طور پر کام کرتی ہیں انہیں اسلام کے عقیدہ ملائکہ سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔

ملائکہ:

زرتشت ملائکہ پر ایمان رکھتا ہے اس کا کہنا ہے کہ ملائکہ کی تعداد بے شمار ہے۔ ملائکہ کلام الہی پیغمبر کے دل پر نازل کرتے ہیں۔

حبث اور دوزخ:

زرتشت حیات بعد الموت اور حبث و دوزخ کا قائل ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جب نیک آدمی جسم چھوڑتا ہے تو وہ جنت میں پہنچ جاتا ہے۔ خدا بہشتیوں کو جو جسم عطا کرے گا وہ نہ تو ریزہ ریزہ ہوگا اور نہ بوسیدہ وہ جسم نہ تھکے گا اور نہ ہی اس میں غلاظت پیدا ہوگی۔ زرتشت کا عقیدہ ہے کہ گنہگار مرنے کے بعد دوزخ میں جائیں گے اور ان کی برائیاں انہیں آگ کی صورت میں جلائیں گی۔ انہیں سانپ، کچھو اور دوسرے زہریلے جانور عذاب دیں گے۔

رسولوں کے متعلق عقیدہ:

زرتشت کا عقیدہ ہے کہ خدا مخلوق کی بہتری کے لیے پیغمبر مبعوث کرتا ہے۔ پیغمبروں کی ضرورت اس لیے ہے کہ لوگ کاروبار زندگی میں ایک دوسرے کے محتاج ہیں انہیں ایسے شرائع کی ضرورت ہے جنہیں سب لوگ مان لیں تاکہ دنیا سے ظلم و ستم اور فریب وغیرہ کا خاتمہ ہو جائے اور نظام عالم درست چلنے لگے۔ پیغمبر کی شناخت سے متعلق زرتشت بتایا ہے کہ جو کچھ پیغمبر جانتا ہے دوسرے نہیں جانتے جو کچھ اس سے پوچھا جائے اگر وہ پیغمبر ہے تو اس کے جواب سے عاجز نہیں ہوگا۔ پیغمبر جو کچھ کرتا ہے دوسرے نہیں کر سکتے۔

تخلیق کائنات سے متعلق نظریات:

زرتشت کا کہنا ہے کہ تخلیق کائنات چھ ادوار میں ہوئی۔ اہورامزدا نے ترتیب وار آسمان، پانی، زمین، نباتات، حیوانات اور آخر میں انسان کو پیدا کیا۔ تمام نوع انسانی کو ایک ہی جوڑے سے پیدا کیا گیا۔

## تعلیمات (اخلاقیات):

زرتشت رہبانیت کی مذمت کرتا ہے اور عاہلی زندگی گزارنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کی اخلاقی تعلیمات میں صداقت و راست گوئی، ظاہر و باطنی طہارت اور دوسروں کی مالی و اخلاقی امداد جیسے فضائل شامل ہیں۔

زرتشت کی تعلیمات درج ذیل ہیں۔

- ۱۔ سچ بولو جھوٹ نہ بولو جھوٹ بولنا بدترین گناہ ہے۔
- ۲۔ ظاہری اور باطنی طہارت کو عزیز رکھو۔
- ۳۔ جو شخص مالدار ہو اسے چاہے کہ اپنے فاضل مال کے ذریعہ دوسروں کی مدد کرے اور اعلیٰ تعلقات کے قیام کے لیے عمدہ کام انجام دے۔
- ۴۔ اس شخص پر حیف ہے جو شخص خیرات دے لیکن خیرات دیتے وقت اس کا دل خوش نہ ہو۔
- ۵۔ خیرات یا مالی مدد صرف مستحقین کو دینی چاہے جو خیرات غیر مستحقین کو دی جاتی ہے وہ رائیگاں جاتی ہے۔
- ۶۔ خیرات دینے میں مذہب کا خیال نہیں رکھنا چاہے، غیر مذہب کے نادار اور مستحقین کو بھی خیرات دی جاسکتی ہے۔
- ۷۔ محنت سے روزی کماؤ۔ زمین کی کاشت اور جانوروں کی پرورش نیکی ہے۔
- ۸۔ وہ شخص جو خاندان رکھتا ہو اس سے بہتر ہے جس کا کوئی خاندان نہ ہو۔
- ۹۔ ایسا شخص جو خاندان رکھتا ہو اس سے بہتر ہے جس کا کوئی خاندان نہ ہو۔
- ۱۰۔ چوری ڈاکا زنی اور خونریزی قطعاً ممنوع ہے۔

## زرتشت ازم کی مذہبی کتب:

زرتشت کی وفات کے کافی عرصہ بعد اس کی تعلیمات و عقائد کو تحریری صورت میں جمع کیا گیا۔ اکثر مؤرخین متفق ہیں کہ زرتشت کے عقائد و نظریات جو کتب میں درج ہیں تحریف شدہ ہیں، تاہم زرتشت ازم کی مذہبی کتب کے نام درج ذیل ہیں۔

- ۱۔ وساتیر خورد
- ۲۔ وساتیر کلاں۔

۳۔ اوستا خورد۔

۴۔ اوستا کلاں۔

”اوستا“ پانچ حصوں پر مشتمل ہے اور ہر حصہ کا نام الگ الگ ہے۔ ان میں سے ایک حصہ ”ژند“ اور ایک حصہ ”پاژند“ کہلاتا ہے۔ ایک حصہ کا نام ”گاتھا“ ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ یہ خود زرتشت کی تحریر ہے۔ گاتھا کا ایک بڑا حصہ سزاؤں کے بیان پر مشتمل ہے جو آئندہ زندگی میں گنہگاروں کو بھگتنی پڑیں گی۔ ان سزاؤں میں سے سے اہم آگ ہے جو بدکرداروں پر اوپر سے برسائی جائے گی۔

## فلسفہ زرتشت اور اسلامی تصوف

ایران کے زرتشتی مذہب کے نزدیک وجود دو ہیں۔ تعمیری، تخریبی، مادہ کوئی وجود مطلق نہیں رکھتا بلکہ اہوارہ کی تخلیق ہے جو خود وجود مطلق، خداوند یا اللہ ہے، جو مکمل، ازلی اور ابدی، تغیر و زوال سے پاک ہے۔ جس نے زمین اور آسمان کی تخلیق کی ہے۔ یہ وجود مطلق جب ظہور کرتا ہے تو اس کے دورخ ہوتے ہیں۔ ایک رخ دائمی، تعمیری نور، حیات اور خیر ہے۔ دوسرا عارضی تخریبی، ظلمت، موت اور شر ہے۔ یہ دونوں پہلو کائنات میں ہر جگہ عیاں ہیں۔ اسلامی تصوف میں وجود صرف ایک ہے اور وہ ذات خداوندی کا ہے اس کے علاوہ تعینات ہیں۔ وہی ایک وجود ہر جگہ موجود ہے (۲۵۱)

انیما توتوا فشم وجه الله

جدھر دیکھو اللہ ہی اللہ ہے۔ (۲۵۲)

نحن اقرب اليه من حبل للوريد -

(۲۵۳) انسان کی شہرگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

اسلام میں دو وجودوں یا دو خداؤں کا تصور شرک اور کفر ہے۔

## یہودیت

عقائد یہود:

ذیل میں عتیق (تورات، بائبل) کے حوالہ سے یہودیوں کے عقائد پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

## عقیدہ توحید و شرک:

انبیائے کرام کی اصل تعلیم اور اصل تورات کی رو سے یہودیت توحید کا مذہب ہے۔ ”عہد نامہ عتیق: میں خدا کو یہودہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ مورخین کا بیان ہے کہ علمائے یہود خدا کا نام لینے میں ہتک اور بے عزتی تصور کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے یہ سزا مقرر کی تھی جو شخص خدا کا نام لے گا وہ سنگسار کیا جائے گا۔

## اس سلسلے میں عہد نامہ عتیق کی یہ عبارت ملاحظہ ہو:

”تو خداوند خدا کا نام بے فائدہ مت لے کیونکہ جو اس کا نام بے فائدہ لیتا ہے خداوند اسے بے گناہ نہ ٹھہرائے گا: اس حکم کے تحت سال میں ایک مقدس انسان بیت المقدس کے اندر ایک دفعہ خدا کا نام لے سکتا ہے اور سب لوگ خاموشی سے سنتے ہیں۔

بائبل میں خدا کا تصور قوی ہے۔ ہر جگہ خداوند اسرائیل کے نام سے پکارا گیا ہے۔

مثلاً ”اے خداوند اسرائیل کے خدا تجھ سے کوئی خدا اوپر آسمان میں ہے۔

اور نہ زمین میں جو کہ اپنے بندوں کے لئے رحمت کی نگاہ رکھتا ہے۔“

خدا کی وحدانیت کا اقرار یوں کیا گیا ہے۔

”میرے حضور تیرے لئے دوسرا خدا نہ ہووے۔“

مختلف جگہوں پر کہا گیا ہے کہ خدا مہذب ہے۔ وہ تمام زمین کے اوپر بادشاہ ہے۔ خداوند کا تخت آسمان پر ہے۔

اس کی آنکھیں دیکھتی ہیں اس کی پلکیں بنی آدم کو آزماتی ہیں۔ خداوند آسمان پر سے دیکھتا ہے اور تمام بنی آدم پر نگاہ کرتا ہے۔

عہد نامہ عتیق میں خدا کو غضبناک بھی دکھایا گیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی ہستی ہے جو انسان کی سرکشی اور بغاوت کی وجہ سے آپے سے باہر ہو جاتی ہے اور پھر غصہ میں آکر ایک قوم بلکہ اس کے ساتھ چرند، پرند اور حیوانات کو بھی ہلاک کر دیتی ہے۔

یہودیوں کے ہاں خدا کو رنج و الم، تاسف و افسوس، تکان اور اسی طرح کے دوسرے انسانی عوارض بھی لاحق ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً ان کے نزدیک تخلیق کائنات سے فارغ ہو کر خدا کے آرام کا دن تھا لہذا شریعت موسوی میں اسے عبادت کا دن

قرار دیا گیا۔ حضرت نوح کے وقت لوگوں کا کفر و شرک دیکھ کر خدا کو تخلیق انسان پر پچھتانا پڑا۔ پھر خدا کو مجسم کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ خدا نے حضرت یعقوب سے کشتی لڑی اور دونوں برابر رہے۔ خدا یہود کے قافلے کے آگے آگے چلا کرتا تھا۔ بعض جگہوں پر خدا کی اولاد بھی تسلیم کی گئی ہے۔ مثلاً کہا گیا ہے کہ حضرت آدم کے وقت میں خدا کے بیٹے خدا کی بیٹیوں سے مقاربت کر کے انسانی نسل میں اضافہ کرتے تھے۔

عہد نامہ عتیق کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہودیوں کا تو حیدی عقیدہ تو حید خالص نہیں ہے اس میں شرک کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ یہودیوں کا ایک فرقہ حضرت عزیر کو ابن خدا تصور کرتا تھا۔

### ملائکہ سے متعلق عقیدہ:

بائبل میں ملائکہ کا ذکر دو طرح سے کیا گیا ہے ایک تو فرشتوں کو انسان سے افضل قرار دیا گیا ہے دوسرے ان کو خدا کی بیٹیاں تصور کیا گیا ہے۔ انہیں ”ایلوہیم“، ”قدوسی“ اور ”پاک“ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ کبھی کہا گیا ہے کہ وہ خدا کے لشکری ہیں اور کبھی انہیں خدا کے مشیر بتایا گیا ہے۔ ان کا کام انسان پر خدا کی مرضی ظاہر کرنا اور خدا کے حکم و انصاف کو نافذ کرنا ہے۔ یہودی حضرت جبریل (فرشتے) کے دشمن ہیں کیونکہ اس نے ان پر بار بار ان کی سرکشی کے باعث عذاب الہی کا کوڑا برسایا تھا۔ باب پیدائش میں لکھا ہے کہ ”فرشتوں کی ایک جماعت گنہگار ہو گئی اور انسان سے ادنیٰ ہو گئی اس جماعت کا انصاف انسان کریں گے۔“

### تخلیق عالم:

کتاب پیدائش کے شروع میں بتایا گیا ہے کہ: خدا نے ابتداء میں زمین و آسمان کو پیدا کیا۔ زمین ویران اور سنسان تھی اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا اور خدا کی روح پانی کی سطح پر جنبش کرتی تھی اور خدا نے کہا کہ روشنی ہو جا اور روشنی ہو گئی۔

اور خدا نے دیکھا کہ روشنی اچھی ہے اور خدا نے روشنی کو تاریکی سے جدا کیا اور خدا نے روشنی کو تو دن کہا اور تاریکی کو رات اور شام ہوئی اور صبح ہوئی سو پہلا دن ہوا۔

کتاب پیدائش کے مطابق خدا نے تمام عالم اور انسان کو چھ دن میں پیدا کیا چھٹے روز اس نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا کتاب پیدائش باب دوم میں لکھا ہے کہ سو آسمان اور زمین اور ان کے کل لشکر کا بنانا ختم ہوا اور خدا نے اپنے کام کو جیسے وہ کرتا تھا ساتویں دن ختم کیا اور اپنے سارے کام سے جسے وہ کر رہا تھا ساتویں دن فارغ ہوا اور خدا نے ساتویں دن کو

برکت دی اور اسے مقدس ٹھہرایا کیونکہ اس میں خدا ساری کائنات سے جیسے اس نے پیدا کیا اور بنایا فارغ ہوا  
 عقیدہ رسالت: یہودی رسالت پر ایمان رکھتے ہیں لیکن ان کے نزدیک انبیاء کا معصوم ہونا ضروری نہیں۔ انہوں نے  
 بڑے بڑے عظیم پیغمبروں پر کفر، شرک، کذب، شراب خوری، فریب، شہوت پرستی اور زنا کاری کے الزام لگائے ہیں۔ مثلاً  
 حضرت نوح علیہ السلام سے متعلق کہا گیا ہے کہ ”اور نوح کا شتکاری کرنے لگا اور اس نے ایک انگور کا باغ لگایا اس نے  
 اس کی شراب پی، اسے نشہ کیا اور وہ اپنے ڈیرے پر برہنہ ہو گیا۔“

## (پیدائش)

حضرت لوط علیہ السلام پر شراب خوری اور خود اپنی بیٹیوں سے بدکاری کا ناقابل یقین الزام لگایا گیا ہے۔  
 حضرت سلیمان علیہ السلام سے متعلق کہا گیا ہے کہ: ”سلیمان نے خدا کے آگے بدی کی اور اس نے خدا کی پوری پیروی  
 نہ کی۔“

حضرت داؤد علیہ السلام سے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ اپنے ایک حتی ملازم کی خوبصورت بیوی پر فریفتہ ہو گئے اور اس کے  
 خاوند کو قتل کروا ڈالا۔

اسلامی عقیدہ کے مطابق تمام انبیاء کرام معصوم اور بے گناہ ہیں لیکن یہودیوں میں عصمت انبیاء معیار نبوت نہیں ہے۔  
 تاہم عہد نامہ عتیق میں بعض انبیاء کرام کی عصمت تسلیم کی گئی ہے۔ مثلاً حضرت ادریس (حنوک) حضرت ابرہیم، حضرت  
 موسیٰ، حضرت ایوب علیہ السلام وغیرہ۔

## عقیدہ آخرت:

یہودی قیامت اور جزا و سزا کے قائل تو ہیں لیکن ان کے ہاں یہ عقیدہ بہت دھندلے انداز میں ہے۔ وہ اپنے  
 آپ کو ایک بخشی ہوئی قوم تصور کرتے ہیں۔ ایک جگہ کہا گیا ہے:  
 ”میرا بدلہ دینے والا زندہ ہے اور وہ روز آخر زمین پر دائم و قائم ہوگا اگرچہ مرنے کے بعد میرا جسم بے جان ہو جائے گا  
 لیکن میں اپنے گوشت میں سے خدا کو دیکھوں گا۔“  
 وعظ کی کتاب میں کہا گیا ہے۔

”اے جوان! تو اپنی جوانی میں خوش ہو اور اپنی بلوغت کے دنوں میں اپنا جی بہلا لیکن یاد رکھ کے ان ساری باتو  
 ں کے لئے خدا تجھ کو عدالت میں لائے گا۔“



”زبور“ میں کہا گیا ہے۔

”خداوند ابد تحت نشین ہے اس نے عدالت کے لئے اپنی سند تیار کی ہے اور وہ صداقت سے جہاں کا انصاف کرے گا اور اسی سے قوموں کی عدالت کرے گا۔“

## کنفیوشس ازم

### کنفیوشس کے عقائد:

اکثر محققین کا خیال ہے کہ کنفیوشس کوئی مذہبی مقتدا نہیں تھا۔ وہ معاشرتی و اجتماعی اور سیاسی صلح و رہنمائی تھا۔ اس نے خدا، وحی و الہام، آخرت، عذاب و ثواب اور حیات و ممات کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ اس کے برعکس بعض علمائے مذاہب کا خیال ہے کہ وہ ایک مذہبی رہنمائی بھی تھا۔ ان علماء کا کہنا ہے کہ کنفیوشس ایک موحد تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ خدا ایسے قانون وضع اور نافذ کرتا ہے جس کے ذریعہ کائنات وجود میں آئی ہے اور اپنے مقرر وقت تک قائم رہے گی۔ کنفیوشس کا کہنا ہے کہ خدا ہی حقیقی پناہ گاہ ہے جس کی تلاش ہمیشہ سے جاری ہے جو خدا کو ناراض کرتا ہے اس کی نجات مشکل ہے۔ اس کے نزدیک تقویٰ اور راضی بارضا رہنا ہی صراطِ مستقیم ہے۔ کنفیوشس کی تحریروں میں لفظ ٹی (T-ien) خدا کی پروردگاری اور لامحدودیت پر دلالت کرتا ہے۔

بعض محققین کا کہنا ہے کہ کنفیوشس حیات بعد الموت اور جزا و سزا پر یقین رکھتا تھا۔ اس کا کہنا ہے:

”اچھے بادشاہ اور نیکو کار عہدہ دار جنہوں نے اپنی زندگی میں نمایاں کام کئے ہوں گے مرنے کے بعد ان کو آسمان پر خدا کی قربت نصیب ہوگی اور ان کو اختیار ہوگا کہ جب چاہیں وہ زمین پر آئیں جائیں اور اپنے عزیزوں کی مدد کریں جو ان کو نذر و نیاز پیش کرتے ہیں۔“

نیکی بدی کے انجام کے بارے میں کنفیوشس کا کہنا ہے: ”جو خاندان نیکی کرتا ہے وہ یقیناً بے انتہا خوشیاں جمع کر لے گا اور جو گھرا نا برائیوں کے درپے ہوتا ہے اسے غیر محدود غم و افسوس سے سابقہ پڑے گا۔“

کنفیوشس نے اپنی تعلیمات میں مہذبہ عبادت کا کوئی طریقہ مقرر نہیں کیا اور نہ ہی وحی و الہام کے ذریعہ پیغمبر خدا ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔

### تعلیمات:

کنفیوشس عوام میں رائج رسوم و روایت کو یکسر مٹانے کے بجائے ان میں اصلاح کا

خواہاں تھا تا کہ اجتماعی زندگی میں دوسروں کے لئے مفید اور کارآمد ثابت ہوں۔ اس کی تعلیمات کی بنیاد اخلاق پر ہے۔ وہ اصلاح اخلاق کے لئے علم و تربیت پر زور دیتا ہے۔ اس کا قول ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی دولت علم ہے۔ ”علم کے ساتھ ساتھ وہ فکر و تدبیر پر بھی زور دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ”بغیر تفکر علم بیکار ہے۔ کنفیوشس والدین، اور حاکم وقت کی اطاعت فرض قرار دیتا ہے۔

نظریہ ”انسان اعلیٰ“: کنفیوشس انسان کو ”انسان اعلیٰ“ بننے کی ترغیب دیتا ہے کہ اس کے نزدیک ”انسان اعلیٰ“ بننے کے لئے مندرجہ ذیل صفات کا ہونا ضروری ہے:

1. بینش و نگاہ میں بلندی و طہارت۔

2. نئی نوع انسان سے محبت۔

3. مشفق و مہربان چہرہ (خندہ پیشانی)۔

4. رحمدلی اور ہمدردی۔

5. باعزت رویہ۔

6. حق گوئی۔

7. گفتگو میں خلوص۔

8. نیکی۔

9. معاملات میں ہوشیاری۔

10. غصہ پر قابو۔

کنفیوشس انسان اعلیٰ اور پست انسان کا مقابلہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

1. انسان اعلیٰ اپنی روح کو عزیز رکھتا ہے اور پست آدمی اپنی دولت اور جائیداد کو۔

2. انسان اعلیٰ یاد رکھتا ہے کہ اسے کس طرح اور کب کوتاہیوں کی سزا ملی لیکن پست آدمی صرف یہ یاد رکھتا ہے کہ

اسے کیا کیا انعامات اور بدلے ملے۔

3. انسان اعلیٰ کوتاہی کا الزام اپنے ذمہ لیتا ہے اور کمتر آدمی دوسروں کے سر تھونپتا ہے۔

4. انسان اعلیٰ با عظمت، باوقار اور مطمئن رہتا ہے اور مغرور نہیں ہوتا جب کہ پست آدمی مغرور ہوتا ہے اور عظمت و

وقار سے خالی ہوتا ہے۔

حقیقت حدیوں کے گرد و غبار میں چھپ گئی تھی اور اسلام نے اس کو تمام ملاوٹوں سے صاف کر کے خالص شکل میں ہمارے سامنے رکھا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام کی طرف دنیا کو ہم جو بلا رہے ہیں اس کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ اسلام کوئی نئی اور انوکھی چیز ہے جو ابھی تک کسی کو معلوم نہیں تھی۔ بلکہ یہ وہی ابدی حقیقت ہے جو ہمیشہ سے انسانوں کے پاس موجود رہی ہے۔ چونکہ لوگوں نے اپنی غفلت سے اس کو مٹا دیا تھا یا اسے بدل ڈالا تھا اس لئے خدا نے اپنے آخری رسول ﷺ کے ذریعہ اس کو دوبارہ اپنی صحیح اور مکمل صورت میں ہمارے پاس بھیجا ہے۔

انسان کو اپنی زندگی کی تنظیم کے سلسلے میں بہت سی چیزیں درکار ہوتی ہیں۔ اس کے لئے ایک قانون کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے ایک معاشی اور سیاسی ڈھانچے کی ضرورت ہے، اس کو شادی بیاہ کے ایک متعین طریقے کی ضرورت ہے۔ لباس، کھانا، پینا، اٹھنا، بیٹھنا، ہر چیز میں اس کے لئے کچھ آداب و قواعد کی ضرورت ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی اس کی ایک ضرورت ہے کہ اس کا ایک سماجی تہوار ہو جس میں لوگ ایک دوسرے کی خوشیوں میں شریک ہوں اور اپنی جائز تمنائیں پوری کریں۔ اس طرح کی اور بہت سی چھوٹی بڑی چیزیں ہیں جو زندگی گزارنے کے لئے لازمی ہیں اور ان کے متعلق بہر حال انسان کو ایک متعین شکل بتانا ضروری ہے۔

بلاشبہ یہ سب کچھ اسلام کے اندر موجود ہے اور ان میں سے ہر ایک کے بارے میں گفتگو کی جاسکتی ہے کہ اسلام کی بتائی ہوئی شکل دوسری مروجہ شکلوں کے مقابلے میں کس طرح زیادہ جامع اور زیادہ مفید ہے۔ مگر یہاں مجھے ان تمام پہلوؤں پر بحث نہیں کرنی ہے۔ جیسا کہ پچھلی گفتگو سے واضح ہو چکا ہے۔ زندگی میں ان چیزوں کی ضرورت زیادہ تر عملی پہلو سے ہے نہ کہ حل مسئلہ کے پہلو سے۔ دوسرے لفظوں میں زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں ایک تفصیلی ڈھانچے موجود ہونا بذات خود زندگی کو بہتر نہیں بناتا۔ یہ سب چیزیں اگرچہ زندگی کے لئے ضروری ہیں مگر ان کی حیثیت روح کے ساتھ جسم کی سی ہے۔ روح کے ظاہر ہونے کے لئے ایک جسم کا ہونا ضروری ہے۔ مگر کسی انسانی وجود میں اصل چیز اس کی روح ہوتی ہے نہ کہ جسم۔ اگر یہ روح نہ ہو تو جسم خواہ کتنی ہی مکمل حالت میں موجود ہو ہم اس زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ انسان کی اپنی اصلاح ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو زندگی کی پوری اسکیم میں فیصلہ کن عنصر کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ موجود ہو تو دوسری تمام چیزیں ٹھیک ٹھیک کام کریں گی اور اگر یہ نہ ہو تو کوئی بھی خارجی نقشہ ہمارے مسائل کو حل نہیں کر سکتا۔

زندگی کے اس اہم ترین سوال کا جواب اسلام کے اندر انتہائی مکمل اور صحیح شکل میں موجود ہے۔ اسلام سب سے پہلے یہ بتاتا ہے کہ یہ کائنات کوئی الل ٹپ جگہ نہیں ہے بلکہ اس کا ایک خدا ہے جو اپنی زبردست طاقت کے ذریعہ

پوری دنیا پر فرماں روائی کر رہا ہے۔ اس طرح وہ انسان کے اندر ایک ایسی طاقت کا عقیدہ پیدا کرتا ہے جس کی پکڑ سے انسان اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا۔ اور نہ اس سے بھاگ کر کہیں جاسکتا۔ وہ زندگی کے بارے میں یہ تصور دیتا ہے کہ وہ دو مرحلوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اور موجودہ مرحلہ اگلے مرحلے کی تیاری کے لئے ہے۔ ہم آج جو کچھ کریں گے اس کا اچھا یا برا بدلہ اگلی زندگی میں پائیں گے۔ اس طرح آدمی کے اندر آئندہ زندگی میں کامیاب بننے کی طلب پیدا ہوتی ہے اور دنیا کی حرص جو تمام خرابیوں کی جڑ ہے اس کا جذبہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ جب ٹرین سامنے کھڑی ہو تو کوئی شخص پلیٹ فارم کی بنچ پر جگہ حاصل کرنے کے لئے جھگڑا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جو شخص دنیا کی بے ثباتی اور اگلی زندگی کی اہمیت کو سمجھ جائے اس کے لئے ناممکن ہے کہ دنیوی منافع کے لئے لوگوں سے چھین جھپٹ کرے۔ اسلام فرشتوں کی ایک ایسی پولس کا تصور دیتا ہے جو ہر انسان کے دونوں کندھوں پر بیٹھی ہوئی ہے اور اس کے تمام اعمال کا ریکارڈ تیار کر رہی ہے۔ جو مرنے کے بعد خدا کی عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ یہ خیال آدمی کو اپنے تمام کھلے اور چھپے معاملات میں چوکنا کر دیتا ہے۔ وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ مستقل طور پر ایسی پولس کے پہرے میں ہے جس سے پیچھا چھڑانے کی کوئی سبیل نہیں۔

دوسری دنیا کے بارے میں اسلام یہ تصور دیتا ہے کہ وہاں جنت اور جہنم ہے۔ جنت انتہائی عیش کی جگہ ہے اور جہنم بدترین عذاب کا مقام۔ وہ تمام لذیذ اور بہترین چیزیں جن کی انسان تمنا کر سکتا ہے اسلام ایک ایک کا نام لے کر بتاتا ہے کہ وہ نہایت اعلیٰ شکل میں جنت میں موجود ہوں گی۔ اور سخت ترین عذاب کی تمام صورتیں جن سے انسان آشنا ہے، ان کے متعلق بتاتا ہے کہ وہ جہنم میں جانے والے شخص کو بھگتنا پڑیں گی۔ ہر وہ انسان جو پیدا ہوا ہے اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان میں سے کسی ایک میں رہنا ہے۔ یہ چیز آدمی کو بے قرار کر دیتی ہے اور وہ ایک ایک لمحے کو فضولیات سے بچا کر صحیح ترین کام میں لگانا شروع کر دیتا ہے۔ پھر اسلام یہ بتاتا ہے کہ جس خدا کی عدالت میں تمہارا معاملہ جانے والا ہے اس پر نہ کسی کا زور ہے اور نہ کوئی سفارش وہاں سنی جانے والی ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس کے حضور اپنی زبان کھول سکے۔ یہ چیز اس کو بتاتی ہے کہ جھوٹے سہاروں پر تکیہ کرنا چھوڑ دے۔ اور صرف خدا سے اپنا تمام تعلق قائم کرے۔ پھر یہ کہ یہ سب کچھ اس طرح پیش آئے گا کہ ہم اپنے موجودہ احساسات کے ساتھ اپنی زندگی کا شعور رکھتے ہوں گے۔ اپنی پچھلی زندگی ہر شخص کو اچھی طرح یاد ہوگی بلکہ اس کے سامنے ہوگی۔ موت اس کے لئے محض نیند کی طرح کا ایک درمیانی وقفہ ہوگا اور وہ دوسری زندگی کو اسی طرح اپنی زندگی سمجھے گا جس طرح سو کر اٹھنے والا کوئی شخص سمجھتا ہے۔ ہر آدمی دوسرے کو اسی طرح پہچانے گا جس طرح وہ آج پہچانتا ہے۔ غرض آج ہمارا جو وجود ہے، اسی وجود کے ساتھ ہم اپنی جزایاں ساز پائیں گے۔

5. انسان اعلیٰ مزاج کا پختہ ہوتا ہے اور جھگڑا نہیں ہوتا جبکہ پست انسان نا پختہ مزاج اور جھگڑالو ہوتا ہے۔
6. انسان اعلیٰ دوسروں کی رائے کے بارے میں فراخ دلی سے کام لیتا ہے لیکن مکمل طور پر ان سے متفق نہیں ہوتا جب کہ پست انسان دوسروں سے متفق ہوتا ہے۔ لیکن ان سے کشادہ دلی میں بخل سے کام لیتا ہے۔

## کنفیوشس کے اقوال:

1. انسان پیدائش کے وقت کچھ بھی ساتھ نہیں لاتا اور نہ ہی مرتے وقت کچھ ساتھ لے جاتا ہے۔
2. جو تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے وہ دوسروں کے لئے پسند کیوں کرتے ہو۔
3. انسان اعلیٰ کے کردار کی علامت بنی نوع انسان سے ہمدردی ہے۔
4. حقیر فائدہ کے حصول کا لالچ بڑے بڑے معاملات کی تکمیل میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔
5. چاروں سمتوں میں جو بھی انسان ہے وہ سب بھائی بھائی ہیں پھر ایک نیک انسان کیونکر غمزدہ ہو سکتا ہے۔ اس کا کوئی بھائی نہیں۔
6. وہ انسان چھک جاتا ہے دوسروں کو کیسے سیدھا کر سکتا ہے۔
7. جب تم باہر نکلو تو لوگوں سے اس طرح پیش آؤ جیسے تم ایک معزز مہمان کی خدمت بجالا رہے ہو۔
8. تفکر کے بغیر علم ایک بے کار محنت ہے اور علم کے بغیر تفکر خطرناک ہے۔
9. دل کی درستگی کردار کی درستگی ہے۔
10. نیکی انسان کو خوشحالی بخشتی ہے اور بدی افلاس کا سرچشمہ ہے۔ (۲۵۲)

## اسلام

نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے کون سا دھرم سب سے بہتر ہے۔ اس کا جواب اسلام کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ تمام خصوصیات اس کے اندر مکمل ترین شکل میں موجود ہیں جو ایسے ایک دھرم میں ہونا ضروری ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام کی طرف سے میں کسی ایسی چیز کا انکشاف کرنے والا ہوں جس کی یقینہ دنیا کو اب تک خبر نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی یہ حیثیت اپنے اصول کے نئے پن کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ صرف اس لئے ہے کہ جو کچھ دوسروں کے پاس بگڑی ہوئی شکل میں ہے وہ اس کو صحیح اور بے آمیز شکل میں پیش کرتا ہے۔ خدا اور آخرت کا تصور جو دوسرے مذاہب میں موجود ہے یہی اسلام کے حل کی اصل بنیاد ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دوسرے مذاہب میں یہ

اس طرح اسلام کا آخرت کا تصور ایک ایسا تصور ہے جو آدمی کو ہلا دینے کے لئے کافی ہے۔ اس نظریے میں اس بات کی مکمل صلاحیت ہے کہ وہ سماجی کی ضرورت کے مطابق نہایت فرض شناس اور دیانت دار شہری پیدا کرے اگر اس نظریے کو کسی آبادی میں وسیع پیمانے پر پھیلا دیا جائے اور لوگوں کے ذہنوں میں اس کو اچھی طرح بٹھادیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ لوگ حساس اور ذمے دار بن جائیں گے۔ جب ایک شخص کو منتخب کر کے کسی کام پر لگادیا جائے گا تو وہ اس احساس کے تحت اپنی ڈیوٹی کو ٹھیک ٹھیک انجام دے گا کہ اس کا جواب اسے مالک کائنات کو دینا ہے جو اس کی تمام سرگرمیوں سے باخبر ہے، جس کی نگاہ سے اس کا کوئی چھوٹا یا بڑا کارنامہ چھپ نہیں سکتا۔

مدینے کے ایک باشندے ابو مسعود انصاری کا واقعہ ہے، وہ اپنے غلام کو مار رہے تھے اتنے میں انہوں نے پیچھے سے ایک آواز سنی ”اعلم ابامسعود! اللہ اقدر عليك منك عليه“ (ابو مسعود! یاد رکھو اس غلام کے اوپر تم کو جتنا اختیار ہے، تمہارا خدا اس سے زیادہ تمہارے اوپر اختیار رکھتا ہے) دیکھا تو حضرت محمد ﷺ کھڑے تھے۔ یہ فقرہ سنتے ہی ان حال بدل گیا۔ انہوں نے فوراً اپنا ہاتھ روک لیا اور بولے کہ اے خدا کے رسول ﷺ! میں اس غلام کو خدا کی راہ میں آزاد کرتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم ایسا نہ کرتے تو جہنم کی آگ تمہیں پکڑ لیتی۔ اس طرح اسلام ایک ایسا نظریہ عطا کرتا ہے جس کے ذریعے آپ کسی بھی شخص کو کسی بھی مقام پر ٹوک سکتے ہیں اور وہ خود اپنے فائدے کی خاطر مجبور ہوگا کہ اس کی تنبیہ پر غور کرے۔ جبکہ موجودہ نظام میں کسی کو بدعنوانی سے روکنے کے لئے صرف پولس کے دفتر میں اس کی رپورٹ درج کرائی جاسکتی ہے، ایک ایسا دفتر جو رشوت لے کر اپنا ریکارڈ جلا سکتا ہے۔ اور اگر عدالت میں بھی جانا ہوا تو ملزم کو خوب معلوم ہے کہ ایک قابل وکیل کو فیس ادا کرنے کی صلاحیت ہونا کسی بھی مقدمے کو جیتنے کی کافی ضمانت ہے۔

### غلط فہمی کا ازالہ

اوپر کی سطروں میں میں نے اسلام کے تصور زندگی کو اس حیثیت سے پیش کیا ہے کہ آج ہم جن مسائل میں گھرے ہوئے ہیں، ان کو وہ کس طرح حل کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہی اس کی کل حیثیت ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کوئی فرضی نظریہ نہیں ہے جو مسائل پیش آنے کے بعد ضرورت کے طور پر گھڑ لیا گیا ہو۔ حل مسائل کی غرض سے ہم دنیا کو کوئی فلسفیانہ فریب نہیں دے رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ سوال کہ ”زندگی کے مسائل کا حل کیا ہے“ یہ بذات خود کوئی الگ سوال نہیں۔ بلکہ وہ اس بڑے سوال کا جزء ہے کہ ”زندگی کی اصل حقیقت کیا ہے“ حقیقت سے مطابق ہونے ہی کا دوسرا نام مسائل کا حل ہونا ہے۔ جس نظام فکر کو اپنانے سے زندگی

کے مسائل حل ہو جائیں، یہ اس بات کو ثبوت ہوگا کہ یہی نظام فکر کائنات کی اصل حقیقت ہے اور کسی نظام فکر کا اصل حقیقت ہونا خود بخود یہ معنی رکھتا ہے کہ اس سے انسانیت کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ (۲۵۵)

## اسلامی تصوف

اسلامی تصوف، غیر اسلامی تصوف سے بہت مختلف ہے۔ ایک غیر مسلم صوفی تمام جسمانی و مادی لذات سے کنار کش ہو جاتا ہے۔ وہ نہ نکاح کرتا ہے۔ نہ مکان بناتا ہے، نہ کام کے کپڑے پہنتا، نہ کچھ کھاتا اور نہ انسانوں سے ملتا ہے۔ دوسری طرف مسلم صوفی مناسب حد تک جسمانی خواہشات کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے، تاکہ جنسی و عصبی ہیجانات اس کی محویت و عبادت میں خلل انداز نہ ہوں۔ وہ نکاح کرتا، مکان بناتا، اچھے کپڑے پہنتا، رزق طیب سے متمتع ہوتا اور انسانوں کے ہجوم میں رہتا ہے، وہ نہ پہاڑوں میں بھاگتا اور نہ غاروں میں پناہ لیتا ہے، لیکن روح کے متعلق دونوں کے تصورات بڑی حد تک ملتے جلتے ہیں، دونوں روح کو لافانی حقیقی، زمان و مکاں سے وراثہ، اور ایک مہیب طاقت سمجھتے ہیں۔ جسم کی پرواز گورتک ہے اور روح کی عرش تک۔ جسمانی سمع و بصر کا دائرہ بہت محدود ہے لیکن روح کی آنکھ سے کائنات کا کوئی راز پوشیدہ نہیں اور اس کی طاقتور آواز ثریٰ سے ثریا تک ایک گونج پیدا کر دیتی ہے، تمام جذبات عالیہ مثلاً رحم، محبت، فیاضی وغیرہ کا منبع روح ہے۔ نیاز و گداز کے چشمے یہیں سے ابلتے ہیں، وجدان کی وہ آنکھ، جس کی زد سے خود خدا بھی باہر نہیں، یہیں کھلتی ہے۔ وہ نور، جس سے شاہراہ حیات جگمگا اٹھتی ہے، یہیں جنم لیتا ہے اور روح ہی میں وہ توانائی نہاں ہے، جو فطرت کی مخفی طاقتوں کو رام بناتی اور کائنات کو تعاون پر مجبور کر دیتی ہے۔

With the heavens within, all heavens without will incessantly cooperate.

(Trine - In Tune with the Infinite, P . 116)

ترجمہ: اللہ روح کی خلوتوں میں بس جائے، تو تمام بیرونی کائنات تعاون پہیم پر مجبور ہو جاتی ہے۔  
روح میں بالیدگی و قوت پیدا کرنے کے لیے تمام مسلم و غیر مسلم صوفیوں کے ہاں ایک ہی طریقہ ہے یعنی پہلے تمام فکری، ذہنی اور عملی آلائشوں سے پاک ہونا اور اس کے بعد عبادت یعنی محویت۔ عبادت سے روح کیوں توانا بنتی ہے؟

کائنات کی تمام طاقتیں ہماری امداد پر کیوں تیار ہو جاتی ہیں؟

اس پر ہم کوئی عقلی دلیل نہیں دے سکتے، لیکن یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر ہم سوالا کھ انبیاء، لاتعداد اولیاء اور

کروڑوں لاموں، یوگیوں اور راہبوں کی شہادت پیش کر سکتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی چند ایک نامور صوفیا تھے، مثلاً نظام الدین اولیا، خواجہ اجیری، سلطان باہو، بابا فرید شکر گنج، بوعلی شاہ قلندر، داتا گنج بخش وغیرہ۔ ان میں سے بعض کی تصانیف موجود ہیں اور بعض کے اقوال و اشعار زبانِ خلق پر جاری ہیں۔ یہ دانا یان راز فطرت ایک ہی بات بتاتے رہے کہ اللہ کے سامنے جھکنے کے بعد تمام کائنات تمہارے سامنے جھک جائے گی۔ اگر آپ اس شہادت کو بھی ناکافی سمجھتے ہوں تو خود تجربہ کر کے دیکھ لیجیے۔ آج ہی تمام گناہوں کو چھوڑیے، عبادت، تلاوت و تہجد کو معمول بنائیے۔ اللہ کو اس کے ناموں سے یاد کیجیے، پھر دیکھیے کہ کس طرح آپ پر مسرت و کامرانی کے تمام دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ کس طرح ساری کائنات آپ کی حفاظت و اعانت کے لئے آمادہ ہو جاتی ہے، کس طرح آپ کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اور کیوں کرفطرت کے مخفی کارکن آپ کے اشاروں کی تعمیل کرنے لگتے ہیں۔ (۲۵۶)

## اسلامی تصوف کی خصوصیات

حیات و کائنات کے باب میں مختلف نظریات اور طرز احساس کے مانند تصوف بھی ایک مخصوص رویہ اور طرز احساس ہے جو اپنی نوعیت میں قطعی طور پر واضح اور معین ہے۔ چوں کہ اس رویہ کا اظہار انسان کی ذات اور اس کی داخلی کیفیات کے واسطے سے ہوتا ہے۔ اسی لئے انسانی زندگی میں اس رویے کو وہی اہمیت حاصل ہے۔ جو دوسرے طرق و اسالیب کو حاصل ہے۔ نیز یہ کہ یہ رویہ دیگر رویوں کے مانند انسانی فطرت سے کسی صورت میں نفیض نہیں ہے۔

اس موضوع پر مزید غور و فکر کے بعد یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ہر انسانی رویہ کی ایک معقول اساس اور بنیاد ہوتی ہے۔ یہی اساس اور بنیاد مخصوص نظریہ حیات اور طرز احساس کی تشکیل و تخلیق کا سبب بنتی ہے اس لئے عقلی بنیادوں پر ہر انسانی رویہ اور طرز احساس کی تعبیر ممکن ہے، تعبیر و توجیہ کے ضمن میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ تعبیر کنندہ اگر مخصوص ذہنی رجحان کا حامل ہے تو اس کی تمام توضیحات کا زور و وزن اسی مخصوص رجحان کی جانب ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح کی تعبیر سے مسئلہ کا وہ پہلو تعبیر کرنے والے کے ذہنی رجحان سے مربوط ہے، زیادہ واضح اور معین ہو جائے گا لیکن اس امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا کہ اگر اصل مسئلہ تعبیر کنندہ کے ذہنی رجحان سے مربوط و منسلک نہیں ہے تو تمام تعبیر و تفسیر حقیقت سے بہت دور ہی نہیں، حقیقت سے عاری بھی ہوگی اور معقول اسباب کی بناء پر اس طرح کی تعبیر پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

اس سلسلے میں یہ امر بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ ہر فرد اپنے طرز احساس اور نظریہ حیات کا اظہار اپنی نفسی، روحانی، ذہنی اور فکری صلاحیتوں کے مطابق کرتا ہے اس لئے اس امر کا قطعی امکان ہے کہ ایک ہی نظریہ حیات اور طرز



احساس کے حامل افراد مختلف الفاظ و کیفیات کے ساتھ اپنے خیال کو بیان کریں۔ اس لئے تعبیر کی ذمہ داری قبول کرنے والے شخص پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اصلی نظریہ حیات کی اساس پر اس حقیقت کی تعبیر کرے جسے مختلف افراد نے مختلف الفاظ و کیفیات کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ نفس، ذہن، فکر اور روح کے معاملات میں ریاضی کا اصول، دو اور دو چار کی طرح کارآمد نہیں ہوتا۔

زیر نظر موضوع کی تحقیق کے سلسلے میں جو اصول و معیار مقرر کیے گئے ہیں، ان کی روشنی میں یہ دیکھنا ہے کہ تصوف کے باب میں مستشرقین، دیگر ارباب علم اور خود صوفیہ نے کن خیالات کا اظہار کیا ہے اور اس مخصوص طرز احساس کی کیا تعبیریں کی ہیں؟

## تصوف سے متعلق مشرق کے ارباب علم کے خیالات:

اسلامی تصوف کے بارے میں مستشرقین اور مغرب کے ارباب علم کے خیالات اور نقطہ نظر کے مطالعے سے مستنبط ہوتا ہے کہ انہوں نے اس موضوع کو اس کے حقیقی سیاق و سباق اور تاریخی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور اپنے مخصوص تعصب یا اسلامی عقائد کی روح سے نا آشنا ہونے کے باعث غلط فہمی، میں مبتلا ہوئے ہیں۔ اس غلط فہمی کے اثرات سے وہ اہل علم بھی محفوظ نہ رہ سکے جن کی زاد بوم نہ صرف مشرق ہے بلکہ وہ طبعاً اور مزاجاً بھی مشرقی ذہن و فکر کے حامل ہیں اور اسلامی تصوف کی جملہ خصوصیات اور اس کے مختلف عناصر کے فہم کی صلاحیت تامہ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر قاسم غنی ایران کے ایک فاضل محقق ہیں۔ انہوں نے اپنی قابل قدر تصنیف ”بحث در آثار و افکار و احوال حافظ“ کے سلسلے میں ایک جلد تصوف اسلام کی تاریخ کے موضوع پر تحریر فرمائی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ”تعریف تصوف“ کے باب میں تحریر کرتے ہیں۔

حالا می خواہیم ببینیم بعد از ہمہ	اس امر کے بعد اب ہم یہ تجزیہ
این مقدمہ تصوف را چگونه باید	کریں گے کہ تصوف کی تعریف کیا
تعریف کرد۔ ہر گاہ تعریف تصوف	ہونی چاہیے۔ یوں تو تصوف کی
غیر ممکن نباشد - لا اقل بسیار	تعریف ناممکن نہیں ہے۔ لیکن
مشکل است۔ زیر تصوف ہیچ	فی الواقعہ بہت مشکل ہے، کیونکہ وقت نظر
او عملاً طریقہ منظم و	کسی زمانے میں بھی تصوف نظری یا
محدود و معینی نبودہ بلکہ در ہر	عملی طور پر ایک منظم، محدود یا معین

عہدی مفہوم مخصوصی  
داشته است - (۳)

طور حیات نہیں رہا ہے بلکہ ہر عہد  
میں اس کا ایک خاص مفہوم تھا۔

”حاصل آں کہ ایں مثل (اختلاف کردن چگونگی شکل پیل در شب تار)

برائے آنہائیکہ خواسنہ اند تعریفی  
از تصوف بکنند صادق است  
و تصوف اسری است درونی واز  
مقوله احساسات شخصی بہر  
کسی آن چیز را تصوف می داند  
کہ خود اساس کروه است ، وبایک  
تعریف عمومی جامع و مانعی کہ  
مورد قبول ہمہ باشد نمی توانیم  
حقیقت تصوف را وصف کنیم۔  
(۴)

مختصر یہ کہ یہ مثل (اندھیری رات  
میں ہاتھی کی شکل کیا معلوم) ایسے  
ہی حضرات پر صادق آتی ہے جو یہ  
چاہتے ہیں کہ لامحالہ تصوف کی کوئی  
تعریف بیان کر دیں۔ ورنہ اصل  
بات یہ ہے کہ یہ ایک داخلی احساس  
ہے۔ ہر شخص اپنے داخلی اور ذاتی  
احساس کی بنا پر اسی کو تصوف خیال  
کرتا ہے جس طرح اس نے محسوس  
کیا ہے۔ اس اعتبار سے ہمارے  
لیے ممکن نہیں ہے کہ تصوف کی  
ایسی کوئی تعریف بیان کر دیں جو  
جامع مانع اور سب کے لئے قابل

قبول ہو۔“

ڈاکٹر قاسم غنی کی اس رائے میں ایک حد تک ان ہی خیالات کی بازگشت سنائی دیتی ہے جو دائرة المعارف فلسفہ  
کے مقالہ نگار نے اپنی تصریح کے خاتمہ میں پیش کیے ہیں۔ اس حتمی رائے کے باوجود ڈاکٹر صاحب موصوف معترف ہیں  
کہ صوفیہ کے اقوال و تصانیف میں ایسے حصے ضرور مل جاتے ہیں جن میں قدر مشترک نظر آتی ہے اور تصوف کی تعریف کی  
جاسکتی ہے۔

باہمہ اختلاف و تشستی کہ  
دریں تعریف بہادیدہ می شود

باوجود ان اختلافات اور پراگندہ خیالی کے جو  
ان تعریفوں میں نظر آتے ہیں، تصوف کے

باز چوں از وجہ بہائے مخصوص  
تصوف و ممیزات آن حکایت  
می کند۔ بالآخر از مجموع  
آنہامی تو ان قدر مشترکی  
یافت کہ کم یا بیش تعریف  
تصوف و عرفان محسوب شود۔

انتیازات اور دیگر وجوہ کی بنا پر یہ کہنا ہی پڑتا  
ہے کہ اس سلسلے میں جو آرائش کی گئی ہیں،  
ان سب پر غور کرنے سے ایک ایسی قدر  
مشترک دریافت ہو سکتی ہے جو کم یا زیادہ  
تصوف و عرفان کے زمرے میں آتی ہو۔

اس اقتباس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر قاسم غنی نے اپنی رائے میں تبدیلی کر کے اس خیال سے رجوع  
کر لیا ہے کہ تصوف سے متعلق مختلف تعریفوں سے ایک قدر مشترک اخذ کی جاسکتی ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ تبدیلی کسی  
یقین یا اعتماد کی بنا پر نہیں ہے بلکہ پروفیسر نکلسن کی رائے کا اعادہ ہے جو انہوں نے اپنی تصانیف میں ظاہر کی ہے۔

ولی چنان کہ رینولد نیکلسن  
مستشرق معاصر معروف کہ  
در تحقیقات تصوف اسلامی  
تخصیص دارد و دریں موضوع  
صاحب تالیفات عدیدہ است  
می گوید باوجود این ہمہ باز بین  
فرقہ مختلفہ صوفیہ یک رستہ  
عقائد و آراء مشترکی بہست کہ  
بتوان نام، اصول تصوف ”بآں داد  
یعنی می توان یک دستہ افکار  
و آرا اساسی مورد قبول عامہ عرفارا  
اصول و مبانی تصوف شمرد۔“

لیکن رینالڈ نکلسن جو معاصر انگریز  
مستشرق ہیں اور تصوف اسلامی کی  
تحقیق میں اختصاص کا درجہ رکھتے  
ہیں، اور اس موضوع پر ان کی  
متعدد تصانیف ہیں۔ کہتے ہیں کہ  
صوفیہ کے مختلف سلسلوں اور  
گروہوں کے باوجود ان کے عقائد و  
نظریات کا ایک حصہ ایسا ہے جو سب  
میں مشترک ہے اور جسے ”اصول  
تصوف“ کا نام دیا جاسکتا ہے۔ یعنی  
افکار و نظریات کا یہ اساسی حصہ  
عرفا میں عام طور پر قابل قبول ہے  
اور اسے تصوف کے اصول و مبانی  
میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر قاسم غنی نے اہل مغرب کے اس نقطہ نظر کی بھی ترجمانی کی ہے کہ تصوف چوں کہ انفرادی، داخلی کیفیت اور شخصی احساس ہے اس لیے ہر صوفی نے اپنے داخلی تجربے اور احساس کے مطابق تصوف کی تعریف کی ہے۔ بنا بریں کسی ایک تعریف کو مسلم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ تصوف تو خیر ایک انفرادی کیفیت اور شخصی احساس ہے۔ وہ علوم جو قطعی طور پر داخلی اور شخصی نہیں ہیں۔ ان کی تعریفوں کا بھی یہی حال ہے۔ فلسفہ، سیاسیات، مہنات اور معاشیات کی کم و بیش اتنی ہی تعریفیں بیان کی گئی ہیں جتنی صوفیہ نے تصوف کی بیان کی ہیں۔ اس کے باوصف ہر مصنف اور ہر قاری یہ جانتا ہے کہ فلسفہ، سیاسیات، مہنات اور معاشیات کیا ہے۔ بعینہ ہر صوفی اس حقیقت سے آشنا ہے کہ تصوف عرفان ذات، قرب الی اللہ اور پیروی سنت کا نام ہے۔ فرق جو کچھ ہے وہ شخصی احوال کے اسلوب اور انداز بیان کا ہے جس کے ذریعے حقیقت تصوف کو اظہار کے بہت سے پیرائے مل گئے ہیں۔ اس معنی میں اقوال صوفیہ خاص حد تک ادبی قدر و قیمت بھی رکھتے ہیں۔

سعید نفیسی ایران کے ان فاضل اساتذہ میں سے ہیں جنہوں نے تصوف کے موضوع پر تحقیقی کام کر کے گراں قدر اضافے کیے ہیں۔ ان کی تصنیف ”سرچشمہ تصوف در ایران“ اپنے موضوع کے اعتبار سے نہ صرف مفید بلکہ تحقیقی کارنامہ ہے۔ فاضل موصوف نے مذکورہ تصنیف میں ان اسباب سے بحث کی ہے جن کی بنا پر تصوف کے بارے میں غلط اور نادرست نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ سعید نفیسی کا نقطہ نظر ہے۔

مائع دومی کہ برائی پی بردن	حقیقت تصوف کو پوری طرح سمجھنے
بحقیقت تصوف ہست استند	میں دوسرا منع وہ غلط استدلال اور غلط
لالہا و استنتا جہای نادرستی	تجزیے ہیں جو ڈیڑھ سو سال قبل اس
ست کہ ارض دو پنجاہ سال پیش	دن سے جاری ہیں جب سے یورپ
یعنی از روزی کہ خاور شناسی	کی مشرق شناسی کی و بادنیامیں پھیلی۔
اردپائی در جہاں انتشار یافتہ	بے خبر لوگوں نے اس میں یورپی
است بی خبران اردپائی کردہ و	تعصب کا رنگ بھرا اور غلط در غلط
نتیجہ ناصوابی ازاں گرفت اند۔	نتائج اخذ کیے۔ مغربی محققین کو
بزرگ ترین اشکالی کہ درپیش	تحقیق کے مرحلے میں جو سب سے
پائی محققان اردپانیست یک نوع	بڑی دشواری پیش آئی وہ خود پسندی

خود خواہی بیشتن پرستی ست کہ  
 اور خود پرستی کا جذبہ تھا جو ہر علم کی  
 درہر علمی آن را وارد کردہ اند۔  
 تحقیق میں ان کے ہاں کارفرما رہا (کہ  
 کسی طرح یورپ کی عظمت  
 کا سکہ دنیا والوں کے دلوں پر  
 بٹھا دیں)۔

فاضل موصوف نے ایک مقالہ اقبال کی شاعری میں تصوف کے عناصر کی دریافت کے موضوع پر بھی سپرد قلم کیا ہے۔ اس مقالہ میں انہوں نے اس امر کی تردید کی ہے کہ تصوف اور سریت کسی معنی میں یکساں اور مماثل ہو سکتے ہیں۔ نیز نکلسن کے اس خیال کو بھی غلط بتایا ہے کہ صوفیہ نے اپنے معاملات کو عام لوگوں سے پوشیدہ رکھنے کے لیے ایسی اصطلاحات وضع کیں جو مبہم اور ناقابل فہم ہیں۔ (۱۰۰) وہ کہتے ہیں۔

اہل مغرب نے تصوف کو سریت کے مترادف قرار دیا ہے بلکہ بعض اوقات تصوف کو ذاتی اور نہاں کیفیت خیال کیا ہے میں ان کے اس نقطہ نظر سے متفق نہیں ہوں کیوں کہ تصوف میں کوئی بات پوشیدہ اور نہاں نہیں ہے۔ فارسی کی صوفیانہ شاعری کے آغاز ہی سے صوفی شعرا نے اشاریت کو متعارف کرایا ہے تاکہ عوام ان کے خیالات کو زیادہ آسانی سے سمجھ لیں (اور کوئی ابہام باقی نہ رہے)۔ سعید نفیسی نے مستشرقین کے نقطہ نظر کی تردید کے ساتھ ساتھ ایرانی تصوف سے متعلق اپنے نظریات کو بھی پیش کیا ہے وہ کہتے ہیں۔

ایرانیان لاقلا در دورہ ساسانی	اہل ایران قطعی طور پر ساسانیوں
و در آغاز دورہ اسلامی از بودا	کے عہد میں اور اسلام کے ابتدائی
و بودائی کاملا آگاہ بودا ہ اند	دور میں بدھ اور بدھ مت سے کامل
و این نیز بیسار طبیعیست زیرا کہ	طور پر آگاہ تھے۔ اور ایسا ہونا بالکل
ایران و ہندوستان از روزی کہ دو	فطری تھا۔ کیوں کہ ایران اور
شعبہ نژاد آریائی باہم از دامنه	ہندوستان کے باشندے اس زمانے
ہائے تیان شان یا دامنه ہائے	سے قریب کے ہمایوں کے مانند رہ

ہندو کش و یاپامیر بسوئے کشور  
 یائے کہ امروز و آن ہستند فرو دآمدہ  
 اندہموارہ ہم سایہ دیوار بہ دیوار  
 یک دیگر بودہ اندو ہرگز رابطہ  
 آنہا بریدہ نشدہ است و ہمیں  
 سبب شدہ است کہ اندیشہ  
 آریاییان ہندی و آریاییان  
 ایرانی در سراسر دورہ بایک  
 دیگر پیوستگی و نزدیکی کامل  
 داشدہ است۔ مہم ترین مراحل  
 نزدیکی آن نخست نفوذ عقائد  
 بودائی در افکار پیش از اسلام  
 ایران دسپس رواج این افکار  
 در تصوف یعنی فلسفہ و مخصوص  
 بہ آریاییان آسیائیسٹ۔

رہے ہیں، جب آریائی نسل کے دو  
 گروہ تین نشان یا ہندو کش یا پامیر کے  
 دامنوں سے ان ملکوں میں جہاں اب  
 وہ آباد ہیں، داخل ہوئے۔ ان کا یہ  
 رابطہ کبھی منقطع نہیں ہوا ہے اور یہی  
 ایک وجہ ہے کہ ہندی اور ایرانی  
 آریاؤں کے افکار ہر زمانے میں ایک  
 دوسرے سے پوستہ اور بہت زیادہ  
 قریب رہے ہیں۔ اس قربت کے  
 اہم ترین مرحلوں میں پہلا مرحلہ یہ  
 تھا کہ قبل اسلام ایرانی افکار میں،  
 بدھ مت، کے عقائد کا نفوذ ہوا اور  
 بعد میں یہی فکر تصوف میں رائج  
 ہو گئی۔ گویا یہ ایشیائی آریاؤں کا  
 مخصوص فلسفہ ہے۔

جنبہ ذوق و لطف شاعرانہ و  
 تعلیمات بسیار عارفانہ و  
 صلح جویانہ و تسلیم و رضا  
 وقناعت و استغنا و زیبائی  
 دوستی کہ ورین آئین بودہ  
 در میان مردمی کہ در آن زمان  
 از عقائد تندوتیز و جنگ

ذوقی کیفیت، شاعرانہ لطف  
 اندوزی، اعلیٰ درجے کی معرفت اور  
 رواداری کی تعلیم، تقدیر پر شاکر  
 رہنا، مال و دولت سے بے نیازی،  
 معاشرتی امن، آپس میں میل و محبت  
 یہ تمام رویے بدھ مت کے عقائد  
 میں شامل تھے۔ اس زمانے کے

لوگوں نے انہیں اپنا لیا کیوں کہ وہ  
 تشدد آمیز نظریات اور قوموں کے  
 درمیاں ختم نہ ہونے والی جنگوں اور  
 قبائل کی دشمنیوں سے بہت زیادہ  
 تنگ آ چکے تھے اور ایسی اخلاقی تعلیم  
 کے متلاشی تھے، جس میں دوستی  
 اور امن کا پیغام ہو۔ انہیں بدھ  
 مت کے یہ اصول بہت پسند آئے۔  
 یہ بات بلا خوف تردد یہی جاسکتی ہے  
 کہ تنہا بدھ مت ایسا مذہب ہے جو  
 جنگ و جدال کے بغیر دنیا میں پھیلا  
 اور جس نے تلوار کے زور پر لوگوں  
 کو اپنا محکوم نہیں بنایا۔ اسلامی دور  
 میں بھی مشرقی ایران کے صوفیہ کے  
 درمیان یہی صلح جو یا نہ اور عدم تشدد  
 پر مبنی عقائد پسند کیے گئے اس اعتبار  
 سے تصوف ایران کا ایک الہامی ماخذ  
 بدھ مت کے عقائد ہیں۔

”اگر آپ حقیقت جاننا چاہتے ہیں تو  
 اصل بات یہ ہے کہ راہبوں کے زہد و  
 ریاضت سے ظاہری شبابہت رکھنے  
 والی بعض رسمیں اور عبادتیں تصوف

جوئی و پر خاش بتنگ آمدہ  
 بودند، و در پی تعلیمات ملایم  
 و آرام می گشتند، بسیار  
 پسندیده افتاده است و بہ جرات  
 می توان گفت این یگانہ عقیدہ  
 و آئین است کہ برے جنگ و  
 کشتار در جہاں پیش رفتہ و  
 بزور شمشیر بر مردم جہاں  
 تحصیل نہ کردہ اند۔ در دورہ  
 اسلامی ہمیں عقائد مسالمت  
 آمیزہ صلح جو یا نہ در میان صوفیہ  
 مشرق ایران نیز بسیار پسندیدہ  
 افتادہ است و آئین بودائی یکے از  
 سرچشمہ ہائے الہام تصوف ایران  
 شدہ است۔

شبابہت ظاہری فریبندہ در میان  
 برخی از فرق تصوف و اگر درست  
 بخوابید عادات و عبادات آن ہا  
 بازہد و تسنک راہبان نصاری

کے بعض سلسلوں میں رائج ہیں۔  
 اس ظاہری مشابہت سے لوگ  
 دھوکا کھا جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی  
 ظاہری مشابہت سے دھوکا کھا کر  
 مستشرقین کی اکثریت نے غلط روش  
 اختیار کی اور یہ فیصلہ دے دیا کہ  
 صوفیہ نے اسلام کے ابتدائی دور کے  
 عیسائی راہبوں کی تقلید کی۔ یہ نکتہ  
 عراق اور جزیرے کے تصوف کے  
 بارے میں درست ہے لیکن کسی بھی  
 دلیل سے اس کا اطلاق ایران پر نہیں  
 ہوتا۔“

”ایران کا تصوف صرف اور صرف کلی  
 طور پر آریائی فکر ہے اور سامی افکار  
 سے ذرہ برابر بھی اس کا تعلق نہیں  
 ہے۔ ایرانی تصوف کا خالصتاً ایرانی  
 ہونا بجائے خود ایک افتخار اور  
 سر بلندی ہے۔“

ایران کے تصوف کے بارے میں  
 بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ہمارا تصوف  
 ہمیشہ ”طریقت“ رہا ہے یعنی اس کا

ہست و ہمیں شبابہت صوری  
 عدہ کثیر از خاور شناسان را گمراہ  
 کردہ و تصوف را تقلیدی از  
 رہبانیت نصاریٰ صدر اسلام  
 دانستہ انداین نکتہ تنہا در بارہ  
 تصوف عراق و جزیرہ درستست  
 و بہیچ وجہ بہ تصوف ایران  
 نمی پردازد۔“

”تصوف ایران حکمتی ست بکلی  
 آریائی محض و اندک رابطہ بہ  
 افکار سامی مزارد و این خود یکی  
 از افتخارات و مواہب  
 آنست۔“

نکتہ اساسی در بارہ تصوف ایران  
 این است کہ تصوف ما ہمیشہ  
 ”طریقت“ بودہ است یعنی مشرب



و مسلك فلسفى بوده و نه  
 مشرب و مسلك فلسفیانہ ہے نہ کہ  
 ”شریعت“ و مذہب و دین -  
 ”شریعت یعنی دین اور مذہب۔“

ان اقتباسات سے مترشح ہوتا ہے کہ سعید نفیسی کے نزدیک تصوف ایک وحدت کلی نہیں ہے بلکہ ہر علاقے کا تصوف بعض خصوصیات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف اور جداگانہ حیثیت کا حامل ہے۔ اس بنا پر سرزمین ایران میں نشوونما پانے والا تصوف دیگر اسلامی ملکوں کے تصوف سے ممتاز و منفرد ہے جس کی تشکیل میں مذاہب قدیمہ بالخصوص بدھ مت نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

اس نقطہ نظر سے صرف اسی صورت میں اتفاق کیا جاسکتا ہے جب تصوف کو دینی اور اعتقادی رویہ کے بجائے ایک ایسا خارجی موثر قرار دیا جائے جسے صوفیائے ایران نے تاریخی جبر کے طور پر قبول کیا اور وہ بھی اس صورت میں کہ اپنی سرزمین میں نشوونما پانے والے مذاہب کے بعض عناصر کو اس خارجی موثر میں شامل کر لیا تاکہ ایرانی طبیعت کے لیے یہ صورت حال گوارا ہو سکے۔

ظاہر ہے کہ تاریخی حقائق کی روشنی میں اس قسم کے نقطہ نظر کی تائید مشکل ہی سے ہو سکتی ہے اور بضر محال ایسا کیا جائے تو یہ مسئلے کی تفہیم کا مبہم اور نامکمل تجربہ ہوگا۔ درآں حالیکہ اسلامی تصوف کی حقیقت مختلف علاقوں کے ثقافتی اور تہذیبی عوامل میں مضمر نہیں ہے بلکہ اس کی اساس قطعی طور پر دینی اور اعتقادی ہے۔ مختلف سرزمینوں میں تصوف کے رنگ، روپ اور طرق کا اختلاف وجدانی اور ذوقی ہے، اساسی اور بنیادی نہیں ہے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کے سلسلے میں غالباً سعید نفیسی اس حقیقت کو فراموش کر گئے کہ تصوف کی اساس رسول اکرم ﷺ کی اس حدیث پر ہے۔ جس میں ”احسانی کیفیت“ کے اصول و مبادی وضاحت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ اور تمام اکابر صوفیہ کا خواہ ان کا تعلق کسی سرزمین سے ہے اس پر اجماع ہے۔ یہی اجماع تصوف کے اسلامی اور شرعی ہونے پر دلیل ہے۔

اس اعتبار سے تصوف کی علاقائی اور جغرافیائی تقسیم علاقائی مہجرات کو ضرور تسکین پہنچا سکتی ہے لیکن اس صورت میں اسلامی روح کے ایک حقیقی مظہر کے مسخ ہونے کا خطرہ یقیناً درپیش رہے گا بلکہ شاید خود اسلام بھی اس رو سے محفوظ نہ رہے۔

اس ضمن میں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ اردو کے بعض عالموں اور نقادوں نے بھی تصوف کے سلسلے میں مغرب سے متاثر ہو کر غیر عالمانہ اور غیر معلمانہ انداز اختیار کیا ہے۔ اس کی بہترین مثال ڈاکٹر خورشید الاسلام کے تحقیقی مقالے

”غالب“ کا یہ اقتباس ہے:

”بیدل شریعت کے آداب کا اثبات کرتے، اور تصوف کی منطق سے زندگی کی گتھیوں کو سلجھاتے ہیں۔ ان کے نظام میں روحانی ریاضتوں پر خاصہ زور دیا گیا ہے ظاہر ہے کہ یہ نظام اپنی ایک منزل بھی رکھتا ہے۔ بیدل کے ذہن میں اس کا تصور کچھ بھی ہو لیکن اس نظام میں وہی نقص ہے جو ہر متصوفانہ نظام میں پایا جاتا ہے یعنی اس میں آخر محض انفرادیت ابھرتی ہے۔ فرد دوسروں کے ساتھ مل کر عمل کرنے سے گریز کرتا ہے اور اجتماعی عمل کے ذریعے سے اپنی خود کو پانے کے بجائے اسے دوسروں سے الگ رہ کر پروان چڑھانے میں مجو ہو جاتا ہے۔ جس کے دو نتیجے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کی شخصیت ایک کل کی حیثیت سے حرکت میں نہیں آتی۔ جس کے مشاہدہ سے وہ نہ صرف حظ اٹھانے لگتا ہے بلکہ آگے چل کر اسے زندگی کے مترادف سمجھنے لگتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کی خودی چونکہ دوسرے افراد کی خودی سے مربوط نہیں ہوتی اور خارج میں عمل کرنے سے گریز کرتی ہے اس لئے وہ جماعت کے اغراض کو نظر انداز کر دیتا ہے اور ان اغراض و مقاصد کے بجائے کسی ماورائی تصور کی لذت میں گم ہو جاتا ہے۔“

خدا معلوم فاضل مصنف نے یہ رائے کیوں کر اور کیسے قائم کر لی، جب کہ تاریخ شاہد ہے کہ صوفیہ کی مجلسوں اور صحبتوں میں جو گفتگو ہوتی تھی وہ بھی زیادہ تو حسن معاشرت اور حقوق العباد کے موضوع پر ہوتی تھی، اور وہ مباحث جو بقول معترضین عینیت یا ماورائیت پر مبنی ہیں، بہت کم معرض گفتگو میں آتے تھے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں برصغیر کے مشائخ چشت کے دو مجموعہائے ملفوظات، فوائد الفواد، مرتبہ حسن علاء ہجری (م ۷۳۸ھ) اور خیر المجاس مرتبہ حمید قلندر ایسے اقوال و ملفوظات سے مبرا ہیں۔ اور جن کے مطالعے سے ڈاکٹر خورشید الاسلام کے نقطہ نظر کی تردید آسانی سے ہو سکتی ہے۔ فوائد الفواد میں سلطان المشائخ کا یہ قول ”متصوفانہ نظام“ اور اس کی حقیقت کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔ سلطان المشائخ حضرت شیخ نظام الدین محبوب الہی قدس سرہ نے ایک مجلس میں ارشاد فرمایا: (وفات ۷۶۵ھ)

”ترك دنیا آن نیست کہ کسی خود را ترک دنیا کے یہ معنی نہیں کہ کوئی اپنے آپ کو نگار کھے اور برہنہ کند۔ مثلاً لنگوٹ بہ بند و پنبند لنگوٹ باندھ کر بیٹھ جائے۔ بلکہ ترک دنیا یہ ہے کہ لباس ترک دنیا آن است کہ لباس بپوشد و طعام بھی پہنے اور کھائے بھی اور حلال کی جو چیز پہنچے اسے روا بخورد و آنچه می رسد روا بداد ردو۔ لجمع رکھے لیکن اس کے جمع کرنے کی طرف رغبت نہ کرے اور اومیل نکند و خاطر را متعلق چیزے ندارد، دل کو اس سے نہ لگائے، ترک دنیا یہ ہے۔

ترك دنیا است۔

ایک دوسری مجلس میں ارشاد ہوا:

”لختی سخن دراصل سلوک افتاد و آن چہ ” کچھ دیر سلوک کے اصل اصول اور لب لباب کے صخ معنی بودہ۔ دریں میان فرسود کہ بارے میں گفتگو فرمائی۔ اسی اشنا میں ارشاد ہوا کہ مروی بخدمت خواجہ اجل ایک شخص خواجہ اجل شیرازیؒ والغفران کی خدمت میں شیرازی آمد رحمۃ اللہ علیہ والغفران و حاضر ہوا، اور بیعت کی اور انتظار کرنے لگا ارادت آورد، منتظر فرمان خواجہ سی بودتا کہ آپ اسے نماز، روزہ اور دیگر اوراد کے بارے میں او را از نماز و روزہ و اورا وچہ سی کچھ ہدایت فرمائیں۔ لیکن حضرت خواجہ نے فرماید۔ خواجہ ہمیں گفت کہ آن چہ صرف یہی فرمایا کہ جو اپنے لیے روانہ نہیں رکھتے، کسی بے خود روانداری بر غیری نیز روا مدار و خود دوسرے کے لئے بھی روانہ رکھو اور اپنے لیے وہی چاہو جو راہماں خواہ کہ دیگری را۔ الغرض آن مرد کسی دوسرے کے لئے چاہتے ہو۔ وہ شخص واپس ہو گیا اور باز گشت و بعد از مدتی باز آمد بخدمت ایک مدت کے بعد خدمت میں پھر حاضر ہوا اور گزارش کی خواجہ اجل شیرازیؒ عرض داشت کہ میں اس روز خدمت میں حاضر ہوا اور منتظر رہا کہ کرد کہ من آن روز کہ بخدمت پیوستم حضرت مجھے نماز اور اوراد کی تلقین فرمائیں گے لیکن منتظر بودم تا خواجہ مرا نمازی و اورادی پیر و مرشد نے کچھ نہیں فرمایا۔ میں پھر اسی ہدایت کا منتظر فرماید، ہیچ نہ فرمود امروز منتظر نیز ہوں، خواجہ نے فرمایا کہ اس روز تمہارا سبق کیا تھا؟ مرید ہستم۔ خواجہ گفت کہ آن روز تخته تو حیران رہ گیا اور خاموش رہا۔

چہ بود؟ مرید حیران ماند۔ ہیچ جواب نداد۔ خواجہ تبسم فرمود و گفت کہ آن روز ترا گفتم آن چہ برخود نہ پسندی بردیگری مپسند و خود را ہماں خواہ کہ غیری را خواہی تو آن سخن یا ونہ داشتی، پس چون تخته اول درست نہ کردی تخته دیگر چگونہ دہم۔“ ۱

خواجه شیرازی مسکرائے اور فرمایا

کہ اس روز میں نے کہا تھا کہ جو کچھ تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے، دوسرے کے لیے بھی پسند نہ کرو۔ اور اپنے لیے وہی پسند کرو جو دوسرے کے لئے چاہتے ہو۔ تم نے وہ بات یاد ہی نہ رکھی۔ جب تم نے پہلا سبق درست نہ کیا تو میں دوسرا سبق کیسے دوں؟“

”ہم برنسبت این حروف فرمود۔۔۔ کہ ”ان الفاظ کی نسبت حضرت خواجه نے فرمایا کہ یحییٰ معاذ یحییٰ معاذ رازی گفتہ است کہ یک ذرہ رازی نے فرمایا کہ محبت کا ایک ذرہ انسانوں اور پریوں کی محبت بہ از طاعت جملہ آدمیاں و پریاں! اطاعت و عبادت سے بہتر ہے۔

مناسب این معنی فرمود کہ شیخ

الاسلام

اسی کی مناسبت سے ارشاد ہوا کہ

فریدالدین قدس سرہ بارہا ہر کسی شیخ الاسلام فریدالدین قدس سرہ العزیز نے ایک شخص سے راگفتی خدائی عزوجل ترا دردی دباد! آں بار بار یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں درد (دل) عطا کرے وہ کس حیران ماندی کہ این چہ دعا ست شخص حیران ہو گیا کہ یہ کیا دعا ہے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ - این ساعت معلوم می شود کہ وہ کتنی بڑی دعا تھی۔“

آں چہ دعا بود۔“ (۱)

ان ملفوظات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ صوفیہ اپنی مجالس خاص میں بھی شریعت کے اس پہلو سے جس کا تعلق عام معاشرت اور تعمیر سیرت سے ہے، غافل نہ تھے۔ اور اپنے ارادت مندوں کو بھی کار حیات سے بے خبر رہنے کو روانہ نہ سمجھتے تھے۔ اس باب میں خود ان کا عمل کیا تھا، یہ ان کی سوانح اور حالات زندگی کے مطالعے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ نہ صرف اللہ تعالیٰ کے معاملات میں بلکہ بندوں کے معاملات میں بھی شریعت کے احکام کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ بنا بریں ان پر ترک عمل اور ترک حقوق کا اتہام لاعلمی پر مبنی ہے اور حد درجہ ناروا ہے۔

پروفیسر سید صفی حیدر دانش نے ”تصوف اور اردو شاعری“ کے نام سے اس موضوع پر ایک مستقل تصنیف تحریر فرمائی ہے۔ پروفیسر موصوف تحریر فرماتے ہیں۔

”صوفیہ کی فطرت میں جو ہر تصوف موجود تھا۔ اس لیے خود بخود درونما ہوا۔ ان کے زیادہ مشاغل اور اعتقادات

خالص اسلامی ہیں۔ لیکن چوں کہ ان کو متعین اور شعوری طور پر قرآن و حدیث سے اخذ نہیں کیا گیا اس لیے یہ نظریہ بھی بطور کلی قابل قبول نہیں۔ (پیشانی)

پروفیسر دانش نے ڈاکٹر خورشید الاسلام کے ”عدالتی فیصلے“ کے برخلاف اسلامی تصوف کی خصوصیات کو جاننے کی کوشش کی ہے۔ اگر وہ اخذ نتائج کے سلسلے میں مزید جستجو کرتے اور اس موضوع پر کبار صوفیہ کی تصانیف کا زیادہ دقت نظر سے مطالعہ کرتے تو شاید انہیں یہ کہنے میں تامل ہوتا کہ تصوف متعین اور شعوری طور پر قرآن و حدیث سے ماخوذ نہیں ہے۔ انہوں نے بھی اخذ نتائج کے سلسلے میں ان مستشرقین کی روش کو نادانستہ طور پر اختیار کیا ہے جو حقیقت کو تو غلط انداز میں پیش کرنے کے عادی ہیں لیکن اظہار مطالب میں لہجے کی نرمی اور بیان کی دل کشی پیدا کرنے کے فن میں ماہر ہیں۔

اس ضمن میں ہمارے ملک کے ایک فاضل محقق اور مصروف نقاد پروفیسر علی عباس جلال پوری کی تصنیف ”اقبال کا علم کلام“ سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔ پروفیسر علی عباس فرماتے ہیں:

”الہیات ارسطو کا عربی ترجمہ ۲۲۶ھ میں ہوا۔ یہ ارسطو کی تصنیف نہیں تھی بلکہ فلاطینیوس کی اینڈز کے آخری تین ابواب کا مخلص تھا جو نیمیا ح امیسوسی نے لکھا تھا عربوں نے غلطی سے اسے ارسطو کی تصنیف سمجھ لیا اور الہیات کے نو فلاطونی افکار ارسطو سے منسوب کر دیے گئے۔ اس طرح عالم اسلام میں ہر کہیں ارسطو کے نام پر نو فلاطونیت کی اشاعت ہوئی۔ اس اسلامی نو فلاطونیت کو ابن سینا، اخوان الصفا، اور ابن رشد نے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ دوسری طرف مسلمان صوفیہ بھی نو فلاطونی افکار سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ جنید بغدادی، بایزید بسطامی، شیخ الاشراق، شہاب الدین سہروردی، مقتول، شیخ اکبر محی الدین ابن عربی، حتیٰ کہ غزالی تک کے افکار بنیادی طور پر نو فلاطونی کہے جاسکتے ہیں۔“

اسی موضوع کے سلسلے میں مزید فرماتے ہیں:

”مسلمانوں کے تصوف و عرفان پر بالخصوص نو فلاطونی تعلیمات کے اثرات بہت دور رس ہوئے۔ بایزید بسطامی پہلے صاحب حال صوفی کہے جاسکتے ہیں۔ فنا فی اللہ کا نظریہ بھی سب سے پہلے انہوں نے پیش کیا تھا۔ جنید بغدادی نے فلاطینیوس کی پیروی میں ذات احد کو حسن ازل اور محبوب اول کا خطاب دیا اور عشق حقیقی کو تصوف و سلوک کی بنیاد قرار دیا۔ حلاج کے ہاں اوتار کا زرتشتی تصور نمایاں ہے لیکن اس کا یہ عقیدہ کہ انسانی روح میں روح بھی جلوہ پیرا ہے، فلاطینیوس سے ہی ماخوذ ہے۔ شیخ اکبر ابن عربی نے نظریہ وحدت الوجود اور فصل و جذب فلاطینیوس ہی سے اخذ کیا ہے۔ فلاطینیوس کا خیال تھا کہ ذات احد کائنات سے بے تعلق اور ماوراء بھی ہے اور کائنات میں جاری و ساری بھی۔ ابن عربی بھی ماورائیت اور سریان، دونوں کے قائل تھے۔ انھوں نے افلاطون کا GOD فلاطینیوس کا احد اور اسلام کا اللہ ایک ہی

معنوں میں استعمال کیے ہیں۔

مذکورہ تصنیف کے آخری باب میں جس کا نام ”تصریحات“ ہے، پروفیسر علی عباس صاحب نے تصوف کی جو تصریح کی ہے وہ بھی یہاں پیش کی جاتی ہے۔

”مسلمانوں کے اخلاقی منزل کے دور میں مذہبی پیشوا اپنی ابلہ فریبی اور دکان آرائی کے لیے بدنام ہو چکے تھے اور مذہب محض رسوم عبادت کی ظاہری پابندی بن کر رہ گیا تھا۔ اہل دل کو یہ بات ناگوار گزری۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مذہب کا مقصد اولیٰ دل کا تصفیہ ہے اور نیکی ظاہری رسوم عبادت کی پابندی سے زیادہ باطن کی اصلاح پر منحصر ہے۔ چنانچہ اہل ظاہر ملاؤں کے مقابلے میں انھیں اہل باطن کہنے لگے۔“

یہ بات قابل ذکر ہے کہ تصوف کی نشوونما خراسان میں ہوئی تھی جو کسی زمانے میں بدھ مت کا بڑا مرکز تھا۔ چنانچہ یہ امر چنداں حیرت کا باعث نہیں ہے کہ خراسان کے صوفیہ زاویہ نشینی اور عزلت گزینی پر زور دیتے تھے۔ ابراہیم بن ادھم (م ۷۷۷ء) کو خراسان کے دبستان صوفیہ کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

وحدت الوجود کا نظریہ حلاج کے حلول پر اضافہ ہے۔ حلویہ کا خیال تھا کہ خالق مخلوق سے الگ ہے گو اس میں حلول کیے ہوئے ہے۔ وجودیہ کو اتحادیہ بھی کہتے ہیں۔ ان کے خیال میں کائنات عین خالق ہے۔ نظریہ وحدت الوجود کی اشاعت صدر الدین قونوی، عبدالکریم الجیلی، عراقی ابن الفارض اور مولوی جلال الدین رومی نے بڑے جوش و خروش سے کی۔ ہندوستان میں چشتیہ نے اسے ہر کہیں پھیلا دیا۔ مرور زمانہ سے تصوف کی تحریک نے جو تصفیہ اخلاق کی ایک کوشش تھی باقاعدہ فلسفے کی صورت اختیار کر لی اور اس میں اشراق، سریاں، تجلی اور فصل و جذب کے خالص نوافلاطونی نظریات وخیل ہو گئے۔

اس تالیف کے (صفحہ ۹۱-۹۲) پر حضرت شاہ ولی اور ڈاکٹر مصطفیٰ حلیمی کی تصانیف کے اقتباسات سے اس امر کا ثبوت پیش کیا گیا ہے کہ تصوف یا احسان کی اصل رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے عہد مبارک میں موجود تھی۔ اس بین شہادت کے باوصف یہ مفروضہ قائم کرنا کہ صوفیہ کے افکار بنیادی طور پر نوافلاطونی ہیں۔ تاریخ، روایت، حقیقت اور صداقت سے روگردانی ہے۔

ممکن ہے کہ پروفیسر سید علی عباس جلال پوری کے لیے مذکورہ شہادت اطمینان کا باعث نہ ہو اس لیے اس مسئلہ کو ان ہی کے نقطہ نظر سے واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

جناب میکش اکبر آبادی نے اپنی تصنیف ”نقد اقبال“ میں مسٹری جے دیپ اور مسٹر تھلی کے حوالوں سے

فلاطینوس اور نوفلاطینیوں کے بارے میں تحریر کیا ہے:

- (۱) روح انسانی روح کائناتی کا ایک حصہ ہے۔ اگر وہ جسمانی زندگی سے متعلق رہتی ہے تو موت کے بعد وہ روح کسی دوسرے انسانی یا حیوانی یا نباتی جسم سے متعلق رہتی ہے۔
- (۲) نظریاتی زندگی عملی زندگی سے بلند ہے۔

(۳) خدا تمام کائنات کا منبع اور مرجع ہے۔ وہ مادر ہے اس لیے ہم اس کی جو صفت بھی بیان کریں گے وہ اس سے محدود ہو جائے گا۔ اس لیے ہم اس کو حسن مطلق یا خیر محض بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ یہ سب صفات محدود ہیں اور کسی نہ کسی کمی کا اظہار کرتے ہیں۔ دنیا خدا سے ہے لیکن اس نے دنیا کو تخلیق نہیں کیا۔ کیوں کہ تخلیق کا فعل شعور اور ارادے کی طرف اور خدا کو محدود کرنے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

(۴) پلوٹینس کئی خداؤں سے بھی انکار نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک تمام دیوتا خدا ہی کا ظہور ہیں۔ وہ خیر و شر کے دیوی دیوتاؤں کا بھی عقیدہ رکھتا تھا۔ صوفیہ اور نوفلاطینیوں کے مسلک اور طرز احساس پر میکش اکبر آبادی کی تنقید حسب ذیل ہے:

”نوفلاطونی مسلک سے روشناس ہونے کے بعد یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ نوفلاطونی اپنے نظریات کے اعتبار سے صوفیوں کے بہ نسبت غیر اسلامی مفکرین سے زیادہ قریب اور زیادہ مشابہ ہیں۔ چنانچہ ہندو مفکرین کی طرح یہ بھی نتائج (آواگون) کے قائل ہیں۔“

(نوفلاطونی) خیالی اور نظریاتی زندگی کو (کرم مارگ اور گیان مارگ کی طرح) عملی زندگی سے علیحدہ اور اعلیٰ جانتے ہیں۔

”صوفیاء ان تمام اصولوں میں ان سے مختلف ہیں۔ ان عقائد کے علاوہ صوفیوں نے حقیقت اعلیٰ یا خدا کا تصور جمال اور نور کی حیثیت کیا ہے لیکن نوفلاطونی خدا کو جمال سے تعبیر کرنا درست نہیں سمجھتے۔ نوفلاطونی نفی صفات کے قائل ہیں صوفیا صفات کے قائل ہیں۔ البتہ صفات کو غیر ذات نہیں سمجھتے۔“

میکش اکبر آبادی نے صوفیہ اور نوفلاطین کے مسالک میں جس فرق و امتیاز کی نشان دہی کی ہے وہ معمولی اور سطحی فرق نہیں ہے بلکہ بنیادی اور اساسی ہے، نیز اپنے نتائج کے اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ حلول، اتحاد اور نتائج سے قطع نظر جسے صوفیہ الحاد و زندقہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ (۱۲۳) صرف اسامہ صفات باری تعالیٰ کے اثبات اور نفی سے حیات و کائنات اور خالق و مخلوق کے تصورات میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، اجتماعی طرز احساس، انسانی

تفاوتات اور معاشرتی ماحول میں زبردست انقلاب رونما ہوتا ہے نیز انفرادی زندگی کے ظاہری باطنی عوامل یکسر بدل جاتے ہیں۔

یہاں اس گروہ کے معاملات سے بحث نہیں جو ذات باری تعالیٰ کے بارے میں نفی صفات کا نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ ان کے حالات اور فلسفہ حیات و کائنات کا مطالعہ فلاطین اور ویدانت کے ادب میں کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جہاں تک صوفیہ کو تعلق ہے ان کے نزدیک اثبات صفات کا مقصود اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی پیروی میں ان صفات کو اپنی ذات میں جذب کرتا ہے، جن سے ان کا خالق متصف ہے۔ یہ تمنا اور آرزو جیسا کہ پروفیسر سید علی عباس صاحب خیال کرتے ہیں۔ فلاطینوس کی پیروی میں نہیں ہے بلکہ اسلام کی معروف تعلیمات اور جناب رسول اکرم ﷺ کے فرمودات کے عین مطابق ہے۔ صوفیہ کی جملہ اصطلاحات فنا و بقا، فصل و جذب، قبض و بسط، وقت و حال اور جمع و تفرقہ اسی آرزو اور تمنا کے مختلف پہلو اور اس راہ کے حصول میں جو عمل جاری رہتا ہے اسی کے مختلف عوالم ہیں۔ حضرت ابوالحسن نوری کا قول ہے:

”صوفیاں آں قوم اند کہ جان ایشان ”صوفیہ ایسی جماعت ہیں کہ ان کی جانیں بشری از کدورت بشریت آزاو گشتہ است و کدورت سے مبرا ہو گئی ہیں۔ نفس کی آفتوں سے محفوظ از آفت نفس صافی شدہ و از بہو اخلاص ہو چکی ہیں اور ہوا و ہوس سے چھٹکارا حاصل کر چکی ہیں۔ یافۃ تا در صف اول و درجہ اعلیٰ با حق بیارا سب سے آگے اور اعلیٰ منزل میں حق تعالیٰ کے ساتھ امن میدہ اندواز غیر رمیدہ۔“

’تصوف نہ رسوم است و نہ علوم لیکن “تصوف نہ رسم ہے نہ علم بلکہ سراسر اخلاق ہے۔ یعنی اگر اخلاقی است، یعنی اگر رسم بودی لگا بندھا طریقہ ہوتا، کوشش سے حاصل بمجاہدہ بدست آمدی و اگر علم بودی ہو جاتا۔ اگر علم ہوتا، پڑھنے سے حاصل ہو جاتا، یہ تو اخلاق بہ تعلیم حاصل شدی بلکہ اخلاقی ہے کہ اپنے میں اخلاق الہی پیدا کرو۔“

است کہ تخلقوا با خلاق اللہ۔“

پروفیسر سید علی عباس جلال پوری کا اصرار ہے کہ سید الطائفہ جنید بغدادیؒ نے ذات احد کو حسن ازل اور محبوب اول فلاطینوس کی پیروی میں کہا ہے۔ یہ اصرار بھی ان کے اعتقادی اور نظریاتی تعصب کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے ایک زبردست مغالطہ پیدا کرتے ہوئے اس قول کی تعبیر اپنے مخصوص رجحانات کے تحت کی ہے۔ اس ضمن میں محل نظر یہ بات



ہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ کے مذکورہ قول کے سلسلہ میں انہوں نے کوئی سند پیش نہیں کی۔ بنا بریں یہ بات کس بنیاد پر تسلیم کر لی جائے کہ جو قول پروفیسر صاحب موصوف نے حضرت جنیدؒ سے منسوب کیا ہے وہ واقعی حضرت جنیدؒ ہی نے ارشاد فرمایا تھا، اور بفرض محال یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مذکورہ قول جنید بغدادیؒ ہی کا ہے تو اس کا جو مفہوم پروفیسر صاحب نے سمجھا ہے اس پر کس طرح اعتماد کر لیا جائے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے اپنی بہت سی صفات اور اسما کا ذکر فرماتے ہوئے یہ بھی ارشاد فرمایا: ”لہ الا سماء الحسنی“ (اس کے لیے حسن و خوبی کی صفتیں ہیں۔) اس لحاظ سے حسن ازل یا محبوب اول اسماء حسنی نہیں تو اور کیا ہو سکتے ہیں؟ اور یہ کس طرح فرض کیا جاسکتا ہے۔ کہ سید الطائفہ جنید بغدادیؒ نے ان اسماء کو عقیدہ تنزیہ کے تحت نہیں کہا ہے بلکہ عقیدہ تعطیل کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ کم از کم علمی دیانت اس نوع کے مفروضے کو ہرگز اجازت نہیں دیتی:

کارپا کاں راقیاس از خود مکیر

گھوچہ باشد در نوشتن شیر و شیر

اسی طرح صوفیہ کے ہاں عشق حقیقی یا عشق الہی کا مسئلہ نوافل طوطی انداز کا نہیں ہے بلکہ قرآن و سنت کی متابعت میں ہے۔ اگر پروفیسر سید علی عباس صاحب قرآن حکیم کا مطالعہ کر لیتے تو اس نوع کا الزام صوفیہ پر قائم کرتے ہوئے ضرورتاً مل کرتے۔ ثبوت کے لئے ملاحظہ فرمائیں: (۲۵۷)

والذین امنوا اشد حبا لله (۱) (۲۵۸) اور جو ایمان لائے وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت کرتے ہیں۔

ياايهاالذين امنوا امن يرتد منكم عن دينه اے پيروان دعوت ايماني اگر تم ميں سے كوئى شخص اپنے فسوف ياتى الله بقوم يحبهم و يحبون دين كى راہ سے پھر جائے گا تو عنقریب اللہ ایک گروہ پیدا کر دے گا جنہیں اللہ کی محبت حاصل ہوگی اور وہ اللہ (۲۵۹) کو محبوب رکھنے والے ہوں گے۔

اللهم اجعل حبك احب الى من نفسى واهلى الہى تو اپنی محبت کو میری جان سے، میرے اہل و عیال و من الماء البارء (۲۶۰) سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ میری نظر میں محبوب بنا۔ مذکورہ آیات اور حدیث نبوی ﷺ کی روشنی میں صوفیہ پر یہ الزام عاید نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے محبت الہی کے جذبے کا اظہار اسلام کے تخلیق کردہ طرز احساس سے اعراض کرتے ہوئے کیا ہے بلکہ اس حکم اور مطالبے کی تکمیل ہے جو

قرآن و سنت کے تحت ہر مسلمان پر واجب ہے۔

اس موضوع پر امام ابوالقاسم قشیریؒ نے جنید بغدادیؒ کی ایک تقریر نقل فرمائی ہے جسے ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

”ابوبکر کتانی فرماتے ہیں کہ حج کے موسم میں محبت پر بحث چھڑ گئی۔ شیوخ صوفیاء نے اس پر تقریریں۔ جنیدؒ سب سے چھوٹی عمر کے تھے۔ مشائخ نے جنیدؒ سے کہا۔ اے عراقی تو بھی کچھ بیان کر۔ اس پر جنیدؒ نے سر جھکایا اور رونے لگے پھر یوں کہا:

”ایک بندہ ہے جو اپنے آپ کو کھو چکا ہے۔ اپنے رب کا لگا تار ذکر کرتا ہے اور اس کے حقوق برابر ادا کیے جا رہا ہے اور دل کی آنکھوں سے اپنے رب کو دیکھ رہا ہے۔ ذات خداوندی کے انوار نے اسے جلادیا ہے اور اس کی محبت کے پیالوں سے اس نے صاف شراب پی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی غیب سے اس کے لیے پردے اٹھا دیے ہیں، لہذا یہ شخص جن گفتگو کرے گا تو اللہ کی مدد سے کرے گا اور اگر حرکت کرے گا تو اسی کے حکم سے اور اگر ساکن ہوگا تو اللہ کے حکم سے۔ لہذا یہ شخص اللہ کے ساتھ اللہ کے لیے اور اللہ کی معیت میں ہوگا۔“

سید الطائفہ جنید بغدادیؒ نے مشائخ کے سامنے محنت کی جو تشریح کی ہے اس کے مفہوم اور پروفیسر سید علی عباس صاحب نے جو تہمت صوفیہ پر عاید کی ہے اس کا تجزیہ کیا جائے تو ان کے دعویٰ کی ناتوانی اور کم عیاری کا یقین واثق ہو جاتا ہے۔

دراصل پروفیسر سید علی عباس صاحب سے اس باب میں جو سوہو ہوا ہے، اس کا حقیقی سبب یہ ہے کہ انہوں نے محبت الہی یا عشق حقیقی کے مسئلے کو اس کے صحیح تناظر میں نہیں دیکھا ہے۔ اس باب میں صوفیہ، علماء، صلحا اور ائمہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے بھی محبت کرے اور اس کے رسول محمد ﷺ سے بھی محبت کا تعلق قائم کرے۔ نصوص سے یہ دونوں امور ثابت ہیں۔ اس اعتبار سے محبت الہی کے مسئلے کی نوعیت وہ نہیں رہتی جو پروفیسر صاحب موصوف کے ذہن میں ہے بلکہ صوفیہ کے عقائد میں محبت الہی کے جذبے کے بنیاد عشق رسول ﷺ سے وابستہ ہے۔

”لایومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ و ولدہ والناس اجمعین۔“ (۲۹۱)

صوفیہ کے جذبہ عشق حقیقی کو اگر اس تناظر میں دیکھا جائے تو اس مطالعہ کے نتائج وہ نہیں ہوں گے جو پروفیسر

سید علی عباس صاحب نے اخذ کیے ہیں۔

پروفیسر صاحب موصوف نے اشراق اور تصوف کو بھی ایک سمجھنے کی غلطی کی ہے اور اسی بنا پر وہ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ مقتول کو گروہ صوفیہ میں خیال کر بیٹھے ہیں، حالاں کہ سہروردی مقتول نہ صوفی تھے اور نہ ان کا مسلک تصوف تھا، البتہ اسلام کی علمی تاریخ میں سہروردی مقتول حکمت اشراق کے ایک عظیم عالم کی حیثیت سے ضرور شمار کیے جاتے ہیں۔ میکش صاحب نے اسلامی تصوف کے متعلق غلط فہمیوں کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی بیان کیا ہے کہ بعض حضرات نے ان لوگوں کو بھی صوفی خیال کر لیا ہے جو سرے سے صوفی ہی نہ تھے۔ جس کی ایک واضح مثال خود پروفیسر سید علی عباس صاحب ہیں۔ میکش صاحب تحریر فرماتے ہیں:

”ایک بڑی ذمہ اس غلط فہمی کی یہ ہے کہ بعض غیر صوفی حضرات کو صوفی سمجھ کر ان کے عقائد کو صوفیوں کے عقائد سمجھ لیا جائے۔ اس ضمن میں ملا ہادی کے علاوہ شیخ الاشراق کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ شیخ کا شمار حکمائے اسلام میں ہے نہ کہ صوفیائے اسلام میں صوفیاں کی تصانیف میں ان کا ذکر کیا جاتا ہے، نہ ان کی سند قبول کر جاتی ہے۔ یہاں تک کہ شہید کے معزز لقب کے بجائے ان کو مقتول کہا جاتا ہے۔

میکش صاحب کی مذکورہ بالا صراحت کی تائید ڈاکٹر مصطفیٰ حلیمی کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر حلیمی نے شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردیؒ (متوفی ۵۸۷ھ) کے اقوال سے یہ استدلال کیا ہے کہ تصوف اور اشراق اپنے مخصوص مسلک اور اسلوب حیات کے اعتبار سے دو مختلف طریق ہیں۔

ڈاکٹر حلیمی فرماتے ہیں۔

”ذات الہی کے صفات و افعال کی لذت اور معرفت اور حکمت علم کلام، فلسفہ اور تصوف میں مشترک ہے اور یہ لذت دو طریق سے حاصل ہوتی ہے۔

پہلا طریقہ فلسفہ اور استدلال عقلی کا ہے۔

دوسرا طریقہ ذوق روحی اور وجد صوفی کا ہے۔

(۱) جو لوگ پہلے طریقے پر عامل ہیں، وہ اسلام کی تعلیمات کو دلیل عقلی سے ثابت کرتے اور مانتے ہیں

یہی حضرات متکلمین کہلاتے ہیں۔

(۲) جو لوگ صرف نظر عقلی کو کافی سمجھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حکمائے مشائین کہلاتے ہیں۔

(۳) لیکن جو لوگ دوسرے طریقے پر عامل ہیں وہ اسلام کی تعلیمات کو مانتے ہیں۔ اس کے نصوص اور

احکام کی حسب موقع تاویل کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو صوفیہ کہلاتے ہیں۔

(۴) اسی گروہ میں جو لوگ اس راستے سے ذرا ہٹ کر چلتے ہیں۔ ذوق و وجدان کو مقدم سمجھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حکمائے اشراقی کہلاتے ہیں۔

اسی تعریف کی روشنی میں حکمت اشراق ایک روحانی فلسفہ ہے۔ اس مذہب کا قوام ذوق اور وجدان ہے۔ یہی سہروردی کا مسلک ہے۔

”سہروردی کہتے ہیں کہ میں نے اپنی کتاب حکمت الاشراق صرف اس طالب کے لیے لکھی ہے جو تالا اور بحث سے شغف اور انہماک رکھتا ہو۔ لیکن وہ طالب جو بحث سے سروکار رکھتا ہو اور الہیت سے شغف نہ رکھتا ہو یا وہ الہیت سے سروکار رکھتا ہو مگر بحث سے بھاگتا ہو۔ اسے اس کتاب سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

اس صراحت کے بعد یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ جو حضرات تصوف اور اشراق کو ایک طریق سمجھتے ہیں وہ مشابہت و مماثلت کے التباس میں مبتلا ہیں۔

ڈاکٹر مصطفیٰ حلی کے علاوہ ڈاکٹر عبدالحسین زرین کوب نے ظاہری مشابہت سے متاثر ہونے والے ایسے مستشرقین کی نشان دہی کی ہے جنہوں نے تصوف کے منابع اور مآخذ پر قیاس آرائیوں کا ایک طومار باندھا ہے جن سے متاثر ہو کر مشرق کے متغربین رطب دیا بس لکھنے کے عادی ہیں لیکن ڈاکٹر زرین کوب نے قطعی واضح الفاظ میں امر کو تسلیم کیا ہے کہ اسلامی تصوف کا ماخذ و مصدر اسلام اور قرآن ہے:

از آن جملہ	ثالوك از	ثالوك قدیم مستشرقین میں سے
قدمائی قوم مدعی شدہ است		ہے جس کا دعویٰ ہے کہ صوفیہ کی
کہ منشأ عمدئہ آن آئین مجوس		تعلیمات کا سرچشمہ مجوس (آتش
بودہ است و حتی بعضی از		پرستوں) کے عقائد ہیں۔ حتیٰ کہ
مشائخ صوفیہ نیز مجوسنی		مشائخ صوفیہ میں سے بعض مجوسی
ثراد بودہ اند۔	وزی۔	نژاد تھے۔ دوزی نے جو بھی
ہم کہ از نام آوران قوم است		مستشرقین میں بہت مشہور ہے،
ہمیں نظر را تائید کردہ است۔		اسی نقطہ نظر کی تائید کی ہے۔
ماکس	بہورتن تاثیر آرا	مارکس ہو رتن کا خیال ہے کہ صوفیہ

کے ہاں ہندو برہمنوں کے مذہب کا اثر ہے، خاص طور پر منصور حلاج اور دیگر صوفیہ مثلاً باریزید و جنید کے اقوال میں ان کا بہت ہی قوی اثر ہے۔ ہارتمان نے علاوہ دیگر عوامل کے ہندوؤں کے اثر پر بہت اصرار کیا ہے اور اپنے نظریہ کی تائید میں دیگر قرائن سے بھی مدد حاصل کی ہے۔ فان کرمر نے بھی ہندو مت اور بدھ مت کے عناصر کے اثر کی نشان دہی جنید اور باریزید کے عقائد میں کی ہے اور دوسرے عناصر کا بھی ذکر کیا ہے کہ صوفیہ نے مسیحی رہبانیت کا اثر قبول کیا تھا۔ خاص طور پر حارث محاسبی اور ذوالنون مصری مسیحی رہبانیت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ تصوف میں مسیحی عناصر کی تائید دوسرے محققین نے بھی کی ہے۔ انہوں نے تصوف کے ماخذ و منشا پر بہت توجہ دی ہے ان میں پالاسیو، ولنک، اور تو راندرانے تصوف اسلامی میں مسیحی عقائد کے اثر کی نشان دہی کی ہے۔ بعض

ہندواں و مذاہب برہمنان را مخصوصاً در سخنان حلاج و بعضی دیگر از متصوفہ چون بابزید و جنید قوی یافتہ است۔ ہارتمان نے ان کے بیش تر نہ نفوذ ہندواں بعلاوہ بعضی عوامل دیگر توجہ بسیار کردہ است و این نظریہ را بہ کمک پارہ قرائن دیگر نیز تائید نموده است۔ فورڈ نے کرمر از تاثیر عنصر ہندی و بودای کہ بہ عقیدہ دی مظهرش جنید و بابزید دست سخن گفہ است و عنصر دیگری راہم نشان دادہ است کہ عبارت باشد از رہبانیت مسیحی و دی مخصوصاً حارث محاسبی و ذوالنون مصری را از مظاہر آن شمرده است۔ وجود این عنصر مسیحی را خیلی از محققان دیگر نیز تائید کردہ اند و در بیان منشا تصوف ہذاں توجہ خاص ورزیدہ اند۔ از آن جملہ آسین نے پالا

محققوں نے سرچشمہ تصوف کی تحقیق میں دور دراز راستہ اختیار کیا ہے۔ ان میں وینفلڈ، براؤن اور نکلسن قابل ذکر ہیں جن کا خیال ہے کہ تصوف نوافلاطونی فلسفہ پر مبنی ہے۔ مرکس نے تصوف میں یونانی فلسفہ اور بلوشہ نے ایرانی عقائد کے اثر کی جانب اشارہ کیا ہے، کارادو و تصوف کو مسیحی عقائد، یونانی، فلسفہ، ویدانت، مجوسیت حتیٰ کہ عقائد یہود کا مرکب خیال کرتا ہے۔

سیو، ونسینک و تور اندرا (۱) تاثیر عقائد مسیحی رادر تصوف اسلامی نشان داده اند۔ بعضی محققان ہم در بیان منشآتصوف راه ہای دور تر رفته اند، چنان کہ از آن میان وینفلڈ، براؤن (۲) و نیکلسون (۳)، بتاثیر حکمت نوافلاطونی تو در زیدہ اند، مرکس (۴) بہ نفوذ حکمت یونانی و بلوشہ بتاثير عقائد و مبادی ایرانی اشارت کردہ اندد کارا (۵) دو و منشاء تصوف را اور آئین مسیح در حکمت یونان در او یان ہندو ایران و حتی در آئین یہود سراغ می دہد۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ مختلف قسم کے فلسفیانہ اور مذہبی افکار، اسلامی تصوف میں وارد اور شامل ہوئے ہیں لیکن یہ مفروضہ کہ تصوف کا منبع اور ماخذ قطعی طور غیر اسلامی ہے، بلا دلیل ہے اور

شک نیست کہ اندیشہ ہائے فلسفی وینی گونا گوں در جریان تصوف اسلامی وارد و حل شدہ است لیکن فرض آن کہ تصوف ناچار بایدیک منشأ غیر اسلامی داشته باشد، امروز دیگر موجہ و

معقول نہیں ہے۔ نیز اسی طرح  
 کے مفروضات کہ سائی مذاہب اور  
 عقائد کے برعکس تصوف آریائی  
 ذہن کی پیداوار ہے یا تصوف  
 حکومت و مذہب کے خلاف سرکشی  
 اور بغاوت کا منفی رویہ ہے، جیسا  
 کہ بعض اہل تحقیق نے اس بارے  
 میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔  
 محض شاعرانہ خیال آرائی ہے (حقیقت نہیں ہے) بہر حال اس  
 نوع کی تحقیقات اپنے تمام تر ظاہری  
 فریب کے ساتھ آج کی دنیائے علم  
 میں محض ڈھٹائی، شوخ چٹشی اور  
 حد درجہ بے باکی خیال کی جاتی ہے اور  
 کسی درجے میں بھی قابل دفاع نہیں  
 ہے۔ (نظر انداز کرنے کے قابل  
 ہے)۔

اسلامی تصوف غیر اسلامی مذاہب  
 سے اس نوعیت کی شباهت کے باوجود  
 نہ جزوی طور پر ان مذاہب سے برآمد  
 ہوا ہے اور نہ مجموعی اعتبار سے ان  
 سے برآمد ہوا ہے بلکہ اپنی ذات میں

معقول نیست - فرضیہ ہای نیز  
 ازیں قبیل کہ تصوف عکس  
 العمل دماغ آریائی است در  
 مقابل مذاہب و عقاید ساسی  
 ، یا این کہ تصوف نوعی عصیان  
 و سرکشی منفی است در برابر  
 مذہب و حکومت کہ بعضی  
 از اہل تحقیق دریں بارہ اظہار  
 کردہ انداز مقولہ خیال بانی  
 ہای شاعرانہ است و بہر حال  
 این گونه سنخناں بابہمہ فریبند  
 گی ظاہری کہ دارد امروز در  
 دنیای علم شوخ چشمی و  
 گستاخی نہ نظرمی آید و قابل  
 دفاع نیست۔

بالیں ہمہ تصوف اسلامی  
 در عین شباهت بارزی کہ  
 بالیں گونه مذاہب غیر  
 اسلامی دارندہ پدید آور  
 دئہ ہیچ یک از آن ہاست

وہ مجموعہ ہمہ آں ہا چیزیں  
 است مستقل کہ شا آں  
 اسلام و قرآن است و شک  
 نیست کہ بدون اسلام و قرآن  
 از جمع این عناصر غیر اسلامی  
 ممکن نہ بود۔ چنیں نتیجہ بی  
 حاصل آید و این نظری است کہ  
 امروز مورد قبول بیش تر اہل  
 تحقیق واقع شدہ است۔

ایک مستقل شے ہے جس کا مخرج  
 اسلام اور قرآن ہے۔ اور اس میں  
 کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں  
 ہے کہ بجز اسلام اور قرآن حکیم کے  
 تصوف کے عناصر غیر اسلامی ہو ہی  
 نہیں سکتے۔ (اس بحث سے) یہی  
 نتیجہ حاصل ہوتا ہے اور عہد حاضر  
 میں یہی نظریہ پیش تر اہل تحقیق  
 نے تسلیم کیا ہے۔

پروفیسر سید علی عباس صاحب نے اسلامی تصوف پر جو اعتراضات وارد کیے ہیں مذکورہ بالا معروضات ان کے  
 ازالے کے لئے کافی ہیں۔

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ تصوف کے موضوع پر ڈاکٹر قاسم غنی، ڈاکٹر خورشید الاسلام۔ پروفیسر دانش اور  
 پروفیسر سید علی عباس جلال پوری نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ کسی نہ کسی نوعیت سے اہل مغرب سے مستعار ہیں۔  
 جنہوں نے اسلامی علوم اور ان کے مسائل کو کسی عنوان صحیح تناظر اور تاریخی پس منظر میں نہیں دیکھا اس لیے مغالطوں سے  
 معمور اور صداقت سے عاری ہیں۔

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی

کایں رہ کہ تو می روی بترکستان ست

لیکن خاک مشرق نے ایسے ارباب علم بھی پیدا کیے ہیں جن کی نگاہوں کو دانش فرنگ کے جلو سے خیرہ نہ کر سکے  
 اور جنہوں نے ”حسن روئے دوست“ کو ”نور دوست“ ہی سے دیکھا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے بہت سے نام  
 گنائے جاسکتے ہیں لیکن یہاں صرف ”قرآن اور تصوف“ کے مصنف ڈاکٹر میرولی الدین کے قول کو بطور مثال پیش  
 کیا جاتا ہے:

”صوفیہ کی ان تمام تعریفوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ تصوف تزکیہ نفس اور تصفیہ اخلاق کا نام ہے۔ کیا انزال



کتب و ارسال رسل کی غایت تزکیہ نفوس اور تصفیہ اخلاق نہیں تھی؟ حضور ﷺ نے اپنی بعثت کا مقصد ہی مکارم اخلاق کی تنمیم بیان فرمائی ہے۔

”بعثت لاتمم مکارم الاخلاق“ اور قرآن عزیز میں آپ کا کام یہ بتایا گیا ہے۔ (۲۶۲)

”یزکیہم ویعلمہم الکتاب ولحکمة“ یعنی تزکیہ اخلاق، تعلم کتب و حکمت اور فلاح دارین کا مدار تزکیہ اخلاق قرار دیا گیا ہے۔ ”قد افلح من زکھا وقد خاب من دسھا۔“ اب تصوف کے انکار کی گنجائش رہتی ہے اور نہ کسی کو یہ

جرات ہو سکتی ہے کہ اس کو غیر اسلامی چیز قرار دے۔ (۲۶۳)

ڈاکٹر میرولی الدین نے تصوف کے خصوصیات کو جس تناظر اور حوالے کے ساتھ دیکھا ہے، اس کے لیے

بصیرت بھی قرآن و سنت سے حاصل کی ہے۔ اس لیے جو بات کہی گئی ہے۔ وہ سادہ ہوتے ہوئے بھی دل کو لگتی ہے۔ (۲۶۴)

## حوالہ جات باب اول

- ۱۔ سنبھلی، محمد اسماعیل: مقامات تصوف، جنرل پرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص: ۲۶
- ۲۔ البخاری، محمد بن اسماعیل: الجامع الصحيح، مصطفیٰ البابی الحسینی، ۱۹۵۴ء، ص: ۱۲-۱
- ۳۔ القادری، محمد طاہر، ڈاکٹر: حقیقت تصوف، منہاج القرآن پرنٹرز لاہور، ۱۹۹۷ء، ص: ۷۷-۷۸
- ۴۔ نعمانی، عاصم: تصوف اور تعمیر سیرت، اللہ والا پرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص: ۳۷
- ۵۔ الشاذلی، عبدالقادر عیسیٰ، شیخ: تصوف کے روشن حقائق، مترجم: محمد اکرم زاویہ ٹریڈرز ۸-سی دربار مارکیٹ لاہور، ۱۹۹۸ء، ص: ۲۶-۲۵
- ۶۔ القادری، محمد طاہر، ڈاکٹر: حقیقت تصوف، ص: ۷۸
- ۷۔ ابوالفتح، شیخ: الشیخ ارسلان الدمشقی، بیروت، ص: ۲۹
- ۸۔ المنجد، تحت مادہ صفو، مطبع: دارالاشاعت بالمقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی، ص: ۵۷۰-۵۷۱
- ۹۔ القادری، محمد طاہر، ڈاکٹر: حقیقت تصوف، ص: ۷۹
- ۱۰۔ القشیری، عبدالکریم بن ہوازن، ابوالقاسم: الرسالة القشیریہ، ادارہ تحقیقات اسلامی، جامعہ اسلامیہ اسلام آباد، ص: ۱۲۶-
- ۱۱۔ غیث اللغات، تصوف ماخوذ از صوف بمعنی یکسو شدن، دارالاشاعت بالمقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی، ص: ۱۱۳
- ۱۲۔ عجیبہ، احمد بن محمد، الحسنی: ایفاظ الہم فی شرح الحکم، مطبع: عبدالحمید حنفی مصر، ص: ۱۶
- ۱۳۔ الکلابازی، محمد بن الخلق،: شرح التعرف لمذہب التصوف، مترجم: پیر محمد حسن، مطبع المعارف، ص: ۴۳
- ۱۴۔ القشیری، عبدالکریم بن ہوازن، ابوالقاسم: الرسالة القشیریہ، مترجم: ڈاکٹر پیر محمد حسن، مطبع: ادارہ تحقیقات اسلامی، جامعہ اسلامیہ اسلام آباد، ص: ۱۲۶-
- ۱۵۔ الشاذلی، عبدالقادر عیسیٰ، شیخ: تصوف کے روشن حقائق، اردو ترجمہ: حقائق عن التصوف، ص: ۲۸-۲۷
- ۱۶۔ القادری، محمد طاہر، ڈاکٹر: حقیقت تصوف، ص: ۸۲
- ۱۷۔ خان، اللہ یار: دلائل السلوک، ناشر: ادارہ تالیفات اویسیہ مرشد آباد (ضلع بھکر)، ۱۹۹۲ء، ص: ۲۵-۲۳
- ۱۸۔ القرآن الحکیم: ۳ (آل عمران) آیت: ۱۶۴

- ۱۹۔ خان، اللہ یار: دلائل السلوک، ص: ۲۵
- ۲۰۔ القرآن الحکیم: ۲ (البقرہ) آیت: ۳۱
- ۲۱۔ خان، اللہ یار: دلائل السلوک، ص: ۲۵
- ۲۲۔ القرآن الحکیم: ۸۳ (مطففین) آیت: ۱۴
- ۲۳۔ ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری، مطبع: مجلس اشاعت علمی حیدر آباد دکن، ج: ۱۰، ص: ۲۲۲
- ۲۴۔ ابن ماجہ، محمد بن یزید، ابو عبد اللہ، القزوینی: السنن ابن ماجہ کتاب الزہد، ص: ۳۹
- ۲۵۔ ہجویری، علی، سید: کشف المحجوب، مترجم، نعیمی، غلام معین الدین، مفتی، مطبع: مدینہ پبلیشنگ کمپنی، جناح روڈ کراچی، ۱۹۷۵ء، ص: ۵۸
- ۲۶۔ ابوداؤد سلیمان بن اشعث بختانی: السنن ابوداؤد، باب اباحتہ الطعام، سعید محمد الحام دار الفکر، ۱۹۸۱ء، ص: ۱۳
- ۲۷۔ الحدیث، بحوالہ نشاة التصوف اسلامی، ص: ۱۰
- ۲۸۔ الحدیث، بحوالہ عوارف المعارف، مترجم: رشید احمد ارشد، لاہور، ص: ۲۰۲-۲۰۰
- ۲۹۔ سہروردی، شہاب الدین، عوارف المعارف، مترجم: رشید احمد ارشد، لاہور، ص: ۲۰۲-۲۰۰
- ۳۰۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، ابو عبد اللہ، امام: الجامع الصحیح، کتاب الصلوٰۃ، ص: ۵۸
- ۳۱۔ احمد بن حنبل، امام: مسند امام احمد بن حنبل، دار الباز عباس احمد الباز مکہ مکرمہ، ت: ۱، ص: ۲۸۷
- ۳۲۔ ابوداؤد، سلیمان بن اشعث بختانی: السنن ابوداؤد، ص: ۳۵
- ۳۳۔ القرآن الحکیم: ۳ (البقرہ): ۲۷۳
- ۳۴۔ جیلانی، عبدالقادر، شیخ: سر الاسرار، اللہ والے کی دکان اردو بازار لاہور، ص: ۹۹-۸۸
- ۳۵۔ القرآن الحکیم: ۲۴ (نور): ۳۱
- ۳۶۔ القرآن الحکیم: ۶۶ (التحریم): ۸
- ۳۷۔ ولی الدین، محمد بن عبد اللہ، ابو عبد اللہ، الخطیب: مشکوٰۃ المصابیح، ص: ۲۰۶
- ۳۸۔ القرآن الحکیم: ۵۰ (الکہف): ۳۳
- ۳۹۔ القرآن الحکیم: ۳۸ (ص): ۳۰
- ۴۰۔ القرآن الحکیم: ۲۴ (نور): ۳۷

- ٣١- القرآن الحكيم: ٤ (اعراف): ١٢٣
- ٣٢- القرآن الحكيم: ٨ (الانفال): ١٢٥
- ٣٣- القرآن الحكيم: ٥٣ (النجم): ٣
- ٣٤- ولي الدين، محمد بن عبد الله، ابو عبد الله، الخطيب: مشكوة المصابيح، ص: ٩٣
- ٣٥- القرآن الحكيم: ٢٨ (فتح): ٢
- ٣٦- ولي الدين، محمد بن عبد الله، ابو عبد الله، الخطيب: مشكوة المصابيح، ص: ٩٠
- ٣٧- القرآن الحكيم: ٩٣ (الضحى): ٢
- ٣٨- القرآن الحكيم: ١٨ (الكهف): ٢٨
- ٣٩- القرآن الحكيم: ١٩ (المريم): ٩٣
- ٥٠- القرآن الحكيم: ٨ (الانفال): ٣٣
- ٥١- القرآن الحكيم: ٢ (البقرة): ٢٥٤
- ٥٢- القرآن الحكيم: ٩٨ (البينة): ٨
- ٥٣- القرآن الحكيم: ٨٩ (الفجر): ٢٨
- ٥٤- القرآن الحكيم: ٣ (آل عمران): ٣١
- ٥٥- القرآن الحكيم: ٢٠ (المؤمن): ٢٣
- ٥٦- القرآن الحكيم: ٦ (الانعام): ١٦٢
- ٥٧- البخاري، محمد بن اسماعيل، ابو عبد الله، امام: الجامع الصحيح، ج: ٢، ص: ٦٦٣
- ٥٨- ايضاً
- ٥٩- احمد بن حنبل، امام: مسند امام احمد بن حنبل، ج: ٦، ص: ٢٥٦
- ٦٠- ابوداؤد، سليمان بن اشعث بختاوى: سنن ابوداؤد، كتاب الامارة، ص: ١٨
- ٦١- القرآن الحكيم: ٨ (الانفال): ١٤
- ٦٢- جيلاني، عبدالقادر، شيخ: سرا السرار، ص: ٢٥
- ٦٣- بجويرى، على، سيد: كشف المحجوب، ص: ٣١-٣٠

- ۶۴۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، ابو عبد اللہ، امام: الجامع الصحيح، کتاب الایمان، ص: ۱۲۸
- ۶۵۔ خان، اللہ یار، دلائل السلوک، ص: ۲۷-۲۸
- ۶۶۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، ابو عبد اللہ، امام: الجامع الصحيح، کتاب الایمان، ص: ۱۲۱۔
- ۶۷۔ الشاذلی، عبد القادر عیسیٰ، شیخ: تصوف کے روشن حقائق، اردو ترجمہ: حقائق عن التصوف، ص: ۲۹-۲۷
- ۶۸۔ مسلم بن حجاج، ابوالحسن، القشیری، امام: الجامع الصحيح، دار احیاء التراث، ص: ۲۱۰
- ۶۹۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، ابو عبد اللہ، امام: الجامع الصحيح، کتاب الایمان، ص: ۱۲۱
- ۷۰۔ ابوسعید، نور الدین، ڈاکٹر: اسلامی تصوف اور اقبال، مطبع: فالکن پرنٹرز لاہور، ۱۹۷۷ء، ص: ۵۰
- ۷۱۔ عبد الرشید، ڈاکٹر: اسلامی تصوف اور صوفیائے سرحد، ناشر: تصوف فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص: ۶۹
- ۷۲۔ الشاذلی، عبد القادر عیسیٰ، شیخ: تصوف کے روشن حقائق، اردو ترجمہ: حقائق عن التصوف، ص: ۳۳-۲۸
- ۷۳۔ بریلوی، شمس، مترجم: تاریخ الخلفاء، ص:
- ۷۴۔ سہروردی، شہاب الدین: عوارف المعارف، ص: ۱۰۵
- ۷۵۔ ابن ماجہ، محمد بن یزید، ابو عبد اللہ، القزوینی: السنن، مہر کتب خانہ، تن، مقدمہ، ص: ۲
- ۷۶۔ القرآن حکیم: ۴۵ (الباقیہ): ۲۳
- ۷۷۔ القرآن حکیم: ۶ (الانعام): ۹۷
- ۷۸۔ القرآن حکیم: ۹۱ (الشمس): ۸
- ۷۹۔ القادری، محمد طاہر، ڈاکٹر: حقیقت تصوف، ص: ۲۵۷-۲۵۱
- ۸۰۔ القرآن حکیم: ۸۳ (المطففین): ۸
- ۸۱۔ ولی الدین، محمد بن عبد اللہ، ابو عبد اللہ، الخطیب: مشکوٰۃ المصابیح، ص: ۲۰۴
- ۸۲۔ القرآن حکیم: ۷ (الاعراف): ۱۷۶-۱۷۵
- ۸۳۔ القرآن حکیم: ۵۰ (ق): ۳۷
- ۸۴۔ القرآن حکیم: ۲۶ (الشعراء): ۸۸
- ۸۵۔ ولی الدین، محمد بن عبد اللہ، ابو عبد اللہ، الخطیب: مشکوٰۃ المصابیح، کتاب البیوع، ص: ۲۴۱
- ۸۶۔ ایضاً ص: ۱۹۹

- ۸۷- نعمانی، منظور احمد، مولانا: معارف الحدیث، کتاب الاذکار والدعوة، ج: ۵، ص: ۸۴.
- ۸۸- القرآن الحکیم: ۴ (النساء): ۵۹.
- ۸۹- القرآن الحکیم: ۴ (النساء): ۸۰.
- ۹۰- القرآن الحکیم: ۴ (النساء): ۶۴.
- ۹۱- القادری، محمد طاہر، ڈاکٹر: حقیقت تصوف، ص: ۲۶۳-۲۶۱.
- ۹۲- القرآن الحکیم: ۲۷ (نمل): ۳۸-۴۰.
- ۹۳- بجوری، علی، سید: کشف المحجوب، ص: ۲۰-۱۹.
- ۹۴- القرآن الحکیم: ۲ (البقرہ): ۱۶۵.
- ۹۵- کیسودراز، محمد حسینی، سید: حیاتہ اشخا ارسلان الدمشقی، ص: ۲۳.
- ۹۶- الترمذی، محمد بن عیسیٰ بن سورہ، ابو عیسیٰ: سنن الجامع، دار الفکر بیروت، ج: ۲، ص: ۱۸۷.
- ۹۷- کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال، ج: ۷، حدیث نمبر ۱۸۹۱۲.
- ۹۸- القرآن الحکیم: ۶ (الانعام): ۱۶۲.
- ۹۹- القرآن الحکیم: ۳ (آل عمران): ۹۲.
- ۱۰۰- النسائی، احمد بن شعب، الحافظ جلال الدین، السنن، المکتبۃ العلمیہ بیروت لبنان، ج: ۲، ص: ۲۷۰.
- ۱۰۱- القرآن الحکیم: ۲۸ (الفتح): ۲۹.
- ۱۰۲- دہلوی، نظام الدین خواجہ: فوائد الفوائد، مترجم: محمد سرور جامعی، ص: ۱۱۵.
- ۱۰۳- المحلوئی، الحافظ: کشف الخفاء، ج: ۱، ص: ۴۱.
- ۱۰۴- نظامی، خلیق احمد: مشائخ چشت، ص: ۳۸.
- ۱۰۵- القرآن الحکیم: ۲ (البقرہ): ۱۶۵.
- ۱۰۶- القرآن الحکیم: ۲ (البقرہ): ۳۱.
- ۱۰۷- القرآن الحکیم: ۴ (نساء): ۱۱۳.
- ۱۰۸- القرآن الحکیم: ۵۱ (الزاریات): ۵۶.
- ۱۰۹- القرآن الحکیم: ۴ (النساء): ۱۰۳.

- ۱۱۰۔ القرآن الحکیم: ۳ (آل عمران) ۱۹۱
- ۱۱۱۔ القرآن الحکیم: ۳۲ (سجدہ) ۱۶
- ۱۱۲۔ القرآن الحکیم: ۴۸ (الفتح): ۲۹
- ۱۱۳۔ القرآن الحکیم: ۷۳ (المزمل): ۲۰
- ۱۱۴۔ القرآن الحکیم: ۴۰ (مومن): ۶۰
- ۱۱۵۔ القرآن الحکیم: ۶۷ (الحديد): ۴
- ۱۱۶۔ القرآن الحکیم: ۵۶ (واقعه): ۸۵
- ۱۱۷۔ القرآن الحکیم: ۵۰ (ق): ۱۶
- ۱۱۸۔ القرآن الحکیم: ۷۳ (المزمل): ۸-۱
- ۱۱۹۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، مولانا: حجۃ اللہ البالغۃ، ج: ۲، ص: ۱۶۸
- ۱۲۰۔ الحدیث بحوالہ کشف المحجوب، ص: ۲۵
- ۱۲۱۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، ابو عبد اللہ، امام: الجامع الصحیح، کتاب الرقاق، باب التواضع،
- ۱۲۲۔ ہجویری، علی، سید: کشف المحجوب، ص: ۲۸-۴۷، ص: ۷۷
- ۱۲۳۔ جیلانی، عبدالقادر، شیخ: سیر الاولیاء، مترجم: غلام احمد بریاں، ص: ۴۵۵
- ۱۲۴۔ القرآن الحکیم: ۲ (البقرہ): ۱۶۵
- ۱۲۵۔ القرآن الحکیم:
- ۱۲۶۔ الترمذی، محمد بن عیسیٰ بن سورہ، ابو عیسیٰ: سنن الجامع، دار الفکر بیروت، ج: ۲، ص:
- ۱۲۷۔ القرآن الحکیم:
- ۱۲۸۔ دہلوی، نظام الدین خواجہ: فوائد الفوائد، مترجم: محمد سرور جامعی، ص: ۱۹
- ۱۲۹۔ شاعر، جمید قلندر: خیر المجالس، ترجمہ: احمد علی بن علی، ص: ۲۵
- ۱۳۰۔ دہلوی، نظام الدین خواجہ: فوائد الفوائد، مترجم: محمد سرور جامعی، ص: ۲۰
- ۱۳۱۔ ہجویری، علی، سید: کشف المحجوب، ص: ۱۰
- ۱۳۲۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، مولانا: حجۃ اللہ البالغۃ، ج: ۲، ص: ۱۶۸

- ۱۳۳۔ شاعر، حمید قلندر: خیر امجالس، ترجمہ: احمد علی بن علی، ص: ۲۷
- ۱۳۴۔ القرآن الحکیم: آیت ۳۶
- ۱۳۵۔ القرآن الحکیم:
- ۱۳۶۔ ہجویری، علی، سید: کشف المحجوب، ص: ۱۶-۱۵
- ۱۳۷۔ لطیف اللہ، پروفیسر: تصوف اور سیریت، مکتبہ جدید پریس لاہور، ۱۹۹۶ء، ص: ۱۵۷
- ۱۳۸۔ البستانی، بطرس، دائرة المعارف الاسلامیہ، مکتبہ الہلال، ۱۹۹۰ء، ج سوم، ص: ۵۸۸
- ۱۳۹۔ بخاری و مسلم، بحوالہ: الحیات الروحیہ فی الاسلام، منصفہ ڈاکٹر مصطفیٰ حلیمی، ص: ۳۶
- ۱۴۰۔ الحدیث، رواہ ابو ہریرہؓ، ص: ۳۶
- ۱۴۱۔ ابن ماجہ، محمد بن یزید، ابو عبد اللہ، القزوینی: السنن ابن ماجہ کتاب الزہد، ص: ۳۷
- ۱۴۲۔ نعمانی، منظور احمد، مولانا: معارف الحدیث، کتاب الاذکار والدعوة، ج: ۵، ص: ۳۷
- ۱۴۳۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، ابو عبد اللہ، امام: المجامع الصحیح، کتاب الرقاق، باب التواضع، ص: ۴۲
- ۱۴۴۔ حلیمی، مصطفیٰ، ڈاکٹر: الحیات الروحیہ فی الاسلام، مترجم: رئیس احمد جعفری، ۱۹۶۴ء، ص: ۴۷-۴۶
- ۱۴۵۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، مولانا: ہمات، مترجم: محمد سرور جامی، ۱۹۶۴ء، ص: ۵۱
- ۱۴۶۔ حلیمی، مصطفیٰ، ڈاکٹر: الحیات الروحیہ فی الاسلام، ص: ۱۴۰
- ۱۴۷۔ غنی، قاسم، ڈاکٹر: تاریخ تصوف در اسلام، ص: ۱۸
- ۱۴۸۔ حلیمی، مصطفیٰ، ڈاکٹر: الحیات الروحیہ فی الاسلام، ص: ۴۵
- ۱۴۹۔ نظامی، خلیق احمد: مشائخ چشت، ص: ۷۴-۷۳
- ۱۵۰۔ دہلوی، نظام الدین خواجہ: فوائد الفوائد، مترجم: محمد سرور جامی، ج: ۲، مجلس ہی وسوم، ص: ۴۴
- ۱۵۱۔ گیلانی، مناظر احسن، مولانا: مقالات احسانی، ۱۹۵۹ء، ص: ۲۷۲
- ۱۵۲۔ دارالمعارف اسلامیہ، ج: ۳، ۵۹۲
- ۱۵۳۔ شیرازی، مصلح الدین، شیخ، گلستان، طہران، ۱۳۳۳ش، ص: ۱۹-۱۸
- ۱۵۴۔ الترمذی، محمد بن عیسیٰ بن سورہ، ابو عیسیٰ: سنن الجامع، دار الفکر بیروت، ج: ۲، ص: ۶۴
- ۱۵۵۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، ابو عبد اللہ، امام: المجامع الصحیح، کتاب الرقاق، ص: ۳۰



- ۱۵۶۔ عطار، فرید الدین: تذکرہ اولیاء، مترجم: مولانا زبیر افضل افغانی کراچی، ۱۹۷۵ء، ص: ۱۱۸-۱۱۱-۵۷-۳۵-۳۲،
- ۱۵۷۔ محدث، عبدالحق دہلوی، شیخ: اخبار الابرار، مترجم: سبحان محمود مولانا محمد فاضل کراچی، سال ندارد، ص: ۶۰
- ۱۵۸۔ گیلانی، مناظر حسن، مولانا: ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ج: ۲، سال ندارد، ص: ۱۱۳
- ۱۵۹۔ نظامی، خلیق احمد، تاریخ مشائخ چشت، ص: ۷۳-۷۴
- ۱۶۰۔ غنی، قاسم، ڈاکٹر: تاریخ تصوف در اسلام، ص: ۵۳-۲۶
- ۱۶۱۔ علمی، مصطفیٰ، ڈاکٹر: الحیات الروحیہ فی الاسلام، ص: ۱۵۳
- ۱۶۲۔ صفائی الدین رضی الدین احسن، امام: مشارق الانوار، مترجم: مولانا خرم علی کراچی، ص: ۲۰۲
- ۱۶۳۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، مولانا: ہمت، مترجم: محمد سرور جامی، ۱۹۶۴ء، ص: ۵۳-۵۴
- ۱۶۴۔ علمی، مصطفیٰ، ڈاکٹر: الحیات الروحیہ فی الاسلام، ص: ۱۶۶
- ۱۶۵۔ نظامی، خلیق احمد، تاریخ مشائخ چشت، ص: ۸۲
- ۱۶۶۔ ایضاً ص: ۸۶-۸۴
- ۱۶۷۔ Trimingham Spencer "Sufi Orders in Islam"

London 1971,

Translated by Professor Latifullah

- ۱۶۸۔ گیلانی، مناظر احسن، مولانا: مقالات احسانی، ص: ۲۵۳
- ۱۶۹۔ ایضاً ص: ۲۲۰-۲۰۴
- ۱۷۰۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، مولانا: ہمت، مترجم: محمد سرور جامی، ۱۹۶۴ء، ص: ۵۳-۵۴
- ۱۷۱۔ نظامی، خلیق احمد، تاریخ مشائخ چشت، ص: ۵۳۸-۹۱
- ۱۷۲۔ القرآن الحکیم: ۸۱ (الکویر): ۲۷
- ۱۷۳۔ القرآن الحکیم: ۴۹ (الحجرات): ۱۳
- ۱۷۴۔ القرآن الحکیم: ۴۹ (الحجرات): ۱۳
- ۱۷۵۔ القرآن الحکیم: ۵۷ (الزاریات): ۵۶
- ۱۷۶۔ غنی، قاسم، ڈاکٹر: تاریخ تصوف در اسلام، طهران، ص: ۵۳۸-۵۳۷

- ۱۷۷۔ القرآن الحکیم: ۲ (البقرہ): ۳۸۔
- ۱۷۸۔ القرآن الحکیم: ۲ (البقرہ): ۳۰۔
- ۱۷۹۔ القرآن الحکیم: ۱۷ (بنی اسرائیل): ۷۰۔
- ۱۸۰۔ نظامی، خلیق احمد، تاریخ مشائخ چشت، ص: ۳۳۰-۱۰۲۔
- ۱۸۱۔ مناظر، حسن، گیلانی، مولانا: ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ج دوم، دہلی سال ندارد، ص: ۱۴۷۔
- ۱۸۲۔ چشتی، یوسف سلیم، پروفیسر: تاریخ تصوف، دارالکتب اردو بازار لاہور، ص: ۹۶-۹۲۔
- ۱۸۳۔ کپتان۔ واحد بخش، سیال: مقابیس المجالس، تعریف پرنٹرز لاہور، ص: ۲۳۳-۲۳۲۔
- ۱۸۴۔ کیومونٹ، اسرار مقرر۔ مطبوعہ نیویارک، ۱۹۵۶ء، ص: ۹۵-۱۹۰۔
- ۱۸۵۔ چشتی، یوسف سلیم، پروفیسر: تاریخ تصوف، ص: ۸۶-۷۱۔
- ۱۸۶۔ ایضاً ص: ۹۶-۹۲۔
- ۱۸۷۔ خان، وحید الدین، مولانا: اسلام اور عصر حاضر، ناشر: فضلی سنز لمیٹڈ اردو بازار کراچی، ص: ۸۹-۸۸۔
- ۱۸۸۔ کپتان۔ واحد بخش، سیال: مقابیس المجالس، ص: ۲۳۸۔
- ۱۸۹۔ برق، غلام جیلانی، ڈاکٹر: من کی دنیا، مطبع: غلام علی پرنٹرز اشرفیہ پارک فیروز پور روڈ لاہور، ص: ۸۲-۸۰۔
- ۱۹۰۔ چشتی، یوسف سلیم، پروفیسر: تاریخ تصوف، ص: ۲۸-۱۷۔
- ۱۹۱۔ ایلینٹ: کائنات اور فرد، ج: اول، باب: چہارم، ص: ۱۵۶۔
- ۱۹۲۔ ایضاً ہندومت اور بدھ مت، ج: دوم، ص: ۲۰۸۔
- ۱۹۳۔ چشتی، یوسف سلیم، پروفیسر: تاریخ تصوف، ص: ۶۱-۵۵۔
- ۱۹۴۔ ایضاً ص: ۶۲-۶۰۔
- ۱۹۵۔ تقابل ادیان ص: ۱۳۰-۹۱۔
- ۱۹۶۔ خان، وحید الدین، مولانا: اسلام اور عصر حاضر، ص: ۸۸-۸۷۔
- ۱۹۷۔ R.W. Trine, In Tune With Infinite, London, P. 116۔
- ۱۹۸۔ القرآن الحکیم: ۵۷ (الحمدید): ۲۸۔
- ۱۹۹۔ خان، وحید الدین، مولانا: اسلام اور عصر حاضر، ص: ۲۸-۲۷۔

- ۲۰۰۔ کپتان۔ واحد بخش، سیال: مقائیس المجالس، ص: ۲۳۸
- ۲۰۱۔ Aurthor Fundley: On the Edge of the Etheric, London, P. 15
- ۲۰۲۔ تقابل ادیان ص:
- ۲۰۳۔ القرآن الحکیم: ۲ (البقرہ): ۱۱۵
- ۲۰۴۔ القرآن الحکیم: ۵۰ (ق): ۱۶
- ۲۰۵۔ تقابل ادیان ص:
- ۲۰۶۔ خان، وحید الدین، مولانا: اسلام اور عصر حاضر، ص: ۹۸-۹۳
- ۲۰۷۔ R.W. Trine, In Tune With Infinite, London, P. 116
- ۲۰۸۔ برق، غلام جیلانی، ڈاکٹر: من کی دنیا، ص: ۸۷-۷۶
- ۲۰۹۔ غنی، قاسم، ڈاکٹر: تاریخ تصوف در اسلام، ص: ۲۰۱-۱۹۴
- ۲۱۰۔ نفیسی، سعید، سرچشمہ و تصوف در ایران، مترجم پروفیسر لطیف اللہ، ۴۶، چاپ اول ۱۳۳۳ ش، ص: ۴۶
- ۲۱۱۔ دہلوی، نظام الدین خواجہ: فوائد الفوائد، ص: ۱۳-۱۲
- ۲۱۲۔ نکلسن: مشمولہ میراث اسلام، مقالہ تصوف، مترجم پروفیسر لطیف اللہ، ص: ۲۹۸
- ۲۱۳۔ نفیسی، سعید، سرچشمہ و تصوف در ایران، مترجم پروفیسر لطیف اللہ، ص: ۴۹-۱۶
- ۲۱۴۔ القرآن الحکیم: ۲ (البقرہ): ۱۶۵
- ۲۱۵۔ القرآن الحکیم: ۵ (المائدہ): ۵۴
- ۲۱۶۔ الترمذی، محمد بن عیسیٰ بن سورہ، ابو عیسیٰ: سنن الجامع، ج: ۲، ص: ۱۸۷
- ۲۱۷۔ نسائی، احمد بن شعیب، الحافظ جلال الدین السنن، ج: ۲، ص: ۲۷۰
- ۲۱۸۔ علی خرم، مترجم: مشارق الانوار، طهران، ۱۳۳۳ ش، ص: ۳
- ۲۱۹۔ خورشیدالاسلام، ڈاکٹر: مقالہ غالب، طبع اول ۱۹۶۰ء اللہ آباد۔ ۵۱-۲۰

۱۸۳-۶۸۳ ص:	کشف المحجوب	۲۲۰	ہجویری، علی، سید
۲۳ - ۲۴ ص:	مقالات احسانی	۲۲۱	گیلانی، مناظر احسن
۲۰۴ - ۲۱۴			
۲۱۹ - ۲۲۰	اشاعت اول کراچی ۱۹۸۹ء		
۹۱ ص:	تاریخ مشائخ چشت	۲۲۲	نظامی، خلیق احمد
۵۳۲-۵۳۸ ص:	تاریخ تصوف در اسلام	۲۲۳	غنی، قاسم، ڈاکٹر
	مطبوعہ طہران		
۱۸۸ ص:	مقالات احسانی	۲۲۴	گیلانی، مناظر احسن
۴۷۲-۴۹۰ ص:	تاریخ تصوف در اسلام	۲۲۵	غنی، قاسم، ڈاکٹر
۷۳-۵۸ ص:	اسلامی تصوف اور صوفیائے سرحد	۲۲۶	عبدالرشید، ڈاکٹر
۶۳-۶۶ ص:	تاریخ مشائخ چشت	۲۲۷	نظامی، خلیق احمد
۲۷-۸۱ سورة:		۲۲۸	القرآن الحکیم
۱۳-۴۹ سورة:		۲۲۹	القرآن المجید
۱۳-۴۹ سورة:		۲۳۰	القرآن المجید
۸۶-۸۲ سورة:		۲۳۱	القرآن المجید
۳۸-۲ سورة:		۲۳۲	القرآن الکریم
۳۰-۲ سورة:		۲۳۳	القرآن المجید
۷۰-۱۷ سورة:		۲۳۴	القرآن المجید

- ۲۳۶ محمد قطب اسلام کا نظام تربیت ص: ۱۵-۱۹
- ۲۳۶ نظامی، خلیق احمد تاریخ مشائخ چشت ص: ۱۲۶-۱۳۲
- ۲۳۷ غلام فرید، خواجہ مقابیس الجالس ص: ۳۳۸-۳۳۱
- ۲۳۸ چشتی، یوسف سلیم، پروفیسر تاریخ تصوف ص: ۹۲-۷۲
- ۲۳۹ ٹرن بل، مس روح فلوطین، مطبوعہ نیویارک امریکہ ص: ۱۴-۲
- ۲۴۰ خان، وحید الدین، مولانا اسلام اور عصر حاضر ص: ۸۸-۸۹
- ۲۴۱ برق، غلام جیلانی، ڈاکٹر ناشر فضلی سنز لمیٹڈ اردو بازار کراچی ”من کی دنیا“ ص: ۸۲-۷۸
- ۲۴۲ رادھا کرشنن، ڈاکٹر مطبع غلام علی پرنٹرز اشرفیہ پارک فیروز پور روڈ لاہور
- Brahma Sutra with Shanker's Gum ص: ۲۵۱-۲۵۶
- ۲۴۳ چشتی، یوسف سلیم، پروفیسر ناشر دہلی کتب خانہ دہلی تاریخ تصوف ص: ۶۲-۵۵
- ۲۴۴ بخاری، اسرار الرحمن، ڈاکٹر مطبع دارالکتب اردو بازار لاہور
- ۲۴۵ خان، وحید الدین، مولانا اسلام اور مذاہب عالم ص: ۸۲-۷۰
- اشرفیہ کتب خانہ بوہڑ گیٹ ملتان
- اسلام اور عصر حاضر ص: ۸۵-۵۷

- ۲۴۶ ندوی، علی، ابوالحسن، مولانا  
انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و  
ص: ۲۵۵-۲۵۱  
زوال کا اثر  
ص: ۸۹-۹۸  
ناشر، مکتبہ تعمیر انسانیت  
10-اردو بازار لاہور۔
- ۲۴۷ برق، غلام جیلانی، ڈاکٹر  
ص: ۸۶-۸۳  
من کی دنیا  
اسلام اور عصر حاضر  
ص: ۹۳-۸۹  
اسلام اور مذاہب عالم  
ص: ۸۶-۹۰  
ناشر اشرفیہ کتب خانہ بوہڑ گیٹ ملتان
- ۲۴۸ خان، وحید الدین، مولانا  
ص: ۸۳-۸۲  
من کی دنیا  
اسلام اور مذاہب عالم  
ص: ۱۰۰-۹۷  
سورۃ: ۵۰-۱۱۵  
سورۃ: ۵۰-۱۶  
ص: ۱۲۶-۱۱۲  
اسلام اور مذاہب عالم  
ص: ۹۸-۹۳  
من کی دنیا  
ص: ۸۷-۸۶
- ۲۴۹ بخاری، اسرار الرحمن، ڈاکٹر  
ص: ۲۵۰  
برق، غلام جیلانی، ڈاکٹر  
ص: ۲۵۱  
بخاری، اسرار الرحمن، ڈاکٹر  
ص: ۲۵۲  
القرآن المجید  
ص: ۲۵۳  
القرآن المجید  
ص: ۲۵۴  
بخاری، اسرار الرحمن، ڈاکٹر  
ص: ۲۵۵  
خان، وحید الدین، مولانا  
ص: ۲۵۶  
برق، غلام جیلانی، ڈاکٹر

٢٥٧	لطيف الله، پروفيسر	تصوف وسرّيت	ص: ٤٢-٤٣
٢٥٨	القرآن المجيد		ص: ٩٤-١١٨
٢٥٩	القرآن المجيد		سورة: ٢-٣٥
٢٦٠	الحديث: الترمذى، محمد بن عيسى بن سوره، ابو عيسى	سنن الجامع ج ٢،	سورة: ٥-٥٩ ص: ٣٥١
٢٦١	الحديث: البخارى، محمد بن اسميل، ابو عبد الله، امام،	الجامع الصحيح ج ٢، مطبع، مصطفى البابى، الحلبي	ص: ٣٣٥
٢٦٢	الحديث: زولى الدين، محمد بن عبد الله، ابو عبد الله، الخطيب	مشکوّة المصابيح	ص: ٢١١
٢٦٣	القرآن المجيد		سورة: ٢-١٥١
٢٦٤	القرآن المجيد		سورة: ٩١-١٠٩
٢٦٥	لطيف الله، پروفيسر	تصوف وسرّيت	ص: ١١٩-١٢٤

# باب دوم

جدید عصری مسائل کا ایک جائزہ۔



## فصل اول:

### دینی و روحانی مسائل:-

#### 1- ”سیکولرزم و مادیت پرستانہ رجحانات“

سیکولر خیالات بہت قدیم ہیں۔ لیکن سیکولرزم کی اصطلاح جارج جیکب ہولی اوک GEORGE.I.HOLYOAKE نامی ایک آزاد خیال انگریز نے ۱۸۴۰ء میں وضع کی۔ وہ شہر برمنگھم کے ملکیس انسٹی ٹیوٹ میں استاد تھا۔ 1851ء میں اس نے لندن میں سنٹرل سیکولر سوسائٹی کے نام سے ایک انجمن قائم کی۔

ہولی اوک کا مؤقف یہ تھا:

- 1- انسان کی سچی رہنمائی سائنس ہے۔
- 2- اخلاق مذہب سے جُدا اور پرانی حقیقت ہے۔
- 3- علم و ادراک کی واحد کسوٹی اور سند عقل ہے۔
- 4- ہر شخص کو فکر اور تقریر کی آزادی ہونی چاہیے۔
- 5- ہم کو اس دنیا کو بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

سیکولر اور سیکولرزم خالص مغربی اصطلاحیں ہیں۔ (۱) لاطینی زبان میں سیکولم (SECULUM) کے لغوی معنی ”دنیا“ کے ہیں۔ قرون وسطیٰ میں رومن کیتھولک پادری دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک وہ پادری جو کلیسائی ضابطوں کے تحت خانقاہوں میں رہتے تھے۔ دوسرے وہ پادری جو عام شہریوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ کلیسا کی اصطلاح میں آخر الذکر کو ”سیکولر“ پادری کہا جاتا تھا۔ وہ تمام ادارے بھی سیکولر کہلاتے تھے جو کلیسا کے ماتحت نہ تھے۔

آج کل سیکولرزم سے مراد ریاستی سیاست یا نظم و نسق کی مذہب یا کلیسا سے علیحدگی ہے اور سیکولر تعلیم وہ نظام ہے جس میں دینیات کو تعلیم سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ (۲)

- 1- انسائیکلو پیڈیا امریکانا میں سیکولرزم کی تشریح اور زیادہ وضاحت سے کی گئی ہے۔ اس کے مطابق سیکولرزم ایک اخلاقی نظام ہے جو قدرتی اخلاق کے اصول پر مبنی ہے۔ اور الہامی مذہب یا مابعد الطبیعیات سے جدا ہے۔ اس کا پہلا کلیہ

فکر کی آزادی ہے۔ یعنی ہر شخص کو اپنے لئے کچھ سوچنے کا حق۔

2۔ تمام فکری امور کے بارے میں اختلاف رائے کا حق۔

3۔ تمام بنیادی مسائل مثلاً خدا یا روح کی لانا نیت وغیرہ پر بحث مباحثے کا حق۔

سیکولرزم یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ موجودہ زندگی کی خوبیوں کے علاوہ کوئی اور خوبی نہیں ہے۔ اس کا مقصد وہ مادی حالات پیدا کرنا ہے جن میں انسان کی محرومیاں اور افلاس ناممکن ہو جائیں۔ (۳)

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی اردو انگلش ڈکشنری کے مطابق سیکولرزم اس معاشرتی اور تعلیمی نظام کو کہتے ہیں جس کی اساس مذہب کی بجائے سائنس پر ہو اور جس میں ریاستی امور کی حد تک مذہب کی مداخلت کی گنجائش نہ ہو۔ (۴)

سیکولرزم کی بنیاد اس کلیے پر قائم ہے کہ ضمیر و فکر اور اظہار رائے کی آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے لہذا ہر فرد بشر کو اس کی پوری پوری اجازت ہونی چاہیے کہ سچائی کا راستہ خود تلاش کرنے اور زندگی کے تمام مسائل پر خواہ ان کا تعلق سیاسیات اور اقتصادیات سے ہو یا مذہب و اخلاق سے، فلسفہ و حکمت سے ہو یا ادب و فن سے، اپنے خیالات کی بلا خوف و خطر ترویج کرے۔

طاقت کے زور سے کسی کا منہ بند کرنا یا دھمکی اور دھونس سے کسی کو زبردستی اپنا ہم خیال بنانا حقوق انسانی کے منافی ہے۔ اور اس بات کا اقرار بھی کہ بحث و مباحثے میں ہم اپنے حریف کی دلیلوں کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔

فکر و عمل کی قوانین قدرت سے ہم آہنگی کا نام سیکولرزم ہے۔ مسٹر الطاف گوہر فرماتے ہیں کہ سیکولرزم خدا، الہام اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتی۔ سیکولرزم کا بنیاد مفروضہ یہ ہے کہ دنیا میں مادی خوشحالی انسانی مسرت کا اہم ذریعہ ہے۔ (۵)

کارل مارکس نے کہا ہے کہ مذاہب ایک افیون ہے۔

## (۱) سیکولرزم و مادیت پرستانہ رجحانات

کیمونسٹ معاشرہ نے تو مذہب کو اپنے دائرہ عمل سے خارج کر دیا ہے اور اس نے اپنی اساس لالہ اور مادیت کے اصول پر رکھی ہے۔ اس لئے کہ کیمونسٹ معاشرہ درحقیقت، معاشرہ کی نفسیات کی عکاسی نہیں کرتا۔ اور نہ ہی اس کے صحیح احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ مذہب سے انحراف کا یہ نظریہ محض چند افراد کے ذہن کی پیداوار ہے، جسے غربت

وافلاس اور محتاجی و بے کسی جیسے مخصوص اجتماعی و سماجی حالات میں پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ اس نظریہ کو فروغ اس لئے بھی ہوا کہ اس وقت کوئی ایسا مثالی دینی و عملی نمونہ موجود نہ تھا جو عقل کو منور اور قلب کو مطمئن کر سکتا، بلکہ خود دین سے منسوب حضرات، پس ماندگی اور کمینگی کا نمونہ بنے ہوئے تھے۔ وہ حقارت و حماقت میں ضرب المثل بن چکے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک دن بھی محروموں اور محتاجوں کی اصلاح کے لئے نہیں گزارا بلکہ وہ تو ہمیشہ ملوکیت کے حامی اور جبر و استبداد کا سہارا بنے رہے۔

لہذا یہ بے دینی اور لامذہبی کا نظریہ، علم کی پیداوار ہے نہ انسانی فطرت کا نمائندہ یہ تو ایک شاذ نظریہ ہے۔ جسے سنگین حالات نے جنم دیا۔ اس کے پھیلنے میں ان کینوں اور دشمنیوں کا بڑا دخل ہے، جو ایک طویل عرصہ سے سینوں میں چل رہی تھیں۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ کمیونزم کے اختیار کرنے میں عوام کی رائے یا اختیار کو کوئی دخل نہیں ہے، اس کے قبول کرنے میں ان کی مرضی شامل نہیں ہے۔ یہ تو قوم پرز بردستی ٹھونسا گیا ہے۔ اور بجران پر مسلط کیا گیا ہے۔ کمیونزم اپنے روز اول سے لے کر آج تک جبر و تشدد کا مظہر ہے نہ کہ حریت و آزادی کا۔

میرا ایمان ہے کہ فطرت انسانی ان تمام قوتوں سے کہیں زیادہ طاقتور ہے جو اسے مٹانے پر تلی بیٹھی ہیں اور اس کے نشانات کو تبدیل و محو کر دینا چاہتی ہیں۔ خواہ کتنا ہی عرصہ کیوں نہ گزر جائے فتح بالا خرا انسانی فطرت کو ہی حاصل ہوگی اور کامیابی اسی کے حصہ میں آئے گی۔ اشتراکیت بھی اس کا دوسرا نام ہے اس کے بارے میں بتانا ضروری ہے کہ یہ کیا چیز ہے۔ (۶)

اشتراکیت ایک خالص مادہ پرستانہ نظریہ ہے۔ جس کا ذکر قدیم فلسفہ میں موجود ہے۔ اور جدید دور میں فیورباخ (FEUERBACH) نے اس کی مزید وضاحت کی ہے۔

”یہ فلسفہ مادیت، مذہبیات، دینیات بلکہ ہر طرح کے مابعد الطبیعیات کے خلاف مستقل جہاد ہے۔“ (۷)

اشتراکیت کے نزدیک حقیقت بس وہی کچھ ہے جس کو ہم اپنے حواس خمسہ کے ذریعے معلوم کر سکیں۔ چنانچہ انجلز (ENGELS) نے لکھا تھا مادہ ہی زندگی کی واحد حقیقت ہے۔ اسی طرح ان مادہ پرستوں کا خیال ہے کہ انسانی ذہن مادے ہی کا ایک مظہر ہے اور اپنے گرد و پیش کے بیرونی مادی ماحول کا عکس ہے۔ ان کے خیال میں انسانی روح کی بھی کوئی حقیقت اس کے سوا نہیں ہے کہ یہ خالص مادی حالات کی پیداوار ہے۔

۵۔ اشتراکیت جدلی مادیت میں یقین رکھتی ہے۔ اس کے نزدیک تضاد کی کشمکش۔ سرمایہ داروں اور مزدوروں کی طبقاتی کشمکش ہی وہ پُر اسرار عامل ہے جو انسان کی تمام مادی اور اقتصادی ترقی کا اصل باعث ہے۔ اب تک جو ترقی ہوئی

ہے۔ وہ اسی طبقاتی کشمکش کا ثمرہ ہے۔

- ۵۔ اشتراکیت کے نزدیک انسانی ترقی میں مشیت ایزدی کا کوئی دخل نہیں۔ دخل جو کچھ ہے وہ بس اقتصادی یا معاشی حالات اور ان کے دباؤ یا اس کے تحت ابھرنے والی انسانی ضرورتوں کو ہے۔
- ۵۔ اشتراکیت کا نظریہ انسان خالصتاً منفی نوعیت کا ہے۔ جس کے مطابق انسان مادی اور اقتصادی حالات و واقعات کے سامنے ایک بے بس کھلونے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ (۸)

کارل مارکس لکھتا ہے۔ انسان کی سماجی، سیاسی اور ذہنی زندگی ویسی ہی بنتی ہے جیسی کہ مادی حالات اور واقعات اس کو بناتے ہیں۔ انسانی شعور اپنے معاشرتی حالات و واقعات کو پیدا نہیں کرتا بلکہ معاشرتی حالات انسانی شعور کو وجود میں لاتے ہیں۔

- ۵۔ اشتراکیت کی نظام معیشت کا لازمی نتیجہ اشتراک کی فلسفہ حیات ہے۔ جس کے نزدیک انسانی زندگی میں اجتماع یا معاشرے ہی کو اصل فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے۔ اور افراد کی حیثیت اسکے لئے بے بس خاموشی سے زیادہ نہیں۔
- ۵۔ اشتراک کی فلسفہ میں جہاں تک معاشرتی تعلقات اور روابط کی تنظیم اور ترتیب کا تعلق ہے۔ اصل اور اساسی اہمیت صرف اقتصادی عامل کو حاصل ہے۔

۵۔ اشتراکیت اپنے نظریہ اور عمل دونوں میں اسلام کی عین ضد واقع ہوئی ہے۔ (۹)

- ۵۔ برٹرانڈ رسل کا قول ہے کہ اشتراکیت نے مذہب کی نفی کر کے ایک لادین مذہب بنا لیا ہے۔ اس لئے اس کا مذہب ”تاریخ مادیت“ ہے۔ اس کی سیاست ”طبقاتی جنگ“ ہے۔ اس کی معاشیات قدر زائد کا نظریہ ہے۔ (۱۰)

## اشتراکیت کا نفوذ

دوسری جنگ عظیم کے بعد تیسری دنیا کے بیشتر ممالک میں اشتراک کی نظریہ کو پزیرائی حاصل ہوئی اور متعدد ممالک اس انقلاب کی لپیٹ میں آ گئے۔ جمال عبدالناصر کے دور میں مصر نے مشرق وسطیٰ کے اندر اشتراکیت پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ تاہم مسلم ممالک میں سوشلزم کو اسلام سے ہم آہنگ ثابت کر کے پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیبیا میں معمر قذافی نے بھی اسی طرح کا طرز عمل اختیار کیا اور متعدد سوشلسٹ اقدامات کو اسلامی لبادہ میں رائج کیا۔ چنانچہ ۱۹۷۱ء میں لائکیشن قائم کیا گیا تا کہ مروجہ قوانین کو اسلام سے ہم آہنگ کیا جاسکے۔ (۱۱) اس کے بعد متعدد اسلامی تعزیری قوانین اور حدود کا نفاذ عمل میں آیا۔ اسی طرح بنک کے سود کو بھی ممنوع قرار دیا گیا۔ اگرچہ اس پر عمل پوری طرح نہ ہو سکا۔ لیکن قذافی کے متعدد اقدامات کے پس پشت روایتی اسلامی فکر کی بجائے دونوں فکریات کا ایک امتزاج تھا۔ دراصل حالیہ

دونوں کالائے عمل مقصد حیات اور طریق کار بنیادی طور پر مختلف ہے۔

علاوہ ازیں قذافی کے اقدامات پر اشتراکی فکر کارنگ بتدریج نمایاں ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اسلامی تعلیمات کا دائرہ عمل محض عبادات تک مقید ہو کر رہ گیا۔ درحقیقت سوشلزم کا نظریہ جن مسلم ممالک میں سرکاری طور پر رائج ہوا وہاں اسے حکومت کی آمریت کی حمایت کے لئے استعمال کیا گیا۔ سوشلزم ہی ایسا ڈھانچہ اور بنیاد فراہم کرتا ہے جس سے برسر اقتدار طبقہ کے ہاتھ مضبوط ہوں۔ عراق، شام، لیبیا، الجزائر، مصر اور دیگر بیشتر ممالک کا تجربہ اس کا بین ثبوت ہے۔

مسلم ممالک میں اشتراکیت کی تعلیمات کو مصلحتاً اور حالات کے دباؤ کے باعث اسلام سے ہم آہنگ صورت دینے کی کوشش کی گئی تھی اور اسلامی سوشلزم کے نام پر اسے آگے بڑھایا گیا۔ سرکاری سرپرستی میں سوشلزم کو مصر کے اس دور میں تقویت ملی جب شام سے مصر کی کنفیڈریشن کا خاتمہ ہوا اور ناصر نے عرب سوشلسٹ یونین قائم کی ناصر نے سوشلزم کا جو تصور پیش کیا اس میں طبقاتی کشمکش یا محنت کاروں کی آمریت جیسے خالص اشتراکی پہلوؤں کی مخالفت کی گئی۔ نیز مذہب کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا گیا۔ مصری قیادت نے اسلام اور سوشلزم کو ہم معنی گردانا جیسا کہ مصطفیٰ کامل نے اس سے قبل کیا تھا۔ (۱۲)

درحقیقت ناصر نے اسلام کا نام محض جھکنڈے کے طور پر استعمال کیا تھا ورنہ اس کی تمام پالیسیاں مذہب بیزار اور مذہبی طبقہ کے خلاف تھیں۔ (۱۳) ناصر نے سوشلزم کو فکری طور پر عرب نیشلزم کے حوالہ سے پیش کیا اس نظریہ کے مطابق سرمایہ دارانہ نظام نے مارکسزم کی راہ ہموار کی جبکہ اس کی منطقی شکل عرب سوشلزم ہے۔ (۱۴) اس دور میں اشتراکیت کے حامیوں کو کھل کھیلنے کا موقع ملا اور انہوں نے کھلے بندوں اسلام کی تضحیک کی اور اس کے خلاف زہرا گلتے رہے۔ اسی دور میں بعض دانشوروں نے معذرت خواہانہ انداز اپناتے ہوئے اسلامی تعلیمات کی حقانیت کو اشتراکیت کے حوالہ سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ جبکہ بعض دانشوروں نے سرمایہ دارانہ معیشت کی مروجہ خرابیوں کے تجربہ اور اس تنقید کے لئے اشتراکی تعلیمات کو استعمال کیا۔ بعض عرب دانشوروں نے یہ بات ثابت کرنے کے لیے اپنی فکری کاوشوں کو پوری طرح استعمال کیا کہ اسلام اور سوشلزم میں یکسانیت ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے اسلام کے عدل اجتماعی کے طریقوں اور اداروں مثلاً زکوٰۃ، سود کی حرمت اور ایک حد تک اجتماعیت کی پالیسی کا سہارا لیا۔ لیکن اس کی واضح مثال لبنان کے شیکب ارسلان (۶۹-۱۹۴۶) اور عبدالرحمان البرزرا کا نکتہ ہائے نظر ہے۔

درحقیقت تمام اشتراکی تحریک کے پس پشت غیر طبقاتی معاشرہ کے قیام کا مقصد کارفرما رہا ہے اور اسی مقصد سے متاثر ہو کر بعض مسلم ممالک میں اس نظریہ کو پذیرائی حاصل ہوئی۔ ایک غیر طبقاتی معاشرہ کے قیام کا تصور ایک تخیل

سے بڑھ کر نہیں بالفرض اگر اس بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ایسے معاشرہ کا قیام ممکن ہے تو اس بات کی کیا ضمانت دی جاسکتی ہے کہ اس مثالی معاشرہ میں پھر سے نئے طبقات معرض وجود میں نہ آجائیں گے۔ انسانی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ طبقاتی تقسیم کبھی بھی مستقل بنیادوں پر قائم نہیں رہی۔ بلکہ اس میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہی ہیں۔ مثلاً جدید سرمایہ دارانہ نظام کے عروج سے پہلے ذات پات کے امتیازات نمایاں تھے۔ لیکن بعد میں وہ نرم پڑ گئے اور انکی جگہ نئی طبقاتی تقسیم نے لے لی جو مارکس کے بقول بورژوائی اور پروتاریہ طبقات کی صورت میں اجاگر ہوئی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ طبقاتی تقسیم کا یہ چکر اس غیر طبقاتی معاشرہ میں کس طرح رک جائیگا۔

سرمایہ دارانہ نظام کے ارتقاء کا مارکسی تصور بھی حقیقت پسندانہ نہیں۔ مارکس کا خیال تھا کہ اس نظام کا تنزل یقینی ہے۔ حالانکہ بعد میں حقائق نے ثابت کیا کہ اس نظام نے اپنی خرابیوں کی کافی حد تک اصلاح کر لی ہے جدید مغربی فلاحی ریاستوں میں محنت کاروں کو کافی مراعات اور سہولتیں حاصل ہیں۔ بلکہ آزاد معیشت والے ممالک میں محنت کاروں کے حالات اشتراکی ممالک کے محنت کاروں کے مقابلہ میں بدرجہا بہتر ہیں۔ ان کا معیار زندگی بھی نسبتاً بلند ہے اور اہم بات یہ کہ ضروریات زندگی کی بہم رسانی کے ساتھ ساتھ انہیں آزادی بھی میسر ہے ظاہر ہے ”ناگزیر انقلاب“ کے اشتراکی تخیل کا اطلاق ایسے معاشروں پر نہیں ہو سکتا علاوہ ازیں انقلاب سے متعلق مارکس کے تصورات کو حقائق نے بھی جھٹلادیا۔ مارکسی نظریہ کے مطابق یہ انقلاب پہلے روس میں رونما ہوا جس کی معیشت کا انحصار زراعت پر تھا۔ مزید برآں روس میں انقلاب کی کامیابی مارکسی نظریات کی مقبولیت سے زیادہ لینن کی قائدانہ تنظیمی صلاحیتوں اور ملک میں موجود شدید انتشار کی کیفیت کے رد عمل کی وجہ سے ہوئی۔ (۱۵)

## سوشلزم و کمیونزم

ذیل میں سوشلزم و کمیونزم کے نظریات تحریر کیے جاتے ہیں۔

- ۱۔ کمیونزم اور سوشلزم سراسر ملحدانہ نظام ہے
- ۲۔ کمیونزم میں طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔
- ۳۔ کمیونزم کے مطابق انسان مادہ سے ترقی کر کے بنا ہے۔
- ۴۔ کمیونزم کے مطابق انسان کا طبعی جسم موت کے بعد فنا ہو جائے گا اور دوبارہ اسی شکل میں زندہ نہیں ہو سکے گا۔
- ۵۔ کمیونزم کے مطابق تمام موضوعات جدوجہد کے گرد گھومتی ہے۔

- ۶۔ کمیونزم دنیا کو دو طبقات میں تقسیم کر کے اسے دو طبقات کی جنگ قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ جب تک ایک طبقہ دوسرے کو برباد نہیں کر دیتا امن ناممکن ہے۔
- ۷۔ کمیونزم اور سوشلزم صرف مادی ترقی پر زور دیتا ہے۔
- ۸۔ کمیونزم کی بنیاد طبقات کی باہمی نفرت پر ہے۔
- ۹۔ کمیونزم نجی ملکیت کو ختم کرتا ہے۔
- ۱۰۔ کمیونزم معاشی تفاوت کو بزور ختم کرنے کا حامی ہے۔
- ۱۱۔ کمیونزم میں سود کاری کا نظام مروج ہے۔
- ۱۲۔ کمیونزم میں فرد کی قطعی کوئی حیثیت نہیں وہ معاشرہ کا ایک مہرہ ہے۔
- ۱۳۔ کمیونزم ایک ڈکٹیٹر شپ ہے۔
- ۱۴۔ کمیونزم کا بانی مارکس ہے جو ایک فانی انسان تھا۔
- ۱۵۔ کمیونزم اور سوشلزم کے نظریات اور قوانین انسانی قوانین اور ضوابط ہیں جن میں بے شمار خامیاں ہیں۔ (۱۶)

## (۲) انکار مذہب کی تحریک

تحریک احیاء کے وقت سے اللہ کے وجود سے انکار، اور یورپ کی رومی وٹینیت کی جانب رجوع کی بناء پر جدید تہذیب لادینی بنیادوں پر اٹھی اسی سے تمام آفتیں نازل ہوئیں۔ انسان کے خلاف تہذیب جدید کا سب سے بڑا جرم اسی مصدر خبیث سے پھوٹا اور انسانی اقدار اور اس کے نوعی اور انفرادی خصائص کے زوال کی جڑ بھی یہی ہے۔ تہذیب جدید مذہب کو اللہ کا مقرر کردہ ضابطہ حیات ہونے کی صورت میں وہ سارا اقدار و اختیار نہیں دیتی جو اسے ملنا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں تہذیب جدید اللہ کی الوہیت سے منکر ہے۔ انسان اپنے رب سے، رب کے مقرر کردہ ضابطہ حیات سے اور اس کی بھیجی ہوئی ہدایت سے روگرداں ہو گیا۔ اس نے اپنے نفس اور اپنی خواہش کو اپنا الہ بنالیا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عزت و تکریم عطا کی اور انسان نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے انسان بنایا مگر اس نے اپنے آپ کو حیوان تصور کیا اللہ تعالیٰ نے اسے مشین کا خالق بنایا مگر وہ خود مشین بن گیا۔ بلکہ کہ مشین کو اپنا صاحب ارادہ الہ بنالیا اور مادہ کو بھی اپنا الہ بنالیا اور اقتصاد کو بھی الہ بنالیا۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ انسان مادہ اور اقتصاد دونوں کا آقا ہو مگر انسان نے اس تکریم کو ٹھکرا دیا تاکہ وہ کلیسا اور کلیسا کے خدا سے نجات پا سکے! انسان نے اللہ کو چھوڑ کر سیککڑوں الہ بنائے

انسان کو اپنی تمام حرکات کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ انسانیت نے فطرت کی خلاف ورزی پر اپنی زندگی کے ہر پہلو پر تادان دیا۔ اور جو قومیں مادی ترقی کے بام عروج تک پہنچ چکی ہیں ان کے لیے نسلی کمی خطرہ بنی ہوئی ہے۔ انسانی خصوصیات میں کمی انہیں بربریت کی طرف لے جا رہی ہے اور عقلی معیار میں کمی اس سائنس کے لیے خطرہ بنی ہوئی ہے جس پر تہذیب جدید کی بنیاد ہے۔ (۱۷)

دور جدید کے وہ نظریات جن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کس قدر لامذہبی ذہنیت کی رونمائی ہے۔ وہ نظریات درج ذیل ہیں۔

### ۱۔ نظریہ قومیت:

ماکیا ویلی (Michiay-elli) کے نزدیک قومی مملکت ہی کائنات کی اعلیٰ ترین ہستی اور انسان کی اصل غرض و غایت ہے۔ وہ نفس قوت کی خاطر ترقی قوت کا پرستار ہے۔ اس سلسلہ میں مذہب، اخلاق اور قانون کو خاطر میں (۱۸) لانے کی ضرورت نہیں۔ (۱۹) چنانچہ وہ کہتا ہے۔

”سلطنت کے قیام و بقاء کے لئے رئیس کو اکثر اوقات معاہدوں، نیک نیتی، انسانیت اور مذہب کے خلاف عمل کرنا چاہیے۔“ (۲۰)

### نظریہ قومیت میں مذہب کی مستقل حیثیت نہیں:-

وہ سیاست کا ماتحت اور خدمت گزار بن کر رہ سکتا ہے اور جب کبھی دونوں کے مفاد میں ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو تو سیاسی مفاد کو بہر حال ترجیح حاصل ہوگی۔ اس نظریہ سے سیاست کو مذہب سے آزادی مل گئی ہے لیکن اس سے بھی انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ اپنے برگ و بار لانے کی خاطر اس نے خلاف اخلاق اور خلاف قانون طرز عمل کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ نیز سیاسی دستور سے اس عنصر (مذہب) کو خارج کر دیا ہے۔ جس سے انسانیت نشوونما حاصل کرتی ہے۔ اس نظری کے فروغ پانے کے بعد اخلاقیات و نفسیات جیسے اہم مذہبی عنوان بھی ”دینیات“ سے آزاد ہو گئے۔

(۲۱)

### فطری مذہب و آزاد خیالی:-

فطری مذہب وہ ہے جو تمام خارجی رسوم و ردایات سے آزاد ہو اور محض فطرت انسانی پر مبنی ہو۔ (۲۲) اسکی تعلیمات درج ذیل ہیں:



”یوڈن“ اپنے ایک دوست کو تو حید کلی کی حمایت کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

مذہب کے مختلف خیالات سے گمراہ مت ہو۔ دل و جان سے صرف اسی حقیقت پر قائم رہو کہ سچا مذہب اسکے سوا کچھ نہیں کہ ایک پاک روح اپنا رخ خدا کی طرف رکھے۔ یہی میرا مذہب ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہی مسیح کا مذہب ہے۔ (۲۳)

مذہب فطرت کا ایک اور مبلغ ٹورالبا (TORALBA) کہتا ہے۔

جب لوگوں نے اس فطری مذہب کو ترک کر دیا جو عقل کے ساتھ ان کی طبیعت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ تو وہ گمراہ ہو گئے۔ فطری قانون اور فطری مذہب انسان کے لیے کافی ہے۔ اسکے علاوہ تمام مذاہب کے بغیر کام چل سکتا ہے۔  
ہ۔ لارڈ ہربرٹ (Lord Herbert) نے مذہب فطری کی تعلیم کے لئے ایک نظریہ علم قائم کیا تھا۔ (۲۴)  
جس کا خلاصہ یہ ہے۔

اگر ہمیں ”صدائق“ کا ادراک ہو سکتا ہے تو اس مقصد کے لئے ضرور ہماری طبیعت میں کچھ ملکات ہوں گے یہ ملکات ان حقائق کلیہ کی بنا پر ہیں جو مختلف مذاہب کے مقابلہ سے معلوم ہو سکتے۔

## فطری مذہب کی خامیاں اور کمزوریاں :-

”فطرت“ کی وحی کو عملی شکل میں متشکل ہوتے وقت کیا کیا دشواریاں پیش آتی ہیں؟ اور کون کونسے مؤثرات و محرکات مزاحم بنتے ہیں؟ پھر ان پر قابو پانے کے لئے کیا صورتیں اور تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں؟  
ان تمام تشریحات سے یہ مذہب خالی ہے۔ صرف اتنی سی بات ہے کہ فطرت کے ذریعے ایک مسلسل باطنی وحی ہوتی رہتی ہے۔ انسان زندگی کے میدان میں ہوس رانیوں سے کیسے محفوظ رہ سکتا ہے اور سخت قسم کی مزاحمتوں اور مخالفتوں کا ”توڑ“ کیے بغیر کب تک یہ باطنی وحی ہوتی رہے گی؟ کیا اس مشاہدہ سے انکار کی گنجائش ہے کہ بسا اوقات مزاحمتوں کے (۲۵) ہجوم میں فطرت کی اصل آواز (وحی) دب جاتی ہے اور اندرون خانہ چھپی ہوئی ”ہوس“ جو تصویر بناتی ہے اسی کو فطرت کا نام دے دیا جاتا ہے۔ چونکہ اشخاص کے لحاظ سے ہوس کی بنائی ہوئی تصویریں مختلف ہوتی ہیں۔ اس بنا پر نام نہاد فطرت کی صداؤں میں بھی تفاوت نظر آتا ہے۔ ورنہ اصلی فطرت کی اصلی آواز (وحی) میں اس قدر یکسانیت و ہم آہنگی ہونی چاہیے کہ کسی اور شے میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

ہ۔ فطری مذہب کی وضاحت کے لئے چار نفسیاتی مؤثرات ہیں :

## 3۔ ماحول

## 4۔ تربیت

## 1۔ فطرت:-

قبول حق کی قوت و استعداد کا نام ہے جو پیدائش کے وقت ہر فرد کو عطا ہوتی ہے۔

## 2۔ وراثت:-

انسان میں کچھ خاصیتیں اور صلاحیتیں بذریعہ وراثت نفوذ کرتی ہیں۔ جو

سیرت سازی کرتی ہیں۔

## 3۔ ماحول:-

انسان شعوری اور غیر شعوری طور پر ماحول کی تمام چیزوں سے متاثر ہوتا ہے۔

## 4۔ تربیت:-

اسکے ذریعے اشخاص کے حالات و مزاج اور مربی کی فکری و عملی زندگی کے لحاظ سے

مختلف قسم کے اثرات نمودار ہوتے ہیں۔ (۲۶)

۵۔ فطری مذہب والی فطرت کسی حیثیت سے محفوظ نہیں ہے۔

۵۔ مذہب فطرت کی ترویج کے بعد مذہب وحی کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

۵۔ مذہب فطرت نے مذہب وحی پر غلبہ حاصل کرنے میں سیاسی انداز اختیار کیا تھا جس کی صورت یہ تھی کہ

ابتداء میں اس نے ہر شے کو عقلی معیار پر جانچنے کی تبلیغ کی اور جو شئی اس معیار کے مطابق نہ ہو اس کو ”وحی“ سمجھنے

سے انکار کر دیا۔

۵۔ مذہب فطرت اور زندگی کے بنیادی امور میں عقل و خل انداز نہیں ہو سکتی ہے۔

۵۔ حرکت کتنی بدیہی اور مشاہدہ میں آنے والی ہے۔ لیکن قدیم فلسفی ”زینو“ کہتے ہیں کہ یہ محض فریب اور دھوکا

ہے۔ حرکت ناموجود بلکہ ناممکن الوجود ہے۔ (۲۷) (۲۸)

۵۔ اشیاء کے خارجی وجود میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے۔ انسان، حیوان، آفتاب و مانتاب وغیرہ سبھی کے وجود مشاہدہ

میں آتے ہیں۔ لیکن بارکلی (BERKELEY) کہتا ہے کہ یہ سب موجودات ذہنی تصورات ہیں اور ذہن سے باہر

کسی چیز کا وجود نہیں۔

۵۔ تناقض محال ہے۔ منطق و فلسفہ کی رو سے لیکن مشہور فلسفی ہیگل کہتا ہے کہ تناقض نہ صرف ممکن بلکہ بکثرت پایا جاتا ہے حتیٰ کہ کائنات کا وجود محض تناقض پر مبنی ہے۔

۵۔ فطری و آزاد خیالی دونوں مذاہب زندگی کی کشتی ساحل مراد پر نہ پہنچا سکتے تھے۔

۵۔ اسپنوزا (SPINOZA) ایک طرف تو فطرت کو قائم بالذات، اپنی آپ علت اور آپ اپنا جوہر ازلی کہتے ہیں اور دوسری طرف اس بات کے قائل ہیں کہ ہمیں صرف ان علتوں کا علم ہوتا ہے جو تجربہ میں عمل کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ علل اولیہ کا علم نہیں ہوتا ہے۔ اس قول کی بنا پر فطرت کا تصور تجربہ پر قائم قرار پاتا ہے۔ (۲۹) جبکہ پہلی صورت میں اس کو محض ایک تعمیر فکر قرار دیا جاتا ہے۔

### (۳) مذہب بیزاری

جب یورپ کی عقلیت تک مسلمانوں کا واقعی اور تجربی طریقہ کار پہنچا۔ تو مغربی فکر بھی علمی اور تجربی بحثوں میں مصروف ہو گئی۔ اس علمی تحقیق کے نتیجہ میں نئے نئے فلکی، جغرافیائی اور طبیعی حقائق سامنے آئے۔ جو اس مجموعہ اوہام دیومالا، اور خرافات کے برعکس تھے۔ جن کو کلیسا نے اپنایا ہوا تھا۔ اور جنہیں وہ مقدس حقائق بتاتا تھا۔ حالانکہ اس خرافات کا عیسائی مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ اس زمانے کے لوگوں میں پھیلے ہوئے غیر علمی افکار تھے۔ اللہ کے نازل کردہ نہیں تھے۔ انہی افکار کو کلیسا نے اپنایا۔ اور اس طرح ان کی مدافعت کرنے لگا جیسے یہ بھی عقیدہ کا ایک جزو ہوں۔

کلیسا نے اندلس اور مشرق کی اسلامی ثقافت سے پھونٹنے والی اس نئی رو کے بالمقابل نہایت سخت موقف اختیار کیا۔ اور یورپ کے جو سائنس دان اس چشمے سے سیراب ہوئے ان کی تحقیقات کا کلیسا نے نہایت سختی سے مقابلہ کیا اور انتہائی وحشیانہ طریقے پر اپنے اقتدار کو ان کے خلاف استعمال کیا۔ جس کے نتیجہ میں کلیسا، اور کلیسا کے اس خدا سے بیزاری پیدا ہو گئی۔ جس خدا کے نام پر کلیسا خوب خوب جھوٹ بولتا اور بہتان تراشی کرتا تھا۔ لوگ مذہب کے سائے سے بھی بیزار ہو گئے۔ مذہب کے اعتراف اور اس کے سامنے جھکنے کے معنی کلیسا کے ظالمانہ اور جابرانہ اقتدار کو تسلیم کرنے اور اس کے سامنے جھکنے کے ہوں گے۔ (۳۰) مذہب و اخلاق کی حالت یہ تھی کہ براعظم کے دونوں پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک ممالک میں عیسائی مذہب کی طرف سے بد اعتقادی عام ہو گئی تھی۔ کیتھولک ممالک کے بیشتر پادری اپنی اوباشی کی وجہ سے بدنام تھے اور ان کی اس مذہب کے اصولوں سے ظاہراً نفرت ان کی بدکرداری کے برابر تھی جس کی وہ تعلیم دیتے

تھے۔ جرمن کے پروٹسٹنٹ پادری بھی اپنی بے دینی میں ایسے ہی آزاد تھے۔

پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک ممالک میں عیسائیت اخلاق کے دلپذیر حالات میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ان موہوم اور بے اصول اخلاق کی وجہ سے کئی مخفی انجمنیں جیسے کہ (۳۱) ”روزیٹی“ اور ”ریومیٹی“ مجذوبوں کے حلقے وجود میں آ گئے تھے جنہوں نے مذہب کی جگہ مشین اور علامتی رسمیں رکھی تھیں۔ (۳۲)

۵۔ عیش پرستی کی ذہنیت عام ہو گئی تھی۔ مذہب کی یہ حالت نشاۃ ثانیہ سے قبل کی تھی۔

۵۔ مذہب دنیا طلبی اور ہوس رانی کا ذریعہ بن گیا تھا۔ محنت اور کام سے بچنے کی غرض سے لوگ مذہبی زندگی اختیار کرنے لگے تھے۔

۵۔ مذہب نے انسان کو جامد اور ناترقی پذیر قرار دے دیا تھا جس کی بنا پر ہر قسم کی علمی و تمدنی ترقی بڑی حد تک رکی ہوئی تھی۔ انہیں نہ صرف یہ کہ مذہب کی بارگاہ سے ملعون و مردود قرار دیا گیا بلکہ سخت سے سخت سزاؤں میں مبتلا کیا گیا۔

۵۔ مذہب انسانی اور معاشرتی کمزوریوں اور خرابیوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

الفرض زمانہ وسطیٰ میں یورپ کی اس حالت اور زندگی میں مذہب کے اس کردار سے انسانیت پناہ مانگ رہی تھی اور ہر قسم کی علمی و تمدنی ترقی بڑی حد تک رکی ہوئی تھی۔

یہ زمانہ 406ء تا 1495ء تک کا شمار ہوتا ہے۔ (۳۳)

اس لیے مذہب و سائنس میں سخت ترین تفریق قائم ہو گئی۔ لوگوں کی۔ اور سائنسدانوں کی بالخصوص، مذہب بیزاری کی یہ کیفیت ہو گئی جیسے شیر کو دیکھ کر گدھے بھاگ کھڑے ہوں۔ بیسویں صدی کے شروع میں جب لوگ چار صدیوں کے طویل اور پر مشقت بیابانی سفر کے بعد سانس لینے رکے تو انہیں شدت سے روحانی خلا محسوس ہوا تو کسی قدر مذہب بیزاری میں بھی کمی واقع ہوئی۔ (۳۴)

## (۴) خوف خدا کا فقدان

مارکسزم کا بانی مارکس کہتا ہے کہ مذہب انسان کے دل و دماغ پر وہی اثر کرتا ہے جو افیون کرتی ہے۔ (۳۵)

اولین نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ہم یہ بات یقیناً کہتے ہیں کہ ہم خدا کو نہیں مانتے۔ ہم پوری طرح جانتے

ہیں کہ پادریوں، جاگیرداروں اور بورژوا طبقہ نے خدا کا نام اس لئے استعمال کیا ہے کہ وہ اپنے لوٹ کھسوٹ پر مبنی

مفاد کی تکمیل کر سکیں۔ (۳۶) اصل بات یہ ہے کہ اشتراکی لیڈروں کو حقیقی مذہب سے سابقہ ہی نہیں پڑا۔ ان کے سامنے

مروجہ دو قسم کے مذاہب تھے۔

1- قنوطی مذہب، جو زندگی کی کشمکش سے گریز کی تعلیم دیتا ہے اور مذہبی انسان جمود و خمود کی نذر ہو کر نہایت تنگ دائرہ میں محدود ہو جاتا ہے۔

2- سیاسی مذہب، جو سیاست کے لئے بطور آلہ کار استعمال ہوتا ہے اور اس میں انسان کا مفاد مذہب پر غالب آ جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ان دونوں مذہبوں نے طبقاتی کشمکش کو فروغ دیا ہے اور سرمایہ دارانہ و جاگیردارانہ ذہنیت کی پشت پناہی کی ہے۔ اس طرح انسانیت کی تذلیل میں جاگیرداروں اور مذہبی نمائندوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ بٹایا ہے۔ (۳۷)

انسان کی اصلاح کے لئے تین چیزیں ہیں:

1- قانون 2- علم 3- خوف خدا

قانون انسان کی اصلاح کے لئے ذریعہ تو ہے مگر کافی دوائی نہیں۔ اسلئے کہ اگر شہادتیں نہ ہوں تو انسان قانون کی گرفت میں نہیں آ سکتا۔

اسی طرح علم بھی انسان کی اصلاح کیلئے ذریعہ تو ہے مگر کافی اور دوائی نہیں۔ اسلئے کہ علم کے باوجود بھی انسان گناہ کرتا ہے۔ سب سے بڑی مثال شیطان کی ہے جو بڑا اسکالر ہے۔

مگر ایک عنصر خوف خدا ہے جو انسان کی اصلاح کے لئے کافی اور دوائی ہے۔ اسلئے کہ جس کے دل میں خوف خدا ہو تو اگرچہ وہ بند کمرے میں بھی بیٹھا ہو تو نافرمانی کرنے سے ڈرے گا۔ اسلئے کہ خوف خدا کی وجہ سے اس کو یہ کیفیت حاصل ہوگی کہ اور اگرچہ کوئی نہیں دیکھ رہا مگر اللہ تعالیٰ تو دیکھ رہا ہے۔ (۳۸)

مارکس مادی عوامل کی قوت اور اہمیت کو اس حد تک بڑھا دیتا ہے کہ اس کے نزدیک مذہب جیسی بڑی اور موثر قوت کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی۔ اس کے نزدیک مذہب بھی محنت کاروں کی کشمکش میں بوڑھائی طبقات کا ساتھ دیتا ہے۔ چنانچہ وہ مذہبی اقدار کی اہمیت کو بالکل مسترد کر دیتا ہے ٹرائسکی نے کہا تھا۔ بہترین اخلاق ایسی خانہ جنگی ہے جو مختلف طبقوں میں جاری ہوا اور جس سے غیر طبقاتی معاشرہ جنم لے سکے سوشلزم کے ضابطہ اخلاق کے مطابق جھوٹ، دھوکہ وہی فریب اور جعل سازی سے مقاصد حاصل کرنا درست اور جائز ٹھہرا۔ اخلاقیات سے متعلق مارکس کے ایسے عقائد ایک ایسے معاشرہ کے قیام میں رکاوٹ بنتے ہیں جس میں لوگ ایک دوسرے کے لئے محبت اور ہمدردی کے جذبات رکھتے ہوں۔ درحقیقت اخلاقی اقدار ہی مادی زندگی کو مربوط و منظم بنیادوں پر استوار کر کے معاشرہ خوشحال بنانے کا

موجب بنتی ہیں۔

قدر زائد کا مارکسی نظریہ **Surplus Value** بھی تصویر کے صرف ایک ہی رخ کی عکاسی کرتا ہے بلاشبہ کارل مارکس نے نظام سرمایہ داری کے تحت قائم بے قید معیشت میں محنت کاروں پر ہونیوالے ظلم و ستم کی موثر طور پر نشاندہی کی لیکن اپنے تجربہ میں وہ اس پہلو کے اعتبار سے بھی انتہا پسندی کی طرف مائل نظر آتا ہے۔ مارکس کے تجزیہ میں قیمتوں کے تعین کے سلسلہ میں کارفرما حقیقی عوامل کی نشاندہی نہیں ہوتی۔ اس ضمن میں وہ ایسے عوامل مثلاً باہمی مسابقت، اجارہ دار یوں کا پہلو انتظامی اخراجات مانگ اور رسد کے باہمی تعلق وغیرہ کو نظر انداز کر دیتا ہے اور صرف محنت کو ہی اشیا کی پیدائش کے سلسلہ میں واحد عامل تصور کرتا ہے۔ بالفرض اگر محنت کو ہی پیدائش دولت میں واحد اور موثر عامل تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کاروبار میں نقصان کی صورت میں بھی مزدور کو مالک کے ساتھ مساوی خسارہ برداشت کرنا ہوگا۔ جبکہ یہ بات ہمیشہ سے مردجہ حقائق کے خلاف رہی ہے۔ از رو کے انصاف کاروبار میں منافع کا بڑا حصہ اسی کو نہ ملنا چاہیے جس کے حصہ میں کاروبار کا نقصان آتا ہے اور جو نقصان کا خطرہ مول لیتا ہے۔

درحقیقت کارل مارکس نے ایک ایسے نظام کا تصور دیا جو اپنے اندر محنت کا طبقہ کے لئے زبردست جاذبیت رکھتا تھا لیکن عملی طور پر وہ مطلق العنانیت، جبر و تشدد اور استبدادیت کے قیام کی راہ ہموار کرتا ہے۔ آمریت ہمیشہ جابرانہ نظام کی غمغیزی کرتی ہے خواہ یہ آمریت مزدوروں کی ہو یا سرمایہ داروں کی بنیادی ضروریات زندگی کی فراہمی کی ضمانت اگر ان کی آزادیوں کی قیمت کے بدل دی جائے تو یہ سودہ بہت مہنگا ہے۔ کیا انسان کو بیک وقت روٹی اور آزادی دونوں کی فراہمی کی ضمانت نہیں دی جاسکتی؟ جن ممالک میں اشتراکی انقلاب آیا وہاں کی حالیہ تاریخ اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ پر دلتاری آمریت عملی طور پر کمیونسٹ پارٹی کی استبدادیت کا ہی دوسرا نام ہے۔ اس نظام میں تمام اختیارات پارٹی کے چند سرکردہ قائدین کے ہاتھوں میں مرککز کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ طبقہ سرمایہ داروں کے اس طبقہ سے بھی بدتر رویہ کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جن کے خاتمہ کے لئے مزدوروں نے جدوجہد کی ہوتی ہے سودیت یونینیں اور عوامی جمہوریہ چین کے اندر حالیہ سیاسی واقعات اس بات کے شاہد ہیں کہ برسر اقتدار آنے والی ہر نئی قیادت نے پرانی قیادت کے آمرانہ اقدامات کا پردہ چاک کیا۔ جبکہ برسر اقتدار گروہ پر تنقید و احتساب کا تصور بھی محال ہے۔

ایک نئے سرخ سامراج کے روپ میں اس کے حامیوں نے جس طرح مختلف اقوام کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے اس کا کیا جواز ہے؟ سودیت یونین کا بہت بڑا حصہ ان علاقوں پر مشتمل ہے جو کبھی مسلم سلطنت کا حصہ تھے اور جہاں مسلم تہذیب نے تابندہ نقوش مرتب کئے تھے۔ روس نے انہیں زیر تسلط رکھنے کے لئے مسلم تہذیب کے ملیامیٹ

کرنے میں کوئی دقیقہ فردگزاشت نہ کیا مشرقی یورپی ممالک کی حالت اور پھر گور باچوف کے موجودہ دور میں سرخ استبدادیت کے خلاف شدید رد عمل کے مظاہرے کیونز م کی ایک گھناؤنی تصور کی عکاسی کرتے ہیں۔

اشتراکی سامراج نے تمام بین الاقوامی اخلاقی و قانونی آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ۱۹۷۹ میں افغانستان پر تنگی جارحیت کا ارتکاب کیا۔ لیکن افغان قوم نے مادیت پرستی کے اس دور میں بھی آزادی و دینی جمعیت کے تحفظ کی شمع روشن کر کے مذہب کی اہمیت کو ایک بار پھر اجاگر کر دیا۔ پندرہ لاکھ افراد کی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے انہوں نے فروری ۱۹۸۹ میں روسی افواج کو اپنے ملک سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔

مارکسی تعلیمات عدل و انصاف کے عام مسلمہ اصولوں کی کسوٹی پر بھی پوری نہیں اتریں۔ افراد سے نجی ملکیت کا حق چھین لینا صریح کے ظلم کے مترادف ہے نجی ملکیت کو قومی مفادات کے مطابق ضبط کر دینے سے اس کی تمام خرابیاں دور ہو سکتی ہیں۔ لیکن مسئلہ کو حل کرنے کی بجائے افراد کو اس فطری حق سے ہی محروم کر دینا کہاں کی دانشمندی ہے؟ حق ملکیت فرد کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور اس کی شخصیت کی تکمیل کے لئے ناگزیر ہے اپنی محنت کے پورے صلے یا اسکے ثمرات سے دست کش ہو جانا انسانی جبلت اور موروثی میلانات کے خلاف ہے دور حاضر میں آزاد معیشت کے نظام کی حامل رفاہی مملکتوں نے بھی منضبط معیشت کا ایسا نظام مرتب کیا ہوا ہے جس سے ایک طرف بڑی حد تک تمام طبقات کے مفادات کا تحفظ کیا جاسکتا ہے جبکہ اس کے ساتھ ساتھ آزادیوں کے تحفظ کی بھی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ مخلوط معیشت کی خصوصیت سے عبارت ایک ایسا منضبط معاشی نظام چلانا ممکن ہے جس میں پریویٹ سیکٹر اور پبلک سیکٹر دونوں کے مابین توازن برقرار رکھا جاسکے۔ مساوات کے متعلق بھی اشتمالیت کا تصور غیر منطقی اور عدل کے تقاضوں کے منافی ہے۔ اشتراکیت کا مستقبل کے غیر طبقاتی معاشرہ کے متعلق یہ اصول کہ اس میں ہر فرد کو اس کی ضروریات کے مطابق اشیاء فراہم کی جائیں گی نہ صرف عدل کے منافی ہے بلکہ ناقابل عمل بھی ہے۔ اس اصول کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسے معاشرہ میں جہاں قابل اور اہل افراد کو ان کی صلاحیت کی بنا پر معاوضہ ملے گا وہاں نا اہل افراد کو ان کی نااہلی کا بھی اتنا ہی بلکہ اگر ان کی ضروریات زیادہ ہوں گی تو اہل افراد سے بھی زیادہ معاوضہ دیا جائیگا ظاہر ہے ایسی صورت حال میں کوئی بھی کارکن اپنی استعداد کار بڑھانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ بلکہ باصلاحیت افراد کی حوصلہ شکنی ہوگی۔ درحقیقت مارکس نے مساوات کا بالکل غیر فطری تصور پیش کیا ہے جو انسانی معاشرہ میں اصلاح کی بجائے مزید خرابیوں کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ مارکس کی تعلیمات اس بات کا مضہر ہیں کہ خوف خدا کا ذرا بھرا حساس نہیں پایا جاتا۔ (۳۹)

(۵) ذہنی سکون کا فقدان

ماہرین نفسیات نے نظریہ جنسیت کی بہت سی خامیاں اور کمزوریاں بیان کی ہیں۔ حتیٰ کہ فرائڈ کی نفسیات کا تجزیہ کر کے ثابت کیا ہے کہ وہ خود جنسی خواہشات کا غلام تھا اسلئے ہر چیز کو وہ جنسیت ہی کی نگاہ سے دیکھتا تھا مثلاً اگر لاشعور میں تمام تر جنسی نوعیت کا جذبہ تسلیم کیا جائے تو آزادانہ جنسی خواہشات کی تسکین سے انسان کو کامل انبساط و آسودگی ہونی چاہیے حالانکہ مشاہدہ ہے کہ آزادی انسان کو بالآخر زیادہ پریشان حال و مصیبت زدہ بنا دیتی ہے۔

اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ خواہشات کی فرمانبرداری سے انسان کے فطری اقدار پامال ہوتے ہیں اور زندگی میں ایک خاص قسم کا ”خلا“ پیدا ہو جاتا ہے جس کے ”پُر“ ہونے کی کوئی سبیل نہیں ہوتی اور تشنگی محسوس ہونے لگتی ہے۔

فرائڈ اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ علم و ہنر، اخلاق وغیرہ کی مشغولیت میں بسا اوقات وہ انبساط و آسودگی حاصل ہوتی ہے کہ اصل خواہشات کی تسکین سے بھی وہ نہیں حاصل ہو سکتی ہے۔ حالانکہ یہ بدلی ہوئی شکلیں اکثر انسانی اقدار، نیکی و سچائی وغیرہ کے روپ میں ظاہر ہوتی ہیں۔ جن کا ”جنسیت“ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔

اس کا جواب اسکے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ انسان کے اندر ایک ”جوہری توانائی“ ایسی موجود ہے کہ جس کے مخصوص قسم کے تقاضے اور مطالبے ہیں۔ انسان کے اعمال و افعال جس قدر اور جس حد تک اس کی موافقت کرتے ہیں۔ اسی قدر فرحت و آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ یہ علم و ہنر اخلاق وغیرہ دراصل اسی کے اصلی تقاضے اور مطالبے ہیں نہ کہ خواہشات کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں۔ رہی وہ عارضی راحت و تسکین جو انسان کو آزادانہ خواہشات کی تکمیل سے ابتدا میں حاصل ہوتی ہے۔ اسکی حیثیت ایسی ہی ہے۔ جیسی سانپ کے کاٹے ہوئے کو ”نیم“ کی کڑواہٹ نہیں محسوس ہوتی ہے۔ اور چڑھے ہوئے زہر کی وجہ سے کام و دہن کے سکون کے ساتھ اس کو استعمال کرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس سکون اور علم و ہنر والے سکون میں کتنا فرق ہے۔ اول الذکر اسی وقت تک ہے جب تک زہر کا اثر چڑھا ہوا ہے اور ثانی الذکر مستقل و پائدار ہونے کے ساتھ کسی عارضی سبب کا مرہون منت نہیں ہے۔ (۴۰)

فرائڈ کے نزدیک نفس کی تسکین عبادت و ریاضت سے ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔

”بالکل ممکن ہے کہ صوفیوں کے بعض طریقے نفس انسانی کے مختلف طبقات کے معمولی تعلقات کو بدل ڈالیں مثلاً اس طرح سے کہ قوت ادراک ”ایغو“ اور لاشعور کی بعض ایسی گہرائیوں پر حاوی ہو جائے جو بصورت دیگر اس کی دسترس سے باہر ہوں۔ (۴۱)

سوال یہ ہے کہ یہ طریقے ہمیں ایسے ابدی حقائق کی طرف رہنمائی کرتے ہیں جن سے ساری برکتوں کا ظہور ہوگا؟ یہ بات مشکوک ہے تاہم ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ ہم نے بھی تحلیل نفسی کی معالجانہ کوششوں میں یہی طریقہ کار اختیار



کر رکھا ہے کیونکہ ان کا مقصد بھی یہی ہے کہ ”ایضاً“ کو مضبوط کیا جائے۔ اسے فوق الشعور سے الگ کر دیا جائے۔ اس کا مطمح نظر وسیع کر دیا جائے اور اس کی تنظیم کو پھیلا دیا جائے تاکہ وہ لا شعور کے کچھ اور حصوں پر حاوی ہو جائے اور جہاں پہلے لا شعور تھا وہاں شعور موجود ہو جائے۔

فرائڈ کے اس اعتراف سے واضح ہوتا ہے کہ جو کام اس نے تحلیل نفسی کے ذریعے کیا ہے وہی کام صوفیوں کے عبادات و ریاضات کے طریقوں سے ہوتا ہے۔ پھر ایسی حالت میں درسی نفسیات کے لئے تحلیل نفسی کے مذکورہ طریقوں اور ذریعوں کی کیا اہمیت باقی رہتی ہے جبکہ اس کی وجہ سے زندگی کے بہت سے گوشے نشہ اور بہت سے راز مخفی رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح جب جذبہ لا شعور کو جنسی خواہشات کے علاوہ صوفیوں کے عبادات و ریاضات کے طریقے مستقل طور پر آسودہ کر دیتے ہیں تو پھر اس جذبہ کی تمام تر نوعیت میں خدا کی محبت کیوں نہ تسلیم کی جائے؟ اور عبادات و ریاضات کے ذریعے اس کی تسکین کا سامان کیا جائے؟

آج ہمارے ذہنی سکون کے فقدان کی وجہ یہ ہے کہ خدا کی محبت نہیں ہے۔ (۴۲)

## فصل دوم

### فکری مسائل

#### 1۔ فکر کا مفہوم:-

فکر کا لغوی معنی سوچ بچار غور، تدبر، دھیان اور رنچ ہے۔ (۴۳) اصطلاح میں طلب علم اور آگہی کے ہیں۔ اور جو علم کہ فوراً معلوم نہ ہو اس کو طلب کرنا ضروری ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے مگر دوسری دو معرفتوں سے۔ اور اگر ان دو کو جمع کر دیا جائے تو ایک تیسری معرفت پیدا ہو جاتی ہے۔ (۴۴) اسلام میں فکری اہمیت:

انظروا ما اذافی السموات والارض۔ (۴۵) زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، اسے آنکھیں کھول کر دیکھو۔

آج کی یہ ترقی یافتہ تہذیب اور عظیم الشان تمدن، انسان کی ذکاوت و ذہانت اور اس کی عقل و دانش کا نتیجہ ہے۔ اگر عقل کی یہ بیداری نہ ہوتی تو انسان کبھی قوانین حیات سے آشنا نہ ہو سکتا، وہ اسباب و وجود کو جان سکتا اور نہ اس کائنات میں کارفرما قوانین الہیہ کا ادراک کر سکتا۔ بلکہ شاہراہ ترقی پر وہ ایک قدم بھی نہ چل سکتا۔ اور یوں انسان اسی

حالت پر قائم رہتا، جس حالت پر وہ پیدا کیا گیا تھا۔ نہ کوئی تبدیلی ہوتی اور نہ کوئی ترقی۔

مگر عقل فطین نے اپنی کامیاب جدوجہد سے، انسان کو، ان بندشوں سے آزاد کر دیا۔ جن میں انسان عرصہ دراز سے جکڑا چلا آ رہا تھا۔ عقل نے انسان کو اس قابل کر دیا کہ وہ زمین کا سینہ چیر کر اس کے خزانے باہر نکالے، خشک سالی اور قحط پر قابو پائے۔ زمین کی پیداوار میں اضافہ کرے۔ دور دراز کی مسافتوں کو سمیٹ دے۔ تباہ کن بیماریوں میں کمی کرے۔ عقل کے ذریعے سے ہی انسان نے بروہر اور فضا کے متعلق معلومات حاصل کیں اور بالآخر آج انسانی زندگی اس اعلیٰ اور بلند معیار پر پہنچ چکی ہے جس کا ہمارے آباؤ اجداد خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔

جس طرح انسانی بدن کے ہر عضو کا کوئی نہ کوئی کام ہے۔ اسی طرح عقل کا کام غور و فکر کرنا ہے اگر عقل، غور و فکر کو ترک کر دیتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عقل کا عمل ختم ہو گیا۔ اور اس نے اپنا فریضہ سرانجام دینا چھوڑ دیا۔ چنانچہ اس کے نتیجہ میں زندگی کی نشوونما رک جائے گی اور جمود، موت اور فنا، انسانی زندگی پر حکمران ہوگی۔

اسلام، عقل کو اس کی بندشوں سے آزاد کر کے، اس کی ترقی کا خواہاں ہے اسلام نے غور و فکر اور خبر و نظر سے کام لینے کی دعوت دی ہے۔ اور اسے مغز دین اور اصل عبادت قرار دیا ہے۔ چنانچہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قل انظروا ما اذافی السموات والارض (۴۶) زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، اسے آنکھیں کھول کر دیکھو۔

نیز فرمایا۔

قل انما اعظکم بواحدة ان تقوموا لله مثنیٰ کہہ دو کہ میں تمہیں صرف ایک بات نصیحت کرتا ہوں  
وفرادى ثم تتفکروا (۴۷) کہ تم اللہ کے لئے ایک ایک اور دو دو کر کے کھڑے  
ہو جاؤ پھر غور و فکر کرو۔

ابن حبان نے حضرت علیؓ کی روایت پیش کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

لاعبادة کا التفکیر (۴۸) غور و فکر سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں۔

ابن عباسؓ اور ابوالدرداءؓ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔

فکر ساعة خیر من قیام ليلة۔ (۴۹) ایک گھڑی کا تفکر، رات بھر کی عبادت سے بہتر ہے۔

حضرت سری سقطیؒ فرماتے ہیں۔

فكرة ساعة خير من عبادة سنة (۵۰) ایک گھڑی کا غور و فکر ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک رات رسول ﷺ نے وضو کیا اور نماز پڑھنی شروع کی۔ ساری رات نماز پڑھتے رہے اور روتے رہے حتیٰ کہ حضرت بلالؓ نے آ کر صبح کی نماز کی اطلاع دی۔ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ رونا کیسا؟ اللہ تعالیٰ نے تو آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف کر دیئے ہیں۔ فرمایا:

يا عائشة افلا اكون عبدا شكورا۔ (۵۱) اے عائشہ! کیا میں شکر گزار بندہ نہ ہوں؟

اور میں ایسا کیوں نہ کروں۔ جب کہ آج ہی کی رات اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ آیتیں نازل کی ہیں۔

ان في خلق السموات والارض واختلاف بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات اور اللیل والنهار لایات لاولی الالباب۔ الذین یذ دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں عقل والوں کے کروں اللہ قیاما و قعودا و علی جنوبہم و لئے نشانیاں ہیں۔ جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے (ہر حال یتفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ما میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمان اور زمین کی خلقت هذا باطلا سبحا نک فقنا عذاب پیدائش میں غور کرتے (اور کہتے) ہیں کہ اے النار۔ (۵۲)

پروردگار! تو نے اس (مخلوق) کو بے فائدہ نہیں پیدا کیا۔ تو پاک ہے۔ تو (قیامت کے دن) ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچائیو۔

پھر فرمایا:

ویل لمن قراها ولم یفکر فیها (۵۳) بربادی ہے اس شخص کے لئے جو اس آیت کو پڑھے مگر اس میں غور و فکر نہ کرے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا:

”ایک شخص اپنے بستر پر لیٹا تھا کہ کہنا گاہ اس نے اپنا سر اٹھا کر آسمان اور ستاروں کو دیکھ کر کہا۔

اشھدان لك ربنا وخالقا اللهم اغفر لی۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ تیرا (آسمان اور ستاروں کا) رب

اور خالق ہے۔ اے میرے اللہ! مجھے بخش دے۔ (۵۴)

اللہ نے نظر رحمت سے اسے دیکھا اور اس کی مغفرت فرمادی۔

جو لوگ عقل جیسی نعمت کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ اللہ نے جس مقصد کے لئے عقل کو پیدا کیا ہے، وہ اسے مقصد کے لئے استعمال نہیں کرتے۔ ایسے لوگ سخت مذمت کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر عتاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔  
 وَمَا تَنْتَبِهْ مِنْ آيَةٍ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا أَوْرَانِ كَے پُور دگار کی طرف سے کوئی معروضین۔ (۵۵)  
 نشانی نہیں آتی۔ مگر اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔  
 ایک اور مقام پر فرمایا۔

وَكَايْنِ مِنْ آيَةٍ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُونِ اور آسمان و زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں جن پر یہ علیہا و ہم عنہا معروضون۔ (۵۶)  
 گزرتے ہیں اور ان سے بے رخی برتتے ہیں۔  
 عقل کو اس کے فریضہ کی ادائیگی سے روک دینے سے انسان حیوانی سطح سے بھی پست مقام پر پہنچ جاتا ہے۔  
 عقل و دانش کا تعطل، ترقی اور انفس و آفاق کے حقیق تک رسائی کے راستہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔  
 ارشاد الہی ہے۔

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ لَهُمْ اور ہم نے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لئے پیدا قلوب لا یفقهون بہا و لهم اعین لا یبصرون بہا کئے ہیں۔ ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں اور ان ولهم اذان لا یسمعون بہا اولئک کالانعام بل کی آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں ان کے کان ہیں ہم اضل اولئک ہم الغافلون۔ (۵۷)  
 پر ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ (بالکل) چارپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بھٹکے ہوئے۔ یہی وہ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

### تقلید، فکر کے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ:

تقلید، عقل کے استعمال میں رکاوٹ ہے۔ وہ عقل کو استعمال کرنے کا موقع ہی نہیں دیتی۔  
 اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تعریف کی ہے جو حقائق کی تلاش میں مخلص ہوتے ہیں۔ بحث و تحقیق و تدقیق کے بعد اشیاء کی حقیقت کو پہچان لیتے ہیں۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرم ہوتے ہیں۔ عمدہ اور بہترین چیز کا انتخاب کرتے ہیں اور باقی کو چھوڑ دیتے ہیں۔ ادشار الہی ہوتا ہے۔

وبشر عبادى الذين يستمعون القول فيتبعون ميرے بندوں کو بشارت سنادو۔ جو بات کو سنتے ہیں احسنه اولئك الذين هداهم الله واولئك هم اور اچھی باتوں کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں اولوالالباب۔ (۵۸) جن کو اللہ نے ہدایت دی اور یہی عقل والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے تقلید پرستوں کی سخت مذمت فرمائی ہے۔ جو اپنے دل و دماغ سے سوچنے کی بجائے دوسروں کے دماغ سے سوچتے ہیں۔ قدامت پرستی پر جے رہتے ہیں آئین نو سے بدکتے اور طرز کہن پر اڑے رہتے ہیں۔ خواہ یہ جدید کتنی ہی واضح، روشن اور بین کیوں نہ ہو وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ ارشاد الہی ہے۔

وانا قيل لهم اتبعوا ما انزل الله قالوا بل نتبع اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جو ماالفينا عليه اباؤنا اولو كان اباؤهم لا (کتاب) اللہ نے نازل فرمائی ہے، اس کی پیروی کرو يعقلون شيئا ولا يهتدون (۵۹) تو کہتے ہیں (نہیں) بلکہ ہم تو اسی چیز کی پیروی کریں گے، جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔ بھلا اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ سیدھے رستے پر ہوں (تب بھی وہ انہیں کی تقلید کئے جائیں گے۔)

دوسری جگہ فرمایا۔

وكذلك ما ارسلنا من قبلك فى قرية من نذير اور اسی طرح ہم نے تم سے پہلے کسی بستی میں کوئی الاقال مترفوها انا وجدنا اباؤنا على امة وانا هدايت کرنے والا نہیں بھیجا مگر وہاں کے خوشحال لوگوں على اثارهم مقتدون۔ (۶۰) نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک راہ پر پایا ہے اور ہم قدم بقدم ان ہی کے پیچھے چلتے ہیں۔

## 2۔ فکری مسائل:-

فکری مسائل سے مراد وہ نئے مسائل ہیں جو معاشرہ میں پیدا ہوئے ہیں۔ ان کا ایسا حل تلاش کیا جائے کہ ایک طرف تو ان کی اصل روح باقی رہے۔ دوسری طرف وہ جدید تقاضوں کے مطابق ہوں۔ (۶۱) فکر کبھی تو ایسے عمل میں ہوتا ہے جو دین سے متعلق ہو تو کبھی غیر دین سے ہم کو یہاں غرض اس فکر کے بیان سے ہے جو دین سے متعلق ہو اس لئے ہم قسم دوم کو چھوڑ دیتے ہیں اور دین سے ہماری مراد یہ ہے کہ معاملہ جو خدا اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان ہو۔ اب

فکر و حال سے خالی نہیں یا تو بندہ اور اس کی صفات اور احوال سے متعلق ہوگا یا معبود اور اس کی صفات اور افعال سے۔ اور جو فکر بندے سے متعلق ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔ یہ بندے کے ان احوال وغیرہ میں ہو۔ جو خداوند تعالیٰ کے نزدیک محبوب ہوں یا ان میں جو مکروہ ہوں اور جو فکر متعلق خداوند تعالیٰ سے ہے وہ یا اس کی ذات اور صفات اور اسمائے حسنیٰ میں ہوگا یا اس کے افعال اور ملک اور ملکوت اور تمام آسمانوں اور زمینوں اور ان کے درمیان کی چیزوں میں۔ اس میں اول کا بیان یہ ہے کہ اپنی ذات و صفات میں فکر کرے اور یہ قسم متعلق علم مکاشفہ سے نہیں ہے۔ افعال و صفات باری تعالیٰ کے نزدیک جو فکر محبوب یا مکروہ ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ظاہری جیسے طاعات اور معاصی۔ اور ایک باطنی جیسے صفات منجیات اور مہلکات جن کا محل دل ہے۔ طاعات اور معاصی کی دو قسمیں ہیں معاصی ساتوں اعضاء سے متعلق ہیں۔ جب ان تمام قسموں کو جمع کریں تو فکر کے مسائل ان اقسام میں سے یک صد سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔ (۶۲)

### تفکر کے حدود:

اسلام نے غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ اس کا خیر مقدم کیا ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ اسلام نے غور و فکر کی حدود کی بھی نشاندہی کر دی ہے اور اس کی جولانگاہ کا تعین کر دیا ہے۔ اس نے اللہ کی تمام مخلوق، کائنات، ارض و سماء خود انسانی ذات اور انسانی جماعتوں میں غور و تدبر کو مستحسن قرار دیا ہے۔ اسلام نے صرف اللہ کی ذات میں تفکر کرنے کی ممانعت کی ہے۔ اس لئے کہ ذات الہی حیط ادراک سے ماوراء ہے۔ اور ذہن انسانی کی دسترس سے بلند تر ہے۔ ارشاد الہی ہے۔

لاتدرکہ الا بصار وهو يدرك الا بصار وهو نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں اللطیف الخبیر۔ (۶۳)

ہے۔

ایک اور مقام پر فرمایا۔

لیس کمثله شئی وهو السميع البصیر اس جیسی چیز نہیں اور وہ دیکھنا سنا ہے۔ (۶۴)

یہ بھی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

يعلم ما بين ايديهم وما خلفهم ولا يحيطون به جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے وہ اس علما۔ (۶۵)  
کو جانتا ہے مگر وہ اپنے علم سے اللہ کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

رسول ﷺ فرماتے ہیں۔

تفكر و افى خلق الله ولا تفكر و افى الله فانكم الله كى مخلوق ميں غور کرو مگر اللہ ميں غور نہ کرو اس لن تقدر وہ قدرہ۔ (۶۶)  
لئے کہ تم اس کی حقيقت کا کبھی ادراک نہ کر سکو گے۔

اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیات میں، وسیع و عریض کائنات میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے۔

ان فى خلق السموات والارض واختلاف الليل بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور والنهار والفلک التى تجرى فى البحر بما ينفع رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے الناس وما انزل الله من السماء من ماء فاحيا ميں اور کشتیوں ميں جو دریا ميں لوگوں کے فائدہ کی به الارض بعد موتها وبث فيها من كل دابة چیزیں لے کر رواں ہیں اور بارش ميں جس کو وتصريف الرياح والسحاب المسخرين السماء اللہ آسمانوں سے برساتا اور اس سے مروہ زمین کو زندہ والارض لايات لقوم يعقلون۔ (۶۷)  
کر دیتا جیسے اور زمین پر ہر قسم کے جانور پھیلانے ميں

اور ہواؤں کے چلانے ميں اور بادلوں ميں جو آسمان اور زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں۔ عقلمندوں کے لئے (قدرت الہی کی) نشانیاں ہیں۔

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا۔

افلم ينظروا الى السماء فوقهم كيف بنيناها کیا انہوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف نگاہ نہیں کی۔ وزیناها و مالها من فروج والارض مددنا کہ ہم نے اسے کیونکہ بنایا اور کیسے سجایا۔ اور اس میں ہاوالقینا فیہا رواسی وانبتنا فیہا من کل کہیں شگاف تک نہیں اور زمین کو ہم نے پھیلا یا اور زوج بھیج - تبصرة وذکری لكل عبد منیب اس پر پہاڑ رکھ دیئے اور اس میں ہر طرح کی خوشنما۔ ونزلنا من السماء ماء مبارکاً فانبتنا به جناناً چیزیں اگائیں تاکہ رجوع لانے والے بندے ت وحب الحصيد۔ والنخل باسقات لها طلع ہدایت اور نصیحت حاصل کریں۔ اور آسمان سے برکت نصید۔ رزقا للعباد و احیینا به بلدة میتا۔ والاپانی اتارا اور اس سے باغ وبتان اگلے اور کھیتی کا اناج اور لمبی لمبی کھجوریں جن کا گابھتہ بہتہ ہوتا ہے (یہ سب کچھ) بندوں کو روزی دینے کے لئے شہر مردہ (یعنی زمین افتادہ) کو زندہ کیا۔

یہ بھی فرمان الہی ہے۔

هو الذی جعل الشمس ضیاء والقمر نوراً وہی تو ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منور بنایا وقدره منازل لتعلموا عدد السنین والحساب اور چاند کی منزلیں مقرر کیں تاکہ تم برسوں کا شمار اور ما خلق الله ذلك الا بالحق يفصل الايات لقوم (کاموں کا) حساب معلوم کرو۔ یہ (سب کچھ) اللہ نے يعلمون۔ (۶۹) تدبیر سے پیدا کیا ہے۔ سمجھنے والوں کے لئے وہ اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان فرماتا ہے۔

اسلام نے غور و فکر کے لئے ایک وسیع میدان مہیا کیا ہے۔ غور و تدبر کے راستہ میں نہ کوئی رکاوٹ ہے اور نہ اس پر کسی قسم کی کوئی قدغن۔ سوچ کے افق لامحدود ہیں۔ وہ دنیا و آخرت دونوں کو شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کذ لك یبین الله لكم الايات لعلمک تتفكرون اللہ اپنی آیتیں اس طرح تمہارے لیے کھول کھول کر فی الدنيا والاخرة۔ (۷۰) بیان کرتا ہے تاکہ تم دنیا اور آخرت میں تفکر کر سکو۔ اس آیت میں دنیا اور آخرت دونوں میں تفکر کی دعوت دی گئی ہے۔ خود دنیا ہی کچھ کم وسیع نہیں ہے۔ مگر آخرت تو دنیا کی وسعتوں سے بدرجہا وسیع تر ہے۔

**دعوت فکر کا نتیجہ:**



یہ غور و فکر کی دعوت کا نتیجہ تھا کہ آزاد نہ سوچ بچار کا آغاز ہوا، عقل نے نظر و تامل سے کام لیا۔ اور علم و فکر کے ماہرین پیدا ہونے لگے۔ عقائد، فلسفہ، فقہ، غرضیکہ، ہر علم و فن کے امام پیدا ہوئے، جنہوں نے بحث و تدریس اور اجتہاد سے علوم کو جلا بخشی۔ وہ غور و فکر میں پوری طرح آزاد اور خود مختار تھے۔ اس سلسلہ میں کسی قسم کی پابندی ان کے راستہ میں حائل نہ تھی۔ اس کے نتیجہ میں اس تہذیب نے جنم لیا، جس پر ہم مسلمانوں کو بجا طور پر فخر ہے۔ اور یہی یورپ کی ترقی اور تمدن کی بنیاد تھی، جس کا اعتراف خود یورپ کے دانشور کر رہے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر لیبری نے لکھا ہے۔

”اگر تاریخ کے سٹیج پر عربوں کا ظہور نہ ہوا ہوتا تو جدید یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں کئی صدیوں کی تاخیر ہو جاتی۔“

(۷۱)

## انسانی زندگی کی بے مقصدیت

انسانی زندگی کی بے مقصدیت میں کلیسا اور اہل مغرب کا بڑا کردار ہے۔ یورپ اور امریکہ میں کلیسا کی کثرت اور ان میں بے شمار مذہبی تہواروں اور جلسوں کے انعقاد ہوتے ہیں۔ پارٹیوں اور جلسوں کا نام مسیحی ہے۔ اہل مذہب بہت بڑی تعداد میں کتابیں اور مقالے لکھتے رہتے ہیں۔ وہ خالص اجتماعی، سیاسی، معاشی اور عملی زندگی پر مضامین نشر کیے جاتے ہیں۔

ان باتوں سے تصور یہ کیا گیا کہ اہل مذہب کا بڑا اثر ہے اور یہ لوگ اجتماعی زندگی میں بڑی حد تک اثر انداز ہیں۔ یہ ایک سطحی سا خیال ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ جب سے لوگوں نے کلیسا کو چھوڑ دیا۔ اجتماعی زندگی کلیسا سے کٹ گئی اور جب دور احیاء عصر روشن اور موضوعی مادہ فلسفہ نے لوگوں کو کلیسا سے متنفر بنا دیا۔ اس وقت سے کلیسا معاشرے اور لوگوں کے پیچھے کھینچا چلا آ رہا ہے۔ اب کلیسا کا یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ معاشرے اور لوگوں کو مذہب کی طرف مائل کرے۔ بلکہ اب مقصد یہ ہے کہ وہ کسی طرح عوام کی خوشنودی حاصل کرے۔

اب کلیساؤں میں عبادت کے بعد مخلوط مجلسیں منعقد ہوتی ہیں جن میں شراب پی جاتی ہے۔ رقص ہوتا ہے۔ تفریح طبع کے لئے کھیل ہوتے ہیں اور نشہ میں مست نوجوان جوڑے صبح تک بوس و کنار میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ سب کام کلیسا اسلئے کرتے ہیں تاکہ نوجوان کلیسا میں آ سکیں۔

چونکہ کلیسا لوگوں کے فطری جذبات کے بالمقابل مؤقف اختیار کر کے یہ تجربہ کر چکا ہے کہ عوام نے کس طرح کلیسائی نظام سے بغاوت کی اور اسے ترک کر دیا۔ اب کلیسا لوگوں کی خواہشات و میلانات کی مخالفت سے بچتا ہے کہ کہیں دوبارہ عوام کلیسائی نظام کو پکھل ڈالیں اور اسے ترک کر دیں۔

یورپ نے دوبارہ قدیم روما کی زندگی اختیار کر لی۔ قدیم روما میں کاہن خداوند اور دیوتاؤں کی شان میں ترانے گاتے اور ان کے نام پر تفریحی میلے لگتے۔ مگر خداوندان روما کا عملی زندگی میں کوئی دخل نہیں تھا اور نہ انہیں یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ لذت و لطف پر کوئی قدغن لگائیں۔

لوگوں کے مطابق یورپ کی زندگی میں کلیسا کا نہ کوئی دخل ہے یا وہاں پر مذہب کا کوئی قابل احترام وجود ہے۔ ان حضرات کا خیال یہ ہے کہ کلیسا کی لچک اور اسکی ثقافت کی بنا پر اسے معاشرے میں نفوذ کا موقع ملا ہے اور دور احیائے عصر روشن اور مادیت کے بعد بھی مسیحیت کو اپنا وجود برقرار رکھنے کی ضمانت مل گئی۔ حقیقت میں یہ خیال ایک وہم ہے۔ واقعہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ (۷۲)

لیوپولڈ فالس انگریز مسلمان ہوا۔ نام محمد اسدر رکھا یہ شخص اپنی کتاب ”اسلام دورا ہے پر“ میں تحریر کرتا ہے۔ ”جدید مغرب کے ہر پہلو پر مادی منفعت اور توسیع پسندی کا تصور غالب ہے۔ اہل مغرب کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ زندگی کے خزانے دریافت کیے جائیں اور انہیں کام میں لایا جائے مگر وہ زندگی میں کسی اخلاقی قدر کے اضافے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ زندگی کے معنی اور اس کے مقاصد ایک مغربی کی نظر میں عرصہ دراز سے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔“ آج کی مغربی زندگی کا معبود روحانی نہیں ہے بلکہ ”رفاہیت“ ہے اور آج کا فلسفہ، فلسفہ طاقت و قوت ہے۔ اور یہ دونوں باتیں قدیم رومی تمدن کی میراث ہیں۔“ (۷۳)

## تعلیمی شعبہ میں بے مقصدیت

سائنسی تحقیق کے باوجود علم ناقص ہے۔ فی الحقیقت ہم بڑی گھمبیر جہالت میں مبتلا ہیں۔ نوع انسان کا مطالعہ کرنے والوں کے سامنے جو عام سے سوالات آتے ہیں ان کا بھی کوئی جواب نہیں مل پاتا کیونکہ ہماری باطنی دنیا کے لاحدود پہلو ابھی تک نامعلوم ہیں۔ ہم ابھی تک اس قسم کے متعدد سوالوں کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔

مرکب اور وقتی خلیوں کے اعضاء بنانے والے کیمیائی مواد کے اجزاء کیونکر متحد ہوتے ہیں؟ ناقلات وراثت، حامل بیضہ میں اس بیضہ سے مشتق ہونے والے فرد کی صفات کو کیونکر جاگزیں کرتے ہیں؟ خلیے کس طرح خود بخود جمع ہو کر نیس اور اعضاء بن جاتے ہیں؟ کیونکہ خلیوں کو بھی چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کی طرح پہلے سے معلوم ہے کہ انہیں کیا کردار ادا کرنا ہے۔ اور جسم بسیط اور پیچیدہ کی تشکیل کے پوشیدہ میکانیکی عمل میں کس طرح مدد دیتا ہے۔

نفسیاتی اور فزیالوجی حیثیت سے ہمارا انکوینی مزاج کیا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہم نسوں، اعضاء، مانتعات اور شعور سے مرکب ہیں مگر شعور اور مخ کے درمیانی علاقے ابھی تک ناقابل فہم گتھیاں ہیں۔ ہمیں عصبی خلیوں کی فزیالوجی کے

بارے میں مکمل معلومات کی ضرورت ہے۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ارادہ کس حد تک جس پر اثر انداز ہوتا ہے؟ عقل اعضاء کی حالت سے کیونکر متاثر ہوتی ہے۔ عضوی اور عقلی خصوصیات جو ہر فرد کو وراثت میں ملتی ہیں۔ کس طرح زندگی کے طریقہ کار، کھانے اور آب و ہوا میں موجود کیمیائی اجزاء اور نفسیاتی اور ادبی نظام کے بدل جانے سے بدل جاتی ہیں۔

ہمیں اب تک یہ علم نہیں ہے کہ جسم انسانی عضلات اور اعضاء اور عقلی و روحانی اعمال میں تعلق کی ماہیت کیا ہے؟

ہمیں یہ بھی علم نہیں ہے کہ وہ کونسے عوامل ہیں۔ جو اعصابی توازن، تکان کے مقابلہ کی قوت اور امراض کے خلاف قوت دفاع پیدا کرتے ہیں۔

ہمیں نہیں معلوم کہ ادبی ذوق، قوت فیصلہ اور جرأت میں کیونکر اضافہ ہو سکتا ہے۔ عقلی، ادبی اور مذہبی اعمال میں نسبتی اہمیت کیا ہے۔

عمل کی کونسی شکل شعور اور خیالات کی ذمہ دار قرار دی جاسکتی ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ فزیالوجی اور عقلی عوامل ہی ہیں جو خوش بختی اور بد بختی اور کامیابی اور ناکامی کے اسباب بنتے ہیں۔ مگر ہمیں یہ معلوم نہیں کہ یہ عوامل کیا ہیں؟ ہمیں کسی شخص کو مصنوعی طریقہ پر قبولیت سعادت کی صلاحیت فراہم نہیں کر سکتے؟

ہمیں اب تک یہ علم نہیں ہے کہ کس قسم کے ماحول میں ایک متمدن اور ترقی پذیر انسان پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ کوشش اور جدوجہد کی روح کو پکچل دیا جائے اور ہر ایسی شے کو ختم کر دیا جائے جس سے ہم اپنی فزیالوجی اور روحانی ہیئت کی بنا پر تکلیف محسوس کرتے ہیں؟ کیا ہم تہذیب جدید میں انسان کے تنزل اور انحطاط کو روک سکتے ہیں؟ کتنے ہی سوالات ہیں جو نہایت اہمیت کے حامل موضوعات میں اٹھائے جاتے ہیں۔ اور جن کا کوئی جواب ابھی نہیں دیا جاسکا۔

غرض یہ بات واضح ہے کہ انسان سے متعلق سائنسدانوں کی جملہ تحقیقات قطعاً ناکافی ہیں۔ اور انسان کے بارے میں ہماری معلومات اب تک ابتدائی ہیں۔ (۷۴)

کسل مندانہ رجحانات

انسان دنیا کی ہر شے پر بلند ہے اگر خود انسان ہی زوال پذیر ہو جائے تو تہذیب کی ساری دلکشی اور مادی دنیا کی تمام تر عظمت چند لمحوں میں ختم ہو جائے۔ کاریل نے کہا۔

انسان وراثت اور ماحول کی پیداوار ہے۔ ٹیکنالوجی نے جو ماحول بنایا ہے۔ انسان اس میں اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کر سکا۔ اور اب یہ ماحول روبہ زوال ہے۔ موجودہ حالت کی ذمہ داری سائنس اور ٹیکنالوجی پر نہیں ہے۔ بلکہ خود ہم پر ہے کیونکہ ہم جائز اور ناجائز میں فرق نہیں کرتے۔ قوانین طبیعت کو توڑ کر ہم نے غلطی کی ہے ایسی غلطی جس کی سزا سے بچاؤ ممکن نہیں ہے۔ سائنس، مذہب اور صنعتی آداب حیاتیاتی حقیقت کے بالمقابل شکست کھا چکے ہیں۔ جب بھی کبھی انسان زندگی کے ممنوع علاقوں میں قدم رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ زندگی انسان کی قوتوں کو مضحک کر دیتی ہے۔ اسلئے موجودہ تہذیب زوال پذیر ہے۔ کیونکہ علوم جماد میں ممنوع علاقے میں لے گئے ہیں اور ہم ان کی رہنمائی پر بغیر دیکھے بھالے چلتے رہے چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ فرد، بدکار، کمزور اور غبی ہو گیا اور اسے اپنے نفس پر کوئی قدرت حاصل نہ رہی۔

”تہذیب جدید ایسے لوگوں کو پیدا کرنے سے عاجز ہے جو خیال عقلمندی اور شجاعت کی موہوبی صفات کے حامل ہوں۔ عام معاملات میں ذمہ دار لوگوں کا عقلی اور اخلاقی معیار ہر ملک میں گرتا جا رہا ہے۔

”جو لوگ اپنے اعمال میں احساس جمال کا ابتدائی شعور رکھتے ہیں وہ ان لوگوں سے بہتر ہیں جو صرف پیداوار کرتے ہیں کیونکہ پیداوار سے انہیں استعمال کی سہولت میسر آتی ہے۔ موجودہ صنعت نے کارکن کو ابتداء اور جمال کے احساس سے محروم کر دیا ہے۔“

”عطف، جمال اور مذہب کے ارتقاء رک جانے کی بنا پر ایسے کمینے لوگ ابھر آئے ہیں جو کج فہم اور مریضانہ ذہنیت کے حامل ہیں۔“ (۷۵)

## عدم رواداری و تشدد پسندانہ رجحانات

جدید معاشرہ اخلاقی احساس سے بالکل دستبردار ہو چکا ہے اور اس احساس کے مظاہر تک کو مٹا چکا ہے۔ کیونکہ ہم ذمہ داریوں سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ اب تو حالت یہ ہے کہ جو لوگ خیر و شر میں امتیاز رکھتے ہیں اور محتاط ہو کر کام کرتے ہیں وہ تنگ دست رہتے ہیں اور لوگ انہیں بڑی تنگ دلی اور افسوس سے دیکھتے ہیں۔

آج جو عورت اپنے آپ کو اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے وقف کر دے اور اپنا کچھ زیادہ خیال نہ رکھے اسے کمزور عقل تصور کیا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص اپنی بیوی اور بچوں کی تعلیم کے لئے کچھ سرمایہ رکھ دے تو یہ سرمایہ کسی نہ کسی بہانے

کاروباری سرمایہ دار یا حکومت اچک کر لے جائے گی۔ (۷۵)  
وحشیانہ مادیت نہ صرف یہ کہ عقلی ارتقاء کی راہ میں رکاوٹ ہے بلکہ نرم خو، شریف کمزور اور تنہا شخص کو کچل کر رکھ دیتی ہے۔ اور ایسے لوگوں کو ختم کر دیتی ہے جو ذوق جمال رکھتے ہیں اور جنہیں دولت کے علاوہ کچھ اور اشیاء کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ (۷۶)

جمال اور مذہب کا ارتقاء رک جانے کی بناء پر ایسے کینے لوگ ابھر آئے تھے جو کج فہم اور مریضانہ ذہنیت کے حامل تھے۔ باوجودیکہ عقلی تربیت ہر شخص کو میسر ہے مگر پھر بھی اس قسم کے لوگ ہر جگہ موجود ہیں۔ صنعت نے انسان کو اس عقلی عمل سے محروم کر دیا ہے جس سے انسان کے لئے اپنی پومیہ زندگی میں لطف اندوز ہونا ممکن تھا۔ تہذیب جدید کی یہ بدترین غلطی ہے کہ اس نے عقل کو مادہ کی قربان گاہ کی بھیئت چڑھا دیا۔ یہ ایسی ہولناک غلطی ہے جس کے خطرات روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔

جدید معاشرہ فرد سے ناواقف ہے۔ وہ اپنے حساب میں بنی نوع انسان کو شمار نہیں کرتا۔ وہ صرف کائناتی حقیقتوں پر ایمان رکھتا ہے۔ اور لوگوں سے اس کا تعامل بطور خلاصہ ہے۔ (۷۷)

## جہالت

انسان کے بارے میں جس گھمبیر جہالت کا تذکرہ ڈاکٹر الکسیس کاریل نے بیسویں صدی کے نصف میں کیا ہے۔ ظاہر ہے یہ جہالت اس صدی سے پہلے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہوگی کیونکہ اس وقت تک انسان کے بارے میں معرفت حاصل کرنے کے لئے اس قدر جدوجہد نہیں کی گئی تھی۔ بلکہ اس وقت تک انسان اور علوم انسان موضوع بحث ہی نہیں بنے تھے۔

انسان کے اپنے بارے میں اس جہالت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ سے متصل اور اس سے قریب ہے۔ اس سے مدد مانگتا رہے اور اس کے نازل کردہ علم و حکمت پر مبنی طریقہ سے ہدایت پائے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ مادی دنیا میں اپنی عقل و علم اور مادی صنعتوں میں اپنی مہارت سے فریب نہ کھائے۔ خواہ اس کی صلاحیتیں کتنی ہی کیوں نہ بڑھ جائیں۔ اور وہ اپنے بارے میں یہ سمجھنے لگے کہ اس نے اس میدان میں معجزے دکھائے ہیں۔ یہ فریب انسان کو مجبور کر دے گا کہ انسان مادی دنیا اپنے تجربات کو عالم حیات اور خاص طور پر انسانی زندگی پر منطبق کرے۔ اور اللہ کے طریقے سے ہٹ کر اور دشمنی کر کے اپنے لئے خود ضابطہ حیات متعین کرے۔

کلیسا اور سائندانوں کے درمیان تلخ ترین واقعات کی بنا پر اہل یورپ مذہب کے سائے سے بھی بھاگتے

ہیں۔

## جہالت کے نتائج و اثرات :-

حقیقت انسان کے بارے میں ہماری جہالت اور اس حقیقت کے تمام پہلوؤں کے عدم ادراک کا بالکل طبعی نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کا کوئی مضبوط، مکمل اور صالح نظام بنانے سے قاصر ہیں۔ اور اگر ہم اللہ کی ہدایت سے ہٹ کر کوئی نظام بنا بھی لیں تو وہ یقیناً انسانی زندگی کو اور خود انسان کو ہلاکت اور تباہی میں مبتلا کر دے گا۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔ مگر ہم اس کو محسوس واقع اور عملی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ فرض کر لیجئے اگر ہم قوانین مادہ سے بھی اسی طرح ناواقف ہوتے۔ جس طرح ہم قوانین زندگی اور خاص طور پر انسانی زندگی سے ناواقف ہیں پھر ہم مادہ کو کلی یا جزئی طور پر کام میں لاتے۔ تو نتیجہ یہ ہوتا کہ مادہ ضائع ہو جاتا۔ بالکل یہی صورت انسانی زندگی میں پیش آئی ہے۔

مگر عام مادہ کا ضیاع اور تباہی ایسی نہیں ہے کہ اس کے اثرات دور نہ کیے جاسکیں اور اس میں عنصر انسانی اور حیات انسانی جیسی قیمتی اور انمول اشیاء ضائع نہیں ہوتی۔ نہ اس کے نتائج وہ کچھ ہوتے ہیں جو انسان معاملات کو اللہ سے دور رہ کر حل کرنے سے ہوئے ہیں (جبکہ اللہ تعالیٰ انسان کی حقیقت سے واقف اس کی زندگی میں حکمراں نواہیں کا جاننے والا اور انسان اور کائنات کے روابط سے باخبر ہے) نہ اس میں اس قدر گمراہی، شقاوت، حیرت اور قلق، تباہی اور فساد برپا ہوتا ہے اور نہ بالآخر اس بد بختی کا انجام بالکل تباہی کے خطرے کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

یہ بدترین مظاہر جو تمام انسانی زندگی پر چھائے ہوئے ہیں اپنے دامن میں عظیم قربانیاں ہولناک قتل سرکش انقلابات اور ایسی بد بختی لیے ہوئے ہیں جس نے کائنات کے قیمتی عنصر انسان کو تباہ کر دیا ہے۔ (۷۷)

## فصل سوم:

# معاشرتی مسائل

## 1- خاندانی مسائل:

خاندان وہ عالمگیر ادارہ ہے جسے تمام معاشروں میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ شوہر اور بیوی اور بچوں کے باہمی مل جل کر رہنے سے خاندان کی تشکیل ہوتی ہے۔ ایسے قریبی رشتہ دار جو ایک ہی مکان میں رہ کر

خورد و نوش میں شرکت کرتے ہوں۔ خاندان کہلاتا ہے۔ (۷۸)

## خاندان کی اہمیت

خاندان ہی اصل میں انسان تمدن کی جڑ اور انسان سوسائٹی کا اولین اور بنیادی ادارہ ہے اور پھر متعدد خاندان ہی کسی ایک مقام پر سکونت اختیار کر کے انسانی معاشرہ اور تہذیب و تمدن کی تشکیل کرتے ہیں۔ خاندان کی بنیاد ایک مرد اور ایک عورت سے پڑتی ہے۔

اسی ملاپ سے ایک نئی نسل وجود میں آتی ہے پھر اس سے دوسرے رشتوں، کنبوں اور برادیوں کے تعلقات استوار ہوتے ہیں اور بالآخر یہی سلسلہ پھیلتے پھیلتے ایک وسیع معاشرہ یا ملک بن جاتا ہے۔

خاندان ہی وہ ادارہ ہے جس میں ایک نسل اپنی بعد میں آنے والی نسل کو انسانی تمدن کی وسیع تر خدمات سرانجام دینے کے لئے نہایت محبت ایثار، دلسوزی اور خیر خواہی کے ساتھ تیار کرتی ہے۔ یہی خاندانی ادارہ تمدن انسان کی بقاء اور نشوونما کے لئے نئے نئے افراد تیار کرتا ہے۔ اور اس کے کارکن دل سے اس بات کے خواہشمند ہوتے ہیں کہ ان کی موت کے بعد ان کی جگہ لینے والے زیادہ بہتر صلاحیتوں کے مالک ہوں۔ اس لئے انسان کے معاشرتی مسائل میں اسلام سب سے پہلے اس امر کی طرف توجہ کرتا ہے کہ خاندانی ادارے کو صحیح بنیادوں پر قائم کیا جائے۔

انسان کی یہ خاندانی زندگی عین منشاء فطرت بھی ہے۔ (۷۹)

## خاندان کی اصلاح کے بنیادی عوامل

ایک خاندان کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہے کہ اس کا ہر فرد اپنی ذاتی اور اجتماعی ذمہ داریوں کا احساس کرے۔ وہ ہر اچھے کام میں دوسروں سے تعاون کرے اور برے کام میں عدم تعاون کرے۔ خاندان کی دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ بچے کی اچھے ماحول میں تربیت کرے۔ تیسری ضرورت یہ ہے کہ خاندان کا ہر فرد اپنے اندر خود احتسابی کا شعور پیدا کرے۔

## خاندانی زندگی میں غلطیاں

خاندانی زندگی کی وہ عام غلطیاں جن میں عام لوگ ملوث ہیں۔ وہ درج ذیل ہیں۔

پہلی غلطی :-

مغربی ممالک کی سائنسی، ٹیکنیکی اور صنعتی ترقی کو دیکھتے ہوئے مشرقی ممالک میں بھی جدید تعلیم یافتہ خواتین اور مردوں کا ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے۔ جو ہر بات میں مغرب کی تقلید کرتا ہے۔ اس طرح سے بڑی خامیاں پیدا ہوتی ہیں۔ امریکہ میں ہر سال زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں ایک (ورلڈ المینک) شائع ہوتی ہے۔ جس میں مختلف اعداد و شمار ہوتے ہیں۔ اس کے مطابق..... ایک سال کی پہلی ششماہی میں (987000) شادیاں ہوئیں جن میں سے (538000) طلاقیں ہو گئیں اس طرح اس ملک میں ہر منٹ بعد طلاق ہوتی ہے۔ اہل فکر اس فکری مسئلہ میں پریشان ہیں۔

کنیڈا کا مشہور رسالہ (اسٹار وٹورنٹو) اس تشویش ناک حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔  
 ”پندرہ برس قبل کی کامیاب شادیاں اب خیال و خواب معلوم ہوتی ہیں جو جوڑے مہر و محبت کی زندگی بسر کر رہے ہیں وہ اب روز بروز اقلیت بنتے جا رہے ہیں۔“

روس، سوئیڈن، ڈنمارک اور جرمنی جیسے ملکوں میں بھی خاندانی انار کی عام ہے۔ ہمارے ہاں کی نام نہاد ترقی پسند خواتین اور مرد ترقی کا راز اگر مغرب کی تقلید کو سمجھتے ہیں تو انہیں امریکہ کے نفسیاتی جریدہ (سیکالوجی ٹوڈے) کے یہ الفاظ یاد رکھنے چاہیں۔

”ہم نے متعدد جوڑوں کو دیکھا ہے اور ان میں سے ایک بھی فرد ایسا نہیں پایا جو علیحدگی کے بعد خوش رہا ہو۔“  
 جو لوگ مل کر رہنے کی صلاحیت سے عاری ہو جاتے ہیں۔ وہ پھر کسی کے ساتھ بھی مل کر نہیں رہ سکتے۔

## دوسری غلطی:-

دوسری غلطی شادی بیاہ پر غلط رسم و رواج ہیں۔ جو عام آدمی کی برداشت سے باہر ہیں۔

## جہیز کا مسئلہ:-

بی۔ بی۔ سی کی رپورٹ کے مطابق پچھلے سال ہندوستان کے صرف ایک شہر دہلی میں کم جہیز لانے والی (275) عورتوں کو زندہ جلایا گیا جن میں سے (90) عورتیں جاں بحق ہو گئیں۔ لوگوں نے شادیوں میں جہیز کو اپنی آمدنی کا ذریعہ بنالیا ہے۔ جبکہ شادی تو دو خاندانوں کے آپس میں پیار و محبت کے رشتہ میں منسلک ہونے کا ذریعہ ہے۔

## تیسری غلطی:-

شادیوں میں دیکھا دیکھی بڑی بڑی باراتوں اور کھانوں کا بندوبست محض مصنوعی تعلقات کا لوگوں پر اظہار کرنا



ہے کہ دیکھوان کے کتنے تعلقات ہیں۔ فضول خرچی کا بازار دونوں طرف سے گرم ہوتا ہے۔

خاندانوں کی اصلاح اور بگاڑ میں اس قسم کے رسم و رواج کا چونکہ بڑا دخل ہوتا ہے۔ اس لئے ہمیں اپنے حالات کی اصلاح کرنی چاہیے۔ (۸۰)

## گروہی تعصبات (لسانی۔ علاقائی۔ نسلی۔ مذہبی)

اجتماعی زندگی انسان کی ضرورت بھی ہے اور فطرتاً بھی وہ اجتماعیت پسند واقع ہوا ہے۔ کچھ عوامل اس قسم کے ہیں جو اس کو اپنے ہم جنسوں سے تعلق رکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان میں ایک بڑا عامل انسانوں کا آپس میں ایک دوسرے کے لئے کشش کا ہوتا ہے۔ اور دوسرا باہمی تعاون کی ضرورت ہے۔ پہلے عامل سے مراد یہ ہے کہ انسان ایک دوسرے سے اُلس رکھتے ہیں۔ اور ہم نشینی میں فرحت اور علیحدگی میں وحشت محسوس کرتے ہیں۔

تعاون کی ضرورت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی ذاتی اور انفرادی قوتیں تو محدود ہیں لیکن اس کی زندگی کی ضروریات حد درجہ وسیع ہیں۔ ان ضروریات کو ذاتی بل بوتے پر کسی صورت بھی پورا نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی تکمیل کے لئے دوسرے انسانوں کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس انسان ہم نشینی کے جذبہ کی وجہ سے دیگر انسانوں کی طرف کھینچتا بھی ہے اور اپنی ضرورت کی تکمیل کے لئے ان کا محتاج بھی ہے۔ (۸۱)

علامہ ابن خلدون کہتے ہیں۔

”افراد انسانی کا اکٹھے ملکر رہنا سہنا ایک ناگزیر بات ہے۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جسے اہل علم و دانش اس طرح

بیان کرتے ہیں۔ کہ انسان پیدائشی طور پر مدنیۃ الطبع واقع ہوا ہے۔ (۸۲)

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ اجتماعی زندگی کی تعمیر و تشکیل کیسے ہوتی ہے۔ تو اس سلسلہ میں دنیا میں جو تصورات پائے جاتے ہیں۔ ان میں قدیم تصور قبائلیت کا ہے۔ اور جدید تر تصور قومیت یا نیشنلزم کا! عناصر ترکیبی کے لحاظ سے البتہ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ قبائلیت یا قومیت کا قیام کسی ایک یا چند ایسی اقدار پر ہوتا ہے جو ایک قوم کے افراد میں مشترک ہوں۔ مثلاً وطنیت، علاقائیت یا نسلیت کا جذبہ اور زبان کا مشترک ہونا۔ (۸۳) مگر انہی قومیتوں نے نسل انسانی کو گروہوں میں تقسیم کر رکھا۔ یہ گروہی تعصبات چار ہیں۔

### 1۔ لسانی گروہ:-

صنعتی انقلاب کے بعد یورپ کو جب ایک مضبوط مرکزی حکومت کے قیام کی ضرورت کا شدت سے احساس ہوا تو قوم پرستی کے جذبات نے جنم لیا۔ لیکن اس تصور کے پس پرہ دوسری اقوام کا استحصال مقصود تھا۔ اسی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے یورپی اقوام نے ایشیا اور افریقہ میں ظلم و تشدد کا بازار گرم کیا۔ قوم پرستی کی اساس اجاگر کر کے لسانی تعصبات کو ابھارا گیا۔ اسی بنا پر سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ کرایا گیا۔ (۸۴)

قومیت کا تصور کوئی عقلی بنیاد نہیں رکھتا۔ مثلاً زبان کے اشتراک کو لے لیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ جو لوگ ایک زبان بولتے ہیں وہ باہمی تبادلہ خیال کے زیادہ مواقع رکھتے ہیں اور اپنے آپ کو ایک دوسرے کے قریب محسوس کرتے ہیں۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ اظہار خیال کا ذریعہ مشترک ہونے کی بنا پر خود خیال بھی مشترک ہو۔ لہذا وحدت و خیال جو قومی وحدت کا ایک مضبوط ذریعہ ہے۔ اشتراک زبان کا محتاج نہیں۔ (۸۵)

## 2۔ علاقائی:-

سامراجی قوتوں نے عرب کے باشندوں کو علاقائی اور وطنیت کے تعصب کی بنا پر ابھارا۔ جس کے نتیجہ میں خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا۔ ترکوں کو حجاز چھوڑنا پڑا۔ (۸۶) قومیت کا تصور اپنے عناصر ترکیبی کے اعتبار سے کوئی عقلی بنیاد نہیں رکھتا مثلاً علاقائیت اور وطنیت کو لیا جائے تو انسان جس جگہ پیدا ہوتا ہے، اس کا رقبہ یقیناً ایک مربع گز سے زیادہ نہیں ہوتا لیکن جائے پیدائش کے ناطے کوئی اس چھوٹے سے رقبہ کو اپنا وطن نہیں کہتا بلکہ اس کے گرد میلوں دور تک ایک سرحدی خط کھینچ کر کہتا ہے کہ وہاں تک میرا وطن ہے۔ ظاہر ہے یہ نظر کی تنگی ہے ورنہ جس دلیل کی بنا پر ایک مربع گز کا وطن پھیل کر ہزاروں لاکھوں مربع گز بن سکتا ہے اس دلیل کی بنا پر پھیل کر پورا کرہ ارضی بھی بن سکتا ہے۔ (۸۷)

## 3۔ نسلی گروہ:-

اجتماعی زندگی کے لیے شہنشاہیت اور بادشاہت ضروری ہونے کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر سیاسی غلبہ نسلی اور قومی تعصب کا مرہون منت ہوتا ہے۔ نسلی غیرت و حمیت کو جوش دلا کر تعصب کی آگ بھڑکائی گئی تھی ایک انسان دوسرے انسان کے خلاف صف آرا ہو سکا۔

نسل و خون کے رشتے بنی آدم میں ایک ایسا رابطہ و اتحاد قائم کرتے ہیں جو تعصب کے جذبات میں ایک نئی روح ڈال دیتے ہیں۔ انسان چاہے کتنا ہی معتدل مزاج کیوں نہ ہو اگر اپنے باپ، بھائی، بیٹے یا کسی ایسے ہی ہم نسب رشتہ دار کا خون دیکھ لے تو وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں پاسکتا۔ والہانہ طور پر اس کے خون میں ایک ولولہ اور جوش پیدا ہونا فطری

بات ہے۔ (۸۸) ہندو مذہب میں برہمن، شودر، چھتری، دلش، نسلی طبقات میں منقسم ہے۔ اسی طرح عیسائیت میں بھی رنگ و نسل کا امتیاز ہے کہ یہ سیاہ فام ہیں۔ اور یہ سفید فام۔ نسل انسانی آجکل اس عصبیت کا شکار ہے۔ (۸۹)

#### 4۔ مذہبی گروہ:-

مذہبی اداروں کی ثقافتی قوتیں جن سے معاشرتی ضبط قائم تھا اب کمزور پڑ گئی ہیں۔ جب سے لوگوں میں مذہبی عقائد اور اس پر سے ایمان کمزور پڑ گیا ہے۔ جرائم میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا ہے۔ جو لوگ مذہبی عقائد پر پورا عمل کرتے ہیں وہ جرم کا ارتکاب ہرگز نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ مذہبی روایات قانونی زندگی گزارنے میں نہایت معاون ہیں۔ (۹۰)

مذہبی تفرقہ ختم کرنے کی صورت تبھی ممکن ہے کہ ایک قسم کا نظریہ حیات اور فلسفہ زندگی رکھنے والے افراد، اپنی منفرد ہیئت اجتماعیہ متشکل کرنے کا فیصلہ اور عزم کریں۔ (۹۱) قوم پرست قوتوں نے آج بھی اپنی حکومتوں میں مذہبی قوتوں پر ظلم و ستم روا رکھا ہوا ہے۔ جیسے عیسائیت میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقے برسرِ پیکار ہیں۔ اسی طرح اسلام میں شیعہ، سنی وغیرہ آپس میں لڑ رہے ہیں۔

مذہب عالم کی تاریخ میں اسلام کے علاوہ نصرانیت، یہودیت، ویدک و ہنوم، بدھ مت زرتشتی مذہب بڑے مذہب شمار ہوتے ہیں جن کی پشت پر اپنی ایک مستقل تاریخ ہے۔ (۹۲)

### ذہنی دباؤ

موجودہ زمانہ کے تمام انسانی مسائل براہ راست یا بالواسطہ طور پر صرف ایک چیز کی بنا پر ذہنی دباؤ کا باعث ہیں۔ اور وہ ہے ”خدا اور انسان کے درمیان جدائی“ دورِ جدید نے انسان کو مادی ساز و سامان تو بہت دیا مگر اسکے خدا کو اس سے چھین لیا۔ اس طرح اس نے جدید انسان کے جسم کے لئے خوراک کا انتظام کیا اور ”روح“ کو فاقہ کی حالت میں چھوڑ دیا۔ روح کو اگر جسم سے کامل طور پر جدا کر دیں تو جسم کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اور اگر ایسا کریں کہ ”روح“ کی جو غذا ہے وہ اسے دینا بند کر دیں تو روح فاقہ کی حالت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ روح کے فاقہ سے روح پر وہ سب کچھ گزرنے لگتا ہے جو جسم کے فاقہ سے جسم پر گزرتا ہے۔ اسی کی طرف قرآن نے ارشاد فرمایا۔

”الا بذكر الله تطمئن القلوب“

یہی بات حضرت عیسیٰؑ نے فرمائی۔ ”آدمی صرف روٹی ہی سے جتنا نہ رہے گا بلکہ ہر بات سے جو خدا کے منہ

سے نکلتی ہے۔“

اگرچہ تمام مذاہب اصلاً خدا ہی کے مبلغ تھے مگر بعد کے زمانہ میں وہ خدا کے تصور کو اپنی صحیح صورت میں محفوظ نہ رکھ سکے۔ کسی نے خدا کو اپنا قومی خدا بنا لیا کسی نے اس میں شرک کی ملاوٹ کر دی۔ کسی نے خدا کو حجر و فلسفیانہ تخیل بنا کر رکھ دیا۔ اس طرح یہ مذاہب اس قابل نہ رہے کہ خدا کو اسکی واقعی حیثیت میں لوگوں کے سامنے پیش کر سکیں۔

## روحانی فاقہ

جدید تہذیب نے انسان کو خدا سے محروم کر کے اسکو روحانی فاقہ میں مبتلا کر دیا ہے۔ اسی روحانی فاقہ کا نتیجہ ہے کہ موجودہ جاپان کے نوجوان، صنعتی ترقی کی انتہا پر پہنچ کر یہ کہنے لگے ہیں کہ ”ہمارا کلچر ایک مرچنٹ کلچر ہے“ اور صرف مرچنٹ کلچر انسان کے لیے کافی نہیں۔ مغربی سوسائٹی کا وہ مظہر جس کو یہی ازم کہتے ہیں وہ بھی اسی فاقہ زدگی کا شکار ہے۔ ایک ہی نوجوان دہلی کی سڑک پر پیدل چل رہا تھا۔ اسکے جسم پر نہایت معمولی ہندوستانی لباس تھا۔ اور گلے میں ڈھول، کینیڈا کا باشی تھا۔ ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا کہ کینیڈا میں ہر طرح مالا مال تھا۔ یہاں پر بے گھر ہوں۔ جہاں پر مجھے نیند آتی ہے سو جاتا ہوں۔ سواری، روزگار، بیوی بچے یہاں پر نہیں ہیں۔ یہاں آپ کو جب اتنی تکلیف ہے تو کینیڈا چھوڑ کر یہاں کیوں آئے۔ مغربی نوجوان نے جواب دیا۔ وہاں میں جسمانی طور پر مطمئن تھا۔ مگر یہاں روحانی طور پر مطمئن ہوں۔

**There I was comfortable physically, here I am comfortable spiritually**

جدید تہذیب نے انسان کو جسمانی عیش کا سامان تو دیا مگر روحانی تسکین کا سامان دینے سے قاصر رہی۔ جدید مشینی تہذیب کا یہی وہ تضاد ہے جس نے وہ تمام مظاہر پیدا کئے جن کو موجودہ زمانے میں ہی ازم، بورڈم از مسیٹ وغیرہ کہا جاتا ہے۔ جس کو ”پیس آف مائنڈ“ **Peace of Mind** کا کھونا کہتے ہیں۔ مشہور ماہر نفسیات

کاؤل جگ کہتے ہیں۔ (1875-1961)

پچھلے تیس برسوں میں روئے زمیں کے تمام متمدن ملکوں کے لوگوں نے مجھ سے اپنے نفسیاتی امراض کے سلسلے میں مشورے حاصل کرنے کے لیے رجوع کیا ہے۔ میرے مریضوں میں زندگی کے نصف آخر میں پہنچنے والے تمام لوگ جو کہ 23 سال کے بعد کی جاسکتی ہے۔ کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس کا مسئلہ اپنے آخری تجربہ میں زندگی کا مذہبی نقطہ نظر پانے کے سوا کچھ اور ہو۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان میں سے ہر شخص کی بیماری یہ تھی کہ اس نے وہ چیز کھودی تھی جو کہ

موجودہ مذاہب ہر دور میں اپنے پیروؤں کو دیتے رہے ہیں۔ اور ان مریضوں میں سے کوئی بھی حقیقتاً اس وقت تک شفا یاب نہیں ہو سکا جب تک اس نے اپنا مذہبی تصور دوبارہ نہیں پایا۔ (۹۳)

Quoted by C.A Coulson, Science and Christian Belief. P-110

## فصل چہارم

### معاشی مسائل

#### 1۔ مادیت:-

تہذیب الحاد کا دوسرا عنصر ترکیبی مادیت (Materialism) ہے اسے مختصر الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں مادہ کے سوا کوئی چیز نہیں حتیٰ کہ انسان میں بھی صرف برقیہ اور سالمیہ ہی کی کرشمہ سازی ہے اسے دنیا میں اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو وہ صرف مادی احتیاجات کی تسکین ہے اس نقطہ تک پہنچنے کے لیے کافی مدت صرف ہوئی۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد کچھ مدت تک مادی زندگی اور مسیحی اعمال و رسوم کو جمع کرنے کی کوشش کی جاتی رہی مذہب کی پیروی سے وہ پوری طرح آزاد ہونا نہیں چاہتے تھے اور اسی بات کے آرزو مند تھے کہ وہ کسی نہ کسی طرح کم از کم زندگی کے معاملات میں مذہبی رسوم کی ضرور پابندی کریں ان کا خیال تھا کہ اس سے قوم کے افراد کے درمیان ربط قائم رہ سکے گا اور اس طرح ملک اجتماعی انتشار اور اخلاقی ابتری سے محفوظ رہے گا لیکن مادی تہذیب کا ریلہ اتنا تیز تھا کہ اس کے سامنے مذہب اس کمزور حیثیت میں کھڑا نہ رہ سکا اور وقت کے دھارے کی نذر ہو کر رہ گیا اور اسکی جگہ مادہ پرستی نے لے لی۔ مصنفین، اہل قلم اور اہل دماغ گروہوں نے اپنی جادو بیانی، سحر طرازی اور زور خطابت سے قدیم مذہبی رسوم و قیود کے خلاف ملک میں ایک عام بغاوت برپا کر دی۔ انہوں نے دنیا پرستی کو نہایت طفریب بنا کر پیش کیا جو چیز اس کی راہ میں حائل ہوئی اس کے خلاف غیظ و غضب کا جذبہ بھڑکایا اور اس طرح طبیعتوں کو ہر قسم کی قید و بند سے آزاد کر دیا۔ انہیں زندگی سے بھرپور تمتع، مطالبات نفس کی بے عنان تکمیل اور لذت پرستی کی علانیہ دعوت دی۔ حرص و ہوس کی اس زندگی کی اہمیت جتانے میں بڑے غلو سے کام لیا گیا۔ نقد لذت اور ظاہری اور محسوس مادی نفع کے سوا ہر چیز کا ابطال کیا گیا حقیقت یہ ہے کہ یورپ کا موجودہ مذہب صرف مادہ پرستی ہے اس کے متعلق ایک مفکر نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

”اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یورپ میں اس وقت بھی ایسے اشخاص پائے جاتے ہیں جو دینی طریقہ پر سوچتے ہیں اور مذہبی احساس رکھتے ہیں اور اپنے عقائد کو اپنی تہذیب کی روح کے ساتھ منطبق کرنے میں امکانی کوشش بھی کرتے ہیں مگر یہ مستثنیٰ مثالیں ہیں یورپ کا عام اور متوسط آدمی خواہ وہ جمہوریت پر ایمان رکھتا ہو، یا فاشزم پر، سرمایہ دار ہو یا اشتراکی جسمانی مشقت کرنے والا ہو یا دماغی محنت کرنے والا ہو وہ ایک ہی مذہب رکھتا ہے اور وہ مادی ترقی کی پرستش ہے اور اس کی غایت حیات صرف یہی ہے کہ وہ زندگی کو زیادہ سے زیادہ آسان پر راحت، اور عام محاذ رے کے مطابق قدرت سے آزاد بنا سکے اس مذہب کے معابد بڑے بڑے کارخانے، کیمیاوی دارالصنعت، ناچ گھر اور بجلی کے مراکز ہیں۔ اس مذہب کے پیشوا بنکیوں کے افسر، انجینئر، اداکار، بڑی بڑی صنعتوں کے ناظمین اور ریکارڈ قائم کرنے والے ہوا باز ہیں لذت اور طاقت کی اس ہوس اور چٹور پن کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ حریف گروہ سامان جنگ سے لیس اور جنگی تیاریوں سے مکمل تیار کھڑے ہیں۔ تاکہ جب کبھی ان کے مصالح میں تصادم ہو تو بغیر کسی تاخیر کے ایک دوسرے کو تباہ کر دیں اور جہاں تک تمدن کا تعلق ہے انسانوں کا ایک ایسا گروہ جنم لے چکا ہے جن کے نزدیک نیکی اور اخلاق کا اصل پیمانہ صرف ذاتی مفاد ہے اور ان کے ہاں بھلائی اور برائی کو جانچنے کا اصل معیار صرف مادی کامیابی ہے۔

بہت ممکن ہے کہ اس بیان کو زیادہ وقعت نہ دی جائے کیونکہ ان خیالات کا پیش کرنے والا اسلامی افکار سے متاثر ہے اس لیے ہم ذیل میں چند دوسرے مفکرین کی آراء پیش کرتے ہیں۔ ان سے اس رجحان کا صحیح اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ پروفیسر جوڈ کہتے ہیں۔

”صدیوں سے انگلستان کے تخیل پر دولت اندوزی کا اصول غالب ہے حصول دولت کی خواہش پچھلے دو سو سال سے دیگر محرکات عمل سے زیادہ بڑھ کر کارفرما رہی ہے کیونکہ دولت حصول ملکیت کا ذریعہ ہے اور ذاتی ملکیت کی بہتات اور عظمت و شان سے انسان کی قابلیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے سیاسیات، ادب، سینما، ریڈیو اور کبھی کبھی گرجاؤں کے منبروں سے سال بسال سامعین کو یہی تعلیم دی جاتی رہی ہے کہ مہذب قوم وہی ہے جس میں تملیکی جذبہ انتہائی ترقی کر چکا ہو۔“ (۹۴)

لن یوٹانگ (Linyutong) ایک چینی مفکر نے دور جدید کی مادہ پرستی کا نقشہ اپنی کتاب ”اشک و تبسم کے درمیان“ *Between Tears and Laughter* میں ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

”اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ معاشی طرز فکر نے تمام دوسرے افکار پر غلبہ پالیا ہے اور اس زمانہ میں معاشی معاملات دوسرے تمام معاملات کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہیں ہم اس وقت معاشیات کے لگائے ہوئے چرکوں پر

معاشیات ہی کا مرہم لگانے کے علاوہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتے ہماری زندگی کا سب سے بڑا مقصد ایک اچھا کاروبار ہے۔ اسکے ساتھ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نفع اندوزی اور حصول قوت کا یہ نصب العین آئندہ جنگ کا اہم ترین محرک ہے۔ ہمارا دور ایک ایسا دور ہے جس میں اخلاقی اور روحانی قدروں کا بالکل دیوالہ نکل چکا ہے ہمارے افکار پر مادیت پرستی کا غلبہ ہے۔

یہی مصنف ایک دوسری جگہ لکھتا ہے۔

”ہمارے افکار کا تانا بانا مادیت ہی سے بُنا گیا ہے۔ ہمارے ذہنوں میں جنت کا تخیل بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ یہ ایک ایسا گودام ہے جس میں مال ہی مال بھرا ہوا ہے۔ اس وقت پوری دنیا ایک کاروبار ہے۔ سیاسی کاروبار یا معاشی کاروبار۔ ایک قوم، ایک کارخانہ اور ایک حکومت وہ میز ہے جس پر لین دین کیا جاتا ہے اور اس کے سیاستدان ان کارخانہ کے سیلز مین ہیں، جو ہر وقت اس ٹوہ میں رہتے ہیں کہ اپنے مال کو دوسری منڈیوں میں اوروں کی نسبت زیادہ فروخت کریں۔ (۹۵)

اس مادیت پرستی کا یہ اثر ہے کہ اس زمانے میں انسان صرف حصول زر اور جلب منفعت کے لیے زندہ ہے اس سے زیادہ کچھ بھی سوچنے کے لئے تیار نہیں ہوتا پروفیسر جوڈ نے بالکل سچ کہا تھا۔

”جو نظریہ حیات اس زمانہ پر مستولی اور غالب ہے وہ اقتصادی نظریہ ہے دوسرے لفظوں میں ہر مسئلے کو پیٹ یا جیب کے نقطہ نظر سے دیکھنا اور جانچنا۔“

زر پرستی کے اس جنون نے سب سے زیادہ نقصان اخلاقی قدروں کو پہنچایا ہے چونکہ اب سب سے بڑا مقصد صرف دولت ہی حاصل کرنا ہے اس لیے اس کا حصول سب سے بڑی نیکی ہے۔ دور جدید کی کتاب اخلاق میں بھلائی وہ ہے جس سے مادی فوائد و لذائذ حاصل ہوں اور برائی نام ہے ان طریقوں کا جن سے ان میں کمی آتی ہو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اخلاق کی وہ معروضی قدریں جو انسانیت کے مختلف گروہوں اور طبقوں میں کسی نہ کسی حد تک توازن قائم رکھتی تھیں۔ مٹ چکی ہیں اور ان کی جگہ مصلحت پرستی نے لے لی ہے اور یہی مصلحت پرستی اس عہد کا سب سے خطرناک فتنہ ہے۔

الیکس کریل (Alexis Carrel) نے اپنی کتاب ”انسان نامعلوم“ میں کہا ہے۔

”ہماری تہذیب کی یہ مادی پرستی نہ صرف فکر انسانی کی صحیح پرواز میں حائل ہوئی ہے بلکہ اس نے غور و فکر کو بھی ختم کر دیا ہے۔ اس نے شریف انسانوں، کمزوروں اور بے سہارا لوگوں اور ایسے تمام انسانوں کو جو دولت کے علاوہ کوئی اور

”مح زندگی رکھتے ہوں، نیست و نابود کر دیا ہے۔“

خدا بیزار فلسفہ زندگی کے مفاسد کا احساس، بعد از خرابی بسیار، اب یورپ کے مختلف مکاتب فکر میں تیزی سے پیدا ہو رہا ہے۔ مشہور اخبار نویس (Louis Fisher) نے اپنی کتاب ”عظیم تحدی“ (The Great Challenge) میں اسی حقیقت کا اظہار کیا ہے۔

”عہد جدید کے فتنہ کی اصل جڑ یہی ہے کہ انسان کے پیش نظر کوئی اصول نہیں، بلکہ فوری نفع ہے۔ اس لیے وہ ظلم و عدوان کے ہاتھوں بک گیا ہے سیاسی میدانوں میں وقتی مصالح اور حب الوطنی ایسے اٹل اصولوں سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ عوام کی غایت حیات اپنے اعتقادات پر کار بند ہونا نہیں بلکہ ان کا منہائے مقصود صرف اپنی حکومتوں کی پیروی کرنا ہے اور تباہی اور بربادی کی اصل وجہ یہی ہے۔“

اخلاقی قدریں آج کل مقیاس الحرات کے پارہ کی سی حیثیت رکھتی ہیں جو واقعات کے ساتھ ساتھ ہر لحاظ بدلتی رہتی ہیں۔ وہ کوئی آخری، حتمی اور قطعی معیار نہیں جن کے مطابق انسان اپنے اعمال و افکار کو جانچ سکے ان کی اہمیت آج کل صرف اسی قدر ہے کہ وہ ہر قول اور ہر فعل کے لئے خواہ وہ کتنے ہی ذلیل مقاصد کیلئے کہا اور کیا جائے وجہ جواز فراہم کریں۔ انسان جو ذلیل سے ذلیل کام کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ اخلاقیات کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اس کی راہ میں کھڑے ہو کر اسے خوش آمدید کہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم پروفیسر ساروکن (Sorokin) کی کتاب (The Crisis of our age) میں سے چند اقتباسات بھی پیش کر دیں:

”موجودہ نظام کے حسی اخلاقیات نے انسان کو کافی حد تک ذلیل کر دیا ہے اخلاقی قدریں بالکل مٹ گئی ہیں۔ ان کی حیثیت آج اس کے سوا کچھ نہیں کہ اگر ان سے کسی کو کوئی فائدہ پہنچے تو ان کو قبول کیا جاسکتا ہے اور اگر وہ اس راہ میں مزاحم ہوں تو ان کو بلا تکلف ترک کر دیا جاتا ہے۔ انسان نے آج مصلحت پسندی کو اپنا شعار بنالیا ہے اور اس طرح انہوں نے دنیا میں مستقل کشمکش اور عناد کے بیج بو دیے ہیں جب ہمارے اخلاقی معیار ہی باہم متضاد ہوں تو اخلاقی قدریں بھی لامحالہ دفن ہو کر رہ جائیں گی ان حالات میں انسانوں پر سے ان کی گرفت کا ڈھیلا پڑ جانا بالکل فطری ہے مسیحیت کے اصول ”الفت“ کی جگہ اب ”نفرت“ نے لے لی ہے۔ یہاں فرد اور فرد کے درمیان منافرت ہے اور ایک گروہ دوسرے گروہ سے برسر پیکار ہے قومیں قوموں کے خلاف، ریاستیں ریاستوں کے خلاف اور نسلیں نسلوں کے خلاف صف آراء ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ”جس کی لاٹھی اس کی بھینس“ ایسے مذموم اصول کی پوری دنیا پر فرماں روائی ہے۔“

”اس وقت شاید ہی کوئی اخلاقی قدر ایسی ہو، جو اشتراکی اور سرمایہ دار، ہٹلر کے پیرو اور یہودی، انگریزی اتحاد



اور جرمین اتحاد دیکھو لوگ اور دہریے۔ امراء اور غرباء کے درمیان مشترک ہو۔ اخلاقی معیار ایک دوسرے سے متصادم ہیں ایک گروہ کے نزدیک جو کچھ بھلائی ہے وہی دوسرے کے خیال میں برائی ہے اور سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہستی فلسفہ کے ہاں کوئی ایسا پیمانہ نہیں جو سب کے لئے قابل قبول ہو۔ لہذا ہم ایک دوسرے سے برسر پیکار افراد کا ایک ایسا گروہ ہیں جن کے پاس عدل و انصاف کی کوئی ترازو نہیں، اس کا نتیجہ اخلاقی انارکی کے سوانہ کچھ ہو سکتا تھا اور نہ فی الواقع ہے ہر شخص خود اپنا قانون ساز ہے اور ہر کوئی اپنے پیش کردہ معیار کو ہی صحیح تسلیم کرتا ہے۔“

یہی مصنف موجود جنگ و جدال کی وجوہ کا تجزیہ کرتا ہوا ایک دوسری جگہ لکھتا ہے۔

”چونکہ جسمانی مسرت، افادیت اور حسی لذت ہر فرد اور گروہ کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے اس لئے ہر ایک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس طرح چاہے اور جہاں تک چاہے ان کو حاصل کرنے کی سعی کرے۔ حسی خواہشات کی کوئی حد نہیں ہوتی اس لئے ان کی تسکین کسی طرح بھی ممکن نہیں جہاں جسمانی لذت کے چند لوازم فراہم کرنے کے لیے ان گنت لوگ بیتاب ہوں وہاں ان کا کمیاب ہو جانا ناگزیر ہے اور ان کی کمیابی ہی عہد حاضر کی جنگ و جدال کا سب سے بڑا سبب ہے ان حالات میں یہ ضروری ہے کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ یہ جنگ و جدال زیادہ شدید صورت اختیار کر لے۔“ (۹۶)

یہ ہے مغربی تہذیب کے اثمار میں سے ایک ثمر جس کی تلخی کا خود اہل مغرب کو بھی اب شدید احساس ہو رہا ہے۔

## تحریک مادیت کے اثرات:-

معاشی مسئلہ کے حل کی ایک صورت اشتراکیت نے تجویز کی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ پیدائش دولت کے وسائل افراد کی ملکیت سے نکال کر جماعتی ملکیت بنا دیے جائیں۔ اور ضروریات زندگی کو افراد پر تقسیم کرنے کا انتظام بھی جماعت ہی کے سپرد ہو۔ بظاہر یہ حل معقول نظر آتا ہے مگر اس کے عملی پہلوؤں پر آپ جس قدر غور کریں گے اُسی قدر آپ پر اس کے نقائص کھلتے چلے جائیں گے۔ یہاں تک کہ آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ آخر کار اس کے نتائج بھی اتنے ہی خراب ہیں جتنے اس بیماری کے ہیں جس کا علاج کرنے کے لئے اسے اختیار کیا گیا ہے۔

یہ بالکل ایک واضح بات ہے کہ وسائل پیدائش سے کام لینے اور پیداوار کو تقسیم کرنے کا انتظام خواہ نظری طور پر (Theoratically) پوری جماعت کے حوالے کر دیا جائے۔ مگر عملاً یہ کام ایک مختصر سی ہیئت انتظامیہ (Executive) ہی کے سپرد کرنا ہوگا۔ یہ مختصر گروہ ابتداء جماعت ہی کا منتخب کردہ سہی، لیکن جب تمام ذرائع معاش

اس کے قبضہ میں ہوں گے۔ اور اسی کے ہاتھوں سے لوگوں تک پہنچ سکیں گے تو تمام آبادی اُس کی مٹھی میں بے بس ہو جائے گی۔

اس کی رضا کے خلاف ملک میں کوئی دم نہ مار سکے گا۔ اس کے مقابلے میں کوئی ایسی منظم طاقت ابھر ہی نہ سکے گی جو اس کو منصب اقتدار سے ہٹا سکے اس کی نظر کسی سے پھر جانے کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ قصور وار بندہ اس سر زمین میں زندگی بسر کرنے کے تمام وسائل سے محروم ہو جائے، کیونکہ سارے وسائل پر اس مختصر گروہ کا تسلط ہوگا۔

مزدور میں اتنا یار نہ ہوگا کہ اس کے انتظام سے ناراض ہو تو اسرائیل کمر دے۔ کیونکہ وہاں بہت سے کارخانہ دار نہ ہوں گے کہ ایک کے در سے اٹھے تو دوسرے کے دروازے پر چلا جائے بلکہ سارے ملک میں ایک ہی کارخانہ دار ہوگا اور وہی حکمران بھی ہوگا۔ اور اس کے خلاف کسی رائے عام کی ہمدردی بھی حاصل نہ کی جاسکے گی۔

اسی طرح یہ صورت جس نتیجہ پر جا کر ختم ہوگی وہ یہ ہے کہ تمام سرمایہ داروں کو کھا کر ایک بڑا سرمایہ دار، تمام کارخانہ داروں اور زمینداروں کو کھا کر ایک بڑا کارخانہ دار اور زمیندار لوگوں پر مسلط ہو جائے اور وہی بیک وقت زار اور قیصر بھی ہو۔ (۹۷)

## کمیونزم اور سوشلزم کے مہلک اثرات

طلوع اسلام سے قبل سرزمین عرب میں یہودیوں کا طوطی بولتا تھا۔ اپنی بدکرداریوں اور بد اعمالیوں کے باوجود انہیں یقین تھا کہ نبی آخر الزمان بنی اسرائیل سے پیدا ہوگا لیکن جس روز حضور نبی کریم بنی اسماعیل سے پیدا ہوئے اور بنی اسرائیل سے اعزاز نبوت چھن گیا اس روز اس نے خدائے بزرگ و برتر کے خلاف شیطان کی طرح اسلام دشمنی کا عہد کر لیا۔ اور دنیا میں خدا بیزاری اور اسلام دشمنی کی مختلف النوع تحریکیں چلا کر مسلمانوں کو صراطِ مستقیم سے منحرف کرنے میں کوشاں ہیں۔

اشتراکی اور سوشلسٹ نظام میں خدا دشمنی اور اسلام دشمنی کی نشر و اشاعت کے لئے وہی طریقہ کار اپنایا گیا جو شیطان مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لئے اختیار کرتا ہے یعنی وہ جس طرح مونس و ہمدرد بن کر اور سبز باغ دکھلا دکھلا کر انسان کو گمراہ کرتا ہے کمیونسٹ اور سوشلسٹ بھی اسی طرح مذہب کا لبادہ اوڑھ کر کبھی ادب کی آڑ میں اور کبھی غربت کے جال میں بیٹھ کر اور کبھی قرآن کریم کا نام لے کر لوگوں کو اس چابکدستی سے فریب دیتے ہیں اور سوشلزم یا کمیونزم کی دلدل میں پھنساتے ہیں کہ بڑے بڑے عالم اور پیران پارساتک ان کے دامنِ تزویر میں پھنس جاتے ہیں۔

کمیونزم کا نظریہ دنیا کے سامنے سب سے پہلے مارکس نے پیش کیا جو مذہباً یہودی تھا۔ اس نظریہ کو سوشلزم کا

جامہ پہنانے والا لینن اور لینن کا جانشین بھی یہودی تھا۔ روس کا سربراہ برٹنیف بھی یہودی تھا۔ روس میں تمام مرکزی اور کلیدی عہدوں پر بھی یہودی فائز ہیں۔ یہودیوں کا عالم گیر سازشی منصوبہ پراٹوکول کے نام سے مشہور ہے جس کے مطابق یہودی ہر وقت اور ہر جگہ تخریب کاری میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ منصوبہ روس میں تیار ہوا جو ایک یہودی مملکت اور سوشلزم کی مرکزی تجربہ گاہ ہے اور جہاں تقریباً چھ سو سال سے دنیا میں سوشلزم پھیلانے اور اسلام کو مٹانے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ ان کوششوں کے باوجود اسلام روس میں بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے جس کی تصدیق خود سوویت یونین کے شائع کردہ اعداد و شمار سے ہوتی ہے جو ۲۴ نومبر ۱۹۸۷ء کو لندن ٹائمز میں نقل ہوئے۔ (۹۸) ان کی رو سے انڈونیشیا، پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے بعد سوویت یونین، دنیا کی پانچویں بڑی مسلم طاقت ہے۔ سوویت روس کی ۱۴ کروڑ کی آبادی میں ساڑھے چار کروڑ سے پانچ کروڑ تک مسلمان آباد ہیں۔ اور مسلمانوں کی شرح پیدائش اتنی زیادہ ہے کہ اس صدی کے آخر تک ۱۵ کروڑ روسیوں کے مقابلہ میں وہاں کم از کم ۱۰ کروڑ مسلمان ہوں گے۔

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

اسی لئے اب روس میں سب سے زیادہ تعداد میں قرآن کریم چھپ رہے ہیں بلکہ ۱۹۷۹ء میں روس کے آمر برٹنیف نے تخفیف اسلحہ کانفرنس کے اختتام پر امریکی صدر کارٹر کو یہ کہہ کر خدا کا بھی اعتراف کر لیا کہ ”اگر اس منصوبہ کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچایا گیا تو پھر خدا ہمیں معاف نہیں کرے گا“ اسے کہتے ہیں جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ روسی خلاء باز خلاء کے چکر کاٹنے کے باوجود خدا کو تلاش نہ کر سکے اور روسی آمر خود خدا کا واسطہ دے رہا تھا۔ برٹنیف کے منہ سے خدا کا نام سن کر کارٹر ششدر رہ گیا جو لوگ آج کمیونزم اور سوشلزم کے گیت گاتے اور اس کا خواب دیکھتے ہیں وہ دراصل یہودی طائفہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ یہودیوں کا ایمان روپیہ پیسہ ہے اس لئے انہوں نے دنیا کی دولت اور وسائل پر قبضہ کرنے کے لئے سوشلسٹ نظام حکومت رائج کیا تاکہ کوئی نجی یا ذاتی حیثیت میں امیر کبیر یا دولت مند یا سرمایہ دار نہ رہے بلکہ مملکت کی ساری دولت اور اس کے وسائل پیداوار ”قومی ملکیت“ میں لے کر حکومت کے قبضہ میں دے دیئے جائیں اور ارباب اقتدار خدا بن کر رعایا سے اپنی مرضی کے مطابق کام لیں اور اس کے بدلے اسے روٹی کپڑا مکان دے۔ عوام ایک غلام اور قیدی کی طرح کام کریں۔ اپنے خداؤں یا آدمروں کے خلاف لب کشائی نہ کریں۔ جیسا کہ روس میں ہو رہا ہے وہاں آزادی رائے اور آزادی فکر ایک سنگین اور ناقابل معافی ہے۔ حکمران طبقہ ملک کی ساری

دولت سمیٹ کر خود عالی شان کوٹھیوں، بنگلوں اور محلوں میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا ہے اور عوام سارا دن قیدیوں کی طرح کھیتوں اور کارخانوں میں کام کر کے اپنے حکام کے لئے دولت پیدا کرتے ہیں اور خود جھوپڑیوں میں رہتے ہیں۔ سوشلسٹ دنیا کو مساوات کا درس دیتے ہیں مگر خود مساوات کے قریب نہیں جاتے۔ امیر حکام اور غریب عوام آج بھی روس اور دیگر سوشلسٹ ممالک میں موجود ہیں۔ وہاں بچوں کو پیدا ہوتے ہی والدین سے جدا کر دیا جاتا ہے پھر انہیں لادینی تعلیم و تربیت کے لئے کمیونزم کی سرکاری درسگاہوں میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں انہیں خدا شنسی اور اسلام پیزی کے سبق پڑھائے جاتے ہیں جو نہ صرف والدین کی محبت اور شفقت سے محروم رہتے ہیں بلکہ اکثر کو بڑا ہونے کے بعد بھی یہ پتا نہیں ہوتا کہ وہ کن کی اولاد ہیں یا کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں یا ان کے والدین کہاں رہتے ہیں؟ انہیں جوان ہوتے ہی قیدیوں کی طرح کھیتوں اور کارخانوں میں بھیج دیا جاتا ہے یہ نسل نو سوشلزم کی پیداوار ہوتی ہے۔ روس کے علاوہ دیگر سوشلسٹ ممالک میں بھی قریباً قریب یہی طریق کار رائج ہے۔

ہمارے ہاں بھی سرخ جنت کے شیدائی ہر شعبہ زندگی میں ملتے ہیں ان کے لئے وہ ارباب علم و دانش نوشتہ دیوار کی حیثیت رکھتے ہیں جو اس جنت سے فرار ہو کر آزاد دنیا میں پناہ لے رہے ہیں۔ روسی سائنسدان، اکیڈمی کے ممتاز رکن اور لینن کے حفاظتی دستہ کے گارڈ کا مرید آرنوشت کولمین کمیونسٹ پارٹی طور و طریق اور وہاں کے جبر و تشدد سے تنگ آ کر روس سے فرار ہو کر سویڈن میں پناہ گزین ہوئے اور اپنا پارٹی کارڈ روسی آمر سٹر لیونڈ برٹنیف کو واپس کرتے ہوئے روسی جنت سے نکلنے کی بابت ایک طویل خط بھی لکھا جس میں دوسرے امور کے علاوہ یہ بھی تحریر کیا کہ:

”سوویت یونین میں جو سوشلزم لایا گیا ہے اسے صحیح معنوں میں اصل سوشلزم سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے جہاں روس کے عوام کا خون پہلے بڑے بڑے سرمایہ دار اور زمیندار چوس رہے تھے وہاں اب ان کا خون بڑے بڑے عہدیدار چوس رہے ہیں انہوں نے تمول اور دولت کے سمندر حاصل کر لئے اور خود ان میں غرق ہو گئے ہیں۔ ایسے افراد عوام سے بالکل الگ تھلگ ہیں اور وہ عوام کے مسائل اور پریشانیوں سے قطعاً بے خبر ہیں“

”روس میں جمہوری حکومت کا عشر و عشر تک نہیں اور صرف ان امیدواروں کو ووٹ دے کر کامیاب بنایا جاتا ہے جن کی اوپر سے نشان دہی کی گئی ہو روس میں کسی طرح کی سیاسی آزادی نہیں ہے ہر قسم کی ہڑتالیں ممنوع ہیں اور ضروری تنظیمیں بھی حکومت کی مٹھی میں ہیں سیاسی بحث مباحثہ کی اجازت نہیں۔ اخباروں اور تحریروں اور تصنیفات پر سخت سنسر شپ عائد ہے نشریات میں شروع سے لے کر اخیر تک جھوٹ سے کام لیا جاتا ہے روس میں انسانی حقوق کی کمیوری طرح پامال کیا جاتا ہے جو افراد حکمران طبقہ سے اختلاف رکھتے ہیں اور اس کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں انہیں

نظر بندوں کے کیمپوں یا جیلوں میں ساری عمر سڑنا پڑتا ہے یا انہیں دماغی مریض قرار دے کر نفسیاتی امراض کے ہسپتالوں میں بھیج دیا جاتا ہے بعض افراد کو اس لئے اذیت ناک سزائیں دی جاتی ہیں کہ وہ مذہبی عقائد رکھتے ہیں۔“

سوویت روس بنے ساٹھ سال گزر چکے ہیں مگر دانشوروں کو کسی طرح کی آزادی حاصل نہیں ہے حتیٰ کہ فنکاروں کو بھی تخلیقی عمل کی آزادی نہیں ہے۔ (۹۹)

”انسان کو سب سے زیادہ جس نعمت کی ضرورت ہے وہ آزادی تحریر و تقریر ہے اسے اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق آزادانہ اظہار خیال کر سکنے کی آزادی نہیں۔ اسے یہ حق حاصل ہونا چاہئے اور وہ جہاں چاہے اور جب چاہے جاسکے کی آزادی رکھتا ہو مگر ہم سٹالن کے دور کی طرح مجبور بدستور اور محکوم چلے آ رہے ہیں ہم سنسرشپ کے خوف سے اپنے خطوط میں بھی اپنے دل کی بات نہیں لکھ سکتے ہم دوستوں سے بھی ڈرتے ہیں اور الگ تھلگ رہتے ہیں“

کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ والدین سے ان کے بچے تک چھین لئے جائیں اور اپنے کنبے کو دوسرے کنبے کے ساتھ اپنی مرضی کے مطابق نہ رہنے دیا جائے؟ اگر کسی اور کنبے کے افراد سے ملنا ہو تو اجازت حاصل کی جائے ہم ایسی فضا میں کب تک رہ سکیں گے۔“

یہ خط امریکی جریدہ ٹائمز ۱۹۷۷ء میں اور اس کی تلخیص و ترجمہ ماہ مئی ۱۹۷۷ء کے پاکستان کے اردو جرائد میں شائع ہوا۔ سوشلسٹوں نے جس ملک میں قدم رکھا وہاں اپنے متذکرہ بالا نظام کو جاری کر کے تاریخ عالم میں ثابت کر دیا کہ جہاں ہمارا قدم شریف وہاں نہ فصل ربیع نہ خریف۔ آخ سرخ سرخ جنت کے خواب دیکھ رہے ہیں اور پاکستان میں۔ کی خواہش اور کوشش کے مطابق تخریب کارانہ ذرائع سے پاکستان کو سرخ دیکھنا چاہتے ہیں انہیں کیوبا کا حشر دیکھ لینا چاہئے۔ فائیڈل کاسترو نے وہاں سوشلزم کی بنیادیں استوار کرتے ہی سب سے پہلے خائف کائنات اور مذہبی عقائد کو بیک جنبش قلم بدر کر دیا۔ وہاں کے روح رواں کیتھولک چرچوں کو تالے لگوا دیئے ”خدا کی تلاش“ کو بیکار شغل قرار دیا۔ ”مساوات اور سوشلزم“ کی قیود و حدود نے وہاں عوام کی زندگی بے کیف اور اجیرن بنا دی۔ رہائش، خوراک اور اولاد کی پرورش کی بنیادی سہولتوں سے انہیں محروم کر دیا گیا۔ کیونکہ ان کا اہتمام اب تمام تر سوشلسٹ حکومت کے ہاتھ میں ہے جس نے وہاں یہ حالات پیدا کر رکھے ہیں۔

- ۱۔ رہائش کے لئے ہمہ قسم عوام کو فلیٹ مہیا کیے جاتے ہیں مگر فلیٹ کے حصول کے لئے وہاں عمر دوام درکار ہے درخواست گزاروں کو اعصاب شکن انتظار کئی کئی برس کرنی پڑتی ہے تب جا کر ایک مختصر سافلیٹ دستیاب ہوتا ہے۔
- ۲۔ بجلی اور پانی کی سہولت شاذ ہی نظر آتی ہے اگر کبھی آ بھی جائے تو کسی قسم کی خرابی کے لئے پھر درخواست دینی

پڑتی ہے اور متعلقہ محکمہ باری آنے پر مرمت کرتا ہے کیونکہ وہاں مرمت کی پرائیویٹ سہولتوں کا کوئی تصور ہی نہیں۔ جو کچھ ہے سرخ سرکار کا ہے اور سرکاری کام سرکاری اوقات میں باری آنے پر ہوتے ہیں جس سے عوام اور ملازم سب دوچار ہیں اور ہمہ وقت گریہ دزاری کرتے رہتے ہیں۔

۳۔ روٹی کا مسئلہ جس کے لئے محنت مشقت کی جاتی ہے اس عقل محدود میں سامنے کے لئے تیار نہیں۔ روٹی، گوشت، ترکاری، گروسری وغیرہ ہر چیز کا راشن کارڈ علیحدہ ہے آپ ایک تنکا بھی اپنی مرضی سے نہیں خرید سکتے۔ دفاتر، گرجوں، کارخانوں سے شفٹ ختم کرنے کے بعد لاتنا ہی طویل قطاروں میں قطار در قطار جنرل اسٹوروں ہوٹلوں اور اشیائے خورد و نوش کی دکانوں کے سامنے لوگ کھڑے ہوتے ہیں کئی کئی گھنٹوں کے بعد باری آتی ہے تب کچھ پلے پڑتا ہے راشن لینے کے بعد پھر وہ کہیں جانے کے نہیں رہتے۔

۴۔ مستورات کو سرخی پاؤڈر اور خوشبو کے بغیر ہی بسر اوقات کرنی پڑتی ہے یہاں تک کہ زیر جامہ کو بھی فضول خرچی میں شمار کیا جاتا ہے۔ جس کی قیمت اس قدر ہوتی ہے کہ کوئی اس کے خریدنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

۵۔ سوشلزم میں صرف ایک آزادی ہے کہ مرد اور عورت کے غیر ازدواجی اختلاط یعنی گزر بسر پر کوئی پابندی نہیں جس کی وجہ سے حرامی بچے بکثرت پیدا ہو رہے ہیں جن کی پرورش حکومت خود کرتی ہے جہاں طبعی اور اخلاقی قدریں بھی پروان نہیں چڑھ سکتیں۔

۶۔ وہاں شادیوں کا تصور ختم کر دیا گیا ہے۔ کنبہ داری کا وجود ہی نہیں ہے تاکہ یہ اہل مل بیٹھ کر کچھ سوچ ہی نہ سکیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حرامی بچے پیدا ہو کر شتر بے مہار بننے لگے۔ جس پر حکومت کو شادی کی رغبت دلانے کے لئے شادی کا راشن کارڈ جاری کرنا پڑا جس میں ہر شادی کرنے والی کو شب خوابی کا لباس، ہونٹوں کی سرخی، خوشبودار لواں اور لڑکے کو شب خوابی کا لباس، مزید ایک پتلون قمیض اور تولیہ دیا جاتا ہے۔ جس کی ہمارے ہاں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ مگر سوشلسٹ حکومت میں اسے نعمت غیر مترقبہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لالچ میں نوجوانوں نے شادیاں شروع کر دیں مگر ازدواجی زندگی کا وہاں کوئی تصور موجود نہ ہونے کی وجہ سے جلد جلد طلاقیں ہونی شروع ہو گئیں۔ جس پر کاستر و حکومت نے راشن پر یہ پابندی لگا دی کہ کم از کم ازدواجی زندگی کا وقفہ چھ ماہ کی مدت سے کم ہوا تو شادی کرنے والے راشن کے حق دار نہ ہوں گے۔

چونکہ روس کے اندرونی حالات باہر کی دنیا تک پہنچانے پر پابندی ہے اور باہر کے لوگوں کو روس ایسے سوشلسٹ ممالک کے اندر جانے اور چلنے پھرنے کی آزادی نہیں ہے اس لئے بیرونی دنیا کے کمیونسٹ اور سوشلسٹ ان کے نعروں

پر خوش ہو کر اپنا دین و بیان گنوار ہے ہیں اپنی آخرت تباہ کر رہے ہیں اور پاکستان میں تخریب کاری کے ذریعہ اپنے اور اپنی اولاد کا مستقبل تاریک بنا رہے ہیں۔ (۱۰۰)

## جنسی آزادی:

اشتراکی دنیا میں بالعموم اور سوشلزم کی مرکزی تجربہ گاہ روس میں بالخصوص صرف جنسی آزادی عام ہے جو دوسرے ممالک میں کمیاب ہے کیونکہ کامریڈ لینن نے کہا تھا کہ:

”ہر وہ چیز اخلاقاً جائز ہے جو قدیم اجتماعی نظم کو مٹانے اور محنت کش عوام کو ایک کرنے کے لئے ضروری ہے“

اسی لئے سوویت روس میں حکومت نے جنسی زندگی کی کھلی اجازت دے دی ہے۔ ایک مرد اور عورت اپنی خوشی سے جتنی مدت چاہیں آزادانہ زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ نہ رائے عامہ ان کی راہ میں رکاوٹ ہے نہ حکومت ان پر معترض ہوتی ہے نامور بالشویک اینٹون نیمی اوف اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

”معاشرہ کے اونچے طبقہ سے لے کر نچلے طبقہ تک سب پر چھایا ہوا ہے“

جب وہاں اس آزادی پر ضابطہ تعزیرات کے مرتبین نے بھائی اور بہن کے ازدواجی تعلق کو خلاف قانون قرار دینے کے متعلق مختلف ماہرین طب و نفسیات سے مشورے طلب کئے تو انہوں نے متفقہ طور پر فیصلہ دیا کہ:

”تاریخی نسلی اور طبقاتی لحاظ سے بھائی بہن کا ازدواج نہ ہی صحت عامہ کے لئے ضرر رساں ہے اور نہ آئندہ نسلوں کے لئے نقصان دہ ہے“

اس قسم کے ازدواج روسی قانونی تعزیرات میں کوئی جرم نہیں ہے اسی طرح مرد اور مرد کے مابین ہم جنسی عرصہ دراز سے سوویت روس کی قانونی گرفت سے آزاد کردی گئی ہے جنسی انار کی پھیلانے میں وہاں کی مخلوط درس گاہوں کا بھی برابر کا حصہ ہے۔ معروف اشتراکی مصنف پیٹ سلو اپنی ایک ممتاز تصنیف میں لکھتا ہے کہ:

”یونیورسٹیوں اور اسکولوں میں مرد اور عورتیں یکجا تعلیم پاتے ہیں لڑکے اور لڑکیاں ایک ہی ہوٹل میں ایک ہی کمرہ میں یکجا رہتے ہیں یونیورسٹیوں اور کالجوں میں دونوں صنفیں پوری آزادی سے ایک دوسرے سے ملتی ان پر کوئی نگران نہیں ہوتے۔ کوئی سرپرست اور اتالیقی نہیں ہوتے۔ آزادی سے ہر موقع محل پر وہ ایک دوسرے کے کمرہ میں آتے جاتے ہیں اکٹھے پڑھتے ہیں، چائے اڑاتے ہیں دوستی گانٹھتے ہیں۔ محبت اور آزاد جنسی ملاپ کرتے ہیں اگر کسی ساتھی طالب علم کی نوازشوں سے یا کسی باہر والے کی مہربانی سے کسی لڑکی کا بچہ پیدا ہو گیا تو طلباء اور فیکلٹی اسے درست نظر سے دیکھتی ہے ان کی نظر میں اس نے کوئی اخلاقی گناہ نہیں کیا“

ہمارا ہوس پرست طبقہ اسی جنسی آزادی کی خاطر اشتراکیت اور سوشلزم کا شیدائی ہے اور پاکستان کو سرخ دیکھنا چاہتا ہے کراچی کی آگ ان ہی کی لگائی ہوئی بیان ہوتی ہے۔ (۱۰۱)

## 2- خود غرضانہ رجحانات

نظام معیشت کی خرابی کا نقطہ آغاز خود غرضی کا حد اعتدال سے بڑھ جانا ہے پھر دوسرے رذائل اخلاق اور ایک فاسد نظام سیاست کی مدد سے یہ چیز بڑھتی اور پھیلتی ہے۔ یہاں تک کہ پورے معاشی نظام کو خراب کر کے زندگی کے باقی شعبوں میں بھی اپنا زہریلا اثر پھیلا دیتی ہے۔ شخصی ملکیت اور بعض انسانوں کا بعض کی بہ نسبت بہتر معاشی حالت میں ہونا یہ دونوں عین فطرت کے مقتضیات تھے اور بجائے خود ان میں کوئی خرابی نہ تھی اگر انسان کی تمام اخلاقی صفات کو توازن کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملتا اور خارج میں بھی ایک ایسا نظام سیاست موجود ہوتا جو زور و قوت کے ساتھ عدل قائم رکھتا تو ان سے کوئی خرابی پیدا نہ ہو سکتی تھی لیکن جس چیز نے انہیں خرابیوں کی پیدائش کا ذریعہ بنا دیا وہ یہ تھی کہ جو لوگ فطری اسباب سے بہتر معاشی حیثیت رکھتے تھے وہ خود غرضی، تنگ نظری، بداندیشی، بخل، حرص، بددیانتی اور نفس پرستی میں مبتلا ہو گئے۔ شیطان نے انہیں یہ سمجھایا کہ تمہاری اصلی ضرورت سے زائد جو وسائل معیشت تمہیں ملتے ہیں اور جن پر تمہیں حقوق مالکانہ حاصل ہیں۔ ان کے صحیح و معقول مصرف دو ہیں۔

ایک یہ کہ ان کو اپنی آسائش، آرائش، لطف، تفریح اور خوش باشی میں صرف کرو۔ دوسرے یہ کہ ان کو مزید وسائل معیشت پر قبضہ کرنے کے لئے استعمال کرو اور بن پڑے تو انہی کے ذریعے سے انسانوں کے خدا اور ان کا داتا بھی بن جاؤ۔ (۱۰۲)

## (۳) غربت اور اس کے اسباب

(افراط زر، ارتکاز دولت، بے روزگاری، کسل مندی)

### 1- افراط زر:-

غربت کے اسباب میں سے پہلا سبب افراط زر ہے۔ اسی نے دنیا کی معیشت کا بیڑا غرق کیا ہے۔ اس کے خاتمے پر معیشت پر اچھا اثر پڑے گا۔

سونامی، چاندی، پیدائش کے اعتبار سے نقد ہیں۔ اس لئے ان کو نقد اصلی یا نقد حقیقی کہتے ہیں۔ سکھ رائج الوقت



نقد عرفی ہے۔ یہ نقد اصلی کی جگہ نقد عارضی ہے۔ نقد اصلی کی نقدیت کو کوئی طاقت منسوخ نہیں کر سکتی مگر نقد عارضی کو جب چاہیں منسوخ کر سکتے ہیں۔ منسوخ ہونے کے بعد نقد عارضی کی قیمت گر جاتی ہے بلکہ ختم ہی ہو جاتی ہے۔ تو جب نقد عارضی نقد اصلی کی جگہ ہے تو سکے رائج الوقت یا نوٹ اتنا ہی چھاپنا چاہیے جتنا نقد اصلی ہمارے پاس ہے۔ کیونکہ یہ روپیہ وغیرہ تو سونے اور چاندی کی وجہ سے اس کی نسبت سے شمن اصطلاحی ہے تو سونا اور چاندی منسوب الیہ ہوئے۔ اور روپیہ یا سکے رائج الوقت منسوب تو روپیہ یا سکے رائج الوقت مقابلہ ہوا جائے گا۔ بلا نسبت رہ جائے گا اور وہی معیشت کی بد حالی کا باعث بنے گا اور بن رہا ہے۔ (۱۰۳) لہذا افراط زر سے بچنا چاہیے ورنہ معیشت کسی بھی ملک کی خراب ہو سکتی ہے۔

## 2۔ ارتکاز دولت :-

غربت کے اسباب میں سے دوسرا سبب ارتکاز دولت ہے۔ ارتکاز کے لغوی معنی ہیں ایک جگہ اکٹھا ہونا۔ یعنی دولت کا ایک مرکز پر جمع ہونا۔ یہ خرابی سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہے کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ کی ملکیت سے ایک انسان ذرائع پیداوار دولت پر قابض ہو جاتا ہے۔ اور تمام دوسرے عوامل اس کے اجرتی غلام بن کر رہ جاتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں حکومت ارتکاز دولت کے معاملے میں بالکل بے بس ہوتی ہے۔ اس نظام کے ارتقاء کے نتیجہ میں دولت بتدریج سمٹ کر چند سرمایہ داروں کے ہاتھ آ گئی۔ اور غریب اور مزدور اپنی جائیداد اور دولت غرض سب کچھ سے محروم ہو گئے۔ اس سے سرمایہ داروں کو مزدور حاصل کرنے میں بڑی آسانی ہو گئی۔

## 3۔ بے روزگاری :-

غربت کے اسباب میں سے تیسرا سبب بے روزگاری ہے۔ اس کی وجہ بھی سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ جب کوئی نظام انسانی حق آسائش زندگی پر متجاوز ہونا شروع ہوتا ہے۔ تو اس کے لطن میں کئی فتنے پرورش پانے لگ جاتے ہیں۔ سرمایہ دار اپنے ہم جنس سے بدظن ہو کر اسکی تخریب کے درپے ہو جاتا ہے۔ چونکہ اسکی ساری پیداوار منڈی کے لئے ہوتی ہے۔ اور معاشی منصوبہ بندی کے فقدان کی وجہ سے اسکی مقدار پیداوار کو طلب و ضرورت سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا اور اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ رسد (supply) طلب (Demand) سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ اس سے منڈی کے بھاؤ گر جاتے ہیں۔ متوقع منافع میں کمی ہو جاتی ہے۔ اب اس کا علاج یہ ہے کہ کچھ کارخانے بند ہو جائیں۔ اسکے لئے کارخانہ داروں کے درمیان مقابلہ بلکہ مقاتلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور عیار سرمایہ دار اپنے حریفوں پر عرصہ حیات تنگ کر کے ان کو میدان عمل سے نکال دیتے ہیں۔ نتیجتاً ملک کے وسائل حیات پر چند سرمایہ دار قابض ہو جاتے ہیں۔ وہ پیدائش

دولت کے عمل کی زیادہ سے زیادہ اصلاح کرتے ہیں کہ مشینی ایجادات کو کام میں لاتے ہیں۔ اسکی زدغریب مزدور پر پڑتی ہے۔ کیونکہ ایک مشین کئی مزدوروں کو بے کار کر دیتی ہے۔ (۱۵۱)

#### 4۔ کسل مندی:-

غربت کے اسباب میں سے ایک سبب کسل مندی ہے۔ سرمایہ داری کے ارتقاء سے سرمایہ دار اور مزدور دونوں ہلاکت کی طرف گامزن ہوتے ہیں۔ جب حالات خراب ہوتے ہیں تو سرمایہ دار آپس میں اتحاد کر لیتے ہیں۔ اور ان کے اس ”تعاظم“ سے اجارہ داری معرض وجود میں آتی ہے۔ جس کے نتیجے میں مزید مزدوروں کا استحصال شروع ہو جاتا ہے۔ قوم کی ترقی رک جاتی ہے۔ اجارہ داروں کے آپس میں جب ٹھٹھن جاتی ہے۔ اگرچہ اس میدان میں حریفوں کی تعداد تو تھوڑی ہوتی ہے مگر ان کا مقابلہ بہت شدید ہوتا ہے۔ اور اس کے مہلک اثرات کی گیرائی بھی پہلے سے زیادہ ہوتی ہے۔ ان کی چٹقلش سے لاکھوں انسان مفلس و قلاش ہو جاتے ہیں اور ملک میں معاشی ابتری پھیل جاتی ہے۔ اس معاشی ابتری بے روزگاری اور بے کاری کی وجہ سے عوام الناس میں کسل مندی کے رجحانات پیدا ہوتے ہیں۔ اور پھر تہذیب، تمدن ہر دور کی ترقی رک جاتی ہے۔ اس طرح انسان ذلت و پست زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

### (۴) استحصالی رجحانات

ماہرین معاشیات بتاتے ہیں۔ کہ سرمایہ داری نظام جب سے اپنے ابتدائی ”دور خیر“ سے نکل کر اپنے موجودہ ”دور شر“ میں داخل ہوا ہے۔ قومی قرضوں پر اس کا انحصار بہت بڑھ گیا ہے۔ چنانچہ بینک قائم ہوئے اور انہوں نے اپنا مالی کاروبار اس طرح استوار کیا کہ وہ سود لے کر حکومتوں کو قرضے مہیا کرنے لگے۔ بینکوں کے کاروبار کی مالی اور فنی پیچیدگیوں میں پڑے بغیر ہم آپ کے سامنے جو حقیقت واضح کرنا چاہتے ہیں وہ صرف اتنی ہے کہ یہ قرضے اور بینکوں کا زیادہ تر کاروبار سود کی اساس پر چل رہا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی دوسری خرابی شدید کاروباری مسابقت ہے جس کے نتیجے میں چھوٹے چھوٹے کاروباری ادارے تباہ ہو جاتے ہیں۔ یا پھر متحد ہو کر وہ بڑے بڑے کاروباری ادارے قائم کر لیتے ہیں۔ تاکہ دوسرے اداروں سے مقابلہ کر سکیں۔ یہیں سے اجارہ داری (Monopoly) وجود میں آتی ہے۔ سرمایہ داری یوں استحصال بے جا اور نوآبادیاتی نظام کو جنم دیتی ہے۔

جس طرح صنعت میں معرکہ کارزار گرم ہوتا ہے اسی طرح بینک (Banks) بھی آپس میں برسرِ پیکار ہوتے ہیں۔ چھوٹے بینک ٹوٹ جاتے ہیں اور سرمایہ کاری کا کام سٹ کر چند بینکوں کے پاس آ جاتا ہے۔ ان بینکوں کے مالک سرمایہ دار ہی ہوتے ہیں۔ چونکہ تمام سرمایہ کا منبع بینک ہوتے ہیں اس واسطے عمل انضمام کے بعد جو بینک قائم ہوتے ہیں۔ وہ ملک کے اقتصاد پر مستولی ہوتے ہیں۔ کارخانے، منڈیاں اور مواد خام کے ذخائر سب ان کی گرفت میں ہوتے ہیں۔ وہ جس رنگ میں چاہتے ہیں معاشی مشینری کو چلاتے ہیں۔ ملک کی حکومت اور آئین ساز ادارے کے نمائندے ان کے سامنے سرنگوں رہتے ہیں۔ آئین سازی ان کی منشاء سے ہوتی ہے۔ نظام سرمایہ داری ترقی کرتے کرتے شہنشاہیت (Imperialism) کے مقام کو جا پہنچتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی استحصال کا دائرہ اتنا وسیع ہو جاتا ہے کہ تمام دنیا اس کی زد میں آ جاتی ہے۔ (۱۵۵)

استحصالی رجحانات کو دوام بخشنے کے لیے صنعتی انقلاب کے بعد مرکنتالزم (Mercantalism) کا نظریہ اس مقصد کے پیش نظر پیش کیا گیا تاکہ تاجر پیشہ افراد کے مفادات کو دوسرے ممالک میں موثر طور پر تحفظ فراہم کیا جائے۔ چنانچہ یورپ میں مضبوط مرکزی حکومتوں کے قیام کے ساتھ ہی سامراجی ممالک نے ایشیا اور افریقہ میں نئی کالونیاں بسانے کے کام کا آغاز کر دیا۔ یورپی غیر ملکی باشندوں نے تاجروں کے روپ میں سیاسی ریشہ دوانیاں کر کے ان ملکوں میں اپنی استبدادیت کے قیام کی راہیں ہموار کیں اور ہر قسم کے اخلاق کو بالائے طاق رکھ کر پسماندہ ممالک کی دولت سے خوب ہاتھ رنگے۔ جبکہ دوسری طرف مقامی لوگوں کو بنیادی حقوق سے بھی محروم رکھا۔ ان کی محنت کے بل بوتے پر اور مقامی وسائل کو بروئے کار لا کر سامراجیوں نے اپنے ملکوں کو صنعت و حرفت میں ترقی دی۔ تاہم اپنے ملکوں کے اندر بھی وسائل دولت پر قابض سرمایہ دار طبقات نے زبردست استحصالی نظام قائم کر رکھا تھا۔ چنانچہ لبرل ازم کے نام پر عدل و انصاف کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سرمایہ داروں نے محنت کش طبقات کو بری طرح دبائے رکھا۔

استحصالی نظام کو دوام دینے اور مراعات یافتہ طبقات کے ہاتھ مضبوط کرنے کیلئے اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں لبرل ازم نے ایک نیا روپ دھارا اور نظریہ انفرادیت Individualism کا سہارا لیا۔ اس نظریہ کے حامی مفکرین نے آزادی کا ایسا منفی تصور دیا جس کا عملی اور منطقی نتیجہ ”جس کی لاٹھی اس کی بھینس“ کے مترادف تھا۔ ایک مہذب اور عدل و انصاف پر قائم معاشرہ میں ایک غیر جانبدار مرکزی ادارہ یعنی حکومت لوگوں کے مابین عدل کے قیام کا ذمہ دار ہے۔ حکومت اپنے پورے وسائل اور قوت کو بروئے کار لا کر اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتی ہے تاکہ عدل

اجتماعی کے قیام کے تقاضے پورے ہو سکیں۔ لیکن نظریہ انفرادیت کی منطق عجیب تھی۔ اس کے حامی ریاست کو ایک ایسی لعنت قرار دیتے تھے جس کی مداخلت سے لوگوں کی آزادی کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ ”عدم مداخلت“ **Laissez Faire** کے اس اصول کی فکری آبیاری کے لئے اس نظریہ کے حامیوں نے معیشت، قانون اور سیاست کے شعبہ میں باقاعدہ کچھ نظریات متعارف کرائے۔ چنانچہ عدم مداخلت کے تصور کے جواز میں کلاسیکل معیشت دانوں ریکارڈ اور آدم سمٹھ نے بے قید معیشت کا ایسا تصور پیش کیا جس کے مطابق کھلے مقابلہ کی فضا کو معاشی ترقی کے لئے ناگزیر خیال کیا جانے لگا۔

ان کا موقف یہ تھا کہ ریاست اور اس کے قوانین اگر معاشی شعبہ میں مداخلت کریں گے تو اس سے کھلے مقابلہ کا ماحول قائم نہ رہے گا۔ نتیجہ معاشی ترقی بری طرح متاثر ہوگی۔ وہ اس بات کے حامی تھے کہ کھلے مقابلہ کی ایسی فضا میں محنت کاروں کے حقوق بھی محفوظ رہتے ہیں۔ اس منطق کی تائید میں انہوں نے قدر محنت **Labour Theory of Value** کا نظریہ اجاگر کیا جس کے مطابق یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اشیاء کی پیداوار کے عمل میں محنت اشیاء کی قدر و قیمت کا تعین کرتی ہے۔ لہذا سرمایہ دار محنت کا پورا پورا معاوضہ ادا کرتا ہے۔ دراصل حالیکہ یہ بات بنیادی طور پر غلط تھی کیونکہ انیسویں صدی کے آخر تک بے قید معیشت کے اس تصور نے ایک نہایت ظالمانہ معاشی لوٹ کھسوٹ کے نظام کو قائم رکھا۔ اس کے باعث دولت کا ارتکاز چند ہاتھوں میں ہوتا چلا گیا۔ اجارہ داریوں کے اس نظام میں عام محنت کار بنیادی ضروریات زندگی سے بھی محروم رہا۔ جان سٹورٹ مل جیسے لبرل ازم کے حامی بعض دانشوروں نے خود بھی اس گھناؤنی صورت حال کو شدت سے محسوس کیا۔ چنانچہ اس استحصالی نظام میں ریاست کے لا تعلق رہنے والے کردار کو بالعموم ناپسندیدہ خیال کیا جانے لگا۔

نظریہ انفرادیت کے سیاسی تصور کو جبری نیتیتھم اور جیمز مل نے نظریہ افادیت **Utilitarianism** کے روپ میں اجاگر کیا۔ اور اپنے اس طبقاتی فکر کو زیادہ موثر طور پر پیش کرنے کے لئے علم نفسیات اور فلسفہ کا سہارا لیا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ انسانی زندگی کا منتہائے مقصود راحت حاصل کرنا اور دکھوں سے بچنا ہے۔ لہذا ملکی قانون کے اس بنیادی اصول کو مدنظر رکھ کر اجتماعی معاملات اور معاشرتی تعلقات کو استوار کرنا چاہیے۔ اس نظریہ کے مطابق ہر قانون کا مقصد زیادہ سے زیادہ افراد کو زیادہ سے زیادہ خوشیاں فراہم کرنا ہونا چاہیے **Greatest Happiness of the Greatest Number** دوسری طرف وہ اس مفروضہ پر پختہ یقین رکھتے تھے کہ ریاست اور اس کی مشینری جبر کی علامت ہونے کے باعث فرد کی آزادیوں اور خوشیوں کا گلا گھونٹتی ہے قانونی مداخلت ایک آزاد معاشرہ میں جس قدر کم

ہوگی لوگ اسی قدر خوشیوں سے ہمکنار ہوں گے اس منطق کا سہارا لے کر افادیت پسندوں نے دراصل ریاست کی ذمہ داریوں اور فرائض کی اہمیت کو بالکل پس پشت ڈال دیا۔ وہ اس بات کو نظر انداز کر گئے کہ عدل اجتماعی کے قیام کے سلسلہ میں ریاست کے کچھ مثبت فرائض اور ذمہ داریاں بھی ہیں۔ اگر ریاست انہیں پورا نہ کرے تو کمزور اور بے سہارا کی کفالت کون کرے گا؟

المختصر انیسویں صدی کے آخر تک نظریہ عدم مداخلت کو مغربی لبرل ازم کی اساسی فکر کی حیثیت حاصل رہی۔ اس دوران نظام سرمایہ داری نے پسماندہ ممالک میں کمزور اقوام کو دبائے رکھا اور ان ممالک کی دولت سے خوب ہاتھ رنگ کر اپنے وسائل کو بڑھایا تاہم مغربی ممالک کے اندر بھی محنت کار سرمایہ داروں کے ہاتھوں ظلم و استحصا کا شکار بنے رہے۔ انسانی فکر میں ایک مضر خرابی یہ ہے کہ محدود انسانی سوچ کے باعث اس پر انتہا پسندی اور جذباتیت کا رنگ غالب آ جاتا ہے۔ انسانی عقل محدود اور ناقص ہے لہذا اہل فکر و دانش طبقہ بھی اپنے ارد گرد کے حالات اور جذباتی ہیجانات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ چنانچہ اس قسم کے عوامل کے زیر اثر اجاگر کئے گئے انسانی افکار میں انتہا پسندی کا رنگ نمایاں ہو جاتا ہے اس کی واضح مثال اشتراکیت کا فلسفہ ہے کارل مارکس نے سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے بلاشبہ اس نظام کی بعض بنیادی خامیوں کی نشاندہی کی اور انقلابی نقطہ نظر پیش کر کے نہ صرف معاشی شعبہ میں تبدیلیاں تجویز کیں بلکہ پوری زندگی کے تصور کو ہی بدل ڈالا۔ مارکس نے رائج الوقت طور طریقوں اور تصورات کو مسترد کر کے ایک آفاقی غیر طبقاتی معاشرہ کے قیام کا تخیل پیش کیا۔ اس نے اشتراکی فکر کو ایک ایسے نظریہ حیات کی صورت میں اجاگر کیا جس میں ماضی کا سائنسی تجزیہ، حال کے لئے لائحہ عمل اور مستقبل کے لئے پیش گوئی جیسے تینوں پہلو موجود تھے۔

رائج الوقت تصورات اور نظاموں کو باطل قرار دینے کی دھن میں مارکس نے تاریخ کی ایسی مادی تعبیر کی جس میں بہت سے دوسرے اہم عوامل کو نظر انداز کر دیا گیا۔ مارکس کے نظریہ کے مطابق ہر نظام معیشت مخصوص خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ جبکہ پورے معاشرہ کا سماجی سیاسی و اخلاقی نظام معیشت کے اساسی تصورات کا عکس ہوتا ہے۔ یعنی طبقات کے باہمی تعلقات بھی اسی مخصوص نظام معیشت کے مطابق استوار ہوتے ہیں مارکس کے اس نظریہ کے مطابق ماضی کے تمام انقلابات کے پس پشت معاشی عوامل ہی کارفرما تھے۔ مارکس کا یہ نظریہ حقائق سے چشم پوشی کے مترادف ہے دراصل انسانی افکار و خیالات پر مذہبی تصورات، نفسیاتی اور جغرافیائی عوامل بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ انسانی تاریخ پر بعض مذہبی تحریکوں اور عظیم شخصیتوں نے امنٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

طبقاتی کشکش کا مارکسی تصور بھی انسانی تاریخ کے صرف تاریک پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ بلاشبہ مارکس اعلیٰ اخلاقی اقدار اور قومی شخص و حب الوطنی جیسے بلند تصورات کی اہمیت کا ادراک کرنے سے قاصر رہا۔ قومیت کے جدید تصور نے اس نظریہ کو باطل ثابت کر دیا ہے کیونکہ مشترکہ قومی مقاصد کے حصول کی خاطر مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے اپنے طبقاتی تعصبات کو بالائے طاق رکھ کر بارہا اشتراک و تعاون کی اعلیٰ مثال قائم کی ہے۔ قیام پاکستان کی جدوجہد میں ہندی مسلمانوں نے ملی یکجہتی کی جو روشن مثال قائم کی وہ بھی اس تصور کی نفی کرتی ہے۔ نہ صرف تمام مسلمان طبقات سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے اس عظیم جدوجہد میں شریک ہو کر بے مثال قربانیاں دیں بلکہ ہند کے ان علاقوں کے لوگ بھی تحریک آزادی کے ہر اول دستہ میں شامل تھے جو کہ پاکستان کی مجوزہ حد بندیوں کا حصہ نہ تھے۔

در اصل مارکس مادی عوامل کی قوت اور اہمیت کو اس حد تک بڑھا دیتا ہے کہ اس کے نزدیک مذہب جیسی بڑی اور موثر قوت کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی۔ اس کے نزدیک مذہب بھی محنت کاروں کی کشکش میں بوڑھائی طبقات کا ساتھ دیتا ہے۔ چنانچہ وہ مذہبی اقدار کی اہمیت کو بالکل مسترد کر دیتا ہے ٹرائسکی نے کہا تھا۔ بہترین اخلاق ایسی خانہ جنگی ہے جو مختلف طبقوں میں جاری ہوا اور جس سے غیر طبقاتی معاشرہ جنم لے سکے سوشلزم کے ضابطہ اخلاق کے مطابق جھوٹ، دھوکہ دہی فریب اور جعل سازی سے مقاصد حاصل کرنا درست اور جائز ٹھہرا۔ اخلاقیات سے متعلق مارکس کے ایسے عقائد ایک ایسے معاشرہ کے قیام میں رکاوٹ بنتے ہیں جس میں لوگ ایک دوسرے کے لئے محبت اور ہمدردی کے جذبات رکھتے ہوں۔ درحقیقت اخلاقی اقدار ہی مادی زندگی کو مربوط و منظم بنیادوں پر استوار کر کے معاشرہ کو خوشحال بنانے کا موجب بنتی ہیں۔

قدر زائد کا مارکسی نظریہ **Surplus Value** بھی تصویر کے صرف ایک ہی رخ کی عکاسی کرتا ہے بلاشبہ کارل مارکس نے نظام سرمایہ داری کے تحت قائم بے قید معیشت میں محنت کاروں پر ہونیوالے ظلم و ستم کی موثر طور پر نشاندہی کی لیکن اپنے تجربہ میں وہ اس پہلو کے اعتبار سے بھی انتہا پسندی کی طرف مائل نظر آتا ہے۔ مارکس کے تجربہ میں قیمتوں کے تعین کے سلسلہ میں کارفرما حقیقی عوامل کی نشاندہی نہیں ہوتی۔ اس ضمن میں وہ ایسے عوامل مثلاً باہمی مسابقت، اجارہ داریوں کا پہلو، انتظامی اخراجات، مانگ اور رسد کے باہمی تعلق وغیرہ کو نظر انداز کر دیتا ہے اور صرف محنت کو ہی اشیا کی پیدائش کے سلسلہ میں واحد عامل تصور کرتا ہے۔ بالفرض اگر محنت کو ہی پیدائش دولت میں واحد اور موثر عامل تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کاروبار میں نقصان کی صورت میں بھی مزدور کو مالک کے ساتھ مساوی خسارہ برداشت کرنا ہوگا۔ جبکہ یہ بات ہمیشہ سے مروجہ حقائق کے خلاف رہی ہے۔ از روئے انصاف کاروبار میں منافع کا بڑا

حصہ اس کو نہ ملنا چاہیے جس کے حصہ میں کاروبار کا نقصان آتا ہے اور جو نقصان کا خطرہ مول لیتا ہے۔

درحقیقت کارل مارکس نے ایک ایسے نظام کا تصور دیا جو اپنے اندر محنت کا رقبہ کے لئے زبردست جاذبیت رکھتا تھا لیکن عملی طور پر وہ مطلق العنانیت، جبر و تشدد اور استبدادیت کے قیام کی راہ ہموار کرتا ہے۔ آمریت ہمیشہ جابرانہ نظام کی غمازی کرتی ہے خواہ یہ آمریت مزدوروں کی ہو یا سرمایہ داروں کی، بنیادی ضروریات زندگی کی فراہمی کی ضمانت اگر ان کی آزادیوں کی قیمت کے بدل دی جائے تو یہ سودہ بہت مہنگا ہے۔ کیا انسان کو بیک وقت روٹی اور آزادی دونوں کی فراہمی کی ضمانت نہیں دی جاسکتی؟ جن ممالک میں اشتراکی انقلاب آیا وہاں کی حالیہ تاریخ اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ پرولتاری آمریت عملی طور پر کیمونسٹ پارٹی کی استبدادیت کا ہی دوسرا نام ہے۔ اس نظام میں تمام اختیارات پارٹی کے چند سرکردہ قائدین کے ہاتھوں میں مرکوز کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ طبقہ سرمایہ داروں کے اس طبقہ سے بھی بدتر رویہ کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جن کے خاتمہ کے لئے مزدوروں نے جدوجہد کی ہوتی ہے سودیت یونین اور عوامی جمہوریہ چین کے اندر حالیہ سیاسی واقعات اس بات کے شاہد ہیں کہ برسر اقتدار آنے والی ہر نئی قیادت نے پرانی قیادت کے آمرانہ اقدامات کا پردہ چاک کیا۔ جبکہ برسر اقتدار گروہ پر تنقید و احتساب کا تصور بھی محال ہے۔

ایک نئے سرخ سامراج کے روپ میں اس کے حامیوں نے جس طرح مختلف اقوام کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے اس کا کیا جواز ہے؟ سودیت یونین کا بہت بڑا حصہ ان علاقوں پر مشتمل ہے جو کبھی مسلم سلطنت کا حصہ تھے اور جہاں مسلم تہذیب نے تابندہ نقوش مرتب کئے تھے۔ روس نے انہیں زیر تسلط رکھنے کے لئے مسلم تہذیب کے ملیا میٹ کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا مشرقی یورپی ممالک کی حالت اور پھر گورباچوف کے دور میں سرخ استبدادیت کے خلاف شدید رد عمل کے مظاہرے کیمونزم کی ایک گھناؤنی تصویر کی عکاسی کرتے ہیں۔

اشتراکی سامراج نے تمام بین الاقوامی اخلاقی و قانونی آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ۱۹۷۹ میں افغانستان پر ننگی جارحیت کا ارتکاب کیا۔ لیکن افغان قوم نے مادیت پرستی کے اس دور میں بھی آزادی و دینی جمعیت کے تحفظ کی شمع روشن کر کے مذہب کی اہمیت کو ایک بار پھر اجاگر کر دیا۔ پندرہ لاکھ افراد کی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے انہوں نے فروری ۱۹۸۹ میں روسی افواج کو اپنے ملک سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔

مارکسی تعلیمات عدل و انصاف کے عام مسلمہ اصولوں کی کسوٹی پر بھی پوری نہیں اتریں۔ افراد سے نجی ملکیت کا حق چین لینا صریح ظلم کے مترادف ہے نجی ملکیت کو قومی مفادات کے مطابق منضبط کر دینے سے اس کی تمام خرابیاں دور ہو سکتی ہیں۔ لیکن مسئلہ کو حل کرنے کی بجائے افراد کو اس فطری حق سے ہی محروم کر دینا کہاں کی دانشمندی ہے؟ حق

ملکیت فرد کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور اس کی شخصیت کی تکمیل کے لئے ناگزیر ہے اپنی محنت کے پورے صلے یا اسکے ثمرات سے دست کش ہو جانا انسانی جبلت اور موروٹی میلانات کے خلاف ہے دور حاضر میں آزاد معیشت کے نظام کی حامل رفاہی مملکتوں نے بھی منضبط معیشت کا ایسا نظام مرتب کیا ہوا ہے جس سے ایک طرف بڑی حد تک تمام طبقات کے مفادات کا تحفظ کیا جاسکتا ہے جبکہ اس کے ساتھ ساتھ آزادیوں کے تحفظ کی بھی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ مخلوط معیشت کی خصوصیت سے عبارت ایک ایسا منضبط معاشی نظام چلانا ممکن ہے جس میں پرائیویٹ سیکٹر اور پبلک سیکٹر دونوں کے مابین توازن برقرار رکھا جاسکے۔ مساوات کے متعلق بھی اشتمالیت کا تصور غیر منطقی اور عدل کے تقاضوں کے منافی ہے۔ اشتراکیت کا مستقبل کے غیر طبقاتی معاشرہ کے متعلق یہ اصول کہ اس میں ہر فرد کو اس کی ضروریات کے مطابق اشیاء فراہم کی جائیں گی نہ صرف عدل کے منافی ہے بلکہ ناقابل عمل بھی ہے۔ اس اصول کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسے معاشرہ میں جہاں قابل اور اہل افراد کو ان کی صلاحیت کی بنا پر معاوضہ ملے گا وہاں نااہل افراد کو ان کی نااہلی کا بھی اتنا ہی بلکہ اگر ان کی ضروریات زیادہ ہوں گی تو اہل افراد سے بھی زیادہ معاوضہ دیا جائیگا ظاہر ہے ایسی صورت حال میں کوئی بھی کارکن اپنی استعداد کار بڑھانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ بلکہ باصلاحیت افراد کی حوصلہ شکنی ہوگی۔ درحقیقت مارکس نے مساوات کا بالکل غیر فطری تصور پیش کیا ہے جو انسانی معاشرہ میں اصلاح کی بجائے مزید خرابیوں کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ مارکس کے نظریہ سے یہ بات عیاں ہے کہ بجائے معاشرہ کی اصلاح کے استحصالی رجحانات کا اضافہ ہوا ہے۔ اسلام ہی وہ دین ہے جس میں استحصالی رجحانات کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ (۱۵۶)

## (۵) ناجائز ذرائع آمدنی

انسان کی مزید بد نصیبی یہ ہے کہ دنیا کے اخلاقی فلسفے، سیاسی نظامات اور قانونی اصول بھی اس شیطانی نظام معیشت سے متاثر ہو گئے۔ مشرق سے مغرب تک ہر طرف اخلاقی معلمین کفایت شعاری پر زور دے رہے ہیں۔ جتنا کمانا اتنا ہی خرچ کر دینا ایک حماقت اور اخلاقی عیب سمجھا جاتا ہے۔ اور ہر شخص کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ اپنی آمدنی میں سے کچھ نہ کچھ پس انداز کر کے بینک میں ڈپازٹ رکھے۔ یا انشورنس پالیسی خریدے یا کمپنیوں کے شیئرز حاصل کرے۔ گویا جو چیز انسانیت کو تباہ کرنے والی ہے۔ وہی اخلاق کی نظر میں معیار خوبی بن گئی ہے۔ رہی سہی طاقت تو وہ عملاً بالکل ہی ایک شیطانی نظام کے قبضے میں آ چکی ہے۔ وہ بجائے اس کے اس ظلم سے انسان کو بچائے ظلم کی آلہ کار بنی ہوئی ہے اور ہر طرف حکومت کی گدیوں پر شیطان کے ایجنٹ بیٹھے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح دنیا کے قوانین بھی اس نظام کے زیر اثر مرتب ہو رہے ہیں۔ ان قوانین نے انسان کو عملاً پوری آزادی دے رکھی ہے۔ کہ جس طرح چاہیں جماعت



کے مفاد کے خلاف اپنی معاشی اغراض کے لئے جدوجہد کریں۔ روپیہ کمانے کے طریقوں میں جائز اور ناجائز کا امتیاز قریب قریب مفقود ہے۔

ہر وہ طریقہ جس سے کوئی شخص دوسروں کو لوٹ کر یا تباہ کر کے مال دار بن سکتا ہے۔ قانون کی نظر میں جائز ہے۔ شراب بنائے اور بیچے اور بد اخلاقی کے اڈے قائم کیجے، شہوانی فلم بنائے، فحش مضامین لکھیے، جذبات کو بھڑکانے والی تصویریں شائع کیجیے، سٹے کا کاروبار پھیلائیے، سود خواری کے ادارے قائم کیجیے، قمار بازی کی نئی نئی تصویریں نکال لیے۔ غرض جو چاہے کیجئے۔ قانون نہ صرف آپ کو اس کی اجازت دے گا بلکہ الٹا آپ کی حقوق کی حفاظت کرے گا۔ پھر جو دولت اس طرح سمٹ کر جس کے پاس جمع ہو گئی ہو۔ قانون یہ چاہتا ہے کہ وہ اس کے مرنے کے بعد بھی ایک ہی جگہ سٹی رہے۔

یہ وہ اسباب ہیں جن سے نوع انسانی کے لئے یہ مسئلہ پیدا ہوا ہے کہ خداوند تعالیٰ کی زمین میں ہر شخص کو سامان زیست بہم پہنچانے کا انتظام کس طرح کیا جائے۔ (۱۵۷)

## (۶) عیش پرستی و اسراف و تبذیر

اسلامی اخلاقیات کی رو سے عیاشی اور لذیت پرستی کی وہ تمام صورتیں جو دولت کے چند ہاتھوں میں جمع ہونے کا لازمی نتیجہ ہیں، سرے سے جائز ہی نہیں ہیں۔ اسلام ان تمام کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ اور ساتھ ہی مالکوں کو تاکید کرتا ہے کہ وہ اپنے ملازمین سے بے انصافی کے مرتکب نہ ہوں، اور ان کے جائز معاوضوں میں کوئی کمی نہ کرے، بلکہ انہیں ان کا پورا پورا حق دیں۔ ارتکاز دولت بھی ملازمین پر ظلم اور زیادتی ہی کی ایک صورت ہے، اس لیے بے انصافی کے خاتمہ کے لیے اس کا سد باب بھی ضروری ہے، چنانچہ اسلام اس لیے بھی ارتکاز دولت کے خلاف ہے۔ اسلام لوگوں کے اندر خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے کا جذبہ ابھارنا چاہتا ہے، خواہ اس کے لیے انہیں اپنا سبھی کچھ لٹا دینا پڑے۔ جس معاشرے میں خوشحال لوگ اس طرح خدا کی خاطر دوسروں پر خرچ کرتے رہتے ہیں، وہاں غربت اور محرومی باقی رہ ہی نہیں سکتی، کیونکہ یہ دونوں تو خود غرضی کی پیداوار ہیں اگر صراحتاً یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ عیاشی اور اسراف و تبذیر خود غرضی کی پیداوار ہیں۔ جس کی وجہ سے معاشرے کے متمول افراد اپنی ساری دولت اپنے ذاتی آرام و آسائش پر خرچ کر ڈالتے ہیں۔ چنانچہ یہ برائی سرمایہ دارانہ نظام اور غلط معاشی نظام کا نتیجہ ہے۔ (۱۵۸)

ان سرمایہ داروں نے اپنی اصل ضروریات میں بے شمار دیگر ضروریات کا اضافہ کیا۔ اور بہت سے انسانوں کو جن کی صلاحیتیں، تہذیب و تمدن کی بہتر خدمات کے لیے استعمال ہو سکتی تھیں۔ اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے

لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ زنا کے لئے فاحشہ عورتوں اور دیوثوں کا ایک لشکر فراہم کر دیا۔

غنا و موسیقی کے لئے گویوں، ناچ کرنے والیوں، سازندوں اور آلات موسیقی تیار کرنے والوں کی ایک اور فوج تیار کی گئی۔

دیگر تفریحات کے لئے مسخروں، نقالوں، ایکٹروں، ایکٹرسوں، داستان گوؤں، مصوروں اور نقاشوں وغیرہ کا گروہ کثیر مہیا کیا گیا۔ ان سرمایہ داروں کے لئے شکار بھی ضروری تھا۔ جس کے لئے ان افراد کو اس کام پر لگایا گیا۔ جو اس کام سے بھلا اور بہتر کام کر سکتے تھے کہ جنگلوں میں شکاری جانور پالتے پھریں۔

ان کے لئے سرور و نشاط اور خود رفتگی بھی ایک ضرورت تھی جس کی خاطر بہت سے انسان شراب، کوکین، افیون اور دوسرے مسکرات کی فراہمی میں مشغول کیے گئے۔

غرض اس طرح ان شیطان کے بھائیوں نے نہ صرف اتنے ہی پراکتفا کیا کہ بے رحمی کے ساتھ سوسائٹی کے ایک بہت بڑے حصے کو اخلاقی و روحانی اور جسمانی تباہی میں مبتلا ہونے کے لئے چھوڑ دیا ہو بلکہ مزید ظلم یہ کیا ایک اور بڑے حصے کو صحیح اور مفید کاموں سے ہٹا کر بیہودہ اور ذلیل کاموں پر لگا دیا۔ پھر بات یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ انسانی سرمایہ (Human Capital) کو ضائع کرنے کے ساتھ مادی سرمایہ کو بھی غلط طریقہ سے استعمال کیا۔

ان کو محلات، کوشیوں، گلستانوں، تفریح گاہوں، ناچ گھروں وغیرہ کی ضرورت لاحق ہوئی۔ حتیٰ کہ مرنے کے بعد زمین میں لینے کے لئے بھی ان کو ایکڑوں زمین اور عالیشان عمارتوں کی حاجت درپیش ہوئی۔ اور اس طرح سے وہ زمین وہ سامان تعمیر اور وہ انسانی محنت جو بہت سے بندگان خدا کے لئے سکونت اور معیشت کا انتظام کرنے کے لئے کافی ہو سکتی تھی ایک ایک عیاش آدمی کے لئے ان کے مستقر اور مستودع پر صرف ہو گئی۔

ان سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو شاندار سواریوں، نفیس لباسوں، اعلیٰ درجے کے آلات و ظروف، زینت و آرائش کے سامانوں، زیوروں اور نہ معلوم کن کن چیزوں کی ضرورت پیش آئی۔

حتیٰ کہ ان ظالموں کے دروازوں کو قیمتی پردوں کی ضرورت ہوئی کیونکہ اس کے بغیر وہ ننگے تصور ہوتے تھے۔ ان کے محلات کی دیواریں ہزاروں اور لاکھوں روپے کی تصویرات سے مزین ہوئے بغیر نہ رہ سکتی تھیں۔ ان کے کمروں کی زمین بھی لاکھوں روپے کے قالین اور ہنا چاہتی تھی۔ ان کے کتوں کو بھی مچل کے گدے اور سونے کے پٹے درکار تھے۔

اس طرح سے وہ بہت سا مواد اور وہ کثیر انسانی عمل جو ہزار ہا انسانوں کے تن ڈھانکنے اور پیٹ بھرنے کے کام آ سکتا تھا وہ ایک ایک شخص کی عیش پرستی اور نفس پرستی کے لئے وقف ہو گیا۔ (۱۵۹)

## حوالہ جات باب دوم

- ۱۔ خان، اشفاق محمد، ڈاکٹر: مذہب، مسلمان اور سیکولرزم، مطبع، المظاہر العربیہ، لاہور ۱۹۹۶ء، ص: ۳۳۸-۳۹
- ۲۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا، ج ۱: ص: ۲۰۴
- ۳۔ انسائیکلو پیڈیا امریکا، ج ۲۴: ص: ۵۲۱
- ۴۔ انسائیکلو پیڈیا امریکانا، ج ۲۴: ص: ۱۰۹۱
- ۵۔ Ed. Altaf Gohar The Challenge of Islam. London. p. 299-300 1978
- ۶۔ Muhammad Qutb : Islam, The Misunderstood. PP 10 11 Repigon
- ۷۔ امینی، محمد تقی: لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر، فضلی سنز اردو بازار کراچی، ۱۹۸۷ء، ص: ۱۷۰
- ۸۔ محمد قطب: اسلام اور جدید ذہن کے شبہات، البدر پبلیکیشنز ۲۳ راحت مارکیٹ اردو بازار لاہور، ۱۹۸۱ء، ۳۱۲، ۳۱۷
- ۹۔ ایضاً، ایضاً، ۳۱۷-۳۱۹
- ۱۰۔ A History of Political theory, by George H. Sabine London. PP 575
- ۱۱۔ John L. Esposito, Islam and Politics, P. 141 by London.
- ۱۲۔ John L. Esposito, Islam and Political P 157.
- ۱۳۔ Hamid Enayat, Modern Islamic Political Thought.
- ۱۴۔ Lawrence C. Wansell, Gettle's History of thought. P 141. 143 335. 336
- ۱۵۔ شہید، قطب، سید: الاسلام والمشكلات الحضارة، ص: ۳۰-۱۲۷
- ۱۶۔ امینی، محمد تقی: لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر، ص: ۵۹
- ۱۷۔ نظریہ سلطنت، ص: ۲۸-۲۷
- ۱۸۔ لیکس: تاریخ یورپ، ص: ۲۸
- ۱۹۔ امینی، محمد تقی: لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر، ص: ۶۳-۶۲
- ۲۰۔ تاریخ فلسفہ جدید ج ۱: ص: ۶۷
- ۲۱۔ ایضاً

- ۲۲۔ ایٹنی، محمد تقی: لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر، ص: ۷۰-۷۶
- ۲۳۔ ایضاً، ص: ۸۹-۸۱
- ۲۴۔ شہید، قطب، سید: اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل، ص: ۴۴
- ۲۵۔ ایٹنی، محمد تقی: لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر، ص: ۳۷
- ۲۶۔ ایچ مور اسٹینس: اخلاقی یورپ،
- ۲۷۔ ایٹنی، محمد تقی: لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر، ص: ۴۰-۴۳
- ۲۸۔ شہید، قطب، سید: اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل، ص: ۴۵
- ۲۹۔ انقلاب روس، ص: ۲۳
- ۳۰۔ لینن کی مجموعی تحریریں، ج: ۷
- ۳۱۔ ایٹنی، محمد تقی: لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر، ص: ۱۷۴
- ۳۲۔ ملفوظات یوسفی: چشتیہ مکتبہ پیر پٹھان روڈ، ملتان، ص: ۴۱
- ۳۳۔ George H. Sabine, A History of Political Theory. P 653.655
- ۳۴۔ ایٹنی، محمد تقی: لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر، فضلی سنزل ردو بازار کراچی، ۱۹۸۷ء، ص: ۱۷۴
- ۳۵۔ رفیع الدین، ڈاکٹر: قرآن اور علم جدید، ص: ۳۱۸
- ۳۶۔ ایٹنی، محمد تقی: لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر، فضلی سنزل ردو بازار کراچی، ۱۹۸۷ء، ص: ۱۵۹
- ۳۷۔ فیروز اللغات اردو بازار فیروز سنز لاہور
- ۳۸۔ غزالی، محمد، امام: کیمیائے سعادت (اردو)، مدینہ پبلشنگ کمپنی ایم اے جناح روڈ، کراچی، ص: ۲۴۰
- ۳۹۔ القرآن الحکیم: ۱۰ (یونس): ۱۰۱
- ۴۰۔ القرآن الحکیم: ۴۵ (الجاثیہ): ۱۳
- ۴۱۔ القرآن الحکیم: ۳۴ (سباء): ۴۶
- ۴۲۔ الہندی، علی المصطفیٰ: کنزل العمال فی سنن الافعال والاقوال ج ۳ حدیث نمبر ۵۷۱
- ۴۳۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، ابو عبد اللہ، امام: الجامع الصحیح، کتاب الرقاق ص: ۱۸
- ۴۴۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، ابو عبد اللہ، امام: الجامع الصحیح، کتاب التہجد ج ۶، ص: ۴۸
- ۴۵۔ القرآن الحکیم: ۳ (آل عمران): ۱۹۱: ۱۹۰
- ۴۶۔ القرآن الحکیم: ۴۳ (سباء): ۴۶
- ۴۷۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، ابو عبد اللہ، امام: الجامع الصحیح، کتاب توحید، ص: ۵۶
- ۴۸۔ القرآن الحکیم: ۳۶ (یس): ۴۶
- ۴۹۔ ایضاً
- ۵۰۔ القرآن الحکیم: ۷ (اعراف): ۱۷۹



- ۵۱۔ القرآن الحکیم: ۳۹ (الزمر): ۱۸: ۱۷
- ۵۲۔ القرآن الحکیم: ۲ (البقرہ): ۱۷۰
- ۵۳۔ القرآن الحکیم: ۲۳ (الزخرف): ۲۳
- ۵۴۔ وحید الدین، مولانا: فکر اسلامی، فضلی سنزاردوبازار، کراچی، ۳۲
- ۵۵۔ غزالی، امام: احیائے العلوم، ۹۴-۶۹۳
- ۵۶۔ القرآن الحکیم: ۶ (انعام): ۱۰۳
- ۵۷۔ القرآن الحکیم: ۴۲ (شوریٰ): ۱۱
- ۵۸۔ القرآن الحکیم: ۲۰ (طہ): ۱۱
- ۵۹۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، ابو عبد اللہ، امام: الجامع الصحیح، کتاب العمل فی الصلوٰۃ ص: ۳۵
- ۶۰۔ القرآن الحکیم: ۲ (البقرہ): ۱۶۴
- ۶۱۔ القرآن الحکیم: ۵۰ (ق): ۱۱: ۶
- ۶۲۔ القرآن الحکیم: ۱۰ (یونس): ۵
- ۶۳۔ القرآن الحکیم: ۲ (البقرہ): ۲۲۰: ۲۱۹
- ۶۴۔ بھٹی، ظہیر الدین، محمد: اسلام دستور حیات، جدید پریس لاہور، ۱۹۹۵ء، ۳۵-۲۲
- ۶۵۔ شہید، قطب، سید: اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل، میٹروپرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص: ۹۰-۸۹
- ۶۶۔ لیوپولڈ فالس: اسلام دور ہے پر، ۳۰
- ۶۷۔ شہید، قطب، سید، اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل، میٹروپرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص: ۴۵-۱۱
- ۶۸۔ ایضاً ، ۱۳۶-۱۳۵
- ۶۹۔ تگہ، عبد الحمید، پروفیسر: عمرانی اصول، اسماعیل برادرز پبلیشرز اردو بازار، لاہور
- ۷۰۔ اصلاحی، مشتاق احمد، حکیم: آداب خاندان، تحریک اصلاح معاشرہ اصلاحی منزل کچہری بازار، سرگودھا ۱۹۹۱ء
- ص: ۱۵-
- ۱۳
- ۷۱۔ ایضاً ، ۶۰-۱۵
- ۷۲۔ وزارت مذہبی امور، معیاری مضامین، وزارت مذہبی امور، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء، ۱۰۳
- ۷۳۔ سینٹاپوری، نادم: تختیص مقدمہ ابن خلدون: حصہ اول- ۲۵
- ۷۴۔ وزارت مذہبی امور، معیاری مضامین مقابلہ، ص: ۴-۱۰۳

- ۷۵۔ محمد سرور، ڈاکٹر، اسلام کا جدید ریاستی نظام، مکتبہ تعمیر انسانیت اردو بازار، لاہور، ص: ۲۸۵
- ۷۶۔ وزارت مذہبی امور، معیاری مضامین مقابلہ، ص: ۱۰۳-۴
- ۷۷۔ محمد سرور، ڈاکٹر، اسلام کا جدید ریاستی نظام، ص: ۲۸۵
- ۷۸۔ وزارت مذہبی امور، معیاری مضامین، ص: ۱۰۵
- ۷۹۔ سینٹاپوری، نادم: تلیخیں مقدمہ ابن خلدون، ۸۸-۸۵
- ۸۰۔ محمد الحق سندیلوی: اسلام کا سیاسی نظام، ندوۃ العلماء لکھنؤ، مطبع معارف اعظم گڑھ-ص: ۸۵۔
- ۸۰۔
- ۸۱۔ تگہ، عبدالحمید، پروفیسر: عمرانی اصول، ص: ۴۱۹-۴۲۹
- ۸۲۔ وزارت مذہبی امور، معیاری مضامین، ۷۰-۷۲
- ۸۳۔ سوہاروی، حفظ الرحمن: اسلام کا اقتصادی نظام، مکتبہ امدادیہ ملتان، ص: ۴۱۷
- ۸۴۔ خان، وحید الدین، مولانا: اسلام اور عصر حاضر، ص: ۱۰۸
- ۸۵۔ Joid: The Pilosophy of our times. London P. 25
- ۸۶۔ Linyotong : Between tears and laughter. London. P . 25, .
- ۸۷۔ Sorokin : The Crisis of our age. London. P. 29,
- ۸۸۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، سید: معاشیات اسلام، میٹر پرنٹرز لاہور، ۱۹۸۸ء، ۵۳
- ۸۹۔ لندن ٹائمز ۲۴ نومبر ۱۸۸۷ء۔
- ۹۰۔ امریکی جریدہ ٹائمز مئی ۱۹۷۷ء۔
- ۹۱۔ خان، عبدالرحمن، منشی: مضطرب صدائیں، طیب اکیڈمی بیرون بوڑگیٹ، ملتان، ۱۹۸۸ء، ص: ۲۹۵-۲۹۴
- ۹۲۔ اشتراکیت کی تجربہ گاہیں، ص: ۱۷۲-۱۶۹
- ۹۳۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، سید: معاشیات اسلام، ص: ۵۳-۴۴
- ۹۴۔ قادری، سرور، غلام: معاشیات نظام مصطفیٰ، کمپائن پرنٹرز لاہور، ۱۹۸۴ء، ۲۷۰-۲۳۰
- ۹۵۔ Lawrence C. Wanlass : Gettle's History of politecal Thought.. London PP 335.36
- ۹۶۔ شہید، قطب، سید: اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل، ص: ۱۳۳
- ۹۷۔ Lawrence C. Wanlass : Gettle's History of political Thought. PP. 335 . 336.
- ۹۸۔ شہید، قطب، سید: اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل، ۱۳۰



- ۱۰۴ قریشی، حسین محمد، مولانا شاہ ولی اللہ کا نظریہ معیشت اور عصر حاضر میں اس کی افادیت ص: ۱۳۵-۱۳۵
- ۱۰۵ محمد قطب اسلام اور جدید ذہن کے شبہات ص: ۱۳۷-۱۳۶
- ۱۰۶ محمد سرور، ڈاکٹر، پروفیسر اسلام اور جدید ریاستی نظام ص: ۳۱-۳۴
- ۱۰۷ الگیلانی، مناظر احسن، سید اسلامی معاشیات ص: ۳۲۹-۳۲۳ ناشر: ادارہ اشاعت اردو عابد روڈ حیدر آباد دکن۔
- ۱۰۸ قریشی، حسین محمد، مولانا شاہ ولی اللہ کا نظریہ معیشت اور عصر حاضر میں اسکی افادیت ص: ۱۹۴
- ۱۰۹ محمد الحق، حکیم اسلام کا معاشی معیار اخلاق ص: ۱۸۱-۱۷۸ حصہ اول

# باب سوم

تربیت نفس اور اصلاح فکر میں تصوف کا کردار

تزکیہ نفس کا دستور العمل سورۃ منزل کی ابتدائی آیات میں درج ہے۔ اس کے مطالعے سے واضح ہو جائے گا کہ صوفیہ صحیح معنوں میں متبع سنت نبوی ﷺ ہیں اور ان کی زندگی صحیح معنوں میں اسلامی زندگی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔

یا یہا المزمل قم الیل الا قلیلا۔ نصفہ او اے کپڑا اوڑھنے والے! کھڑا رہا کرات کو مگر تھوڑا دیر انقص منه قلیلا۔ او زد علیہ و رتل کے لئے۔ آدھی رات یا اس میں سے بھی کم کر لیا کر یا کچھ القرآن تر تیل۔ انا سنلقی علیک قولاً بڑھا دیا کر اور قرآن کو خوب آہستہ آہستہ پڑھا کر۔ تحقیق ہم ثقیلا۔ ان ناشئة الیل ہی اشد و طئا و ڈالنے والے ہیں تیرے اوپر ایک بھاری حکم کا بوجھ۔ تحقیق اقوم قلیلا۔ ان لك فی النهار سبحا طو اٹھنارات کا، وہ بہت سخت (مؤثر) ہے۔ نفس کو کچلنے میں اور یلا۔ و اذ کر اسم ربك و تبتل الیہ تبتیلا بہت سیدھا کرنے والا ہے بات کو (یعنی اس وقت دعا بھی رب المشرق و المغرب لا اله الا هو ٹھیک دل سے نکلتی ہے) تحقیق تیرے لئے دن میں (بلسلسلہ فاتخذہ وکیلا۔ واصبر علی ما یقولون و تبلیغ) بڑا مشغلہ رہا کرے گا اور ذکر کر اپنے پروردگار کے نام کا ہجر ہم ہجرا جمیلا۔ و ذرنی اور اسی کا ہوسب سے ٹوٹ کر وہ پروردگار ہے مشرق اور مغرب والمکذبین اولی النعمة و مهلم قلیلا۔ (۳) کا۔ نہیں معبود اس کے سوا۔ پس بنالے اسی کو اپنا کارساز اور صبر کر اوپر ان باتوں کے جو (کافر) تیری نسبت کرتے ہیں اور قطع تعلق کر لے ان سے وضع داری کے ساتھ اور چھوڑ دے مجھ کو اور ان جھٹلانے والوں کو جو خوشحال اور دولت مند ہیں۔ (میں ان سے بھگت لوں گا) اور تھوڑی سی مہلت دے۔

قرآن مجید کی ان آیات سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ صوفیائے کرام نے تمام بنیادی اصول انہی آیات سے مستنبط کیے ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

- ۱۔ شیخ طریقت سالک کو حکم دیتا ہے کہ آخر شب میں اٹھو۔ یہ حکم ”قم الیل“ سے ماخوذ ہے۔
- ۲۔ اٹھ کر نماز تہجد پڑھو۔ یہ حکم سورۃ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۷۹ سے ماخوذ ہے۔ اور سورۃ منزل کی آیت نمبر ۳ کی شرح ہے۔

انا ناشئة الیل هی اشد و طئنا و اقوم قیلا “ سے ماخوذ ہے۔

۵۔ شیخ طریقت سالک کو اسم ذات کی تلقین کرتا ہے۔ ”واذکر اسم ربك“ سے یہ حکم ماخوذ ہے۔

۶۔ تصوف میں ”تبتل“ کی تلقین کی جاتی ہے جو کہ ”و تبتل الیہ تبتیلا“ سے ماخوذ ہے۔

۷۔ سالک کو تلقین کی جاتی ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسہ رکھو۔ وہ ”فا تخذہ وکیلا“ سے ماخوذ ہے۔

۸۔ سالک کو اغیار کے اعتراضات پر صبر کی تلقین کی جاتی ہے اور یہ حکم ”و اصبر علی ما یقولون“ سے ماخوذ

ہے۔

۹۔ سالک کو مخالفین سے احسن طریقے سے کنارہ کشی کا حکم دیا جاتا ہے اور وہ ”وا هجر هم هجرا جمیلا“

سے ماخوذ ہے۔

۱۰۔ سالک کو مخالفین یا مکذبین سے بحث یا تکرار وغیرہ کرنے سے منع کیا گیا ہے وہ اس حکم سے ماخوذ ہے۔ ”و ذ

رنی والمکذبین“

سورۃ مزمل ترتیب نزول کے اعتبار سے دوسری یا تیسری سورہ ہے۔ معلوم ہوا کہ پہلے تزکیہ نفس کا حکم ہے۔

کیونکہ جب تک نفس مغلوب نہ ہوگا اس وقت تک کوئی مسلمان نہ ”جہاد فی سبیل اللہ“ کر سکتا ہے اور نہ ہی ”انفاق

فی سبیل اللہ“ اور اسلام انہی دو چیزوں کا نام ہے۔ (۴)

کشف المحجوب میں ہے۔ حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

التصوف ترک کل حظ للنفس۔ (۵)

تصوف تمام نفسانی خواہشات سے دور ہونے کا نام ہے۔

## اصلاح فکر:-

فکر دراصل ذہن کی وہ قوت ہے جو علم کو معلوم کی طرف لے جاتی ہے۔ اور فکر کا مطلب عقل کے مطابق اس

قوت کو بہترین انداز میں پروان چڑھانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے غور و فکر کا یہ عطیہ ہر انسان کو عطا کر رکھا ہے مگر اس کو ترقی دینا

انسان کے اختیار میں دیا ہوا ہے تاکہ وہ غور و فکر کے ذریعے حقیقت کا سراغ لگا سکے کہ اسے کس نے پیدا کیا ہے اور اسکی

زندگی کا مقصد کیا ہے۔ جو شخص حضور ﷺ کی اتباع میں راہ ہدایت کی طرف غور و فکر کرے گا وہی فلاح پائے گا۔

اچھا فکر، اطاعت اور عبادت کی بنیاد ہے اور جن کو فکر رہتا ہے وہی اعمال میں استقامت حاصل کرتے ہیں۔ فکر عقلندی

کی بھی دلیل ہے۔ اہل فکر ہی سے علم و حکمت کے چشمے پھوٹتے ہیں۔

اچھا فکر، اطاعت اور عبادت کی بنیاد ہے اور جن کو فکر رہتا ہے وہی اعمال میں استقامت حاصل کرتے ہیں۔ فکر عقلمندی کی بھی دلیل ہے۔ اہل فکر ہی سے علم و حکمت کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ (۶)

## (۶) فکر کی فضیلت :-

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کیسے سعادۃ میں تحریر فرماتے ہیں کہ اے عزیز! جو کام سال بھر کی عبادت و طاعت سے بڑھ کر ہو وہ کتنا فضیلت والا ہوگا کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے۔ ”ایک گھڑی کا تفکر سال بھر کی عبادت سے بڑھ کر ہے۔“ (۷)

قرآن مجید نے متفکرین کی تعریف میں فرمایا۔

الذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبہم و وہ لوگ جو اٹھتے بیٹھتے اور پہلو کے بل اللہ کا ذکر  
یتفکرون فی خلق لسموت و الارض۔ (۸)

کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی تخلیق میں فکر کرتے ہیں۔

## میدان فکر کی وسعت :-

فکر کا میدان بہت وسیع ہے کیونکہ علوم بی شمار ہیں۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ جو بات راہ دین سے تعلق نہیں رکھتی۔ اسکی توضیح اور تشریح ہمارا مقصود نہیں ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ بندہ یا تو اپنے بارے میں فکر کرے گا یا اللہ تعالیٰ کے بارے میں۔ پس تفکر کے اس راہ میں چار میدان ہیں۔

## ۱۔ ذات الہی کے بارے میں فکر :-

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات یا اس کے افعال و مخلوقات کے بارے میں تفکر کا بڑا مقام ہے۔ عوام کی وہاں تک رسائی نہیں۔ حضور ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

۲۔ مخلوقات میں غور و فکر :-

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ مخلوق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ مخلوق جن کی ہمیں خبر نہیں۔ سو اس میں تفکر نہیں ہو سکتا جس مخلوق کی خبر ہے پھر اس کی دو قسمیں ہیں ایک وہ مخلوق جو دیکھی نہیں جاتی جیسے عرش و کرسی، لوح و قلم، فرشتے، جن، پری وغیرہ۔

دوسری وہ مخلوق جو دیکھ سکتے ہیں۔ جیسے آسمان و زمین، آفتاب و ماہتاب، ستارے، نباتات، جمادات، حیوانات، آسمان و زمین کے درمیان (جویات) کی مخلوق۔ اس میں تفکر کریں۔ (۹) اللہ تعالیٰ نے ان عجائب مخلوقات کے بارے میں فرمایا۔

وَكَايْنِ مِنْ آيَةِ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمْرُونُ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ (۱۰)  
کرتے۔

۳۔ قرآن مجید میں غور و فکر:-

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے مطالب و معانی پر غور و فکر کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا۔  
وَ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (۱۱)  
نازل کیا گیا ہے تاکہ آپ اسے لوگوں  
میں بیان کر دیں جو ان پر نازل ہوا ہے  
تاکہ وہ غور کریں۔

۴۔ اپنے بارے میں فکر:-

کیمیائے سعادت میں امام غزالیؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ہر انسان اپنے بارے میں غور و فکر کرے تاکہ معلوم  
کر سکے کہ صفاتِ بد اور افعالِ ذمیرہ اس میں کون کون سے ہیں تاکہ ان سے خود کو پاک کرے۔ (۱۲) اللہ تبارک و تعالیٰ نے  
بھی ارشاد فرمایا ہے۔

أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِي أَنْفُسِهِمْ (۱۳)  
کیا انہوں نے اپنے آپ کے بارے  
میں فکر نہیں کیا۔

صوفیائے کرام نے بنی نوع انسان کو محاسبہ و مراقبہ کی بھی تلقین ہے۔ (۱۴)  
یہ حکم اس آیت سے ماخوذ ہے۔

وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مِمَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (۱۵)  
اور لازم ہے کہ ہر شخص یہ دیکھتا (غور کرتا) رہے

(قیامت) کے لئے کیا توشہ آگے بھیجا ہے۔

یعنی کون کون سے اعمالِ صالحہ اس کے نامہ اعمال میں مندرج ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ محاسبہ مراقبہ پر موقوف ہے۔ جب  
تک مراقبہ نہ کیا جائے۔ محاسبہ ناممکن ہے۔ (۱۶)

فصل اول :-

## انسانی زندگی پر عقائد اسلامی کے مطلوبہ اثرات

مشہور جرمن فلسفی ہیگل جس نے انیسویں صدی کے نصف اوّل میں فلسفہ کو ایک نیا افق فراہم کیا تھا، کا قول ہے۔ تمام تاریخ نظریات کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اس تفسیر مارکس کے اس قول میں ملتی ہے کہ نظریات مادی دنیا کے خالق ہیں۔

نظریہ یا عقیدہ نہ صرف نقطہ نگاہ کو بدل دیتا ہے بلکہ زندگی کو نئی معنویت عطا کرتا ہے اور تقدیر میں ایک نیا رنگ بھرتا ہے۔

ایک مومن صدقہ و خیرات کو خدائی رحمت کی قیمت سمجھتا ہے اور بے دین مصیبت! اس کے ہاں بوڑھے والدین کی خدمت اور بے دین کے عذاب۔ ایک مسلمان اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے کو خواہ وہ کتنا ہی ناگوار ہو رحمت سمجھتا ہے اور یہ زحمت! اُسے کائنات کے ہر منظر میں اللہ تعالیٰ نظر آتا ہے اور کافر عناصر سے پرے دیکھ ہی نہیں سکتا۔ مسلمان دنیا کو مزرع آخرت سمجھتا ہے اور بے دین آخرت ہی کو نہیں مانتا تاریخ شاہد ہے کہ ہندو میدان جنگ سے بھاگتے رہے ہیں۔ اسکی وجہ یہ کہ وہ عقیدہ تناخ کے قائل ہیں۔ اُن کے ہاں ایک انسان ہزار ہا چرنوں سے گزر کر نروان حاصل کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مرنے کے بعد چوہا، کتا یا سور بن جائے۔ اس عقیدے کے ہوتے ہوئے موت کا خطرہ کون مائل۔

دوسری طرف مسلمان کا عقیدہ یہ ہے کہ میدان جنگ کی موت شہادت ہے۔ شہادت زندگی کی حسین ترین منزل ہے اور مومن اس کی تلاش میں رہتا ہے۔

الغرض عقیدہ ایک عظیم قوت ہے۔ ہر عمل عقیدے کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔ عقیدہ بیج ہے اور عمل درخت یا وہ بنیاد ہے اور یہ دیوار۔ بنیاد ٹیڑھی ہو تو۔ ”تاثریامی رود دیوار کج“ کسی قوم کی صفوں میں اتحاد بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے عقائد میں وحدت ہو۔ ہزار خداؤں کا پجاری ایک مؤحد سے اشتراک عمل کر ہی نہیں سکتا۔ اسلام نے جہاں اعمال صالحہ کی تفصیل دی ہے وہیں اہل ایمان کے لئے چند عقائد بھی تجویز فرمائے ہیں تاکہ عقائد کی وحدت سے ایک ایسی ملت پیدا ہو جو ذہنا و عملاً ایک ہو۔ یہ عقائد وہ سانچے ہیں جن میں غیر اسلامی اعمال ڈھل ہی نہیں سکتے۔ ایک خدا کو ماننے والا بت پرستی کیسے

کرے گا؟ اللہ تعالیٰ کو قہار و منتقم سمجھنے والا گناہ کے تصور ہی سے کانپ اٹھے گا۔ آخرت پر ایمان رکھنے والا عقبیٰ پر ہی نظر رکھے گا اور خدا کو کریم و رحیم سمجھنے والا کبھی مایوس نہیں ہوگا۔

ہمارے بنیادی عقائد ہیں۔

اللہ تعالیٰ، رسول، انبیائے سابقہ، ملائکہ اور آخرت پر ایمان لانا نیز اس بات کو تسلیم کرنا کہ خیر و شر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ عقائد بنیاد اعمال بھی ہیں اور ان کی تہہ میں کچھ حکمتیں بھی ہیں۔ (۱۷)

## توحید:-

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

تمہارا معبود ایک ہی ہے۔

والہکم الہ واحد (۱۸)

نیز فرمایا

تم فرما دو کہ اللہ ایک ہے۔

قل ھو اللہ احد (۱۹)

یہ بھی فرمایا

تم دو معبود نہ بناؤ بلاشبہ معبود ایک

لاتتخذوا الھین اثنین انما ھو الہ واحد - (۲۰)

ہی ہے۔

توحید کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اکیلا جانے اور اس پر صحیح ایمان رکھے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ ایک ہے وہ بے مثل، اپنی ذات و صفات میں بینظیر ہے اور اپنے افعال میں لاشریک ہے اہل ایمان نے اللہ تعالیٰ کو انہی خوبیوں کے ساتھ جانا ہے۔

توحید کی اقسام:-

تین قسمیں ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کی توحید خود اسی کے لئے کہ اسے علم ہے کہ وہ اکیلا ہے۔

۲۔ خالق کی توحید مخلوق کے لئے، یعنی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ بندے توحید تسلیم کریں۔

۳۔ مخلوق کی توحید خالق کے لئے یعنی مخلوق کا جاننا کہ اللہ ایک ہے۔

حضرت جنید رضی اللہ عنہ نے توحید کی تعریف یوں کی ہے۔



التَّوْحِيدُ أَفْرَادُ الْقَدِيمِ عَنِ الْمَحْدَثِ - (۲۱)

توحید قدیم کو حادث سے جدا کر دینے کا نام ہے اس؟

- ۱۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کو ذوات حادثہ سے متمیز کیا جائے۔ صرف ذات واجب الوجود کو مقصود بنایا جائے۔
- ۲۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کو اشیائے کائنات کی صفات سے متمیز کیا جائے۔ صرف اسی کی صفات کو مطمع نظر بنایا جائے۔
- ۳۔ اللہ تعالیٰ کے افعال کو اشیائے کائنات کے افعال سے متمیز کیا جائے۔ کہ صرف وہی فاعل حقیقی ہے۔ اس کے سوا کوئی فاعل حقیقی نہیں ہے۔

اکثر صوفیاء نے حضرت جنید کی اس تعریف کی تائید کی ہے۔

### توحید کے مراتب اربعہ:-

- |                          |                               |
|--------------------------|-------------------------------|
| ۱۔ توحید عوام            | ۲۔ توحید علماء                |
| ۳۔ توحید عرفاء طبقہ خواص | ۴۔ توحید عرفاء طبقہ خاص الخاص |

### ۱۔ توحید عوام:-

حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ عوام کا عقیدہ توحید یہ ہے کہ وہ اللہ کو لاشریک اور واحد مانتے ہیں۔ ”لا مثل له ولا ضر له“ مانتے ہیں مگر اس کے علاوہ دوسروں سے امیدیں بھی رکھتے ہیں۔

### ۲۔ توحید علماء:-

یہ لوگ عقیدہ عوام کے علاوہ یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نفع یا نقصان نہیں دے سکتا۔ اس لئے نہ کسی سے ڈرتے ہیں نہ امید رکھتے ہیں۔

### ۳۔ توحید عرفاء طبقہ خواص:-

ان حضرات کا عقیدہ مندرجہ بالا دونوں طبقوں کے عقیدوں کے علاوہ یہ بھی ہے کہ خدا ہمیں دیکھ رہا

ہے ہم اس کی بارگاہ میں حاضر ہیں۔ وہ دے رہا ہے ہم لے رہے ہیں۔

اس مرتبے میں سالک کو اپنی شخصیت اور انفرادیت کا احساس باقی رہتا ہے۔

## ۴۔ توحید عرفا و طبقہ خاص الخاص:-

اس میں سالک اپنی شخصیت کو خدا میں محو کر دیتا ہے۔ اس حالت میں سالک کامل طور پر وحدت ذات کا تحقق حاصل کر لیتا ہے۔ وہ اپنی مرضی کو مرضی حق میں فنا کر دیتا ہے۔

## ارکان توحید:-

شیخ ابوبکر بن ابی اسحاق الکلابازیؒ اپنی کتاب "التعرف لمذہب اہل تصوف" میں توحید کے ارکان سات لکھے ہیں۔

۱۔ قدیم کو حادث سے منفرد کرنا۔

۲۔ قدیم کو حادث کے مشاہدے سے منزہ کرنا۔

۳۔ صفات میں مساوات کو ترک کرنا۔

۴۔ ربوبیت سے علتوں کا ازالہ کرنا۔

۵۔ اللہ تعالیٰ کو اس بات سے بالاتر کرنا کہ محدث اس میں کوئی تغیر کر سکتا ہے۔

۶۔ اللہ تعالیٰ کو ذہنی متمیز یا فاعل (خیالات) سے وراء رکھنا۔

۷۔ اللہ تعالیٰ کو انسانی قیاس سے منزہ جاننا۔

محمد بن موسیٰ الواسطی کا قول ہے کہ توحید کا حاصل یہ ہے کہ زبان جو کچھ بذریعہ الفاظ ادا کر سکتی ہے اور قوت بیان جو کچھ واضح کر سکتی ہے خواہ وہ منجملہ تعظیم ہو یا تجرید یا تفرید ہو۔ یہ سب امور معلول ہیں لیکن حقیقت ان سب سے وراء الوریاء ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ انسان خدا کے بارے میں جو بات بھی کہے گا وہ اسی کے اوصاف ہوں گے اور تمام انسانی اوصاف معلول اور محدث ہیں حالانکہ خدا اپنی صفت خود ہی کر سکتا ہے۔ بندہ وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ (۲۲)

## صفات توحید:-

کشف المحجوب میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے۔ وصل و فصل سے آزاد ہے۔ دوئی اس کے لئے روا نہیں۔ اسکی واحدانیت عددی نہیں۔ وہ محدود نہیں وہ کسی مکان میں مکین نہیں۔ اگر اس کا مکان ہوتا تو مکان کے لئے بھی مخصوص مکان کی ضرورت تھی اور فاعل اور قدیم و حادث کا حکم باطل ہو جاتا ہے۔ وہ "عرض" نہیں کہ "جوہر" کی ضرورت ہو۔ وہ "جوہر" نہیں کہ اپنی قبیل کی کسی اور چیز کا محتاج ہو۔ روح نہیں کہ جسم کا محتاج ہو۔ جسم نہیں کہ اسکی تالیف اجزاء سے ہو۔ وہ

کسی چیز میں مدغم نہیں کہ اس چیز کا جزو جنسی بن جائے۔ کس چیز سے اس کو رشتہ نہیں کہ اس کا جزو بن کر رہ جائے ہر نقصان سے بری ہے۔ ہر نقص سے پاک ہے۔ سب آفات و عیوب سے محفوظ ہے۔ اسکی کوئی مثال نہیں۔ اس کا کوئی فرزند نہیں کہ وہ اصل جدا کہلائے۔

وہ ان صفات کا مالک ہے۔ جو اہل بصیرت و معرفت اپنی بصیرت سے اسکی طرف منسوب کرتے ہیں اور جو بطل اپنی خواہشات کے مطابق صفات انکی طرف منسوب کرتے ہیں وہ ان سے بری ہے۔ اور جو خود اس نے بیان فرمائیں جی، علیم ہے روف، رحیم ہے، مدبر و قدیر ہے، سمیع و بصیر ہے، متکلم و باقی ہے۔ اس کا علم اس کے لئے مقام حال نہیں اسکی قدرت و طاقت اس پر سختی سے مسلط نہیں۔ وہ سمیع و بصیر تجدد کا محتاج نہیں۔ اس کا کلام اس سے جدا اور کٹا ہوا نہیں۔ وہ اپنی قدیمی صفات پر قائم ہے۔ (۲۳)

## آخرت:-

اکثر لوگوں کا یہ حال ہے کہ آخرت کے بارے میں زبان سے تو اقرار کرتے ہیں مگر دل ان کے اس سے غافل ہیں جب کہ یہ اٹل حقیقت ہے کہ قیامت قائم ہوگی اور اس میں جزا و سزا کے مرحلہ سے گزرنا ہوگا۔ اعمال صالحہ کے بدلے جنت اور اعمال بد کے بدلے میں دوزخ جانا ہوگا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

و نفخ فی الصور فصعق من فی السموت و من فی الارض الا اور صور کو پھونکا جائے گا تو جو کوئی آسمانوں اور زمین میں من شاء اللہ - ثم نفخ فیہ اخرى فاذا هم قیامہ ينظرون پر گمیں گے مگر جس کو اللہ نے چاہا پھر پھونکا جائے گا تو وہ دیکھتے ہوئے ٹھہرے ہوں گے۔ (۲۴)

زمین محشر اور لوگ:-

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے روز لوگوں کا حشر ایک زمین سفید خالی پر ہوگا جس پر کوئی عمارت نہ ہو

گی۔ (۲۵)

اللہ کا فرمان ہے۔

اس دن زمین اس دنیا جیسی زمین کی

طرح نہیں ہوگی۔

یوم تبدل الارض غیر الارض (۲۶)

حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ لوگ قیامت کے دن ننگے بدن ننگے پاؤں بے ختنہ کیے ہوئے اٹھیں گے اور پسینہ انکی کانوں کی لؤتک بہہ رہا ہوگا۔ (۲۷)

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے روز لوگ تین قسم کے ہو کر گئے۔ سوار، پیادہ اور سر کے بل۔ (۲۸)

اس روز کے ہول اور شدت پر غور کراے انسان! اور قیامت کے لئے اپنے آپ کو تیار کر۔  
قیامت کے دن کی بڑائی:-

رب ذو الجلال کا فرمان ہے کہ

یوم يقوم الناس لرب العلمین (۲۹)  
اس دن لوگ رب کی بارگاہ میں  
کھڑے ہوں گے۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگوں کا کیا حال ہوگا جب اللہ تعالیٰ تم کو اس طرح جمع فرمائے گا کہ جیسے ترکش میں تیر کھچا کھچ بھرے ہوتے ہیں اور پچاس ہزار برس تک تمہاری طرف نظر نہیں کرے گا۔ (۳۰)

قیامت کی ہولناکی میں لوگ گھبرا کر انبیاء کرام کے پاس جائیں گے کہ شفاعت کریں۔ سب نفسی نفسی پکار رہیں ہوں گے آخر حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوں گے۔ اور آپ ﷺ جس شخص کے لئے حکم پائیں گے شفاعت فرمائیں گے۔ (۳۱)  
اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

لا تنفع الشفاعة الا لمن اذن له الرحمن ورضی له قولا۔ کام نہ آئے گی سفارش مگر جس کو اذن  
دیا رحمن نے اور اپنی پسند کی اسکی بات۔ (۳۲)

سوال کا تذکرہ:-

قیامت کی سختی میں ہر ایک سے ایک ایک ذرہ اور تنکے تک کا سوال کیا جائے گا۔ اور اپنے اس قول کے مطابق  
عمل ہوگا۔

فورك لنستألهم اجمعین عما كانوا يعملون۔  
تیرے رب کی قسم! البتہ ہم ضرور ضروران سے سوال کریں گے۔ اعمال کے بارے میں۔ (۳۳)

## میزان اعمال کا ذکر:-

سوال کے بعد لوگ تین گروہ میں تقسیم کیے جائیں گے۔ ایک گروہ وہ ہوگا کہ جن کے پاس کوئی نیکی نہیں ہوگی انہیں دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

دوسرا گروہ وہ جن کے نامہ اعمال میں نیکی ہی نیکی ہوگی۔ ان کو جنت میں داخل کیا جائے گا۔ تیسرا گروہ وہ ہوگا کہ جن کے نامہ اعمال میں نیکیاں بھی ہوں گی اور بدیاں بھی ان کو ترازوں میں تولاجائے گا۔ اگر نیکیوں والا پلڑا بھاری رہا تو جنت ورنہ دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

## دوزخ اور اسکے احوال:-

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

وان منكم الا وار دها كان على ربك حتما اور کوئی نہیں تم میں جو نہ پہنچے گا اس پر ہو چکا ضرور تیرے مقضیاً ثم ننجي الذين اتقوا ونذر الظالمين رب پر مقرر بچا دیں گے ہم ان کو جو ڈرتے رہے اور فیہا جثیاً ۔ (۳۴) چھوڑ دیں گے گنہگاروں کو اسی میں اوندھے گرے۔

حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ جہنم میں ستر ہزار جنگل ہیں اور ہر جنگل میں ستر ہزار شعبے اور ہر شعبے میں ستر ہزار سانپ اور ستر ہزار بچھو ہیں۔ کافر اور منافق جب تک ان سب سے نہیں ملتا تب تک اپنے انجام کو نہیں پہنچتا۔

حضور ﷺ نے فرمایا اگر ایک ڈول جہنم کے غساق کا دنیا میں ڈال دیا جائے تو تمام باشندے بد بو مھر جائیں۔ اور یہی ان کو پینے کو ملے گا جب پیاس سے فریاد کریں گے۔ (۳۵) چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

ليسقى من ماء حديد يتجرله ولا يكاد ليسيغه اور پلا دیں گے اس کو پانی پیپ کا گھونٹ گھونٹ کر پیتا ويا تيه الموت من كل مكان و ما هو بميت ۔ ہے اس کو اور گلے سے نہیں اتار سکتا اور چلی آتی ہے اس پر موت ہر جگہ سے اور وہ نہیں مرتا۔ (۳۶)

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

كلما نضجت جلودهم بدلناهم جلودا غيرها جس وقت پک جائے گی کھال ان کی بدل کر دیوں گے ان کو اور کھال۔ (۳۷)

حضرت حسنؑ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ آگ دوزخیوں کو ایک دن میں ستر ہزار بار کھالیا کرے گی تو حکم ہوگا کہ ہر بار پھر ویسے ہی ہو جاؤ وہ فوراً جوں کے توں ہو جاویں گے۔  
اے بندہ خدا دوزخیوں کے رونے کا فکر اور ان کی چنگھاڑ اور تباہی اور خرابی پکارنے کا خیال کر کہ یہ باتیں ان کو آگ میں ڈالتے وقت مسلط کی جائیں گی۔  
جنت کی کیفیت اور اس کی راحت کی اقسام:-  
اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

و نو دوا ان تلکم الجنة اور ثتموها بما کنتم آواز آئی یہ جنت ہے وارث ہوتے تم اسکے بدلے اپنے تعملون (۳۸) کاموں کے۔

دوسرے مقام پر فرمایا۔

ولمن خاف مقام ربہ جنتان (۳۹) اور جو اللہ سے ڈرا اس کے لئے دو جنتیں ہیں۔

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ دو جنتیں چاندی کی ہوں گی۔ اس میں ہر چیز استعمال کی چاندی کی ہوں گی اور دو جنتیں سونے کی ہوں گی اور ان میں چیزیں بھی سونے کی ہوں گی۔ (۴۰)  
حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے ایک مرتبہ یہ آیت پڑھی  
وسیق الذین اتقوا ربہم الی الجنة زمرا۔ اور ہانکے گئے جو ڈرتے رہے تھے اپنے رب سے بہشت کو جھتے جھتے۔ (۴۱)

اور آپ نے فرمایا کہ جب یہ لوگ جنت کے کسی دروازے پر پہنچے گے تو اس کے پاس درخت دیکھیں گے۔ جس کی جڑ کے پاس دو چشمے بہتے ہوں گے۔ وہ بموجب حکم کے ان دونوں میں سے ایک کا قصد کریں گے اور اس کا پانی پیئیں گے۔ اس کے پیتے ہی پیٹ میں جو ایزد ہوگی یا حاجت ہوگی جاتی رہے گی۔ پھر دوسرے چشمے کا قصد کریں گے اور اس سے نہادیں گے اس پر رحمت کی شادابی عیاں ہوگی۔ پھر کبھی اس کے بالوں میں فرق نہ پادے گا۔ اور الجھنے اور میلے ہونے نہ پادیں گے ہر وقت ایسے معلوم ہوں گے جیسے تیل پڑا ہوا ہے پھر جنت تک پہنچے گے تو جنت کا داروغہ اس سے

کہے گا۔

سلام علیکم طبتم فاد خلوہا خالدین سلام پہنچے تم پر، تم لوگ پاکیزہ ہو سو داخل ہو اس میں سدا رہنے کو۔ (۴۲)

پھر ان سے لڑ کے ملیں گے اور ان کا ایسا استقبال کریں گے جیسے کوئی رشتہ دار دنیا میں دور سے آیا کرتا ہے اور وہ غلمان ان سے کہیں گے کہ تجھ کو بشارت ہو اس کرامت کی جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تیار کی ہے۔ پھر ایک لڑکا اس جنتی کی کسی حور سے کہے گا کہ فلاں شخص آیا ہے اور وہی نام لے گا جو دنیا میں اس کا تھا وہ کہے گی کہ تو نے اس کو دیکھا ہے لڑکا کہے گا کہ ہاں دیکھا ہے اور وہ میرے پیچھے آتا ہے وہ حور خوشی کے مارے اٹھے گی اور اپنے دروازے کی دہلیز پر پیشوائی کو آکھڑی ہوگی جب جنتی اپنے گھر میں داخل ہوگا تو دیکھے گا کہ پیخڑوں کی جگہ موتی ہیں۔ اور ان پر ایک عمارت عایشان سرخ زرد سبز ہر ایک رنگ کی بنی ہے پھر اپنا سراٹھائے گا تو چھت بجلی سے چمکتی نظر آئے گی اور اگر اللہ تعالیٰ نظر کی قدرت نہ دیتا تو کیا عجب تھا کہ اس کی چمک سے نظر جاتی رہتی پھر اپنی نظر کو نیچی کرے گا تو دیکھے گا کہ اس کی پیبیاں ہیں اور پیالے رکھے ہوئے فرش بچھے ہوئے اور تکیے لگے ہوئے ہیں۔ پھر تکیہ لگا کر کہے گا کہ خدا کا شکر ہے جس نے ہم کو اس پر ہدایت کی۔ اگر خداوند تعالیٰ ہدایت نہ فرماتا تو ہم اس قابل نہ تھے کہ راہ پاتے۔ پھر ایک منادی پکارے گا کہ تم زندہ رہو گے کبھی مرو گے نہیں اور ٹھہرو گے کبھی سفر نہیں کرو گے اور تندرست رہو گے کبھی بیمار نہیں ہو گے۔

جنت کی راحتیں اور انعامات بے شمار ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے حصول کی توفیق عطا فرمائے۔

آخرت پر ایمان لانا گویا نظریہ مکافات عمل کو تسلیم کرنا ہے۔ دنیا کے حکماء نے کہا ہے کہ

چاہ کن را چاہ در پیش

انگریزی میں ایک کہاوت ہے۔

You shall be paid in the same Coin.

فارسی میں ایک مشہور شعر ہے۔

از مکافات عمل غافل مشو گندم از گندم بروید جوز جو

ہر عمل کا ایک صلہ ہے جو اس سے کسی صورت جدا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ صلہ کہیں عیاں ہوتا ہے مثلاً آگ یا بچھو کو

ہاتھ لگانا، زہر کھانا، بلندی سے گرنا وغیرہ اور کہیں پنہاں مثلاً رشوت کھانا، دوسروں کو ستانا اور کسی کی عزت میں ہاتھ ڈالنا

مختلف قسم کی سزاؤں کا شکار ہوتے ہیں۔ مثلاً گرفتاری، بیماری، حادثات یا شدید ذہنی بیماری۔

آج کل کے عیاش امراء اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ شاہد رب ذوالجلال ان کے عمل کو نہیں دیکھ رہا۔ وہ اک نگاہ غضب سے ان کے گھروں میں آگ لگا سکتا ہے۔ جب فرعون، نمرود، چینگیز، ہلاکو اور دیگر لاکھوں ارباب تاج و تخت اسکی آہنی گرفت سے نہیں بچ سکتے تو آج کل کے عیاش کس کھاتے میں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

ام حسب الذین لایعلمون السيئات ان کیا بدکار لوگوں کا خیال یہ ہے کہ وہ ہم سے بچ نکلیں گے یہ  
یسبقوننا ساء ما یحکمون (۲۳) خیال کتنا غلط ہے اور بودا ہے۔

جس طرح بلب یا پنکھے کا سوئچ آن کرنے سے وہ چل پڑتا ہے اسی طرح گناہ کرنے کے بعد خدائی انتقام کی چکیاں خود بخود حرکت میں آ جاتی ہیں اور بدکار کو پس کر رکھ دیتی ہیں۔

جو شخص مکافات عمل کا قائل نہیں ہے وہ گویا اللہ تعالیٰ سے قطعاً نہیں ڈرتا اور اپنی جہالت و حماقت سے پٹ کر رہ جاتا ہے۔  
حضور ﷺ کو بھی معراج کی رات جہنم اور جنت کے چند مناظر دکھائے گئے تھے جس سے نظریہ مکافات عمل پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ (۲۴)

## رضاء و محبت الہی کا حصول

### ۱۔ رضاء:-

رضائے الہی کتاب و سنت اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

”و رضوا عنه“ (۲۵) وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔

نیز یہ بھی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذ یبا یعونک اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں سے راضی ہوا جنہوں نے درخت

تحت الشجرہ (۲۶) کے نیچے آپ ﷺ سے بیعت کی۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔



ذاق طعم الايمان من رضى بالله رباً (۱۱) اس نے ایمان کا ذائقہ پایا جو اللہ کے رب ہونے پر راضی ہو گیا۔ (۱۷)

۲۔ صورتِ رضا:-

رضاء کی دو صورتیں ہیں۔

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کا بندے سے راضی ہونا۔ دوسری یہ کہ بندہ کا اللہ تعالیٰ سے راضی ہونا ہے۔

خداوند تعالیٰ کے راضی ہونے کی حقیقت یہ ہے کہ وہ بندے کو ثواب و نعمت اور کرامت سے نوازے۔ اور بندے کا خدائے واحد سے راضی ہونے کی حقیقت یہ ہے کہ اس کے فرمان پر عمل کرے۔ اس لئے کہ رضائے بندہ، رضائے خدا پر موقوف ہے۔

امیر المومنین حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے آگے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا یہ قول رکھا گیا۔

الفقرا حب الی من الغناء والسقم احب الی میرے نزدیک مفلسی تو نگری سے اور بیماری صحتندی سے من الصحت۔ زیادہ محبوب ہے۔

اس پر حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ فرمایا۔

رحم الله اباذر اما انا اقول من اشرف على الله تعالى ابوذر پر رحم فرمائے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ حسن اختیار اللہ لہ لم یتمن غیر ما اختار اللہ نے بندے کے لئے جو اختیار فرمایا ہے۔ بندہ خدا کے اختیار کردہ حالت کے سوا کسی اور حالت کی آرزو نہ کرے۔

اللہ تعالیٰ بندے کے لئے جو پسند فرمائے بندہ اسی کو چاہے۔

معاملاتِ رضا کی حقیقت:-

معاملاتِ رضا کی حقیقت بندے کی پسندیدگی ہے کہ وہ یقین رکھے کہ منع و عطا اللہ تعالیٰ کے علم سے ہے اور وہ اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ تمام حالات سے باخبر اور دیکھنے والا ہے۔

اس سلسلہ میں علماء کے چار گروہ ہیں۔

ایک گروہ وہ ہے جو خدا کی عطا پر راضی ہو یہ معرفت ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو نعمتوں پر راضی ہو یہ دنیا کے اندر ہے۔

تیسرا یہ کہ مصائب و ابتلاء پر راضی رہے۔ چوتھا یہ کہ برگزیدگی پر راضی ہو یہ محبت ہے۔ (۱۸)  
اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

لَا يَمْلِكُونَ لِنَفْسِهِمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا وَلَا يَمْلِكُونَ دَهْ أَفْنِي جَانُودِ الْفَيْعِ وَنَقْصَانِ الْكَالِكِ لَا يَمْلِكُونَ  
مُوتًا وَلَا حَيَاةً وَلَا نَشُورًا (۱۸) موت و حیات اور مرنے کے بعد اٹھنے کے مالک ہوتے  
ہیں۔

لہذا غیر حق پر راضی ہونا نقصان کا موجب اور اللہ تعالیٰ سے راضی ہونا رضوان کا سبب ہے اسلئے کہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہونا  
صریحاً بادشاہت ہے اور اسی میں عافیت ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا ہے

مَنْ لَمْ يَرْضَ بِاللَّهِ وَبِقَضَائِهِ شُغْلَ قَلْبِهِ وَتَعَبَ جُودَ اللَّهِ تَعَالَى كِي رِضَا أَوْ اس كِي قِضَا پَر رَاضِي نہ ہو اس نے  
بد نہ (۱۹) اپنے دل کو تقدیر و اسباب میں مشغول کر کے بدن کو سختی میں  
ڈال دیا۔

## محبت الہی کا حصول :-

محبت الہی سب مقامات سے انتہا درجہ کی غمایت اور سب میں بلند رتبہ رکھتی ہے۔ اس لئے کہ دیگر مقامات یا تو  
اس کے توابع اور ثمرات ہیں یا کچھ مقدمات ہیں۔ محبت الہی کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر موافقت کی  
جائے۔

لغت میں محبت کا لفظ حب سے مشتق ہے۔ اور حب کے معنی تخم کے ہیں لہذا حب کا حب رکھا گیا کیونکہ اصل حیات اسی میں  
ہے۔ جب محبت کا بیج دل میں جگہ پکڑتا ہے تو اسے حضور و غیبت، بلا و ابتلاء، مشقت، راحت و لذت اور فراق و وصال کوئی  
چیز نہیں بدل سکتی اسی معنی میں محبت جب طالب کے دل میں پیدا ہوتی ہے تو پھر اس دل میں محبوب کے کلام کے سوا کوئی  
جگہ نہیں رہتی۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب خلعت غلت سے سرفراز فرمایا تو وہ صرف کلام حق کے ہو کر رہ گئے۔  
اللہ تعالیٰ نے ان کے حال و قال کی ہمیں اس انداز میں خبر دی

نَانَهُمْ عَدُو لِي الْا رَب الْعَلَمِينَ - (۵۰) یہ سب میرے دشمن ہیں بجز رب العلمین کے۔

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

سمیت المحبة لانها تمحو القلب ما سوى محبت اسی لئے نام رکھا گیا ہے کہ وہ دل سے محبوب کے ماسوا  
المحسوب۔ کو مٹا دیتا ہے۔

محبت الہی کے وجود پر قرآن کا ارشاد ہے۔

يَحِبُّهُمْ وَ يَحْبُوْنَهُمْ - (۵۱) وہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔  
دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَالَّذِينَ اٰمَنُوا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ - (۵۲) اہل ایمان کی محبت اللہ تعالیٰ سے زیادہ ہے۔

ان دونوں آیات سے معلوم ہوا کہ محبت کا وجود بھی ہے اور اس میں تفاوت بھی ہوتا ہے۔  
آنحضرت ﷺ نے بہت سی احادیث میں محبت الہی کو شرط ایمان فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا۔

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ يَكُونَ لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ حُبٌّ تَمَّ مِنْ سَائِرِ مَوْنٍ هُوَ يَحِبُّهُمُ اللَّهُ وَ رَسُوْلَهُ  
اليه مما سواهما - (۵۳) اللہ اور اس کے رسول سے محبت اس کے ماسوا سے زیادہ  
ہو۔

### محبت کی حقیقت :-

بندے کی اللہ تعالیٰ سے محبت یہ ہے کہ وہ اس کی اطاعت کرے۔ اور اسکی عادت اس کے ذکر کے ساتھ ہو  
جائے۔ غیر کی یاد یا غیر کے ذکر سے نفرت کرنے لگے۔

اور اللہ تعالیٰ کی محبت اپنے بندے کے لئے یہ ہے کہ اس پر نعمت کی ارزانی فرمائے۔ اور دنیا و آخرت میں اجر و ثواب عطا  
فرما کر مقام سزا سے اسے محفوظ رکھے۔ اور اسے ارتکاب معاصی سے بچا کر مقامات علیا سے سرفراز فرمائے۔

محبت کی قسمیں :- دو قسمیں ہیں۔

ایک جنس کی محبت دوسری ہم جنس کے ساتھ۔ جو میلان طبع کی وجہ سے ہوتی ہے۔ نفس پرستی ہے دوسری جنس کی

محبت غیر جنس کے ساتھ۔ ایسی محبت کی کسی صفت پر سکون و قرار حاصل کرنا ہے۔ مثلاً محبوب کا کلام سننا یا دیدار حاصل کرنا وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے حضرات دو طرح کے ہیں۔ ایک تو وہ جو انعام و اکرام کی بدولت منعم و محسن کی محبت کے متقاضی ہوئے۔

دوسرے وہ جو ان انعامات کو غلبہ محبت میں مقام حجاب تصور کرتے ہیں۔ نعمتوں پر نظر کرنے کی بجائے ان کا طریق نعمت دینے والے کی طرف ہوتا ہے یہ مقام پہلے سے زیادہ ارفع و اعلیٰ ہے۔  
محبت میں مشائخ کا طریق:-

حضرت سمنون الحب رحمۃ علیہ فرماتے ہیں کہ محبت تو راہ خدا کی اساس اور بنیاد ہے۔ اسی پر تمام احوال و مقامات اور منازل کی بنا ہے۔  
ایک شیخ کا ارشاد ہے۔

الحب عند الزهاد اظهر من الاجتهاد۔ زاہدوں کے نزدیک محبت اجتہاد سے زیادہ ظاہر ہے۔

حضرت عمرو بن عثمان مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ”کتاب محبت“ میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قلوب کو ان کے اجسام سے سات ہزار سال قبل پیدا فرمایا اور انہیں اپنے قرب خاص میں رکھا۔ اس کے بعد محبت کے درجہ میں رکھا پھر اس کے باطن کو ان کے اجسام سے سات ہزار سال قبل پیدا کیا اور انہیں وصل کے درجہ میں رکھا۔ اور روزانہ ۳۶۰ مرتبہ ظہور جمال سے باطن کو تجلی بخشی اور تین سو ساٹھ مرتبہ نظر کرامت ڈالی پھر محبت کا کلمہ سنایا اور ۳۶۰ مرتبہ دلوں پر انس و محبت کے لطائف ظاہر کیے یہاں تک کہ انہوں نے ساری کائنات پر نظر ڈالی تو کسی مخلوق کو اپنے سے زیادہ صاحب کرامت نہ پایا۔ فخر و غرور کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان سب کا امتحان لیا۔ باطن کو جسم سے مقید کر کے روح کو دل میں مجبوس کیا۔ اور دل کو جسم میں رکھا پھر عقل میں ان کو شامل کیا اور انبیاء کرام علیہم السلام کو بھیج کر انہیں حکم دیا۔ اس کے بعد جو اپنے مقام کا متلاشی ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اسے نماز کا حکم دیا تاکہ جسم تو نماز میں ہو اور دل محبت الہی میں اور جان قربت کا مقام حاصل اور باطن وصال حق سے سکون و قرار پائے۔

یہ سب محبت کی تعبیرات ہیں نہ کہ عین محبت اس لئے کہ محبت حال ہے اور حال کو کسی صورت الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

## محبت الہی:

محبت ایک نہایت لطیف، پاکیزہ جذبہ اور احساس ہے۔ محبت کی اعلیٰ ترین قسم، اللہ کی محبت ہے۔ یہ جذبہ محبت، عقلی اور روحانی قوتوں کے فروغ، کائنات میں غور و فکر آیات قرآنیہ میں حسن تدبیر، کثرت سے یاد الہی اور اس کے اسماء حسنی صفات عالیہ کے ذکر پیدا ہوتا ہے۔ جب محبت کی جڑیں مضبوط ہو جاتی ہیں اور یہ جذبہ راسخ ہو جاتا ہے تو پھر انسان کا مطلوب و مقصود ذات الہی بن جاتی ہے۔ انسان ہر چیز پر اللہ کو ترجیح دیتا ہے۔ اپنی ہر چیز اسکی خاطر قربان کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ وہ حلاوت ایمانی سے لذت یاب ہو چکا ہوتا ہے۔ لذت یقین اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی ہوتی ہے۔ جب انسان کا تعلق اللہ سے مضبوط ہو جاتا ہے تو پھر اس کی نگاہ میں دنیا کی ہر لذت اور کشش حقیر اور پیچ معلوم ہونے لگتی ہے۔

حضرت انسؓ رسول کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

ثلاث من كن فيه وجد حلاوة الايمان ان يكون تین صفات ایسی ہیں جس میں یہ پائی جائیں تو اس اللہ و رسولہ احب الیہ معاسوا هما وان میں ایمان کی حلاوت پائی جاتی ہے۔ اللہ اور اس کا یحب المرء لا یحبہ الا لله و ان یکره ان یعود رسول ﷺ اسے ان کے علاوہ ہر ایک سے زیادہ محبوب ہو وہ فی الکفر کھا یکره ان یقذف فی النار۔ کسی شخص محبت کرے تو صرف اللہ کے لئے کرے۔ اسے کفر اختیار کرنا، آگ میں ڈالے جانے کی طرح ناپسندیدہ

(۵۵)

ہو۔

محبت الہی کا یہ مقام نفس کی درستی اور سلامتی قلب کی علامت ہے۔ انسان اس وقت تک کوئی کمال حاصل نہیں کر سکتا جب تک اسے اللہ کے جمال و جلال کی معرفت حاصل نہ ہو۔ اللہ کے برواحسان کا گہرا شعور نصیب نہ ہو۔ اس کی مہربانیوں اور قدرتوں کا اور اک نہ ہو اور اس کی رحمت و حکمت کا انسان نے مشاہدہ نہ کر لیا ہو۔ اگر کسی شخص کے دل میں ابھی تک اللہ کے قرب سے زیادہ کسی اور چیز کو زیادہ اہمیت حاصل ہے تو اس کا صاف مفہوم یہ ہے کہ ابھی تک اس کا نفس مریض اور اس کا ایمان ناقص ہے۔ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے:

قل ان كان ابائكم و ابناؤكم و اخوانكم و اكهه دو كه اكر تمهارے باپ اور بیٹے، بھائی اور بیویاں  
زواجكم و عشير نكم و اموال اقتر فتموها و اور خاندان كے آدمی اور مال جو تم كھاتے هو اور تجارت  
تجارة تخشون كساد هاومسا كن ترضو نها جس كے بند هونے سے ڈرتے هو اور مكانات جن كو پسند  
احب اليكم من الله ورسوله وجها دفی سبيله كرتے هو، الله اور اس كے رسول سے اور الله كی راه ميں  
فتر بصوا حتى ياتى الله بامرہ والله لا يهدى جماد كرنے سے تمھیں زيادہ عزيز هوں تو انتظار كرو يہاں  
القوم الفاسقين۔ (۵۶) تک کہ اللہ اپنا حکم (عذاب) بھیجے اور خدا نافرمان لوگوں  
کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی اس محبت کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا:

والذین امنوا اشد حبالہ۔ (۵۷) وہ لوگ جو ایمان لائے وہ اللہ سے شدید محبت کرتے ہیں۔

یعنی مشرک اپنے معبودوں سے اتنی محبت نہیں کرتے، جتنی مومن اللہ سے کرتے ہیں۔

ارشاد الہی ہے۔

وَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ  
(۵۸)

اللہ ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور  
جس سے وہ محبت کریں گے۔

آنحضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسی محبت کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

احبوا الله لما يغذوكم به من نعمه واحبوني الله سے محبت رکھو تو وہ تمہیں اپنی نعمتوں سے سرفراز فرمائے  
 احب الله اياي (۵۹) گا اور خاص اللہ کی محبت کی وجہ سے مجھ بھی محبت رکھو۔

(ترمذی نے ابن عباس سے روایت کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے)

رسول اکرم ﷺ، بارگاہ الہی میں تضرع و زاری کے ساتھ دعا کرتے کہ اللہ انہیں یہ محبت عطا فرمائے۔ آپ کی

وعا کے الفاظ یہ تھے۔

اسالك حبك وحب من يحبك وحب عمل يقر اے اللہ! میں تجھ سے تیری محبت کا سوال کرتا ہوں اور بنی الی حبك۔ (۴۵) اس کی محبت کی درخواست کرتا ہوں جو تجھ سے محبت کرتا ہو اور ایسے عمل کی محبت چاہتا ہوں جو (عمل) مجھے تیری محبت کے قریب کر دے۔

## اللہ کی اپنے بندوں سے محبت

انسان کا اپنی زندگی میں بلند ترین اور اعلیٰ ترین و رافع مقصد، محبت الہی اور رضائے پروردگار ہے۔ اللہ تعالیٰ جب کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو اسے نیکیوں کی توفیق عطا فرماتا ہے۔ بلند ترین غرض و غایت تک پہنچنے کے لئے انسان کی نصرت و اعانت فرماتا ہے۔ یوں انسان جملہ پیش آمدہ مصائب و تکالیف سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

محبت الہی کے حصول کا طریق کار واضح اور معلوم ہے۔ اس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ رسول ﷺ کی متابعت کی جائے۔ آپ کے اقوال اور اعمال کی پیروی کی جائے۔ آپ ﷺ کے خلاق و آداب کو اپنایا جائے۔ حب الہی کے حصول کا صحیح راستہ یہی ہے۔ کمال ایمان اور صداقت یقین کی علامت بھی یہی ہے۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں۔

قل ان كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله (اے پیغمبر لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ویغفر لکم ذنوبکم واللہ غفور رحیم

ہو تو میری پیروی کرو خدا تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے (۴۱) گناہ معاف کر دے گا اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

جو شخص قرب الہی کے لئے کوشاں ہو، اس کے لئے لازم ہے کہ وہ اسلامی قوانین پر عمل کرے، شعائر اسلام کو اپنائے۔ فرائض و نوافل ادا کرے اور اپنی ان تمام ذمہ داریوں کو بطریق احسن ادا کرے جو اسلام کی طرف سے اس پر عائد ہوتی ہیں۔

ان الله تعالى قال : من عادى لي وليا فقد اذنت للحرب. وما تقرب الي عبدي بشئى : الله تعالى فرماتا ہے۔ جس نے میرے ولی سے عداوت احب الي مما افترضته عليه۔ وما يزال عبدي ركعى، میں اس کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہوں۔ میرے يتقرب الي بالنوافل حتى احبه۔ فاذا احينه۔ بن میرا بندہ نوافل کے ذریعہ برابر میرے قریب ہوتا كنت سمعه الذى يسمع به۔ وبصره الذى يبصر به۔ ورجله التى يمشى بها۔ ولئن سالنى اعطيته ولئن بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے۔ اور اس کی نگاہ بن استعاذى بى لا عبذنه استعاذى بى لا عبذنه جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے مانگے تو میں اسے دیتا ہوں اور اگر میری پناہ چاہے تو میں اسے ضرور اپنی پناہ دیتا ہوں۔

(۶۲)

اللہ کے محبوب اس کے وہ خلفاء ہیں جو اس کے اخلاق سے متصف ہوتے ہیں۔ ہر چیز کے حق سے آگاہ ہوتے ہیں اور ہر کام کو اس کے موقعہ محل کے مطابق ادا کرتے ہیں۔ وہ مومنوں کے لئے سراپا سلامتی و رحمت ہوتے ہیں۔ کافروں کے لئے درشت اور سخت ہوتے ہیں۔ وہ ہر آن کلمۃ اللہ کی سر بلندی کے لئے مستعد اور تیار ہوتے ہیں۔ وہ بہر حال حق کے مددگار ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں موت کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔

فسوف يأتى الله بقوم يحبهم ويحبونه اذلة خذا لیسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے اور جسے على المومنين اعزة على الكافرين يجاهدون وہ دوست رکھیں۔ اور جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں اور فى سبيل الله ولا يخافون لومة لا اثم ذلك کافروں سے سختی سے پیش آئیں، خدا کی راہ میں جہاد کریں فضل الله يوتيه من يشاء والله واسع عليم۔ اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں۔ یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے اور اللہ بڑی کشائش والا اور جاننے والا ہے۔

(۶۳)

لباس اور جسم کی صفائی، قلب اور عقل کی تطہیر، اخلاق و کردار کی پاکیزگی، براہ راست اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔



ان الله يحب التوا بين ويحب المتطهرين۔ کچھ شک نہیں کہ اللہ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ جسم و لباس اور قلب و عقل کی نجاست اللہ تک پہنچنے کے راستہ میں رکاوٹ ہے۔

انما المشركون نجس (۶۸) بے شک مشرک تو پلید ہیں۔

ويجعل الرجس على الذين لا يعقلون۔ اور جو لوگ بے عقل ہیں ان پر وہ (کفر و ذلت کی) نجاست ڈالتا ہے۔

اللہ خود نظیف ہے، نظافت کو پسند کرتا ہے۔ طاقتور ہے، بہادر کو پسند کرتا ہے، سخی ہے سخیوں کو پسند کرتا ہے۔ غیور ہے غیرت مند کو پسند کرتا ہے۔ رسول ﷺ فرماتے ہیں:

ان الله طيب يحب الطيب، نظيف يحب الله تعالى پاک ہے، عمدہ چیزوں کو پسند کرتا ہے۔ صاف ہے النظافة كريم بحب الكرم جواد يحب الجود، صفائی کو پسند کرتا ہے، شریف ہے شرافت کو پسند کرتا ہے۔ فنظفوا فنيتم ولا تشبهوا باليهود۔ فیاض ہے، سخاوت کو پسند کرتا ہے۔ تم اپنے ہمین صاف رکھا کرو اور یہودیوں کی طرح نہ ہو جاؤ۔

اللہ کی نعمت کا اعتراف اور اس پر اس کی حمد و تعریف کرنا، ایک عمل صالح ہے۔ رسول ﷺ فرماتے ہیں۔

ان الله ليرضى عن العبد إذا كل الاكلة فيحمد الله تعالى اس بندہ پر راضی ہوتا ہے، جو کھانا کھا کر اس کا شکر ادا کرتا ہے اور پانی (وغیرہ) پی کر اس کا شکر بجالاتا ہے اور اس کی حمد و تعریف کرتا ہے۔

آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔

راس الشكر الحمد لله ان الله يحب ان يحمد سب سے بڑا شکر الحمد لله (یعنی اللہ کی تعریف کرنا) ہے۔ اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے کہ اس کی حمد کی جائے۔

اسلام نے عظیم الشان کارنامے سرانجام دیئے اور بنی نوع انسان کے مفاد کے لئے کام کرنے کا ایک وسیع میدان فراہم کیا ہے۔ لوگوں کو موقع دیا ہے کہ وہ نیکی اور بھلائی میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا مقابلہ کریں۔ صبر و ثبات، استقامت و جہاد، حق و عدل اور توکل و تقویٰ جیسی اعلیٰ صفات اپنانے کے لئے ایک وسیع جولا نگاہ ہے۔ مندرجہ ذیل آیات کریمہ پر غور کرنے سے واضح ہوگا کہ قرآن کریم ہمیں قدم قدم پر خیر و بر (نیکی اور بھلائی) کی تلقین کرتا اور ترغیب دیتا ہے۔

و کاین نبی قاتل معہ ربیون کثیر فما وھنوا اور بہت سے نبی ہوئے ہیں جن کے ساتھ ہو کر اکثر اہل  
لما اصابھم فی سبیل اللہ وما ضعفوا وما اللہ (خدا کے دشمنوں سے) لڑے ہیں تو جو مصیبتیں ان پر  
اسنکنوا واللہ یحب الصابرین راہ خدا میں واقع ہوئیں ان کے سبب انہوں نے نہ تو  
(۷۵) ہمتھاری اور نہ بزدلی کی نہ دے اور اللہ استقلال رکھنے  
والوں کو دوست رکھتا ہے۔

ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفا جو لوگ اللہ کی راہ میں (ایسے طور پر) پرے جما کر لڑتے  
کانھم بنیان مرصوص۔ ہیں کہ گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں جسے شک محبوب  
(۷۱) کردگار ہیں۔

واقسطوا ان اللہ یحب المقسطین۔ اور انصاف سے کام لو۔ کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو  
(۷۲) پسند کرتا ہے۔

ان اللہ یحب المتوکلین۔ (۷۳) اللہ توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔  
واحسنوا ان اللہ یحب المحسنین۔ اور نیکی کرو۔ بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا  
(۷۴) ہے۔

بلی من اوفی بعہدہ واتقی فان اللہ یحب ہاں جو شخص اپنے اقرار کو پورا کرے اور (اللہ) سے ڈرے تو  
المتقین۔ اللہ ڈرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ (۷۵)

اسی طرح احادیث میں بہت سی ایسی صفات و عادات بیان کی گئی ہیں جن کو اپنا کر فرد اور جماعت ترقی کے  
انتہاء کمال تک پہنچ سکتے ہیں۔

رسول اکرم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں۔

ان الله يحب اذا عمل احدكم عملا ان يتقنه۔ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند کرتا ہے جب تم میں سے کوئی شخص ان کوئی کام کرے تو اسے نہایت خوبی اور مہارت کے ساتھ ادا کرے۔ (۷۶)

(ابو یعلیٰ اور ابن عساکر نے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے)

ان الله يحب اغاثة اللهفان (۷۷) اللہ تعالیٰ مصیبت زدہ کی فریاد رسی کو پسند فرماتا ہے۔ (یعنی جب کوئی اس کی نصرت اور اعانت کرے)

ان الله يحب الرفق في الامر كله (۷۸) اللہ تعالیٰ ہر بات میں نرمی کو پسند کرتا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے کہ مومن اپنے قول و فعل میں نرمی اور رفق سے کام لے، دین اور دنیا کے تمام امور میں زیادہ آسان کام کو اختیار کرے، لوگوں اور خاص طور پر قریبی رشتہ داروں کے ساتھ نرمی اور خاکساری سے پیش آئے۔ (۷۹)

## خوفِ خدا

### خوف:

عصر حاضر کے دیگر فسادات ایمانی میں سے سب سے زیادہ قابل افسوس بات مسلمانوں میں خوفِ الہی کی عدم موجودگی ہے یہ حقیقت ہے کہ ہم لوگ خوفِ الہی کے تصور اور خشیت کی کیفیت سے قطعاً عاری ہو چکے ہیں۔ اگر ہم حضور ﷺ کی سیرت طیبہ اور ان کے شب، روز کے معمولات دیکھیں اور کتب حدیث کے حوالے سے آپ ﷺ کی عبادات اور اطاعت کی کیفیت کا مطالعہ کریں تو ہمارے رو لگنے کھڑے ہو جائیں۔

آقائے دو جہاں ﷺ جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہر گناہ و معصیت سے کلیتاً معصوم پیدا فرمایا ان کی حیات مقدسہ میں خوفِ الہی کا یہ عالم تھا کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ جب اذان کا وقت قریب آنے لگتا تو حضور ﷺ کے چہرہ پاک کا رنگ متغیر ہونے لگتا اور آپ ﷺ سہم جاتے آپ ﷺ خشیت کا عالم طاری ہو جاتا اور جب نماز کی حالت میں

داخل ہوتے تو اس وقت تک ان کی یہ کیفیت ہو جاتی کہ جیسے آپ ﷺ کا دنیا میں کسی سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے اور نہ ہم میں سے کسی کو جانتے ہیں یعنی آپ خوف الہی کی وجہ سے سب کچھ بھول جاتے۔

حضور ﷺ جب رات کو اٹھتے تو اللہ کی یاد میں اس قدر روتے کہ اکثر بچکی بندھ جاتی۔ صحیح بخاری میں ایک صحابی سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ

ایک دن حضور ﷺ کی زیارت اور شرف ملاقات حاصل کرنے کے لئے بارگاہ رسالت پناہ ﷺ میں حاضر ہوا تو حضور نماز میں مصروف تھے اور اس قدر آہ و زاری سے رو رہے تھے کہ آپ ﷺ کے سینہ مبارک سے ایسی آواز سنائی دے رہی تھی جیسے ہنڈیا کے ابلنے کے وقت اس سے آواز آتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ کا یہی رنگ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگیوں پر بھی غالب تھا۔ چنانچہ ہم فیض یافتگان نبوی ﷺ میں سے جسے بھی دیکھیں وہ خوف الہی کا ایک پیکر نظر آتا ہے خوف الہی کی یہی کیفیت ہمیں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں نظر آتی ہے۔

### حضرت یحییٰ علیہ السلام کا خوف الہی:

حضرت یحییٰ علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ نبی تھے اپنی حیات مطہرہ کے بالکل ابتدائی حصہ میں جب کہ آپ ابھی معصوم بچے تھے پہاڑوں اور جنگلوں میں نکل جاتے اور یاد الہی میں اتنا روتے کہ جو بھی آپ کو دیکھتا اس پر یہی کیفیت طاری ہو جاتی۔

ایک مرتبہ آپ پہاڑ پر مصروف عبادت تھے اور اللہ کے خوف میں زار و قطار رو رہے تھے آپ سجدہ میں گرے ہوئے تھے ادھر آپ کی والدہ ماجدہ پریشانی کی حالت میں پھرتی پھرتی آپ کی تلاش میں وہاں آ پہنچیں۔ دیکھا کہ آپ بحالت سجدہ رو رہے ہیں۔ والدہ کے قریب آنے پر قدموں کی آہٹ سن کر حضرت یحییٰ نے اپنا سر مبارک سجدہ اٹھایا لیکن موت کا اس قدر دھیان تھا کہ آپ نے سمجھا کہ شاید ملک الموت روح قبض کرنے کے لئے آ گیا ہے آپ اس حالت میں فرمانے لگے۔ ”اے ملک الموت تھوڑی دیر ٹھہر میں اپنی ماں کو مل آؤں وہ میری وجہ سے پریشان ہوگی۔ تب آپ کی والدہ نے فرمایا بیٹا میں تمہاری ماں ہی تو ہوں۔“

ماں کی متنا معصوم بچے کو دیکھ کر نہ رہا گیا اور فرمانے لگیں ”بیٹا! تم اتنا کیوں روتے ہو حالانکہ تم ابھی تک معصوم بچے ہو اس عمر میں اللہ کے خوف میں اس قدر رونے کی کیا وجہ ہے؟“

اس پر حضرت یحییٰ علیہ السلام اپنی والدہ ماجدہ سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے ”امی جان! اگر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مجھ سے ناراض ہو جائے اور مجھے مستحق عذاب قرار دیتے ہوئے جہنم میں ڈالنے کا فیصلہ صادر فرمادے تو کیا آپ

مجھے اس عذاب الہی سے بچالیں گی؟“

ان کی والدہ نے فرمایا ”نہیں بیٹے! میں نہیں بچاسکوں گی۔ اس پر آپ علیہ السلام نے فرمایا ”امی جان! اگر اس دن اللہ عذاب سے بچانے کی استطاعت نہیں ہے تو آج مجھے اللہ کے خوف میں رونے سے کیوں روکتی ہیں۔ اسی طرح اگر ہم صحابہ، تابعین، تبع تابعین، صلحاء، اولیاء اور دیگر برگزیدہ لوگوں کی زندگیوں میں خوف الہی کی کیفیات کا بغور مطالعہ کریں اور ان کے واقعات کو چشم تصور میں لائیں تو ہماری حالت ہی غیر ہو جائے اور شرم و ندامت سے ہم پانی پانی ہو جائیں کہ اس قدر عظیم ہستیاں جن کی زندگی کا ہر لمحہ یاد الہی اور ذکر الہی میں گزرتا ہے مگر پھر بھی مخلوق کے سامنے خدا کے سب سے بڑے مجرم کی طرح رہتے ہیں اور یوں اپنی حالت کو لوگوں سے مخفی رکھتے ہیں بقول میاں محمد بخش۔

راتیں ساری کر کر زاری نیند اکھاں تھیں دھوندے

فجریں اوہ گنہگار کہاندے تے سبتھیں نیویں ہوندے

لیکن ہم کتنے گنوار بد بخت ہیں کہ ہر وقت یاد الہی سے گریز کرتے ہوئے بھی ذوہ بھر خوف الہی نہیں رکھتے حالانکہ ہم سراسر ظلم و معصیت کی وادیوں میں بھٹک رہے ہیں اور سرکشی و بغاوت کی دنیا میں سرگرداں ہیں۔ رسول ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

الايمان بين الخوف والرجاء (۸۵) ایمان امید اور خوف کیدر میانی کیفیت میں مضمر ہے۔

اہل اللہ کا ایمان اسی حدیث نبوی ﷺ کا مظہر ہوتا ہے وہ اپنے ایمان کو اللہ کے خوف میں رونے دھونے آہ و زاری کرنے اور ذکر و فکر کی کیفیات سے تقویت دیتے ہیں اور جب انہیں اللہ کی رحمتوں اور کرم نوازیوں کا خیال آتا ہے تو انہیں امید لگ جاتی ہے کہ ممکن ہے اللہ کریم اپنے فضل و کرم سے ہمیں بھی مستحق بخشش ہونے کے اکرام سے نواز دے گویا اہل اللہ جب اللہ کے عدل کا خیال کرتے ہیں تو ان پر خوف و خشیت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے لیکن جب اس کے فضل کا خیال کرتے ہیں تو بوجہ امید خوش ہو جاتے ہیں اسی تصور کو صوفی شاعر میاں محمد بخش نے اپنے ایک شعر میں بہت اچھی طرح واضح کیا ہے۔

عدل کریں تے تھر تھر کنین اچیاں شانناں والے

فضل کریں تے بخشے جاوون میں جے منہ کالے

اسی طرح ان کی پوری زندگی خوف اور امید کے اندر بسر ہو جاتی ہے ہمارے اعمال خواہ کتنے ہی کثیر ہوں ان پر

بخشش کا انصار نہیں کیا جاسکتا مگر اللہ کے فضل و کرم پر ہر مومن کی بخشش کی امید ہے خواہ وہ ایمان میں کمزور ہو یا پختہ اس لئے بزرگ فرماتے ہیں۔

جے میں دیکھاں عملاں دلے تے کچھ نئی میرے پلے  
جے میں دیکھاں تیری رحمت دلے تے بلے بلے بلے

### ملائکہ کا خوف الہی:

جناب علامہ ابواللیثؒ کا ارشاد ہے کہ ساتوں آسمان پر اللہ کے ایسے فرشتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ نے جب سے پیدا کیا ہے وہ حالت سجدہ میں ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے انتہائی خائف ہیں قیامت کے دن جب وہ سجدہ سے سر اٹھائیں گے تو کہیں گے۔

سبحانک ما عبدک حق عبادتک  
اے اللہ تو پاک ہے ہم تیری عبادت کا حق ادا نہیں کر سکتے۔  
ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

یخافون ربهم من فوقهم ویفعلون مایؤمرون وہ (فرشتے) اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور جس چیز کا انہیں حکم دیا گیا ہے وہی کرتے ہیں اور کچھ بھی نافرمانی میں نہیں گزارتے۔ (۸۱)

حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔

قال رسول اللہ ﷺ اذا قشعر جسد العبد من جب کوئی بندہ خوف الہی سے کانپتا ہے تو اس کے گناہ اس خشية الله تعالى تخانت منه ذنوبه کما تخانت کے بدن سے اس طرح جھڑ جاتے ہیں جیسے درخت کو عن الشجرة ورقتها۔ (۸۲) ہلانے سے اس کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔

### مقررین بارگاہ الہی کے خوف کی چند مثالیں:

سلف صالحین اور متقی لوگوں پر اللہ تعالیٰ کے احسانات جتنے زیادہ ہوتے ہیں اور بارگاہ الوہیت کے جس قدر قریب ہوتے ہیں اتنے ہی وہ قرب یافتہ لوگ خداوند تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے زیادہ ڈرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہاں

ہم بطور استشہاد عارف ربانی حضرت شیخ عبدالوہاب شعرائی کے حوالے سے چند مثالیں بیان کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں۔  
حضرت حسن بصریؒ فرماتے تھے۔ ”ہم نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے کہ جتنا ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسکی رحمتوں اور مہربانیوں کا انعام و اکرام ہوتا ہے اتنا ہی وہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرتے ہیں۔“

حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے تھے۔ ”عام لوگوں کا اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اتنا ہی کافی ہے کہ ان باتوں سے بچتے رہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اے کاش میں ان میں سے ہی ہوتا چنانچہ مذکور ہے کہ آپؐ پر اللہ تعالیٰ کا خوف اس قدر طاری ہوتا کہ ایک مرتبہ آپؐ خون کا پیشاب کرنے لگے اس پر ایک یہودی طبیب کو لایا گیا تو اس نے روتے ہوئے یہ کہہ کر علاج کرنے سے معذرت کر لی کہ ان کا جگر خوف الہی سے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرماتے تھے۔ ”اللہ تعالیٰ نے بعض اوقات مخلوق کو غفلت دے کر اس پر بڑا احسان فرمایا ہے اگر یہ نہ ہوتی تو تمام لوگ اللہ تعالیٰ کے خوف سے مرجاتے۔“

### اہل اللہ کے ہاں خوف ورجاء کی حالت:

ابوسلیمان دارائیؒ فرماتے ہیں کہ جب خوف پر امید غالب آتی ہے تو دل بگڑ جاتے ہیں جیسا کہ ہمارے جیسے احمقوں کا حال ہے لہذا ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہنا ہی ہمارے لئے بہتر ہے۔  
اسی طرح ایک اور بزرگ حضرت شعمیؒ فرماتے ہیں ”اللہ تعالیٰ سے ڈرنا کہ امن حاصل ہو کیونکہ یہ تیرے نزدیک اس امید سے بہتر ہے جس کے بعد خوف ہو۔“

مذکورہ بالا بزرگ حضرت ابوسلیمانؒ فرمایا کرتے تھے کہ واللہ مجھے خوف ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے مجھے ہی منہ کے بل آگ کی طرف گھسیٹا جائے گا۔

### سیدنا صدیق اکبرؓ کا قول:

حضرت سیدنا صدیق اکبرؓ کے متعلق بعض روایتوں میں آیا ہے کہ آپؐ فرماتے ہیں اگر قیامت کے دن یہ اعلان کیا جائے کہ ایک شخص کے علاوہ باقی سب کی بخشش ہوگئی ہے تو مجھے ڈر ہے کہ بخشش سے محروم شخص میں ہی ہو سکتا ہوں اور اگر یہ اعلان کیا جائے کہ صرف ایک ہی شخص کی مغفرت ہوگی تو اللہ کی رحمت اور فضل پر امید کرتے ہوئے یقین کر لوں گا کہ وہ خوش قسمت میں ہی ہوں گا۔ وہ سری جگہ آپؐ ایک پرندے کو مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔

”اے پرندے! کاش میں تیرے جیسا ہوتا اور میں (مکلف) انسان بن کر پیدا ہی نہ ہوتا۔“

## حضرت عمر فاروقؓ کا قول:

امیر المومنین حضرت عمر بن الخطابؓ فرماتے تھے اگر مجھے جنت اور دوزخ کے درمیان کھڑا کیا جائے اور مجھے اختیار دیا جائے کہ چاہوں تو جل کر خاک ہو جاؤں یا چاہوں تو صبر کروں تاکہ معلوم ہو جائے کہ کہاں جاؤں گا تو میں جل کر خاک ہونا پسند کروں گا۔ ایک اور مقام پر آپؓ فرماتے ہیں۔  
 ”میری خواہش ہے کہ میں ایک درخت ہوتا جس کو کاٹ دیا جاتا۔“

## بابا فریدؒ کا قول:

حضرت بابا فریدؒ گنج شکرؒ جن کی عبادت و ریاضت کی کیفیات سے اکثر لوگ آگاہ ہیں۔ آپؒ نے دن رات اللہ کی رضا جوئی کے لئے مجاہدے کئے۔ شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اوچ کے مقام پر آپؒ چلہ میں ابتداء مسلسل چالیس دن تک ہر شب کنویں میں الٹے لٹکے رہتے اور دن کو باہر نکال لئے جاتے رات کو جب مخلوق خدا گہری نیند میں مستغرق ہوتی تو آپؒ یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے۔

اٹھ فرید اتو ستیا جھاڑو دے میت

توں ستار بجا گدا تیری ڈاڈے نال پریت

## امام اعظم ابو حنیفہؒ اور خوف الہی:

جس طرح فقہ کے امام ہیں اسی طرح تقویٰ اور خوف الہی میں اپنی مثال آپ ہیں کہا جاتا ہے کہ آپ چالیس سال تک متواتر صبح کی نماز عشاء کے وضو سے ادا فرماتے رہے پوری رات خوف الہی میں روتے رہتے عذاب الہی کے متعلق کوئی آیت سن لیتے تو بے ہوش ہو کر گر پڑتے اور کبھی اپنی داڑھی پکڑ کر ایک مجرم کی طرح بارگاہ الہی میں معافی مانگتے کہ الہی! اپنے مجرم ابو حنیفہ کو معاف کر دے جب روتے روتے کہیں آنسو ذرا تھمتے تو فرماتے ”اگر قیامت کے دن ابو حنیفہ کو معاف کر دیا گیا اور رہا کر دیا گیا تو یہ بڑی حیرانگی اور تعجب کی بات ہوگی۔“

اللہ اکبر! یہ ان لوگوں کی حالت ہے جن کی ساری زندگیاں بندگی اور اطاعت میں گزریں لیکن ہم کیا ہیں؟ نہ بندگی کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ خوف خدا کا احساس ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ ہم بہت ظالم، غافل اور گناہ گار ہیں ہماری زندگیوں کے شب و روز بغاوت، سرکشی، لالچ اور طلب دنیا جیسے شیطانی پھندوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ اپنے نفس کے اسیر ہیں ان لوگوں کی بندگی اور خوف الہی کی بھی کیفیت انہیں حیات جادواں عطا کر گئی۔ ان کے علم



عمل کے تذکرے رہتی دنیا تک کیوں نہ ہوں کہ جنہوں نے علم کو اس قدر خلوص عمل کے خوبصورت سانچوں میں ڈھالا اور عمل کو خوف الہی اور تقویٰ کے پروقار لباس میں رنگ دیا۔ پھر قیامت تک علم و اخلاص اور عمل صالح کی خیرات طلب کرنے والے انہیں کی تقلید میں ان کے بحر علم سے فیضاب ہوتے ہیں۔ جن لوگوں نے علم کے ساتھ اس طرح اپنی زندگیاں رونے کے ساتھ بسر کیں ان کے فیوضات کی نہریں مسلسل اطراف و اکناف عالم میں بہہ رہی ہیں۔ (۸۶)

خشیت الہی:

اسلام نے اللہ سے ڈرنے کی دعوت دی ہے اور اللہ سے ڈرنے والوں کی تعریف کی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ - اَگَر تُمْ مُّؤْمِنُوْنَ هُوَ اللّٰهُ اَسْكَازِيَادَهُ مُّسْتَحَقٌّ هُوَ كِهْ اَسْ سَے ڈُرُو۔ (۸۳)

نیز فرمایا:

وَاِيَايَ فَارْهَبُوْنَ۔ (۸۲) اور مجھ ہی سے تم ڈرو۔

وَخَافُوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (۸۵) مجھ سے ہی ڈرنا، اگر تم حقیقت میں صاحب ایمان ہو۔

ارشاد الہی ہوتا ہے۔

وَيَحْذَرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ (۸۴) اور اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کافر مان ہے۔

واقبل بعضهم على بعض يتساءلون قالوا انا يه لوگ آپس میں ایک دوسرے سے (دنیا میں گزرے کنا قیل فی اهلنا مشفقین - فمن الله علينا هوء) حالات پوچھیں گے۔ یہ کہیں گے کہ ہم پہلے اپنے ووقانا عذاب السموم۔ انا کنا من قبل ندعوه گھر والوں میں ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے تھے انہ هو البر الرحیم۔ (۸۷) آخر کار اللہ نے ہم پر فضل فرمایا اور ہمیں جھلسا دینے والی ہوا کے عذاب سے بچالیا۔ ہم پچھلی زندگی میں اسی سے دعا میں مانگتے تھے۔ وہ واقعی بڑا ہی محسن اور رحیم ہے۔

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد:

ان الذين هم من خشية ربهم مشفقون والذين جولوگ اپنے رب کے خوف سے ڈرنے والے ہوتے ہیں ہم بایات ربهم يؤمنون۔ والذين هم بربهم لا جواپنے رب کی آیات پر ایمان لاتے ہیں جواپنے رب کے یشرکون۔ والذين يؤتون ما اتوا وقلوبهم وجلة ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے اور جن کا حال یہ ہے کہ دیتے انهم الى ربهم راجعون۔ (۸۸) ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں اور دل ان کے اس خیال سے کا پتے رہتے ہیں کہ اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔

کیا اس شخص کے بارے میں ہے جو زنا کرتا ہے اور شراب پیتا ہے اور چوری کرتا ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا:

لا يا ابنة الصديق۔ ولكن الرجل يصوم، نہیں۔ اے دختر صديق۔ بلکہ یہ وہ شخص ہے۔ جو ویصلی۔ ویصدق، و يخاف ان لا يقبل منه۔ روزہ رکھتا، نماز پڑھتا اور صدقہ و خیرات کرتا ہے اور ڈرتا ہے کہ شاید اس کی یہ عبادات بارگاہ خداوندی میں قبول نہ ہوں۔ (۸۹)

حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ رسالت پناہ علیہ ﷺ نے فرمایا:

انی اری مالا ترون اطت السماء وحق لها ان جو میں دیکھتا ہوں وہ تم نہیں دیکھ سکتے۔ آسمان چرچراتا تنط۔ مافیہا موضع اربع اصبع الا وملك ہے اور اس کا حق چرچرانا بجا ہے۔ آسمان میں چار واضع جبہتہ ساجد اللہ تعالیٰ۔ واللہ لو انکشت کے برابر بھی جگہ نہیں ہے۔ مگر وہاں فرشتہ تعلمون ما اعلم لضحکتہم قليلا ولبکیتہم اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہو کر اپنی بیچیں رکھے ہوئے کثیرا۔ وما تلذذہم بالنساء علی الفرش۔ ہے۔ اللہ کی قسم! جو میں جانتا ہوں اگر تم جان لیتے تو تھوڑا ولخرجتم الی الصعدات تجارون الی اللہ ہنٹے اور زیادہ روتے اور کبھی بستروں پر اپنی بیویوں سے لذت یاب نہ ہوتے۔ تم راستوں پر نکل جاتے اور تعالیٰ (۹۰)

اللہ کے حضور کڑکڑاتے۔ (ترمذی نے روایت کی ہے اور اسے حسن قرار دیا ہے)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا۔

من خاف ادلج ومن ادلج ، بلغ المنزل۔ الا ان جو ڈرا وہ آمادہ بہ سفر ہوا اور جو چل کھڑا ہوا وہ منزل پر پہنچا۔ سلمۃ اللہ غالبۃ الا ان سلعة اللہ الجنۃ۔ آگاہ ہو کہ اللہ کا سامان تجارت بہت گراں قیمت ہے۔ خبردار! اللہ کا سامان تجارت تھمت ہے۔ (۹۱)

ابو امامہ الباہلیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

لیس شی احب الی اللہ من قطرتین واثرتین وہ قطروں اور دو زخموں سے بڑھ کر اللہ کو کوئی چیز محبوب نہیں قطرة دموع من خشية اللہ ، وقطرة دم لہراق ہے۔ آنسوؤں کا ایک قطرہ جو اللہ کے خوف سے ہوا اور خون فی سبیل اللہ۔ واما الاثران : فاثر فی سبیل کا قطرہ جو اللہ کے راستہ میں گرایا گیا۔ باقی رہے دو اللہ واثر فی فريضة من فرائض اللہ۔ زخم۔ ایک تو جہاد فی سبیل اللہ میں زخم ہے اور دوسرا اللہ کے فرائض میں سے کسی فريضہ کی ادائیگی میں پہنچنے والا زخم۔ (۹۲)

حقیقت ایمان کا جامع نام خوف خدا ہے یعنی وجود و یقین کا علم۔ ہر ممنوعہ کام سے بچنے کا سبب اور ہر مامور بہ کام کرنے کی کنجی یہی خوف خدا ہے۔ مقام خوف نفسانی خواہشات اور آفات کو ختم کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

يد عون ربهم خوفاً وطمعاً (۹۴) اللہ تعالیٰ کے نیک بندے اسے پکارتے ہیں عذاب کے خوف سے اور ثواب کی طمع میں۔

حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ

”نہیں داخل ہوگا دوزخ میں جو رویا اللہ کے خوف سے یہاں تک کہ داخل ہو دو دھ دوبارہ تھن میں اور نہیں جمع ہوگا غبار فی سبیل اللہ اور جہنم کا دھواں کسی کے نتھنوں میں“ (۹۴)

## خوف کی قسمیں:-

ابوالقاسم الحکیم کا قول ہے کہ خوف دو قسم کا ہے۔

(۱) رھبہ (۲) خشية

۱۔ صاحب الرھبۃ جب کسی شی سے ڈرتا ہے تو بھاگ جاتا ہے۔

۲۔ صاحب الخشیۃ جب ڈرتا ہے تو اپنے رب سے التجا کرتا ہے۔

ابوالخفس کا قول ہے کہ خوف وہ شمع ہے قلب مومن میں، جس کی روشنی کی بدولت وہ خیر اور شر میں امتیاز کر سکتا ہے۔

(۹۸)

## خوف کی فضیلت:-

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

انما یخشى الله من عباده العلماء (۹۵) وہ لوگ خدا سے ڈرتے ہیں جو عالم اور صاحب دانش ہیں۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں۔

راس الحکمة مخافة الله تعالى (۹۶) خدا ترسی حکمت کی اصل ہے۔

خالفین کا مقام دو گنا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

ولمن خاف مقام ربہ جنتان (۹۷) جو اپنے رب سے ڈر کر کھڑا ہو۔

اس کے لئے دو جنتیں ہیں۔

حضور ﷺ کا فرمان ہے۔

و من خاف الله خوف الله عنه كل شئى جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے ساری مخلوق اس سے ڈرتی ہے۔  
(۹۸)

## اقوال مشائخ:-

شیخ ابو عمر دمشقی فرماتے ہیں کہ اپنے نفس سے ڈرنے والا اس شخص سے زیادہ ڈرنے والا ہے جو شیطان سے ڈرتا ہے۔

شیخ سہل عبداللہ فرماتے ہیں کہ خوف مذکر ہے اور رجا مؤنث ہے۔ ان دونوں کے ملاپ سے ایمان کے حقائق پیدا ہوتے ہیں۔

حضرت ذوالفون مصری فرماتے ہیں ”عاشق کو جامِ محبت اس وقت دیا جاتا ہے جب خوف اس کے دل کو پختہ اور مضبوط بنا دیتا ہے۔“

شیخ فضیل بن عیاض فرماتے ہیں۔ جب تم سے کہا جائے کیا اللہ سے ڈرتے ہو اگر جواب میں تم نے کہا نہیں تو یہ کہنا کفر ہے۔ اگر تم نے کہا کہ ہاں ڈرتا ہوں تو تم نے جھوٹ بولا کہ تمہارا یہ کہنا ان لوگوں کے قول کے مطابق نہیں جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔

(پس جواب میں خاموش رہنا بہتر ہے۔) (۹۹)

## تعلق باللہ کی مضبوطی

سب سے اول چیز جس کی ہدایت ہمیشہ سے انبیاء کرام علیہم السلام، خلفائے راشدین اور صلحائے امت ہر موقع پر بندگان خدا کو دیتے رہے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور اس کی محبت دل میں بٹھانے اور اس کے ساتھ تعلق بڑھانے کی ہدایت ہے۔

عقیدے میں اللہ پر ایمان مقدم ہے۔

عبادت میں اللہ سے دل کا لگاؤ مقدم ہے۔

اخلاق میں اللہ کی خشیت مقدم ہے۔

معاملات میں اللہ کی رضا کی طلب مقدم ہے۔

ہماری ساری زندگی کی اصلاح اور درستگی کا انحصار اس پر ہے کہ ہماری دوڑ دھوپ اور جدوجہد میں رضائے الہی کی مقصودیت ہر دوسری غرض پر مقدم ہو پھر خصوصیت کے ساتھ یہ راہ سلوک جس کے لئے ہم ایک جماعت کی صورت میں کوشاں ہیں۔ یہ تو سراسر تعلق باللہ ہی کے بل پر چل سکتا ہے۔ یہ اتنا ہی مضبوط ہوگا جتنا اللہ کے ساتھ ہمارا تعلق مضبوط ہوگا۔ اور یہ اتنا ہی کمزور ہوگا جتنا خدا نخواستہ اللہ کے ساتھ ہمارا تعلق کمزور ہوگا۔

## تعلق باللہ سے مراد

تعلق باللہ کے بارے میں قرآن مجید میں بتایا گیا ہے۔

ان صَلَوَاتِي وَنَسْكِ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ آدَمَى كَاجِنَا، مَرْنَا اور اسکی عبادت اور قربانیاں سب اللہ کے الغلیمین - (۱۵۵) لئے ہوں

وما امروا الا ليعبدوا الله مخلصين له وہ يکسوہو کر دین کو بالکل اللہ کے لئے خالص کر کے اس کی الدین (۱۵۱) بندگی کرے۔

حضور ﷺ نے تعلق باللہ کے بارے میں ارشاد فرمایا۔

خشية الله فى السر والعلانية (۱۵۲) کھلے اور چھپے ہر کام میں اللہ کا خوف محسوس کرنا۔

جب یہ تعلق باللہ بڑھتے بڑھتے اس حد کو پہنچ جائے کہ آدمی کی محبت اور دشمنی اور اس کا دینا اور روکنا جو کچھ بھی ہو اللہ کے لئے ہو اور نفسانی رغبت و نفرت کی لاگ اس کے ساتھ لگی نہ رہے۔ تو اس نے تعلق باللہ کی تکمیل کر لی۔

من احب لله و ابغض لله و اعطى لله و منع لله فقد استكمل الايمان (۱۵۳)

## تعلق باللہ بڑھانے کا طریقہ

اس تعلق کے نشوونما کے دو طریقے ہیں۔

۱۔ فکر و فہم کا طریقہ ۲۔ عمل کا طریقہ

۱۔ فکر و فہم کے طریقے سے اس تعلق کو بڑھانے کی صورت یہ ہے کہ قرآن مجید اور احادیث مبارکہ کے ذریعے ان نسبتوں کو اچھی طرح سمجھیں جو آپ کے اور اللہ کے درمیان فطرۃً ہیں اور بالفعل ہونی چاہیں۔ غور و فکر کر کے اور اپنی حالت کا جائزہ لے کر دیکھتے رہیں کہ ان میں سے کس کس نسبت کو آپ نے بالفعل قائم کر رکھا ہے۔ یہ احساس جتنا

بڑھے گا۔ اسی تناسب سے اللہ تعالیٰ سے آپ کا تعلق بڑھے گا۔

۲۔ عمل کا طریقہ یہ ہے کہ درجہ ذیل تدبیروں سے یہ طاقت حاصل ہو سکتی ہے۔

۱۔ نماز ۲۔ ذکر الہی ۳۔ روزہ ۴۔ انفاق فی سبیل اللہ

ان اعمال پر عمل اگر باقاعدگی کے ساتھ آپ کرتے رہیں تو دیگر ریاضتوں اور مجاہدوں کے بغیر ہی آپ اپنے گھروں اور بال بچوں میں رہتے ہوئے بھی اپنے خدا سے اپنا تعلق بڑھا سکتے ہیں۔ (۱۵۲)

## تقویٰ کا حصول

اسلام میں از اوّل تا آخر جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ تقویٰ ہے۔

حصول ہدایت، قبولیت اعمال، معیت خداوندی، محبوبیت کاملہ دنیوی و آخری فلاح سب تقویٰ پر منحصر ہیں۔ اسلام کے تمام ارکان و شعائر میں اسی تقویٰ کی جلوہ آرائی اور زندگی کے تمام پہلوؤں میں اسی کی کار فرمائی ہے۔

## تعریف و مفہوم:-

لفظ تقویٰ تقی سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی بچنے کے ہیں۔ اصطلاحی معنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ذریعے اس کے عذاب سے بچنا ہے۔ عربی زبان کا محاورہ ہے ”اتقی فلاں بہتر سے“ فلاں نے اپنی ڈھال سے اپنا بچاؤ کیا۔

اصل تقویٰ شرک سے بچنا ہے۔ اس کے بعد معصیت اور برائیوں سے بچنے کا درجہ آتا ہے پھر شبہات سے بچنے کا پھر فضول باتوں کے ترک کرنے کا۔ تقویٰ قرآن و سنت کی ایک جامع اصطلاح ہے اور اس کے سلبی اور ریجابی دو پہلو ہیں ناشرانی سے بچنا اور احکام خداوندی کی حفاظت و رعایت کرنا ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (۱۵۵) بیشک تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مکرم و معظم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔

حضرت ابوسعید الخدریؓ سے روایت ہے کہ ایک دن ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور

آپ سے عرض کی مجھے وصیت فرمائیے آپ ﷺ نے فرمایا۔

۱۔ تجھ پر تقویٰ اختیار کرنا فرض ہے کیونکہ تقویٰ جامع جمیع کمالات حسنہ ہے۔

۲۔ تجھ پر جہاد کرنا فرض ہے کیونکہ جہاد ہی رہبانیت اسلام ہے۔

۳۔ تجھ پر اللہ کا ذکر کرنا فرض ہے کیونکہ وہ تیرے حق میں نور ہے۔ (۱۵۶)

حضرت انسؓ نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا یا نبی اللہ ﷺ! آل محمد کون ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہر وہ شخص جو متقی ہو۔

تقویٰ تمام نیکیوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ (۱۵۷)

## تقویٰ کی قسمیں:-

اس کی چار قسمیں ہیں۔

۱۔ عوام کا تقویٰ

۲۔ خواص کا تقویٰ

۳۔ خاص الخواص یعنی اولیاء کا ملین کا تقویٰ

۴۔ انبیاء کرام علیہم السلام کا تقویٰ

## ۱۔ عوام کا تقویٰ:-

عوام کا تقویٰ یہ ہے کہ وہ شرک سے بچیں۔

## ۲۔ خواص کا تقویٰ:-

اس طبقہ کے لوگوں کا تقویٰ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچیں۔

## ۳۔ اولیاء کا تقویٰ:-

اولیاء کا ملین کا تقویٰ یہ ہے کہ وہ اپنے افعال کو وسیلہ بنانے سے بچیں۔

## ۴۔ انبیاء کا تقویٰ:-

وہ افعال کو اپنی طرف منسوب نہیں کرتے اس لئے کہ ان کا تقویٰ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور (ہر چیز سے بچ

کر) وہ اللہ کی طرف جاتے ہیں۔

## مشائخ کے اقوال:-



حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا۔ دنیا میں لوگوں کے سردار سخی ہوتے ہیں اور آخرت میں لوگوں کے سردار متقی ہوں گے۔

حضرت سہل بن عبداللہ کا قول ہے ”اللہ کے سوا کوئی معین نہیں۔ رسول ﷺ کے سوا کوئی رہنما نہیں اور تقویٰ کے سوا کوئی زاد نہیں۔“

النصر آبادی کا قول ہے۔ جس نے تقویٰ کو اپنے اوپر لازم کر لیا وہ دنیا سے مفارقت کا مشتاق ہو گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

ولدار الآخرة خير الذين يتقون افلا اور یقیناً آخرت کا گھر بہترین ٹھکانہ ہے ان کے لئے جو متقی تعقلون ﴿۱۵۸﴾ ہیں پس تم عقل سے کام کیوں نہیں لیتے۔

ابن عطاء کا قول ہے کہ تقویٰ کا ظاہری پہلو، حدود اللہ کی محافظت ہے اس کا باطنی پہلو، نیت اور اخلاص ایک بزرگ کا قول ہے کہ متقی وہ ہے جس میں تین صفات پائی جائیں۔

(الف) اگر وہ اپنی مراد کو نہ پہنچے تو توکل کرے۔

(ب) اپنی مراد کو جس حد تک پہنچے تو شیوہ رضا اختیار کرے۔

(ج) اور جو شئی اس سے فوت ہو جائے یا جاتی رہے تو اس پر صبر کریں۔

## تقویٰ:

جب ایمان قلب میں راسخ ہو جاتا ہے۔ ایمان کی جو بین نفس کی گہرائیوں میں مضبوطی سے جم جاتی ہیں تو

انسان کی وہ خفیہ صلاحیتیں اور قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جو اللہ نے انسان کو عطا فرمائی ہیں۔ پوشیدہ صلاحیتوں کے

اس اظہار کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان خیر کی طرف بڑی محبت سے لپکتا ہے اور شر نفرت کے ساتھ دور بھاگتا ہے۔

اس کی حالت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے عین مطابق ہو جاتی ہے کہ

ولكن الله حبيب اليكم الايمان و زينه في قلو لكن الله نے تمہارے لئے ایمان کو محبوب بنا دیا اور اس کو بکم وكره اليكم الكفر و الفسوق والعصيان تمہارے دلوں میں سجادیا اور كفر، گناہ اور نافرمانی سے اولئك هم الراشدون فضلا من الله و نعمة تمہیں بيزار کر دیا۔ یہی لوگ راہ ہدایت پر ہیں۔ یعنی واللہ علیم حکیم (۱۵۹) خدا کے فضل اور احسان سے۔ اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ اسی حالت کا نام تقویٰ ہے۔

## ان مطلوبہ مقاصد کے حوالے سے ہماری موجودہ حالت کا جائزہ

روزمرہ زندگی پر نظر ڈالیے تو یہ بات واضح ہوگی کہ اکثر لوگوں کے اعتقادات ایک تزلزل کا شکار ہیں۔ ہمارے اسلاف کے عقائد و نظریات کے مقابلے میں نوجوان نسل ان چیزوں سے جان چھڑانے میں کوشاں نظر آتی ہے۔ شعائر اسلام اور دینی معاملات سے جو دلچسپی اور شغف ہمارے بزرگوں کو تھا وہ موجودہ نسل میں مفقود ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ نوجوان نسل میں تو کسی حد تک دین سے انحراف اور اسلامی عقائد سے بغاوت و نفرت کی فضا بھی نظر آتی ہے۔

دوسرا پہلا اعتقادی و عملی زندگی کا تضاد ہے۔ مسلم معاشرہ کے ایک بڑے حصہ میں اعتقاد و عمل میں ہم آہنگی نہیں رہی ہے۔ جن باتوں کو ماننے اور ان پر عمل پیرا ہونے کا ہم اقرار باللسان کرتے ہیں۔ ان کی تصدیق بالعمل کی بجائے تکذب بالعمل کے مرتکب ہوتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ! کیا ہم نے کبھی عقیدہ و عمل کے اس تضاد پر غور کیا اور اس کے اسباب و محرکات کو ڈھونڈنے اور اس کے ازالہ کی کوشش کی؟ ہم نوجوان نسل کو دین سے گریزاں دیکھتے ہیں کہ وہ ایمانی، اخلاقی اور روحانی اقدار سے بیگانہ ہیں۔ ہم دین کے دفاع کی بجائے اور ان کی اصلاح کی بجائے اتنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ یہ دین کے باغی ہو چکے ہیں بس قیامت کی نشانیاں ہیں۔

اس رویہ سے عمل و اعتقاد کے تضاد کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ اس کے اسباب کو مد نظر رکھ کر اس بے راہ روی کا مداوا کرنے کی کوشش کرنا ہوگی۔

## عملی و اعتقادی زوال اور اس کے اسباب

انسانی زندگی کا نظام تین بنیادوں پر استوار ہے۔

۱۔ اعتقاد ۲۔ علم ۳۔ عمل

ان تینوں کے مجموعہ کا نام دین ہے۔

۱۔ عقائد وہ نظری تعینات ہیں جن کو کسی خارجی ذریعے سے جان کر یا اندرونی سطح پر سوچ بچار کر کے انسان اپنے دل میں جاگزیں کر لیتا ہے اور پھر ذہن ان پر اس قدر جم جاتا ہے کہ وہ نظریات سے بڑھ کر یقینیات کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ ان پر پختہ یقین کر لینے کا نام اعتقاد ہے۔ مختلف مذاہب میں عقائد بھی کئی یا جزئی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

ہم اعتقاد کی بنیاد قرآن و سنت کی تعلیمات پر رکھتے ہیں جبکہ دوسرے مذاہب کے لوگ اپنے اپنے مذاہب کی تعلیمات کے مطابق عقائد اختیار کرتے ہیں۔ کسی کا عقیدہ مورد وثق ہو تا ہے کسی کا علمی وجہ البصیرت۔

۲۔ نظام حیات کی دوسری بنیاد علم ہے۔ انسان کو بتدریج حواس نصیب ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعے سے اسے شعور کا خام مواد مسر آتا ہے۔ ان ادراکات اور حواس کے ذریعے خام مواد عقل میں منتقل ہو کر جو معیارات اور پیمانوں کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ ان کو جانچ کر ان کا درست اور جائز مقام انہیں دیا جاتا ہے اور اس شکل میں جو معلومات متعین ہو جاتی ہیں انہیں علم کا نام دیا جاتا ہے۔

انسانی زندگی میں ایک قوت عقیدے کی ہے اور دوسری علم کی جو مشاہدات اور تجربات کی صورت میں انسان کو حاصل ہوتا ہے۔ اگر علم عقیدے کی تصدیق کر دے تو عقیدے کو پختگی نصیب ہوتی ہے اور پھر اسی پختہ بنیاد پر عمل کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

۳۔ عمل کی عمارت عقیدہ و علم کی بنیاد پر قائم ہوتی۔ جب علم و عقیدہ میں تضاد ہو جائے تو آدمی کے ذہن میں خلش پیدا ہو جاتی ہے کہ میرے عقیدہ یا علم میں سے ایک چیز درست ہے ورنہ تضاد واقع نہ ہوتا۔ عقیدہ کو اس نے دیکھا نہیں ہوتا جبکہ علم تجربات اور مشاہدات سے حاصل ہوتا ہے اسلئے اس فکر میں عقیدہ کمزور ہوتا چلا جاتا ہے۔ جب عقیدہ جو کہ بنیاد ہے عمل کے لئے کمزور ہو تو عمل کی عمارت کیسے قائم ہو۔

اللہ تعالیٰ کو جو کچھ مان کر عقیدہ قائم کیا اگر اسکے عملی ثمرات ظاہر نہ ہوں تو علم و عقیدہ میں تضاد کا باعث بنتا ہے نتیجتاً اطاعت الہی اور نیک اعمال کا جذبہ مرجھا جاتا ہے۔ (۱۱۰)

ہمارے عقائد کی کیفیت :-

جزا و سزا، جنت و دوزخ انجام خیر اور انجام شر ہمارا عقیدہ ہے لیکن عام طور پر مشاہدہ میں یہ آیا ہے کہ ہر اچھے کام کا انجام اچھا اور برے کام کا برا انجام نہیں ہوتا۔ یہ محض ہماری نظر کا فریب ہوتا ہے کہ جن نتائج کو ہم انجام کہتے ہیں ان کو

اپنے تئیں ہم عقیدہ بنا لیتے ہیں۔ نتیجتاً جب مشاہدہ اس عقیدہ کی تصدیق نہیں کرتا تو ہمارا عمل دوسرے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے۔

ہمارے عقیدہ کی بنیاد ایمان بالغیب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

الذین یؤمنین بالغیب (۱۱۱) وہ جو بغیر دیکھے ایمان لاتے ہیں۔

ظاہر ہے ایک عام عقیدے بھی ”غیب“ پر ہی ہوگا۔ جسے عمل کی دنیا میں متحقق کرنے کے لئے اسے تصدیق کی ضرورت محسوس ہوگی۔ اب اگر اسکی عملی زندگی عقیدے کی تصدیق نہ کرے بلکہ تکذیب کر ڈالے تو عقیدہ روز بروز کمزور سے کمزور ہوتا چلا جائے گا۔ یہ حقیقت محتاج دلیل نہیں کہ عقیدہ میں جتنی شدت ہو عمل میں اسی قدر اٹقان اور پختگی ہوتی ہے۔

آج کل کا تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے کے باعث خدا و رسول ﷺ کا انکار تو نہیں کرتا لیکن دراصل وہ بری طرح بے یقینی کا شکار ہو چکا ہے۔ اگر ان نوجوانوں کی دلی کیفیات دیکھنے کے قابل ہوتیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہزاروں نوجوان زبان سے قیامت کا انکار تو نہیں کرتے مگر دل سے منکر ہیں۔ اسی طرح الوہیت اور رسالت کے بارے میں مجبوراً زبان سے اقرار مگر دل و دماغ سے سراپا استفہام؟ یہ سوال کہ اس زندگی کے ختم ہو جانے کے بعد یعنی موت کے بعد کیا ہوگا؟

جب پہلے ایمان بالغیب کی عملی تصدیق و توثیق نہیں نظر نہ آئی تو بعد والے ایمان بالغیب کی تصدیق تو اس زندگی سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتی۔ اگر اس کو یقین دلانے کی کوشش کی جائے کہ تصدیق یہاں نہیں ہوتی تو نہ سہی مرنے کے بعد سب ثمرات مشاہدہ میں آجائیں گے۔ تو وہ سوال کرنے میں حق بجانب ہوگا کہ جن امور پر ایمان لایا تھا۔ ان کا تو کوئی نتیجہ نظر نہ آیا۔ مرنے کے بعد کسی اچھے نتیجہ کے سامنے آنے کی امید کس بنیاد پر قائم کی جائے گی؟ ان حالات میں انسان کے دل و دماغ پر ایک تضاد کا طوفان برپا قائم رہتا ہے۔ یہی ایمان و عمل کا تضاد دینی اور روحانی قدروں پر سے اعتماد و ایتقان کو متزلزل کر دیتا ہے۔

آج یہی تضاد کی کیفیتیں انسانی زندگی کو عمل کی بنیاد فراہم کر رہی ہیں۔ نتیجتاً عمل میں کجی بھی ہے اور ناپائیداری بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم زبان سے تو ایمان کا انکار نہیں کرتے لیکن عمل سے بزبان حال ان خاص عقائد کا انکار کر رہے ہیں جن پر ہمارے نظام زندگی کی بنیادیں استوار ہیں۔ جو بات دل میں ہے وہ زبان پر تو نہیں آتی لیکن عمل اس کا اظہار کر دیتا ہے۔

ہم ایمان کے دعویٰ کے ساتھ ساتھ جب کذب و افتراء کے مرتکب ہوتے ہیں تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سچ کی افادیت پر ہمارا اعتقاد نہیں۔

ہم یہ تو کہتے ہیں کہ عملاً بھی اللہ اور رسول کی غلامی اختیار کر لیکن ہمارا اپنا عمل ہمارے قول کی تردید کرتا ہے۔ ہم زبان سے تو انکار نہیں کرتے لیکن ہمارے دل میں پوشیدہ انکار کو ہمارا عمل بے نقاب کر دیتا ہے عقیدہ جب تک عمل کا روپ نہ دھارے وہ ایک لاشیاء بے جان ہے۔

ان حقائق کو سامنے پا کر ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ جس عقیدے کا اثر ہماری عملی زندگی پر نہ ہو اس عقیدے کو ہم کے سوا کیا نام دیں گے اگر ہمارے عقیدے کا اثر عمل پر نظر نہیں آتا تو ہماری حد تک ہمارے عقیدے اور دیگر اہل مذاہب کے عقائد میں کچھ فرق نہیں۔

کچھ خاص عقائد کو وہ بھی مانتے ہیں۔ ہم بھی مانتے ہیں۔ نہ ان کا ماننا ان کی زندگی میں کوئی انقلاب برپا کر رہا ہے نہ ان کی زندگی میں کوئی انقلاب برپا کرتا ہے۔

آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں یہ سائنسی دور ہے۔ معاشرہ کا ذہن طبقہ ہر بات پر کیا؟ کیوں؟ کیسے؟ کے سوالات وار کرتا ہے۔

آج اگر کوئی سائنسدان دعویٰ کرتا ہے تو تجربات کی روشنی میں اسے سچا کر دکھانے کا بھی پابند ہے ورنہ اس کا دعویٰ بے معنی ہو جاتا ہے۔ جب آنکھ کسی حقیقت کا مشاہدہ کر لے تو پھر انکار کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔

آج ایک طرف مادیت کے علمبردار ہیں جو روحانیت کی ہر بات کو بے بنیاد اور واہمہ قرار دیتے ہیں اور اپنے ہر دعویٰ کو تجربے اور مشاہدے کی کسوٹی پر پرکھ کر قبول کرنے کی عادی ہو چکی ہے اسلئے اگر آج عقیدہ تجربے کی کسوٹی پر ثابت ہوتا نظر نہ آئے تو عقل اسے کیسے مان لے گی؟ یہ سائنسی دور ہے۔ باتوں کے رد و قبول کا معیار سائنسی طریقہ کار بن چکا ہے۔

## اعتقاد و مشاہدہ اور مرتبہ ایتقان

آج کے دور میں جو سائنسی انداز نظر و فکر پیدا ہو چکا ہے آیا قرآن حکیم اس کو درست قرار دیتا ہے۔ کیا اسلامی فکر اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ عقیدے کی پختگی صرف ایمان سے نہیں بلکہ تجربے اور مشاہدے سے حاصل ہوتی ہے؟ کیا سائنسی طریق کار اور فکر اسلامی میں ہمیں کوئی مطابقت نظر آتی ہے۔ قرآن مجید اس سوال کا جواب اثبات میں دیتا ہے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام بارگاہ الہی میں عرض کرتے ہیں۔

رب ارنی کیف تحى الموتى (۱۱۴) اے رب! مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔

یعنی ایمان تو ہے مگر میں اس ایمان کو مشاہدہ و تجربہ کی توثیق دینا چاہتا ہوں۔ تو میرا عقیدہ و ایمان علم الیقین سے عین الیقین کا مقام حاصل کر لے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نہ صرف مردہ کو زندہ کر دینا کا عینی مشاہدہ کروادیا بلکہ ان کے ایمان کو ایقان میں بدلنے کے لئے انہیں زمین و آسمان کی ساری بادشاہی اور اپنی قدرت کے کرشموں کی سیر کرائی۔

تسلیم کرنا پہلے بھی تھا لیکن اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کے بعد ماننا اور کیفیت رکھتا ہے۔ یہ بلند تر اور پختہ تر کیفیت کا نام ہے۔

## ان مقاصد کے حصول میں تصوف کا مجوزہ کردار

اسلام کے اندر باقاعدہ ایسا نظام موجود ہے جو عقائد و ایمانیات کے محسوس نتائج سامنے لاتا ہے اور یہ نظام روحانی تجربات و مشاہدات پر مبنی تصوف ہے۔ اس نظام کے ماہر اور سائنس دان صوفیائے کھرام ہیں۔ صرف تصوف ہی مذہبی واردات کی وہ صورت ہے جو تعلیمات اسلامی اور کیفیات ایمانی کا عملی روحانی تجربہ ہے۔ یہی باطنی مشاہدہ کا وہ نظام ہے کہ ایمان بالغیب جب اس کے تدریجی مرحلوں سے گذرتا ہے تو ایقان میں بدل جاتا ہے۔ تصوف ایمان کے لطائف کا وہ سلسلہ ہے جس سے عقائد کی کیفیات کا باطنی مشاہدہ ہوتا ہے۔ تصوف ہی وہ علم ہے جو عقیدہ اور ایمان کی عملی تصدیق کرتا ہے۔

جب تصوف کے ذریعے مشاہدہ عقیدے کی تصدیق کر دے تو عین الیقین کے نتیجے میں وہ عملی وجود میں آتا ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت مضحمل نہیں کر سکتی۔

اولیائے کاملین اللہ تعالیٰ کے وہ مقرب بندے ہیں جو ریاضتوں اور مجاہدوں کے مراحل سے گذر کر وہ مقام پاتے ہیں کہ حقائق کا مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ ان کے اعمال کی قوت محرکہ اتنی زبردست ہوتی ہے کہ کائنات کے کروڑوں انسانوں کے عمل میں وہ کیفیت جذب نہیں ہوتی جو ان کے اعمال میں ہوتی ہے۔ ان کا عمل اللہ کے لطف و کرم کے عینی مشاہدہ سے تشکیل پاتا ہے جبکہ عام افراد کا عمل یہ کیفیت نہیں رکھتا۔ ان کا عمل دید پر مبنی ہوتا ہے۔ جبکہ عوام کا عمل شنید پر مبنی ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے اسی لئے تو فرمایا۔

تیرا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور

ایسی نماز سے گذر، ایسے امام سے گذر

تاریخ اسلام کے اکابر رجال نے ان حقائق کی تصدیق کی ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ جو خود بھی الراخون فی العلم کے مقام پر تھے۔ بڑے بڑے علماء کی بارگاہوں میں پہنچا کہ حق کو پاسکوں مگر ناکام لوٹا۔ آخر صوفیاء کی راہ میں حق کو پایا۔ وہ فرماتے ہیں۔ صوفیاء معاملات حیات میں اپنی عقل سے رہنمائی لینے کی بجائے تاجدار کائنات ﷺ کے اشاروں کے منتظر ہوتے ہیں۔ تصوف کی راہ عین البیقین کی راہ ہے اور اس قدر پختہ ہے کہ بقول امام غزالی

فهذا هو منهاج تحصیل العلم الضروري نبی اکرم ﷺ کی تصدیق کے لئے علم ضروری حاصل کرنے بتصدیق النبی ﷺ مجرب و تامل القرآن و کاہی انداز ہے۔ آپ اس کا تجربہ کریں قرآن میں غور طالع الاختیار تعرف ذالك بالعیان۔  
و فکر کریں اور اختیار کا مطالعہ کریں تو آپ ان حقائق کو روز روشن کی طرح پہچان لیں گے۔

ثابت ہوا کہ علم حقیقی کی کیفیت سوائے تصوف کے اور کسی فلسفہ میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ تصوف کے طریقہ میں دل شفاف ہوتے ہیں۔ ذہن مجلیٰ ہوتے ہیں۔ اور وہ روحانی ذوق حاصل ہو جو بقول امام غزالی۔

وما الذوق فهو كاللمشا هده والاخذ باليد ولا اور ذوق تو وہ مشاہدہ اور کسی چیز کو ہاتھ میں پکڑ لینے کی طرح یوجد الا فی طریق الصوفیة۔ (۱۱۳)

معلوم ہوا کہ کیفیت ذوق مشاہدہ کے مترادف ہے اور طریق صوفیہ اپنا نا گویا ہتھیلی پر سرسوں جمانا ہے۔ امام غزالی فرماتے ہیں کہ اس کا آغاز سچے خوابوں سے ہوتا ہے چونکہ پہلے نفس غالب تھا۔ جب نفس کا غلبہ ٹوٹتا ہے تو اسرار منکشف ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ دین و ایمان کی وہ کیفیت جو اس سے پہلے نظر نہیں آتی تھی وہ نظر آنا شروع ہو جاتی ہے۔ رؤیا صادقہ سے اسرار منکشف ہوتے ہیں اور یہی ردیائے صادقہ ہیں جو حسب ارشاد نبوت، نبوت کا چالیسواں حصہ ہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد پاک ہے۔

لم یبق من النبوة الا المبشرات قالوا و ما نبوت سے المبشرات کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا عرض المبشرات یا رسول اللہ قال الرویا الصالحة کیا گیا یا رسول اللہ! مبشرات کیا ہیں فرمایا سچے خواب!

یعنی اہل ایمان کے سچے خواب وہ بشارات ہیں جو کہ نبوت کا چالیسواں حصہ ہیں کیونکہ ان کے ذریعے حقائق منکشف ہوتے ہیں اور فیضان نبوت جاری رہتا ہے۔ دراصل تصوف کی راہ پر چلنے سے مشاہدہ کی قوت حاصل ہوتی ہے اور مشاہدہ حاصل ہونے سے ایمان کو پختگی میسر آتی ہے۔ جو لوگ کبھی تصوف کی راہ پر گامزن ہی نہ ہوئے ہوں، مشاہدہ سے کسی علم و عقیدہ کی حقیقت معلوم ہی نہ کی ہو ان کے ایمان میں اہل تصوف کی مانند پختگی آنا ممکن نہیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسی سائنسی دور میں ایمانیات کو یقینیات کی کیفیت میں رنگنے کے لئے تصوف کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے جو لوگ طریق تصوف کو اپنا کر اپنے قلب و باطن کو جلا بخشتے ہیں۔ ان میں وہ بصیرت پیدا ہو جاتی ہے کہ ہر نئے مسئلہ کو قوت بصیرت سے مشاہدہ کر لیتے ہیں اور انہیں حق و باطل کی راہیں صاف نظر آنے لگتی ہیں۔ (۱۱۵)

## فصل دوم:

### مذہب بیزار رجحانات کے انسداد میں تصوف کا مطلوبہ

#### کردار

مذہب اسلام ایک آسمانی ڈسپلن ہے۔ جو انسان کو خدا، رسول، اولوالامر، والدین اور اساتذہ کے سامنے جھکنا سکھاتا ہے۔ جو ہر چھوٹے بڑے کام میں معین کرتا ہے۔ جو قلب و نظر میں پاکیزگی اور ارادوں میں رفعت بھرتا ہے جو تسلیم و نیاز کا خوگر بناتا ہے۔ مذہب اسلام سے فرار گویا خدا اور رسول، قانون، والدین اور اساتذہ کے خلاف اعلان بغاوت ہے۔

#### مذہب سے بغاوت:-

ہماری تباہی کا اصل سبب مذہب سے بغاوت ہے۔ دیار اسلامی پر تسلط فرنگ کے بعد ہم میں سے ایسے ادیب اور منکر پیدا ہو گئے۔ جو ذہناً و عملاً اسلام کے باغی تھے۔ اور تبلیغ سے افکار میں بہت بے باک! ان لوگوں نے پہلے ترکی میں کام شروع کیا۔ کمال اتاترک اور اس کی قوم کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کے بعد ان کا فلسفہ عرب ممالک پر حملہ آوار ہوا۔ عراق، شام اور لبنان میں اس کی کوئی مزاحمت نہیں کی گئی۔ البتہ مصر میں سید قطب شہید اور دیگر علماء نے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

#### تاریخ بغاوت:-

مذہب کے خلاف بیزاری یا بغاوت کی پہلی لہر یورپ سے اٹھی۔ اس بغاوت کا سرخیل اٹلی کا مشہور مفکر مکیا ولی



تھا۔ اس کے علاوہ ہیوم، روسو، ڈارون، کارل مارکس اور فرائڈ کے نام قابل ذکر ہیں جو خداوند تعالیٰ کی ہستی کے قائل نہیں ہیں۔ ڈی کارٹ جو کہ بیکن کا پیرو ہے کائنات کو ایک خود کار تخلیق سمجھتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ مجھے عناصر دے دو اور کائنات بنا دوں گا۔ فرانس بیکن لکھتے ہیں کہ مذہب بیکار ہو چکا ہے۔ سائنس کا آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔ اور یہ دنیا کو مسرت و راحت کے جلووں سے بھر دے گا۔

مسلمانوں میں قرن رواں کا پہلا باغی ایک ترک تھا جس کا نام ضیا گوکلپ ہے۔ پھر اسمعیل مظہر پیدا ہوا جو کہ بعد میں تائب ہو گیا۔

اسکے علاوہ خالد محمد خالد مصری، سیہ لطفی مصری، احمد خاکی مصری، جمال احمد مصری وغیرہ ہیں۔ جنہوں نے مذہب کی مخالفت کی ہے۔

## مذہب بیزاری کے نتائج:-

اس الحاد اور مذہب سے نفرت کے درج ذیل نتائج برآمد ہوئے۔

۱۔ آسمانی تہذیب یعنی مذہب اور وحی ظلمت اور پسماندگی کی علامت قرار پائی اور عیاش وادبаш لوگ مہذب کہلانے لگے۔

۲۔ آخرت سے انکار کی بنا پر ظلم، آئین حیات بن گیا۔

۳۔ خواتین نے ان قیود کی خلاف ورزی شروع کر دی جو مذہب نے ان پر عائد کی تھیں۔

۴۔ جب یورپ کی خواتین متاع عام بن گئیں تو گھرا جڑنے لگے۔ لاکھوں بچے آوارہ ہو گئے۔

۵۔ شراب، رقص، سنہما، عیاشی، چوری اور ڈکیتی عام ہو گئی۔

۶۔ والدین، اساتذہ اور بزرگوں کا احترام ختم ہو گیا۔

۷۔ یورپ میں زندگی بھٹکنے لگی اور آوارگی اس حد تک بڑھ گئی کہ خودکشی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

۸۔ اسلام میں فرقوں کو بھاری تعداد نے عقائد کے انحراف کی وجہ سے مذہب بیزاری کے بہت رجحانات پیدا ہوئے۔

۹۔ نوجوان نسل اعمال خیر و شر کے نتائج کی عدم مطابقت پر بیزاری کا رویہ اختیار کرنا شروع کر دیا۔ (۱۱۴)

## تصوف کا مطلوبہ کردار

جدید تہذیب نے انسان کو خدا سے محروم کر کے اس کو روحانی فاقہ میں مبتلا کر دیا ہے۔ اسی روحانی فاقہ کا نتیجہ ہے کہ موجودہ

جاپان کے نوجوان صنعتی ترقی کی انتہا پر پہنچ کر یہ کہنے لگے ہیں کہ ہمارا کلچر ایک مرچنٹ کلچر ہے۔ اور صرف مرچنٹ کلچر انسان کے لئے کافی نہیں۔ مغربی سوسائٹی کا وہ مظہر جس کو پپی ازم کہتے ہیں وہ بھی اسی روحانی فاقہ زدگی کی ایک مثال ہے۔

ایک پپی نوجوان دہلی کی سڑک پر پیدل چل رہا تھا۔ اس کے جسم پر نہایت معمولی ہندوستانی لباس تھا۔ گلے میں ڈھول، کنیڈا کے باشی اس نوجوان نے بتایا کہ کنیڈا میں مجھے سب کچھ میسر ہے۔ یہاں سفر کی حالت میں کچھ بھی نہیں۔ مگر اس اسلامی ملک کو اس لئے منتخب کیا کہ روحانی طور پر مطمئن ہوں، کہنے لگا۔ (۱۱۸)

There I was Comfortable Physically,

here I am comfortable Spiritually.

ماہر نفسیات کارل ینگ (۱۹۲۶ - ۱۸۷۵) نے بتایا کہ مجھ سے پچھلے تیس برسوں میں روئے زمین کے متحدہ ملکوں کے بیشمار نفسیاتی مریضوں نے علاج کے لئے رجوع کیا۔ ان میں سے اکثر مریضوں کی یہ بیماری تھی کہ وہ روحانی طور پر مطمئن نہ تھے۔ ان میں سے کوئی بھی اس وقت تک شفا یاب نہ ہو سکا جب تک اس نے اپنا مذہبی تصور دوبارہ نہیں

بنالیا۔ (۱۱۷)

### روحانیت کی ضرورت :-

روحانیت اس حسن کا نام ہے جو اللہ کی عبادت سے پیدا ہوتا ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں یہ نور کہلاتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔ اول وہ چمک اور جاذبیت جو روح سے نکل کر جمیل پہ آ جاتی ہے۔

سِیْمَاہُمْ فِیْ وَجُوْہِہُمْ مِّنْ اَثْرِ السَّجُوْدِ (۱۱۸)

سجدہ عبادت کے آثار ان کے چہروں پر نمایاں ہیں دوم یہ کہ وہ روشنی جو شاہراہ حیات پر پھیل جاتی ہے اور انسان کو بھٹکنے یا ٹھوکر کھانے سے بچاتی ہے۔ جیسا کہ قرآن ناطق ہے۔

یا ایہا الذین امنوا اتقوا اللہ وامنوا برسولہ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور رسول کی بات مانو اللہ یوتکم کفلین من رحمته و یجعل لکم نوراً تعالیٰ تمہیں دہری رحمت سے نوازے گا۔ اور ایک ایسا نور تمہیں ہدایت دے گا۔ جس کی روشنی میں تم جادہ حیات کو طے کرو گے۔ (۱۱۹)

زندگی سے اس نور کا وہی تعلق ہے جو پھول سے خوشبو کا، پھل سے رس کا اور لؤلؤ سے چمک کا۔ یہ مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ کہیں سوز گداز کا رنگ اختیار کرتا ہے اور کہیں ناز و نیاز کا۔ چھوٹوں پہ شفقت، بڑوں کا احترام، نوع انسان سے محبت، ہر فرد سے انصاف، ہر شخص کی خدمت، جان و مال کا ایثار، نعمت میں شکر، مصیبت میں صبر تواضع، تعلیم، توحید و رسالت کا اقرار اور خدائی مشیت میں ڈھل جانا، سب روحانیت کے کرشمے ہیں۔

آیات ذیل میں روح کی انہی صفات کا ذکر ہے۔

التابون العابدون الحامدون السامحون اللہ کے بندے گناہ پہ نادم، عبادت گزار، حمد گو، صائم، الراكعون الساجدون الا مرون بالمعروف راجع، ساجد، نیکی کے مبلغ و بدی سے مانع اور خدائی حدود والناہون عن المنکر و الحافظون کے محافظ ہوتے ہیں۔

لحدود اللہ (۱۲۰)

دوسرے مقام پر ارشاد ہے۔

ان المسلمین و المسلمات و القانتین و وہ مسلمان مرد اور عورتیں جو خالص مومن، فرمانبردار، القانتات و الصادقین و الصادقات و راست باز، صابر، خاشع، مخیر، پابند صوم، شرم گاہوں کی الصابریں و الصابرات و الخاشعین و محافظ اور تسبیح و تحمیل کی گردیدہ ہیں وہ اللہ سے انعام الخاشعات و المتصدقین و المتصدقات مغفرت اور اجر عظیم پائیں گے۔  
والصالحین و الصالحات و الحافظین  
لفروجہم و الحافظات و الذاکرین اللہ کثیراً  
والذاکرات اعد اللہ لہم مغفرة و اجرا عظیما۔

(۱۲۱)

حیات اقوام کا انحصار نہ تو دولت پر ہے نہ فراوانی لشکر اور کثرت علوم و فنون پر بلکہ اس کا تعلق ایک آسمانی آگ یا شعلے سے ہے۔ جو عزم، حسن اور عظمت کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور اس کا دوسرا نام روحانیت ہے۔ زوال پذیر اقوام مادیات سے رشتہ جوڑ کر روح کی طاقت سے غافل ہو جاتی ہیں اور نتیجتاً مٹ جاتی ہیں۔  
اسلام ایک ناقابل تغیر صداقت ہے۔ تبدیلی ان لوگوں میں آئے گی جو اسلام کی طرف بڑھیں گے ان کا یہ سفر پستی سے بلندی، جہالت سے علم، ضعف سے قوت، کثافت سے لطافت اور اندھیرے سے نور کی طرف ہوگا۔ (۱۲۲)

## تصوف میں ظاہر و باطن کی اصلاح:-

آج تہذیب جدید کا انسان جو خداوند تعالیٰ کی ہستی کے انکار کی بدولت طرح طرح کے معاشی، معاشرتی و دیگر مسائل کا شکار ہو کر تباہی کے کنارے کھڑا ہے وہ اگر مندرجہ ذیل دو باتوں پر عمل پیرا ہو جائے جن کا درس تصوف نے دیا ہے۔ اور جو کہ تصوف کی اصل الاصول ہیں۔ تو تباہی سے محفوظ ہو کر امن و عافیت کا سانس لے۔

۱۔ خدا کا خوف ۲۔ دنیا سے بے رغبتی

۱۔ خدا کے خوف سے یہ فائدہ کہ ہر شخص میں جو اب دہی کا احساس زندہ و موجود رہتا ہے۔

۲۔ دنیا سے بے رغبتی کا حاصل یہ کہ انسان کے اندر حرص، طمع، فساد اور ہوس کے جذبات سرد پڑ جاتے ہیں جو تمام معاشی اور معاشرتی مشکلات کا باعث ہیں۔

## تصوف کا دعویٰ:-

تصوف کا دعویٰ ہے کہ مذہب سے بیزاری اور خدا سے بے خونی نے معاشرتی مشکلات کو جنم دیا ہے۔ مثلاً جھوٹ، غداری، قتل، فساد، بدانی، قانون شکنی اور ظلم وغیرہ۔ اور دنیا کی رغبت نے معاشی مسائل پیدا کیے ہیں۔ مثلاً ہوس زد، ذخیرہ اندوزی، چور بازاری، حب جاہ، سرمایہ پرستی، شکم پروری اور نفس پرستی وغیرہ۔

آج مدہرین عالم ان مسائل کے حل کے لئے اکیڈمیاں قائم کرنے، کمیٹیاں بنانے، مجلسیں بٹھانے، اجلاس بلانے، تحقیق کرنے، فلسفے مرتب کرنے، طریق کار تجویز کرنے اور لائحہ عمل تیار کرنے میں مصروف عمل ہیں۔ اگر وہ بھی صوفیائے کرام کے ان دونوں اصولوں کو اپنائیں تو یہ مسائل اپنی موت آپ مر جائیں گے۔ جن تصوف کی خانقاہوں نے غریبوں کو نفس و لطیف دسترخوان پر بٹھایا اور امیروں کو روکھی روٹی اور سوکھی دال سے آشنا کیا اور دونوں کے دلوں سے ایک سے دوسرے کی کدورت و نفرت اور از خود تجویز کردہ معاشی اور معاشرتی بُعد کا خاتمہ کر دیا۔ کیا آج وہی تصوف کیونرم کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تصوف کے جن اداروں نے ہوا و ہوس کے بندوں کو ایک خدا کی بندگی پر لگا دیا آج وہ وطنیت اور قومیت کے بت نہیں توڑ سکتا اور خداوند تعالیٰ سے رشتہ نہیں جوڑ سکتا؟ اخلاق سے تہی دست دنیا آج بھی تصوف کو اس کی صحیح روح کے ساتھ اپنا لے تو اس کے جملہ اخلاقی مسائل چٹکیوں میں حل ہو سکتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ تصوف اپنے دور انحطاط میں اتنا کچھ بدل چکا ہے کہ پہچانا نہیں جاتا کسی صاحب دل کے صحیح تر الفاظ ہیں۔

”تصوف حال تھا مگر اپنے دور انحطاط میں برا حال بن گیا وہ احتساب تھا لیکن اب اس نے اکتساب

کی صورت اختیار کر لی۔ وہ استنار تھا لیکن اب وہ اشتہار نظر آنے لگ گیا۔ پہلے وہ صدور کی جماعت تھی اب وہ غرور کا مرکز بن گیا پہلے وہ تفتش تھا اب تکلف کا جامہ اس نے پہن لیا۔ پہلے وہ تخلق تھا اب وہ تملق بن گیا پہلے وہ قناعت تھا اب اس حرض کا روپ دھار لیا۔“

تصوف نے تعلق باللہ اور خوف کا درس دیا۔ اس نے اس روح کو بیدار کرنے پر زور دیا جو علم کو با مقصد، زہد کو نتیجہ خیز، حکومت کو خادم خلق اور تعلیم و تدریس کو سرگرم بنادے۔ تصوف نے نا اہل حکمرانان سلطنت کے خلاف عوام کے جذبات بھڑکانے اور تحریکیں چلانے کی بجائے ان میں خوف خدا اور جوابدہی کے احساس کو بیدار کیا کیونکہ بظاہر نظام کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو جب تک یہ دو عناصر لوگوں میں موجود نہ ہو جو جڑ ہیں اخلاق حسنہ اور اعمال صادقہ کی۔ اگر یہ نہ ہوں تو نظام یا مشکل کیسی کیوں نہ ہو نتیجہ کے اعتبار سے صفر ہی ہوگا۔

صوفیاء نے تحریر و تقریر سے کم اور عمل کر کے زندگیوں میں انقلاب برپا کیا۔ صوفیا کا دنیا پر احسان ہے کہ انہوں نے لمبا موڑ کاٹ کر منزل پر پہنچانے کی بجائے سیدھا راستہ اختیار کر کے مسافت کو کم کر دیا وگرنہ ہو سکتا تھا کچھ لوگ کارواں سے ہچڑھتے جاتے۔ یہ بات دیکھ کر صوفیاء کے بارے میں یقین ہو جاتا ہے۔ کہ انبیاء کی جانشینی کا اگر کوئی مستحق ہو سکتا تھا تو یہی اصفیاء تھے۔

صوفیاء، تعلیم و تعلم کے ساتھ ساتھ دنیا کو سلجھانے کے لئے سرگرم رہے۔ وہ نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج کے ادا کرنے کے ساتھ ساتھ پوری زندگی کو نماز بنانے کا داعیہ رکھتے تھے۔ وہ صرف پانچ وقت خدا کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا نہیں ہمہ وقت اسکی بارگاہ میں حاضری کا درس دیتے تھے۔ وہ اپنا رخ کعبہ کی طرف موڑنا کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اپنے اور لوگوں کے قلوب کا رخ کعبہ کی طرف موڑنے پر زور دیتے تھے۔ الفاظ کی ادائیگی کی بجائے معانی دل میں اتارنا چاہتے تھے روزہ ان کے ہاں بھی تھا مگر وہ دل کو اوہام و خرابات سے خالی رکھنے کا درس دیتے تھے وہ صرف منہ کو تالا لگانا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ یہ درس دیتے کہ ہر وہ سوتا بند کر دیں جہاں سے شیطان داخل ہو سکے۔ وہ ایسے روزے کو اہمیت دیتے جس سے ضبط نفس ہو اور ایسی بھوک پیاس جو دوسروں کی بھوک اور پیاس کا احساس کرے۔ وہ صرف پیٹ کے روزے کے نہیں بلکہ زبان، آنکھ، کان، ہاتھ، اور دماغ کے روزے کے قائل تھے۔ زکوٰۃ میں صرف ڈھائی فیصد پر قناعت نہ فرماتے تھے۔ اگرچہ اتنا فرض سمجھتے تھے۔ ان کے ہاں سب کچھ زکوٰۃ میں دے دینا فرض تھا۔ زکوٰۃ سے مال پاکیزہ ہوتا ہے وہ دل کی پاکیزگی کو زیادہ اہم سمجھتے تھے۔

حج کے لئے وہ بھی جاتے تھے۔ مگر مقصود رب کعبہ کا دیدار ہوتا نہ کہ صرف کعبہ! منی میں بکرے کی قربانی سے آگاہ تھے مگر

نفس لئیم کا ذبح کرنا ان کے نزدیک فرض اولین تھا۔ عرفات میں جسموں کے ملاپ کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے روحانی اور قلبی ملاپ کے وہ علمبردار تھے۔ جہاد کا مفہوم صرف میدان جنگ میں لڑنا کافی نہ سمجھتے تھے۔ بلکہ وہ نفس اور شیطان کے ساتھ جہاد کو جہاد اکبر کا نام دیتے تھے۔ اور خواہش نفس کے ساتھ لڑنے کو جہاد کی معراج سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی زبان و نگاہ میں تاثیر تھی۔ جدھر دیکھتے مذہب سے بیزار اور منکرین مذہب کی زندگیوں میں انقلاب برپا ہو جاتا۔ مذہب کے گرویدہ ہو جاتے۔ جس کی مثال خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زندگی میں ملتی ہے۔ راجپوتانہ میں ان کی وجہ اسلام پھیلا۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے دہلی کے اطراف میں منکرین مذہب کو دائرہ اسلام میں داخل کیا۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ نے علاقہ پنجاب میں مذہب سے بیزار لوگوں کو مذہب کا شیدائی بنایا۔

حضرت نظام الدین محبوب الہیؒ نے دہلی اور اس کے نواح میں اور اسی طرح سلسلہ چشتیہ نظامیہ و دیگر سلاسل کے صوفیاء نے ملک کے مختلف حصوں میں تبلیغ اسلام کی۔ مغربی پنجاب اسلام کی اشاعت کا سہرا حضرت بہاؤ الحق زکریا ملتانیؒ کے سر ہے۔ ریاست بہاولپور اور مشرقی پنجاب میں سید جلال بخاریؒ، خواجہ فریدؒ کے فیضان سے معرفت حق کی روشنی پھیلی۔ سندھ میں اسلام کی تبلیغ حضرت سید یوسف الدینؒ نے کی اور سات سو خاندان لوہانہ ذات کے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ ان کے علاوہ دیگر اولیائے کاملین نے بھی کافی حصہ لیا۔ بنگال میں شیخ سید جلال الدین تبریزیؒ نے اس مقدس فرض کو سرانجام دیا۔ آسام میں شیخ جلال الدین فارسیؒ نے اس نعمت عظمیٰ کو گھر گھر پہنچایا۔ کشمیر میں اول اسلام کے علمبردار بلبل شاہ رحمۃ اللہ علیہ تھے پھر سید علی ہمدانیؒ و دیگر اولیاء کاملین نے لوگوں کے دل روشن کیے۔

یوگنڈا کی طرف اسلامی آبادی عام طور پر اپنے اسلام کو حضرت بابا فخر الدینؒ کی طرف منسوب کرتی ہے جنہوں نے وہاں کے راجہ کو مسلمان کیا تھا۔ الغرض دنیا کے کونے کونے میں ان صوفیاء اسلام کی روشنی پھیلائی۔ (۱۲۲)

## فصل سوم

### سکون قلب کا حصول اور تصوف

سکون قلب خواہشات نفسانی پورا کرنے میں نہیں بلکہ خواہشات کو روکنے میں ہے۔ تعجب ہے اس آدمی پر جو خانہ خدا تک جانے کے لئے دشت صحرا کو طے کرتا ہے تاکہ وہاں انبیائے کرام علیہم السلام کی نشانیاں دیکھے کیوں اپنے نفس اور نفسانی

خواہشات کو عبور کر کے اپنے دل تک نہیں پہنچتا؟ دل میں اس کے مولا کے آثار ہیں مطلب یہ کہ دل معرفت حق کا پیغام ہے اور اس کعبہ سے عظیم تر جس طرف حسن بندگی ختم ہوتی ہے۔ دل قدرتی طور پر اس سے محبت کرتا ہے جو مہربانی سے پیش آئے۔

پاک ہے وہ ذات جس نے عارفوں کے دل محل ذکر زاهدوں کے دل منیخ توکل، متوکلوں کے دل منبع رضا درویشوں کے دل جائے قناعت اور اہل دنیا کے دل محل طمع بنائے۔ دلوں کا منہاج الگ الگ ہے۔ جدا جدا ارادے۔ علیحدہ علیحدہ خواہشیں۔ ایک دل معرفت کا مقام ہے دوسرے میں گمراہی کے سوا کچھ نہیں۔ ایک قناعت سے لبریز ہے دوسرا طمع و لالچ کا گھر ہے۔ دل قدرت حق کا عجیب مظہر ہے اعمال بد سے دل زنگ آلود ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بندہ کے دل کو اپنی معرفت کے لئے مخصوص کر کے نور معرفت سے مامور کر دے۔ اس درجہ کے لئے خاص و عام مومن و گنہگار اطاعت گزار سب برابر ہیں۔

### راز مسرت:-

انسان کی ساری تگ و دو ذہنی آسودگی کے لئے ہے کوئی اسے دولت کے انباروں میں، کوئی راگ رنگ اور کوئی بادہ وزن میں تلاش کرتا ہے لیکن ناکام رہتا ہے اسکی تگ و دو حیوانی لذات کے لئے ہوتی ہے جو بالا خرغم میں بدل جاتی ہے۔ فسق و فجور سے چہرہ مسخ، صحت تباہ اور آبرو برباد ہو جاتی ہے۔

آج کل امریکہ سب سے زیادہ متمول اور طاقتور ملک ہے۔ امریکہ کے اٹھارہ انیس کروڑ باشندے دنیا کی آبادی کا صرف چار فیصد ہیں لیکن ساٹھ فیصد دولت پر قابض ہیں۔ ان کے چار اور خاکروب تک کاروں کے مالک ہیں اگر مسرت تمول کا نتیجہ ہوتی تو یہ ملک مسرور ترین ہوتا لیکن وہاں آسودگی کا نام تک نہیں۔ ہر سال لاکھوں افراد خودکشی کر جاتے ہیں۔ بے اطمینانی کا یہ عالم کہ سالانہ بیس لاکھ سے زیادہ میاں بیوی کے درمیان جدائیاں ہوتی ہیں۔ اولاد حرام سے ان کی گلیاں بھر گئی ہیں اور بد چلن لڑکیوں سے ان کے گھر۔

سقراط نے کہا تھا کہ حقیقی مسرت علم میں ہے افلاطون نے علم کے ساتھ عدل، شجاعت اور اعلیٰ حکومت کو بھی شامل کر دیا تھا۔ لیکن قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ مسرت اور خوشی اطمینان کی وہ لہر ہے۔ جو اطماع دل سے ابھرتی ہے اور انسان کی دنیا بدل دیتی ہے یہ درست ہے کہ

”علم میں بھی سرور ہے“ لیکن عشق کی لذتیں عمیق تر اور پائیدہ تر ہیں۔ عشق اس ذہنی رابطہ کا نام ہے جو اللہ سے قائم ہو جاتا ہے جب ہم اللہ کے حسین تصور میں ڈوب کر اسے پکارتے ہیں تو جواباً وہ اشیر میں ایسی لہریں اٹھاتا ہے۔ جو

ہمارے دل میں پہنچ کر فردوسی سکون اور گہرے اطمینان کا احساس پیدا کرتی ہیں اور گاہے گاہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ روح کائنات ہم سے ہی کلام ہو رہی ہے اور وہ سکون جس کا حقیقی مسکن ستاروں کی مطمئن فضا ہے ہمارے قلب میں اتر رہا ہے۔ (۱۲۲)

فضائے کائنات میں ہماری نگاہوں سے پرے حسن و رنگ کا ایک ایسا جہاں آباد ہے جس کی ہر تجلی مسرت کی ایک لہر بن کر دل تک پہنچتی ہے۔ اہل نظر کا تجربہ یہ ہے کہ جب انسان کی ابدی روح اللہ کی طرف بڑھتی اور قدس و عظمت کی حدود میں داخل ہوتی ہے تو اس کا پیش منظر کھلتا اور وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس مادی دنیا کے مظاہر اسکی چشم حقیقت میں سے یوں محو ہونے لگتے ہیں جیسے بچپن کی کہانیاں جو پہلے دھندلاتی اور پھر ہماری یاد سے مٹ جاتی ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان سکون کا مل کی دولت پانے کے بعد غم روزگار سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اللہ کا فرمان ہے۔

الا بذكر الله تطمئن القلوب (۱۲۵) یاد رکھو کہ دلوں کو سکون اللہ کے ذکر سے ملتا ہے۔

اہل دنیا فلسفی چار ہزار برس سے تلاش اطمینان میں سرگرداں ہیں لیکن وہ قرآن کی اس حقیقت کو نہیں پاسکے۔ محبت الہی:-

محبت الہی راہ سلوک اور تصوف کے مقامات سے بلند تر مقام ہے۔ باقی جتنے مقامات ہیں وہ اس کے تابع اور ثمرات ہیں۔ رب ذوالجلال کا فرمان ہے۔

يحبهم و يحبونہ (۱۲۶) وہ اسکو چاہتا ہے اور وہ اسکو چاہتے ہیں۔

یہ مقام محبت درحقیقت اللہ تعالیٰ کا اپنے مخصوص بندوں کو مخصوص کرنا ہے اور اس کے ذریعے خداوند تعالیٰ کا انتہائی اور عظیم ترین فضل و کرم فرماتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے محبت کا معنی یہ ہے کہ اسکی اطاعت کی جائے اور حضرت محمد ﷺ سے محبت کی جائے اور اسکی اتباع کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

قل ان كنتم تحبون الله فا تعونى يحببكم فرما دیجئے اے محبوب! اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرمائے گا۔ (۱۲۷)

اللہ تعالیٰ سے محبت میں کمال اس وقت تک محال ہے جب تک اللہ تعالیٰ کی محبت انسان کو دنیا کی ہر شے کی محبت اور چاہت سے بے نیاز کر دے۔ اس امر کی تائید اور محبت خدا و رسول ﷺ کی توثیق حدیث نبوی ﷺ سے بھی ہوتی ہے۔



لا یومن احد کم حتی اکون احب الیه من تم میں سے کوئی شخص مومن کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں والدہ ولده والناس اجمعین<sup>۱</sup>۔ (۱۲۸) اسے اپنے والد، اولاد، اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

محبت کی علامات میں سے ایک علامت یہ ہے کہ محبوب کا ذکر کثرت سے کیا جائے۔  
چنانچہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔

من احب شیئا اکثر ذکرہ۔ (۱۲۹) جو کسی سے محبت کرتا ہے اکثر اسی کا ذکر کرتا ہے۔

ظاہر ہے جو اللہ تعالیٰ سے محبت کرے گا تو محبت کی علامت یہ ہے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے۔ ذکر الہی کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (۱۳۰) خبردار ذکر الہی سے دلوں کو سکون حاصل ہوتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ محبت الہی سکون قلب کے حصول کا باعث ہے۔ جتنی محبت زیادہ ہوگی۔ اتنا قلبی سکون نصیب ہوگا۔

شیخ ابوالحسن الوراق فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی شدید محبت سے ایک سرور خاص حاصل ہوتا ہے۔ (۱۳۱)  
رضائے الہی:-

محبت الہی کا نقطہ کمال یہ ہے کہ انسان اللہ کی رضا پر راضی ہو جاتا ہے یہاں اللہ تعالیٰ کے محبت کی کیفیت یہ ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے فرمان سے ظاہر ہے۔

تراہم رکما سجدا یبتغون فضلا من اللہ و تو انہیں دیکھتا ہے کہ کبھی رکوع اور کبھی سجود میں ہیں ہر طرح رضوانا (۱۳۲) اللہ سے اس کے فضل اور اس کی رضا مندی کے طلبگار ہیں۔

ان کی سعی و کاوش، عبادت اور شب بیداریاں ان سب کا مقصد وحید رضائے الہی کا حصول ہے۔ (۱۳۳)  
حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔

الرضاء بالقضاء باب اللہ الاعظم (۱۳۴) خداوند تعالیٰ کی بارگاہ کا باب عظیم۔ اس کی قضا پر راضی رہنا ہے۔

حضور ﷺ کا یہ بھی فرمان ہے کہ

ذاق طعم الايمان من رضى بالله ربا۔ (۱۳۵) اس نے ایمان کا ذائقہ پالیا جو اللہ کے رب ہونے پر راضی ہو گیا۔

شیخ حارثؒ فرماتے ہیں کہ ”خداوند تعالیٰ کے حکم کے تحت قلب کے اطمینان کا نام رضا ہے۔“

شیخ ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں ”قسمت کے فیصلہ پر دل کی مسرت کا نام رضا ہے۔“

شیخ سہل بن عبد اللہ کا ارشاد ہے ”جب رضا رضوان (خوشنودی) سے مل جاتی ہے تو طمانیت کلی حاصل ہو جاتی ہے۔“ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

فطوبیٰ لهم و حسن ماب (۱۳۶) پس ان کو یہ خوشخبری ہو کہ ان کا اچھا انجام ہو۔

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے سامنے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ کا یہ قول رکھا گیا کہ

الفقر احب الی من الغناء والسقم احب الی میرے نزدیک مفلسی تو نگری سے اور بیماری صحتندی سے من الصحة زیادہ محبوب ہے۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ ابوذر پر رحم فرمائے میں تو یہ کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کے لئے جو اختیار فرمایا ہے۔ بندہ خدا کی اختیار کردہ حالت کے سوا کسی اور حالت کی آرزو نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ بندے کے لئے جو پسند فرمائے بندہ اسی کو چاہے۔ جب بندہ خدا کے رضا اور اختیار کو دیکھ لیتا ہے تو وہ اپنی مرضی و اختیار سے اعراض کر کے ہر غم و فکر سے آزاد ہو جاتا ہے۔“

مشائخ کرام کے فرامین سے یہ بات واضح ہوئی کہ جو راضی برضائے الہی ہو جاتا ہے تو وہ اطمینان کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے۔

(۱۳۷) معلوم ہوا رضائے الہی بھی سکون قلب کے حصول کا باعث ہے۔

روح کی غذا:-

انسان دو چیزوں سے مرکب ہے۔

۱۔ جسم ۲۔ روح

جسم عالم خلق کی چیز ہے روح عالم بالا کی۔ جسم کا تعلق چونکہ عالم خلق سے ہے۔ تو اس کی غذا بھی یہیں اسی عالم میں پیدا کی گئی ہے۔ اور روح چونکہ عالم بالا کی چیز ہے تو اس کی غذا بھی اسی عالم میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

نحن نسبح بحمدك ونقدس لك ہم تیری ہی تسبیح بیان کرتے ہیں اور تیری ہی پاکی بیان کرتے ہیں۔ (۱۳۸)

جیسے جسم کو غذا نہ ملے تو لاغر اور کمزور پڑ جاتا ہے۔ بیمار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح روح کو غذا نہ ملے تو وہ بھی بے قرار اور بے چین ہو جاتی ہے۔ بیمار ہو جاتی ہے۔ اسلئے اگر حقیقی راحت چاہتے ہو۔ سکون خاطر کی تمنا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی یاد، اس کی عبادت اور فقر کی جانب آنا ہوگا۔

صرف جسم کی غذا کی طرف دھیان رہے تو پھر بے قراری بے اطمینانی، حسرت، ناکامی اور انجام خود کشی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

انسانی مجبہ لطیف قلب اور روح کی اصلی غذا عبادت الہی ذکر و فکر، تلاوت قرآن اور اعمال صالحہ ہیں۔ ان سے دل کو حقیقی اور دائمی اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اگر روح کو یہ غذا نہ ملے تو پھر بھوک کے اضطراب اور اضطراب سے تنگ آ کر مجبوراً نفس بہیم کی نجس غذا کھانے لگ جاتا ہے۔ تو پھر انسانی قلب بھی نفس بہیم کی عادت اختیار کر لیتا ہے۔

اور اسی کی صفات ذمہ کے متصف اور اخلاق رذیلہ سے متعلق ہو جاتا ہے۔ اور اپنی اعلیٰ ملکوتی احسن تقویم سے گر کر بہیمیت سبعیت اور شیطنیت کے درک اسفل میں جا گرتا ہے اور سفلی مخلوق میں شامل کر کے مقام سچین میں داخل کیا جاتا ہے۔ اسکے برعکس اگر روح کو روحانی غذا ملتی رہے تو پھر دل ذکر الہی کے انوار اور مشاہدات کی لذت اور ذوق و شوق میں محو ہو جاتا ہے۔ اس وقت نفس بہیم بھی جو لطیفہ قلب کا قریبی ہم نشین اور پڑوسی ہے اپنے رفیق دل کی نوری غذا کی لذت اور بومعلوم کر کے اس ملکوتی اور روحانی غذا کا شائق ہو جاتا ہے۔ فانی لذات کو چھوڑ کر ذکر الہی سے پرورش پاتا ہے۔ ملکوتی صفات سے متصف ہو جاتا ہے۔ ایسے سعادت مند کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

قد افلح من زكها ۱ یقیناً وہ شخص کامیاب ہو گیا جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر کے اس کو پاک کر لیا۔ (۱۳۹)

اللہ تعالیٰ کا یہ بھی فرمان ہے۔

واذکروا اللہ کثیراً لعلکم تفلحون اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرو تا کہ تم چھٹکارا پا لو۔

(۱۴۰)

اس وقت نفس بہمیں قلب ملکوتی کے رنگ میں رنگین ہو جاتا ہے۔ اور ملاء اعلیٰ کو نوری مخلوق میں شامل ہو کر ابدال آباد تک اس پاک لطیف عالم کی نوری لذات اور نظاروں سے لطف اندوز رہتا ہے۔ (۱۲۱)

اس لطف کے مزے لینے والوں نے شاہی سلطنت اور تخت و تاج کولات ماری اور جنگلوں اور غاروں میں ڈیرے ڈال دے۔ کون نہیں جانتا کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کو ایک دفعہ والی سنجر نے عرض کی کہ اگر آپ میرے دولت کدے پر تشریف لائیں تو نیمروز کا سارا علاقہ لنگر کے لئے دے دوں گا۔ اسکے جواب میں آپ نے فرمایا۔

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد

در دل اگر آید ہوس ملک سنجرم

زا نگا یاتم خبر از ملک نیم شب

صد ملک نیم روز بیک جوئی خرم

سنجر کے چتر کی طرح میرا چہرہ سیاہ ہوا اگر فقر کے ہوتے ہوئے مجھے ملک سنجر کی ہوس ہو۔ جب سے میرا دل ملک نیم شب سے آشنا ہو گیا ہے۔ سنجر جیسے سولمک میں ایک بوسے نہیں خریدتا۔

الغرض اس روحانی دوم دولت اور روحانی لازوال لذت کی کیا بات ہے اس کی قدر و قیمت وہی جانتے ہیں جنہوں نے یہ چاشنی چکھی ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ پر جب اللہ تعالیٰ کی نورانی تجلیات کی بارش ہونے لگی تو فرماتے ہیں اگر اس نعمت کا ایک ذرہ دنیا کے بادشاہ دیکھتے تو تخت چھوڑ کر جنگل میں آٹھتے۔ (۱۲۲)

## حاصل بحث

مذکورہ بالا پہلوؤں میں تصوف کے علمی اثرات کا جائزہ اور اصلاح کے لئے

## تجاویز

تصوف شریعت کے علاوہ یا اس سے ہٹ کر کوئی ادارہ یا تحریک نہیں بلکہ شرعی مسائل و احکام کے ضمن میں لوگوں کے اندر آمادگی اور شوق ابھارنا تصوف کا اصل کام ہے۔ یوں تو نماز ادا کے ارکان کے ساتھ مکمل ہو جاتی ہے۔ لیکن تصوف حضور قلب پیدا کرتا ہے۔ روزے کے ساتھ ضبط نفس کا اہتمام تصوف کا منشاء ہے۔ زکوٰۃ ادا کرتے وقت سب کچھ خدا کی راہ میں لٹا دینے کا عزم تصوف کا منشاء ہے۔

تصوف حج کو دنیا کے غیر ضروری مشاغل اور جھنجھٹوں سے آزاد کر دینے کا ذریعہ بنا دینا چاہتا ہے۔ اسی طرح دیگر تمام فرائض و واجبات کے سلسلہ میں تصوف کی نظر اس کی اصل غایت اور روح پر رہتی ہے۔ اسلام جب ایک تحریک اور انقلاب کے طور پر دنیا کے سامنے آیا اور دنیا کے بیشتر حصے میں حکمران دین کے طور پر متعارف ہوا تو یہ باقاعدہ ایک ایسا ادارہ بن گیا جس کے کئی شعبے ہوں۔ اسلام محض مذہب ہوتا تو اس کے پیروکاروں کے لئے یہی کافی تھا کہ وہ زاہد و عابد، شب بیدار اور تسبیح خوان بن جائیں۔ لیکن یہ دین تھا اور انسانی زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی اور محیط ہے۔ اس دین کے لیے ضروری تھا کہ اس کے ماننے والوں میں جرنیل بھی ہوں اور سیاستدان بھی، عابد و زاہد بھی ہوں اور عالم اور محقق بھی، مفسرین کی ایک جماعت بھی ہونی چاہیے اور محدثین کی بھی، متکلمین اسلام کے گروہ کی ضرورت بھی تھی اور فلسفیان اسلام کی بھی، سو وقت گزرنے اور دائرہ اسلام وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ یہ تمام شعبے خود کفیل ہوتے چلے گئے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام، فلسفہ، منطق، مناظرہ، سیاسیات، سپاہ گری اور سفارت کاری یہ اور ایسے دیگر علوم و فنون مستقل حیثیت اختیار کر گئے۔ اسلام بین الاقوامی دین بنا تو بین الاقوامی تقاضے بھی پیدا ہو گئے۔ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بے پناہ صلاحیت کاری ضرورت تھی۔ اس امر سے ہر شخص متفق ہے کہ جو چیز جتنی اپنا دائرہ اثر وسیع کر لیتی ہے اس میں اتنی ہی کمزوری پیدا ہوتی چلی جاتی ہے اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں فطرتاً ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ یہ کچھ اسلام کے اندر بھی ہوا۔ اسلام کا اصل مقصود اور مدعا حقیقی دنیا کے لئے بہترین اور باصلاحیت انسان فراہم کرنا تھا۔ اور اسلام نے اس مقصد کو کبھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیا لیکن مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ مختلف شعبے اپنے نام کے ساتھ تو قائم رہے لیکن مقصدیت کا فقدان صاف طور پر محسوس ہونے لگا۔ تصوف اسلام صرف لشکر و سپاہ ہی پر اکتفاء نہیں کرتا وہ لشکر و سپاہ کو ”جند اللہ“ کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے۔ تصوف اسلام قرآن اور اس کی تفسیر کے ضمن میں محض شان نزول، اقسام وحی، تقسیم سور، ناسخ و منسوخ، آیات مکیہ و مدنیہ، تاویل، تعبیر، حروف مقطعات، حکمت و متشابہات کے علم کو کافی نہیں سمجھتا۔ جب تک کہ روح قرآن دل میں نہ اتر جائے۔ وہ ایسے محدثین چاہتا ہے جو احادیث کے ضعیف و قوی، حسن و صحیح اور ناسخ و منسوخ جاننے کے ساتھ ساتھ مزاج شناس رسول ہوں تاکہ اطاعت میں محبت کی کیفیت پیدا ہو جائے۔

تصوف اسلام اصل میں انہیں فقہا سمجھتا ہے جو زے طہارت و روضہ، بیع و شراء قرض و رہن اور لعان و ظہار کے مسائل ہی نہ جانتے ہوں بلکہ انہیں دین کی حکمت سے پوری واقفیت ہو اور دل و جان سے اس پر عمل کرنے والے ہوں اور اسی طرح اسلام کا فلسفہ اور علم کلام کے ضمن میں بھی اپنا ہی حراج ہے۔ مگر اسلامی حکومت کی حدود میں وسعت، پیردکاروں کی ان گنت تعداد، مختلف ملکوں کے تمدن کے اثرات، دیگر قوموں کی عادات اور حقالی رسوم و روایات کی وجہ سے مسلمانوں کی

زندگی کے ہر شعبے پر مختلف اثرات مرتب ہوئے، نتیجتاً صورت میں تو چنداں تبدیلی نہ آئی البتہ معنی بدل گئے۔ یوں تو مسلمانوں میں اچھے جرنیل بھی تھے، مفہر اور محدث بھی، متکلم بھی اعلیٰ درجے کے اور مناظر بھی بلند پایہ، فقہاء کی کمی بھی نہ تھی اور سیاستدانوں کی بھی! لیکن معیاری انسان کم سے کم تر ہوتے چلے گئے۔ ایسے انسان جن میں تقویٰ، اخلاص، مروت، صبر، سہاحت، فتوت، انکساری، بذل و سخا، سوز و گداز، رفق و طلب، عفو و درگزر، للہیت، قناعت، صدق، سادگی، توکل اور تسلیم و رضا کے اوصاف بدرجہ اتم ہوں، کہ یہی معراج انسانیت اور مقام آدمیت ہے۔

تصوف اسلام ایک باقاعدہ ادارے اور تحریک کی شکل میں ابھرا اور متذکرہ صدر کام دیے تاکہ جو شخص جیسا اور جس شعبے میں ہے، وہیں رہے لیکن اس میں بنیادی انسانی اوصاف و حضائے اور اخلاق ناضلہ کا ہونا سب سے اہم چیز ہے۔

تصوف اسلام نے جو بھی خدمات سرانجام دیں اور جس بھی درجے میں اپنے علمی اثرات چھوڑے اس میں یہ تو نہ ہوا اور نہ تصوف اس کا دعویدار ہے کہ تفسیری نکات اور محدثانہ اصطلاحات میں اضافہ ہوا ہو۔ فقہی ابواب کی از سر نو ترتیب ہوئی ہو۔ علم کلام کے نئے ادارے وجود میں آئے ہوں البتہ اس سے انکار بہت دشوار ہے کہ تصوف نے دنیا کو مخلص، بے ریا، باخدا، متواضع، راستباز، دردمند، غیور و جسور، متوکل، قانع، صابر و شاکر، سادہ اور ایثار پیشہ انسان مہیا کیے ہیں۔

مختلف علوم فنون پر جب ہزاروں کتابیں لکھی گئیں اور لکھی جانے لگیں لیکن ان کا انسانی اخلاق سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ انہیں داد تحقیق ہی دی جاسکتی تھی تو صوفیاء نے اسے عبث کام سمجھتے ہوئے لوگوں کو ہدایت کے بنیادی سرچشموں یعنی قرآن و حدیث کی تعلیمات سے روشناس کرایا۔

ایک محقق جب کتاب لکھتا ہے تو ان مسائل کی تحقیق و جستجو کرتا، جبر و قدر، خلق قرآن ملائکہ اور جنات کا وجود، جنت کی ماہیت، رفع عیسیٰ، ولادت مسیح اور ایسے ہی دیگر مسائل لیکن صوفیاء نے ان مسائل کے مقابلے میں توبہ و اثابت، زہد و ورع، خشوع و خضوع، تسلیم و رضا، صبر و شکر، توکل علی اللہ، عجز و انکسار، فقر و قناعت، عزم و استقامت، ایثار و اخلاص، صدق و صفا، خوف و خشیت اور حکمت و بصیرت ایسے مضامین کو اپنی کتابوں کی زینت بنایا۔

اب ہر معقول شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ انسانیت کو کن مضامین اور ایک معیاری انسان بننے کے لئے کن مسائل کی ضرورت

ہے۔ (۱۲۲)

## تعلیمات تصوف :-

حضرت ابوسعید بن ابی الخیر فرماتے ہیں۔ اے سالک تیرے حق میں توئی (تیری ذات) سے بڑھ کر کوئی شے

موجب زحمت و کلفت نہیں۔

۱۔ ایک دفعہ فرمایا یہ تصوف بھی شرک ہے۔ لوگ حیران ہوئے پوچھا تو جواباً فرمایا۔ تصوف نام ہے نفس کو غیر اللہ میں مشغول ہونے سے باز رکھنے کا مگر اللہ کے سوا غیر اللہ کا وجود ہی کہاں ہے۔

۲۔ فرمایا! خداوند تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ صرف ایک قدم کا۔ اپنی خودی سے باہر نکلنے کے لئے ایک قدم اٹھاؤ، فوراً خدا تک پہنچ جاؤ گے۔

۳۔ فنا کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی شے موجود نہیں ہے۔

۴۔ ”من عرف نفسه فقد عرف ربه“ کا مطلب یہ کہ جو شخص اپنے کو معصوم سمجھتا ہے وہ جانتا ہے کہ خدا موجود ہے۔ یہ علم بذریعہ عقل و خرد حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ بذریعہ عرفان حاصل ہو سکتا ہے۔ اور عرفان کا مقام قلب اور یہ لطیفہ قلب ایک روحانی آلہ ہے نہ کہ وہ قلب جو خون اور گوشت کا مجموعہ ہے۔

۵۔ یہ عرفان دراصل ”سر اللہ“ یعنی خدائی راز ہے اور ایک فضل ہے جو قلب انسانی پر نازل ہوتا ہے۔

۶۔ اس واحد لا شریک سے محبت کرو جو غیر فانی ہے تاکہ تم بھی غیر فانی ہو جاؤ۔

۷۔ کسی نے سوال کیا کہ ”شر“ کیا ہے اور بدترین شر کیا ہے۔ فرمایا تو ”شر“ اور بدترین شر یہ ہے کہ تو اس حقیقت سے آگاہ نہ ہو کہ تو ”شر“ ہے۔

۸۔ یہ خیال کرنا کہ فلاں شخص نے مجھے راحت پہنچائی اور فلاں نے زحمت۔ یہ شرک ہے۔

۹۔ استقامت یہ کہ ایک کہنے کے بعد کبھی دو نہ کہے۔

۱۰۔ کشش کا تقاضا کوشش ہے جس کے بغیر کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔

۱۱۔ اللہ تک پہنچنے کے لئے نیاز مندی سے بڑھ کر کوئی راستہ نہیں۔

۱۲۔ سچا ولی وہ ہے جو نبی آدم کی خدمت کرے۔

۱۳۔ قرب الہی کا بہترین ذریعہ بندگان خدا سے محبت و پیار ہے۔

۱۴۔ سلوک میں قدم رکھو تو حسب ذیل امور اپنے اوپر لازم رکھ لو۔

۱۔ کثرت صوم ۲۔ حرام سے اجتناب

۳۔ کثرت ذکر ۴۔ شب بیداری

۵۔ نامحرم عورت سے غصق لصر ۶۔ ترک سوال

۷۔ تسلیم و رضا ۸۔ بازار سے اجتناب

۱۰۔ اتباع شریعت

۹۔ قیام در مسجد

۱۲۔ فرش زمین پر سونا

۱۱۔ تلاوت شبانہ روزیں ختم قرآن

ریاضت و مجاہدے کے لئے یہ ضروری امور ہیں۔

۱۲۔ حضرت خواجہ نظام الدین دہلویؒ فرماتے ہیں کہ بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے پاس ایک شخص چھری لایا۔ آپ نے فرمایا سوئی اور دھاگہ لادو۔ میں توڑنے نہیں بلکہ ملانے اور جوڑے کے لئے آیا ہوں۔

۱۳۔ علم و عمل کی باہم ملازمت کے سلسلہ میں شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتائیؒ نے فرمایا ”توشیح کی طرح بن اور شمع کی طرح نہ بن“ مطلب یہ کہ دوسروں کو روشنی پہنچاؤ اور خود تاریکی میں نہ رہو۔

۱۴۔ توکل کی روح کے سلسلہ میں حضرت ابوبکر شبلیؒ نے فرمایا۔ ایک کثیر العیال شخص کی شکایت پر! ”ان افراد کو گھر سے نکال دو جن کا رزق اللہ کے ذمہ نہیں ہے۔“

۱۵۔ شیخ نظام الدین دہلویؒ فرماتے ہیں۔ برا کہنا برا ہے مگر برا چاہنا اس سے بھی بدتر ہے۔ تصوف کا دستور اور یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ ہر کام میں تقصدیت کے متلاشی ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایسا علم محض الفاظ کا گورکھ دھندہ ہے جو عمل سے خالی ہو۔ اسی نظریہ کو ایک مرد حق نے یوں واضح کیا۔

۱۶۔ حضرت خواجہ نظام الدین دہلویؒ نے مکارم اخلاق کے بارے گفتگو کی تو فرمایا ”شیخ ابوسعید ابوالخیر اور بوعلی سینا کی ملاقات ہوئی۔ رخصت سے پہلے بوعلی سینا نے ایک صوفی کو کہا کہ حضرت میرے بارے میں جو کچھ فرمائیں۔ لکھ دینا۔ مگر آپ نے اس کے بارے کچھ بھی نہیں فرمایا تو ایک دن صوفی نے خود پوچھا کہ بوعلی سینا کیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ فلسفی ہے، طبیب ہے، عالم ہے، البتہ مکارم اخلاق ندارد! اس صوفی نے بوعلی سینا کو لکھ کر دیا۔ بوعلی سینا نے آپ کو لکھا اس میں یہ بھی مذکور تھا کہ میں نے اتنی کتابیں مکارم اخلاق پر لکھی ہیں پھر حضرت کیوں فرماتے ہیں کہ میں مکارم اخلاق نہیں رکھتا۔ آپ نے فرمایا میں یہ تو نہیں کہتا کہ بوعلی سینا مکارم اخلاق جانتا نہیں میں نے تو یہ کہا ہے کہ مکارم اخلاق کا مالک نہیں ہے۔“

## تصوف کا عملی منہاج:

صوفیاء کرام محض کلام نظری سے شرع کے احکام آداب لوگوں پر واضح کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ سالک کا ہاتھ پکڑ کر ترقی کے تمام مراتب میں اس کے ساتھ چلتے ہیں اور سیر الی اللہ کی تمام منازل میں اس کے



ساتھ رہتے ہیں، اور اپنی خصوصی عبادات اور مہربانیوں سے نوازتے ہیں اور انکے ساتھ محبت سے پیش آتے ہیں اور اپنے حال و حال اور اپنی علو ہمت اور عظمت و صداقت سے اسے پروان چڑھاتے ہیں۔ اگر وہ ذکر سے غافل ہو جائے تو اسکی توجہ ذکر کی طرف مبذول کراتے ہیں۔ اگر صراط مستقیم سے منحرف ہو تو اسے دوبارہ راہ راست پر لاتے ہیں۔ اگر وہ مجلس سے غائب ہو جائے تو اسکی خبر گیری کرتے ہیں جب سست پڑے تو اسکی سستی زائل کر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ اس کے لئے ایک ایسے عملی نصاب (طریقہ کار) کی راہنمائی کرتے ہیں۔ جس کے ذریعہ دین کے ارکان ثلاثہ یعنی ایمان، اسلام اور احسان تک اس کی رسائی ہو جاتی ہے۔

صوفیاء کرام ارباب اعمال و احوال ہوتے ہیں نہ کہ ارباب دعویٰ و اقوال۔ کلام اور تعلیم تو بہت آسان ہے لیکن اسکے مقابلہ میں عمل اور تطبیق بہت مشکل۔

اس باب میں ہم وہ عملی نصاب بیان کریں گے جس کو صوفیاء کرام رضاء الہی اور اس کی معرفت تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اختیار کرتے ہیں۔ یہ عملی نصاب کتاب اللہ کی عملی تطبیق اور رسول ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کی اتباع و اقتداء پر مبنی ہے۔ صوفیائے کرام نے کوئی نیا طریقہ اختراع نہیں کیا اور نہ ہی کسی نئے اسلوب کو اپنایا ہے بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کے قول، عمل اور اخلاق کے متبع ہیں۔

## صحبت شیخ:

اس عنوان کے تحت مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے درج ذیل موضوعات پر بحث کی ہے۔

- (۱) صحبت کی اہمیت اور فوائد و آثار۔
- (۲) قرآن و سنت سے اس کا ثبوت۔
- (۳) صحبت کی اہمیت کے بارے میں علماء و محدثین اور عارفین کے اقوال و آراء۔

## (۱) صحبت کی اہمیت اور فوائد و آثار:

صحبت کا انسان کی شخصیت، طرز عمل اور اخلاق پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ صحبت اختیار کرنے والا روحانی اثر اور علمی اتباع سے اپنے صاحب کی صفات کو اخذ کرتا ہے۔ انسان طبعی طور پر معاشرتی واقع ہوا ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ وہ مختلف قسم کے لوگوں سے ملے اور ان میں اس کے دوست و احباب ہوں۔ اگر وہ برے اور فاسق و فاجر لوگوں کو دوست بنائے گا تو وہ اخلاقی انحطاط کا شکار ہوگا اور اسکی اچھی صفات بتدریج ناپید ہو جائیں گی لیکن اسے شعور تک بھی نہیں ہوگا۔ یہاں تک

کہ وہ اپنے دوستوں کی طرح ذلت کی انتہائی پستی میں گر جائے گا۔ اسی طرح اگر اس نے کسی صاحب ایمان، متقی اور کسی عارف باللہ کی صحبت کو اختیار کیا تو جلد ہی وہ بلندیوں کے اعلیٰ مقام پر پہنچ جائے گا۔ اور اس سے عمدہ اخلاق، پختہ ایمان، صفا عالیہ اور معارف الہیہ حاصل کرے گا اور اپنے نفس کے عیوب اور برے اخلاق سے محفوظ ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی آدمی کے اخلاق کو اس کے دوست و احباب سے پہچانا جاتا ہے۔

اذا كنت في قوم فصاحب خيارهم ولا جب تم کسی قوم میں ہو، تو ان میں سے بہترین لوگوں کی صحبت الاریدی فتردی مع الردی عن المرء صحبت اختیار کر گھٹیا اور خسیس لوگوں کی سنگت اختیار نہ کر، لاتسئل و سل عن قرینه فکل قرین بالمقارن کہ تو بھی ان کے ساتھ ہلاکت کا شکار ہو جائے۔

یقتدی۔ (۱۲۲)

(۲) کسی انسان کے متعلق نہ پوچھ، بلکہ اس کے دوست کے متعلق پوچھ، کیونکہ ہر دوست اپنے دوست کی پیروی کرتا ہے۔

صحابہ کرام نے یہ بلند مرتبہ نبی کریم ﷺ کی صحبت و ہم نشینی سے حاصل کیا ہے۔ حالانکہ قبل از صحبت جہالت کی تاریکیوں میں تھے۔ اسی طرح تابعین کو جو یہ عظیم شرف ملا ہے یہ صحابہ کرام کی صحبت اور ملاقات کی ہی طفیل ہے۔ کیونکہ نبی پاک ﷺ کی رسالت عام اور تاقیامت رہنے والی ہے۔ اس لئے رسول ﷺ نے علماء و عارفین کو اپنا جانشین بنایا ہے اور انہیں اپنے نبی کریم ﷺ سے علم و اخلاق اور ایمان و تقویٰ ورثہ میں ملا ہے اور یہ ہدایت و ارشاد اور دعوت الی اللہ میں اپنے نبی کی نائب ہیں۔ یہ سید نبوت سے نور حاصل کرتے ہیں۔ تاکہ انسانیت کے لئے ہدایت اور حق کے راستہ کو روشن کریں۔ جو شخص ان کی صحبت میں بیٹھتا ہے۔ اس کے دل میں بھی وہ نور سرایت کر جاتا ہے۔ جو انہوں نے رسول ﷺ سے حاصل کیا ہے۔ پس جس نے ان کی نصرت و اعانت کی گویا وہ دین کا معین و مددگار ہوا۔ اور جس نے اپنی زنجیر کا حلقہ ان پاکباز لوگوں کی زنجیر سے مربوط کیا تو وہ درحقیقت نبی پاک ﷺ تک جا پہنچا گویا کہ چشمہ نبوی سے فیضاب سیراب ہوا یہی وہ دین محمدی ﷺ کے وارث ہیں جنہوں نے دین کو لوگوں تک بذریعہ نقل و روایت پہنچایا۔ اور انکی حرکات و سکنات اور طرز عمل دوسرے لوگوں کے لئے بہترین نمونہ ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں نبی پاک ﷺ کا ارشاد ہے۔

لاتزال طائفه من امتی ظاہرین علی الحق لا ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر یضرهم من خذلهم حتی یاتی امراللہ۔ وہم قائم رہے گا۔ ان کے مخالفین ہرگز نقصان نہ پہنچا سکیں کذلک۔ (۱۲۵)

گے۔ یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے تو وہ اسی حالت پر قائم ہوں گے۔

مرد زمانہ سے ان کے آثار منقطع نہیں ہوں گے اور کوئی علاقہ ان سے خالی نہ ہوگا۔ یہی وہ جانشین رسول خدا ہیں جن کی صحبت مجرب تریاق ہے۔ اور ان سے کبھی زہر قاتل ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کا ہم نشین کبھی بد بخت نہیں ہوتا۔ ان کی صحبت اصلاح نفوس، تہذیب اخلاق، عقیدہ کی پختگی اور رسوخ ایمان کے لئے موثر عملی علاج ہے۔ کیونکہ یہ امور مطالعہ کتب سے حاصل نہیں ہوتے۔ بلکہ یہ عملی اور وجدانی خصائل ہیں۔ جنہیں اتباع اور پیروی، قلبی تعلق اور روحانی تاثیر سے حاصل کیا جاتا ہے۔

اس کا دوسرا سبب اور وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی انسان قلبی امراض اور ایسی پوشیدہ بیماریوں سے خالی نہیں جن کی تشخیص وہ بذات خود نہیں کر سکتا۔ ان قلبی امراض سے مراد ریا، نفاق، غرور، انایت حب شہرت خود پسندی اور بخل وغیرہ ہیں۔ بلکہ انسان تو اپنے آپ کو سمجھتا ہے کہ وہ اخلاق میں سب سے زیادہ کامل اور دین میں سب سے زیادہ راسخ ہے اور یہ جہل مرکب اور واضح گمراہی ہے۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے۔

قل هل ننبئکم بالا خسرین اعمالا فرمایے (اے لوگو) کیا ہم مطلع کریں تمہیں ان لوگوں الذین ضل سعیہم فی الحیاۃ الدنیا وہم پر جو اعمال کے لحاظ سے گھاٹے میں ہیں جن کی ساری یحسبون انہم یحسنون صنعاً جدوجہد دینی زندگی کی آراستگی میں کھو کر رہ گئی۔ اور وہ یہ خیال کر رہے ہیں کہ وہ بہت بڑا عمدہ کام کر رہے ہیں۔ (۱۲۶)

جس طرح انسان اپنے چہروں کے عیوب کو صاف ستھرے آئینہ میں دیکھتا ہے جو اس کی حقیقت حال کو واضح کر دیتا ہے۔ اس طرح مومن کے لئے بھی ایک مخلص اور ناصح مومن کی ضرورت ہے جس کا حال اس سے اچھا، اخلاق بلند اور ایمان قوی ہو، وہ اس کی صحبت اختیار کرے۔ تاکہ وہ اس کے نفسانی عیوب اور پوشیدہ قلبی امراض کو اپنے قال یا حال سے واضح کرے اس لئے نبی پاک ﷺ کا ارشاد ہے۔

المؤمن مرآۃ المؤمن ”ایک مومن دوسرے مومن کے لئے آئینہ ہے۔“

(۱۲۷)

ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اس بات کا خیال رکھیں کہ آئینے مختلف انواع و اقسام کے ہوتے ہیں بعض صاف شفاف اور بعض گدے ہوتے ہیں۔ جو چہرہ کے حسن و جمال کو بگاڑ دیتے ہیں، اور بعض ایسے ہوتے ہیں جو چہرہ کو چھوٹا اور بڑا دکھاتے ہیں اور یہی حال دوستوں کا ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جو دوست کے نفس کی حالت کو ظاہر نہیں کرتے، بلکہ وہ اس کی مدح و ثنا کرتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ اپنے آپ کو کامل گمان کرنے لگتا ہے۔ اور اس میں غرور اور خود پسندی کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ یا وہ اپنے دوست کی مذمت کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ اپنے نفس کی اصلاح سے مایوس ہو جاتا ہے۔

مگر کامل مومن وہ مرشد صادق ہوتا ہے جو اپنے آئینہ کو کسی مرشد کامل سے صیقل کراتا ہے۔ اور اسی طرح یہ سلسلہ حضور ﷺ تک متصل ہو جاتا ہے اور آپ کی ذات ہی وہ آئینہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے انسانیت کے لئے نمونہ قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

”لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجو اللہ والیوم الآخر و ذکر اللہ کثیراً“ (زندگی میں خوبصورت نمونہ ہے یہ نمونہ اس کے لئے ہے جو اللہ سے ملنے اور قیامت کے آنے کی امید رکھتا ہے اور (۱۲۸)

کثرت سے اللہ کو یاد کرتا ہے۔“

تزکیہ نفس اور اخلاقی کمالات سے مزین ہونے کا عملی طریقہ جانشین محمدی ﷺ کی صحبت ہے یعنی وہ مرشد کامل جس کی صحبت سے مرید کے ایمان اور تقویٰ اور اخلاق میں اضافہ ہو، اور اس کی مجلس میں حاضری سے قلبی امراض سے شفاء حاصل ہو اور اس کی شخصیت اپنے مرشد کامل کی شخصیت سے اثر قبول کرے۔ جو کہ حضور نبی کریم ﷺ کی مثالی شخصیت کا عکس ہے۔

اس بحث سے ان لوگوں کی غلط فہمی دور ہو جانی چاہئے جو یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ اپنے قلبی امراض کا علاج خود کر سکتے ہیں۔ اور محض قرآن کریم کی تلاوت اور رسول کریم ﷺ کی احادیث پڑھ کر اپنے نفس کی بیماریوں کا علاج کر سکتے ہیں۔ کیونکہ کتاب و سنت میں قلبی و نفسانی علاج کے لئے مختلف قسم کی ادویات کا ذکر ہے اس لئے قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ ایک طبیب کا ہونا بھی ضرور ہے جو ہر مرض کی مناسب دوا تجویز کرے، اور ہر بیماری کا صحیح علاج تجویز کرے۔ رسول ﷺ بھی صحابہ کرامؓ کے قلوب کا علاج فرمایا کرتے تھے اور ان کے نفوس کا بھی اپنے حال و حال سے تزکیہ فرمایا کرتے تھے جلیل القدر صحابی حضرت ابی بن کعبؓ کو پیش آنے والا واقعہ بھی اسی قبیل سے ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں

مسجد میں بیٹھا تھا کہ ایک آدمی آیا اور نماز پڑھنے لگا اس نے نماز میں ایسی قرات کی جس کو میں نے پسند کیا۔ پھر ایک اور آدمی داخل ہوا جس نے نماز میں ایک دوسری قرات کی۔ جب انہوں نے نماز ختم کی تو ہم رسول ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے میں نے عرض کیا، یا رسول ﷺ اس آدمی نے ایسی قرات کی ہے جس کو میں نے پسند کیا ہے۔ اور اس دوسرے آدمی نے ایک اور قرات کی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے دونوں کو قرآن پڑھنے کا حکم دیا جب دونوں نے پڑھا تو آپ ﷺ نے دونوں کی قرات کی تحسین فرمائی۔ حضرت ابی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ صورت حال دیکھی تو میرے دل میں شک و شبہ کے بادل چھا گئے جب نبی کریم ﷺ نے میری اس حالت کا ملاحظہ فرمایا تو میرے سینہ دست اقدس کو مارا جس کی وجہ سے میں پسینے میں شرابور ہو گیا۔

اس سے ثابت ہوا کہ صحابہ کرامؓ بھی محض قرآن کریم کی تلاوت سے اپنی نفوس کا علاج نہیں کر سکتے تھے بلکہ وہ بھی محمدی ﷺ شفا خانہ میں حاضر ہوتے تو آپ ﷺ ان کے نفوس کا تزکیہ اور ان کی تربیت کی نگرانی فرماتے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

هو الذي بعث في الامم رسولا منهم يتلوا "وهي الله تعالى" جس نے مبعوث فرمایا امیوں میں سے علیہم آیاتہ ویزکیہم ویعلمہم الکتاب والحکمة ایک رسول انہیں میں سے جو پڑھ کر سناتا ہے انہیں اس کی آیتیں اور پاک کرتا ہے ان (کے دلوں) کو اور (۱۲۹)

سکھاتا ہے کتاب و حکمت۔“

تزکیہ علیحدہ چیز ہے اور تعلیم قرآن علیحدہ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ”یزکیہم“ سے مراد آپ کا صحابہ کرام کو حالت تزکیہ عطا کرنا ہے۔ اور علم تزکیہ اور حالت تزکیہ میں بہت بڑا فرق ہے۔ جس طرح کہ علم صحت اور حالت صحت میں بڑا فرق ہے اور ان دونوں کو جمع کرنے سے ہی کمال حاصل ہوتا ہے۔ ہم بہت سے حیران و پریشان لوگوں کے بارے میں سنتے ہیں کہ وہ قرآن حکیم کو پڑھتے ہیں اور اس کے علاوہ بھی دوسرے بہت سے علوم واقف ہوتے ہیں۔ اور وہ شیطانی وساوس کے بارے میں گفتگو بھی کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود دوران نماز مختلف قسم کے وسوسوں سے نجات نہیں پاسکتے۔

جب طب جدید میں یہ بات ثابت شدہ ہے کہ انسان خود اپنا علاج نہیں کر سکتا خواہ اس نے طب کی کثیر کتب پڑھی ہوں بلکہ اس کے لئے طبیب ضروری ہوتا ہے جو اس کی پوشیدہ امراض کی تشخیص کرے۔ اور پیچیدہ امراض سے مطلع ہو جو اس کے لئے مخفی تھیں تو امراض قلبیہ اور نفسانی بیمار یوں کو طبیب کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ بیماریاں زیادہ

خطرناک پوشیدہ اور دقیق ہوتی ہیں۔ اس لئے کسی مرشد کامل صاحب اذن سے تزکیہ نفس اور ان بیماریوں سے چھٹکارا پانا مفید اور ضروری ہوتا ہے اس کے بعد ہم کتاب وسنت فقہاء و محدثین اور عارفین کے اقوال ذکر کریں گے جس سے صحبت کی اہمیت واضح ہو جائے گی اور اس کے اچھے آثار اور عمدہ نتائج سے آگاہی ہوگی۔

### صحبت کی اہمیت پر قرآنی دلائل:

ارشاد خداوندی ہے۔

ياايهاالذين امنوا اتقوا الله و كونو مع اے ایمان والو! ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور ہو جاؤ سچے  
الصادقين (۱۵۵) لوگوں کے ساتھ۔

صادقین سے مراد وہ مخلص مومنین ہیں جن کا ذکر اس آیت میں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

من المؤمنین رجال صدقوا ما عاهدوا الله ابل ایمان میں سے ایسے جواں مرد ہیں جنہوں نے سچا کر  
علی (۱۵۱) دکھایا جو وعدہ انہوں نے اللہ سے کیا تھا۔

(۲) ارشاد خداوندی ہے۔

واصبر نفسك مع الذين يدعون ربهم بالغدوة و اور روکے رکھیئے اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ  
العشتی یریدون وجهه ولا تعدعینا ك عنهم جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح و شام، طلبگار ہیں اس کی  
ترید زینة الحياة الدنيا ولا تطع من اغفلنا رضا، اور نہ ہٹیں آپ کی نگاہیں ان سے۔ کیا آپ  
قلبه عن ذکرنا واتبع هوا۔ وکان امره فرطا چاہتے ہیں دنیوی زندگی زینت اور نہ پیروی کچھ اس  
(بد نصیب) کی، غافل کر دیا ہے ہم نے جس کے دل کو اپنی  
(۱۵۲) یاد سے اور وہ اتباع کرتا ہے اپنی خواہش کا اور اس کا معاملہ  
حد سے گزر گیا ہے۔

یہاں خطاب رسول ﷺ کو ہے اور اس کا مقصد تعلیم امت ہے۔

(۳) ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

واتبع سبیل من اناب الی (۱۵۳) اور پیروی کرو اس کے راستہ کی جو میری طرف مائل ہوا۔

(۴) فرمان خداوند قدوس ہے۔

وَيَوْمَ يَعْصِي الظَّالِمُ عَلَى يَدَيْهِ يَقُولُ يَا لَيْتَنِي أُورِثُ رُزْغَ ظَالِمٍ (فرطِ مدامت) کاٹے گا اپنے ہاتھوں کو  
اتخذت مع الرسول سبيلا يا ويلتنا ليتني لم (اور) کہے گا کاش میں نے اختیار کیا ہوتا رسول  
اتخذ فلانا خليلا لقد اضلني عن الذكر بعد اذ كریم ﷺ کی معیت میں (نجات کا راستہ) ہائے  
جاء نى وكان الشيطان للانسان خذولا۔ افسوس کاش نہ بنایا ہوتا میں فلاں کو اپنا دوست۔ واقعی  
(۱۵۴) اس نے بہکا دیا مجھے اس قرآن سے اس کے میرے پاس  
آجانے کے بعد اور شیطان تو ہمیشہ سے انسان کو بے  
یار و مددگار چھوڑنے والا ہے۔

(۵) فرمان الہی ہے۔

الا خلاء يو منذ بعضهم لبعض عدو الا گہرے دوست اس روز اپنے دوسرے کے دشمن ہوں  
المتقين۔ (۱۵۵) گے، بجز ان کے جو متقی اور پرہیزگار۔

(۶) ارشاد خداوندی ہے:

ثم استوى على العرش الرحمن فاستل به پھر وہ متمکن ہوا عرش پر (جیسے اس کی شان ہے) وہ  
رحمان ہے سو پوچھ اس کے بارے میں کسی واقف حال  
خبیرا۔ (۱۵۶) سے۔

(۷) ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

هل اتبعك على ان تعلمن مما علمت رشد اقال کیا میں آپ گئے ساتھ رہ سکتا ہوں بشرطیکہ آپ سکھائیں  
انك لن تستطيع معي صبرا۔ مجھے رشد و ہدایت کا خصوصی علم جو آپ کو سکھایا گیا ہے۔ اس  
(۱۵۷) بندہ نے کہا (اے موسیٰ) آپ میرے ساتھ صبر کی طاقت  
نہیں رکھتے۔

اہمیت صحبت پر احادیث نبویہ سے دلائل:

(۱) نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

تماثل الجلیس الصالح و جلیس السوء کحامل اچھے اور برے دوست کی مثال کستوری والے اور بھٹی المسک و نافع الکیر، فحامل المسک امان والے کی طرح ہے، کستوری والا یا تو تمہیں عطا کر دے گا یا یحذیک و اما ان تبتاع منه و اما ان تجد منه تم اس سے خرید لو گے۔ یا اس سے اچھی خوشبو ریحاطیبہ و نافع الکیر امان یحرق الشیاب پاؤ گے۔ بھٹی والا تو تمہارے کپڑے جلادے گا یا تم اس و اما ان تجد منه ریحاً منتنه۔ (۱۵۸) سے بدبو پاؤ گے۔

(۲) عن ابن عباس قال قيل يا رسول الله ای حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بارگاہ جلساء ناخیر، قال: من ذکر کم اللہ رویۃ میں عرض کی گئی کہ کون سا دوست بہتر اور بہت افضل ہے۔ رویۃ و ازاد فی عملکم منطقہ و ذکر کم فی الا تو آپ نے فرمایا جس کا دیدار تمہیں اللہ کی یاد دلا دے۔ خرة عملہ۔ (۱۵۹) اور جس کی گفتار تمہارے عمل میں زیادتی کا باعث ہوا جس کا عمل تمہیں آخرت کی یاد تازہ کر دے۔

(۳) عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے علی دین خلیلہ فلینظر احدکم من یخالل - ارشاد فرمایا کہ آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے تم میں سے ہر ایک کو چاہئے کہ وہ دیکھے کہ وہ کس کے ساتھ دوستی قائم کر رہا ہے۔ (۱۶۵)

(۴) حضرت عمر بن خطابؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ کے کچھ بندے ایسے ہوں گے جو نبی ہوں گے نہ شہداء۔ روز قیامت اللہ کے نزدیک ان کے رتبہ کی وجہ سے انبیاء شہداء ان پر رشک کریں گے۔ صحابہؓ نے عرض کی کہ ہمیں بتائیں وہ کونسے لوگ ہیں؟ فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو صرف اللہ کے لئے آپس میں محبت کرتے ہیں، ان کے درمیان نہ تو رشتہ داری ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی مال کا لین دین۔ قسم بخدا ان کے چہرے سراپا نور ہوں گے۔ اور وہ نور کے منبروں پر بیٹھے ہوں گے انہیں کوئی خوف نہیں ہوگا۔ جب لوگ خوفزدہ ہوں گے۔ اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ جب دوسرے لوگ غمزدہ ہوں گے پھر یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: (۱۶۱)



الا ان اولياء الله لا خوف عليهم ولا هم يحزنون (۱۶۲) ہوں گے۔

(۵) عن ابی ذرؓ قلت یا رسول اللہ ﷺ الرجل یحب ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ فرماتے ہیں میں نے عرض القوم ول یستطیع ان یعمل عملہم قال انت مع کی، یا رسول اللہ ﷺ کوئی شخص کسی قوم سے محبت من احببت یا اباذر (۱۶۳) رکھتا ہے لیکن ان جیسا عمل نہیں کر پاتا تو آپ ﷺ نے فرمایا اے ابو ذرؓ تو اسی کے ساتھ ہوگا جس سے محبت کرتا ہے۔

(۶) حضرت حظلہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے حضرت ابو بکر صدیقؓ ملے تو انہوں نے فرمایا۔ اے حظلہؓ تمہارا کیا حال ہے؟ میں نے کہا حظلہؓ منافق ہو گیا تو آپ نے فرمایا سبحان اللہ یہ کیا کہہ رہے ہو۔ میں نے کہا جب ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو وہ جب جنت اور دوزخ کا ذکر کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے ہم انہیں آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اور جب آپ کی بارگاہ سے نکل کر گھروں کو جاتے ہیں اور اپنے اہل و عیال اور مال و جائیداد میں مصروف ہو جاتے ہیں تو یہ سب کچھ بھول جاتے ہیں حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا قسم بخدا! ہماری بھی یہی حالت ہے۔ حضرت حظلہؓ فرماتے ہیں کہ میں اور حضرت ابو بکرؓ وہاں چلے اور حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! حظلہؓ منافق ہو گیا، اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ کیسے؟ میں نے عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ جب ہم آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں اور آپ ہمیں جنت اور دوزخ کی یادلاتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم انہیں آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ جب ہم اپنے گھروں کو جاتے ہیں اور اپنے اہل و عیال اور مال و دولت میں مشغول ہو جاتے ہیں تو یہ چیزیں بھول جاتے ہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قسم ہے مجھے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ اگر تمہاری حالت ہمیشہ ایسی ہی رہے جیسا کہ میرے پاس اور محفل ذکر میں ہوتی ہے تو فرشتے آرام گاہوں اور راستوں میں تمہارے ساتھ مصافحہ کریں۔ لیکن اے حظلہؓ! یہ گھڑی کبھی کبھی میسر آتی ہے۔ آپ ﷺ نے تین مرتبہ یہی ارشاد فرمایا۔

(۱۶۲)

یہ حدیث اور بہت سی دیگر احادیث صحبت کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہیں تربیت اور اصلاح کا یہی عملی راستہ ہیں۔ خصوصاً حضرت حظلہؓ کی حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ کیسے حضور نبی کریم ﷺ کی صحبت ان کے دلوں میں انوار یقین کو

اجاگر کرتی تھی اور نفوس میں ایمان کی چنگاری کو روشن رکھتی تھی اور ان کی روحوں کو مقدس فرشتوں کی سطح تک بلند کر کے ان کے دلوں کو مادی آلودگیوں سے پاک کرتی اور ان کے ایمان کو مراقبہ اور شہود کی بلندیوں پر فائز کرتی۔ اور اسی طرح نبی کریم ﷺ کے جانشینوں کی مجلس اور صحبت بھی نفوس کو پاک کرتی اور ایمان میں زیادتی کا باعث اور دلوں کو بیدار کر کے اللہ تعالیٰ کی یاد کو تازہ کرتی ہے اور ان سے دوری غفلت کا سبب اور دل کا دنیا میں مشغول ہونے اور اس ناپائیدار زندگی کی طرف رجحان کو بڑھاتی ہے۔

اہمیت صحبت اور اس کے آداب کے بارے میں فقہاء اور محدثین کے اقوال

### امام فخر الدین رازیؒ:

امام فخر الدین رازی اپنی مشہور تفسیر میں سورۃ فاتحہ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ”اهدنا الصراط المستقیم“ فرمایا تو اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ فرمایا: ”صراط الذین انعمت علیہم“ اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مرید کے لئے ہدایت اور مکاشفہ کے مقامات تک پہنچنے کا سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں کہ وہ کسی ایسے شیخ کامل کی اتباع کرے جو اس کی صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کرے۔ اور گمراہی اور ضلالت کے راستے سے بچائے اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر مخلوق پر نقص غالب اور ان کی عقل اور ادراک حق اور خطا و صحیح کے درمیان تمیز نہیں کر سکتیں۔ اس لئے ایسے شیخ کامل کا ہونا ضروری ہے جس کی ناقص شخص اتباع کرے یہاں تک کہ اس کی ناقص عقل شیخ کامل سے حاصل کردہ نور سے قوی و پختہ ہو جائے اور اس طرح وہ بھی مراتب سعادت اور کمالات کی بلندیوں پر فائز ہو جائے۔

### حضرت ابی حمزہؒ:

امام ابی حمزہ اندلسیؒ حدیث پاک کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ ایک آدمی حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ اور جہاد میں شریک ہونے کی اجازت طلب کی تو آپ نے فرمایا، کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟ اس نے کہا، ہاں! تو آپ ﷺ نے فرمایا، تم انہیں میں جہاد کرو۔ اس حدیث پاک میں دلیل ہے کہ مجاہدات اور ریاضت شروع کرنے سے پہلے کسی شیخ کامل کی بارگاہ میں حاضر ہو۔ تاکہ وہ اس کی صحیح راہنمائی کرے۔ کیونکہ اس صحابی نے جہاد پر جانے کا ارادہ کیا تو اپنی ذاتی رائے پر اعتماد نہیں کیا بلکہ اپنی ذات سے زیادہ اکمل و افضل ذات سے مشورہ کیا۔ یہ حال تو جہاد اصغر کا ہے تو جہاد اکبر (جہاد بالنفس) کے لئے اس کی بدرجہ اولیٰ ضرورت ہوگی۔

## ابن قیم جوزیہ:

حافظ ابن قیم فرماتے ہیں کہ بندہ جب کسی کی اتباع کرنے کا ارادہ کرے اسے دیکھنا چاہئے کہ آیا وہ اہل ذکر سے ہے یا غافلین میں اس پر ہوا و ہوس کا غلبہ ہے یا احکام الہی کی اطاعت کا۔ اگر تو اس پر ہوا و ہوس کا غلبہ ہے اور وہ غافلین میں سے ہو تو وہ قابل نہیں کہ اس کی اتباع کی جائے پھر فرماتے ہیں کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے شیخ اور مقتدا کو دیکھے اگر تو اس میں ایسی صفات پائی جاتی ہیں جن کا بھی ذکر ہوا ہے تو وہ اس سے دور جائے۔ اگر اس پر ذکر اللہ اور اتباع سنت کا غلبہ ہے اور اپنے امور میں انتہائی محتاط ہے تو اس کا دامن مضبوطی سے پکڑ لے۔ (۱۶۵)

## اصلاح کیلئے تجاویز

تصوف کے جتنے سلاسل ہیں۔ ان کے طریقے اصلاح تربیت کے مختلف ہیں۔ اور ادو وظائف کے سلسلہ میں ہر ایک سلسلہ کا طریقہ دوسرے سے مختلف ہے۔ کسی کے ہاں ذکر خفی کی بات ہوتی ہے۔ کسی کے ہاں ذکر جلی کا حکم ملتا ہے۔ پھر ریاضت اور مجاہدات میں بھی فرق ہے۔ سلوک کے یہ طریقے نہ صرف مختلف ہم طبع اور ہم لیاقت لوگوں کی تربیت کے لئے الگ الگ جاری ہوئے بلکہ ان کے اجراء اور نفاذ میں زمانے کے تقاضوں کا دخل بھی تھا۔ اس میں ایک دوسرے پر فضیلت کی بھی کوئی وجہ نہیں۔ نتیجہ و انجام کے لحاظ سے آخر میں سب ایک ہو جاتے ہیں۔

## ترمیم سلوک کی ضرورت:-

زمانے کے حالات کے مطابق سلوک میں تبدیلی کی طرف اشارتاً ذکر کرنا ناگزیر ہے۔ طرق میں اختلاف لوگوں کی استعداد اور زمانے کی مقتضیات کی وجہ سے پیدا ہوا چنانچہ اس دور میں بھی مشائخ نے سب سے زیادہ عملی سلوک میں نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی ہے کیونکہ شرعی احکام کی صورتوں کو استحکام کا شرف حاصل ہوتا ہے لیکن تصوف کے عملی شعبہ میں ضرورت اور حالات کے تحت ترمیم و تنبیج کا عمل جاری رہتا ہے اس کی مثال علم طب کی سی ہے۔ جس کی غرض و غایت یا افادیت انسان کی صحت و تندرستی ہے مگر نئی نئی بیماریوں اور دواؤں کو ایجاد و دریافت کی بنا پر علاج و پرہیز کے طریقے بدلتے رہتے ہیں۔ اسی طرح تصوف میں مقصد محبت و معرفت الہی ہے۔ مگر اس کے حصول کے لئے مشائخ اپنے اپنے علم اور اجتہاد کی بدولت وقتاً فوقتاً سلوک میں ترمیم کو لازم جانتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں حالات بہت بدل گئے ہیں۔ زمانے کے تقاضے اور ہیں۔ اور اس کے ساتھ لوگوں کی طبائع اور استعداد میں بھی فرق آ گیا ہے۔ اس لئے سلوک بھی ان کے مناسب حال ہونا چاہیے۔ صوفیائے کرام کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہر

زمانے میں ایسا ہوتا رہا ہے جسے ابتدائی دور میں قلوب پر خشیت الہی کا تسلط زیادہ تھا تو محض ریاضات شاقہ اور مجاہدہ کو اہمیت دی جاتی تھی۔ بعد ازاں امام غزالی، شیخ شہاب الدین سہروردی اور شیخ الاکبر محی الدین ابن العربی نے علوم و معارف کے دروازے کھول دیے۔ ان کی تحصیل ضروری قرار پائی۔ یہ گویا تصوف میں فکر و ادراک کا دور تھا۔ پھر ایک دور آیا کہ حضرت خواجہ بہاؤ الدین نقشبندؒ نے جذبے کو سلوک پر مقدم کیا تا کہ سالک کے لئے آسانی کی راہ پیدا ہو۔

ہندوستان میں سماع کے ذریعے خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خلفاء نے اہل ہند کے مزاج کا رخ بدلا اور سلوک میں سوز و ساز اور ذوق و شوق کا رنگ گہرا کر دیا۔ زمانے کے تقاضے بدلے تو مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے تمام ذوق و شوق کو باطن کی طرف مائل کرنے کی تعلیم دی۔ آپ نے لطائف ستہ میں لطیفہ قلب سے ابتداء کی اور مراقبات کے ذریعے دوائر کی سیر کرا کے سلوک کی تکمیل کرائی۔ ظاہر ہے کہ صوفیاء اپنے اپنے طرق میں کبھی پہلے تشدد رہے ہیں نہ اب ہیں۔ عصر جدید میں لوگوں کی چال ڈھال، رہن سہن اور فکر و احساس کے طریقوں اور رویوں میں اس قدر انقلاب آیا ہے کہ ارباب علم و معرفت کو تعلیم و تلقین کے طریقے بدلتے پڑ گئے اور محفل تصوف بھی ان حضرات سے خالی ہونے لگی جو پرانے طریقوں کا عالم و عامل یا معلم و مربی تھے۔ اس صدی کے شروع سالوں میں مولوی محمد حسن بجنوری نے مشائخ نقشبندیہ مجددیہ کے ضخیم تذکرہ کے آخر میں طریقہ کے مراقبات اور سید دوائر کے بعد لکھا تھا۔

”مگر واضح ہو کہ ان مقامات عالیہ پر بلا توجہ پیر کامل مکمل کہ جس نے تفصیلاً (یہ مقامات حاصل نہ کئے ہوں پہنچنا محال ہے اور افسوس کہ اس وقت ایسے بزرگوار ”النادر کالمعدوم“ کا حکم رکھتے ہیں۔ ان سے بھی زمانہ روز بہ روز خالی ہوتا جاتا ہے اور قریب ہے کہ تسلیک مقامات مجددیہ محدود ہو جائے۔“

یہ خدشہ اس لئے باعث تشویش تھا کہ حالات و واقعات زمانے کی طبعیت میں تغیر ہوا کر چکے تھے اور اب تصوف کے دائرے میں بھی تبدیلی کی ضرورت تھی۔ خدشات تو اپنی جگہ صحیح ہوتے ہیں مگر وہ اللہ تعالیٰ کی اس سنت کی بھی نشاندہی کر رہے ہوتے ہیں کہ جب ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو اس کی رحمت کئی دوسرے دروازے کھول دیتی ہے۔ غرض و غایت اللہ تعالیٰ کی محبت و معرفت میں کمال ہے خواہ وہ اپنی حدود میں کسی طرح سے اور کسی طریق سے حاصل ہو۔

اب اس صدی کے اختتام تک تو حالات بالکل بدل چکے ہیں لیکن صوفیاء کرام نے سلوک میں تبدیلیوں کی ضرورت پہلے سے محسوس کر لی تھی۔ چنانچہ عرصہ ہوا کہ مشائخ کرام نے اپنے سلوک کے نصاب کو از سر نو مرتب کرنے کی طرح ڈال دی تھی۔ انہوں نے طویل مراقبات اور اوراد کثیر کو خارج کر کے صرف ان دعاؤں اور مراقبوں کو باقی رکھا جو سلوک کے دوسرے اجزاء کے ساتھ مناسبت رکھتے تھے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ فرصت قلیل ہو گئی ہے علم کی کثرت ہے اور لوگوں

میں تذبذب، تشکیک اور بدعقیدگی کا دور دورہ ہے۔ اس لئے انہوں نے ایسی راہ اختیار کی جس سے لوگوں کو مقصود تک رسائی اور یافت میں آسانی ہو۔ (۱۶۶)

### جدید دور میں مشائخ کا طریق عمل:-

اس دور کے مشائخ کرام خواہ وہ کسی بھی روایتی طریق کے متوسلین میں سے ہوں عام طور پر ایک سا طریقہ تعلیم و تلقین استعمال کر رہے ہیں مثلاً صاحب وقت اور باہمت مشائخ سب سے پہلے توجہ کے ذریعے طالب کے اندر جذبہ کو بیدار کرتے ہیں۔ جذبہ کے ساتھ ادراک کا حاسہ باطنی بھی بیدار ہو جاتا ہے۔ سالک روحانی تجربات سے مستفیض ہوتا ہے۔ تشکیک دور ہونے لگتی ہے۔ معرفت کے لئے فہم کھل جاتا ہے اور اس دوران میں صرف وہی اذکار اور تلقین کیے جاتے ہیں جو احوال و کیفیات میں استقامت کے لئے مدد و معاون ہوتے ہیں۔ اگر مراقبات تجویز کیے جاتے ہیں تو وہ بہت سادہ اور آسان ہوتے ہیں کہ ان سے کشف کے لئے راہ کھلتی ہے اور تشکیک سے نجات ملتی ہے۔

دور حاضر میں علم کی بڑی کثرت کے باوجود بے راہ روی اتنی عام ہے جو جہالت سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ اس دور میں اگر کوئی شیخ اپنے پاس کسی آنے والے کے خیال و رجحان کو اپنی فکر، توجہ، سخن، عملی نمونہ یا اشارات علمی کے ذریعے نیکی اور تقویٰ کے رخ پر لے آتا ہے تو ایک کار عظیم ہے۔ مشائخ کے لئے اب صرف قدیم نصاب سے واقفیت کافی نہیں رہی۔ شیخ کے لئے اب ضروری ہے کہ وہ عالم ہو۔ متقی ہو اور صحیح معنوں میں باطن کا معلم ہو جیسا کہ اس دور کے آدمی کو متاثر کر سکے گا۔ اس دور کے شیخ کو معلوم ہونا چاہیے کہ نفسیات کہاں ختم ہوتی ہے اور روحانیت کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ دوسرے مذاہب کے سری سلوک کو حدود و قیود کیا ہیں؟ اور تصوف میں سلوک کہاں سے شروع ہو کر کہاں تک پہنچتا اور پہنچاتا ہے؟ اس دور میں لوگوں کی زبانیں کھل گئی ہیں لیکن کان اور آنکھ اور دل بند ہیں۔ ضروری نہیں کہ شیخ ہر شخص کے اعتراضات کا جواب دینے بیٹھ جائے لیکن اس قدر لازم ہے کہ وہ طالب کے گمان اور شک کو رفع کر سکے۔ اور سمع و بصر و قلب کے دروازے کھول دے۔ کیونکہ جب تک کوئی دیکھتا، سنتا اور محسوس نہیں کرتا ہے دل سے اسے مان نہیں سکتا۔ چنانچہ آج کل مشائخ کرام کو سب سے پہلے جذبہ و وجدان کو ہی انگلیخت کرنا چاہیے۔ طالب کے روحانی تجربات، رویا اور اس کی واردات و کیفیات کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیے اور یوں روحانی شعور کو ترقی دیکر راہ پر ڈال دینا چاہیے۔ اس طرح محبت و معرفت سے اس کا ایمان قوی ہوگا اور بالآخر وہ احسان کے بلند مرتبہ تک جا پہنچے گا جہاں وہ دیکھ کر عبادت کرتا اور اللہ کے قرب میں ترقی پاتا جائے گا۔ (۱۶۷)

## روحانی شعور:-

سلوک کے تمام مراحل میں ہر سطح کے روحانی تجربات اور واردات و کیفیات کا محرک وہ شعور ہے۔ جسے سلوک میں وجدان کا نام دیا گیا ہے۔ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ سے کسی نے پوچھا کہ سیر منازل و مقامات آفاقی ہے یا نفسی؟ تو آپ نے فرمایا کہ سیر آفاقی ہے نہ نفسی کیونکہ آفاق و انفس باہر اور اندر چاہتے ہیں اور یہ معاملہ منزہ ہونے کی وجہ سے دخول و خروج سے وراء ہے۔ لیکن ساتھ ہی وضاحت فرمادی کہ ان ارباب سیر کے نزدیک جو علم رکھتے ہوں یہ سیر دہلی و آگرہ کی سیر کی طرح ہے کہ معلوم ہو متمیز ہوتی ہے اور ایک منزل دوسری منزل سے جدا نظر آتی ہے۔

مسلمان صوفیاء کا وجدان انہیں ایسے اسرار الہی کی معرفت کا ادراک عطا کرتا ہے جو شعور کی کسی اور سطح پر منکشف نہیں ہوتے۔ کہا جاتا ہے کہ خوارزم میں شیخ نجم الدین کبریٰ قدس سرہ کے ورود کی خبر شیخ مولانا فخر الدین رازیؒ نے سنی تو مولانا نے شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت کی اور پھر آپ سے سوال کیا کہ

”آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کو کیسے پہچانا“ آپ نے فرمایا انوار سے پہچانتا ہوں جو غیب سے مجھے پہنچتے ہیں کہ اس کی سمجھ سے عقلی واردات قاصر ہیں جو کہ شک میں ڈالتے ہیں۔ مولانا حیران ہو گئے۔ عصر حاضر میں صوفی میاں محمد ظہور الدین احمد مرحوم نے بھی اصطلاح ”وجدان“ استعمال کی ہے اور اسے ”یقین ذات وحدت“ کہا ہے پھر اسے روحانی حقیقتوں کو سمجھنے کا مادہ بتایا ہے لیکن بالآخر انہیں بھی احساس ہوا ہے کہ وہ شعور جو صوفی کو سدرۃ المنتہی کے مقامات کی سیر کراتا ہے اور اس کے قلب پر ہر آن انوار و تجلیات کی جلوہ ریزی کا باعث بنتا ہے محض وجدان نہیں۔ چنانچہ انہیں لکھنا پڑا۔

”روحانی حقیقتوں کو سمجھنے کے لئے جو قوت قدرت نے انسان

کو عطا فرمائی ہے۔ اسے بعض لوگوں نے عشق کے نام سے

پکارا ہے۔ بعض نے بصیرت اور بعض نے عرفان کے نام سے

پکارا ہے اور بعض اسے محبت کہتے ہیں اور میں اسے انسانیت کے

درجہ پر وجدان کے نام سے پکارتا ہوں جو محبت کے قریب تر ایک جذبہ ہے۔ (۱۶۸)

غیر مسلم صوفیوں نے اس شعور کو ”عقلی وجدان“ کا نام دیا ہے۔ مسلم صوفیاء نے اسے عقل کلی کہا ہے۔

اس عقل کلی کے مشاہدہ کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ بعض صوفیاء کی نظر سے کوئی چیز غائب نہیں رہتی۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ فرماتے ہیں ”عقل روح کی زبان ہے اور بصیرت کی ترجمان ہے۔“ اس نقطہ نظر سے

عقل کلی کی ماہیت ہی یہی بصیرت ہے۔ جس کے متعلق وہ فرماتے ہیں۔

”بصیرت نہ صرف ان علوم کا احاطہ کرتی ہے جنہیں عقل (جزوی) مکمل طور پر حاصل کر لیتی ہے بلکہ وہ ان علوم کو بھی اپنے اندر سمالیتی ہے۔ جو عقل (جزوی) کے دائرہ سے باہر ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ بصیرت کو کلمات خداوندی سے فیض حاصل ہے جو فنا نہیں ہو سکتے۔ خواہ سمندر خشک ہو جائیں عقل بصیرت کی ترجمان ہے اسی لئے بصیرت اپنی بعض باتیں اس تک پہنچا دیتی ہے۔“

غرضیکہ اسے عقلی وجدان کہا جائے یا عقل کل، بصیرت کہا جائے یا صرف ذوق۔ یہ وہ روحانی شعور ہے جو براہ راست حکمت الہیہ کے حقائق تک پہنچا دیتا ہے۔

روحانی تجربے کے دوران میں جب صوفی دیکھتا ہے تو اسے یوں معلوم ہوتا ہے گویا اس کا پورا وجود آنکھ بن گیا ہے اسی طرح سنتا ہے تو اس کا پورا وجود کان بن جاتا ہے۔ عقلی وجدان کے آلہ کار سمع و بصر ہیں۔ جب صوفی کو کوئی بشارت ملتی ہے یا موافق حال کیفیت وارد ہوتی ہے تو پورا وجود وجد و اتہزاز کے عالم میں گویا جھوم اٹھتا ہے۔

صوفیائے کرام نے جو اس شعور کو کئی نام دیے اسکی وجہ یہ تھی کہ کبھی اس کا کوئی پہلو زیادہ منکشف ہوا یا کسی صفت کا زیادہ غلبہ ہوا تو انہوں نے اسے اسکی نسبت سے موسوم کر دیا۔ کسی نے اس میں جذب دیکھ کر اسے عشق کہہ دیا تو کسی نے بصیرت، کسی نے عرفان کہا تو کسی نے وجدان، کسی نے عقل کلی کہا تو کسی نے عقلی وجدان، بہر حال قوت ایک ہی ہے جو کل اوصاف سے متصف ہے۔

یہ قوت کسی میں کم اور کسی میں زیادہ ہوتی ہے۔ وجدان کی قوت نفسی سطح پر تو شاید ہر ایک میں کسی قدر ضرور موجود ہوتی ہے اور اسے تھوڑی سی مشق سے بڑھایا جا سکتا ہے۔ سریت پسندوں کے ہاں یوگا کی کئی مشقیں اسکے لئے مقرر ہیں لیکن عقلی وجدان یا عقل کلی کی بیداری کے لئے کسی تجربہ کار شیخ کی صحبت اور توجہ ضروری ہے۔ بیعت و صحبت مرشد:-

صحبت اور توجہ کے حصول کی خواہش سالک کو کسی شیخ کے ہاں پہنچا دیتی ہے جس سے وہ رہنمائی کا طالب ہوتا ہے۔ اور اسکے احکام کی تعمیل کا وعدہ کرتا ہے۔ اسے تصوف میں بیعت کہتے ہیں۔

اس رسم بیعت پر بعض لوگ معترض ہیں۔ حالانکہ یہ ایک قسم کا عہد ہے جو صحبت اور توجہ کی خاطر کسی کامل استاد کی شاگردی اختیار کرتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ ایک گروہ اطاعت شیخ سے خائف ہے۔ مگر اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اگر وہ ظاہر کے ساتھ باطن کی بھی تکمیل چاہتا ہے تو اسے شیخ کامل کی بارگاہ میں رہنا ہوگا۔ کیونکہ

قال را بگذار و مرد حال شو پیش مردے کا ملے پا مال شو

(باتوں کو چھوڑ کر صاحب حال بن جا اور اس کی خاطر اپنے کو کسی مرد کامل کے سامنے پامال کر دے۔)  
 دوسرا گروہ ماڈرن تعلیم یافتہ طبقہ جو صرف وحی کی پیروی کو واجب سمجھتا ہے۔ اس چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔  
 حالانکہ وہ نہیں جانتا کہ یہ بیعت بھی دراصل صاحب وحی کی پیروی ہے۔  
 بہر صورت اس بیعت کے سبب شیخ کامل کی عقل کلی کا پرتو جب سالک کے قلب یا معنوی وجود پر پڑتا ہے تو اس کا حاسہ  
 روحانی بیدار ہو جاتا ہے۔

عقلی وجدان کی بیداری کے لئے شیخ کامل کے ہاں جانا ضروری ہے۔ جو اسے ضروری نہیں سمجھتے دراصل اسکی قوت کے  
 رموز اور طریق کار سے بے خبر ہیں۔ اگر وہ کسی شیخ کے ہاں حاضر ہوتے بھی ہیں تو قلب سلیم کے ہمراہ نہیں۔ اسلئے بے  
 فیض ہوتے ہیں۔ ان کے لئے یہ بھی اچنے کی بات ہے کہ یہ حاسہ باطنی جب بیدار ہوتا ہے تو شرعی امور کی حکمت تک  
 ظاہر و باطن میں کھلنے لگتی ہے۔ فکر و عمل میں تذبذب کی کیفیت ختم ہو جاتی ہے۔ ہر قدم پر قلب حکم کرنے لگتا ہے۔ قلب کا  
 یہ حکم ذہن و دماغ پر بھی چلتا ہے اور جسم پر بھی۔ کئی بار فقراء کہتے ہیں ہمیں یہاں سے چلنے کا حکم ہو گیا ہے۔ وہ یہی قلب  
 سلیم کا حکم ہوتا ہے۔ یہ بات بھی وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہیں ان کے رب نے اس تجربے سے مشرف کیا ہو۔ (۱۶۹)

### فنا و بقاء:-

اس دور میں منکرین تصوف نے فنا کا غلط مفہوم سمجھ کر اکثر تصوف کو تنقید کا ہدف بنایا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ  
 اس کے اصل مفہوم کو نہیں سمجھ سکے۔

تصوف میں فنا پر گفتگو دو ذراویوں سے کی گئی ہے۔ ایک نقطہ نظر علمی ہے دوسرا روحانی تجربہ سے متعلق ہے۔  
 فنا کے روحانی تجربے کے ذکر میں یہ بات واضح ہو کہ فنا ایک کیفیت یا ایک حال ہے جو اپنی حقیقت کو ذات خداوندی کے  
 سامنے حاضر کرنے سے پیدا ہوتا ہے بدیں وجہ صوفیاء اپنی کیفیت میں صرف فنا کے تجربے سے ہی نہیں گذرتے ہیں بلکہ وہ  
 فنا کے ساتھ بقاء کا بھی اس طرح احساس کرتے ہیں کہ فنا و بقاء دونوں لازم و ملزوم ہو جاتی ہیں۔

فنا عن المعاصی و بقاء الطاعات گناہوں سے فانی ہو جانا اور اطاعت پر باقی رہنا۔

متکلمین اسلام کے خیال میں فنا اس کاروائی کا نام ہے جس میں شے کے اوصاف معدوم ہو جاتے ہیں اور بقاء انہی  
 اوصاف کے دوام کا نام ہے۔

اس سلسلہ میں اعتراض کی وجہ یہ بھی ہوئی کہ بعض صوفیوں نے فنا و بقاء کی تعریف میں جو مثالیں دی ہیں۔ مثلاً برف اور



پانی، لوہے اور آگ وغیرہ کی۔ اس سے غلط فہمیاں پیدا ہونیں۔ سالک صرف بعض خصائص کو فنا کرتا اور اعلیٰ خصائص کو اپنا کر ان کے ذریعے یا ان کے اندر بقاء پاتا ہے۔

مختصر علمی سطح پر یوں کہہ سکتے ہیں کہ صوفی کے عقلی وجدان کا رابطہ اس عقل کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے جسے سب سے پہلے تخلیق کیا گیا۔ چنانچہ فنا کے تجربہ میں اس پر اپنی روح اور ذات خداوندی کی بنیادی وحدت کا راز کھلتا ہے۔ اس طرح صحیح معنوں میں اسے علم غیب پر حق الیقین حاصل ہوتا ہے اور یہی بقاء ہے اور صوفی کے لئے یہ بڑی مسرت کا مقام ہوتا ہے۔ سب سے بڑا صوفی وہ ہے جو کہیں مقام نہ کرے۔ سلوک میں ارتقاء کا سفر جاری رکھے۔ ایک ولی اللہ کے لئے تجلیات اور واردات کی کوئی انتہا نہیں۔ قرب کے درجات بے شمار ہیں۔ اور اس طرح اسرار الہی کی معرفت کی بھی کوئی حد نہیں اسکی تفصیل سے مولانا رومیؒ نے منع فرمایا ہے۔

در نیابد حال نچتہ چچ خام پس سخن کوتاہ کن باید و السلام

(یعنی خام اور ناتجربہ کار کسی عارف کا حال نہیں جان سکتا۔ پس اس مقام پر بات مختصر ہی مناسب ہے۔)

(۱۷۵)

## مردان حق اور تفویض کار:-

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ”جس شخص کو تصوف کا ذوق نہیں دیا گیا۔ اس کو حقیقت نبوت سوائے اس کے کہ یہ ایک نام ہے یا لفظ ہے اور کچھ معلوم نہیں۔ لیکن نبوت کی حقیقت کو جاننا ہر ایک کے لئے بقدر استعداد ضروری ہے۔ آگے فرماتے ہیں۔

”اور جسے یہ ذوق مقدر نہیں کیا گیا وہ تجربے سے اور محض سن کر بھی اسے سمجھ سکتا ہے بشرطیکہ ایسے لوگوں کی معیت اور ہم نشینی بکثرت اختیار کرے۔ قرآن سے یہ بات واضح ہے کہ جو شخص بھی اولیاء اللہ کی صحبت اختیار کرے گا وہ ان سے ایمان حاصل کرے گا۔ یہی ایک ایسا گروہ ہے جس کا صحبت یافتہ کبھی شقی و محروم نہیں رہتا۔“

(۱۷۱)

جو لوگ تصوف کے دائرے میں کسب فیض کے لئے داخل ہوتے ہیں سبھی مشائخ کبار نہیں ہو جاتے۔ تصوف کی مبادیات تو اصول دین میں سے ہیں مثلاً ذکر الہی کرنا، اللہ و رسول سے محبت اور ان کے لئے اہل اللہ کی صحبت اختیار کرنا کیونکہ اس کے بغیر نہ علم حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی عمل میں اخلاص پیدا ہوتا ہے۔ جو نیت کی درستگی کے لئے ضروری ہے۔

اب آگے اپنی اپنی استعداد اور ظرف پر منحصر ہے کہ کون کہاں تک پہنچتا ہے۔

بعض لوگ دینی و دنیوی امور میں بڑھے ہوئے ہوتے ہیں مگر سلوک میں وہ مبتدی ہی رہتے ہیں۔

دوسرا درجہ متوسلین کا ہے جو زیادہ وقت سلوک کو دیتے ہیں مگر دنیوی کاموں سے تعلق ہوتا ہے۔ جنہیں چھوڑنا شرعی لحاظ

سے ان کے لئے مستحق نہیں ہوتا۔ یہ لوگ مجاہدات اور اذکار کی وجہ سے راہ مستقیم اور مستقیم الاحوال ہوتے ہیں اور فیض روحانی خاصا حاصل ہوتا ہے۔ تبلیغی اور روحانی امور میں ان کے معاون ہوتے ہیں۔

آخری درجہ منتہی لوگوں کا ہے۔ جن کو اللہ نے چن لیا ہوتا ہے۔ یہ اپنے سلاسل میں خلفاء اور خلقت کے لئے مربی و معلم بنتے ہیں۔ نہ صرف دینی اور روحانی امور میں قائد ہوتے ہیں بلکہ امور تکوینی بھی ان کی دعا و برکت سے سرانجام پاتے ہیں۔ ان کو ان کی استعداد، قابلیت اور رجحان کے مطابق مناسب کام تفویض کئے جاتے ہیں۔ ان تمام سالکین کو ان کے مراتب اور دانش کی مطابقت میں بہرہ یقین و معرفت حاصل ہوتا ہے (۱۷۶)

## حوالہ جات باب سوم

- ۱۔ برق، غلام جیلانی: یورپ پر اسلام کا احسان، مطبع غلام علی پرنٹرز جامعہ اشرفیہ اچھرہ لاہور، ۱۹۶۳ء، ص: ۲۷۱-۲۶۹
- ۲۔ القرآن الحکیم: ۶۲ (الجمعة): ۲
- ۳۔ القرآن الحکیم: ۳۷ (مزل): ۱۱-۱
- ۴۔ چشتی، یوسف سلیم، پروفیسر: تاریخ تصوف، ناشر: دارالکتب اردو بازار لاہور، سن اشاعت ص: ۱۱۵-۱۰۹
- ۵۔ ججویری، علی، سید، کشف الحجب، مترجم، فاروقی، عبدالرؤف، لٹل سٹار پرنٹرز لاہور، ص: ۶۵
- ۶۔ غزالی، محمد، امام: احیاء العلوم، مطبع، بشیر پرنٹرز، لاہور، ج: ۴، ص: ۶۸۷
- ۷۔ الحدیث، کنز العمال، ج: ۳، حدیث نمبر: ۵۷۱۱
- ۸۔ القرآن الحکیم: ۳ (آل عمران): ۱۹۱
- ۹۔ غزالی، محمد، امام: کیمیائے سعادت (اردو)، مطبع، مدینہ پبلشنگ کمپنی ایم۔ اے جناح روڈ کراچی، ص: ۸۶۰۔
- ص: ۸۶۲-۸۶۳، ص: ۸۶۵، ص: ۸۶۷
- ۱۰۔ القرآن الحکیم: ۱۲ (الیوسف): ۱۰۵
- ۱۱۔ القرآن الحکیم: ۱۶ (النحل): ۴۴
- ۱۲۔ غزالی، محمد، امام: کیمیائے سعادت اردو، ص: ۸۶۳
- ۱۳۔ القرآن الحکیم: ۳۰ (روم): ۸
- ۱۴۔ غزالی، محمد، امام: کیمیائے سعادت (اردو)، ص: ۸۴۲
- ۱۵۔ القرآن الحکیم: ۵۹ (الحشر): ۱۸
- ۱۶۔ غزالی، محمد، امام: کیمیائے سعادت (اردو)، ص: ۷۳۴
- ۱۷۔ برق، غلام جیلانی: رمز ایمان، مطبع، غلام علی پرنٹرز جامعہ اشرفیہ اچھرہ، لاہور، ص: ۳۰-۲۹، ص: ۳۸-۳۷

ص: ٣٩

- ١٨- القرآن الحكيم: ٢ (البقرة) ١٦٣
- ١٩- القرآن الحكيم: ١١٢ (اخلاص) ١
- ٢٠- القرآن الحكيم: ١٦ (النحل) ١٢
- ٢١- بجويري، علي، سيد، كشف المحجوب، ص ٣٩٤-٣٩٦، ص: ٢٠٠
- ٢٢- چشتي، يوسف سليم: تاريخ تصوف، ص: ٢٢٤-٢٢٦، ص: ٢٢٩-٢٣٠، ص: ٣٩٨-٣٩٩
- ٢٣- بجويري، علي، سيد، كشف المحجوب، ص: ٣٩٨
- ٢٤- القرآن الحكيم: ٣٩ (زمر) ٣٢
- ٢٥- ولي الدين، محمد بن عبد الله، ابو عبد الله، الخطيب: مشكوة المصابيح، ص: ٢٨٢
- ٢٦- القرآن الحكيم: ١٣ (ابراهيم) ٢٨
- ٢٧- بخاري، محمد بن اسماعيل، ابو عبد الله، الجامع الصحيح، ج ٣، ص: ٦٠٢
- ٢٨- ولي الدين، محمد بن عبد الله، ابو عبد الله، الخطيب: مشكوة المصابيح، ص: ٢٨٢
- ٢٩- القرآن الحكيم: ٨٣ (مطففين) ٦
- ٣٠- العجلوني، الحافظ: كشف الخفاء، ج: ٢، ص: ٢٢٦
- ٣١- معارف الحديث، ج ١، ص: ٢٢٣
- ٣٢- القرآن الحكيم: ٢٠ (طه) ١٠٩
- ٣٣- القرآن الحكيم: ١٥ (الحجر) ٩٠
- ٣٤- القرآن الحكيم: ١٩ (المريم) ٤١
- ٣٥- ولي الدين، محمد بن عبد الله، ابو عبد الله، الخطيب: مشكوة المصابيح، ص: ٥٠٣
- ٣٦- القرآن الحكيم: ١٦ (اشعراء) ٤٤
- ٣٧- القرآن الحكيم: ١٣ (ابراهيم) ١٦-١٥
- ٣٨- القرآن الحكيم: ٣ (النسا) ٥٦
- ٣٩- القرآن الحكيم: ٥٥ (رحمن) ٢٦

ج: ۲، ص: ۱۵۹	سنن	۴۰	ابوداؤد، سليمان بن اشعث، سجستانی
۴۳ (زخرف) ۷۰		۴۱	القرآن الحكيم
۳۹ (الزمر) ۷۳		۴۲	القرآن الحكيم
ص: ۸۳۵	احياء العلوم	۴۳	غزالی، محمد، امام
۲۹ (العنكبوت) ۴		۴۵	القرآن الحكيم
۹۸ (البینہ) ۸		۴۶	القرآن الحكيم
۲۸ (الفتح) ۱۸		۴۷	القرآن الحكيم
۵ (المائدہ) ۵۴		۴۸	القرآن الحكيم
باب الايمان ص: ۱۲		۴۹	ولی الدین، محمد بن عبد اللہ، ابو عبد اللہ، الخطیب مشکوٰۃ المصابیح
۲۵ (الفرقان) ۳		۵۰	القرآن الحكيم
۲۶ (الشعراء) ۷۷		۵۱	القرآن الحكيم
۵ (المائدہ) ۵۴		۵۲	القرآن الحكيم
ج: ۳، ص: ۱۱۵	الجامع الصحيح	۵۳	البخاری، محمد بن اسماعیل، ابو عبد اللہ
ص: ۸۶۵، ۸۷۴، ۸۶۸	احياء العلوم (اردو)	۵۴	غزالی، محمد، امام:
کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال ج: ۱، حدیث نمبر ۴۸۳		۵۵	علی، المتقی، الہندی،
۹ (توبہ) ۲۴		۵۶	القرآن الحكيم

۲ (البقرہ) ۱۶۵	۵۷ القرآن الحکیم
۵ (المائدہ) ۵۴	۵۸ القرآن الحکیم
ج: ۲، ص: ۱۸۷	۵۹ ترمذی، محمد بن عیسیٰ، ابوعلی
ج: ۲، ص: ۱۷۲	۶۰ البخاری، محمد بن اسماعیل، ابو عبد اللہ
۳ (آل عمران) ۳۱	۶۱ القرآن الحکیم
ص: ۲۵۳	۶۲ ولی الدین، محمد بن عبد اللہ، ابو عبد اللہ، الخطیب مشکوٰۃ المصابیح
۵ (المائدہ) ۵۵-۵۴	۶۳ القرآن الحکیم
۲ (البقرہ) ۲۲۳	۶۴ القرآن الحکیم
۹ (توبہ) ۲۸	۶۵ القرآن الحکیم
۱۰ (یونس) ۱۰۰	۶۶ القرآن الحکیم
ج: ۲، ص: ۳۱۴	۶۷ الترمذی، محمد بن عیسیٰ، ابوعلی
ج: ۱، ص: ۲۳۱	۶۸ العجلونی، الحنفی، الحافظ
ج: ۱، حدیث نمبر ۹۸۳	۶۹ علی، المنتقی، الہندی
۳ (آل عمران) ۴	۷۰ القرآن الحکیم
۶۱ (القصف) ۴	۷۱ القرآن الحکیم
۴۹ (الحجرات) ۹	۷۲ القرآن الحکیم
۳ (آل عمران) ۱۵۹	۷۳ القرآن الحکیم
۲ (البقرہ) ۱۹۵	۷۴ القرآن الحکیم
۳ (آل عمران) ۷۶	۷۵ القرآن الحکیم
ج: ۱، حدیث نمبر ۳۷۲	۷۶ علی، المنتقی، الہندی
ج: ۲، ص: ۸۶	۷۷ الترمذی، محمد بن عیسیٰ، ابوعلی
ج: ۲، ص: ۲۷۴	۷۸ الحدیث،
ص: ۸۳-۸۸	۷۹ بھٹی، ظہیر الدین، محمد؛
سنن الجامع - دار الفکر بیروت	
الجامع الصحیح	
سنن الجامع	
کشف الخفاء	
کنز العمال	
کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال	
بحوالہ احیاء العلوم	
اسلام کا دستور حیات	
مکتبہ جدید پریس لاہور ۱۹۹۵ء	

۲۹۳ ص:	سنن الجامع	۸۰	الترمذی، محمد بن عیسیٰ، ابو عیسیٰ
۲۹۳ (۲۷۷) ص:		۸۱	القرآن الحکیم
۱۲۵-۱۳۳ ص:	بحوالہ حقیقت تصوف	۸۲	الحديث
منہاج القرآن پرنٹرز لاہور ۱۹۹۷ء			
۱۳ (توبہ)		۸۳	القرآن الحکیم
۱۴۰ (بقرہ)		۸۴	القرآن الحکیم
۱۷۵ (آل عمران)		۸۵	القرآن الحکیم
۳۰ (آل عمران)		۸۶	القرآن الحکیم
۶۵-۲۸ (الطور)		۸۷	القرآن الحکیم
۵۸-۶۰ (المؤمنون)		۸۸	القرآن الحکیم
۸۶: ج ۲:	سنن الجامع	۸۹	الترمذی، محمد بن عیسیٰ، ابو عیسیٰ
۱۲۱: ج ۲:	سنن النسائي	۹۰	نسائي، احمد بن شعيب، الحافظ جلال الدين
۱۱۱: ج ۲:	سنن ابن ماجه	۹۱	ابن ماجه، محمد بن يزيد، ابو عبد الله، القزويني
۱۷۳: ج ۲:	سنن الجامع	۹۲	الترمذی، محمد بن عیسیٰ، ابو عیسیٰ
۳۲ (السجده)		۹۳	القرآن الحکیم
۷: ج ۷: حدیث نمبر ۸۵	کنز العمال فی الاقوال و الافعال	۹۴	علی، المتقی، الہندی
۶۸ (الناظر)		۹۵	القرآن الحکیم
۲۹۱-۲۹۳ ص:	بحوالہ الرسالة القشیرہ	۹۶	الحديث
۴۶ (الرحمن)		۹۷	القرآن الحکیم
۴۳۱: ج ۱:	کشف الخفاء	۹۸	العجلونی، الحنفی، الحافظ
۶۶۲ ص:	عوارف المعارف مترجم شمس بریلوی	۹۹	سهروردی، شہاب الدین، شیخ
مطبع ارشد برادرز کوچہ چیلان ۱۹۸۶			

۶ (الانعام) ۱۶۲	القرآن الحکیم	۱۰۰
۶ (الانعام) ۱۶۲	القرآن الحکیم	۱۰۱
معجم ج: ۱، ص: ۱۲۳	الطبرانی، الامام	۱۰۲
کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال حدیث نمبر ۷۳۱	علی، المتقی، الہندی	۱۰۳
تصوف اور تعمیر سیرت ص: ۲۵-۲۷	مودودی، ابوالاعلیٰ	۱۰۴
۵۹ (الحجرات) ۱۳	القرآن الحکیم	۱۰۵
معجم ج: ۱، ص: ۹۹	الطبرانی، الامام	۱۰۶
حدیث نمبر ۱۳۴۱	علی، المتقی، الہندی	۱۰۷
۲ (البقرہ) ۳	القرآن الحکیم	۱۰۸
۲ (البقرہ) ۲۶۰	القرآن الحکیم	۱۰۹
حقیقت تصوف ص: ۲۳۲-۲۳۵	القادری، محمد طاہر، ڈاکٹر	۱۱۰
۲ (البقرہ) ۲	القرآن الحکیم	۱۱۱
۲ (البقرہ) ۲۶۱	القرآن الحکیم	۱۱۲
ص: ۵۹	غزالی، محمد، امام	۱۱۳
ص: ۳۷۴-۳۷۵	ولی الدین، محمد بن عبد اللہ، ابو عبد اللہ، الخطیب	۱۱۴
ص: ۲۳۲-۲۳۵	القادری، طاہر، ڈاکٹر، پروفیسر	۱۱۵
ص: ۱۹۷، ۲۰۲، ۳۰	برق، غلام جیلانی، ڈاکٹر	۱۱۶
اسلام اور عصر حاضر مطبوعہ فضلی سنز کراچی	خان، وحید الدین، مولانا	۱۱۷
۲۵ (الفتح) ۴۹	القرآن الحکیم	۱۱۸
۵۸ (مجادلہ) ۲۸	القرآن الحکیم	۱۱۹



- ۱۲۰ القرآن الحکیم  
۱۲۱ القرآن الحکیم  
۱۲۲ برق، غلام جیلانی، ڈاکٹر  
۱۲۳ گیلانی، خورشید احمد، سید  
۱۲۴ مودودی، ابوالاعلیٰ، سید  
۱۲۵ القرآن الحکیم  
۱۲۶ القرآن الحکیم  
۱۲۷ القرآن الحکیم  
۱۲۸ علی، کمتقی، الہندی  
۱۲۹ ابوداؤد، سلیمان بن اشعث، بختانی  
۱۳۰ القرآن الحکیم  
۱۳۱ برق، غلام جیلانی، ڈاکٹر  
۱۳۲ القرآن الحکیم  
۱۳۳ القادری، طاہر، ڈاکٹر، پروفیسر  
۱۳۴  
۱۳۵ سیوطی، جلال الدین  
۱۳۶ القرآن الحکیم  
۱۳۷ سہروردی، شہاب الدین، شیخ  
۱۳۸ القرآن الحکیم  
۱۳۹ القرآن الحکیم  
۱۴۰ القرآن الحکیم  
۱۴۱ سروری قادری، نور محمد، فقیر  
۱۴۲ گیلانی، خورشید احمد، سید
- ۹ (توبہ) ۱۱۲  
۳۳ (احزاب) ۳۵  
ص: ۲۶-۲۴  
روح تصوف مطبع عالمین پبلیکیشنز لاہور ص: ۲۰-۳۵  
تصوف اور سیرت کا کردار ص: ۱۰۵-۱۰۲  
۱۳ (رعد) ۲۸  
۵ (المائدہ) ۵۴  
۳ (آل عمران) ۳۱  
کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال ج: ۸، حدیث نمبر ۹۲۲۳  
سنن ابی داؤد ج: ۱، ص: ۲۳۱  
۱۳ (رعد) ۲۸  
رمز ایمان ص: ۱۲۲-۱۱۹  
۲۵ (الفتح) ۳۸-۳۹  
ص: ۲۷۷  
حقیقت تصوف  
کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال ج: ۲، حدیث نمبر ۱۱۲۵  
الجامع الصغیر، مطبع احیاء التراث بیروت ج: ۱، ص: ۱۲۹  
۱۳ (رعد) ۲۹  
عوارف المعارف، مترجم، شمس بریلوی ص: ۶۶۶  
۲ (البقرہ) ۱-۴  
۹۱ (النہل) ۹  
۶۳ (الجمعة) ۱۰  
عرفان، دین محمد پریس لاہور ج: ۱  
س طباعت بارہ ہفتم ۱۹۹۱ء ص: ۱۲۲-۱۲۱  
روح تصوف ص: ۱۵۵-۱۵۲

۱۴۳	چشتی، یوسف سلیم	تاریخ تصوف	ص: ۵۱۴-۵۱۰
۱۴۴	گیلانی، خورشید احمد، سید	روح تصوف	ص: ۲۰۵-۲۰۱
۱۴۵	ابوداؤد، سلیمان بن اشعث، سجستانی	اسنن ابوداؤد، باب اباقة الایمان مطبع - سید محمد المحام دار الفکر ۱۹۸۱ء	ص: ۶۷
۱۴۶	القرآن الحکیم		۱۸ (الکھف) ۱۰۴
۱۴۷	البخاری، محمد بن اسمعیل، ابو عبد اللہ، امام	الجامع الصحیح، باب اباقة الایمان مطبع دار الفکر، تراش، بیروت	ص: ۵۱
۱۴۸	القرآن الحکیم		۳۳ (الاحزاب) ۲۱
۱۴۹	القرآن الحکیم		۶۳ (الجمعة) ۲
۱۵۰	القرآن الحکیم		۳۳ (الاحزاب) ۲۳
۱۵۱	القرآن الحکیم		۳۱ (لقمان) ۱۵
۱۵۲	القرآن الحکیم		۲۵ (الفرقان) ۲۹-۲۸-۷
۱۵۳	القرآن الحکیم		۳۱ (لقمان) ۱۵
۱۵۴	القرآن الحکیم		۲۵ (الفرقان) ۵۹
۱۵۵	القرآن الحکیم		۱۸ (الکھف) ۲۷-۲۷
۱۵۶	القرآن الحکیم		۲۵ (الفرقان) ۵۹
۱۵۷	القرآن الحکیم		۱۸ (الکھف) ۶۷-۶۶
۱۵۸	البخاری، محمد بن اسمعیل، ابو عبد اللہ	الجامع الصحیح	ج: ۳، ص: ۶۰۴
۱۵۹		الحديث، مجمع الزوائد	ج: ۱۰، ص: ۲۲۶
۱۶۰	ابوداؤد سلیمان، بن اشعث سجستانی	اسنن ابوداؤد	ج: ۲، ص: ۳۴۱
۱۶۱	البخاری، محمد بن اسمعیل، ابو عبد اللہ	الجامع الصحیح	ج: ۲، ص: ۱۵۱

- ۱۶۲ القرآن الحکیم
- ۱۶۳ ابوداؤد، سلیمان بن اشعث، بختانی
- ۱۶۴ البخاری، محمد بن اسمعیل، ابو عبد اللہ
- ۱۶۵ الشاذلی، عبد القادر عیسیٰ، شیخ
- ۱۶۶ بجنوری، محمد حسن، مولوی
- ۱۶۷ ہمدانی، احمد سعید، سید، پروفیسر
- ۱۶۸ احمد، محمد ظہیر الدین، میاں
- ۱۶۹ سہروردی، شہاب الدین، شیخ
- ۱۷۰ ہمدانی، احمد سعید، سید، پروفیسر
- ۱۷۱ غزالی، محمد، امام
- ۱۷۲ ہمدانی، احمد سعید، سید، پروفیسر
- ۱۰ (یونس) ۶۲
- سنن ابوداؤد باب اباحۃ اللحم مطبع، ج: ۲
- سعید بن اللہ دار الفکر بیروت ۱۹۸۱ء ص: ۳۱۲
- الجامع الصحیح ج: ۳، ص: ۱۴۵
- تصوف کے روشن حقائق ص: ۵۹-۴۵
- ناشر: زاویہ سن اشعث ۱۹۹۸ء
- تذکرہ مشائخ نقشبندیہ مجددیہ، ص: ۴۰۸
- دین محمد پریس لاہور ۱۹۸۰ء
- عصر جدید اور مسائل تصوف، ناشر ص: ۷۳-۷۲
- پبلشرز رائل پارک لاہور ۱۹۹۸ء ص: ۷۵-۷۴
- سلوک محمد: ص: ۱۴۴
- مطبع دین محمد پریس لاہور ۱۹۵۱ء
- عوارف المعارف ص: ۳۴۴
- عصر جدید اور مسائل تصوف ص: ۸۷-۷۵
- ۸۴-۸۰
- ۸۴-۸۷
- تلاش حق (اردو) ص: ۵۷
- عصر جدید اور مسائل تصوف ص: ۹۶-۹۴

# باب چہارم

سلمانوں کے علمی و تعلیمی مسائل اور تصوف



ع۔ لام۔ م

ع سے علو (علیین) مراد ہے۔

لام سے لطیف (رازدان) مراد ہے۔

میم سے ملک (بادشاہت) مراد ہے۔

اسی طرح ع سے عزت، لام سے لطافت اور م سے محبت مراد ہے۔

حرف عین:۔ علیین اور عزت کی طرف کھینچتا ہے۔

حرف لام:۔ رازدان، صاحب لطافت بناتا ہے۔

حرف میم:۔ بادشاہت و محبت کا مصداق بناتا ہے۔

یعنی صفت علیین، رازدان، بادشاہت، عزت، لطافت اور محبت کے مجموعہ کا نام علم ہے۔ اور ان کے موصوف کا

نام عالم ہے۔ ان صفات کی تلاش کرنے والے کا نام طالب ہے۔ (۳)

علم روح کی زندگی اور جہالت روح کی موت ہے۔ علم مسلمان کا دوست ہے۔ (۴)

علم ایک روشنی، ایک قوت اور ایک گراں مایہ جوہر ہے جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرتا ہے۔ اس سے انسان کے شعور میں

پختگی آتی ہے۔ اور اس کے ذہن کو بالیدگی نصیب ہوتی ہے۔ اس سے انسان کو کائنات اور زندگی کے مختلف حقائق کا

ادراک ہوتا ہے۔ علم کا اصل منبع اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات ہے جس نے انسان کو عقل کی قوت عطا کی اور جو علم حاصل

کرنے اور اس سے استفادہ کرنے کی بنیاد۔

علم، اعمال کی، بنیادان کا پیش رو اور ان کے صحیح ہونے کا ضامن ہے۔ جس طرح علم، بغیر عمل کے فائدہ نہیں

دیتا۔ بعینہ عمل بغیر علم کے فائدہ نہیں دیتا۔

(۱) کتنے ہی عالم ہیں جو اپنے علم پر عمل پیرا نہیں ہوتے، انہیں بتوں کے پجاریوں سے پہلے عذاب

دیا جائے گا۔

(۲) کیونکہ جو بغیر علم عمل کرتا ہے اس کے اعمال مردود اور غیر مقبول ہوتے ہیں۔

علم اور عمل دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ سالک، ایمان، معرفت الہی

اور حصول رضا کے کسی مقام و منزل میں علم، بے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

سلوک کی ابتدا میں عقائد، عبادات اور معاملات کے علم کا حصول ضروری ہے۔ اور منازل سلوک کے وسط میں

سالک دل کے احوال، حسن اخلاق اور تزکیہ نفس کے علم سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر تصوف کے عملی نصاب میں علم ضروری کے حصول کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ تصوف اسلام کے تمام ظاہری و باطنی پہلوؤں کی عملی تطبیق کا نام ہے۔ اگرچہ اس سے قبل قرآن اور فضیلت علم پر بحث ہو چکی ہے تاہم تبرکاً ایک دو آیات اور احادیث پر اکتفا کرتے ہیں۔

انسان علم ہی کی بدولت اشرف المخلوقات کے بلند مرتبے پر فائز ہوا اور خلیفہ خدا کہلایا۔ علم کی روشنی نے اس میں اپنے حالات بدلنے کی امنگ پیدا کی۔ اور اس نے بتدریج ترقی کی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی تخلیق کے بعد اسے فرشتوں سے اس لئے ممتاز کیا کہ وہ اس کے علم کا امین تھا۔ انسان نے ابتدائی ایام میں اپنی جبلت کے ذریعے لیکن بعد میں شعوری طور پر ارد گرد کے ماحول سے علم حاصل کیا اور دوسرے انسانوں سے معلومات حاصل کر کے اپنے علم میں مسلسل اضافہ کیا۔ اس طرح اسکی صلاحیتیں پروان چڑھیں۔

انسان کے جذبات، احساسات و تجربات میں حالات کے تقاضوں کے مطابق ارتقائی تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ وہ اس دنیا کی ہر چیز کو تنقیدی نظر سے دیکھتا ہے نیز ہر ایک چیز کی ماہیت جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی زندگی میں مختلف واقعات و حادثات اسے مختلف تجربات سے دوچار کرتے ہیں۔ اس میں تجسس کا مادہ ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف دوسرے انسانوں کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے بلکہ اپنے تجربات سے دوسروں کو مستفید کرنے کے لئے آمادہ رہتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں بگ و دو کرتا ہے۔

انسان کو شعور، گونا گوں کاوشیں اور بہتر مستقبل کے لئے اس کے سہانے سپنے ترقی کی منازل طے کرنے کے لئے ہمیز لگاتے ہیں۔ انسان کی یہ تمام سرگرمیاں دراصل علم ہی کی بدولت وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ گویا علم ایک بہتر شعور کا نام ہے اور یہ بہتر شعور اسے اپنی حالت اور حالات بدلنے کے لئے سرگرم عمل رکھتا ہے۔

ابتداء میں انسان نے باقاعدہ تعلیمی اداروں کے ذریعے علم حاصل نہیں کیا بلکہ اپنے ارد گرد کے ماحول، اپنے ساتھیوں، بزرگوں اور ماضی و حال کے مفکروں کے نظریات اور تجربات سے سیکھا وہ دراصل غیر رسمی تعلیم (Non Formal Education) کا دور تھا۔ اس وقت انسان غیر شعوری یا شعوری طور پر اپنے خاندان، معاشرے، معاشرتی سرگرمیوں اور معاشرتی میل ملاپ سے تعلیم حاصل کرتا تھا۔ اور آج بھی علم کے وہ ذرائع اپنا اپنا کردار سرانجام دے رہے ہیں۔ گویا غیر رسمی تعلیم نے انسانی زندگی کے ارتقاء میں ابتدائی زمانے سے حصہ لیا اور آج بھی حصہ لے رہی ہے۔

ابتداء میں انسان کا علم سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا لیکن فن تحریر کی ایجاد نے انسانی علم کی کاپی لپٹ دی اور اس کے استفادہ سے علم کے بے پناہ ذخائر منظر عام پر آ گئے۔ فن تحریر نے انسان کے علم کے فروغ میں گراں قدر خدمات سر انجام دیں۔ تاہم آبادی، تجربے، مشاہدے، غم روزگار میں اضافے اور کچھ ترقی کے منازل طے کرنے کے بعد انسان نے علم دینے اور علم حاصل کرنے کے لئے باقاعدہ اساتذہ اور باضابطہ تعلیمی اداروں کی ضرورت محسوس کی اور ان کا اجراء کیا چنانچہ جو علم انسان کسی منصوبہ بندی کے تحت یا دیگر اداروں کے قائم کردہ تعلیمی اداروں سے حاصل کرتا ہے اسے رسمی تعلیم Formal Education کہتے ہیں۔

اقوام کی تعمیر و ترقی میں غیر رسمی اور رسمی تعلیم دونوں ہی اہمیت کی حامل ہیں۔ اس لئے باشعور اقوام ان دونوں طریقہ ہائے تعلیم کے فروغ کے لئے بہتر سے بہتر مؤثر منصوبہ بندی کرتی ہیں۔ اور اجتماعی مفاد میں اس پر پُر خلوص عمل کرتی ہیں۔

انسانی علم نسل در نسل ارتقاء پذیر رہا ہے۔ ایک نسل نے دوسری نسل اور ایک قوم نے دوسری قوم کے تجربات سے فائدہ اٹھایا اور اٹھا رہی ہے۔ کسی قوم کی ترقی اور خوشحالی کا دار و مدار اس کی اخلاقی اور معاشرتی اقدار اور بہتر تعلیم و تربیت یافتہ افرادی قوت پر ہوتا ہے۔ تعلیمی ادارے افراد کی تعلیم و تربیت کے گہوارے ہوتے ہیں۔ اس لئے کسی قوم کی عظمت کا اندازہ اس کے معاشرتی ماحول، نظام تعلیم، نصاب تعلیم، نظام امتحان اور معیار تعلیم سے لگایا جاتا ہے۔ علم ایک مقدس امانت ہے۔ یہ ہمارے مستقبل کا امین ہے۔ اس لئے اس کے فروغ کے لئے تگ و دو کرنا ہمارا اخلاقی اور قومی فریضہ ہے۔ اسلام کے مطابق علم کا حصول ہر مرد اور عورت پر فرض ہے۔ ہمارے پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی طرف سے مسلمان قوم کے لئے اسے حاصل کرنے اور اس کے لئے چین تک کا سفر کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس لئے ہمارے لئے علم حاصل کرنا اور تعلیم دنیا صرف ایک قومی ضرورت ہی نہیں بلکہ ایک مذہبی فریضہ ہے۔ (۵)

## علم کی اہمیت و فضیلت

اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جس نے علم کے بارے میں یہ تصور رائج کیا کہ دنیا کی تمام مخلوق میں انسان کو صرف اس لئے برتری حاصل ہے کہ اسے علم سے نوازا گیا ہے گو اسلام نے تمام انسانوں کو مساوی حیثیت عطا کی ہے۔ ان میں کسی کو کسی پر فوقیت نہیں سوائے ان لوگوں کے جو علم میں دوسروں سے برتر ہیں۔ گو یا علم اسلام کے تصور کے مطابق باعث فضیلت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک علم وہ واحد وسیلہ ہے۔ جس سے انسان اپنے خالق حقیقی کو پہچان سکتا ہے اسی کے ذریعے وہ اپنی ذات اور اپنے ماحول کا ادراک کر سکتا ہے اور اسی کے ذریعے اپنی اس زندگی اور اسکے بعد آنے

والی زندگی کے لئے مکمل تیاری کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب دنیا تخلیق فرمائی تو سب سے پہلے قلم ہی کو تخلیق کیا۔ لوح و قلم کی اصلاح آج بھی دنیا کے بیشتر ممالک میں رائج ہے اور ہر جگہ انہیں علم کے حوالے سے لکھنے پڑھنے کی بنیادی اشیاء میں شمار کیا جاتا ہے۔ قلم اور اس سے جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ علم کی نشاندہی کرتا ہے اور اللہ کے نزدیک یہ عمل اس حد تک اہم ہے کہ اس نے ان اشیاء کا حوالہ دیا۔ (۶)

ن والقلم وما یسطرون (۷) ن اور قسم ہے قلم کی اور جو کچھ وہ لکھتے ہیں۔

## قرآن سے علم کی فضیلت :-

علم کی فضیلت، بزرگی اور شرافت کے بارے میں اللہ تعالیٰ جل جلالہ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا۔

شهد الله انه لا اله الا هو والملئكة و ايو العلم الله نے گواہی دی کہ کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا اور قائما بالقسط۔ (۸)

فرشتوں نے اور علم والوں نے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی معبودیت کی شہادت سب سے پہلے خود دی پھر فرمایا ملائکہ کرام نے اور تیسرے مرتبہ پر فرمایا، اہل علم نے۔ یہ علم کی فضیلت، اہمیت اور اصالت پر بہت بڑی دلیل ہے۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

یرفع الله الذین امنوا منکم والذین اوتوا العلم الله تعالیٰ ان کے درجے اونچے کرے گا جو علم اور ایمان درجات (۹) رکھتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ علماء کے درجات، ایمانداروں سے سات سو درجے بلند ہوں گے۔ دو درجوں کا فاصلہ پانچ سو برس کی راہ ہوگی۔

تیسرے مقام پر ارشاد فرمایا۔

قل هل یستوی الذین یعلمون والذین آپ کہیں کہ برابر ہیں جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے۔ لا یعلمون (۱۰)

چوتھے مقام پر فرمایا۔



انما يخش الله من عباده العلماء۔ (۱۱) اللہ سے ڈرتے وہی ہیں اس کے بندوں میں سے جو علم والے ہیں۔

پانچویں مقام پر فرمایا۔

قل كفى بالله شهيداً بيني وبينكم و من عندهُ آپ کہہ دیں اللہ کافی ہے گواہ میرے اور تمہارے بیچ علم الکتاب (۱۱) اور جس کو خبر ہے کتاب کی۔

چھٹے مقام پر فرمایا۔

قال الذي عنده علم من الكتاب انا اتيك به اس شخص نے کہا جس کے پاس کتاب کا علم تھا میں لا دیتا ہوں تجھ کو وہ۔ (۱۲)

ساتویں مقام پر فرمایا۔

و قال الذين اوتوا العلم ويلكم ثواب الله اور بولے جن کو ملی تھی سمجھ۔ اے خرابی تمہاری! اللہ کا دیا خیر لمن امن وعمل صالحاً (۱۳) ثواب بہتر ہے ان کو جو یقین لائے اور کیا بھلا کام اس میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ قدر آخرت کی بزرگی علم سے معلوم ہوتی ہے

آٹھویں مقام پر فرمایا۔

وتلك الامثال نضربها للناس و ما يعقلها یہ کہادیں بیان کرتے ہیں ہم آدمیوں کے لئے اور ان کو الا العالمون (۱۴) بوجھتے ہیں وہی لوگ جن کو سمجھ ہے۔

نویں مقام پر ارشاد فرمایا۔

ولوردوه الى الرسول والى اولوا امر منهم اور اگر پہنچانے میں رسول تک اور اپنے اعتبار والوں تک لعلمه الذين يستبطونه منهم۔ (۱۵) تو تحقیق کرتے اس کو جو ان میں تحقیق کرنے والے ہیں۔

اپنے حکم کو معاملات میں علماء کے اجتہاد پر راجح فرمایا اور ان کے رتبہ کو حکم الہی کے معلوم کرنے میں انبیاء کے رتبہ کے

ساتھ ملایا۔ اور اس آیت کی تفسیر میں اللہ نے ارشاد فرمایا۔

يَا بَنِي آدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ لِبَاسًا يَوَارِي أَعْيُنَكُمْ وَأَعْيُنُهُمْ لِبَاسٌ أَلْفٌ خَيْرٌ - تَمَارِ عَيْبٍ أَوْ رَوْثٍ أَوْ كِبْرٍ عَلَىٰ رِيشَاءِ لِبَاسِ التَّقْوَىٰ ذَاكَ خَيْرٌ -  
(۱۶) ہیں۔

بعض لوگوں نے کہا کہ لباس سے مراد علم ہے اور ریش سے مراد یقین ہے اور لباس تقویٰ سے مراد حیا ہے۔  
دسویں مقام پر فرمایا۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا هُمْ بَكْتَبٍ فَصَلْنَهُ عَلَىٰ عِلْمٍ (۱۷) اور ہم نے انکو پہنچا دی ہے کتاب جو کھول کر بیان کی ہے  
خبر داری سے۔

گیارہویں مقام پر فرمایا۔  
وَلَنَقْصِنَ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ (۱۸) پھر ہم احوال سنا دیں گے ان کو اپنے علم سے۔

بارہویں مقام پر فرمایا۔  
بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيْنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ بَلْكَ يَفْقَهُونَ آيَاتِ هِيَ صَافٍ سَيَنِي فِي ان كَجَن كَوْنِي  
(۱۹) ہے سمجھ۔

تیرہویں مقام پر فرمایا۔  
خَلَقَ الْإِنْسَانَ عِلْمَهُ الْبَيَانِ (۲۰) بنایا آدمی اور سکھائی اس کو بات۔

اللہ تعالیٰ نے اس کو احسان جتنا نے کی جگہ پر ذکر فرمایا ہے۔ (۲۱)  
ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

احادیث کی روشنی میں علم کی فضیلت  
حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ نے فرمایا۔

مَنْ يَرِدُ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يَفْقَهُهُ فِي الدِّينِ وَيُلْهِمُهُ جَسَ كَ سَا تَهَ اللّٰهَ تَعَالٰی بَهْتَرِي چاہتا ہے اس کو دین میں سمجھ  
رشدہ (۲۲) دیتا ہے اور راہ اس کو الہام کر دیتا ہے۔

مزید ارشاد فرمایا۔

العلماء ورثة الانبياء (۲۳) علماء کرام انبیاء کے وارث ہیں۔

ظاہر ہے کہ کوئی رتبہ نبوت سے بڑھ کے نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس رتبہ کی وراثت سے بڑھ کر کوئی اور شرف نہیں۔ حضور ﷺ نے ایک اور مقام پر فرمایا کہ عالم دین کے واسطے زمین اور آسمانوں میں جو چیز ہے، مغفرت طلب کرتی ہے۔ اس سے بڑھ کر کون سا منصب ہوگا جس منصب والے کے لئے آسمان و زمین کے فرشتے مغفرت چاہنے میں مشغول رہتے ہیں۔ (۲۴)

حضور ﷺ نے فرمایا کہ حکمت، شریف کی بزرگی زیادہ کرتی ہے اور مملوک کو اتنا اونچا کرتی ہے کہ اس کو بادشاہوں کی جگہ میں بٹھلا دیتی ہے۔ (۲۵)

اس حدیث میں آپ نے علم کا نتیجہ دنیا میں ارشاد فرمایا اور یہ ظاہر ہے کہ آخرت دنیا کی نسبت بہتر اور پائیدار ہوتی ہے۔

حضور ﷺ نے ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا۔

خصلتان لا یكونان فی منافق حسن سمت و دو خصلتیں ہیں کہ منافق میں نہیں ہوتیں اول خوبی ہدایت فقہ فی الدین۔ (۲۶) دوم دین میں سمجھ۔

اس حدیث میں بعض فقہائے وقت کا نفاق دیکھ کر تمہیں شک نہیں کرنا چاہیے۔ اس لئے کہ حضور ﷺ کی مراد فقہ سے وہ علم نہیں کہ جس کو تم فقہ خیال کرتے ہو بلکہ ادنیٰ درجہ فقیہہ کا یہ ہے کہ اس بات کا یقین رکھتا ہو کہ آخرت دنیا سے بہتر ہے اور یہ بات جب فقیہہ میں ٹھیک اور غالب ہو جاتی ہے تو اس کو نفاق اور نمود سے بری کر دیتی ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ آدمیوں میں سے بہتر اور ایماندار وہ عالم ہے کہ اگر لوگ اس کے پاس حاجت لے جاویں تو وہ اس کو فائدہ دے اور اگر اس سے بے پروائی کریں تو وہ اپنے نفس کو بے پرواہ کرے۔ (۲۷)

حاکم نے ابو داؤد سے روایت کیا کہ حضور ﷺ نے فرمایا۔ ایمان ننگا ہے اور اس کی پوشش تقویٰ ہے اور اس کی آرائش حیا اور اس کا ثمرہ علم ہے۔ (۲۸)

اسی طرح طبرانی نے ابو داؤد سے روایت کیا کہ حضور ﷺ نے فرمایا۔ ایک قبیلے کا مرجانا ایک عالم دین کے مرنے کی بہ نسبت آسان تر ہے۔ (۲۹)

حضور ﷺ نے علم کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

انّ الناس معادن كمعادن الذهب والفضة آدمی کانیں ہیں مثل سونے اور چاندی کی کانوں کے، پس  
فخيارهم خيارهم في الاسلام اذا فقهوا۔ جو کفر میں بہتر تھے وہ اسلام میں بھی بہتر ہیں جبکہ دین میں  
(۳۰) سمجھ پیدا کریں۔

قیامت کے روز علماء کی سیاہی شہیدوں کے خون سے تولی جائے گی۔  
حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص میری امت میں سے چالیس احادیث سنت کی یاد کر کے پہنچا دے تو میں اس کا شفیق اور گواہ  
قیامت میں رہوں گا۔

ایک اور مقام پر فرمایا کہ جو شخص میری امت میں سے چالیس حدیثیں یاد کرے۔ وہ قیامت میں اللہ تعالیٰ سے فقیہ اور  
عالم ہو کر ملے گا۔ (۳۱)

حضور ﷺ کا یہ بھی فرمان ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے دین میں سمجھ پیدا کرے۔ اللہ تعالیٰ اس کو رنج سے بچائے گا اور ایسی  
جگہ سے روزی پہنچائے گا کہ جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہوگا۔ (۳۲)

یہ بھی ارشاد رسول مقبول ﷺ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو فرمایا کہ میں علیم ہوں اور ہر علم والے کو دوست  
رکھتا ہوں۔

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ میری امت میں سے دو قسمیں ایسی ہیں کہ جب وہ درست ہو جائیں تو سب لوگ درست ہو  
جائیں اور اگر وہ بگڑ جائیں تو سب لوگ بگڑ جائیں۔ ایک امراء یعنی حکام ہیں، دوسرے فقہاء۔ (۳۳)  
حضور ﷺ نے فرمایا۔

فضل العالم على العابد كفضلي على ادنى علم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے میری فضیلت میرے  
رجل من اصحابی۔ (۳۴)

غور فرمائیں کہ حضور ﷺ نے اس حدیث میں کیسا نبوت کے درجے کے ساتھ کیا ہے اور جو علم کہ عمل سے خالی ہو اس کے  
رتبہ کو کیسا کم کیا ہے۔ حالانکہ عابد جس عبادت کو ہمیشہ کرتا ہے اس کا علم تو رکھتا ہی ہے اگر اس کا علم نہ ہو تو عبادت نہ ہوگی۔  
حضور ﷺ نے فرمایا۔

فضل العالم على العابد كفضل عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی چودھویں رات کے  
القمر ليلة البدر على سائر الكواكب (۳۵) چاند کی فضیلت سب ستاروں پر ہے۔

یہ بھی ارشاد رسول اللہ ﷺ ہے کہ

شفیع یوم القيامة ثلثة الانبياء ثم العلماء ثم قیامت میں تین آدمیوں کی شفاعت قبول ہوگی۔ انبیاء کی الشہداء (۳۶) پھر علماء کی پھر شہداء کی۔

کس قدر علماء کا مرتبہ ہے کہ انبیاء سے نیچے اور شہداء کے اوپر ہے۔ باوجودیکہ شہادت کی فضیلت میں بہت کچھ وارد ہے

حضرت ﷺ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ کی عبادت کسی چیز سے بہتر نہیں ہوتی جیسے دین کی سمجھ سے ہوتی ہے اور ایک دین کا سمجھنے والا شیطان پر ہزار عابدوں سے سخت تر ہے۔

یہ بھی فرمایا کہ تمہارے دین میں بہتر وہ ہے جو سب سے آسان زیادہ ہو اور بہترین عبادت فقہ ہے۔

اور فرمایا کہ ایماندار عالم ایماندار عابد سے بہتر 72 درجے بڑھ کر ہے۔ (۳۷)

حضرت ﷺ نے فرمایا عالم اور عابد کے درمیان سو درجوں کا فرق ہے ہر دو درجوں میں اتنا فاصلہ ہے جتنا کہ ستر برس میں ایک گھوڑا تیز دوڑ کر قطع کرے اور صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اعمال میں سے کون سا افضل ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ علم اللہ کا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ ہم اعمال میں سے افضل پوچھتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا علم اللہ تعالیٰ کا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ ہم عمل کا پوچھتے ہیں اور آپ ﷺ علم ارشاد فرماتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ علم کے ساتھ تھوڑا سا عمل کا رآمد ہوتا ہے اور جہالت کے ساتھ بہت سا عمل بے سود ہے۔ (۳۸)

یہ بھی ارشاد رسول ﷺ ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ علماء کو فرمائے گا اے گروہ علماء، میں نے تم میں جو علم رکھا تھا تو جان کر رکھا تھا اسلئے نہیں رکھا تھا کہ تم کو عذاب دوں۔ جاؤ میں نے تم کو بخش دیا۔ (۳۹) اللہ تعالیٰ ہمارا انجام بھی انہی لوگوں میں فرمائے۔ آمین۔

حضرت ابو درداغ سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو انسان حصول علم کے لئے کسی راستہ پر چلتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کے راستہ کو آسان فرما دیتا ہے۔ ملائکہ اس کے عمل سے خوش ہو کر اپنے پر پچھالیتے ہیں۔ زمین و آسمان کی مخلوق عالم کے لیے استغفار کرتی ہے۔ حتیٰ کہ پانی کی مچھلیاں۔ عالم کو عابد پر اسی طرح فضیلت ہے جس طرح چاند کو ستاروں پر۔ بے شک علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں۔ انبیاء درہم و دینار کو وارث نہیں بناتے، بلکہ اہل علم کو وارث بناتے ہیں۔ پس جس نے علم حاصل کیا۔ اس نے وافر حصہ پایا۔ (۴۰)

حضرت ابو بکرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے۔ عالم بن جاؤ یا متعلم۔ یا علم کا سامع یا

اس سے محبت رکھنے والا۔ ان چار کے علاوہ پانچواں شخص نہ بننا اور نہ ہلاک ہو جاؤ گے۔ حضرت عطا فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے مجھ سے فرمایا کہ تو نے ہمارے لئے پانچویں شخص کی وضاحت کی ہے جس کا مجھے علم نہیں تھا۔ اور اس سے مراد یہ ہے کہ علم اور صاحب علم کے ساتھ بغض رکھے۔ (۴۱)

## بزرگان دین کے نزدیک علم کی فضیلت

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت کمیلؓ کو فرمایا کہ علم مال سے بہتر ہے۔ علم تیری حفاظت کرتا ہے اور تو مال کی۔ علم حاکم ہے اور مال محکوم علیہ، مال خرچ کرنے سے گھٹتا ہے اور علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔

یہ بھی آپ کا ارشاد ہے کہ عالم افضل ہے روزہ دار، شب بیدار اور جہاد کرنے والے سے اور جب عالم مرتا ہے تو اسلام میں ایسا رخنہ پڑتا ہے کہ اس کو بجز اسکے نائب کے اور کوئی بند نہیں کرتا۔

حضرت ابوالاسودؓ نے فرمایا کہ کوئی چیز علم سے بڑھ کر عزت والی نہیں کہ بادشاہ لوگوں پر حاکم ہوتے ہیں اور علماء بادشاہوں پر۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت سلیمان بن داؤدؑ کو اختیار دیا گیا کہ علم، مال اور سلطنت میں سے جو چاہو اختیار کرو انہوں نے علم کو پسند فرمایا تو مال اور حکومت علم کے ساتھ ان کو عطا ہوئی۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؓ سے پوچھا گیا کہ آدمی کون ہیں۔ آپ نے فرمایا ”عالم دین“ پھر پوچھا گیا کہ بادشاہ کون ہیں فرمایا کہ ”زائد“۔ آپ سے پوچھا گیا کہ کسے کون لوگ ہیں فرمایا کہ جو لوگ اپنے دین کو بیچ کر کھاتے ہیں غرضیکہ عالم دین کے سوا اور دل کو آدمی نہ کہا سلتے کہ جو چیز انسان کو جانوروں سے ممتاز کرتی ہے وہ علم ہے۔ انسان تبھی انسان کہلائے گا کہ جس بات سے اس کو شرف ہو وہ اس میں موجود ہو اور انسان کی شرافت نہ تو جسم کے زور کے باعث ہے اسلئے کہ زور میں اس سے اونٹ زیادہ ہے۔ نہ ہی بڑا جثہ ہونے کی جہت سے ہے کہ ہاتھی اس سے بڑا ہے۔ نہ شجاعت کے سبب سے ہے کہ درندے اس سے بھی زیادہ شجاع ہیں نہ کھانے کے سبب سے ہے کہ بیل کا پیٹ اس سے بھی بڑا ہے۔ نہ صحبت کے سبب سے ہے کہ ادنیٰ چڑیا اس باب میں اس سے بھی بڑھ کر ہے بلکہ اس کو شرافت ہے تو صرف علم کی رو سے ہے اور اسی علم کے لئے وہ پیدا ہوا ہے۔

حکماء کا قول ہے کہ ہم کو کوئی یہ بتا دے کہ جس کو علم نہ ملا اس کو اور کیا ملا اور جس کو علم ملا اس سے اور کیا باقی رہا۔ حضرت فتح موصلیؒ نے فرمایا کہ اگر مریض کو تین دن کھانا، پانی، دوا کچھ نہ دیا جائے تو وہ مر جائے گا۔ لوگوں نے کہا بے شک مر جائے گا۔ فرمایا یہی حال دل کا ہے۔ جب اس سے تین دن علم اور حکمت کو روک دیا جاتا ہے تو وہ مر جاتا ہے۔ اسلئے کہ دل کی غذا

علم و حکمت ہے اور انہی دونوں سے اس کی زندگی ہے۔ جس طرح کہ بدن کی غذا کھانا ہے۔ جس شخص کو علم میسر نہیں تو اس کا دل بیمار ہے۔ اور اس پر موت لازم مگر اس شخص کو اپنے دل کی بیماری اور موت کی خبر نہیں ہوتی اسلئے کہ دنیا کی محبت اور اسکے کاروبار میں لگے رہنے سے اس کی حس جاتی رہتی ہے۔ جیسے خوف اور نشے کے غلبہ میں زخم کا درد اس وقت معلوم نہیں ہوتا اگرچہ واقع میں درد ہوتا ہے لیکن جب موت دنیا کے بوجھ اور علاقے آدمی سے اتار دیتی ہے تب اپنے دل کی موت کو جانتا ہے اور افسوس کرتا ہے۔ اس وقت افسوس کچھ فائدہ نہیں کرتا۔ جس طرح کہ خوف والے کا خوف اور متوالے کا نشہ دور ہو جاتا ہے تو اس کو جہاں جہاں نشہ یا خوف کی حالت میں زخم لگا ہوتا ہے، معلوم ہوتا ہے۔ اب تو لوگ سوتے ہیں جب مریں گے تب جاگیں گے اور حقیقت حال کا پتہ چلے گا۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ عالموں کی سیاہی اور شہیدوں کا خون تولا جائے گا تو سیاہی کا وزن زیادہ ٹھہرے گا۔ حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ لوگو! علم کو سیکھو پیشتر اس سے کہ علم اٹھالیا جائے اور اس کا اٹھانا یہ ہے کہ اس کے روایت کرنے والے مر جاویں۔ پس قسم ہے مجھ کو اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ جو لوگ راہ خدا میں مارے گئے اور شہید ہوئے وہ عالموں کی بزرگیاں دیکھ کر یہ چاہیں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کو عالم اٹھاتا۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ علم کا تذکرہ تھوڑی سی رات میں کرنا میرے نزدیک تمام رات جاگنے سے اچھا ہے۔ اور یہی مضمون حضرت ابوہریرہؓ اور امام احمد بن حنبلؒ سے مروی ہے۔

حضرت حسن بصریؒ ”ربنا اتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة“ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ دنیا کے حسنہ سے مراد علم اور عبادت ہے اور آخرت کے حسنہ سے مراد جنت۔

بعض صوفیاء سے کسی نے سوال کیا کہ کون سی چیز ذخیرہ کی جائے۔ جواب دیا کہ وہ چیز ذخیرہ کرنی چاہیے کہ جب تیری کشتی ڈوب جائے تو وہ تیرے ساتھ تیرے لگے یعنی علم ذخیرہ کرنے کے قابل ہے۔

بعض صوفیاء نے کہا ہے کہ جو شخص حکمت کو اپنی لگام بناتا ہے لوگ اس کو اپنا امام بناتے ہیں۔ اور جو شخص حکمت میں مصروف ہوتا ہے اس کو لوگ عزت و وقار سے دیکھتے ہیں۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ علم کی شرافت یہ ہے کہ اس کو جس شخص کی طرف منسوب کرو گویا کسی ادنیٰ بات میں ہو مثلاً کہ یہ شخص فلاں چیز کا علم رکھتا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے۔ اور جس شخص سے اس کو اٹھا لو مثلاً کہو کہ فلاں چیز کا اس کو علم نہیں تو وہ رنجیدہ ہوتا ہے۔

حضرت عمرؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ اے لوگو! علم کے پیچھے پڑو کہ اللہ کے پاس ایک چادر محبت ہے جو شخص باب علم کا طالب

ہوتا ہے اللہ تعالیٰ وہ چادر اس کو اڑھاتا ہے پھر اگر وہ شخص کوئی گناہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی رضا جوئی اس سے کرا لیتا ہے۔ پھر دوبارہ اگر غلط کام مرتکب ہوتا ہے تب بھی اس سے رضا جوئی کا طالب ہوتا ہے تیسری بار بھی ایسا ہی معاملہ ہوتا ہے۔ غرض اس، ہر دفعہ کی رضا جوئی کرانے سے یہ ہوتی ہے کہ اس سے وہ چادر نہ چھینے اگرچہ اس کا گناہ بڑھتے بڑھتے موت تک پہنچ جائے۔

حضرت احنفؒ فرماتے ہیں کہ علماء، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مالک بن جائیں گے۔ جس عزت کی مضبوطی علم سے نہ ہو تو اس کا انجام ذلت ہوتا ہے۔

حضرت سالم بن جعدؒ فرماتے ہیں کہ میرے آقا نے مجھ کو تین سو درہم لیکر آزاد کر دیا تو میں نے سوچا کہ کون سا فن سیکھوں آخر علم کو حرفہ بنایا۔ ایک برس بھی مجھ کو نہ گذرا تھا کہ حاکم شہر میری ملاقات کو آیا۔ میں نے اسکو لوٹا دیا اور پاس نہ آنے دیا۔ حضرت زبیر بن ابی بکرؓ نے کہا مجھ کو میرے باپ نے عراق میں خط لکھا کہ تو علم کے پیچھے پڑا سنے کہ اگر تو مفلس ہو جائے گا تو یہ تیرا مال ہوگا اور اگر تو غنی ہوگا تو اس سے تیری زینت ہوگی۔

حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو وصیت کی کہ اے لڑکے! علماء کے پاس بیٹھ اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر اسلئے کہ اللہ تعالیٰ نور حکمت سے دلوں کو ایسا زندہ کرتا ہے جیسے زمین کو بھاری مینہ سے سرسبز کرتا ہے۔

بعض صوفیاء فرماتے ہیں کہ عالم مرجاتا ہے تو اس پر مچھلیاں پانی میں اور پرندے ہوا میں روتے ہیں۔ گو ظاہر میں اس کا چہرہ نظر نہیں آتا مگر اس کی یاد دلوں سے نہیں بھولتی۔

حضرت امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ علم نر ہے اور اس کو مردوں میں سے وہی پسند کرتے ہیں جو مرد اور نر ہوں۔

## عقلی دلائل

علم کی فضیلت اور نفاست کو معلوم کرنے سے خود فضیلت کا مفہوم سمجھنا چاہیے۔ جو اس سے غرض ہے اس کو نہ معلوم کرو تو علم وغیرہ اشیاء کی فضیلت کا جاننا ناممکن ہے۔ جیسے کوئی یہ معلوم کرنا چاہے کہ زید حکم ہے یا نہیں تو اگر اس کو ابھی تک حکمت کے معنی اور اس کی حقیقت کا علم نہ ہو تو سوائے راہ بھٹکنے کو اس کو کیا حاصل ہوگا۔ وہ حکمت کے بارے میں بے بہرہ ہوگا۔

واضح رہے کہ فضیلت کا لفظ فضل سے مشتق ہے جس کا معنی زیادتی کے ہیں۔ جب دو چیزیں کسی بات میں شریک ہوں اور ایک میں کوئی بات زیادہ ہو اس کو کہیں گے کہ یہ دوسرے سے زیادہ اور افضل ہے۔ لیکن زیادتی ایسی چیز میں ہونی چاہیے جو اس چیز کا کمال ہو۔ مثلاً گھوڑے کو جو گدھے سے افضل کہتے ہیں تو اسی لئے کہ گھوڑا بار برداری میں تو گدھے کا شریک ہے مگر کروفر، تنگ و دو اور خوبصورتی میں اس سے بڑھ کے ہے۔



علم کو اور اوصاف کے لحاظ سے دیکھو تو اس میں ایک طرح کا فضل ہے جیسے گھوڑے کو بہ نسبت اور حیوانات کے فضیلت ہے۔ بلکہ تیزی، تگ و دو جو گھوڑے میں ہے وہ مطلق فضیلت نہیں۔ اضافی ہے اور علم کو بالذات اور مطلق فضیلت ہے خواہ کسی کی نسبت کو ہو یا نہ ہو اس لئے کہ وہ خدائے تعالیٰ کی صفت کمال ہے۔

یاد رکھیے نفیس چیز کی رغبت جو ہوتی ہے اسکی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ کہ غیر کے لئے مطلوب ہو۔ دوسری وہ کہ بالذات مطلوب ہو۔ تیسری وہ بالذات اور غیر کے لئے دونوں طرح مطلوب ہو۔ ان تینوں قسموں میں سے جو بالذات مطلوب ہوتی ہے وہ اول کی نسبت اشرف اور افضل ہوتی ہے۔ اور اول قسم یعنی جو غیر کے لئے مطلوب ہو وہ روپیہ اور نقدی وغیرہ کہ جو خود پتھر یا کاغذ ہیں۔ ان سے خود کسی طرح کا فائدہ نہیں اگر بالفرض خداوند کریم لوگوں کی حاجتیں پوری کرنی ان سے سہل فرماتا تو ان کا اور کنگروں کا ایک سا حال ہوتا۔ لیکن مطلوب بالذات آخرت کی سعادت اور لذت دیدار الہی ہے۔ تیسری قسم جو بالذات بھی اور غیر کے لئے بھی مطلوب ہوتی ہے اسکی مثال بدن کی سلامتی ہے مثلاً پاؤں کی سلامتی اس جہت سے بھی مطلوب ہے کہ بدن درد سے سلامت رہے اور اس لئے بھی مطلوب ہے کہ اس سے چل کر اپنے مطالب اور حاجات پوری کریں۔ اب اس اعتبار سے اگر علم کو دیکھو تو اس کو خود بھی لذت پاؤں کے اور وسیلہ آخرت اور سعادت اخروی اور قرب الہی کا ذریعہ بھی پاؤں کے۔ بغیر اسکے اللہ تعالیٰ تک وصول ممکن نہیں۔ اور سب چیزوں سے افضل وہی ہے جو سعادت ابدی کا وسیلہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اس کا ملنا بغیر علم و عمل کے ہرگز نہیں ہوتا۔ اور عمل بغیر علم کے نہیں ہو سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا اور آخرت میں سعادت کی اصل علم ہی ہے۔ اس لئے ثابت ہوا کہ سب اعمال سے افضل علم ہے۔ اور کیوں نہ ہو کہ فضیلت کسی چیز کی اسکے نتیجے سے بھی معلوم ہوا کرتی ہے۔

جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے کہ علم کا نتیجہ قرب الہی اور وصول بزمہ ملائکہ اور نزدیکی ملاء اعلیٰ کی ہے۔ یہ امور تو آخرت میں ہوں گے۔ دنیا میں بھی عزت و وقار۔ لوگوں کی طبائع میں عالم دین کی قدر و منزلت علم کی بدولت ہے۔ یہاں تک کہ چھوٹے اور کم مرتبہ لوگ بڑوں کی عزت اور توقیر اس لئے کرتے ہیں کہ وہ تجربہ کرتے کرتے علم میں بڑھ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ چوپائے بھی انسان کی توقیر کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کو بھی یہ شعور ہے کہ جو درجہ ہمیں حاصل ہے اس سے کمال میں انسان بڑھا ہوا ہے۔

یہ فضیلت علم کی مطلق ہے۔ پھر علوم مختلف ہیں۔ جیسے علوم میں اختلاف ہے اسی طرح ان کے فضائل میں بھی

تفاوت ہے۔ (۴۲)

صول علم کا حکم:

شرعی حکم کے اعتبار سے علم کی تین اقسام ہیں۔

- (۱) مامور بہ (وہ علم جس کے حصول کا حکم دیا گیا ہو۔)
- (۲) منہی منہ (وہ علم جس سے روکا گیا ہو۔)
- (۳) مستحب

(۱) مامور بہ:

اس کی دو قسمیں ہیں۔

- (۱) فرض عین (۲) فرض کفایہ

فرض عین وہ ہوتا ہے جو مکلف کے بذات خود ادا کرنے سے اس سے ساقط ہوتا ہے۔

مکلف پر فرض عین علوم کو ذکر کرنے سے پہلے اس موضوع کے متعلق بعض بنیادی قواعد ذکر کرتے ہیں۔

قاعدہ نمبر ۱:

وہ چیز جس کے بغیر واجب کی تکمیل نہ ہو پس وہ بھی واجب ہو جاتی ہے۔

قاعدہ نمبر ۲:

علم معلوم کے تابع ہوتا ہے۔ لہذا جو علم کسی فرض کی ادائیگی کا وسیلہ اور سبب ہو، وہ فرض ہوگا۔ اور جو واجب کی ادائیگی کا وسیلہ ہو، واجب اور جو سنت کی ادائیگی کا وسیلہ ہوگا وہ سنت ہوگا۔

ان قواعد کو بنیاد بناتے ہوئے ہم بعض ان علوم کو بیان کرتے ہیں جو ہر مکلف پر فرض ہیں۔

- (۱) عقائد اہلسنت اور اس کے اجمالی دلائل کو جاننا، تاکہ انسان لمحدین کی تشکیک اور گمراہ کن لوگوں کے مغالطوں سے ایمان کی حفاظت کر سکے۔

- (۲) ان مسائل کو جاننا جن کے ذریعہ مکلف فرضی عبادات مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کو ادا کر سکے۔

- (۳) اور جس شخص کا واسطہ معاملات یعنی خرید و فروخت وغیرہ کے ساتھ ہو اس پر ان احکام کا سیکھنا فرض ہے جن کے ذریعے حرام سے بچ سکے اور شرعی حدود کا التزام کر سکے۔

- (۴) احوال قلب یعنی توکل، خشیت اور رضا وغیرہ کو جاننا کیونکہ مسلمان کو اپنی زندگی میں ان تمام احوال

سے واسطہ پڑتا ہے۔

(۵) تمام اخلاق حسنہ اور سیئہ کو جاننا، تاکہ اخلاق حسنہ سے اپنے آپ کو آراستہ کرے۔ اور اخلاق سیئہ سے اجتناب کرے۔ اور ان اخلاق کو ترک کرنے کے لئے مجاہدہ نفس کرے۔ کیونکہ مجاہدہ ہر مکلف پر فرض ہے۔ اور اس کا حصول اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب سالک تمام اخلاق حسنہ اور سیئہ کو جاننے کے ساتھ ساتھ مجاہدات کے ان تمام طریقوں کو بھی جان لے جن میں صوفیاء کرام مشغول رہے۔

اسی لئے شیخ ابوالحسن شاذلیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص ہمارے علم یعنی تصوف میں داخل ہوئے بغیر مر گیا۔ وہ بہت سے کبار پر اصرار کرتے ہوئے مراجس کا اسے شعور تک بھی نہ تھا۔ یہ جاننا چاہیے کہ بعض کبار اور فواحش ظاہری ہوتے ہیں جیسے زنا، شراب نوشی، اور بعض باطنی جیسے تکبر اور نفاق وغیرہ۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان دونوں سے روکا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فلا تقربوا الفواحش ما ظهر منها وما بطن۔ اور مت نزدیک جاؤ بے حیائی کی باتوں کے، جو ظاہر ہوں (۴۳) ان سے اور جو چھپی ہوئی ہوں۔

ظاہری فواحش کا مرتکب تو توبہ کر لیتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کے گناہ پر متنبہ ہوتا ہے۔ مگر فواحش باطنی کا ارتکاب کرتے ہوئے انسان زندگی گزار لیتا ہے۔ توبہ کی فکر نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ اس کے حکم سے ناواقف ہوتا ہے۔ یا اسے شعور ہی نہیں ہوتا کہ وہ گناہ کر رہا ہے۔

دوسری قسم کفایہ ہے۔ فرض کفایہ وہ ہوتا ہے جس کو بعض لوگ ادا کر دیں تو دیگر سے ساقط ہو جاتا ہے۔ اور اگر کسی ایک نے بھی ادا نہ کیا تو تمام لوگ گنہگار ہوں گے۔ فرض کفایہ عموماً وہ ہوتا ہے جس پر امت کی اصلاح موقوف ہوتی ہے، جیسا کہ علم فقہ میں گہرائی تک جانا اور اسی طرح علم تفسیر، حدیث، اصول فقہ، اصول اعتقاد، علم حساب، علم صنعت اور علم اسلحہ سازی وغیرہ۔

## (۲) علوم منہیہ :

(۱) وہ علوم جن سے منع کیا گیا ہے گمراہ کن مذاہب، مشکل افکار اور عقائد رافعہ کی گہرائی تک جانا منع ہے۔ لیکن ان کی تردید کے لئے اور ان کے خطرات سے بچنے کے لئے انہیں پڑھنا منع نہیں ہے۔

اسی طرح ان کی کجی کو دور کرنے کے لئے اور ان کے شبہات کو دور کرنے اور دین کی حفاظت کے لئے ان کو سیکھنا فرض کفایہ ہے۔

(۲) مسروقہ مال، خزانوں کی تلاش اور اسی طرح گمشدہ چیزوں کی تلاش کے لئے علم نجوم کا سیکھنا جائز

نہیں۔ کیونکہ اس کا تعلق کہانت سے ہے۔ اور شرع نے ان لوگوں کی تکذیب کی ہے اور ان کی تصدیق کو حرام قرار دیا ہے۔ لیکن علمی تحقیقات، نماز کے اوقات جاننے اور قبلہ شریف کی سمت جاننے میں کوئی حرج نہیں۔ جادو سے بچنے کے لئے جادو کا علم جائز ہے۔ برائی کا علم برائی سے بچنے کے لیے ہو، نہ کہ اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے۔ کیونکہ جو شخص برائی کو نہیں جانتا وہ اس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

(۳) علوم مستحبہ:

جسمانی اور قلبی فضائل، سنن و نوافل اور مکروہات اور فرائض کفایہ کو جاننا مستحبات سے ہے۔ اسی طرح علم فقہ اور اس کی فروعات، عقائد اور اس کے تفصیلی دلائل کی معرفت بھی اسی قبیل سے ہے۔ (۴۶)

## فصل دوم

### صوفیاء کے افکار کی روشنی میں جہالت کی مذمت

جہالت کا لفظ جھل سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی بے علمی کے ہیں۔ (۴۵)

جھل کی دو قسمیں ہیں۔ جھل بسیط اور جھل مرکب۔

#### 1۔ جھل بسیط:-

فقدان علم کے ساتھ اپنی بے علمی کا اعتراف کرنا جھل بسیط کہلاتا ہے۔

#### 2۔ جھل مرکب:-

ایس چیز کا اعتقاد رکھنا جو واقع میں موجود نہ ہو اور اس میں یہ اعتقاد ہو جاتا ہے کہ میں عالم ہوں یہاں

تک کہ ایسا شخص نہیں جانتا کہ وہ کچھ نہیں جانتا اسی وجہ سے اس کو جھل مرکب کہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر جاہل ہو مگر خود کو عالم

فاضل سمجھنا۔ (۴۶)

### قرآن کی روح سے جہالت کی مذمت:-

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا۔

قل هل يستوی الذین یعلمون والذین کیا علم والے اور جاہل برابر ہیں۔

لا یعلمون۔ (۴۷)

کیا مطلب؟ جاہل عالم کے برابر نہیں ہو سکتے۔ اہل علم کو جاہل پر فضیلت حاصل ہے۔ وجہ فضیلت علم ہے جبکہ جاہل علم سے عاری ہوتا ہے۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّهُمْ لَنَ يَغْنُوا أَوْ لَنَ يَحْلُوا أَوْ لَنَ يَكُونُوا لَكَ آيَاتٍ  
عَنْكَ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا۔ (۴۸) گے تیرے اللہ کے سامنے کچھ بھی۔

اس آیت کریمہ میں اللہ رب العزت نے جاہل کی پیروی سے منع فرمایا۔ اور وجہ یہی بتائی کہ اسکی پیروی تمہیں نہ اس دنیا میں فائدہ دے گی اور نہ آخرت میں فائدہ دے گی۔ بلکہ رب ذو الجلال نے فرمایا کہ تم جاہل سے دور بھاگو۔ اسکی اذیتوں پر صبر کرو اور اگر وہ کوئی بات کرے تو دور سے گزر جاؤ۔ چنانچہ ارشاد فرمایا۔

فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَامٌ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ۔ تو ان سے درگزر فرما اور فرما دے سلام ہے کہ آگے جان جائیں گے۔ (۴۹)

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کی تعریف کرتے ہوئے واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا کہ ان کی شان یہ ہے کہ  
وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا۔ جب جاہل ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ دور سے سلام کہتے ہیں۔ (۵۰)

اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب حضرت محمد ﷺ کو فرمایا کہ جاہل لوگوں سے اعراض فرمائیں۔ ارشاد فرمایا۔  
خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ اے محبوب معاف کرنا اختیار کرو اور بھلائی کا حکم دو اور جاہل لوگوں سے منہ پھیر لو۔ (۵۱)

اس سے بڑھ کر اور کیا جہالت کی مذمت ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں مختلف مقامات پر جاہلوں سے منہ پھیرنے اور دور رہنے کا حکم دیا ہے۔ (۵۲)

**احادیث کی روشنی میں جہالت کی مذمت:-**

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

الْمُتَعَبِدُ بِلَا فِقْهٍ كَالْحِمَارِ فِي طَاهُونَةٍ۔ (۵۳) بے علم عبادت گزار اس گدھے کی مانند ہے جو آٹے کی چکی سے بندھا ہو۔

چکی سے بندھا ہوا گدھا اگر چہ دوڑتا، بھاگتا اور چلتا ہے لیکن وہ اپنے ہی محور میں گھومتا رہتا ہے اور کوئی مسافت طے نہیں کر پاتا۔ یعنی وہ کوئی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ ”زمین جب نہ جب بدل گل محمد“ کا مصداق بنا رہتا ہے۔ جاہل وہ شخص ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر نہیں ہوتی۔ اس لئے حضور ﷺ نے فرمایا۔

من یرد اللہ بہ خیراً یفقہ فی الدین و یلہمہ جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بہتری چاہتا ہے اس کو دین میں سمجھ رُشدہ (۵۴) عطا کرتا ہے اور راہ اس کو الہام کر دیتا ہے۔

معلوم ہوا کہ جاہل اللہ کی طرف سے خیر کا مستحق نہیں ہوتا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جاہل سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا۔

لیس منی الا عالماً او متعلماً (۵۵) عالم یا معلم کے سوا میرا کسی سے تعلق نہیں۔

یہ حدیث پاک اس بات کا بین ثبوت ہے کہ جاہل کو حضور ﷺ پسند نہیں فرماتے۔ جاہل اور عالم کے فرق کو جو حضور ﷺ نے بیان فرمایا ہے۔ یہ فرق بتاتا ہے کہ حضور ﷺ کی نظر میں جاہل کا درجہ کس قدر کمتر ہے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں۔

فضل العالم علی العابد کفضل علی ادنکم عالم کی فضیلت جاہل عابد پر ایسے ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے ادنیٰ مرد پر۔ (۵۶)

بلکہ حضور ﷺ نے جاہل کو منافق قرار دیا ہے ارشاد فرمایا۔  
خصلتان لا یكونان الا فی منافق حسن سمت دو خصلتیں منافق میں جمع نہیں ہوتیں ایک دین کی سمجھ اور وفقہ فی الدین (۵۷) دوسری سیدھی راہ۔

اس حدیث پاک سے ثابت ہوا جو دین کا علم نہیں رکھتا یعنی جو جاہل ہے وہ منافق ہے۔ (۵۸)

صوفیاء کے اقوال کی روشنی میں جہالت کی مذمت:-

حضرت علیؓ فرماتے ہیں

رضینا قسمة الجبار فینا لنا علم وللجهال ما ہم اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر خوش ہیں کہ ہمیں علم کی دولت سے نوازا اور جاہلوں کو مال دیا۔

ل۔

گویا حضرت علیؓ نے اہل علم کی فضیلت اور جاہل کی مذمت بیان کرتے ہوئے اس طرف اشارہ فرمایا کہ اہل علم کو باقی دولت اور نعمت ملتی ہے جبکہ جاہل کو فانی دولت نصیب ہوتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؓ سے کسی نے پوچھا کہ آدمی کون ہیں۔ انہوں نے فرمایا ”عالم“ پھر پوچھا کہ بادشاہ کون ہیں فرمایا کہ ”زائد“ پھر پوچھا کہ کینے کون لوگ ہیں۔ فرمایا کہ جو لوگ اپنے دین کو بیچ کر کھاتے ہیں۔ اس فرمان سے یہ بات واضح ہوئی کہ جاہل کو صوفیاء حضرات آدمی بھی نہیں سمجھتے۔

حضرت فتح موصلیؒ فرماتے ہیں کہ جب مریض کو تین دن کھانا پانی، دوا کچھ نہ دیا جائے تو وہ مر جائے گا۔ لوگوں نے کہا بیشک وہ مر جائے گا۔ فرمایا یہی حال دل کا ہے۔ جب اس سے تین دن علم اور حکمت کو روک دیا جاتا ہے۔ تو مر جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ جاہل کا دل مردہ ہو جاتا ہے۔ اصل میں حضرت فتح موصلیؒ نے فرمایا کہ عالم کا دل زندہ ہے اور جاہل کا دل مردہ ہے۔ ظاہر ہے جس کا دل مردہ ہو وہ خود بھی مردہ ہوتا ہے۔

اسی بات کی طرف حضرت ابوعلی ثقفیؒ نے بھی اشارہ فرمایا۔

العلم حیوۃ القلب من الجہل و نور العین من جہالت اور تاریکی کے مقابلہ میں علم دل کی زندگی اور الظلمۃ۔ (۵۹) آنکھوں کا نور ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جہالت کا خاتمہ دل کی حیات اور کفر کی تاریکی دور ہونے سے آنکھ کی روشنی یقینی ہے۔

مفہوم مخالف سے یہ بات واضح ہوئی کہ جہالت سے دل مردہ اور کفر کی تاریکی سے آنکھ بند ہو جاتی ہے۔

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ فرماتے ہیں کہ جاہل کی عبادت بھی رایگاں جاتی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا۔

مَنْ تَزْهَدَ بِغَيْرِ عِلْمٍ جَنِّ فِي آخِرِ عَمْرِهِ اَوْمَاتٍ جَوْ اَدَمِي بِغَيْرِ عِلْمٍ كَ عِبَادَتِ، رِیاضات اور مجاہدہ کرے گا وہ کافراً آخر عمر میں پاگل ہو جائے گا یا کافر ہو کر مرے گا۔

اس علم سے مراد اللہ کا علم اور صوفیوں کا علم ہے اسلئے وہ فرماتے ہیں کہ میرا مشاہدہ ہے کہ جو دانشمند حضرات صرف علم ظاہری رکھنے کے بعد زہد و عبادت کرتا ہے وہ وسوسہ کا شکار ہو جاتا ہے یا اس کی نیت میں اتنا مبالغہ ہو جاتا ہے کہ معمولی باتیں گزرنے پر اس کے نزدیک فرض بن جاتی ہیں۔ بعض لوگ وضو کرنے میں ایسی غلطی کرتے ہیں کہ ان کو طہارت نہیں ہوتی اور اس طرح مستقلاً نماز پر نماز ان کی فوت ہوتی جاتی ہے اور وہ بحالت ناپاکی رہتے ہیں۔ اس میں ذرہ شبہ نہیں ہے۔ اس لئے علم سے مراد اللہ سے متعلق علم اور علم تصوف لیا گیا ہے کیونکہ ان دونوں علوم سے وسوسوں کا خطرہ نہیں رہتا۔ (۶۰)

حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک گروہ کو دیکھا کہ وہ علم کو عمل پر فضیلت دیتا ہے اور ایک گروہ کو دیکھا کہ وہ عمل کو علم پر فوقیت دیتا ہے۔ جبکہ ان دونوں گروہوں کے نظریے باطل ہیں۔ اس لئے کہ بغیر علم کے عمل کو حقیقت میں عمل کہا ہی نہیں جاسکتا کیونکہ عامل جبھی عمل کرتا ہے جبکہ پہلے اسے اس کا علم ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ بندہ کو علم ہوتا ہے کہ اس عمل کے کرنے کا خدا نے اسے حکم دیا ہے۔ اس علم کے بعد بندہ اس پر عمل کرتا ہے۔ جس سے وہ عمل کرنے کے ذریعہ اجر و ثواب کا مستحق قرار پاتا ہے۔ سمجھنا یوں چاہیے کہ نماز ایک عمل ہے جب تک بندے کو پہلے طہارت کے ارکان کا علم نہ ہو اسی طرح پانی کی شناخت کا علم، سمت قبلہ کا علم، کیفیت نیت کا علم، وقت نماز کا علم اور ارکان نماز کا علم پہلے سے نہ ہو وہ نماز کیسے صحیح ہو سکتی ہے۔ لہذا جب بغیر علم سے بندہ بے علم ہو جاتا ہے تو جاہل کو اس سے کیسے جدا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اس گروہ کا حال ہے جو عمل کو علم پر فضیلت دیتا ہے۔ یہ نظریہ بھی باطل محض ہے کیونکہ عمل کے بغیر علم کچھ کام نہ آئے گا ارشاد ربانی ہے۔۔

نبذ فریق من الذین اوتوا الكتاب کتاب اللہ اہل کتاب کے ایک گروہ نے کتاب کو پس پشت ڈال دیا گویا وراء ظهورهم کانهم لا یعلمون۔ (۶۱) وہ لوگ جانتے ہی نہیں بے علم ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے عالم بے عمل کو علماء کے ذمے سے بھی خارج فرما دیا کہ ایسے لوگ عالم نہیں بلکہ جاہل ہیں اور یہی بات حضرت داتا گنج بخشؒ نے بھی کی ہے۔

حضرت یحییٰ بن معاذ رازیؒ فرماتے ہیں۔ تین قسم کے لوگوں کی صحبت سے بچو۔ غافل علماء، مداہنت کرنے والے فقراء، جاہل صوفیاء سے۔

غافل علماء وہ ہیں جنہوں نے دنیا کو اپنا قبلہ بنا رکھا ہے۔ اور مداہنت کرنے والے فقراء وہ ہیں جو ہر کام اپنی خواہش کے مطابق کرتے ہیں اگرچہ وہ باطل ہی کیوں نہ ہو۔

جاہل صوفیاء وہ ہیں جن کا کوئی شیخ و مرشد نہ ہو یہ تینوں گروہ اپنی دعادی میں جھوٹے ہیں اور ان کی روش گمراہ کرنے والی ہے۔

درحقیقت حضرت یحییٰ بن معاذ رازیؒ ان تینوں گروہوں کو جاہل تصور کرتے ہیں۔ اور جاہل کی صحبت گمراہ کرنے والی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔



العجز عن درك الادراك ادراك : والوقف في علم کے ادراک سے عاجز رہنا ہی علم و ادراک۔ نیکیوں کی راہ طرق الخیار اشراک۔ (۶۲)  
 سے ہٹ جانا شرک کے برابر ہے۔ بتانا یہ مقصود تھا کہ جو شخص تحصیل علم کی کوشش نہیں کرتا اور اپنے جہل پر مصر رہتا ہے ہمیشہ مشرک رہتا ہے۔

جہالت ایک جرم ہے:-

ایک روایت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ جہالت کو ایک عذر قرار نہیں دیتا اور جاہل کے لئے جہالت پر چپ رہنا جائز نہیں اور نہ عالم کے لئے جائز ہے کہ وہ علم پر خاموش رہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔  
 فائسوا اهل الذکر ان کنتم لاتعلمون (۶۳) سو پوچھو اہل ذکر سے اگر تم کو معلوم نہیں۔  
 حضرت سہلؒ سے پوچھا گیا۔ جہالت سے بڑی بھی کوئی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے۔  
 فرمایا! ہاں۔ پوچھا کیا! وہ کیا ہے۔

فرمایا! جہالت سے جاہل ہونا۔ یعنی آدمی جاہل ہو اور یہ جانتا ہو کہ وہ جاہل ہے یا جاہل آدمی اپنے آپ کو عالم سمجھتا رہے اور جہالت پر خاموش اور راضی ہو کر بیٹھ جائے اور علم حاصل نہ کرے اور اس طرح فرائض کے فرض و اصل سب کو ضائع کرتا رہے۔ یعنی طلب علم کو ضائع کرے اور شاید ایسا بھی کرنے لگے کہ جہالت کے مطابق فتویٰ دینا شروع کر دے یا شبہات میں کلام کرے اور سمجھے کہ یہ علم ہے۔ یہ بات اسکی خاموشی سے زیادہ جرم ہے۔ (۶۴)  
 حضرت سہلؒ فرماتے ہیں۔ جہالت کے باعث انسان کی قساوت قلبی گناہوں کے باعث پیدا ہونے والی قساوت قلبی سے ہے اس لیے کہ جہالت ایک اندھیرا ہے اور اندھیرے میں بینائی کچھ فائدہ نہیں دے سکتی ہے۔ (۶۵)  
 فرمان الہی ہے۔

وَبَدِّلْهُمْ مِنْ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ۔ (۶۶) اور نظر آیا ان کو اللہ کی طرف سے جو خیال نہ رکھتے تھے۔

اس کی تفسیر میں بتایا گیا کہ انہوں نے ایسے اعمال کیے کہ جنہیں اپنی جہالت کے بدلے نیکیاں سمجھتے رہے مگر آخر میں انہوں نے انہیں برائیاں پایا۔

حضرت ثورثیؒ فرماتے ہیں۔ جاہل آدمی فضائل کو تلاش کرتا رہتا ہے۔ چھوٹے گناہوں کی پروا نہیں کرتا حالانکہ ان کی نحوست سے اللہ تعالیٰ سے بعد حاصل ہوتا ہے اور یہ مقرئین کی راہ نہیں ہے۔

اولیائے چشت اہل بہشت نے کبھی بے علم اور جاہل کو خلافت کے لئے منتخب نہیں فرمایا۔ اس لئے کہ جاہل نہ تو خود تصوف

کے اسرار کو سمجھ سکتا ہے اور نہ ایک حاذق طبیب کی طرح امراض ملت کی صحیح تشخیص اور علاج کر سکتا ہے۔  
حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ نے صرف اہل علم کو خلافت دینے کی یہ وجہ بتائی کہ ”در صحبت او ضلالت رواج نحو اہد گرفت“ اسکی صحبت میں گمراہی اور جہالت رواج نہیں پائے گی۔

حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ اگر تم خداوند تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا چاہتے ہو تو جہالت سے بچو۔ علم حاصل کرو۔

پے علم چوں شمع باید گداخت کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

علم کے لئے بے حد محنت کرو کیونکہ جاہل خدا کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ (۶۷)

مولانا رومؒ جہالت کی مذمت کرتے ہوئے ایک حکایت بیان کر کے مسلمانان عالم کو درس دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگلے زمانہ میں ایک جاہل عابد ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ ایک دن دوسرے گاؤں کے لوگ آئے اور کہنے لگے صوفی صاحب! آپ اللہ کے نیک بندے ہیں۔ ہمارے گاؤں تشریف لائیں۔ وہاں لوگوں نے ایک درخت کی پوجا شروع کر دی ہے۔ انہیں آ کر تبلیغ کریں کہ یہ شرک ہے۔ تاکہ وہ اس سے باز آئیں صوفی صاحب نے غصہ میں آ کر کلہاڑا لیا اور چل دیے۔ راستے میں شیطان بصورت انسان آ گیا اور کہنے لگا۔ صوفی صاحب! کہاں جا رہے ہو۔ کہا! فلاں گاؤں میں لوگ درخت کی پوجا کر رہے ہیں۔ اس شرک کو مٹانے جا رہا ہوں۔ شیطان نے کہا میں نہیں جانے دیتا۔ آپس میں گھٹم گھٹا ہو گئے۔ صوفی نے ایک منٹ میں شیطان کو گرا دیا۔ شیطان نے جاہل صوفی کو کہا کہ مجھے چھوڑ دے تمہیں ایک ایسا وظیفہ بتاتا ہوں جس سے ہر رات تیرے تکیے کے نیچے چار پانچ درہم آ جایا کریں گے جس سے معاش کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس سلسلہ میں جو وقت بچے گا وہ بھی یاد الہی میں بسر کرنا اور ساتھ کہا کہ درخت کو مت کاٹ! وقت ضائع نہ کر اگر اللہ کو یہ شرک مٹانا مقصود ہو تو اس کام کے لئے نبی کو مبعوث فرمائے گا کیونکہ شرک مٹانے کے لئے انبیاء کو ہی بھیجا کرتا ہے۔ صوفی جہالت کی بنا پر اس کے دام میں آ گیا اور اسکو یقین ہو گیا کہ اگر اللہ تعالیٰ کو شرک مٹانا منظور ہوگا تو کسی نبی کو مبعوث فرمائے گا۔ جبکہ سلسلہ نبوت ختم ہو چکا ہے۔ اب اس کام کے لئے حضور ﷺ کے امتیوں کی ذمہ داری ہے۔ جاہل صوفی خوشی خوشی گھر گیا۔ رات کو وظیفہ پڑھ کے سویا۔ صبح تہجد کے لئے اٹھا تو پہلے پہلے تکیے کے نیچے ہاتھ لے گیا۔ درہم پالے۔ اسی طرح چار پانچ روز کے بعد درہم ملنے بند ہو گئے۔ تو صوفی صاحب پھر طیش میں آ گئے۔ اور کلہاڑا اٹھایا اور درخت کا ٹٹے روانہ ہو گئے۔ حسب سابق شیطان آگے آ گیا اور کہا میں جانے نہیں دیتا اور گھٹم گھٹا ہو گئے۔ اس دفعہ جاہل صوفی کو شیطان نے ایک منٹ میں گرا دیا۔ وہ جاہل صوفی کہنے لگا۔ آپ نے کیا کھایا ہے گذرے تو چار دن ہیں مگر بلا کی طاقت اور قوت آ گئی ہے۔ شیطان نے کہا۔ کچھ نہیں کھایا۔ دراصل پہلی دفعہ جو تم جا رہے تھے تو صرف رضائے الہی مقصود

تھی۔ اسلئے روحانی قوت بھی شامل تھی مگر اب کی بار صرف چند درہم نہ ملنے کا غم ہے۔ رضائے الہی مقصود نہیں ہے۔ اسلئے روحانی قوت سے عاری ہو گئے ہو۔

یہ حکایت بیان کر کے نہ صرف مولانا رومؒ نے رضائے الہی کا درس دیا۔ اخلاص کا درس دیا بلکہ بتایا کہ اللہ کی معرفت بغیر علم کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ جاہل صوفی اپنی جہالت کی وجہ سے بالآخر مار کھا جاتا ہے۔

مولانا رومؒ نے دوسرے مقام پر فرمایا کہ انسان کے اندر لامحدود دولت ہے مگر جہالت سے وہ بھکاری بن گیا ہے۔ اسی بات کو مشرقی پنجاب، ہندوستان کے ایک بزرگ حضرت بھیکؒ نے دو لفظوں میں بیان فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

بھیکا بھوکا کوئی نہیں سب کی گدڑی میں لعل

گرہ کوئی نہیں جانتا اس لئے ہے کنگال (۶۸)

نبوت سے پہلے ہی حضرت محمد ﷺ عام عرب لوگوں سے مختلف زندگی گزارتے تھے آپ ﷺ امین اور صادق کے نام سے پہچانے جاتے تھے آپ ﷺ اکثر اپنے تنہائی کے لمحات مکہ سے کچھ فاصلے پر غار حرا میں عبادت اور غور و فکر میں گزارتے تھے۔ آپ ﷺ عبادت الہی میں مشغول تھے کہ پہلی مرتبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوئی حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس آئے اور عرض کیا۔

اقراء! پڑھ، آپ ﷺ نے فرمایا میں پڑھنے والا نہیں ہوں حضرت جبرائیل علیہ السلام نے پھر عرض کیا اقرء! آپ ﷺ نے پھر وہی جواب دیا تیسری دفعہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو زور سے بھینچا اور عرض کیا؟

اقرا باسم ربك الذي خلق - خلق الانسان من پڑھ اس رب کے نام سے جس نے پیدا کیا جس نے انسان علق (☪) کو خون کے ٹوٹھڑے سے پیدا کیا۔

اس بات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے آقا سر دار دو جہان سرور کائنات باعث تخلیق کائنات پر پہلی دفعہ جو اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوئی وہ علم کے بارے میں تھی۔ جہالت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ جاہل انسان کو اچھے برے کی تمیز نہیں ہوتی غلط اور صحیح کا فیصلہ اس کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ فائدہ اور نقصان اس کی سمجھ سے بالاتر ہوتا ہے جہالت کسی فرد سے لے کر کسی قوم تک کی تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔

دوسری طرف تعلیم کی اہمیت سے کسی بھی دور میں انکار نہیں کیا جاسکا یہ تعلیم ہی ہے جو انسان کو آگاہی و شعور کی بلندی پر لے جاتی ہے۔ علم ہی سے انسان اپنی حیثیت اور دوسرے انسانوں کا مقام اور خدا تعالیٰ کی ذات کو پہچانتا ہے۔

اسلام سے پہلے کا دور جہالت ہر طرح کی برائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ عرب کے لوگ جہالت اور لاعلمی کے باعث طرح طرح کی معاشرتی برائیوں میں مبتلا تھے جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔

- ۱۔ آتش پرستی
- ۲۔ بت پرستی
- ۳۔ مظاہر فطرت کی پرستش
- ۴۔ بیٹیوں کو زندہ دفن کرنا
- ۵۔ شراب نوشی
- ۶۔ سود خوری
- ۷۔ جوا
- ۸۔ عبادات میں افراط و تفریط

اسلام کے آنے سے جہالت کی تاریکی علم کی روشنی میں بدل گئی۔

حضور ﷺ کی تعلیم سے لوگوں میں علم و عبادت کی صحیح آگاہی ہوئی۔ آپ ﷺ کے زمانے میں بھی بہت سے صحابہ نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا اور بہت سے صحابہ کا تب و وحی بھی تھے۔ جب حضور ﷺ پر کوئی آیت نازل ہوتی تو صحابہ کرامؓ اسے ہڈیوں یا کھجور کے پتوں یا چمڑے پر اتار لیتے تھے۔ کئی صحابہ کو قرآن پاک زبانی یاد تھا۔ حضرت عثمان غنیؓ قرآن پاک کا بہت علم رکھتے تھے ان کا فرمان ہے کہ خدا کی قسم! قرآن کے جس حصے کے بارے میں چاہو مجھ سے پوچھ لو۔ حضور ﷺ کے دور میں مشہور کا تب وحی حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت عبدالرحمان بن عوف، حضرت عبداللہ بن کعب، حضرت سعد بن عبادہ تھے۔

حضور ﷺ نے ایک درس گاہ بھی بنائی تھی جہاں پر صحابہ کو قرآن اور سنت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان صحابہ کو اہل صفہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ حضرت عائشہ کی درس گاہ میں بھی تقریباً چار ہزار طالب علم تھے۔ اللہ تعالیٰ علم رکھنے والوں کو پسند کرتا ہے اور جاہلوں کو ناپسند کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کون علم رکھنے والا ہے قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

ان ربك علیم حکیم۔ (۷۰) بے شک تیرا رب علم والا اور حکمت والا ہے۔

اسلام کی روح اور اس کے ارکان کو سمجھنے کے لئے علم کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اسلام کے ارکان چاہے وہ نماز ہو یا زکوٰۃ اور روزہ ہو یا حج، ہر حکم کی فرضیت اور تعمیل و طریقہ کار کا پتہ علم کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔ وہ شخص جس کو عبادت کی اصل روح کا پتہ نہ ہو وہ کس طرح دلجمعی کے ساتھ عبادت کر سکتا ہے۔ قرآن پاک کو سمجھنے کے لئے علم کا حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ بے علم شخص قرآن پاک کی تعلیم سے صحیح طور پر فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ ہر مسلمان کو اپنی مادری زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ ضرور آنا چاہیے تاکہ وہ نہ صرف اسے پڑھے بلکہ سمجھ بھی سکے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

ان انزلنا قرآنًا عربیاً لعلکم تعقلون۔ (۷۱) ہم نے قرآن عربی زبان میں نازل کیا تاکہ تم سمجھ سکو۔

حدیث رسول کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے علم کا حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ اسی طرح ہر لفظ کے مآخذ اور استنباط احکام کے لیے بھی اہل علم ہونا بہت ضروری ہے۔ قرآن پاک میں انسان کو بار بار کائنات پر غور و فکر کرنے پر آمادہ کیا گیا ہے چنانچہ اللہ نے فرمایا۔

ان فی اختلاف الیل والنهار وما خلق اللہ فی بے شک رات اور دن کے بدلنے میں اور جو اللہ نے السموات والارض لایت لقوم یعقلون۔ (۷۲) زمین اور آسمانوں میں پیدا کیا ہے۔ عقل والوں کے لیے نشانی ہے۔

ایک اور جگہ پر ارشاد ہوتا ہے۔

ان فی ذالک لایۃ لقوم یتفکرون سخر لکم بے شک اس میں اس قوم کے لیے نشانی ہے جو فکر کرتے الیل والنهار والشمس والقمر والنهار ہیں اور اللہ نے تمہارے لیے رات اور دن، سورج اور مسخرات بامر۔ (۷۳) چاند کو مسخر کیا ہے۔

حضور ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ علم حاصل کرو چاہے تمہیں چین کیوں نہ جانا پڑے۔ اسلام نے مرد اور عورت دونوں پر علم حاصل کرنا فرض کیا ہے اس جدید دور میں علم کی ضرورت و اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ ایک پڑھی لکھی ماں اپنی اولاد کو وہ شعور اور تربیت دے سکتی ہے جو اس کے خاندان، ملک و قوم اور دین کے کام آئے۔ جب کہ ایک جاہل ماں ایک پوری نسل کی تباہی کا باعث بن جاتی ہے۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنی بساط کے مطابق دین و دنیا کی تعلیم حاصل کرے۔ جہالت سے خود بھی دور رہے اور دوسروں کو بھی اس کی تبلیغ کرے۔ (۷۴)

## فصل سوم

### علم کے فروغ کے لئے صوفیاء کی کاوشیں

#### (i) فکری (ii) عملی

مسلمانوں کے فکر و عمل کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہو جس پر تصوف سے زیادہ تنقید و تبصرہ کیا گیا ہو۔ ناقدین نے صرف اس کے سرچشموں ہی کو غیر اسلامی بتانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ملت اسلامیہ کے اکثر امراض کا باعث ہی اس کو قرار دیا ہے۔ بعض ناقدین نے تو اپنے لہجے میں اس قدر سختی پیدا کر لی ہے کہ صدق و انصاف کا دامن اُن کے ہاتھ سے چھوٹ

گیا ہے اور انہوں نے تاریخ حقائق سے چشم پوشی کر کے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ تصوف اسلام کے رُخ روشن پر ایک بدنما داغ ہے۔ اگر یہ الزامات صرف ”صوفیائے خام“ اور ”مسخ شدہ تصوف“ پر ہیں تو ٹھیک اور اگر حقیقی تصوف اور صوفیاء کامل پر ہیں تو غلط ہی نہیں بلکہ گمراہ کن بھی ہیں۔ حقیقی تصوف مذہب کی روح، اخلاق کی جان اور ایمان کا کمال ہے۔ اس کی اساس شریعت ہے اور اس کا سرچشمہ قرآن وحدیث ہے۔

صوفیاء کا ہمیشہ یہ عقیدہ رہا ہے کہ جس عمل کو کتاب وسنت رد کردیں وہ ”زندقہ“ ہے۔ جس شخص کی زندگی قرآن وسنت کے مطابق نہیں اسے صوفیاء کے طبقہ میں شمار ہی نہیں کرنا چاہیے۔ کچھ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ تصوف جہلاء کا مسلک تھا اور صوفیائے کرام علم دین سے نابلد تھے۔ مشائخ کے حالات کا سرسری مطالعہ بھی اس الزام کی نوعیت دریافت کرنے کے لئے کافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس چیز پر ان بزرگوں نے سب سے زیادہ زور دیا وہ علم ہے۔ حضرت بابا فرید گنج شکر فرمایا کرتے تھے کہ جاہل پیر مسخرہ شیطان ہو جاتا ہے۔ اس کی نگاہ حقیقت اور سراب میں امتیاز کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ وہ دل کی بیماریوں کی صحیح تشخیص اور مناسب علاج نہیں کر سکتا۔

حضرت شیخ نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں۔

بیر آنچنان باید کہ در احکام شریعت و طریقت و یعنی پیر ایسا ہونا چاہیے کہ احکام شریعت، طریقت وحقیقت حقیقت عالم باشد و چوں این چنین باشد او خود کا علم رکھتا ہو اگر ایسا ہوگا تو خود کسی نامشروع چیز کے لئے نہ ہیچ نامشروع نہ فرماید۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے قرآن اور حدیث کے علم کو ایک صوفی کے لئے لازم قرار دیا ہے۔

حضرت یحییٰ معاذ رازیؒ کا قول ہے۔

اجتنب صحبة ثلاثة اصناف من الناس، تین قسم کے آدمیوں کی صحبت سے بچنا چاہیے۔ غافل العلماء الغافلین و الفقراء المداہنین عالم سے مکار فقیر سے اور تیسرے جاہل صوفی سے۔

والمتصوفة الجاهلین

علامہ ابن جوزیؒ تصوف کے حامیوں میں سے نہیں تھے لیکن ان کو بھی اعتراف کرنا پڑا ہے۔ فرماتے ہیں۔

وما كان المتقدمون في التصوف الا روساً في قدامى صوفياء قرآن، فقه، حدیث اور تفسیر کے امام القرآن و الفقه والحديث والتفسير۔

تھے۔

## فکری و عملی کوششیں:-

پہلی صدی ہجری سے لیکر 21 صدی ہجری تک کوئی دور ایسا نہیں کہ جس میں صوفیائے کرام نے علم کے فروغ کے لئے فکری و عملی کوششیں نہ کی ہوں۔ آپ غور فرمائیں کہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی سرکارِ دو جہاں ﷺ کو فرمایا 'اقرا' تو پڑھ پھر حضور ﷺ نے اپنی امت کو علم حاصل کرنے کا درس دیا۔ تو پھر صوفی جو بننا ہی اتباع قرآن و سنت سے ہے وہ کیسے نہ عالم ہوگا اور کیوں نہ علم کا درس دے گا۔ یقیناً اس کی فکر اسکی سوچ ہر وقت علم کی تبلیغ کے لئے ہوگی۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ پہلی صدی ہجری سے لیکر آج کی صدی تک صوفیائے کرام کی علم کے بارے میں کیا فکری کوششیں رہی ہیں۔ (۷۵)

1۔ پہلی صدی ہجری:-

حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔

طلب العلم فريضة على كل مسلم و مسلمة۔ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور ہر مسلمان عورت پر فرض ہے۔ (۷۶)

آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔

من يرد الله به خيراً ليفتته في الدين۔ (۷۷) جس کے لئے اللہ تعالیٰ بھلائی چاہتا ہے اس کو دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے۔

نیز فرمایا۔

العلماء ورثة الانبياء۔ (۷۸) علماء انبیاء کے وارث ہیں۔

یہ بھی فرمایا۔

تعلم العلم و علموه الناس۔ (۷۹) علم سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ۔

یہ بھی ارشاد رسول مقبول ﷺ ہے۔

خيركم من تعلم القرآن وعلمه۔ (۸۰) تم میں سے بہتر وہ ہے جو قرآن کو سیکھے اور سکھائے۔

ایک روز حضور ﷺ باہر نکلے اور مسجد نبوی کے صحن میں تشریف لائے۔ آپ ﷺ نے دو مجلسیں دیکھیں۔ ایک تو اللہ سے سوال کرتے۔ دعا مانگ رہے تھے اور دوسرے لوگوں کو کچھ سکھاتے تھے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجلس اول کے

لوگ تو اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں اور اگر وہ چاہے ان کو دے اور چاہے نہ دے مگر دوسری مجلس والے لوگوں کو تعلیم کر دیتے ہیں اور مجھ کو بھی اللہ تعالیٰ نے تعلیم دینے ہی کے لیے پنا کر بھیجا ہے پھر آپ پہلی مجلس والوں کی طرف سے پھرے اور دوسری مجلس میں آ کر بیٹھ گئے۔

خطبہ حجۃ الوداع جو اسلامی تاریخ کا اہم خطبہ ہے۔ اس میں جہاں اسلامی سماج اور سیاست کے سب بنیادی اصول اجمالاً بیان کر دیے گئے ہیں وہاں آپ نے علم کا بھی ذکر فرمایا۔ میں نے تمہارے درمیان ایک چیز چھوڑی ہے جس کو اگر تم مضبوط پکڑو گے تو میرے بعد کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ یاد رکھو وہ قرآن ہے۔

آپ کا یہ فرمان بھی علم کے حصول کی دعوت فکر دیتا ہے کہ عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی میری فضیلت تم میں سے ادنیٰ مسلمان پر ہے۔ اور فرمایا شیطان پر ایک ہزار عابدوں کی بجائے ایک عالم بھاری ہے۔

حضور ﷺ کے بعد خلفائے راشدین نے پوری طرح نظام خلافت، منہاج سنت پر ترتیب دیا اور اپنے طریقہ کار میں راہ نبوی کا اتباع کیا۔ اس دور میں بھی خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے علم کی ضرورت پر بہت زور دیا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے دور حکومت میں قرآن کی تعلیم پر زور دیا۔ ہر جگہ مبلغ بھیجتے۔ آپ یوں دعا فرمایا کرتے۔

اللهم ارنا الحق حقاً فننتبعه و ارنا الباطل اے اللہ! ہمیں حق کو حق کر کے دکھاتا کہ ہم اس کا اتباع باطلاً فجتنبه ولا تحمل ذالك متشابهاً علينا کریں اور ہمیں باطل کو باطل کر کے دکھاتا کہ ہم اس سے پرہیز کریں اور ہم پر اسے مشتبہ نہ بنا کہ ہم خواہش کی پیروی کرنے لگ جائیں۔

حضرت عمرؓ نے افواج کے اعلیٰ افسروں کو خط لکھا عبادت گزاروں سے جو تم سنتے ہو اسے یاد رکھو۔ اس لئے کہ ان پر صحیح امور منکشف کیے جاتے ہیں اور حضرت عمرؓ خود بھی ایسے علمائے باطن کے پاس بیٹھ کر ان کا کلام سنتے تھے۔ آپ کے مشورے پر قرآن کو کتابی شکل میں لکھا۔

حضرت عثمانؓ نے قرآن کی خدمت کی۔ مسلمانوں میں کتابت اور قرأت کے اختلافات کو ختم کیا۔ حضرت عمر بن خطابؓ کی تعلیمی پالیسی پر عمل کرایا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی شخصیت تو وہ ہے کہ جس کے بارے میں سرکارِ دو جہان ﷺ نے فرمایا۔



انامدینة العلم و علی بابہا۔ (۸۱) میں علم کا شہر ہوں تو حضرت علی اس کا دروازہ ہیں۔

حضرت علیؑ نے فرمایا علم مال سے بہتر ہے۔ کیونکہ علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے اور مال خرچ کرنے سے گھٹتا ہے۔  
حضرت سیدنا امام حسن مجتبیٰؑ نے بھی علم کی افادیت پر زور دیا۔ ان کے علمی کمال ان کے ان خطوط سے بھی عیاں ہے جو آپ نے بعض احباب اور غلاموں کو لکھے بالخصوص حضرت خواجہ حسن بصری کے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ علم حقائق و اصول میں کتنی مہارت رکھتے تھے۔ آپ نے جاتے ہوئے وصیت فرمائی۔

علیکم بحفظ السرائر فان الله تعالى مطلع تم اسرار ربانی کی حفاظت میں محکم رہنا کیونکہ اللہ تعالیٰ علی الضمائر۔  
دلوں کے بھیدوں سے واقف ہے۔

### دور بنو امیہ، صوفیاء کا پہلا طبقہ:-

آپ کے بعد بنو امیہ کا دور شروع ہوا۔ صوفیاء کے اس پہلے طبقہ کا دور 41ھ تا 132ھ بمطابق 661ء تا 850ء تک کا ہے۔ ان کا مرکز کوفہ اور بصرہ تھا۔ جہاں خلفائے بنو امیہ نے بے انتہا ظلم و ستم ڈھائے تھے۔ اور اپنے شرمناک رویوں سے انسانیت کو ذلیل کیا تھا۔ اس دور کے صوفیاء میں صحابہ کرام اور تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک بڑی تعداد تھی۔ جن میں ہر ایک علم کی مشعل فروزاں اور نور و ہدایت کا منبع تھا۔ جن کے نام زیادہ مشہور ہیں۔ وہ حضرت عبداللہ ابن عباس، حضرت عبداللہ ابن عمر، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عمرو بن عاص، حضرت اولیس قرنی، حضرت حسن بصری، حضرت مالک بن دینار، حضرت محمد واسع، حضرت حبیب عجمی، حضرت فضیل بن عیاض، حضرت ابراہیم ادھم وغیرہم شامل ہیں۔  
ان کی خصوصیات میں چار چیزیں شامل تھیں۔

- 1- خشیت الہی زیادہ تھی بمقابلہ حب الہی کے
- 2- حکومت کے ارباب سے لاتعلقی اور گریز
- 3- تالیف و تصنیف سے بے توجہی
- 4- گوشہ نشینی اور انفرادی طور پر عبادت و ریاضت میں انہماک اسلئے ان لوگوں نے توبہ اور تزکیہ نفس پر

زیادہ زور دیا۔

دور بنو عباسیہ، صوفیاء کا دوسرا طبقہ:-

یہ طبقہ عقلیت اور وصفیت سے بے زاری کا نتیجہ میں پیدا ہوا۔ اس دور کے مشہور صوفیاء میں ہم حضرت بابزید بسطامی، حضرت ذوالنون مصری، حضرت جنید بغدادی اور حضرت شیخ محی الدین ابن عربی کا نام پیش کر سکتے ہیں۔ خلفائے عباسیہ بالخصوص مامون الرشید کے سر پر یونانی فلسفہ اور حکمت کا بھوت سوار تھا۔

عقلیت کے بعد وصفیت کا سیلاب امنڈ آیا۔ نتیجتاً مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں انتشار پیدا ہو گیا۔ ذات و صفات باری تعالیٰ، خلق قرآن، جنت و دوزخ، معجزات، معراج غرضیکہ اس قسم کے سینکڑوں مسئلے فلسفہ و حکمت کی کسوٹی پر کسے جانے لگے۔ آیات قرآنیہ کی تاویل میں کی جانے لگیں۔ سوائے صوفیاء کرام کے اس دور میں اس فتنہ سے کوئی بچ نہ سکا۔ صوفیائے کرام اس فتنہ کے خلاف سید سکندری بنکر کھڑے ہو گئے۔ ان فتنوں کے خلاف نہ صرف آواز اٹھائی بلکہ اس کا علاج بھی تجویز کیا۔ اور وہ تھا۔ ”عشق“

فسوف یأتی اللہ بقوم یحبہم ویحبونہ (۸۲) پس اللہ تعالیٰ ایک قوم کو لائے گا کہ پیار کرتا ہے۔ ان کو اور پیار کرتے ہیں وہ اسکو۔

الغرض ان صوفیائے کرام نے عقلیت و وصفیت کا مقابلہ عشق سے کیا اور آخر میں ”خرد“ کا طلسم توڑ کر رہے۔

اس طبقہ کے صوفیاء کی دو خصوصیات تھیں اور ان کی وجہ سے انہوں نے اہل اسلام کو راستی کا درس دیا۔

1۔ ”عشق الہی“ پہلے دور کے صوفیاء نے حالات کے پیش نظر خشیت الہی پر زور دیا جبکہ ان حضرات نے ماحول کے پیش نظر عشق الہی پر زور دیا اور اس طرح سے عقلیت و وصفیت کے طلسم کو توڑ کر رکھ دیا۔

2۔ فلسفہ و حکمت کے پیدا کردہ ذہنی انتشار اور لامرکزیت کو قلب کی طاقت سے دور کیا۔

اس سلسلہ میں حضرت معروف کرخی نے اشراق پر زور دیا۔ حضرت سری سقطی نے توحید کا نظریہ پیش کیا۔ اور

حضرت ذوالنون نے حال و مقام پر بحث کر کے اس فتنہ پر قابو پانے کی کوشش کی۔

صوفیاء کا تیسرا طبقہ:-

جب اسلامی فتوحات کی وسعت کے بعد اجتہاد اور استنباط کی ضرورت لاحق ہوئی۔ تو اس کو امام ابو حنیفہؒ نے

780-855ء کے دوران اپنی دینی بصیرت سے پورا کیا اور مختلف فقہی مسائل کی تدوین کر کے چار مسالک کی بنیاد ڈالی

لیکن اس کے بعد سب سے بڑی خرابی یہ پیدا ہوئی کہ لوگوں نے فقہی مسائل میں حیلہ بازی کا دروازہ کھول دیا۔ اس فتنہ سے ٹکرانے کے لئے صوفیاء کا گروہ پھر آگے بڑھا۔ اور دینی عقائد کو بچانے کے لئے سرتن کی بازی لگادی۔ انگلستان کے پروفیسر H.A.R. Gibbs نے ایک مرتبہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں لیکچر دیتے ہوئے کہا تھا۔

”تاریخ اسلام میں بار بار ایسے مواقع نظر سے گزرتے ہیں جس میں اسلام کے کلچر کو مٹانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن وہ مغلوب نہ ہو سکا کیونکہ ٹھیک اسی دم صوفیاء کا گروہ اسکی مدد کو آ جاتا اور اپنے انداز فکر سے اس تن بیمار میں اتنی قوت اور توانائی بخش دیتا تھا کہ ساری طاقتیں اس کے سامنے عاجز آ جاتی تھیں۔“

اس دور کے صوفیاء کرام کی پہلی خصوصیت تزکیہ قلب اور اصلاح باطنی کی طرف زور دینا تھا۔ اور عملی اقدام کر کے لوگوں کو صحیح راہ دکھانا تھا۔

درکنز و ہوا یہ نہ تو اں دید خدا را

آئینہ دل ہیں کہ کتابے برازیں نیست۔

چنانچہ شیخ ابوسعید ابن العربی نے طبقات اور شیخ ابو محمد الخلدی نے حکایات الاولیاء اور ابو عبد الرحمن السلمی نے طبقات الصوفیین نے مرتب کر کے اس مقصد کی تکمیل کی۔

دوسری خصوصیت یہ تھی کہ صوفیائے نے شریعت اور طریقت میں پوری مطابقت ثابت کی اور ہر طرح دکھلایا کہ شریعت اور تصوف میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

چنانچہ شیخ ابوطالب مکی کی ”قوت القلوب“ شیخ ابوبکر کی کتاب ”التعارف لمذہب التصوف“ اور شیخ ابو نصر سراج کی کتاب ”اللمع“ اس بحث پر بڑی مدلل کتابیں ہیں۔ اس دور صوفیاء کی دوسری اور تیسری خصوصیت تصوف کی اصطلاحات کو وضع کرنا اور صوفیاء کا حلقے اور گروہ کا تصنیفی شکل میں وجود میں آنا ہے۔ جیسا کہ شیخ علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش نے اپنی مشہور تصنیف ”کشف المحجوب“ میں مندرجہ ذیل گروہوں کا ذکر کیا ہے۔

- |            |           |           |           |
|------------|-----------|-----------|-----------|
| 1- طیفوریہ | 2- قصاریہ | 3- نوریہ  | 4- محاسبہ |
| 5- تستریہ  | 6- حکمیہ  | 7- خرازیہ | 8- خفیضہ  |
| 9- سیایہ   |           |           |           |

گیارہویں صدی عیسوی کے صوفیاء کی فکری و عملی کاوشیں:-

اس دور کے پانچ قابل ذکر صوفیاء ہیں۔ جنہوں نے مسلمانانِ عالم کو صحیح راہ پر قائم رکھنے کے لئے فکری اور عملی

کوششیں جاری رکھی ہوئیں تھیں۔

## 1- شیخ ابونعیم اصبہانیؒ:-

شیخ ابونعیم احمد بن عبد اللہ بن اٹحق اصبہانی المتوفی 1308ء شافع المذہب بزرگ تھے۔ ان کی تصنیف حلیۃ الاولیاء اس حیثیت سے بہت اہم ہے کہ انہوں نے ہزاروں صوفیاء کی علمی و فکری کاوشوں کے علاوہ دیگر کارنامے لکھے اور دس جلدوں میں مرتب کی ہے۔ ابن جوزی نے اس کا خلاصہ پانچ جلدوں میں کیا ہے۔

## 2- شیخ ابوالقاسم القشیریؒ:-

شیخ ابوالقاسم ابن ہوازن القشیری المتوفی 1074ء یوں تو بہت ساری کتابوں کے مصنف ہیں لیکن ان کا رسالہ قشیریہ فن تصوف میں بہت اہم ہے۔ اس کے پڑھنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ گیارہویں صدی عیسوی تک فن تصوف میں کتنی اصطلاحات وضع ہوئی تھیں۔

## 3- شیخ علی ہجویریؒ:-

شیخ علی ہجویریؒ کشف المحجوب کے مصنف ہیں۔ جو کہ فن تصوف میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں داتا گنج بخشؒ نے شریعت اور تصوف میں قربت اور یکسانیت دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اور اپنے فکری اور عملی انداز میں تصوف پر اعتراضات کو رفع کیا ہے۔

## 4- شیخ عبد اللہ انصاری ہرویؒ:-

شیخ عبد اللہ انصاری ہروی المتوفی 1080ھ بہت مشہور صوفی اور محدث تھے مسلک کے لحاظ سے امام احمد بن حنبلؒ کے پیرو تھے۔ انکی بہت اہم چار تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔ جو صوفیائے کرام کے درمیان بے حد مقبول ہیں:

1- منازل السائرین 2- طبقات الصوفیاء

3- کتاب جامع الکلام 4- مناجات

ان کے ذریعے انہوں نے اپنے فکر و عمل کی تبلیغ کی۔

## 5- شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ:-

المتوفی 1047ء گیارہویں صدی عیسوی کے بہت بڑی صوفی شاعر تھے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ کسی تحریک کی

تبلیغ اور پرچار کا جتنا بھرپور اور وسیع پیمانہ پر نظم کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ نثر کے ذریعے نہیں ممکن ہے۔ تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ شیخ ابوسعید ابوالخیر کی مناجات اور رباعیات نے علم کے فروغ میں بڑی مدد کی ہے۔

بارہویں صدی کے چھ ممتاز مشائخ کی فکری و عملی کوششیں:-

بارہویں صدی عیسوی کے ممتاز مشائخ میں حضرت امام غزالیؒ، حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ نجیب الدین عبدالقادر سہروردیؒ، حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، حضرت نجم الدین کبرئیؒ فردوسی خاص قابل ذکر ہیں۔

### 1۔ امام غزالیؒ:-

مشائخ متقدمین مثلاً شیخ قشری ابوطالب مکی وغیرہم نے اس وقت تک جو کچھ لکھا تھا امام غزالیؒ نے ان سب کو جذب کر کے اپنی گرانقدر تصنیف احیاء العلوم والدین کو مدون کیا۔ امام صاحب کی ابتدائی زندگی فلسفہ و حکمت کی شنواری میں گزری تھی مگر جب آنکھ کھلی تو انہوں نے المنقذ من الضلال لکھ کر خرد پر عشق کی برتری ہی صرف ظاہر نہیں کی بلکہ فلسفہ و حکمت کی بچا رگی اور بے حاصلیت کا بھی پول کھول دیا۔

### 2۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ:-

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنے فکر و عمل سے اصلاح و تربیت کے بڑے بڑے کام سرانجام دیے۔ شیخ جیلانیؒ کی دو مشہور تصانیف غنیۃ الطاہرین الفیوضات الربانیہ کے علاوہ موعظ حسنہ کے دو مجموعے فتوح الغیب اور فتح الربانی بھی ہیں۔ ان کی علمی تصانیف نے جہاں علم تصوف کو مالا مال کیا وہاں ان کے موعظ حسنہ نے تصوف میں جان ڈال دی اور اس میں ایک شان پیدا کر دی۔

### 3۔ شیخ نجیب الدین عبدالقادر سہروردیؒ:-

آپ علوم ظاہری و باطنی دونوں کے معلم تھے۔ انہوں نے ایک طرف جہاں تصفیہ قلوب و تزکیہ نفس کی طرف زور دیا وہاں علم دین کے درس و تدریس کی طرف بھی توجہ کی۔ ابن خلقان نے آپ کے اس شغف کے بارے میں لکھا ہے کہ

طہرت برکتہ علی تلامذہ آپ کی برکت تلامذہ میں ظاہری ہو گئی۔

#### 4- شیخ محی الدین ابن عربی:

شیخ اکبر نے اپنے فکر و عمل سے بہت بڑی علمی خدمت کی ہے۔ آپ کی تصانیف کی تعداد پانچ سو بتائی جاتی ہے۔ مگر اس وقت ڈیڑھ سو کے لگ بھگ تصانیف موجود ہیں۔ لیکن ان سب میں فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ سب سے اہم ہیں۔ اس لئے کہ ان دونوں میں شیخ کے عقائد و نظریات کا نچوڑ ملتا ہے۔

#### 5- شیخ شہاب الدین سہروردی:

آپ حضرت جنید بغدادی کے مکتب خیال سے متاثر تھے۔ محی الدین ابن عربی کے ہم عصر تھے۔ دونوں مختلف الخیال ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی بہت عزت کیا کرتے تھے۔

آپ کی مشہور تصنیف عوارف المعارف تھے۔ اس میں تصوف کے بنیادی اعتقادات - خانقاہوں کی تنظیم وغیرہ پر وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ حضرت نجم الدین کبریٰ نے کہا تھا کہ جس نے یہ کتاب نہیں پڑھی وہ صوفی نہیں ہو سکتا۔

#### 6- حضرت نجم الدین کبریٰ:

آپ کو ان کی بزرگی عظمت اور کرامات کی بناء پر ولی جراث و سہر تراش بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت ابونجیب ضیاء الدین سہروردی کے مرید تھے اور خلیفہ تھے۔ مناقب الاصفیاء میں حضرت مخدوم شعیب فردوسی نے حضرت نجم الدین کبریٰ کے علم و فضل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عربی فارسی نظم و نثر میں ان کی بہت سی تصانیف ہیں جن میں تبصرہ اور رسالہ بہت اہم ہیں۔

#### بارہویں صدی عیسوی کے صوفی مشائخ کی فکری و عملی کاوشیں:

تصوف کا اصلی سرمایہ عشق ہے۔ اور عشق کی ترجمانی شاعر بہتر انداز میں کرتا ہے۔ علم تصوف کے فروغ میں صوفی شعراء کی فکری اور عملی کاوشیں درج ذیل شعراء کے کارناموں سے بہتر انداز میں معلوم ہوتی ہیں۔

#### 1- حکیم سنائی:

آپ شیخ ابو یوسف ہمدانی سے بیعت ہو کر گوشہ نشینی اختیار کی اور پھر ساری زندگی تصوف اور اخلاق کی خدمت میں گذاردی۔ مخلوق الہی کی اصلاح اور تربیت کے لئے علمی میدان میں اپنے فکر و عمل سے بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ جس کے ثمرات سے لوگ اب بھی مستفیض ہو رہے ہیں۔

حکیم سنائی قادر الکلام شاعر تھے۔ ایک کلیات کے علاوہ ان کی تصنیفات میں سات مثنویاں شامل ہیں۔ حدیقہ

سیرالعباد، کارنامہ بلخ، طرقتہ التحقیق، عشق نامہ، عقل نامہ، بہرور و بہرام لیکن سوائے حدیقہ کے تمام ناپید ہیں۔ تصوف کے اسرار و معارف جس انداز میں بیان کئے گئے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

## 2۔ خواجہ فرید الدین عطارؒ:-

خواجہ صاحب نے تصوف کی اس زمین کو آسمان بنا دیا۔ انہوں نے قصیدہ رباعی، غزل تمام اصناف میں شاعری کو تصوف سے مالا مال کر دیا۔ ان کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔ علم تصوف میں جس طرح انہوں نے اپنے فکر و عمل سے خدمت کی ہے۔ مولانا رومیؒ بھی ان کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکے۔

## 3۔ نظامی گنجویؒ:-

حضرت نظامی گنجویؒ درباری شاعر ہوتے ہوئے بھی علم تصوف کے میدان میں اپنے فکر و عمل سے طبع آزمائی کی اور بھرپور کوشش کی تاکہ لوگوں کی اصلاح ہو۔  
فخرن الاسرار میں انہوں نے خالص اخلاق شاعری کی ہے۔

## تیرہویں صدی کے چند مشائخ کے عملی میدان میں فکری و عملی کارنامے:-

تیرہویں صدی کے مشائخ میں جہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتی، حضرت سیف الدین باخرزی، حضرت بدرالدین سمرقندی، بابا کمال جنید خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ وہاں صوفی شعراء میں عراق، اوحدی، شیخ سعدی اور مولانا رومی ناقابل فراموش ہیں۔

حضرت سیف الدین باخرزی اور شیخ بدرالدین سمرقندی کی خدمات اور تنظیم سے جہاں سلسلہ فردوسیہ نشوونما پایا اور دنیا کو رشد و ہدایت کا راستہ دکھایا۔

1۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے سلسلہ چشتیہ کو پورے ملک ہندوستان و پاکستان میں پھیلایا گم گشتہ راہ انسانوں کو صراط مستقیم تک پہنچایا خواہ غریب نواز کی وجہ سے سلسلہ چشتیہ کو جو عروج حاصل ہوا ایسا کسی سلسلہ کو حاصل نہ ہوا۔ کوئی شہر ایسا نہیں جہاں آپ کے خلفاء اور ان کے مریدین رشد و ہدایت کا کام نہ کر رہے ہوں اور اپنے فکر و عمل سے بھٹکی ہوئی انسانیت کو علم سے سیراب کر رہے ہیں۔ اسی طرح صوفی شعراء نے بھی اپنے دور کے انسانوں بلکہ ساری کائنات کو متاثر کیا۔

## 2۔ عراقیؒ:-

عراقی حضرت شاہ زکریا ملتانی سے سیراب ہو کر بیعت ہوئے اور پھر تصوف کے عملی میدان میں غرتاب ہو گئے۔

شاہ زکریا ملتانی نے ان کے شعروں کو سن کر فرمایا ”وہ تو منزل پر پہنچ گیا“۔ پھر طلب کر کے نہ صرف بیعت کیا بلکہ اپنا داماد بھی بنا دیا۔ ان کی مشہور تصنیف لمعات ہے۔ یہ اٹھائیں لمعوں پر مشتمل ہے۔

### 3۔ اوحدی:-

اوحدی کی مشہور نظم جام جم ہے۔ جس کی شہرت کے بارے میں دولت شاہ نے لکھا ہے کہ اس نظم کے لکھے جاتے ہی اس کی چار سو نقلیں تیار ہو گئیں۔ ان کی مجمع الصفحاء تقریباً سات ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ تصوف پر بہت کام کیا۔ لوگوں کی اصلاح اور تربیت کے لئے اپنے فکر و عمل سے عظیم کام کئے جو رہتی دنیا تک یاد رہیں گے۔

### 4۔ شیخ سعدی:-

ان کی زندگی کے 3 حصے ہیں۔ پہلا حصہ تعلیم، دوسرا حصہ سیاحت میں اور تیسرا حصہ عبادت و ریاضت میں گزرا علوم ظاہری ابن جوزی کے شاگرد ہوئے اور علوم باطنی شیخ شہاب الدین سہروردی کے شاگرد ہیں۔ نہایت عاشق رسول ہیں۔ ہر شعر ان کا عشق میں ڈوبا ہوا ہے۔

بالغ العلیٰ بکمالہ      کشف الدجی بجمالیہ  
حسنت جمیع خصالہ      صلوا علیہ وآلہ

آخری مصرعہ تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اس سے اندازہ فرمائیں کہ وہ کس فکر اور عمل کے مالک ہوں گے۔ اور اس عظیم عاشق رسول نے علم کے میدان میں بنی نوع انسان کی اپنے فکر و عمل سے کس قدر خدمت کی ہوگی۔

### 5۔ مولانا رومی:-

ابتدائی میں علوم ظاہری میں کمال حاصل کیا۔ بہت بڑے جید عالم دین تھے۔ مثنوی کی صورت میں قرآن کا ترجمہ اور مفہوم واضح کیا۔ حضرت شاہ شمس تبریزی کی ذرا سی تنبیہ سے دل کی دنیا کی کایا ہی پلٹ گئی۔ پھر ساری زندگی تصوف کے میدان کے سرخیال بن کر اپنے فکر و عمل سے بھنگی ہوئی انسانیت کی خدمت کرتے رہے اور آج تک بلکہ قیامت تک لوگ ان کے کلام سے مستفیض ہوتے رہیں گے۔



## 6۔ ہندوستان میں چودہ سلاسل کے علمبرداروں نے اپنے فکر و عمل سے علم تصوف کی خدمت کی:-

ان چودہ سلاسل میں سے سب سے زیادہ سلسلہ چشتیہ کو عروج حاصل ہوا ہے۔ اگرچہ سب سلاسل سے وابستہ صوفیاء نے اپنی بساط کے مطابق روحانی علمی طور پر سیراب کیا مگر جو تنگی سلسلہ چشتیہ نے بجھائی وہ انہی کا طرہ امتیاز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو نائب رسول فی اللہ کا خطاب ملا۔

الغرض تمام صوفیائے کرام نے روحانی اور علمی اعتبار سے مسلمانان عالم کو اپنے فکر و عمل سے سیراب کیا۔ اور ہر دور میں جب بھی سیاسی نظام اور سماجی نظام کی خرابیاں آڑے آئیں تو روحانیت کے علمبرداروں نے اپنے علم اور روحانیت سے انسانیت کی ڈوبتی ناؤ کو پار لگایا۔

صوفیائے کرام نے ہر ماحول میں ہر خرابی کی نشاندہی کی اور اپنی نگاہ سے اپنی سوچ سے اپنی فکر اور عمل سے اس خرابی کا علاج کر کے جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ جیسی خرابی دیکھی اور جیسا مرض دیکھا اس کے مطابق علاج کیا۔ اور شیطانیت کے علمبرداروں کے منصوبے خاک میں ملا دیے۔

## فکر و عمل:

اسلامی ریاست دراصل مذہبی اقلیتوں کی الگ حیثیت کو تسلیم کرتی ہے اور پھر ان کے الگ تشخص کو برقرار رکھنے پر زور دیتی ہے۔ اس طرح عملی طور پر وہ ان کے حقوق کے تحفظ کی بہتر ضمانت فراہم کرتی ہے۔ جدید مغربی ذہن ملک کے شہریوں کے اندر مذہبی یا کسی اور بنا پر امتیازات کو حقیقی آزادی کے منافی خیال کرتا ہے۔ لیکن اگر ماضی کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عملی طور پر موجودہ صدی میں بھی یہ امتیازات کسی نہ کسی شکل میں موجود رہے ہیں۔ بلکہ نام نہاد ترقی یافتہ اقوام نے آزادی اور مساوات کے دعووں کے باوجود اپنی اقلیتوں پر ظلم ڈھائے ہیں۔ کسی ملک میں مذہبی اقلیتوں کے حقوق غصب کئے گئے تو کسی دوسرے میں نسلی امتیازات روا رکھ کر نسلی اقلیتوں پر ظلم ڈھائے گئے۔

جدید قومی ریاستوں Nation States کی حالیہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مملکت کی سیکولر اساس کے باوجود جدید قومی ریاستیں یہ تاثر دینے کی کوشش کرتی ہیں کہ ان کے ہاں تمام شہریوں سے مساویانہ سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ ماضی میں بھی اقلیتوں کو بنیادی حقوق سے محروم کیا جاتا رہا۔ حتیٰ کہ بعض سیاسی مفکروں نے بھی چند امتیازات کی بنا پر بعض طبقات کو حقوق شہریت سے محروم کرنے کا جواز پیش کیا۔ ارسطو نے غلاموں کو شہری کا درجہ دینے کے خلاف

دلائل دیئے۔ انگریز مفکر لاک Lock نے رومن کیتھولک فرقہ کو حقوق شہریت سے محروم کرنے کا جواز ڈھونڈ نکالا۔ موجودہ صدی میں ہٹلر نے یہودیوں کو عام شہری کا درجہ دینے سے محروم رکھا۔ (۸۳)

## فصل چہارم

### صوفیاء کے افکار کی روشنی میں مقاصد علم کا تعین

صوفی کی زندگی قرآن و سنت سے عبارت ہوتی ہے۔ جب تک وہ اسوہ حسنہ رسول مقبول پر عمل پیرا نہ ہو صوفی ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ طریقت اور شریعت آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ جب یہ بات واضح ہو گئی کہ صوفی کا عمل قرآن اور سنت سے ہٹ کر نہیں ہو سکتا تو لامحالہ ان کے افکار کی روشنی میں عمل کے مقاصد وہی ہوں گے جو قرآن نے بیان کیے ہیں۔ اور حضور ﷺ نے بیان فرمائے۔ آئیے دیکھتے ہیں کہ قرآن نے مقاصد تعلیم و علم کے بارے میں کیا بیان فرمائے ہیں۔ مندرجہ ذیل آیات قرآنی علم اور تعلیم کے چند اصولی مقاصد کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔

1- یعلم مافی البر و البحر (۸۴) وہ جانتا ہے اس کو بھی جو خشکی میں ہے اور اس کو بھی جو تری میں ہے۔

2- و علم آدم الاسماء کلھا - (۸۵) اور اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھا دیے۔

3- وما اوتیتہم من العلم الا قلیلا (۸۶) تمہیں جو کچھ علم دیا گیا وہ بہت ہی تھوڑا ہے۔

4- ومن یوتی الحکمة فقد اوتی خیرا کثیرا جسے علم و فہم کی دولت ملی اسے بڑی بھلائی کا حصہ ملا۔ (۸۷)

5- انما یشی اللہ من عبادہ العلماء - (۸۸) اللہ سے وہی ڈرتے ہیں جو صحیح معنوں میں عالم ہیں۔

6- یتلوا علیہم آیاتک و یعلمہم الکتاب (اے اللہ! ایسا پیغمبر مبعوث فرما) جو ان کے سامنے تیری آیات کی تلاوت کریں۔ کتاب کی انہیں تعلیم دیں۔ حکمت سکھائیں اور تزکیہ نفس کریں۔ (۸۹)

7- یرفع اللہ الذین امنوا منکم والذین اوتوا اللہ تعالیٰ تم میں سے مومنین کے درجے اور اہل علم کے العلم درجت (۹۰) درجے بلند کرے گا۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو مندرجہ بالا سات آیات قرآنیہ سے اسلامی نظام تعلیم و تربیت کے سات اصول مقاصد اخذ ہوتے ہیں۔ جو علی الترتیب بیان کیے جاتے ہیں۔

پہلی آیت سے یہ اصول اخذ ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا علم بحر و بر ہر چیز پر حاوی ہے۔ اور اس کی ذات ہی علم و عرفات کا اولین سرچشمہ ہے۔

دوسری آیت سے یہ راہنمائی ملتی ہے کہ علوم و معارف کو سیکھنے کی استعداد اللہ تعالیٰ نے ہی انسان کو بخشی ہے۔ تیسری آیت سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ انسان کا عمل محدود ہے پس اُسے اپنی عقل کو وحی الہی کا تابع بنا دینا چاہیے۔ چوتھی آیت یہ نکتہ ہاتھ آتا ہے کہ علم اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت و عنایت ہے پس انسان کو اس کا شکر گزار اور فرمانبردار بندہ بننا چاہیے۔

پانچویں آیت اسلامی نظام تعلیم کی بنیادی غایت کو متعین کرتی ہے۔ اور وہ ہے خشیت الہی! بالفاظ دیگر خدا کی رضا کی طلب اور اس کی ناراضگی کا ڈر۔

چھٹی آیت ہمیں یہ بتلاتی ہے کہ تعلیم کا ایک بڑا مقصد انسانی اخلاق و کردار کو سنورانا ہے۔ دوسرے الفاظ میں قلب انسانی کا تزکیہ تعلیم کی اہم ترین غایت ہے۔

ساتویں آیت سے یہ سبق ملتا ہے کہ صحیح علم و عرفان قرب الہی کا وسیلہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں علم بجا خود مقصود نہیں بلکہ ان اعلیٰ مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے جن کا تعین اللہ اور اس کے رسول نے کر دیا ہے۔

احادیث نبوی کے آئینہ میں مقاصد علم صوفیائے کرام نے بیان کیے صوفیائے کرام نے بتایا کہ معلم انسانیت نے علم اور تعلیم دونوں کے پست مقاصد کی بھی خود نشان دہی فرمادی ہے اور اس کے اعلیٰ مقاصد بھی خود ہی وضاحت سے بیان فرمادیے ہیں۔ پہلے پست مقاصد کا ذکر کیا جاتا ہے۔ (۹۱)

### پست مقاصد:-

ہادی اعظم نے تعلیم و تعلم کے جن مقاصد کو مذموم (ناپسندیدہ) قرار دیا ہے۔ وہ یہ ہیں۔

### 1۔ علمی وجاہت کا خبط:-

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ علم اس لئے حاصل نہ کرو کہ علماء پر فخر بتلاؤ اور مجلس میں اونچی جگہ بیٹھو جو کوئی ایسا کرنا ہے اس کے لئے دوزخ ہے۔ (۹۲)

## 2. علمی شہرت کی ہوس:-

سید المرسلین ﷺ کا ارشاد ہے جس شخص نے اس غرض سے علم حاصل کیا کہ وہ اس کے ذریعے علماء سے مناظرہ کرے گا یا لوگوں سے جھگڑے گا یا لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ اسے دوزخ میں داخل کرے گا۔ (۹۳)

## 3. متاع دنیا کی طلب:-

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے ایسا علم سیکھا جس سے خدا کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے تو بہتر ہے لیکن اگر اس غرض سے سیکھا کہ وہ اس سے دنیا کی متاع حاصل کرے گا تو قیامت کے دن اس کو جنت کی خوشبو میسر نہ آئے گی۔ (۹۴)

اسی طرح عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ صاحب علم زیادہ سے زیادہ رحمن کی رضا حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔ (۹۵)

## 4. علم غیر نافع:-

ارشاد نبوی ہے:-

قیامت کے دن سب سے سخت عذاب اس عالم پر ہوگا جس نے علم سے فائدہ نہ اٹھایا۔ (۹۶)

اسی طرح فرمایا۔ علم نافع کی آرزو کرو اور علم بے فائدہ سے پناہ مانگو۔ (۹۷)

خود رسول اکرم ﷺ دعا کیا کرتے تھے۔ اے اللہ! مجھے علم نافع، رزق طیب اور علم مقبول عطا فرما۔ (۹۸)

ان تینوں احادیث کا منشاء یہ ہے کہ انسان کے علم و عمل میں ربط ہونا چاہیے۔ بے عمل انسان کا علم اس کے لئے سرے سے

مفید نہیں بلکہ قیامت کے دن اس کے خلاف حجت بنے گا اور وبال جان ثابت ہوگا۔

## علم و تعلیم کے اعلیٰ مقاصد

مرکی اعظم نے علم کے مندرجہ ذیل مقاصد کو پسندیدہ قرار دیا ہے۔

## 1- خشیت الہی اور رضائے الہی:-

آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ علم حاصل کرو کیونکہ علم کا سکھانا خشیت الہی ہے اور اس کا سیکھنا

عبادت ہے۔ (۹۹)

نیز فرمایا علم سکھنے کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی ہے۔ (۱۰۰)

## 2- دنیا سے بے زاری اور اخلاقی بلندی:-

ارشاد نبوی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو جس بندے کی بھلائی منظور ہوتی ہے اس میں تین وصف پیدا کر دیتا

ہے۔ دین کا علم و فہم دنیا سے بیزاری اور اپنے عیوب کی پرکھ۔ (۱۰۱) دوسرا فرمان رسول ﷺ ہے۔

جب تم بندے کو دیکھو کہ اس کو دنیا سے بے رغبتی ہے اور کم گوئی کی عادت پڑ گئی تو اس کے قریب ہو جاؤ کیونکہ

اسکو حکمت دی جاتی ہے۔ (۱۰۲)

## احیائے دین کے لئے تحصیل علم:-

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔ جو کوئی اس لئے میرے قول کو نقل کرے کہ اللہ کا دین سر بلند ہو اس کا مقام جنت ہے۔

(۱۰۳)

آپ کا دوسرا ارشاد ہے۔

جس کو اس حالت میں موت آگئی کہ اسلام کے زندہ کرنے کے لئے علم حاصل کر رہا تھا اس کے اور نبیوں کے

## مقاصد علم کا تعین

درمیان ایک درجے کا فرق ہوگا۔ (۱۰۴)

## صحابہ کرام کی نظر میں

صحابہ کرام اور صوفیاء کرام کے مقاصد علم بھی وہی ہوں گے جو قرآن و حدیث نے بتلائے ہوں گے۔ ان کے

اقوال درج ذیل ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ یہ مقدس ہستیاں علم و تعلیم کے ادنیٰ و اعلیٰ غرض دونوں مقاصد سے پوری طرح

آگاہ تھے اور انہوں نے اعلیٰ مقاصد کے حصول کی غرض سے ہی اشاعت علم میں دلچسپی لی۔

1- حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے جب کسی عالم کو دیکھو کہ دنیا سے محبت رکھتا ہے تو دین کی بات میں اس کا اعتبار نہ کرو۔

2- حضرت عباسؓ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی کہ اے فرزند! ریاکاری، بحث و مباحثے اور فخر و مباہات کے لئے علم نہ سیکھنا۔

3- حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد ہے۔ بہت سی حدیثیں یاد کر لینا علم نہیں۔ علم تو خوف خدا کا نام ہے۔

4- حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے۔ اے حاملین قرآن و احکام قرآن پر عمل کرو۔ عالم وہی ہے جو علم حاصل کرنے کے بعد

اس پر عمل کرے۔

5- حضرت ابوذر غفاریؓ فرمایا کرتے تھے۔ یہ حدیثیں محض رضائے الہی کے لئے حاصل کی جاتی ہیں۔ ورنہ کوئی ان سے

دنیا چاہے گا تو جنت کی مہک نہ پائے گا۔

6۔ ام دہداء فرمایا کرتی تھیں اصل ترین علم معرفت الہی ہے۔

7۔ حضرت ابن عباس کا ارشاد ہے اگر اہل علم اپنے علم کی عزت کرتے اور اپنا عمل اس کے مطابق رکھتے تو خدا کے فرشتے اور صالحین ان سے محبت کرتے لیکن انہوں نے اپنے علم کو دنیا کمانے کا ذریعہ بنا لیا اس لئے خدا بھی ان سے ناراض ہو گیا اور مخلوق میں بے وقعت ہو گئے۔

یہاں تک قرآن و حدیث اور اقوال صحابہ کی روشنی میں علم کے مقاصد کی نشاندہی کی ہے۔ اب چند نامور صوفی اور مفکر اسلام ماہرین تعلیم کے افکار و نظریات نقل کرتے ہیں۔ (۱۰۵)

### صوفیاء کے کردار کا ناقدانہ جائزہ:-

صوفیاء کا عمل شریعت سے ہٹ کر نہیں۔ بلکہ شرعی احکام و مسائل کے ضمن میں لوگوں کے اندر آمادگی اور شوق ابھارنا صوفی کا اصل کام ہے۔ یوں تو نماز ادا کئے ارکان کے ساتھ مکمل ہو جاتی ہے۔ لیکن صوفی حضور قلب پیدا کرنا چاہتا ہے۔ روزے کے ساتھ ضبط نفس کا اہتمام صوفی کا منشاء ہے۔ زکوٰۃ ادا کرتے وقت سب کچھ خدا کی راہ میں لٹا دینے کا عزم صوفی کے پیش نظر ہوتا ہے۔ صوفی حج کو دنیا کے غیر ضروری مشاغل اور جھنجھٹوں سے آزاد کر دینے کا ذریعہ بنا دینا چاہتا ہے۔ اسی طرح دیگر تمام فرائض و واجبات کے سلسلہ میں تصوف کی نظر اس کی اصل غایت اور روح پر ہوتی ہے۔

صوفی قرآن اور اسکی تفسیر کے ضمن میں محض شان نزول اقسام وحی، تقسیم سور، ناسخ و منسوخ، آیات مکیہ و مدینہ، تاویل و تعبیر، حروف مقطعات اور محکمات و متشہبات کے علم کو کافی نہیں سمجھتا جب تک کہ روح قرآن دل میں نہ اتر جائے۔ وہ ایسے محدثین چاہتا ہے جو احادیث کے ضعیف و قوی، صحیح و حسن اور ناسخ و منسوخ جاننے کے ساتھ ساتھ مزاج شناس رسول ہوں تاکہ اطاعت میں محبت کی کیفیت پیدا ہو جائے۔

صوفی اصل میں فقہاء نہیں سمجھتا ہے جو نرے طہارت و وضوء، بیع و شراء، قرض و رہن اور لعان و طہار کے مسائل ہی نہ جانتے ہوں بلکہ انہیں دین کی حکمت سے پوری واقفیت ہو اور دل و جان سے اس علم پر عمل کرنے والے ہوں۔

اور اسی طرح صوفی کا فلسفے اور علم کلام کے ضمن میں بھی اپنا ہی مزاج ہے مگر اسلامی حکومت کی حدود میں وسعت پیر و کاروں کی ان گنت تعداد، مختلف ملکوں کے تمدن کے اثرات، دیگر قوموں کی عادات اور مقامی رسوم و روایات کی وجہ سے مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے پر مختلف اثرات مرتب ہوئے۔ نتیجے کے طور پر صورت میں تو چنداں تبدیلی نہ آئی البتہ

معنی بدل گئے۔ یوں تو مسلمانوں میں اچھے جرنیل بھی تھے، مفسر اور محدث بھی، متکلم بھی اعلیٰ درجے کے اور مناظر بھی بلند پایہ، فقہاء کی کمی بھی نہ تھی اور سیاستدانوں کی بھی لیکن معیاری انسان کم سے کم تر ہوتے چلے گئے۔ ایسے انسان جن میں تقویٰ، اخلاص، مروت، صبر، سماحت، قنوت، انکساری، بذل و سخا، سوز و گداز، انقی و لطف، عفو و درگزر، للہیت، قناعت، صدق، سادگی، توکل اور تسلیم و رضا کے اوصاف بدرجہ فہم ہوں کہ یہی معراج انسانیت اور مقام آدمیت ہے۔

صوفی کو تصوف کو باقاعدہ ایک ادارے اور تحریک کی شکل دینے کی ضرورت محض اس لئے پیش آئی کہ وہ متذکرہ صدر کام سرانجام دے کہ جو شخص جیسا اور جس شعبے میں ہے وہیں رہے لیکن اس میں بنیادی انسانی اوصاف و خصوصیات اور اخلاق فاضلہ کا ہونا سب سے اہم چیز ہے۔

صوفی نے جو بھی خدمات سرانجام دیں اور جس شعبے میں اپنے اثرات چھوڑے اس سے یہ تو نہیں ہوا اور نہ صوفی اس کا دعویدار ہے کہ تفسیری نکات اور محدثانہ اصطلاحات میں اضافہ ہوا ہو۔ فقہی ابواب کی از سر نو ترتیب ہوئی ہو۔ علم کلام کے نئے ادارے وجود میں آئے ہوں۔ البتہ اس سے افکار بہت ہی دشوار ہے کہ صوفی نے دنیا کو مخلص، بے ریا، باخدا، متواضع، راستباز، دردمند، غیور و جسور، متوکل، متانفع، صابر و شاکر سادہ اور ایثار پیشہ انسان مہیا کیے ہیں۔

مختلف علوم و فنون پر جب ہزاروں کتابیں لکھی گئیں اور لکھی جانے لگیں لیکن ان کا انسانی اخلاق سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ انہیں داد تحقیق ہی دی جاسکتی تھی تو صوفیاء نے اُسے عبث کام سمجھتے ہوئے لوگوں کو ہدایت کے بنیادی سرچشموں یعنی قرآن و حدیث کی تعلیمات سے روشناس کرایا۔ ایک محقق جب کتاب لکھتا ہے تو ان مسائل کی تحقیق و جستجو کرتا جبر و قدر، خلق قرآن، ملائکہ اور جنات کا وجود، جنت کی ماہیت، رفع عیسیٰ، ولادت مسیح اور ایسے ہی دیگر مسائل، لیکن صوفیاء نے ان مسائل کے مقابلے میں توبہ و انابت، زہد و ورع، خشوع و خضوع، تسلیم و رضا، صبر و شکر، توکل علی اللہ، عجز و انکسار، فقر و قناعت، عزم و استقامت، ایثار و اخلاص، صدق و صفا، خوف و خشیت اور حکمت و بصیرت ایسے مضامین کو اپنی کتابوں کی زینت بنایا۔

اب یہ ہر معقول شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ انسانیت کو کن مضامین اور ایک معیاری انسان بننے کے لئے کن مسائل کی ضرورت ہے۔ (۱۰۶)

## صوفیاء کے افکار کی روشنی میں مقاصد علم کا تعین

- 1- حضرت حسن بصریؒ کا فرمان ہے کہ ان لوگوں میں سے نہ ہو کہ علم اور نظرافت کو مثل علماء اور حکماء کے رکھتے ہیں اور عمل میں بے وقوفوں کے برابر ہیں۔

2- حضرت ابراہیم بن عقبہ سے کسی نے پوچھا کہ لوگوں میں زیادہ مذمت کس کو ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ دنیا میں تو اس شخص کو ہوتی ہے جو ایسے شخص پر احسان کرے کہ اس کا مشکور نہ ہو اور موت کے وقت اس عالم کو ہوگی جس نے علم میں کوتاہی کی ہو۔

3- حضرت خلیل بن احمدؒ نے فرمایا کہ آدمی چار ہیں ایک وہ جو واقع میں جانتا ہے اور جانتا ہے کہ میں جانتا ہوں تو وہ شخص عالم ہے اس کا اتباع کرو۔ اور ایک وہ ہے کہ جانتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ وہ سونے والا ہے۔ اور اس کو ہوشیار کرو۔ اور ایک وہ کہ نہیں جانتا اور جانتا ہے کہ نہیں جانتا ایسا شخص ہدایت کے قابل ہے اس کو ہدایت کرو اور ایک وہ کہ نہیں جانتا اور یہ بھی نہیں جانتا کہ نہیں جانتا تو وہ جاہل ہے اس کو ترک کرو۔

4- حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ علم عمل کو پکارتا ہے اگر عمل نے ہاں کیا تو خیر ورنہ علم رخصت ہوتا ہے۔

5- حضرت عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں آدمی جب تک طلب علم میں رہتا ہے تو تب تک عالم ہوتا ہے اور جب یہ گمان کرتا ہے کہ میں جان چکا تب جاہل ہو جاتا ہے۔

6- حضرت فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں کہ مجھ کو تین شخصوں پر ترس آتا ہے۔ ایک وہ کہ اپنی قوم میں عزت رکھتا ہے مگر ذلیل ہو گیا۔ ایک وہ کہ قوم میں تو انگریز تھا اور مفلس ہو گیا اور ایک وہ عالم جس سے دنیا کھیل کرتی ہو۔

7- حضرت حسنؒ فرماتے ہیں کہ علماء کا عذاب دل کا مرجانا ہے اور دل کی موت یہ ہے کہ آخرت کے عمل سے دنیا کی طلب ہو۔

8- حضرت مسعود بن میتبؒ نے فرمایا کہ جب تم عالم کو دیکھو کہ وہ بات کو افشاء کرتا ہے تو وہ چور ہے۔

9- حضرت مالک بن دینار کا قول ہے کہ میں نے بعض پہلی کتابوں میں پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ عالم جب دنیا کی محبت کرتا ہے تو سب سے ادنیٰ امر میں اس کے ساتھ یہ کرتا ہوں کہ اپنی مناجات کی حلاوت اس کے دل میں سے نکال لیتا ہوں اور ایک شخص نے اپنے بھائی کو لکھا کہ تجھ کو علم عنایت ہوا ہے اپنے علم کے نور کو گناہوں کے اندھیرے سے مت بجھانا ورنہ جس روز اہل علم اپنے علم کے اجالے میں چلیں گے تو تو تاریکی میں رہے گا۔

10- حضرت یحییٰ بن معاذ رازیؒ فرماتے ہیں کہ جب علم اور حکمت سے دنیا طلب کی جاتی ہے تو ان کی جوت جاتی رہتی ہے۔

11- حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ علماء کی سزا دل کا مرجانا ہے۔ اور دل کی موت عمل آخرت کے عوض میں دنیا کا طلب کرنا ہے۔



12- حضرت سہل تستریؒ فرماتے ہیں کہ آدمی عالموں کے سوا سب مردے ہیں۔ اور عالم عالموں کے سوا سب متوالے ہیں اور عامل اخلاص والوں کے سوا سب مفاطلہ میں پڑے ہیں اور اخلاص والوں کو یہ ڈر ہے کہ ان کا انجام کیا ہوگا۔

13- حضرت ابوسلیمان دارائیؒ نے فرمایا کہ جب آدمی حدیث کو طلب کرے یا نکاح کرے یا طلب معاش کے لئے سفر کرے تو وہ دنیا کا مکمل ہو چکا اس میں ان کی غرض طلب حدیث سے اونچی سندیں طلب کرنی یا ایسی حدیث کی طلب کہ جس کی آخرت میں حاجت نہ ہو۔

14- حضرت یحییٰ بن معاذ رازیؒ علمائے دنیا کو یوں کہا کرتے تھے کہ علم والو! تمہارے محل قیصر کے سے ہوں گے اور مکانات کسریٰ کے سے اور کپڑے بہت ٹیپ ٹاپ کے اور موزے جالوت کی طرح کے اور سواریاں قارون کی طرح اور برتن فرعون کے سے اور گناہ ابوجاہل کی طرح کے اور مذہب شیطان کے ہیں تو شریعت محمدیؐ کہاں ہے۔

15- کسی شخص نے ایک عارف باللہ سے پوچھا کہ آپ کے نزدیک جس شخص کو گناہوں سے راحت ہوتی ہے کیا وہ خداوند تعالیٰ کو نہیں پہچانتا۔ انہوں نے فرمایا کہ میں اس بات میں شک نہیں کرتا کہ جس کے نزدیک دنیا بہ نسبت آخرت کے ترجیح رکھتی ہے وہ بھی خدائے تعالیٰ کو نہیں پہچانتا حالانکہ یہ شخص بہ نسبت پہلے شخص کے بہت کم ہے اور یہ مت گمان کرنا کہ مال کا ترک کرنا علمائے آخرت میں ملنے کے لئے کافی ہے اس لئے کہ جاہ کا ضرر مال سے زیادہ ہے۔

16- حضرت بشرؒ نے فرمایا کہ لفظ ”حدثا“ جو روایت کے لئے کہا جاتا ہے دنیا کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے جب تم کسی کو حدثا کہتے ہوئے سنو تو وہ یہ کہتا ہے کہ مجھ کو جگہ دو اور انہیں ولی کامل نے دس سے کچھ اوپر کتابوں کے بستے دفن کر دیے تھے اور کہتے تھے کہ مجھ کو خواہش ہے کہ حدیث بیان کروں اگر یہ خواہش جاتی رہے تو حدیث بیان کروں۔ اور ایک اور بزرگ کا قول ہے کہ جب تم کو خواہش ہو کہ حدیث کہوں تب خاموش رہو اور جب خواہش نہ ہو تب بیان کرو اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تعلیم اور ارشاد کا منصب ملنے جاہ کی لذت تمام دنیاوی لذتوں سے بڑھ کر ہے تو جو اپنی خواہش کو اس باب میں مانے گا وہ دنیا داروں میں سے ہوگا۔

17- حضرت فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ قیامت میں بت پرستوں سے پیشتر علمائے ہدکا حساب ہوگا۔

18- حضرت مالک بن دینارؒ فرماتے ہیں کہ عالم جب اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کرتا تو اسکی نصیحت دلوں پر ایسی رپٹ ہو جاتی ہے جیسے قطرہ آب چکنے پتھر سے ڈھل جاتا ہے۔ (۱۰۷)

## فصل پنجم

علم کے شعبے میں صوفیاء کے کردار کا ناقداً جائزہ

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبرانہ فریضہ کے متعلق ارشاد فرمایا

ويزكيهم و يعلمهم الكتاب والحكمة  
پیغمبر اُن ان پڑھ جاہلوں کو پاک و صاف کرتا اور ان کو  
کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔ (۱۰۸)

خود حضور ﷺ نے فرمایا بنی نوع انسان کے اخلاق کی درستگی کے لئے جدوجہد وہ کام ہے جس کے لئے پیغمبر  
مبعوث کئے گئے ہیں۔ اور میری بعثت کا مقصد بھی یہی ہے۔

بعثت لا تتم مکارم الاخلاق۔ (۱۰۹) میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں۔

بلکہ ایک مقام پر ارشاد فرمایا۔

بعثت معلماً۔ (۱۱۰) مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔

آپ عام معلمین کی طرح نہ تھے بلکہ معلم انسانیت تھے۔ نوع انسان کا ہر فرد ہمہ وقت یکساں طور پر فیض یاب  
ہوتا تھا۔ بلکہ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ صوفیائے کرام کے بارے ارشاد فرمایا۔

”میں ان لوگوں کو پہچانتا ہوں جو نہ نبی ہیں اور نہ شہید ہیں لیکن قیامت میں ان کے مرتبہ کی بلندی پر انبیاء اور  
شہداء بھی رشک کریں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا سے محبت ہے اور جن کو خدا پیرا کرتا ہے وہ اچھی باتیں بتاتے اور بُری  
باتوں سے روکتے ہیں۔ (۱۱۱)

ارشاد نبوی ہے کہ مسلمانوں میں کامل ایمان اُس کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے۔

اکمل المؤمنین ایماناً احسنهم خلقاً۔ (۱۱۲) تمام مذہبی عبادات کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان میں اچھے  
اخلاق پیدا ہوں۔

حدیث پاک میں ہے کہ جس کی نماز اس کی برائی اور بدی سے نہ روکے تو ایسی نماز اس کو خدا سے اور دور کر دیتی  
ہے۔ (۱۱۳) اور ایک جگہ فرمایا کہ انسان حسن خلق سے وہ درجہ پاسکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر عبادت کرنے

سے حاصل ہوتا ہے۔

ان الرجل لیدرک بحسن خلقه درجة قائم بے شک ایک شخص اپنے حسن اخلاق سے قائم الیل اور اللیل وصائم النهار (۱۱۴) صائم الدھر کا درجہ پالیتا ہے۔

صوفیاء کرام نے جو علم تصوف کی تعریفیں کی ہیں۔ ان کو ایک جگہ جمع کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اکثر تعریفیں ایسی ہیں جن میں تصوف کو اخلاق سے تعبیر کیا گیا ہے۔

صوفیائے کرام کے نزدیک تصوف کا مقصد یہ ہے کہ انسان خود اپنے اندر اچھے اخلاق پیدا کرے اور دنیا کے دوسرے بنے والوں کو اپنی نجاتوں اور آلودگیوں سے پاک و صاف کرے اور بنی نوع انسان کے ساتھ تعلقات میں شگفتگی پیدا کرنا، ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنا، برائی سے بچنا، بھلائی کی طرف بلانا یہ وہ کام ہیں جو عبادت سے زیادہ اہم ہیں۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ فرمایا کرتے تھے۔

”بہت نماز پڑھنا اور وظائف میں بکثرت مشغول رہنا، قرآن مجید کی تلاوت میں بہت مصروف رہنا یہ سب کام چنداں مشکل نہیں ہیں۔ ہر باہمت شخص کر سکتا ہے بلکہ ایک ضعیف بڑھیا بھی کر سکتی ہے۔ روزہ پر مداومت کر سکتی ہے۔ تہجد گزاری میں مصروف رہ سکتی ہے۔ قرآن مجید کے چند پارے پڑھ سکتی ہے لیکن مردانِ خدا کا کام کچھ اور ہی ہے۔“ (۱۱۵)

مشائخ متقدمین کی نظر میں علم تصوف اس اخلاقی پروگرام کا نام تھا جس میں اپنے نیز دوسروں کے اخلاق کی درستگی کو زندگی کا سب سے اہم فرض سمجھا جاتا تھا۔ حضرت شیخ ابوالحسن کا قول ہے۔

لیس التصوف رسوماً و لا علمو ماً ولكنہ تصوف نہ رسوم ہے نہ علوم بلکہ وہ تو اخلاق ہی ہے۔ اخلاق۔

حضرت شیخ محمد بن قصابؒ فرمایا کرتے تھے۔

التصوف اخلاق کریمہ ظہرت فی زمان کریم تصوف اخلاق کریمہ ہیں جو بہتر زمانہ میں بہتر شخص سے من رجل کریم مع قوم کریم۔ بہتر قوم کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔

حضرت محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب کا قول ہے۔

التصوف خلق فمن زاد عليك في الخلق تصوف خوش اخلاقی کا نام ہے یعنی جو شخص خلق میں تم سے زیادہ ہے۔ صوفی زیادہ ہوتا ہے۔ زاد عليك في التصوف

حضرت شیخ مرتضیٰ فرماتے ہیں۔

التصوف حسن الخلق تصوف خلق نیک کا نام ہے۔

حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی فرمایا کرتے تھے کہ تصوف راہِ صدق و اخلاقِ حسنہ کا نام ہے۔ صوفیائے کرام کے حالات زندگی اور تصوف کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اسلامی تصوف، نفوسِ انسانی کو مادی نجاستوں سے پاک کرنے اور اعلیٰ اخلاق و کردار پیدا کرنے کی ایک عظیم الشان تحریک تھی۔ خود علم سیکھا اور لوگوں کو علم کے زیور سے آراستہ فرمایا۔ تاریخ شاہد ہے کہ صوفی نے جس جگہ قدم رکھا وہاں پہلے خانقاہ بنائی پھر مسجد و مدرسہ تعمیر کیا پھر زندگی کے آخری سانس تک تعلیم و تعلم میں مصروف رہے۔ اور اس طرح سے کارنبوی کو جاری رکھا اور بنی نوع انسان کے اخلاق و اطوار، فکر و عمل کو درست کرنے کی کوششیں کیں۔

مشائخِ متقدمین کے ملفوظات، تعلیم و اخلاق کی سسبیل و کوثر ہیں۔ جن کی خاموش روانی دلوں کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتی ہے اور دلوں میں اچھے عمل کا جذبہ اور ولولہ جوش مارنے لگتا ہے۔ ان بزرگوں کی کوششیں صرف یہی نہیں تھیں کہ انسان کے ظاہری اعمال درست ہو جائیں بلکہ وہ چاہتے تھے کہ برائی کے سوت ہی بند ہو جائیں۔ انسان کا دل برائی کی طرف راغب ہی نہ ہو کہ دل کی نجاست جسم کی نجاست سے بدرجہا بڑی ہے۔ حضرت شیخ رکن الدین ملتانی فرمایا کرتے تھے۔ جنابت بردو نوع است، جنابت دل است و جنابت تن یعنی جنابت دو قسم ہے۔ ایک جنابت دل کی اور دوسری است، و جنابت تن از صحبت بازن حاصل شود و جنابت دل جنابت بدن کی۔ بدن کی جنابت وہ ہے جو عورت کے ساتھ بصحبت ناہموار۔ جنابت تن پاک بآب شود، اما جنابت دل صحبت کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اور دل کی جنابت بآب دیدہ محو گردد۔ نالائقوں کی صحبت سے حاصل ہوتی ہے۔

بدن کی جنابت تو پانی سے پاک ہو جاتی ہے۔ لیکن دل کی جنابت آنسوؤں سے دھوئی جاتی ہے۔ صوفیائے کرام کی زندگیوں کا جو پہلو سب سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے وہ ان کی تعلیم اخلاق ہے۔ جن مصنفین نے اور ادو وظائف اور کشف و کرامات کے افسانوں کو مرکزی اور بنیادی حیثیت دے دی ہے۔ انہوں نے تصوف کی حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے میں بڑی رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں۔

خواجہ اجل شیرازیؒ کا واقعہ جو حضرت محبوب الہی نے اپنی مجلس میں ایک روز بیان فرمایا۔ وہ مشائخ متقدمین کے لائحہ عمل، طریق کار اور علم کے فروغ کے لئے کاوشوں و مقصد حیات کا بہترین آئینہ دار ہے۔ وہ ارشاد فرماتے ہیں۔

”ایک شخص خواجہ اجل شیرازیؒ کی خدمت میں آیا اور مرید ہو کر خواجہ صاحب کے حکم کا منتظر تھا کہ اب مجھے نماز یا ورد بتلاتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے صرف یہ کہا کہ جو بات اپنے لئے پسند نہیں کرتا وہ اوروں کے لئے بھی پسند نہ کر۔ اور اپنے لئے اس بات کی خواہش کر جس کی اوروں کے لئے خواہش کرتا ہے۔ مدت بعد جب وہ شخص پھر حاضر خدمت ہوا تو عرض کی میں فلاں روز آپ کا مرید ہوا تھا۔ اور منتظر تھا کہ آپ مجھے نماز یا روزہ کی بابت فرمائیں گے۔ لیکن آپ نے کچھ نہ فرمایا۔ اب بھی میں اسی بات کا منتظر ہوں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا۔ اس روز تجھے کیا سبق دیا تھا۔ مرید حیران رہ گیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ حضرت خواجہ صاحب نے مسکرا کر فرمایا۔ اس روز میں نے کہا تھا کہ جو بات اپنے لئے پسند نہیں کرتا وہ دوسروں کے لئے بھی نہ کر اور اپنے لئے اسی بات کو خواہش کر جس کی اوروں کے لئے کرتا ہے چونکہ تو نے پہلا سبق یاد نہیں کیا اب میں دوسرا سبق کس طرح سکھاؤں۔

حقیقت یہ ہے کہ تصوف نام ہی خدمت خلق اور تعلیم اخلاق کا ہے۔ ہمارے مشائخ متقدمین نے اس کو یہی سمجھا تھا اور اس کے لئے اپنی پوری زندگیاں وقف کر دی تھیں۔ (۱۱۶)

حضرت امام مالکؒ کے اس قول سے یہ بات واضح ہے کہ صوفی خود بھی علم پڑھے گا اور دوسروں کو بھی پڑھائے گا۔ آپ فرماتے ہیں۔

من تفقه ولم يتصوف فقد تفسق ومن تصوف جو فقه میں ماہر ہوا اور تصوف کو نہ جانا وہ فسق و فجور میں پڑ گیا  
ولم يتفقه فقد تزندق ومن جمع بينهما اور جو تصوف میں ڈوب گیا اور فقه سے نابالہ رہا وہ زندیق  
فقد تحقق“  
ہو گیا اور جس نے دونوں کو جمع کیا اس نے حق کو پالیا۔

اسی طرح دیگر بزرگوں کا بھی ارشاد ہے۔

فلا تصوف الا بفقه اذ لا تعرف احكام الله تعالى الظاهره الا منه۔

حضور ﷺ کا ارشاد پاک ہے۔ (۱۱۷)

فقيه واحد وشد على الشيطان من الف عابد ایک فقیہ، شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے۔

(۱۱۸)

اس لئے راہ طریقت میں علم شریعت کے بغیر حصول معرفت تو درکنار انسان خود ہلاکت کے گڑھوں سے بھی

نہیں نکل سکتا ہے۔

آپ پہلی صدی ہجری سے لیکر آج تک کے صوفیائے کرام کی علمی و عملی زندگیوں کا مطالعہ کریں تو واضح ہوتا ہے کہ ان مقدس ہستیوں نے اپنی زندگیاں تعلیم و تعلم میں صرف کی ہیں۔ مثلاً

- 1- حضرت حارث الحاسبیؒ کی ”کتاب الرعایۃ“ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے علم کی کتنی خدمت کی ہے۔
- 2- حضرت ابوسعید خدریؒ کی ”کتاب الصدق“ ان کی علمی خدمات کی آئینہ دار ہے۔
- 3- سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کی ”تصنیفات“ اور بالخصوص ”رسائل جنید“ کے مطالعہ سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ انہوں نے علم کے فروغ میں بے بہا خدمات سرانجام دی ہیں۔
- 4- ابوالمغیث حسین ابن منصور الحلّاج المصلوب کی زندگی اور بالخصوص تعلیمی خدمات جیسے آپ کی تصنیف ”اخبار الحلّاج“ نے علم کے فروغ میں بہت مدد ثابت ہوئی۔
- 5- محمد بن عبد الجبار ابن الحسن النفریؒ نے ”مواقف“ لکھ کر صوفیاء کی علمی خدمات کو ثابت کیا۔
- 6- حضرت ابونصر السراجؒ نے ”کتاب الملع“ لکھ کر بتا دیا کہ علم کے فروغ میں صوفیاء کا کیا کردار ہے۔
- 7- حضرت شیخ ابوبکر ابن ابی اسحق الکلاباذیؒ نے ”کتاب التصرف“ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ان صوفیائے کرام کا علم کے فروغ میں قابل قدر حصہ ہے۔
- 8- حضرت الامام ابوطالب المکیؒ نے ”قوت القلوب“ جیسی ضخیم کتاب علم تصوف میں تحریر کر کے بتایا کہ ان حضرات نے بے حد علمی خدمات سرانجام دی ہیں۔
- 9- حضرت ابوالقاسم عبدالکریم قشیریؒ نے علم تصوف پر ”رسالہ قشیریہ“ صوفیائے کرام کے علمی تجربہ اور خدمات علمیہ کا آئینہ دار ہے۔
- 10- حضرت داتا گنج بخشؒ نے بے شمار تصنیفات کیں مگر سب کے سودے ضائع ہو گئے۔ اب اس وقت منظر عام پر آپ کی تصنیف ”کشف الکجوب“ معرکہ الآراء ہے۔ جس کا جواب نہیں ہے۔
- 11- حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی ”تصنیفات بہجت الاسرار غیۃ الطاہرین“ وغیرہ آپ کے علمی تجربہ کا آئینہ دار ہیں۔ جن کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ یہ حضرات کس قدر عالم دین تھے اور لوگوں کی علمی اعتبار سے کس قدر خدمت کی ہے۔
- 12- حضرت خواجہ خواجگان سلطان الہند غریب نوازؒ نے بے شمار تصنیفات کیں جن میں نے ”انیس الارواح“ تحریر

کر کے نہ صرف مرشد کی خدمت کی بلکہ اس سے مخلوق خدا کو علمی لحاظ سے سیراب کیا۔ پھر آپ کے خلفاء نے علی الترتیب دلیل العارفین، فوائد السالکین، راحت القلوب، مفتاح العاشقین، فوائد الفوائد، راحت المحبین، اسرار الاولیاء، سر العارفین جیسی اعلیٰ تالیفات کیں۔

مندرجہ بالا صوفیائے کرام کی ان علمی خدمات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کا علم دین کے فروغ میں جو حصہ ہے وہ کسی کا بھی نہیں ہے۔

امام غزالیؒ نے تو دینی و دنیوی دونوں علوم میں بے تعداد تصنیفات کیں ہیں۔ احیائے العلوم علم تصوف میں معرکہ الآراء تصنیف ہے۔ اسی طرح مولانا رومؒ، مولانا عبدالرحمن جامی، حافظ شیرازیؒ و دیگر بے شمار صوفیاء کا بڑا احسان ہے کہ انہوں نے تدریسی، تحریری، تقریری میدانوں میں اپنے علم کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہیں کہ صوفیاء کا علم کے فروغ میں وہ حصہ ہے جس کو تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔ (۱۱۹)

## حوالہ جات باب چہارم

- ۱۔ نقی علی، مفتی: فضل العلم والعلماء، ناشر: مجلس اشاعت فیض العلوم محمد آباد گہنہ ضلع اعظم گڑھ، سن اشاعت ۱۹۸۳ء، ص: ۱۶-۱۵
- ۲۔ محمد قاسم، عبدالبر: تحصیل علم۔ مطبع: سید الیکٹرک پریس ملتان، سن اشاعت ۱۹۹۰ء، ص: ۱۴-۱۰
- ۳۔ ایضاً
- ۴۔ اندلسی، ابن عبدالبر، علامہ: جامع البیان العلم وفضله، مترجم: یلیح آبادی عبدالرزاق، المطبع العربیہ پرانی انارکلی
- سن اشاعت: ۱۹۷۷ء، ص: ۳۵-۲۹۔

- ۵۔ خالد سعید احمد پروفیسر: پرائمری تعلیم، ناشر: صوبائی تعلیمی کونسل بلوچستان کوئٹہ، ص ۵۔
- ۶۔ ایضاً ص ۳۱۔
- ۷۔ القرآن الحکیم: ۶۸ (القلم) ۱۔
- ۸۔ القرآن الحکیم: ۳ (العمران): ۱۸۔
- ۹۔ القرآن الحکیم: ۵۸ (مجادلہ): ۱۱۔
- ۱۰۔ القرآن الحکیم: ۳۹ (الزمر): ۸۔
- ۱۱۔ القرآن الحکیم: ۱۳ (الرعد): ۴۳۔
- ۱۲۔ القرآن الحکیم: ۱۶ (نحل): ۴۰۔
- ۱۳۔ القرآن الحکیم: ۲۸ (القصص): ۸۰۔
- ۱۴۔ القرآن الحکیم: ۲۹ (العنکبوت): ۴۲۔
- ۱۵۔ القرآن الحکیم: ۴ (النساء): ۸۲۔
- ۱۶۔ القرآن الحکیم: ۷ (الاعراف): ۲۶۔
- ۱۷۔ القرآن الحکیم: ۷ (اعراف): ۵۲۔
- ۱۸۔ القرآن الحکیم: ۷ (اعراف): ۷۔
- ۱۹۔ القرآن الحکیم: ۲۹ (العنکبوت): ۴۲۔
- ۲۰۔ القرآن الحکیم: ۵۵ (الرحمن): ۳۴۔
- ۲۱۔ غزالی، محمد، امام: احیاء العلوم: مطبع زاہد بشیر پرنٹرز لاہور۔ ص ۱۶-۱۵۔
- ۲۲۔ ولی الدین، محمد بن عبد اللہ، ابو عبد اللہ، الخطیب: مشکوٰۃ المصابیح، ص ۳۲۔
- ۲۳۔ ایضاً باب العلم، ص ۳۴۔
- ۲۴۔ ایضاً ایضاً
- ۲۵۔ الترمذی، محمد بن عیسیٰ بن سورہ، ابو عیسیٰ: سنن الجامع، دار الفکر بیروت، ج ۲، ص ۱۱۲۔
- ۲۶۔ ایضاً ج ۲، ص ۵۹۳۔
- ۲۷۔ ولی الدین، محمد بن عبد اللہ، ابو عبد اللہ، الخطیب: مشکوٰۃ المصابیح، باب العلم، ص ۳۴۔



- ۲۸۔ الدیلمی، الامام: مسند الفردوس، ص: ۱۷۵
- ۲۹۔ الرزین، مولانا: زاد الطالبین، ص: ۴۵
- ۳۰۔ الحاکم: المستدرک، مطبع: بیروت لبنان، ج: ۱، ص: ۱۵۸
- ۳۱۔ العجلونی، الحافظ: کشف الخفاء، ج: ۲، ص: ۲۴۶
- ۳۲۔ الترمذی، محمد بن عیسیٰ بن سورہ، ابو عیسیٰ: سنن الجامع، ج: ۲، ص: ۴۶۵
- ۳۳۔ الحافظ، السیوطی: جامع الصغیر، کتاب العلم، ص: ۲۱۳
- ۳۴۔ ولی الدین، محمد بن عبد اللہ، ابو عبد اللہ، الخطیب: مشکوٰۃ المصابیح، باب العلم، ص: ۳۴
- ۳۵۔ ایضاً باب العلم، ص: ۳۵
- ۳۶۔ ایضاً باب الشفاعۃ، ص: ۴۹۵
- ۳۷۔ ایضاً باب العلم، ص: ۳۴
- ۳۸۔ النسائی، احمد بن شعیب، ابو عبد الرحمن: سنن نسائی، ج: ۲، ص: ۲۱۰
- ۳۹۔ الہندی، علی المتقی: کنز العمال فی سنن الافعال والاقوال، ج: ۱۱، حدیث نمبر ۳۲۲۱
- ۴۰۔ الترمذی، محمد بن عیسیٰ بن سورہ، ابو عیسیٰ: سنن الجامع، باب الزہد، ج: ۲، ص: ۳۰۵
- ۴۱۔ ایضاً ج: ثانی، ص: ۶۷
- ۴۲۔ غزالی، محمد امام: احیاء العلوم زاہد بشیر پرنٹرز لاہور۔ مترجم مولانا محمد احسن نانوتوی، ص: ۲۶-۱۶
- ۴۳۔ القرآن الحکیم: ۴ (انعام) ۱۵۱
- ۴۴۔ الشاذلی: عبد القادر عیسیٰ، شیخ: روشن حقائق، ترجمہ: الزہری، محمد اکرم، ناشر: زاویہ ٹریڈرز لاہور، سن اشاعت ۱۹۹۸ء، ص: ۱۰۳-۱۰۰
- ۴۵۔ المنجد، لغت جہالت کا لفظ جہل سے مشتق ہے۔ دارالاشاعت بالمقابل مولوی مسافر خانہ کراچی، ص: ۶۳
- ۴۶۔ دؤانی، علامہ: ”اخلاق جلالی“، مطبوعہ بختیار پرنٹرز لاہور، ص: ۹۹۔
- ۴۷۔ القرآن الحکیم: ۳۹ (زمر): ۹
- ۴۸۔ القرآن الحکیم: ۴۵ (الجاثیہ): ۱۸
- ۴۹۔ القرآن الحکیم: ۴۳ (الزخرف): ۸۹

- ۵۰۔ القرآن الحکیم: ۲۵ (الفرقان): ۶۳۔
- ۵۱۔ القرآن الحکیم: ۷ (الاعراف): ۱۹۹۔
- ۵۲۔ غزالی، محمد، امام: احیاء العلوم، ص: ۲-۱۰۰۔
- ۵۳۔ العجلونی، الحافظ، الامام: کشف الخفاء، مکتبہ دار التراث قاہرہ، سن اشاعت ۱۹۸۰ء، ج: ۱، ص: ۲۵۔
- ۵۴۔ ولی الدین، محمد بن عبد اللہ، ابو عبد اللہ خطیب، مشکوٰۃ المصابیح، ص: ۳۲۔
- ۵۵۔ ایضاً ص: ۳۴۔
- ۵۶۔ ایضاً ص: ۳۴۔
- ۵۷۔ ایضاً ص: ۳۴۔
- ۵۸۔ غزالی، محمد، امام: احیاء العلوم، ص: ۹-۶۰۶۔
- ۵۹۔ حارثی المکی، محمد بن عطیہ ابوطالب، امام: قوت القلوب، مطبوعہ غلام علی پرنٹرز، سن اشاعت ۱۹۸۷ء، ص: ۵۸۸۔
- ۶۰۔ ہجویری، علی: کشف المحجوب، مطبوعہ: مدینہ پبلشنگ کمپنی ایم اے جناح روڈ کراچی، ص: ۴۱-۴۰۔
- ۶۱۔ القرآن الحکیم: ۲ (البقرہ): ۱۰۱۔
- ۶۲۔ حارثی المکی، محمد بن عطیہ، ”قوت القلوب“، ص: ۵۵۶۔
- ۶۳۔ القرآن الحکیم: ۲۱ (الانبیاء): ۷۔
- ۶۴۔ حسینی، محمد اکبر، سید: جوامع الکلم، ”مطبع نفیس اکیڈمی اسٹریٹ راجہ روڈ کراچی، طبع اول ۱۹۸۰ء، ص: ۲۵۶۔
- ۶۵۔ نظامی، خلیق احمد، پروفیسر: ”تاریخ مشائخ چشت“، ناشر: دارۃ المصنفین اسلام آباد، ص: ۶۲۔
- ۶۶۔ القرآن الحکیم: ۳۹ (زمر): ۴۷۔
- ۶۷۔ سعدی، مصلح الدین، شیخ: گلستان، ص: ۳۵۔
- ۶۸۔ خلیفہ، عبد الحکیم، ڈاکٹر: ”تشبیہات رومی“، مطبع: اظہار سنز پرنٹرز لاہور، طبع سوم ۱۹۹۰ء، ص: ۱۴۶۔
- ۶۹۔ القرآن الحکیم: ۹۶ (العلق): ۱۔
- ۷۰۔ القرآن الحکیم: ۱۲ (یوسف): ۶۔
- ۷۱۔ القرآن الحکیم: ۱۲ (یوسف): ۲۰۔

- ۷۲- القرآن الحکیم: ۱۰ (یونس): ۶-
- ۷۳- القرآن الحکیم: ۱۶ (نحل): ۱۲-
- ۷۴- نعمانی، شبلی: سیرۃ النبی، مطبع، ص: ۷۲-۵۰-
- ۷۵- نظامی، خلیق احمد، پروفیسر: تاریخ مشائخ چشت، ص: ۵۴-
- ۷۶- ابن ماجہ، محمد بن یزید، ابو عبد اللہ، القزوینی: السنن، مہر کتب خانہ، سن، ص: ۲۱-
- ۷۷- ولی الدین، محمد بن عبد اللہ، ابو عبد اللہ، خطیب، مشکوٰۃ المصابیح، ص: ۳۲-
- ۷۸- ابو داؤد، سلمان بن اشعث، سجستانی: السنن، سعید محمد اللحام دار الفکر، سن، ج: ۲، ص: ۱۵۷-
- ۷۹- البخاری، محمد بن اسماعیل، ابو عبد اللہ، الامام: الجامع الصحیح، ج: ۱، ص: ۱۳۱-
- ۸۰- ایضاً
- ۸۱- الترمذی، محمد بن عیسیٰ بن سورہ، ابو عیسیٰ: سنن الجامع، باب الزہد، ج: ۲، ص: ۴۳-
- ۸۲- القرآن الحکیم: ۵ (المائدہ): ۵۴-
- ۸۳- دادائی، معین الدین، محمد، پروفیسر: مجلس صوفیہ، ناشر: نفیس اکیڈمی اردو بازار لاہور، طبع اول ۱۹۸۸ء، ص:
- ۶۹-۴۶-
- ۸۴- القرآن الحکیم: ۲ (البقرہ): ۳۱-
- ۸۵- القرآن الحکیم: ۲ (البقرہ): ۳۱-
- ۸۶- القرآن الحکیم: ۱۷ (ابن اسرائیل): ۸۵-
- ۸۷- القرآن الحکیم: ۲ (البقرہ): ۲۶۸-
- ۸۸- القرآن الحکیم: ۳۵ (الفاطر): ۲۸-
- ۸۹- القرآن الحکیم: ۲ (البقرہ): ۲۹-
- ۹۰- القرآن الحکیم: ۵۸ (المجادلہ): ۱۱-
- ۹۱- سعید اختر، پروفیسر، ہمارا نظام تعلیم، ناشر: ادارہ تعلیمی تحقیق، سن اشاعت ۱۹۹۱ء، ص: ۵۶-
- ۹۲- ترمذی، محمد بن عیسیٰ: جامع الترمذی، ج: ۲، ص: ۹۴-
- ۹۳- ابن ماجہ، محمد بن یزید، الربیع، ابو عبد اللہ: سنن ابن ماجہ، ص: ۲۲-

- ۹۴۔ السجستانی، سلیمان ابن الشث، سنن ابوداؤد، ج: ۱، ص: ۱۵۹۔
- ۹۵۔ ایضاً ص: ۹۴۔
- ۹۶۔ ولی الدین، محمد بن عبد اللہ الخطیب: مشکوٰۃ المصابیح، کتاب العلم، ص: ۳۷۔
- ۹۷۔ ابن ماجہ، محمد بن یزید، الربیع، ابو عبد اللہ: سنن ابن ماجہ، ج: ۲، ص: ۲۲۔
- ۹۸۔ ایضاً ص: ۲۲۔
- ۹۹۔ ابو نعیم، الحافظ: حلیۃ الاولیاء، ج: ۱۰، ص: ۳۴۹۔
- ۱۰۱۔ ابن ماجہ، ابو عبد اللہ: سنن ابن ماجہ، باب انتقاع العلم والعمل، ص: ۲۳۔
- ۱۰۲۔ ایضاً ص: ۳۱۱۔
- ۱۰۳۔ ابوالحسن، مسلم بن حجاج، القشیری، امام: الجامع الصحیح، دار احیاء التراث لبنان، ص: ۳۶۹۔
- ۱۰۴۔ الدیلمی، الامام: مسند الفردوس، ص: ۷۵۔
- ۱۰۵۔ نظامی، خلیق احمد، پروفیسر: تاریخ مشائخ چشت، ص: ۶۰-۵۵۔
- ۱۰۶۔ ایضاً ص: ۶۰-۵۹۔
- ۱۰۷۔ دہلوی، عبد الحق، محدث: مرقاۃ المفاتیح، ناشر مکتبۃ العارفین کراچی، ص: ۲۵۶۔
- ۱۰۸۔ القرآن الحکیم: ۲ (البقرہ): ۲۹۔
- ۱۰۹۔ ولی الدین، محمد بن عبد اللہ، ابو عبد اللہ خطیب، مشکوٰۃ المصابیح، ص: ۴۳۲۔
- ۱۱۰۔ ایضاً کتاب العلم، ص: ۳۶۔
- ۱۱۱۔ نعمانی، منظور احمد، مولانا: معارف الحدیث، ج: ۲، ص: ۲۰۱۔
- ۱۱۲۔ ولی الدین، محمد بن عبد اللہ، ابو عبد اللہ خطیب، مشکوٰۃ المصابیح، ص: ۴۳۲۔
- ۱۱۳۔ ایضاً ص: ۳۶۔
- ۱۱۴۔ ایضاً ص: ۴۳۱۔
- ۱۱۵۔ دہلوی، عبد الحق، محدث: مرقاۃ المفاتیح، ص: ۷۵۔
- ۱۱۶۔ نظامی، خلیق احمد، پروفیسر: تاریخ مشائخ چشت، ص: ۶۰-۵۵۔

- ۱۱۷۔ برکت علی صوفی، ایقاظ الہمم فی شرح الحکم، مطبع: میٹرو و پرنٹرز لاہور، ص: ۹۱
- ۱۱۸۔ ولی الدین، محمد بن عبد اللہ ابو عبد اللہ خطیب، مشکوٰۃ المصابیح، ص: ۳۴
- ۱۱۹۔ نظامی، خلیق احمد پروفیسر: تاریخ مشائخ چشت، ص: ۷۱-۶۰

# باب پنجم

انسانی زندگی کی فعالیت کے اسلامی تصور کی تشکیل اور تصوف

## انسانی زندگی کی فعالیت کے اسلامی تصور کی تشکیل اور تصوف فعال زندگی کے اسلامی تصور کی وضاحت

اسلام دور جدید کے انسان کی ہر گمراہی کو دور کرتا ہے۔ وہ زندگی کے کسی مخصوص پہلو کی اصلاح کو کافی خیال نہیں کرتا بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ اور عمل کے ہر گوشہ کے لئے اصلاحی تدابیر رکھتا ہے۔ اس وجہ سے اس کا ایک مخصوص نظام تمدن، ایک الگ نظام معاشرت اور ایک جداگانہ نظریہ سیاست و حکومت ہے۔ یہاں مذہب اور تہذیب و تمدن یا اخلاق اور اجتماعی زندگی کوئی الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ سب ملکر ایک مجموعہ بناتے ہیں جنہیں ”الاسلام“ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

یہاں ایک ہی طریق فکر اور ایک ہی نظریہ حیات ہے جو زندگی کے سارے گوشوں پر حاوی ہے۔ مکمل نظام زندگی ہونے کی بنا پر دین حق عہد حاضر کے ایک نہایت اہم مسئلہ یعنی فرد اور جماعت کے باہمی رابطہ کو بھی حل کرتا ہے۔ اسکی نگاہ میں اصل اہمیت فرد کی ہے نہ کہ جماعت یا اجتماعی نظام کی۔ ہر فرد انسانی کو اللہ تعالیٰ نے شعور شخصیت عطا کیا ہے۔ خودی کا احساس دیا ہے۔ انفرادی خصوصیات بخشی ہیں، اسی بنا پر ایک انسان منفرداً اللہ کا خلیفہ ہے۔ اور اسی حیثیت سے وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار اور جواب دہ ہے۔ (۱)

یہی بات ہے جسے قرآن حکیم میں مختلف طریقوں سے یوں دہرایا گیا ہے۔

علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذاھتد یتم (۲) تم پر تمہارے اپنے نفس کی ذمہ داری ہے اگر تم ہڈایت والا تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

ولا تکسب کل نفس الا علیھا ولا تزر وازرة وزر اخری۔ (۳) ہر نفس جو کچھ کماتا ہے اس کا بوجھ اسی پر ہے کوئی کسی کا بوجھ ان احسنتم احسنتم لا نفسکم وان اسأ تم فلھا (۴) اگر تم نیک کام کرو گے تو اپنے نفس کے لئے کرو گے اور اسی کے لئے۔

اسی حقیقت کو رسالت مآب ﷺ نے یوں بیان فرمایا کہ

الا کلکم راعٍ و کلکم مسؤول عن رعیتہ (۵)

سنو تم میں سے ہر ایک نگران اور ذمہ دار ہے اور ہر ایک بارے میں سوال کیا جائے گا۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے آخرت کے ذکر میں بڑی کثرت سے بیان فرمایا ہے کہ اللہ کی عدالت میں ہر شخص اپنی انفرادی حیثیت سے پیش ہوگا۔ اور اسی حیثیت سے اپنے اعمال کا نتیجہ دیکھے گا یعنی جس طرح ہر فرد کی شخصیت انفرادی ہے۔ اور ذمہ داری انفرادی ہے اسی طرح اس کا نتیجہ اور انجام بھی آخر کار انفرادی ہے۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جماعت اور اجتماعی نظام اسلام کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے فی الواقع ان کو بڑی اہمیت حاصل ہے مگر اس حیثیت سے نہیں کہ وہ بجائے خود مقصود ہیں بلکہ اس حیثیت سے کہ فرد کی شخصیت کا ارتقاء اور اس کی ذات کی تکمیل جماعت ہی کی اصلاح اور اجتماعی نظام کی بہتری پر منحصر ہے۔

اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ بنی نوع انسان کا ایک ایک فرد اپنے انفرادی حیثیت میں خدا کے سامنے جواب دہ ہے اسلئے ہر ایک فرد کو فرداً خدا کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے تیار ہونا چاہیے مگر چونکہ خدا کے سامنے اسکی جوابدہی بڑی حد تک اجتماعی حقوق و فرائض اور ذمہ داریوں ہی سے متعلق ہے اور آخری امتحان میں اس کی کامیابی بہت حد تک اجتماعی صلاح و فلاح پر ہی منحصر ہے۔ نیز خدا کی رضا حاصل کرنے میں بھی وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک حتی الامکان فساد کو مٹانے اور خدا کے احکام، اس کی زمین اور اس کی خلق پر جاری کرنے کا فریضہ انجام نہ دے جو خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد کیا گیا ہے لہذا اس کی تیاری محض اپنی ذاتی اصلاح کی حد تک ہی محدود نہیں کی جاسکتی بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان اجتماعی تقاضوں کو بھی پورا کرے جو سوسائٹی کا فرد ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ اسلام نے یہ طرز فکر اختیار کر کے انفرادی حریت اور اجتماعی گرفت کے ظاہری تضادیں جو درحقیقت تضاد نہیں۔ ایک وحدت معنوی پیدا کر دی ہے۔

خلافت سے مراد یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں اپنے مالک کے اس منشاء کو پورا کرے جو خدا کے نائب ہونے کی حیثیت سے اس پر لازم ٹھہرایا گیا ہے۔ چونکہ یہ نیابت کسی مخصوص گروہ یا قوم کو نہیں سونپی گئی بلکہ اس کا حق ہر وہ شخص رکھتا ہے جو توحید و رسالت اور آخرت کے بنیادی اصولوں کو تسلیم کر کے نیابت کی شرطیں پوری کرنے پر آمادہ ہو اس لئے ایسی سوسائٹی بحیثیت مجموعی خلافت کی حامل ہوتی ہے۔ یہ چیز اسلامی خلافت کو قیصریت، پاپائیت اور مغربی تصور والی مذہبی ریاست کے برعکس جمہوری رنگ دے دیتی ہے۔ (۶)

فرد کی کامیابی کے بارے میں قرآن کا اسلامی تصور یہ ہے کہ

قد افلح من تزكى و ذكر اسم ربہ فصلی۔ (۷)

وہ شخص کامیاب ہو گیا جس نے خود کو پاک کر لیا اور اپنے رب کا نام پکارا اور نماز ادا کی نیز قرآن میں اللہ نے اپنے کامل



بندوں کے بارے میں فرمایا۔

رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله . (۸) وہ مرد جنہیں غافل نہیں کرتا کوئی سودا اور خرید و فروخت

اللہ کی یاد سے

یاد خداوندی کا کیف و سرور ان کی زندگی کے ہر گوشے پر محیط ہوتا ہے۔ اسلام نے ایک فرد کی زندگی میں ایسا انقلاب پیدا کیا کہ جن کا پیشہ ڈاکہ زنی تھا وہ دنیا کے پاسان بن گئے۔ قتل و غارت جن کا مشغلہ تھا پیامبر بن گئے۔ وہ جنہیں فحاشی و بے حیائی سے عشق تھا اب پاکیزگی اور قدوسیت کے پیکر بن گئے۔ وہ جو باہمی چپقلش کے باعث اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ تاریخ کے جھونکے انہیں ٹھوکروں میں فنا کر رہے تھے اسلام کے باعث پوری دنیا پر چھا گئے۔ تاریخ نے جنہیں بھلا دیا تھا تاریخ ساز بن گئے۔ جہالت کے لئے جنہیں بطور مثال پیش کیا جاتا تھا۔ دنیا میں علم کا نور انہیں کے ذریعے سے پھیلا۔ سائنس و حکمت کی شمعیں انہوں نے روشن کیں۔

حضرت امام زین العابدین نے فرمایا کہ بندے تین قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم ان بندوں کی ہے جو بظاہر تو مرد ہیں۔ مگر حقیقت میں ان میں مردانگی نہیں بلکہ وہ عورتیں ہیں۔ دوسری قسم ان بندوں کی ہے۔ جو نہ مرد ہیں نہ عورتیں بلکہ وہ مخنث ہیں۔ اور تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو حقیقتاً مرد ہیں۔ اور وہ اللہ کے کامل بندے ہیں جن کی نظر صرف اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی پر ہے جو صرف اور صرف طالب مولیٰ ہوتے ہیں۔ انہیں دنیا و عقبیٰ کی پرواہ نہیں صرف اللہ کی رضا مقصود ہوتی ہے۔ (۹)

## فصل اول

صوفیاء کے افکار کی روشنی میں انسان کے درست مقام و مرتبے کے شعور کی

### بیداری

صوفیائے کرام کے بارے میں گوشہ نشینی اور عزلت گزینی کا جو تاثر ہے۔ منجملہ دیگر تاثرات کے یہ بھی غلط ہے اگر انصاف کی نظر سے صوفیائے کرام کی زندگیوں کا جائزہ لیا جائے تو صوفیاء کی زندگی آرام و آسائش عافیت اور اطمینان کی نہیں بلکہ جدوجہد اور کشمکش کی زندگی دکھائی دیتی ہے۔ نامساعد فضا، ناسازگار ماحول، نامانوس آب و ہوا اور ناخوشگوار حالات میں دینی و ملی فرائض کی انجام دہی صوفیائے کرام کا کام ہے۔ کٹھن حالات میں جو سخت کام صوفیائے کرام نے کیا ہے اس کا تصور بھی انسان کو لرزادیتا ہے اور صوفیائے کرام کی محنت، سخت کوشی، اور اخلاص و ایقان کا قائل بنا دیتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں جن کٹھن حالات میں صوفیائے کرام نے اشاعت اسلام کا فریضہ سرانجام دیا ان سے وہی شخص

کماحقہ آگاہ ہو سکتا ہے جو ہندوستان کی اخلاقی اور معاشرتی حالت کا علم رکھتا ہو۔ ان کی ان مساعی سے جہاں اسلام کی اشاعت ہوئی وہاں انسان کے درست مقام اور مرتبے کے شعور کی بیداری حاصل ہوئی۔

ہندوستان کے حالات کچھ اس طرح تھے کہ خداؤں کی حد سے بڑھی ہوئی کثرت، جنسی خواہشات کی بحرانی کیفیت، طبقاتی تقسیم اور معاشرتی امتیازات کی لعنت کے دور میں توحید پرستی کا درس، ضبط نفس کی تلقین اور انسانی وحدت و اخوت کا پیغام جس جاں گسل اور صبر آزمائش کا متقاضی ہے اُسے ہر شخص بخوبی جانتا ہے اور صوفیاء نے یہی کچھ کیا ہے۔ دلوں میں ایک خدا کے لئے جذبہ عبادت اور محبت کر دار میں پاکیزگی اور عفت اور انسانوں کے مختلف طبقات میں وحدت و مودت پیدا کر کے صوفیاء نے تاریخ کا رخ موڑ دیا۔

اس وقت کے ہندوستان کی معاشرتی اور اخلاقی حالت کیا تھیں۔ ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے۔  
ہندوستان میں ذاتوں کی تقسیم کچھ اس طرح تھی۔ برہمن (مذہبی پیشوا) کھشتری (لڑنے والے) ویش (زراعت و تجارت پیشہ) اور شودر (خادم، غلام)  
ان کے درجات پیدائش کیا تھے؟

"قادر مطلق نے دنیا کی بہبودی کے لئے اپنے منہ سے بازوؤں سے اپنی رانوں سے اور اپنے پاؤں سے برہمن کھشتری، ویش اور شودر کو پیدا کیا" ان کے ذمے وظائف کیا تھے۔

برہمنوں کے لئے وید کی تعلیم اور خود اپنے لئے اور دوسروں کے لئے چڑھاوے چڑھائے دینا فرض قرار دیا۔

کھشتری کو اس نے حکم دیا کہ خلقت کی حفاظت کرے چڑھاوے چڑھائے وید پر ہے خواہشات نفسانی میں نہ پڑے۔

ویش کو اس نے حکم دیا کہ مویشی کی سیوا کرے۔ تجارت، لین دین اور زراعت کرے۔

شودر کے لئے قادر مطلق نے صرف ایک ہی فرض بنایا۔ وہ ان تینوں کی خدمت کرتا ہے۔

چھوت چھات کی کیا کیفیت تھی؟

اگر شودر کسی برہمن کو ہاتھ لگائے یا گالی دے تو اس کی زبان تالو سے کھینچ لی جائے اگر اس کا دعویٰ کرے کہ وہ اس

کو تعلیم دے سکتا ہے۔ تو کھولتا ہوا تیل اس کو پلایا جائے۔

کتے، بلی، مینڈک، کوئے اور شودر کے مارنے کا کفارہ برابر ہے۔ اس ماحول میں انسانی مساوات اور وحدت کا

پیغام جہاں ایک طرف انقلاب آفریں تھا وہاں حیات بخش بھی تھا۔ جہاں اپنے اندر بے پناہ مشکلات اور مصائب رکھتا

تھا وہاں پسپائی اور دبی ہوئی قوموں کے لئے مژدہ جانفز ابھی تھا۔ (۱۰)

صوفیائے کرام کی بات تو بعد میں کرتے ہیں۔ ان کے اس مشن کا مختصر سا جائزہ سرولیم ہنٹر کے حوالے سے پروفیسر آرئلڈ کی زبانی سنئے۔ لکھتے ہیں۔

بنگال کے ان مفلس لوگوں کے لئے جن میں ماہی گیر، شکاری، سمندری قزاق اور بیچ ذات کے کاشتکار شامل تھے۔ اسلام ایک نعمت عظمیٰ ہے جو ان پر عرش بریں سے اترا۔ اسلام حکمران قوم کا مذہب تھا اور اس کے پر جوش مبلغ خدا کی توحید اور انسانی مساوات کا مژدہ لیکر ایک ایسی قوم کے پاس پہنچے جس کو سب لوگ حقیر اور ذلیل سمجھتے تھے اور جس کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیع صوفیائے کرام کی تبلیغی مساعی کا ذکر کرتے ہوئے اس دور کے حالات و کوائف کے بارے میں لکھتے ہیں۔

یہاں کے لوگ ان مبلغوں سے انتہائی اختلاف رکھتے تھے۔ ان کی زبان اہل ملک سے انتہائی مختلف ان کا دین اُن سے بالکل مختلف غیروں کو یہاں والے پیچھے کہتے تھے۔ ان سے میل جول، شادی، بیاہ، قربت سب کونا جائز سمجھتے تھے۔ مسلمانوں سے ان کا اختلاف اس قدر تھا کہ وہ اپنے بچوں کو ان سے ان کے لباس سے اور انکی شکل و صورت سے ڈرایا کرتے تھے۔ (۱۱)

حضرت سید علی الجویری المعروف داماد گنج بخش ”کشف المحجوب“ میں لکھتے ہیں۔

اس وقت میں دیار ہند کے شہر لاہور میں نا جنسوں کے درمیان گرفتار ہوں۔

سیرالاولیاء میں جابجا خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکر اور آپ کے مریدوں کے سانپوں سے ڈسے جانے کا بار بار ذکر ملتا ہے۔ جب اجودھن تشریف لائے تو اس وقت اس شہر کی اخلاقی علمی اور مذہبی حالت کیا تھی۔ حامد بن فضل اللہ جمالی لکھتے ہیں۔

وہ ایک خراب مقام تھا۔ وہاں آرام کیا۔ اس قصبے میں لوگ زیادہ تر خراب طبع، بد مزاج اور بد اعتقاد تھے۔

آپ نے شہر سے باہر ایک بڑے درخت کے نیچے کھل بچھا دیا اور عبادت الہی میں مشغول ہو گئے۔ (۱۲)

خواجہ نظام الدین فرماتے ہیں۔

حضرت خواجہ فرید الدینؒ نے پیلو پر گزارہ کیا۔ خواجہ نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں کہ میرے پاس ایک دانگ

بھی نہ ہوتا کہ اس سے روٹیاں خرید کر گھر والوں کو کھلاؤں۔ خربوزہ کی ارزانی کے باوجود ایک خربوزہ چکھنا نصیب نہ ہوتا تھا۔

حالات کی یہ ناسازگاری مگر اشاعت اسلام کی بیقراری، بزرگان دین کو چین نہ لینے دیتی۔ بھوکے پیٹ، خشک تالو، پیاسے ہونٹوں، ٹوٹے بوریے اور شکستہ حالت میں کیا کارنامے سرانجام دیے۔ تاریخ کو آج تک اس پر ناز ہے۔ ناسازی حالات کے باوجود ان نیک طینت انسانوں کے منہ سے جو کچھ نکلتا۔ دل پر پڑتا۔ ان کے قول و عمل کی ہم آہنگی لوگوں کو پیکر عمل بنادیتی۔ (۱۳)

ہندوستان میں تبلیغ اسلام کا سب سے زیادہ کام خواجہ معین الدین سنہری چشتی نے سرانجام دیا اور آپ اور آپ کے خلفاء کی بے پناہ کوشش سے ہندوستان کا چپہ چپہ نور اسلام سے منور ہو گیا۔

آپ حضور ﷺ کے حکم سے اجیر پہنچے اور ننانوے لاکھ ہندوؤں کو مسلمان کیا۔

خواجہ فرید الدین گنج شکر نے پنجاب کی سولہ اقوام کو مسلمان کیا خواجہ معین الدین چشتی کی خدمات دین کو ایک ہندو مفکر رائے بہادر ہر بلاس شاروا کس نظر سے دیکھتا ہے۔

”خواجہ معین الدین نے پرہیز گاروں کی زندگی بسر کی۔ انہوں نے زیادتی کرنے کی تلقین کبھی نہ کی اور خدا کی تمام مخلوقات کی نسبت ان کا نقطہ نظر صلح اور خیر خواہی کا تھا۔

شیخ ابواسحاق گازروئی کی تبلیغی و اصلاحی کوششوں کا کوئی احاطہ نہیں۔ نہ جانے ان آنکھوں میں وہ کونسی مقناطیسیت بھری تھی کہ جس جانب اٹھتیں، پردوں کے پردے کھینچ آتے۔ جنہوں نے ایک بار ان کی حلاوت گفتار کا مزہ چکھا، زندگی بھر شہد کی مٹھاس یاد نہ آئی۔ ہزاروں نغموں اور ترانوں میں وہ سرور کہاں جو ان کے بے تکلف الفاظ میں ہوتا تھا۔ ہزاروں کتابیں وہ کچھ نہ کر پائیں جو ان کے ایک جملے نے کر دکھایا۔ (۱۴)

خزینہ الاصفیاء میں ہے کہ شیخ گازروئی کے دست حق پرست پر چوبیس ہزار غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا اور ایک لاکھ کے قریب مسلمان تائب ہوئے۔

شیخ اسماعیل پہلے مبلغ اسلام ہیں جو 1005ء میں لاہور تشریف لائے۔ ان کے بارے میں آب کوثر از ڈاکٹر شیخ اکرام مطبومہ فیروز سنز (صفحہ 75) میں لکھا ہے۔ ”ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں سید جلال الدین بخاری کی آمد بہت اہمیت رکھتی ہے۔ آپ نے اوچ کے جنگل کو منگل بنایا یہ قصبہ عظیم روحانی اور سیاسی مرکز بنا رہا۔ دور دراز سے لوگ آتے اور فیضیاب ہوتے رہے۔ اس خانقاہ سے نہ جانے کتنے تلخ کام شاد کام ہوئے۔ کتنے نشہ لب سیراب، کتنے گم گشتہ راہ یاب اور کتنے محروم فیضیاب ہوئے۔ آپ کے پوتے سید احمد کبیر المعروف مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے پنجاب کے کئی قبیلوں کو مسلمان کیا تھا۔

حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے بنگال میں قدم رکھتے ہی تبلیغ و رشد و ہدایت کا کام شروع کیا۔ پروفیسر محمد ایوب قادری نے لکھا ہے۔

”وہاں رشد و ہدایت کا ہنگامہ برپا کر دیا۔ بہت سے مسلمان حلقہ ارادت میں آگئے اور خاص طور پر وہ ہندو اور بدھ جو نہایت پستی کی حالت میں زندگی گزار رہے تھے۔ آپ کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئے۔ (۱۵)

حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نے عراق عجم سے تیرہویں صدی عیسوی کے آخر میں پانی پت میں آ کر رشد و ہدایت کا کام جاری کیا اور اپنے مواعظ حسنہ سے عوام و خواص کو منور کیا۔

پروفیسر ضیاء الدین برنی کے الفاظ میں۔

شیخ کے مبارک وجود۔ ان کے انفاس پاک کی برکت اور انکی مقبول دعاؤں کی وجہ سے اس ملک کے اکثر مسلمان عبادت، تصوف اور زہد کی طرف مائل ہوئے۔ سلطان علاؤ الدین آپکا بمعہ فیملی معتقد اور مخلص ہو گیا۔ عہد علائی کے آخری ایام میں فحاشی وغیرہ کا نام بھی آدمیوں کی زبان پر نہ آنے پایا کبیرہ گناہ کفر نظر آنے لگا۔ مسلمان ایک دوسرے کے شرم سے سود خوری اور ذخیرہ اندوزی کے مرتکب نہ ہوتے تھے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ اور آپ کے صاحبزادے حضرت خواجہ محمد محمود سرہندی المتوفی 1096ء کے ہاتھ پر نولاکھ انسانوں نے بیعت اور توبہ کی۔

صدر الصدور شیخ عبدالنبی جو دور اکبری کی عظیم علمی اور روحانی شخصیت گزرے ہیں۔ آپ کی تلقین کا اثر تھا کہ اکبر بادشاہ مغل اعظم نماز باجماعت کی پابندی تو ایک طرف اذان خود دیتا اور مسجد کی صفائی خود کرتا تھا۔

حضرت شاہ غلام علی المتوفی 1240ء نے خانقاہ مجددیہ میں بیٹھ کر حق کی شمع فروزاں کی اور طالبان صادق پروانے کی طرح کھینچے چلے آتے تھے۔ سرسید احمد خان ان کے دروازے پر اس قدر ہجوم عاشقان دیکھ کر ”آثار الصادقہ“ میں لکھتے ہیں۔

”میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے روم، شام اور بغداد اور مصر اور چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے۔ جو حلقہ ارادت میں آئے۔ اور قریب کے شہروں اور ملکوں کا تو ذکر ہی کیا۔ ٹڈی دل کی طرح امنڈ کر آتے تھے۔

حضرت شاہ رؤف احمد مجددی دارالمعارف میں صرف ایک روز کے طالبین کے مقامات کی فہرست میں لکھتے ہیں کہ

سمرقند، بخارا، غزنی، تاشقند، حصار، قندھار، کابل، پشاور، کشمیر، ملتان، لاہور، سرہند، امرہ، سنبھل، رامپور، بریلی، لکھنؤ، گورکھ پور، عظیم آباد، ڈھاکہ، حیدرآباد، پونہ وغیرہ سے لوگ آئے اور فیضیاب ہوئے۔ حضرت شیخ عبدالقادر

جیلانی نے تحریر و تقریر دونوں سے اسلام کی جو گرانقدر خدمات سرانجام دی ہیں ان کی گھن گرج اب بھی موجود ہے۔ اگر مقبولیت انام اور محبوبیت عوام کو کسی کی عظمت و ہر و عزیز کی کامعیار مان لیا جائے تو حضرت شیخ کی ذات اس پر پوری اترتی ہے۔ آپ کی آمد اسلام کے افسردہ چمن میں باد بہاری کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس مرد قلندر نے ٹوٹی چٹائی پر بیٹھ کر وہ کچھ کیا جو تخت و سریر پر بھی انجام نہ پاسکتا۔ آپ ہی کی نظر کا اعجاز ہے کہ مندی آنکھیں یک بیک کھل گئیں کانوں کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ دل کا غلاف اتر گیا۔ لغزیدہ قدم سنبھل گئے۔ بہکی فکر سدھ گئی۔ دھندلا ذہن صاف ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے نظر حق نما، کان حق آشنا اور دل خود آگاہ بن گئے۔ ایک زمانہ گواہ ہے کہ حضرت شیخ کے ہاتھوں قطرے دریا اور ذرے صحرا بن گئے۔ بے راہ ہادی اور مردے مسیحا بن گئے۔ یہ داستان کسے یاد نہیں۔ مال لوٹنے آئے تو دل لٹا بیٹھے۔ حضرت عبداللہ جبائی فرماتے ہیں۔ (۱۶)

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے دست حق پرست پر بقول ان کے ایک لاکھ عیار اور ڈاکو لوگوں نے توبہ کی۔ اور پانچ ہزار سے زائد یہودی مسلمان ہوئے۔

مندرجہ بالا دلائل اور حوالہ جات کے ہوتے ہوئے یہ بات کتنی بے وزن ہو جاتی ہے کہ صوفیاء کی زندگیاں گوشہ نشینی اور عزلت نشینی میں گذریں۔

سچی بات یہ ہے کہ جملہ اہل اسلام ان بے نوا فقیروں کے ممنون احسان ہیں جن کے صدقے ان کے دل نور اسلام سے منور ہوئے۔ ورنہ کیا خبر آج ہم کسی مندر میں دیوی کے چرنوں میں آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوتے۔ اسکی ڈنڈوت بجالا رہے ہوتے۔

پہلے سے قائم شدہ رائے کا کوئی علاج نہیں ورنہ حقیقت یہی ہے کہ ان خرقد پوشوں نے سختی و نرمی، سردی اور گرمی میں جس جاں سوزی کے ساتھ لوگوں کی تعلیم و تربیت، اصلاح عقائد و اخلاق اور تزکیہ قلب نفس کا اہتمام کیا۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ صوفیاء کی زندگی محض سائنس کی آمد و شد نہ تھی ایک پیکر مسلسل تھی۔ باطل کے خلاف کفر کے خلاف اور فساد کے خلاف جہد مسلسل تھی۔ سر بلندی حق کے لئے اور رب کعبہ کی قسم وہ اپنی مراد کو پہنچ گئے۔ (۱۷)

## فصل دوم

صوفیاء کے افکار کی روشنی میں انسان کے مطلوبہ کردار کے شعور کی

بیداری

حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ یعنی صوفیائے کرامؒ آج معین نہ صرف جہادِ زندگانی کی اصل رمز سے آگاہ تھے اور ہیں بلکہ ان کی زندگی سراسر جہاد سے عبارت ہے۔ جہاں انہوں نے گلی کوچوں میں تبلیغ و نصیحت کی وہاں بڑے بڑے ایوانوں میں بھی آوازِ حق بلند کیا اور اس قوت، شدت، اخلاص اور بے نیازی سے حق کا پرچار کیا کہ انبیاء کی سیرتیں نظروں میں گھوم گئیں۔ دل میں وہی جذبہ نظروں میں وہی بے باکی، چہرے پر وہی اعتماد و سکون، زبان پر وہی کھرے جملے، بیان میں وہی طظنہ، انداز میں وہی ولولہ، عمل میں وہی اخلاص طبیعت میں وہی قناعت و توکل اور چال ڈھال میں وہی بے نیازی جو منصبِ نبوت کے عاملین کی سیرتوں میں دکھائی دیتی ہے۔

انہوں نے نہ صرف بگڑے نوابوں، بدمست جاگیرداروں، جابر و ظالم بادشاہوں، بے لگام حکمرانوں، نخوت و کبر میں چور، رئیسوں، عیش و عشرت میں غرق مہاراجوں اور بے ضمیر وزیروں کو لاکار اور برسرعام لاکار بلکہ ان کی تنقید کا ہدف وہ علماء بھی بنے جو اپنے عالی منصب سے نفرت، بادشاہوں کی کاسہ لسی اور جاگیرداروں کی خوشامد کو اپنا دین سمجھے ہوئے تھے۔ ان فقہاء پر بھی بر سے جنگی قبائیں ان کے فتویٰ فروشی کے باعث بے گناہ خون سے لتھڑی ہوئی تھیں۔ ان مفتیوں کا تعاقب کیا جن کی حیلہ جوئیوں، ہمیہ کاریوں اور فریب سازیوں کی وجہ سے دین باز بچہ اطفال بن کر رہ گیا تھا۔ ان زاہدوں کی بھی خبر لی جو کج خموشی میں مسائلِ زندگی سے بے خبر تصوراتی دنیا میں گم سم تھے جنہیں کسی بیوہ کے سر سے دوپٹہ اترنے کسی کی بیٹی کے پیرہن نچنے، کسی یتیم کے اجڑنے اور کسی غریب کے لٹنے کا کوئی احساس نہ تھا۔ وہ خطیب بھی ان کی حق گوئی کی سان پر چڑھے جن کے خطبے خشک، وعظ بے تاثیر، تقریریں بے روح اور مقالے بے جان تھے جن سے نہ آنکھوں میں عشق کا سرور نہ چہرے پر یقین کا نور پیدا ہوتا۔ المختصر صوفیوں کا مقدس گروہ جہاں جہاں پہنچا، تبلیغ و نصیحت کا حق ادا کرتا، حق گوئی کے پرچم گاڑتا، بیباکی کے پھریرے لہراتا اور اخلاص و سوز کے نشانات چھوڑتا گیا۔ (۱۸)

صوفیائے کرام کو جہاں کوئی خلاف شرع کام نظر آیا فوراً ٹوکا جہاں قرآن و سنت سے تجاوز کا رجحان دیکھا سدراہ بن گئے۔ جہاں بدعت کو سراٹھاتے پایا وہیں کچل دیا۔ جہاں کوئی بات دین اسلام کے منافی نظر آئی اس کے استیصال کی بھرپور کوشش کی۔ جب بھی اور جہاں بھی محسوس کیا کہ خدا کے حدود اور اس کے رسول ﷺ کے طریقوں کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ کون اس فعل کا مرتکب ہے فوراً نیام زبان سے شمشیر حق نکالی اور نخوت و کبر سے بھرے کلاہ داروں، انانیت و غرور سے سرشار عمامہ پوشوں، کروفر کے نشے میں دھت سریر آراؤں کی اکڑی گردنیں ہوا میں اچھال دیں۔ اور ان کی تندی خاک میں سلا دی۔ جب اور جہاں موقع ملا حق کی بات سنادی بادشاہوں کو مرصع اور مست ہاتھیوں پر زنگار ہودج میں بیٹھے خدام و حشم کی فوج کے جلو میں سیر کرتے دیکھا تو وہیں پیغام حق سنا دیا۔

بھرے دربار میں چوہداروں کے درمیان تخت و تاج سے آراستہ و پیراستہ جلوہ افروز دیکھا تو حق بات کہنے میں تامل نہ کیا۔ بادشاہوں نے بلوا کر نصیحت چاہی تو چلے گئے اگر انہوں نے راستے میں رکاوٹیں ڈالیں تو بھی دروازوں پر دستک دے آئے۔ حق گوئی زندگی کا نصب العین بنالیا تھا تو بہر طور نبھایا خواہ کوئے یا موقع ملایا سوئے دار جانا پڑا۔ تاریخی حقائق سے یہ بات واضح ہے کہ صوفیائے کرام نے تبلیغ حق اور نصیح خیر کا فریضہ بڑی بے باکی اور جوانمردی سے سرانجام دیا جو نظام مصطفیٰ کے علمبرداروں کے لئے بجا طور پر مشعل راہ کا کام دے سکتی ہے۔

خواجہ فرید الدین عطارؒ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید اپنے معتمد وزیر فضل کے ہمراہ حضرت خواجہ فضیل بن عباس کے در دولت پر حاضر ہوا اور دروازہ کھٹکھٹایا پوچھا کون وزیر نے جواب دیا ”امیر المومنین“ خواجہ فضیل نے فرمایا۔ امیر المومنین کا مجھ سے کیا کام اور مجھے ان سے کیا واسطہ؟ وزیر نے کہا بادشاہ کی اطاعت واجب ہے۔ فرمایا مجھے پریشان نہ کرو۔ وزیر نے کہا اندر آنے کی اجازت دو ورنہ ہم حکماً اندر آجائیں گے۔ فرمایا اجازت تو نہیں دیتا حکماً اندر آ سکتے ہو۔ چنانچہ خلیفہ اور وزیر اندر آ گئے۔ خواجہ فضیل نے چراغ گل کر دیا تاکہ ہارون الرشید کو نہ دیکھ سکیں۔ اسی اثناء میں ہارون کا ہاتھ آپ کے ہاتھ سے چھو گیا فرمایا کیسا نرم ہاتھ ہے کاش کہ دوزخ کی آگ سے بچ جائے۔ خلیفہ نے درخواست کی۔ کچھ ہدایت فرمائیے۔ جواب دیا کہ تیرا باپ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا چچا تھا۔ اس نے درخواست کی تھی کہ مجھے کسی صوبے کا حاکم بنا دیا جائے۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ ”یا عم بك نفسك“

یعنی اے چچا تجھے تیرے نفس کا امیر کیا۔ ہارون الرشید نے کہا کچھ اور فرمائیے فرمایا یہ ملک تیرا گھر ہے اور رعایا تیری اولاد ہے، ماں باپ کے ساتھ نرمی، بہن بھائیوں پر مہربانی، بچے بچیوں سے نیکی کا سلوک کر، اگر کوئی مفلس بڑھیا رات کو بھوکے سو جائیں گی تو قیامت کے دن وہ بھی تیری دامن گیر ہوگی اور تیرے ساتھ جھگڑے گی۔

اس واقع میں بیک وقت بادشاہوں سے بے نیازی، امراء و وزراء سے بے رغبتی، مملکت کی ذمہ داریوں کو باحسن پورا کرنے کی تلقین، وعظ و نصیحت اور فکر آخرت نمایاں ہے۔ شفیق سے شفیق باپ بھی اتنی نرمی اور پیار سے بیٹے کو زمانے کے نشیب و فراز سے آگاہ نہ کرتا ہوگا جتنی شفقت اور محبت سے خواجہ فضیل نے ہارون الرشید کی رہنمائی فرمائی۔ دینی اخوت، ایمانی ہمدردی اور انسانی مروت لفظ لفظ سے ٹپکتی پڑتی ہے۔ زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ اور ہر حرف اخلاص و سوز لیے ہوئے ہے۔ اور انداز دامن میں اپنائیت سموئے ہوئے ہے۔ رہا یہ سوال کہ خلیفہ و وزیر کے آنے پر دروازہ نہ کھولنا یا اندر آنے کی اجازت نہ دینا اخلاق و مروت کے خلاف ہے۔ تو اس کے بارے میں بادشاہی تامل تہہ تک پہنچا جاسکتا ہے کہ فقیروں کے وہ دروازے جو ہر اپنے غیر کے لئے ہر وقت کھلے رہتے ہیں، ہر عام و خاص کے لئے واہ



ہوتے ہیں۔ وہ ہارون و فضل پر کیسے بند ہو سکتے ہیں لیکن اس میں تبلیغ و نصیحت کا پہلو تھا اور یہ باور کرنا مقصود تھا کہ حق کے علمبردار کبھی قرب شاہی کے لئے بے قرار نہیں ہوتے۔ یہی وہ بے نیازی ہے جو بات میں تعدد و نبات اور تقریریں شہد و شیر کی مٹھاس بھر دیتی ہے اور دل کے لوہے کو مقناطیس کی طرح اپنی جانب کھینچ لیتی ہے یوں ایک تیر سے دو شکار ہو جاتے ہیں۔

عباسی خلافت کے ایک تاجدار خلیفہ المنصور کا واقعہ ہے۔ حضرت سفیان ثوری نے حج کے موقعہ پر منیٰ کے میدان میں خلیفہ المنصور کو پکڑ لیا اور کہا۔

امیر المؤمنین! حضرت عمرؓ نے ایک حج کے عام مصارف پر سولہ دینار خرچ کئے تھے آپ نے خدا اور امت محمدیہ کا بے شمار مال بغیر اجازت صرف کیا ہے۔ آپ اس کا کیا جواب دیں گے۔ منصور لا جواب ہو گیا بعد میں انہیں یعنی حضرت سفیان ثوری کو سلسلہ حکومت میں منسلک کرنا چاہا تو وہ روپوش ہو گئے۔ (۱۹)

نامور، ذی جاہ، طاقتور اور باہیت حکمران کے منہ آنے والا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والا، خلیفہ راشد ثنائی کے طریقے سے ہٹنے پر ٹوکے والا، جوابدہی کا احساس ابھارنے والا۔ امت محمدیہ کی امانت یاد دلانے والا اور منصب حکومت کو ٹھکرانے والا کون تھا؟ یہ اسی گروہ کا نامور فرزند تھا جو آج تک طعن و تشنیع کے چر کے سہتا آ رہا ہے کہ صوفیاء عافیت کو ش، خلوت پسند اور امور دنیا سے گریزاں ہوتے ہیں۔

ملک شاہ سلجوقی کا بیٹا سلطان سنجر پورے خراسان کا حاکم تھا۔ نمود و نمائش کا رسیہ اور زرق برق لباس پہننے کا دلدادہ جب نکلتا تو خدام و حشم کی فوج لیکر نکلتا تھا۔ چوہداروں کی ایک جماعت ہٹو بچو کی صدائیں بلند کرتیں شاہانہ کروفر اسکی ایک ایک بات سے ٹپکتا تھا۔ اسی نوع کی ایک تقریر میں امام غزالیؒ نے اُسے خطاب کر کے کہا۔

”افسوس مسلمانوں کی گردنیں مصیبت اور تکلیف سے ٹوٹ جاتی ہیں اور تیرے گھوڑوں کی گردنیں طوقہائے زریں کے بار سے۔ (۲۰)

جب بھی صوفیائے کرام نے دیکھا کہ اقتدار کی امانت کو نا اہل ہاتھوں کے سپرد کیا جا رہا ہے اور عوام کی گردنوں پر فاسق و فاجر کو بٹھایا جا رہا ہے تو ان کا رد عمل کیا تھا؟ اس سلسلہ میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا ایک واقعہ ہماری بہترین رہنمائی اور حقیقت مال کی وضاحت کرتا ہے۔ جب خلیفہ ”مقتضیٰ لا مرِ اللہ“ نے قاضی ابوالوفاءؒ کی کو منصب قضاء سونپا تو اس واقعہ پر احتجاج کرتے ہوئے ایک اجتماع میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے برسرِ منبر خلیفہ کو سخت الفاظ میں مخاطب کر کے فرمایا۔

”تم نے مسلمانوں پر ایک ایسے شخص کو حاکم بنایا ہے جو ظلم الظالمین ہے کل قیامت کے دن اس رب العلمین کو جو رحم الراحمین ہے کیا جواب دو گے“ (۲۱)

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا روان ولایت کے سالار کے علاوہ ہمہ جیت شخصیت کے مالک ہیں۔ ہزاروں انسانوں جتنا کام اس مرد خدا نے تنہا ماحول کی ناسازگاری اور باد مخالف کی تندی کے باوجود کر دکھایا۔ آپ نے ایک طرف بادشاہوں کے دامن کو پکڑ کر جھنجھوڑا تو دوسری جانب ان عمامہ پوشوں کا تعاقب کیا جن کی علمی اور اخلاقی کمزوریوں کے باعث سلاطین و حکام دین کے معاملہ میں جری اور بے خوف ہو گئے تھے۔ ایک موقع پر اسی طبقہ کو خطاب کر کے فرمایا۔

”اے علم و عمل میں خیانت کرنے والو! تمہیں ان سے کیا نسبت۔ اے اللہ اور اسکے رسول کے دشمنو! اے رہزنو! تم کھلے ظلم اور نفاق میں مبتلا ہو۔ یہ نفاق کب تک رہے گا۔ اے عالمو! اے زاہد! شاہان و سلاطین کے لئے کب تک منافق بنے رہو گے کہ ان سے دنیا کا زر و مال اور اسکی شہوات و لذات لیتے رہو گے تم اور اکثر بادشاہ اس زمانے میں اللہ تعالیٰ کے مال اور اسکے بندوں کے متعلق ظالم اور خائن بنے ہوئے ہیں۔

شیخ کے اس خطاب میں اسلام کی غیرت، ایمان کی حمیت، مسلمانوں کی فلاح کی تڑپ، راہ حق سے ہٹے ہوؤں کی اصلاح کے لئے بے قراری، نفاق و بندگی، زر و مال اور کتمان حق کے استیصال کے لئے بے چینی بآسانی ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ (۲۲)

تصوف نے جو ذہن اور افراد تیار کیے ہیں۔ وہ بیک وقت عبادت گزار اور تقویٰ شعار بھی ہیں اور علم و اخلاق کے علمبردار بھی۔ ان کے اندر علمی گہرائی بھی پائی جاتی ہے اور روحانی عظمت بھی۔ خدمت خلق ان کا شیوہ ہے تو معاشرتی اصلاح ان کا وتیرہ۔ اگر وہ معیت اور قرب خداوندی سے سرشار ہیں تو دوسری جانب ان کے دل خلق خدا کی محبت و ہمدردی سے لبریز بھی ہیں۔ ایثار ان کا نصب العین ہے اور مروت ان کی متاع حیات۔ جہاں وہ صدق و صفا کے پیکر ہیں وہاں ہبذل و عطا کے مجسمے بھی ہیں۔ گفتگو نرم نظر آتے ہیں مگر دم جستجو گرم بلکہ سرگرم دکھائی دیتے ہیں۔ حلقہ یاراں میں بریشم اور رزم حق و باطل میں مانند فولاد ہیں ایک طرف وہ تبلیغی سرگرمیوں میں منہمک ہیں اور دوسری طرف استیصال باطل کے لئے مصروف عمل۔ غرضیکہ ایک ایک فرد بجائے خود انجمن اپنی ذات میں تحریک اور انسانی پیکر میں انقلاب ہے۔ رات کو ان کی آنکھیں خشیت خداوندی سے اشکبار ہوتی ہیں اور دن کو ظالم و جابر کی آنکھوں سے ملائی جاتی ہیں۔ نمازیں تضرع اور زاری سے جھکی گردنیں دربار میں اکڑی رہتی ہیں۔ شکستہ مسجد کے خستہ حال مؤذن کی تکبیر پر دوڑ پڑنے والے یہ فقیر بادشاہوں کے ہزار بلاوے پر بھی ادھر کا رخ نہیں کرتے۔ خدا کے حضور کا پنپنے اور لرزنے والے یہ انسان ایوان

شاہی میں پہاڑوں کی سی مضبوطی کے ساتھ بات کرتے ہیں۔ مزدور بن کر بیواؤں، ضعیفوں اور مسافروں کا بوجھ اٹھانے والے، وقت کے بادشاہوں کی اطاعت کے حلقے کا بارگردن پر نہیں سہہ سکتے۔ یہ بندگان مولا صفات اور قدس عادات یہ پاکباز، پاک نفس اپنی زندگی اس شان سے بسر کرتے ہیں کہ ان کی پوری زندگی خدا کی بندگی شمار ہوتی ہے کیونکہ ان کا ہر قدم رضائے خدا تعالیٰ کی طلب میں اٹھتا ہے۔ ان کے ہر عمل کا منہا خدا کی خوشنودی ہے۔ ان کی نماز، ان کی قربانی ان کی زندگی اور ان کی موت سب رب العلمین کے لئے ہوتی ہے۔ حق و صداقت کے یہ پیکر جس راہ سے گزرے ان کے قدموں کی مٹی کا ہر ذرہ جادہ پیماؤں کے لئے مشعل راہ اور منزل کے لئے سنگ میل ہوتا گیا اور ان کے ذرات راہ دعوت و عزیمت کی تاریخ کا مستقل عنوان بنتے گئے جو قابل فخر بھی ہیں اور آنے والوں کے لئے قابل تقلید بھی اور یہی ایک انسان کے درست مقام کا کردار اور انہی لوگوں نے اس کردار کے لئے انسانوں کے شعور کو بیدار کیا۔ (۲۳)

## فصل سوم

### انسانی زندگی سے بے مقصدیت کے خاتمے اور نصب العین

#### کے تعین کے سلسلے میں صوفیاء کی تعلیمات

صوفیائے کرام کی عظمت و جلالت کا راز ان کے فقر غیور میں پوشیدہ ہے۔ جب فقیر آداب خود آگاہی کا معلم بنتا ہے تو انسان کو اپنی منزل آسمانوں سے بھی پرے نظر آتی ہے۔ فقر بجائے خود فخر ہے۔ فقر کے حسین چہرے کو مزید کسی غارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ فقر کے روئے دلا رام کو مشاطہ فطرت خود سنوارتی نکھارتی ہے۔

تاریخ تصوف کا جہاں ہر باب بصیرت افروز ہے وہاں دلچسپ بھی ہے۔ ایسی ایسی باتیں سامنے آتی ہیں کہ عقل و رطہ حیرت میں ڈوب ڈوب جاتی ہے۔ یہ تو بارہا ہوا کہ قصر مرم سے لگا ہیں کنیا کی طرف اھیں مگر ایسا ہرگز نہیں ہوا کہ جھونپڑی کی درز سے کبھی نظروں نے فلک بوس مخلوں کا طواف کیا ہو۔ یہ نظارہ تو ہزاروں لوگوں نے دیکھا کہ مرمیں محل سے اکتا کر شاہان وقت گھانس پھونس کی جھونپڑی میں آ کر عافیت کے طالب ہوئے مگر اس کا ایک بھی گواہ نہیں کہ بوریا نشین نے شاہوں کی چوکھٹ پر سر نیاز جھکا یا ہو۔ وارثان کسری و جم تو تاج و تخت سے اکتا گئے مگر بوڑو سلمانؑ کے مسند نشین کبھی دل برداشتہ نہ ہوئے۔ تاریخ نے شاہوں کو آتے دیکھا لیکن گداؤں کو جاتے نہیں دیکھا۔ امیروں کو کھدر کے چیتھڑے اس آگئے لیکن فقیر کو صریو پر نیاں، کانٹوں کا اوڑھاوا لگے۔

تاج زر اور خرقة فقر کی داستان بڑی ہی عجیب و غریب ہے۔ تخت کے موتی اور ہیرے وہ کچھ نہ دے سکے جو

شاہی میں پہاڑوں کی سی مضبوطی کے ساتھ بات کرتے ہیں۔ مزدور بن کر بیواؤں، ضعیفوں اور مسافروں کا بوجھ اٹھانے والے، وقت کے بادشاہوں کی اطاعت کے حلقے کا بار گردن پر نہیں سہہ سکتے۔ یہ بندگان مولا صفات اور قدس عادات یہ پاکباز، پاک نفس اپنی زندگی اس شان سے بسر کرتے ہیں کہ ان کی پوری زندگی خدا کی بندگی شمار ہوتی ہے کیونکہ ان کا ہر قدم رضائے خدا تعالیٰ کی طلب میں اٹھتا ہے۔ ان کے ہر عمل کا منہا خدا کی خوشنودی ہے۔ ان کی نماز، ان کی قربانی ان کی زندگی اور ان کی موت سب رب العلمین کے لئے ہوتی ہے۔ حق و صداقت کے یہ پیکر جس راہ سے گزرے ان کے قدموں کی مٹی کا ہر ذرہ جادہ پیاؤں کے لئے مشعل راہ اور منزل کے لئے سنگ میل ہوتا گیا اور ان کے ذرات راہ دعوت و عزیمت کی تاریخ کا مستقل عنوان بنتے گئے جو قابل فخر بھی ہیں اور آنے والوں کے لئے قابل تقلید بھی اور یہی ایک انسان کے درست مقام کا کردار اور انہی لوگوں نے اس کردار کے لئے انسانوں کے شعور کو بیدار کیا۔ (۲۳)

## فصل سوم

### انسانی زندگی سے بے مقصدیت کے خاتمے اور نصب العین

#### کے تعین کے سلسلے میں صوفیاء کی تعلیمات

صوفیائے کرام کی عظمت و جلالت کا راز ان کے فقر غیور میں پوشیدہ ہے۔ جب فقیر آداب خود آگاہی کا معلم بنتا ہے تو انسان کو اپنی منزل آسمانوں سے بھی پرے نظر آتی ہے۔ فقر بجائے خود فخر ہے۔ فقر کے حسین چہرے کو مزید کسی غارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ فقر کے روئے دل آ رام کو مشاطہ فطرت خود سنوارتی نکھارتی ہے۔

تاریخ تصوف کا جہاں ہر باب بصیرت افروز ہے وہاں دلچسپ بھی ہے۔ ایسی ایسی باتیں سامنے آتی ہیں کہ عقل و رطہ حیرت میں ڈوب ڈوب جاتی ہے۔ یہ تو بارہا ہوا کہ قصر مرمر سے نگاہیں کٹیا کی طرف اھیں مگر ایسا ہرگز نہیں ہوا کہ جھونپڑی کی درز سے کبھی نظروں نے فلک بوس محلوں کا طواف کیا ہو۔ یہ نظارہ تو ہزاروں لوگوں نے دیکھا کہ مرمریں محل سے اکتا کر شاہان وقت گھانس پھونس کی جھونپڑی میں آ کر عافیت کے طالب ہوئے مگر اس کا ایک بھی

گواہ نہیں کہ بوریا نشین نے شاہوں کی چوکت پر سر نیاز جھکایا ہو۔ وارثان کسری و جم تو تاج و تخت سے اکتا گئے مگر بوذرؤ سلمان کے مسند نشین کبھی دل برداشتہ نہ ہوئے۔ تاریخ نے شاہوں کو آتے دیکھا لیکن گداؤں کو جاتے نہیں دیکھا۔ امیروں کو کھدر کے چیتھڑے راس آگئے لیکن فقیر کو صریو پر نیاں، کانٹوں کا اوڑھاوا لگے۔

تاج زر اور خرقة فقر کی داستان بڑی ہی عجیب و غریب ہے۔ تخت کے موتی اور ہیرے وہ کچھ نہ دے سکے جو

بیابان کے ذروں نے دیا۔ گلاہ خسروی اس قدر داغ کو اونچا نہ کر سکی جتنا کہ روئی کی ٹوپی نے کر دیا۔ سکندر گھڑی گھڑی بدلتے رہے مگر قلندر جہاں تھے وہیں رہے کیونکہ یہی انسانیت کی معراج کبریٰ ہے۔ سکندر کو تخت و تاج سیر چشتی نہ دے سکے مگر قلندر کو فقر نے تو نگر بنا دیا۔ (۲۴)

اب آئیے تاریخ کی روشنی میں صوفیاء کی تعلیمات اور کردار کو ملاحظہ فرمائیں کہ انہوں نے اپنی زندگیوں میں بے مقصدیت کو ختم کیا۔ دنیا سے بیزار ہو گئے اور اس راہ پر چلے جو بامقصد زندگی کی راہ ہے جو معرفت الہی کی راہ ہے۔ یوں سمجھیے کہ تاج زر کو چھوڑا اور خرقة فقر کو اپنایا۔ سید اشرف جہانگیر، شیراز کے حاکم اعلیٰ 808ھ میں وفات پائی۔ آپ کے بارے میں آتا ہے۔

آپ نے سمنان و شیراز کے تخت سلطنت کو والدہ کی اجازت سے چھوڑ کر فقر و درویشی اختیار کی۔ حاکم شاہ، کیچ مکران کے گورنر تھے۔ 1368ء میں وفات پائی۔ آپ کے بارے میں ڈاکٹر شیخ اکرام لکھتے ہیں۔ ”شاہ رکن عالم ملتان کے مرید بنے، گورنری چھوڑ کر ارشاد و ہدایت اور تبلیغ اسلام میں مصروف ہو گئے۔ اوچ اور سکھر کا درمیانی علاقہ آپ کا مرکز بنا۔

وقت کے صاحب جلالت اور پُر ہیبت بادشاہ فقیروں سے ملنے کا شوق دل میں پیدا کئے رہے مگر اللہ والوں کے دل میں کبھی شاہ کی ملاقات نے چٹکی نہیں لی۔ ان کے نزدیک لوگوں کے دین کے لئے دنیا اور دنیا داروں کا قرب بکریوں کے لئے بھیڑیے کی نسبت زیادہ نقصان دہ تھا۔ بادشاہ کے کروفر نے فقیر کے دل کو نہیں لبھایا لیکن ارباب تحت و تاج ان کے ہاں حاضری کو دنیا و آخرت کی سعادت سمجھتے رہے۔

حضرت شیخ برہان الدین مرغینائی صاحب الہدایہ کے شاگرد شیخ برہان الدین بلخی کے بارے میں شیخ مرغینانی کی پیش گوئی تھی۔

”یہ بچہ اس قدر عظیم و جلیل ہوگا کہ بادشاہ ان کے دروازے پر حاضری کو سعادت سمجھیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ سلطان غیاث الدین بلبن ہمیشہ جمعہ کی نماز کے بعد شیخ برہان الدین بلخی کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ (۲۵)

حضرت شیخ قطب الدین کاشانی جہاں ایک طرف مرجع عوام تھے وہاں وہ مرجع خواص بھی تھے۔ حلقہ ارادت میں ممتاز مشائخ سے لیکر جلیل القدر بادشاہ تک شامل تھے۔ ہزاروں لاکھوں لوگوں کے مرشد و رہنما خواجہ بہاؤ الدین زکریا بھی ان میں سے تھے جن کے دل شیخ کاشانی کی عقیدت اور محبت سے لبریز تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ کاشانی ایک دوسرے کے موقع پر جب تک ملتان ٹھہرے رہے خواجہ بہاؤ الدین زکریا روزانہ صبح کی نماز ان کے پیچھے جاکر پڑھتے تھے اور نیاز

حاصل کرتے تھے۔ شیخ کاشانی جب ملتان کے راستے دہلی تشریف لے گئے تو سلطان شمس الدین التمش شہنشاہ ہند نے بنفس نفیس باہر نکل کر آپ کا استقبال کیا اور دعائیں حاصل کیں۔

انہی سلطان شمس الدین کا بیٹا شہزادہ ناصر الدین بھی اپنے والد کی طرح اللہ والوں کا عقیدہ مند تھا۔ جب وہ ملتان اور اوج کے دورہ پر گیا تو اوج دھن (پاک پتن) میں شیخ فرید الدین گنج شکر کی قدم بوسی کی۔

سلطان شمس الدین التمش، باوجود شہنشاہ ہونے کے خود بھی متقی اور متشرع انسان تھا اگر وہ خلعت شاہی کی بجائے صوف کا خرّہ اور کلاہ خسروی کی جگہ کلاہ فقراور ڈھ لیتا تو وقت کا صوفی اور شیخ ہوتا۔ تاہم اس کے صالح، پرہیزگار اور متدین ہونے پر ایک زمانہ متفق ہے۔ سلطان کو منجملہ دیگر بزرگوں کے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی خلیفہ اول خواجہ معین الدین چشتی سے خصوصی عقیدت تھی۔ دارالحکومت دہلی میں جب شیخ ملتان سے آئے تو سلطان نے خدا کا شکر ادا کیا اور شہر سے باہر نکل کر آپ کا خیر مقدم کیا۔ خواجہ حامد بن فضل اللہ جمالی شیخ اور سلطان کی مخلصانہ عقیدت کے متعلق تحریر کرتے ہیں۔

”سلطان ہفتے میں دو بار آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ سے فیض حاصل کرتا چونکہ آپ کی قیام گاہ شہر سے باہر اور ذرا فاصلے پر تھی۔ سلطان نے عاجزی سے درخواست کی اگر براہ کرم و عنایت آپ شہر کے نزدیک قیام پذیر ہوں تو بہت بہتر اور نہایت خوب ہو۔ آپ نے سلطان کی درخواست منظور کر لی“

آپ ان واقعات سے اندازہ فرماتے جائیے کہ بے مقصد زندگی کیا ہے اور بامقصد زندگی کیا ہے۔ شان فقر اور عظمت فقیر کا اور تاج شہی کے علمبردار کا فرق ملاحظہ فرمائیں۔

شیخ رکن الدین ابوالفتح جنہیں دو بادشاہوں کا زمانہ ملا۔ بایں ہمہ فقیر نے کبھی شاہوں کی جانب التفات نہ کیا مگر ”شاہ“ باب فقیر سے مستغنی نہ رہ سکے۔ دراصل وہ خوب جانتے تھے کہ ”نعم الامیر علی باب الفقیر“ میں دونوں کی عزت ہے صاحب سیر العارفین شیخ ابوالفتح کی دہلی آمد کے بارے میں لکھتے ہیں۔

”شیخ دو مرتبہ سلطان علاؤ الدین اور تین مرتبہ سلطان قطب الدین کے زمانے میں دہلی تشریف لائے۔ سلطان علاؤ الدین باوجود یکہ آشوب چشم میں مبتلا تھا مگر آپ کے استقبال کے لئے سوار ہو کر گیا۔ اور نہایت اعزاز کے ساتھ آپ کو شہر لایا۔“

سیر العارفین کے مصنف شیخ ابوالفتح کی بادشاہوں سے ملاقات اسکی غرض اور شاہوں کے طرز عمل کی روداد کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ صوفیاء اگر کبھی شاہوں کے دربار میں گئے۔ تو دو مقاصد کے علاوہ تیسرا کوئی مقصد نہ تھا۔ ایک تبلیغ حق اور وعظ و نصیحت، دوسرے حاجتمندوں کی حاجت برآری کے لئے ورنہ صوفیائے کرام کو نہ کبھی

شاہی دربار سے دلچسپی رہی اور نہ شاہوں سے ملاقات کا شوق۔ تاریخ کی گواہی دیکھیے۔

شیخ رکن الدین ابوالفتح سلطان قطب الدین سے ملنے شاہی محل میں جاتے تو لوگوں کی ڈھیروں عریاں ہمراہ رکھتے۔ تیسری دہائی پر سلطان آپ کا استقبال کرتا اور اندر لے جاتا دوزانور ہو کر باادب آپ کے سامنے بیٹھ جاتا اور آپ کی تشریف آوری کو بہت بڑی عنایت اور نعت تصور کرتا۔ آپ اپنے خادم کو حکم دیتے کہ وہ لوگوں کی عریاں لائے۔ سلطان تمام عریوں کو پڑھتا۔ مناسب حکم دیتا اور آپ اس وقت تک واپس نہ جاتے۔ جب تک مخلوق کے تمام معاملات طے نہ ہو جاتے۔

اسی مصنف نے شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے ساتھ سلطان شمس الدین التمش کے حسن عقیدت کی منظر کشی ان الفاظ میں کی ہے۔

”شیخ تبریزی بغداد سے دارالخلافت دہلی آئے تو سلطان شمس الدین التمش نے دہلی سے باہر آ کر آپ کو خوش آمدید کہا۔ جب آپ ابھی دور ہی تھے سلطان کی نظر پڑی تو احتراماً گھوڑے سے اتر پڑے اور والہانہ انداز میں مصافحہ کیا۔ (۲۶)

تاریخ کے صفحات میں ہمیں ایسے واقعات جا بجا ملتے ہیں جو اس امر کی مستند گواہی کی حیثیت رکھتے ہیں کہ بیسیوں شہنشاہان بندگان خدا کی خدمت اور ارادت کو اپنا قیمتی اثاثہ تصور کرتے اور ان سے تعلق کو عزت سمجھتے تھے۔ سچ ہے جو خدا کا ہو گیا دنیا اس کی بن گئی جو اس سے پھر دنیا بھی پھر گئی۔ ان حقائق کا انکار کیونکر ممکن ہے کہ وقت کے باجبروت سلاطین نے صوفیاء کرامؒ کی عقیدت کا قلاوہ اپنے گلے میں ڈالا اور اسے موتیوں کا ہار سمجھا۔ ہر چھا جانے والی رات اور نکلنے والا دن انکی عقیدت و ارادت میں برابر اضافہ کرتا جاتا۔

شہنشاہ ہند فیروز تغلق کو شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی سے بہت عقیدت تھی۔ سلطان علاؤ الدین خلجی خواجہ نظام الدین دہلویؒ کا مرید تھا۔ جلال الدین خلجی بھی آپ سے نیاز مندی کا شرف رکھتا تھا۔ سلطان احمد خان بہمنی سید محمد گیسو دراز کا ارادت مند تھا۔ والی ہرات شاہ حسین خواجہ عبید اللہ اصرار کا معتقد اور باقاعدہ آپ کے سلسلہ سے منسلک تھا۔ حاکم بیجا پور ابراہیم عادل شاہ ثانی پیر ہاشم گجراتی کا ارادت کیش تھا۔ سلطان نصیر الدین ہمایوں شیخ حامد بن فضل اللہ جمالی کے عقیدتمندوں میں سے تھا۔ یہ اور ایسی سینکڑوں مثالیں ہمارے مدعا کو واضح کرتی ہیں کہ بور یہ نشینی میں عرش نشینی کا مزہ صوفیاء کرامؒ نے لوٹا ہے اور یوں فقر کی لاج رکھی۔ وہ اس کو با مقصد زندگی سمجھتے تھے۔ اور یقیناً ہے۔

سلطان محمد جلال الدین اکبر جسے منتظم، مدبر، صاحب کروفر اور شان و شکوہ کے لحاظ سے مغل اعظم کہا جاتا ہے۔

اپنی تمام تر سطوت و وجاہت کے ساتھ فقراء کی جھگیوں کا طواف کرتا اور اس طرح تاریخ کا ایک نیا اور زریں باب رقم ہوتا۔ وقت کا شاہنشاہ جو پچاس برس پورے دبدبے سے حکومت کرتا رہا۔ فقیروں کے ہاں یوں نظر آتا کہ وہ خادموں میں سے ایک ہے۔ جب آتا تو ذہن سے سکندری نکال کے آتا اور دل میں بحر ارادت و جذبہ خدمت کے اور کچھ نہ ہوتا۔ صدرالصد در شیخ عبدالنبی کے ساتھ اکبر کی ارادت و عقیدت کا یہ عالم ہوتا۔

”ایک دفعہ جوتے ان کے سامنے اٹھا کر رکھے“

والی ہند خواجہ اجیر می کے ساتھ عقیدت و ارادت ذیل کے الفاظ سے ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

”اکبر سال بسال اجیر جاتا کوئی مہم یا اس کے علاوہ بھی ایک منزل سے پیادہ پا جاتا اور بعض منتیں مانتا اور ادا کرتا خصوصاً جہانگیر کے تولد سے پہلے تو ایسی بھی ہوئیں کہ فتح پور یا آگرہ سے اجیر تک پیادہ گیا۔ (۲۷)

اکبر بادشاہ شیخ سلیم چشتی کا بھی بے حد عقیدت مند تھا شیخ سلیم ہی کے نام پر اپنے بیٹے کا نام سلیم رکھا جو بعد میں شہنشاہ نورالدین محمد جہانگیر کے نام سے مشہور ہوا۔ اکبر نے سلیم کی پیدائش کے دو برس بعد شیخ سلیم چشتی سے اپنی عقیدت کا اظہار اس طریقے پر کیا۔

”خانقاہ شیخ کوروحانی و عرفانی چشمہ جان کروہاں ایک شہر تعمیر کروایا چنانچہ 1571ء میں فتح پور کی شاندار عمارتیں بنی شروع ہوئیں اور یہ معمولی شہر شہنشاہ ہند کا پایہ تخت بن گیا۔ (۲۸)

خواجہ محمد زبیر سرہندی المتوفی 1151ھ سے امراء اور اعیان سلطنت کی عقیدت و ارادت کی یہ کیفیت تھی۔

”جب شیخ مکان سے مسجد تشریف لے جاتے تو امراء راستہ میں دو شالہ اور رو مال بچھا دیتے کہ آپ کا پاؤں زمین پر نہ پڑے۔“

حجۃ اللہ فی الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اپنے بزرگوں کا ذکر کرتے ہوئے مختلف مشائخ کرام سے بڑے بڑوں کی ارادت کا حال بیان فرماتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم کا کہنا ہے۔

”جب شیخ آدم بنوری کی شہرت عام ہوئی تو دھوم شاہجہان تک پہنچی۔ شاہ نے وزیر سعد اللہ خان اور ملا عبدالکیم سیالکوٹی کو بھیجا تا کہ حقیقت حال کا علم ہو۔ دونوں شیخ کی خدمت میں پہنچے۔ شیخ مراقبہ میں تھے۔ باہر نکلے تو دونوں آپ کے حجرے میں داخل ہوئے۔ شیخ ان کی تعظیم بجا نہ لائے یہ دیکھ کر دونوں بگڑ گئے۔ سعد اللہ خان نے کہا میں تو اہل دنیا میں سے ہوں مگر ملا عبدالکیم تو عالم دین ہیں۔ ان کی تعظیم ضروری ہے آپ نے جواباً ارشاد فرمایا۔ حدیث میں وارد ہے۔



العلماء آمناء الدين مالم يخالطوا الملوك اما اذ خالطوهم فهم علماء دين متين کے پہریدار اور محافظ ہیں جب تک صحبت اللصوص۔ (۲۹)

ایک دن بہمن یار خان لباس فاخرہ زیب تن کر کے حضرت خواجہ میر دردؒ (صاحب سیر الاولیاء) کی خدمت میں آیا۔ اس وقت آپ کے گھر میں کوئی فرش نہیں تھا۔ لوگ زین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بہمن یار خان بھی زین پر بیٹھ گیا۔ حاضرین میں سے کوئی شخص اٹھا اور خواجہ کے کان میں کہا۔ یہ بہمن یار خان ہے اس کی تعظیم کرنی چاہیے خواجہ صاحب نے باواز بلند کہا ”اگر یار ہے تو محتاج تعظیم نہیں اگر غیر ہے تو لائق تعظیم نہیں۔“ (۳۰)

حضرت میاں میر قادریؒ لاہوری کے دروازے پر بھی کئی بار بادشاہوں نے دستک دی اور نیاز بجلائے۔ آپ کے عقیدتمندوں میں سرفہرست شاہ جہان کا نام ہے۔ آپ کے ساتھ ان کی عقیدت کا تذکرہ ”تذکرہ مشائخ قادریہ میں یوں ملتا ہے۔“

”جب شاہ جہاں لاہور آیا تو شہزادہ بلند اقبال بھی اسکے ہمراہ تھا حضرت میاں میرؒ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ دوسری بار بھی شہزادہ ان کے ہمراہ حاضر ہوا۔ اس وقت شہزادے کی ارادت مندی کا یہ عالم تھا وہ آپ کے مکان کی دوسری منزل میں جہاں آپ کا قیام تھا برہنہ پا گیا اور جو لونگ وہ چبا کر پھینکتے جاتے انہیں اٹھا کر کھاتا جاتا تھا۔“ (۳۱)

حضرت شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادیؒ چودھویں صدی کی بڑی با اثر روحانی شخصیت گذری ہیں۔ اپنی درویش منشی، سادگی، غیرت فقر اور للہیت کے باعث خاصی مشہور ہیں۔ آپ کے در دولت کو نبجانے کتنے امیروں، رئیسوں، نوابوں اور منصب داروں نے چوما۔ کتنے کج کلاہ سلامی دیئے آئے۔ اور کتنے سریر آراء جاروب کش بنے۔ آپ کی کشش کا یہ عالم تھا کہ ایک زمانہ امنڈا چلا آتا مسلمان امراء کا تو کیا کہنا غیر مسلم ارکان سلطنت کو بھی آپ سے ملنے کا اشتیاق رہا اور دل میں جذبہ عقیدت موجزن رہا۔ مولانا ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں۔

”ایک دفعہ صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے لیفٹیننٹ گورنر نے آپ سے ملنے کی اجازت چاہی۔ آپ نے لوگوں سے فرمایا میں تو ایک فقیر آدمی ہوں۔ ان کے بیٹھنے کا کیا انتظام ہوگا۔ اچھا ایک کرسی منگا لینا۔ لیفٹیننٹ گورنر کی طرف سے تاریخ اور وقت بھی مقرر ہو گیا اور آپ لوگوں سے یہ کہہ کر بھول بھی گئے۔ یہاں تک کہ لیفٹیننٹ گورنر معہ چند حکام اعلیٰ موجود ہوئے۔ سب کھڑے تھے۔ ایک میم بھی کھڑی تھی۔ شیخ نے الٹے گھڑے کی طرف اشارہ فرمایا کہ ”بی بی تو اس پر بیٹھ جا“۔ لیفٹیننٹ گورنر نے کچھ تبرک مانگا۔ آپ نے ایک خادم سے فرمایا کہ بھائی دیکھو میری ہنڈیا میں کچھ ہو تو ان کو دے دو۔ اس میں سے کچھ چورا مٹھائی کا نکلا بس سب کو تھوڑا تھوڑا تقسیم کر دیا۔ سب نے ادب اور خوشی سے قبول کیا

اور تھوڑی دیر بیٹھ کر اجازت چاہی اور رخصت ہوئے۔ چلتے وقت نصیحت کی درخواست کی تو فرمایا ”ظلم مت کرنا۔  
ان تمام تاریخ، مستند اور مضبوط حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صوفیاء کرام نے بے مقصد زندگی کو خیر آباد کہہ کر  
بامقصد زندگی گزاری۔ ان کی زندگیوں میں تواضع، انکساری اور عاجزی کا پہلو تھا اور نظر خدا پر تھی۔ ”مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ  
رَفَعَهُ اللّٰہُ“ جو خدا کے ہاں سرنگوں ہو۔ خدا اسے سر بلند کر دیتا ہے۔ خادم بن کر رہنے سے خدا مخدوم بنا دیتا ہے۔ صوفیاء  
نے بلاشبہ یہی طریقہ اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں عزیز جہاں بنا دیا۔ (۳۲)

## اسلام ایک مکمل دستور حیات:

صوفیاء کرام کی زندگیاں قرآن و سنت کے احکامات کا عملی نمونہ ہیں۔ اسلام کا دستور ایک بامقصد زندگی گزار  
نے کے لیے ایک بہترین ضابطہ حیات ہے اس لیے صوفیاء کرام کی زندگیوں میں بے مقصدیت کا نام و نشان نہیں ہے بلکہ  
ان کا جہاد زندگی یہی رہا کہ خود بھی بامقصد زندگی گزاریں اور دوسروں کو بھی اس پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کریں۔ اسلام  
اور اہل اسلام کا مقصد اعلیٰ انسانی زندگی کا قیام ہے۔ ایسی بلند پایہ زندگی جس میں عقل و ضمیر کو مکمل آزادی ہو۔ ارادہ اور  
تفکر پر کوئی پابندی نہ ہو، جس میں ہر فرد معاشرہ محسوس کرے کہ وہ اپنی ذات اور اپنے معاملات کا خود مالک ہے۔ حق  
کے سوا، اس پر کسی کا حکم نہیں چلتا۔ وہ حق جو غالب رہتا ہے، مغلوب نہیں ہوتا۔ ذیل میں چند سطور تحریر کرتے ہیں۔ جو اس  
بات کی آئینہ دار ہیں کہ اسلام ایک بامقصد زندگی کا درس دیتا ہے۔

اسلام نے لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ اپنی عقل سے کام لیں، تاکہ وہ کائنات میں آیات الہی کی معرفت حاصل  
کریں، مخلوق میں اس کے قوانین کا ادراک کریں اور فطرت میں اس کی حکمت کو جانیں۔

اولم ينظروا في ملكوت السموات والارض۔ وما خلق الله من شئ۔ (۳۳)  
کیا ان لوگوں نے آسمان و زمین کے انتظام پر کبھی غور  
بھی جو خدا نے پیدا کیا ہے۔ آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا

غور و فکر کی قوتوں کو معطل کرنا، اور ان سے فائدہ نہ اٹھانا اسلام کی نظر میں ایک بہت بڑا جرم ہے۔ جس کے  
بارے میں انسان سے باز پرس ہوگی اور اس کا سخت محاسبہ کیا جائے گا۔

ان السمع والبصر والفؤاد كل اولئك كان عنه مسو لا۔ یقیناً آنکھ، کان اور دل سب سے ہی باز پرس ہوئی۔  
(۳۴)

اسلام نے اپنے عقائد، عبادات، عملی نمونوں اور گراں قدر اصولوں سے جامد جذبات میں زندگی کی لہر

دوڑادی۔ خوابیدہ قلوب کو بیدار کیا۔ انسان کے خیر و فلاح کے احساسات کو متحرک کیا، تاکہ انسان خوشگوار تعلقات، مخلص دوستی اور حسن کارانہ طرز عمل کے لئے اپنے اندر وسعت اور فراخ دلی محسوس کرے۔ اسلام نے ظلم و ستم اور بغاوت و سرکشی کے خلاف اعلان جہاد کیا تاکہ کسی کی عزت و ناموس پر ہاتھ نہ ڈالا جاسکے، کسی کی شرافت کو بے نہ لگایا جاسکے۔ کوئی کمزور و ناتواں اپنے آپ کو معاشرہ میں تنہا محسوس نہ کرے۔ غریب و نادار کو اپنی ہلاکت و بربادی کا خوف نہ رہے اور کسی کا مال ناحق نہ لیا جاسکے۔

اسلام نے روئے زمین پر نہایت پاکیزہ اور طیب معاشرہ قائم کرنے کی ٹھان لی۔ ایک ایسا معاشرہ، جس میں نہ شرک ہو نہ بت پرستی۔ بلکہ اس میں تو حید خالص ہو اور عبادت و بندگی صرف اللہ واحد کے لئے ہو۔ ایک ایسا سماج جس میں ظلم و استبداد نہ ہو بلکہ اس میں حق و انصاف اور حریت و اخوت کا دور دورہ ہو۔ ایک ایسی زندگی جس میں جہالت اور ناخواندگی نہ ہو۔ بلکہ اس میں علم و معرفت اور حکمت کی حکمرانی ہو۔ ایک ایسی حیات تازہ جس میں بے حیائی اور فحاشی کا دخل نہ ہو بلکہ طہارت، پاکیزگی، نظافت اور پاک دامنی ہو۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں حسد اور کینہ پروری نہ ہو بلکہ محبت، تعاون، خلوص، امداد باہمی اور اخوت ہو۔ ایسی حیات صالحہ جس میں نہ فضول خرچی ہو نہ تعیش بلکہ اس میں انفاق ہو، سخاوت ہو اور ایثار ہو۔ ایسی زندگی جس میں جو اور شراب نہ ہو بلکہ محنت، عمل اور رزق حلال کے حصول کی طلب ہو۔

اسلام کا مقصد فرد کو مہذب بنانا اور جماعت میں باہمی تعاون اور ایثار کی روح پھونکنا ہے۔ اس کے نظام حکومت کی بنیاد باہمی مشورہ پر ہے۔ اس نظام کی غرض و غایت، دین کی حفاظت ہے۔ حکومت کا مقصد، دنیا کے نظام کو صحیح ڈگر پر چلانا ہے۔ اسلامی حکومت کا اولین مقصد انسانیت کو دین اسلام کی دعوت دینا ہے تاکہ جتنی جلدی ہو سکے، انسانی اخوت عام ہو، امن و امان کا دور دورہ ہو اور انسان اس نظام حکومت میں ایک با مقصد زندگی گزار سکیں اور ہر قدم پر امن و چین اور سکون کے لمحات حاصل رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس اسلام پر عمل کرنے والے ایک با مقصد زندگی گزارتے ہیں اور وہ اسلام کو اس سائنس، ٹیکنالوجی اور ایٹم کے دور میں لوگوں کے سامنے بڑے فخر کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

(۳۵)

فصل چہارم

## انسانی کردار میں جرأت اقدام کی صلاحیت کی

## تشکیل اور صوفیاء کی تعلیمات

(مذکورہ بالا پہلوؤں سے موجودہ صورت حال اور اصلاحی لائحہ عمل)

قرآن مجید میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کے بارے ارشاد فرمایا۔

محمد الرسول الله والذين معه اشداء على الكفار رحماء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو  
بینہم تراهم ركعاً سجداً يبتغون فضلاً من الله ورضواناً كفار کے لئے بہت سخت ہیں۔ آپس میں رحمدل ہیں  
سماهم في وجوهم من اثر السجود۔ ان کو دیکھ کر میں اللہ کے فضل اور رضا کو تلاش کرتا ہوا دیکھے گا۔ ان  
(۳۶) کچھ کتب سے روشن ہیں۔

مردانگی کے بارے میں دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله۔ (۳۷)  
یہ ایسے مردان خدا ہیں کہ کوئی تجارت اور نہ خرید و فرو  
از سر اللہ ذکر سے روک نہیں سکتی۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ

افضل الجهاد كلمة حق عند السلطان الجائر۔ (۳۸) جابر بادشاہ کے سامنے کلمہ حق کہنا افضل جہاد ہے۔

صوفیائے کرام کی زندگیاں مسلسل جہاد سے عبارت ہیں۔ جدید علم نفسیات میں عمل کے دو محرکات تسلیم کئے گئے  
ہیں۔ ترغیب اور ترہیب اور عمل کے سلسلہ میں یہی دو مانعات بھی ہیں۔ یعنی اگر کسی کو کسی کام سے روکنا مقصود ہے تو دو ہی  
حر بے استعمال کئے جاسکتے ہیں یا لالچ دیکر خرید لیا جائے یا دھمکا کر خاموش کر دیا جائے مگر جن لوگوں کے مذہب و مسلک  
کی بنیاد ”امانت داری“ اور ”اخلاص“ پر ہواں پر دونوں کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ ترغیب کی صورت میں وہ تاج اسکندری پر  
ٹیرھی نگاہ ڈالنا بھی پسند نہیں کرتے اور ترہیب کے ضمن میں ان کا عقیدہ ہے۔

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں

اک جان کا زیاں ہے سوا یا زیاں نہیں

ان کا ضمیر اور ان کی جان دونوں خدا کی امانت ہیں۔ بھاری سے بھاری قیمت کے عوض ضمیر بیچنا ان کے منشور زندگی میں  
نہیں کہ امانت ناقابل بیع و شرا ہوتی ہے۔ دل کا خوف انہیں دامن کش نہیں ہوتا کہ وہ ”جان دی ہوئی اسی کی تھی۔“ کے

مسلک کے علمبردار ہیں۔ اس لئے ترغیب و ترہیب دو ایسے ہتھیار ہیں جو ان پر کبھی کارگر ثابت نہیں ہوئے۔ صوفیائے کرام نے نہ صرف خانقاہوں میں بیٹھ کر اصلاح اخلاق اور تزکیہ نفس کی کوششیں کیں بلکہ ترہیب کے تمام تر فلسفے کے علی الرغم بادشاہوں، امیروں، تاجداروں اور کلاہ پوشوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی۔ بادشاہوں کے ایوانوں، امراء کے درباروں، تاجداروں کی نخوت و تندہی اور کلاہ پوشوں کی جاہ و حشمت کا صرف یہ ہی نہیں کہ صوفیاء نے اثر قبول نہیں کیا بلکہ اسے سراسر ناک کا کھیل سمجھا۔

ہر وہ تحریک جو رضا کا رانہ بنیادوں پر اٹھائی گئی ہو اس کی بنیاد میں اگر امانت و اخلاص موجود نہیں تو وہ کبھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ دین کہ جس کا سارا دار و مدار قلب و روح کی آمادگی پر ہے۔ اس کے لئے یہ دونوں شرطیں بہ طریق اولیٰ لازم ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی روحانی و اخلاقی فلاح کے لئے اور مسائل زندگی کی اصلاح کے لئے خداوند عالم کی جانب سے ایک لاکھ سے زیادہ نفوس قدسی الہام و وحی سے سرفراز ہوئے اور منصب نبوت پر فائز ہو کر لوگوں کو بھولی ہوئی بات اور فراموش کردہ عہد یاد دلایا لیکن اس کے طریق کار کے سلسلہ میں مختلف امتوں اور مختلف زمانوں کے انبیاء کے درمیان جو قدر مشترک ہمیشہ موجود رہی وہ یہی امانت و اخلاص کی قدر تھی اور یہی اوصاف انسان کو جرأت اقدام کی صلاحیت سے سرفراز کرتے ہیں۔

ہر نبی نے آتے ہی قوم کے سامنے اپنی بے غرضی، بے نفسی اور اخلاص کا یقین دلایا اور لوگوں کے ذہنوں میں اس بات کو راسخ کرنے کی برابر کوشش فرمائی۔ سورۃ شعراء کی متعدد آیات ملاحظہ فرمائیے۔

”قوم نوح نے بھی پیغمبروں کو جھٹلایا جب اُن سے اُن کے بھائی نے کہا کہ تم نہیں ڈرتے۔ میں تو تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں تو خدا سے ڈرو میرا کہا مانو اور اس کام کا تجھ سے کچھ صلہ نہیں مانگتا۔ میرا صلہ تو رب العلمین پر ہی ہے۔ (۳۹) جناب ہود نے فرمایا!

”عاد نے بھی رسولوں کو جھٹلایا جب اُن سے اُن کے بھائی ہود نے کہا کیا تم ڈرتے نہیں ہو میں تو تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں تو خدا سے ڈرو اور میری بات مانو اور میں اس خدمت کا تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا میرا معاوضہ تو جہانوں کے پروردگار کے پاس ہے۔“ (۴۰) جناب صالح قوم سے مخاطب ہیں۔

قوم ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا جب ان سے ان کے بھائی صالح نے کہا کہ تم ڈرتے کیوں نہیں۔ میں تمہارے لئے ایک امانت دار رسول ہوں تو خدا سے ڈرو اور میری بات مانو اور اس خدمت کا معاوضہ تم سے نہیں چاہتا میرا معاوضہ

رب العلمین کے ذمہ ہے۔ (۴۱)

حضرت لوطؑ اپنی حیثیت اور رسالت کی غرض و غایت واضح کرتے ہوئے گویا ہیں۔

قوم لوط نے رسولوں کی تکذیب کی جب ان سے ان کے بھائی لوط نے کہا تم تقویٰ کیوں نہیں اختیار کرتے ہو میں تمہارے لئے امانت دار رسول ہوں تو تم اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو اور میں تم سے اپنے اس کام کا کوئی صلہ نہیں مانگتا میرا اجر جہانوں کے پالنہار کے پاس ہے۔ (۴۲)

حضرت شعیبؑ بھی دوسرے انبیاء کرام سے ہم آہنگ اور ان کے ہمنوا ہیں اور فرماتے ہیں۔ میں تم سے اس کام کا کوئی بدلہ نہیں چاہتا میرا اجر تو جہانوں کے پالنے والے پر ہے۔ (۴۳)

قرآن مجید میں ایک ایسے فرستادہ کا ذکر ملتا ہے جو شہر کے کنارے سے آیا تھا۔ اس نے جو بات جس درد اور سوز میں ڈوب کر کہی اور جس اخلاص اور اپنائیت سے کہی۔ ایک طرف وہ اس کے جذبہ اطاعت حق کی غماز تھی اور دوسری جانب مقام رسالت و منصب نبوت کو واضح کرنے کے لئے دلیل قاطع اور برہان سا طع تھی۔ اس نے کہا۔

”اے قوم رسولوں کی اتباع کرو۔ ان کی اتباع کرو جو تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتے اور وہ ہدایت یافتہ ہیں۔“ (۴۴)

اس نے بیک وقت دو باتیں کہیں کہ رسول کی صداقت کی دو ہی دلیلیں ہو سکتی ہیں، اس کے قول و فعل میں ہم آہنگی اور صلہ سے بے نیازی اور یہ دونوں چیزیں انبیاء کرام کی سیرتوں کا طرہ امتیاز ہیں اس نے اپنے کلام میں یہ کہہ کر زور پیدا کیا کہ اتباع تو کرنی بھی اس کی چاہیے جو داد و ستد سے بے پرواہ، حصول منفعت اور جلب زر سے گریزاں اور لالچ اور غرض سے پاک ہو۔

جناب رسالت مآب ﷺ نے بھی اس عقیدے کا اظہار بار بار فرمایا۔ (۴۵)

”آپ کہہ دیجئے میں تم سے اس خدمت کے لئے کسی معاوضے کا طلب گار نہیں“ حضور ﷺ نے متعدد بار اپنے خطبوں میں لوگوں پر یہ امر واضح کیا کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں کسی صلہ کی تمنا، مزد و معاوضے کی خواہش اور داد و پیش کی آرزو کے بغیر کر رہا ہوں بلکہ آپ نے زندگی بھر اس امر کا اہتمام کیا کہ کسی سے کوئی چیز اس طرح نہ لی جائے چاہے وہ عاریت ہو یا قرض حسنہ کے طور پر، جس میں اجر و معاوضہ کا کوئی شائبہ تک موجود ہو۔ رسول خدا کی بے نفسی اور بے غرضی کا اس سے بڑا کوئی اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اولاً آپ نے کوئی میراث نہیں چھوڑی، ثانیاً اگر کوئی اہل قریب چھوڑی بھی ہے تو کسی کو اپنا وارث نہیں ٹھہرایا اور ثالثاً تمام صدقات واجبہ کو اپنے اولاد پر حرام قرار دے دیا۔ ادنیٰ سے ادنیٰ شائبہ بھی اگر پیدا ہونے کا

امکان تھا تو اس کی راہ بھی مسدود کر دی۔ بخاری کی ایک روایت ہے کہ سیدہ عائشہؓ فرماتی ہیں۔

”رسول اللہ ﷺ نے ایسے عالم میں وفات پائی کہ آپ کی زرہ میں 30 صاع جو کے بدلے ایک یہودی کے پاس گروی رکھی ہوئی تھی۔“ (۴۶)

یہودی سے قرض لینے کی مصلحتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے شارحین حدیث اور علماء نے مختلف آراء پیش کی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ

”آپ اس کے شبہ اور شائبہ سے بھی بچنا چاہتے تھے کہ آپ کے ذریعے اہل ایمان کو دین کی جو دولت ملی، اس کے عوض آپ کوئی حقیر سے حقیر بھی دنیوی فائدہ ان سے اٹھائیں اس لئے ضرورت کے موقع پر آپ قرض بھی غیر مسلموں سے لینا چاہتے تھے“

اسی اخلاص و امانت کو تصوف کے حلقوں میں فقر غیور کہا جاتا ہے۔ جرأت اقدام کی صلاحیت جو ان صوفیاء کرام میں تھی وہ اپنی مثال آپ تھے۔ انہوں نے جن کٹھن حالات، ناسازگار ماحول اور مخالف فضا میں تبلیغ و اشاعت کا مشکل ترین اور صبر آزما فریضہ سرانجام دیا۔ اسکی مثال نہیں ملتی۔ لیکن اس سب کے باوجود صوفیاء کا دامن لالچ اور حرص سے پاک ہے۔ قدموں میں عہدے ڈالے گئے، ہاتھوں میں جاگیروں کے قبائے دیے گئے۔ مراعات و وظائف کے پروانے پیش کئے گئے، آزمائش و امتحان کے طور پر زور و جواہر ڈھیر کئے گئے شاید آنکھیں ان کی چکا چوند سے خیرہ ہو جائیں۔ قبول منصب کی صورت میں حاصل ہونے والے فوائد اور انکار کے نتیجے بھی پیش آنیوالے مصائب و شدائد گنوائے گئے۔ بیک وقت دو متضاد کیفیتوں سے دوچار کر کے انعام و اکرام قبول کرانے کی کوششیں کی گئیں۔ قریبی عزیزوں اور عزیز دوستوں کو درمیان میں لاکر ”قفص زر“ میں ان ”طائران لاہوتی“ کو بند کرنے کے جتن کیے گئے مگر ان کی روح کی آزادی، دل کے غنا اور فقر کی غیرت انہیں کسی چیز کی طرف آمادہ و مائل نہ کر سکی، انہوں نے گھاس پھوس کے جھونپڑوں کو ایوان شاہی، ٹاٹ کی ٹوپی کو کلاہ خسروی، کھدر کی پوسٹین کو قبائے سلطانی، جو کے ان چھنے آٹے کی روٹی کو مرغ و ماہی کی تابوں، فرش خاک کو سنبال و سمور کے بستروں اور بور یہ نشینی کو صدر نشینی کے عوض نہ بیچ کر غیرت فقر کی لاج رکھی اور یہی ان کی کل کائنات تھی۔

صوفیائے کرام کو ہمیشہ یہ منفرد اعزاز حاصل رہا ہے کہ انہوں نے دنیا کو پاؤں کی ٹھوکر اور بندگان دنیا کو جوتے کی نوک پر رکھا۔ ان کا مٹی کا لوٹا بوسیدہ چٹائی، ٹوٹی تسبیح اور پھٹی ٹوپی شاہوں کے تخت و تاج سے قیمتی تھی۔ جنہیں فرش خاک پر اور فقیروں کے درمیان بیٹھنے کا لطف میسر آیا۔ انہیں مسند امارت پر اور خدام و حشم کے جلو میں بیٹھنا کیسے راس

آسکتا تھا۔ اس لئے جب سلطان بخر نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کو نیم روز کی گورنری پیش کی تو آپ نے اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

صوفیائے کرام جہاں بھی گئے فقر و استغناء کی مثالیں قائم کر آئے جو خدمت سرانجام دی بلا مزد و معاوضہ سرانجام دی۔ تبلیغ کو پیشہ نہیں بلکہ فریضہ سمجھ کر ادا کیا۔ لوگوں کو ایمان و ایقان کی لازوال دولت سے نوازنے کے باوجود ان کی دولت میں خود کو کبھی حصہ دار نہ جانا۔ بادشاہ ان کے جھونپڑوں کا طواف کرتے رہے مگر انہوں نے کبھی شاہ کے در دولت پر دستک دے کر غیرت فقر کو مجروح نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ دنیا پرست علماء جو بادشاہوں کے گرد شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھناتے تھے اور ان کے اشارہ ابرو پر ضمیر و ایمان کے سودے چکاتے تھے۔ باوجود منصب و جاہ اور سرکاری تحفظ و مراعات کے لوگوں کے دلوں میں وہ مقام پیدا نہ کر سکے جو ان بے نواؤں کو حاصل ہے اور آج تجربہ شاہد ہے کہ لوگ فوراً اس سے بدظن ہو جاتے ہیں جو امراء کے ارد گرد منڈلاتا ہوا اور وہ شخص دنیا کے دل کے تخت پر تمکن ہو جاتا ہے جس نے اپنا پیوند کسی کے پاس گروی نہ رکھا ہو۔

بادشاہوں نے اپنی سی کوشش کر ڈالی، امراء کی التجاؤں سے لگھی بندھ گئی، سرمایہ دار خاک چاٹتے رہے، جاگیردار پیشانیاں رگڑتے رہے، نواب در پر پڑے رہے۔ رئیس کہہ کہہ کر عاجز آ گئے۔ مہاراجوں کے تالو خشک ہو گئے۔ کسی نے نذر دینی چاہی، کسی نے ہدیہ دینا چاہا کسی نے جاگیر پیش کرنی چاہی، کسی نے منصب سوچنا چاہا۔ کسی نے وظیفہ جاری کرنا چاہا مگر کسی ایک کی کبھی پیش نہ گئی اور یوں صوفیائے کرام نے بڑی جرأت سے اپنے مشن کو جاری رکھا۔

شیخ نور ترک جن سے بابا فرید الدین گنج شکر، خواجہ نظام الدین اولیاء، خواجہ میر درد اور شیخ عبدالرحمن کو بھی عقیدت تھی۔ انہوں نے ذکر کیا کہ رضیہ سلطانہ نے ایک مرتبہ زرنقہ بھیجا۔ انہوں نے اس پر چھڑی ماری اور فرمایا اس کو میرے سامنے سے لے جاؤ۔ (۴۷)

صوفیائے کرام کی طبیعت میں بڑی بے نیازی اور غیرت تھی۔ کسی طمع اور کسی سے تمنا ان کی سرشت میں نہ تھی۔ نہ ہی دولت کے لئے ہاتھ پھیلائے اور نہ ہی ہاتھ اٹھا کر دیکھا۔

شیخ حامد بن فضل اللہ جمالی رقمطراز ہیں۔

”ایک بار سلطان شمس الدین اتمش نے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو دہلی کی ”شیخ الاسلامی“ کا منصب پیش کیا تو آپ نے اس پیش کش کی جانب مطلق توجہ نہیں کی۔“

حضرت خواجہ بختیار کاکی وہ شخصیت تھے جنہیں شیخ الاسلام سے نہیں اسلام سے محبت تھی۔ اس کی تو خواہش تھی



کہ زندگی اگر خادم اسلام کی حیثیت سے گزر جائے تو زہے نصیب شیخ الاسلام ہونا تو بڑی بھاری ذمہ داری ہے۔

عام لوگ جب صاحب منصب و جاہ بن جاتے ہیں تو ان کی گردنیں فخر سے تن جاتی ہیں۔ کسی کو جاگیر مل جائے تو اس کا قدم زمین پر نہیں پڑتا۔ کسی کو زمین کا قطعہ حاصل ہو جائے تو اس کے سر میں عجیب غرور آ جاتا ہے مگر فقر غیور جن کا سرمایہ حیات ہو وہ ان چیزوں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ خواجہ حسن دہلوی 19 جمادی الاول 712ھ کی ایک مجلس کی روئیداد جو حضرت خواجہ نظام الدین دہلوی کے بارگاہ میں دیکھی اور سنی لکھتے ہیں۔

”سعادت قدم بوسی میسر آئی۔ انہی دنوں کسی رئیس نے دو باغوں اور اسباب و آلات سمیت بہت سی زمین کی ملکیت کے کاغذات آپ کی خدمت میں بھجوائے تھے اور آپ کے ساتھ اپنے اخلاص کا اظہار کیا تھا۔ حضرت خواجہ نے قبول نہیں کیا۔ حضرت اس باب میں فرما رہے تھے کیا میں باغ، کھیتی اور زمین والا چوہدری بن جاؤں آپ تبسم فرما رہے تھے اور کہہ رہے تھے میں یہ قبول کر لوں تو لوگ کیا کہیں گے یہی کہ شیخ باغ کو جا رہا ہے۔ شیخ کھیتوں اور اراضی کے معائنہ کے لئے جا رہا ہے۔ یہ میرا عجیب و غریب فعل ہوگا۔ اس کا کوئی محل ہے۔ یہ کہتے کہتے آپ آبدیدہ ہو گئے۔ اور فرمانے لگے کہ ہمارے خواجگان اور ہمارے مشائخ میں سے کسی نے بھی اس طرح کا کام نہیں کیا۔ کسی نے سچ کہا ہے۔ (۴۸)

جو بھی تیرے فقیر ہوتے ہیں

آدمی بے نظیر ہوتے ہیں

اورنگ زیب عالمگیر کا ایک بیٹا صوفیاء اور اولیاء سے عقیدت رکھنے والا تھا اور اسے برابر کسی بزرگ اور صوفی کی تلاش رہی تاکہ زیارت سے فیضیاب ہو سکے۔ عالمگیر کو اس کی ان سرگرمیوں کا پورا علم تھا چنانچہ اس نے ایک مفصل خط میں بیٹے کو لکھا کہ ہر ہاتھ اس قابل نہیں کہ اسے پکڑ لیا جائے اور ہر دامن اس لائق نہیں کہ اسے تھام لیا جائے۔ بڑے بڑے دعویدار اکثر و بیشتر بہت چھوٹے ثابت ہوتے ہیں لہذا اس معاملے میں احتیاط و حزم اختیار کرو اور آخر میں ایک ایسے بزرگ کا واقعہ لکھا جو فقر و استغناء کا پیکر تھا جس کا اثر شہنشاہ نے دل کی گہرائیوں میں محسوس کیا۔ اورنگ زیب لکھتا ہے۔

”میں نے ایک بار شیخ عبداللطیف برہان پوری کو گاؤں قبول کرنے کی درخواست کی تو فرمایا

شاہ مارادہ دہد منت نہند

رزاق مارا رزق بے منت دہد

بادشاہ ہمیں گاؤں دیتا ہے تو احسان دھرتا ہے۔ ہمارا رزق ہمیں بغیر منت جتائے رزق دیتا ہے۔

شیخ نے بڑی لطافت اور خوبی سے اپنی بے نیازی کا اظہار بھی کر دیا اور مصنوعی اور حقیقی خداؤں میں فرق بھی

واضح کر دیا حضرت مرزا جانجاناںؒ کی بارگاہ میں ایک امیر نے حویلی اور خانقاہ تیار کر کے اور فقراء کی وجہ معاش مقرر کر کے آپ کی خدمت میں پیش کی مگر آپ نے قبول نہ فرمایا اور جواب دیا۔

”چھوڑ جانے کے لئے اپنا اور بیگانہ مکان برابر ہیں۔ فقیروں کا خزانہ صبر و قناعت ہے۔“ (۴۹)

حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ ایک دن بہت پرانی پھٹی چادر پہنے ہوئے تھے۔ نواب فیروز جنگ دربار میں حاضر تھے۔ یہ حال دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے اپنے ایک مصاحب سے کہا کہ ہم گہنگاروں کی کیسی بد قسمتی ہے کہ وہ بزرگ جن کی خدمت میں ہمیں ارادت ہے ہماری نیاز قبول نہیں کرتے آپ نے فرمایا۔

”فقیر نے روزہ رکھا ہوا ہے کہ امیروں کی نیاز قبول نہیں کروں گا اب جبکہ آفتاب غروب ہونے کے قریب پہنچ گیا ہے۔ میں اپنا روزہ کیوں توڑوں۔“

حرص اور طمع نہ ہو تو بات کرنے میں جرأت ہوتی ہے۔ ہر نیک اور اچھا قدم اٹھانے میں کوئی کمزوری نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام نے ظالم اور جابر حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی اور خلاف شریعت کسی کام کو بلا خوف و جھجک رد کیا بلکہ اس کے خلاف بھرپور اور جرأت مند اقدام کیا۔ (۵۰)

## موجودہ صورت حال اور اصلاحی لائحہ عمل

اس وقت جو مسلمانوں کی صورت حال ہے وہ بے حد ناگفتہ بہ ہے نام کے مسلمان ہیں۔ عمل نہیں ہے۔ جب تک مسلمان حضور ﷺ کے متبع رہے۔ اقوام عالم میں بلند مقام رہا۔ دنیا میں بھی عزت تھی اور دین میں بھی عزت! کیوں نہ ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔

انتم الاعلون ان کنتم مومنین (۵۱)

تم ہی سر بلند رہو گے۔ شرط یہ ہے کہ تم صحیح معنی میں مومن  
موجود ہو۔

معاملات ہوں یا عبادات، ہر دونوں صورتوں میں ہم حضور ﷺ کی غلامی ترک کر چکے ہیں۔ صحیح معنی میں مسلمان وہی ہے جس کے اعمال ظاہرہ اور اعمال باطنہ دونوں اسوۂ حسنہ مصطفیٰ ﷺ کے مطابق ہوں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت مسلمان چار طبقوں میں بٹ چکا ہے۔

1- اعمال ظاہرہ ہیں تو پھر اعمال باطنہ نہیں ہیں۔

2- اعمال باطنہ ہیں تو پھر اعمال ظاہرہ نہیں ہیں۔

3- نہ اعمال باطنہ ہیں اور نہ ہی اعمال ظاہرہ ہیں۔

4۔ اعمال ظاہرہ بھی ہیں اور اعمال باطنہ بھی ہیں۔ مگر الاقلیل!

عہد نبوی اور عہد صحابہ کے بعد صوفیائے کرام کی مقدس جماعت تھی جنہوں نے مسلمانوں کو درست مقام و مرتبہ تک پہنچنے کا درس دیا۔ اسی جماعت نے باطل قوتوں کی تردید کی اور اتباع رسول مقبول ﷺ کی تلقین کی لیکن اسی جماعت صوفیاء میں کچھ ایسے لوگ آگھے جنہوں نے اس کے تقدس کو مجروح کیا۔ وہ جھوٹی اور بے سند پیری مریدی ہے۔ اور اسی چیز نے مسلمانوں کے شیرازے کو منتشر کر کے انہیں ذہنی پریشانی اور احساس کمتری میں مبتلا کر دیا ہے۔

جس طرح یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اکثر اولیاء اللہ نے اپنی روحانی طاقت اور علوم علوی کے ذریعے سورج، چاند ستارے، آگ، ہوا، پانی اور کائنات کے ایک ایک ذرہ کو باذن اللہ مسخر کر کے روحانی طور پر خلیفۃ اللہ ہونے کا عملی ثبوت دیا اور بہت سے حضرات نے حقیقت محمدی ﷺ کو پا کر دنیا کو علوم معرفت اور نور محمدی سے منور کر دیا ہے۔ اور عوام الناس کو ان علوم اور روحانی فیض سے مستفیض کیا ہے اسی طرح یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بہت سے نام نہاد اور جھوٹے پیروں اور مرشدوں نے عوام الناس کے بیشتر حصے کو اپنی پیری مریدی کی آڑ میں من گھڑت اور خود ساختہ طور طریقوں پر ڈال کر قرآن و سنت کے بتلائے ہوئے صراط مستقیم سے بہت دور جا پھینکا ہے۔ یہ جھوٹے اور کذاب پیر اور ملنگ ہیں جو دراصل استدراج کے مالک ہیں۔ بظاہر مسمریزم، ہپناٹزم، جادو اور ٹوکوں کے ذریعے سادہ لوح اور سادہ دل لوگوں کو شریعت اسلامی سے ہٹا کر اپنی طرف راغب کر لیتے ہیں اور پھر خود ساختہ طور طریقوں کو عبادت کے نام سے رائج کر لیتے ہیں۔ اور اس طرح لوگوں کو قرآن و سنت سے ہٹا کر ایسی بدعات میں مبتلا کر دیتے ہیں جو بظاہر تو اچھے کام نظر آویں لیکن حقیقت میں وہ قرآنی احکام سے غفلت میں ڈالنے والے ہوتے ہیں۔

قرآن شاہد ہے کہ وہ لوگ جو قرآن و سنت کے علاوہ ایسے طور طریقے رائج کر لیتے ہیں جن کے باعث وہ لوگوں کو راہ حق سے ہٹا کر ان خود ساختہ راہوں پر ڈال لیتے ہیں۔ جو مومنین کی مسلک کے خلاف ہوں تو ان پر اللہ ایک شیطان مسلط کر دیتا ہے۔ جو انہیں لہو و لعب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اور پھر ان کو بھی شیطان کی طرح مہلت دی جاتی ہے تاکہ وہ چند دن اس دنیا کی رنگ رلیوں میں اپنا جی بہلا لیں مگر ان کا انجام جہنم ہی ہے۔ جو بہت بری جگہ ہے۔

اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کسی منصب و ولایت کے مالک تو نہیں ہوتے مگر وہ اپنے اندر یہ تصور رکھتے ہیں کہ ہم صاحب ولایت و منصب ہیں۔ اور بعض وہ لوگ ہیں جن کے باپ دادے تو اچھے پیر اور ولی اللہ گذرے ہوں لیکن خود کسی ولایت و کرامت کے مالک نہیں ہوتے یا لوگ ان کی تعظیم، تعریف اور توقیر کر کے انہیں اوپر چڑھا دیتے ہیں۔ جس کے باعث وہ خواہ مخواہ ”پدرم سلطان بود“ کی بھول بھلیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور باپ دادوں کے نام پر پیری کو

سنجھالے رہتے ہیں۔ وہ اصل امانت تو ان کے ہاتھوں سے ”لاینال عہدی الظالمین“ کے حکم کے بموجب چھنی ہوئی کہیں اور نمودار ہوتی ہے مگر یہ صاحب اپنے آپ کو پیر بنا کر گدی نشین بن جاتے ہیں اور پھر طرح طرح کی شعبہ بازیوں سے لوگوں کو اپنے گرد جمع رکھتے ہیں یا باپ دادوں کے قصے سنا سنا کر اپنی وقعت اور کبریائی جماتے اور روپے بٹورتے رہتے ہیں۔ (۵۲)

کوئی شخص بظاہر ہوا میں اڑتا ہوا کیوں نہ آ رہا ہو اور صاحب کشف و کرامت ہو لیکن اس نے قرآن و سنت کے خلاف کوئی حکم یا فعل جاری کر دیا ہو تو وہ صوفی نہیں پیر نہیں ہے بلکہ آدم نما ابلیس ہے۔ اس کا قرآن گواہ ہے کہ

ومن لم يحكم بما انزل الله فاولئك هم الكافرون۔ فاولئك هم جولوگ اللہ تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے احکام کے منکر  
الظالمون۔ فاولئك هم الفاسقون (۵۳) ہیں۔ ظالم ہیں اور فاسق ہیں۔

مگر آج کل حق و باطل کی کوئی تمیز نہیں رہی ہے۔ اصل پیر اور نقلی پیر کا عوام کے سامنے کوئی معیار نہیں ہے۔ جس کا جی چاہے وہ اپنے آپ کو پیر بنا سکتا ہے۔ کیونکہ جہاں کسی نے جھنڈا گاڑ دیا وہاں لوگوں کی بھرمار شروع ہو جاتی ہے پھر نہ حق دیکھا جاتا ہے نہ ناحق جو سائیں بابا نے کہہ دیا وہ وحی کی حیثیت رکھتا ہے۔ امیر، غریب چھوٹے بڑے مرد و زن سب اپنی اپنی مرادوں کو لیکر باباجی کے پاس پہنچتے ہیں۔ نذرانوں کی بھرمار ہے۔ ہر شخص باباجی سے اپنی مراد بیان کرتا ہے۔ اور دعا لیکر چلا جاتا ہے۔ نہ باباجی کو یہ خیال کہ ان لوگوں کو کچھ راہ ہدایت کی تلقین کریں کچھ قرآن و سنت کے احکام بیان کریں کچھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہی فریضہ ادا کریں۔ کچھ مواظظ حسنہ کہہ ڈالیں۔ بس مراد پوچھی اور دعا کا شکرانہ جیب میں ڈالا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

لیکن افسوس ہے کہ آج اس اصل جماعت صوفیائے کرام کا وجود نہیں ہے اور اگر ہے تو آٹے میں نمک کے برابر ہے جو اس کے اصل نصب العین کو آشکار کرے اور عوام کو احساس کمتری اور ذہنی انتشار سے نجات دلائے۔

## اصلاحی لائحہ عمل:-

اس دور کا اہم تقاضا یہ ہے کہ جھوٹی اور بے سند پیری مریدی جس کی وجہ سے اصل صوفیاء اور تصوف بدنام ہوا ہے اس کو ختم کیا جائے اور تصوف کا اصل نصب العین اور غرض و غایت کو دنیا کے سامنے واضح کیا جائے۔ سچے اور حقیقی صوفیاء اور پیر حضرات کو دعوت و تبلیغ اسلام۔ احیائے سنن اور اصلاح عالم کے عظیم کام پر دوبارہ لگایا جائے۔ تاکہ وہ اپنے عمل و کردار کو نمونہ بنا کر کشف و کرامات، علوم ظاہری و باطنی سے غیر اسلام ادیان پر دین حق کا اظہار کر کے اسلام کی

حقانیت کو دنیا پر ثابت کریں اور آپ کوثر کے اس روحانی چشمہ فیض سے ساری دنیا کو مستفیض کر سکیں۔ اس انتخاب میں ”قرآن و سنت اور علم فقہ سے پوری واقفیت، محبت رسول اور عشق الہی سے مخمور ہونا، عمل صالح، نماز کی پابندی، تقویٰ، ایثار، جان و مال، اکل حلال، خشیت الہی، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، رضائے الہی اور قرب خداوندی کی تمنا کو معیار بنایا جائے اور اس کے لئے ایسے قابل ترین اور مستند صوفیائے کرام و پیران عظام کی ایک شورئی بنائی جائے۔ جو سالکین کو مذکورہ بالا معیار پر پرکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ علاوہ ازیں ایسی دینی یونیورسٹیاں بنائی جائیں جہاں قرآن و سنت اور فقہ کے علاوہ ہر چار طریقوں کے اسباق بھی پڑھائے جائیں۔ مجاہدے کرائے جائیں۔ سلوک کے تمام راستے طے کرائے جاویں اور جب سالک تمام ظاہری اور باطنی علوم کے زیور سے آراستہ ہو جاوے اور وہ تمام اسناد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو پھر اسے کسی علاقہ یا ملک کے لئے نامزد کر دیا جائے۔ تاکہ وہ صحیح معنی میں دعوت و تبلیغ اسلام اور اظہار دین حق کا کام انجام دے سکے۔

ان تمام خود ساختہ طور طریقوں کو بند کر دیا جائے جو قرآن و سنت کے خلاف اور اسلام کے نام پر بدنام داغ ہوں۔ لہذا اس کے لئے سب سے پہلے ”بے سند پیری مریدی“ کو ختم کر کے جھوٹوں اور کذابوں کو اسلام کے نام پر دھوکہ اور فریب و دجل سے باز رکھنا لازمی ہے اور چند مخصوص و مستند خانقاہوں کے علاوہ ان تمام گدیوں کو بند کرنا جو محض روپیہ پیسہ بٹورنے کی خاطر کھولی گئی ہیں۔ جنہوں نے دنیا کی متاع قلیل کی خاطر نیک دل اور سادہ لوح مسلمانوں کو اپنے معبود حقیقی سے ہٹا کر شیطان کے راستے میں ڈال دیا جس کی ان بیچاروں کو خبر نہ لگ سکی ہے۔ (۵۴)

آئیے سنئے جو لوگ صحیح معنی میں اللہ کے بندے اور صوفی تھے کامل اولیاء تھے انہوں نے محض رضائے الہی کی خاطر بندگان خدا کی تربیت و اصلاح کی۔ جو بھی ان کی محفل میں آ گیا وہ اصلاح یافتہ ہو گیا۔ ان کے ایک ایک حرف اور لفظ میں ایسی تاثیر تھی کہ نشتر کی طرح دل میں کھب جاتی تھی۔ ان کے ہاں بیٹھنے والے کس قسم کے انسان بن کر نکلتے تھے۔ محافل کیسی ایمان افروز ہوتی تھیں جہاں احترام انسانیت، خوف خدا، خدمت خلق، محبت، تقویٰ، اخلاص، عجز و نیاز، ایثار، توکل اور حسن اخلاق کے چرچے ہوتے تھے۔ ایسی ہی چند محافل کی جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

دہلی میں خانوادہ چشت کے ممتاز رہنما کا دربار سجا ہے۔ بڑے چھوٹے ایک ہی مجلس میں برتری اور کمتری کے احساس سے بالا ہو کر بیٹھے ہیں۔ ستاروں کے اس ہالے میں خواجہ نظام الدین دہلوی چاند بن کر محفل آراء ہیں اور فرما رہے ہیں۔

”ایک شخص نے حضرت خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکر کی خدمت میں چھری پیش کی۔ فرمایا مجھے چھری نہ دو

مجھے سوئی لا دو۔ میں کاٹنے نہیں جوڑنے آیا ہوں۔“

یہ ہے برائے وصل کروں آمدی کی تفسیر۔ علم و عمل کے باہم لازم و ملزوم ہونے اور ان کی اہمیت و ضرورت کتنی ہے اسے شیخ بہاؤ الدین نقشبند نے کس خوبصورتی سے واضح کیا مجلس کی ایک جھلک گفتگو کا ایک حصہ ملاحظہ فرمائیے۔  
توشیح کی طرح بن توشیح کی طرح نہ بن شمع کی طرح بن بایں معنی کہ دوسرے کو روشنی پہنچائے اور شمع کی طرح نہ بن بایں معنی کہ تو خود تاریکی میں رہے۔

توکل اور توکل کی روح کیا ہے۔ حضرت ابو بکر شبلیؒ فرماتے ہیں۔

ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کثیر العیال ہونے کی شکایت کی فرمایا ان افراد کو گھر سے نکال دو جن کا رزق اللہ کے ذمہ نہیں۔

عجیب و غریب افعال کے صدور اور خرق عادت و واقعات کے ظہور ہی کو صرف کرامات سمجھا جاتا ہے۔ اور اسے عام ذہن معیار ولایت قرار دیتے ہیں۔ مگر اس الجھن کو شیخ بہاؤ الدین نقشبندؒ نے بڑے احسن انداز میں سلجھایا ہے۔ لوگوں نے آپ سے کرامات طلب کی تو فرمایا یہی کرامات کیا کم ہیں کہ اتنے گناہوں کے باوجود ہم روح زمین پر چل رہے ہیں۔ غیبت، زنا سے سخت، مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف ہے۔ گلہ، اخلاقی پستی کی انتہا ہے لیکن یہ سب کچھ بدگوئی میں شامل ہے۔ مگر بدخواہی کے بارے میں شیخ نظام الدین اولیاءؒ فرماتے ہیں۔

برا کہنا برا ہے۔ مگر برا چاہنا اس سے بھی بدتر ہے۔ (۵۵)

صوفیائے کرام کی زندگی کا مقصد ہی اپنی ظاہری اور باطنی اصلاح کے ساتھ ساتھ دیگر بندگان خدا کی ظاہری و باطنی اصلاح تھا چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ 'ادبنی ربی فاحسن تادیبی یعنی خداوند تعالیٰ نے مجھے ادب سکھایا اور خوب اچھا ادب سکھایا۔ (۵۶)

## ادب کی تعریف:

ادب کیا ہے؟ ادب ظاہر و باطن کی آراستگی و تہذیب کا نام ہے، جب کسی بندے کا ظاہر و باطن ادب سے آراستہ ہو جاتا ہے تو وہ صوفی بن جاتا ہے، دسترخوان (سفرہ) کو مادہ اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ بہت سی اشیاء پر مشتمل ہوتا ہے (اور ان سے پیراستہ ہوتا ہے) پس ایک شخص اس وقت تک مکمل ادب حاصل نہیں کر سکتا جب تک تمام اخلاق حسنہ اس میں مکمل طور پر جمع نہ ہو جائیں، مکارم اخلاق تحسین و تہذیب خلق سے یعنی جب نفس مہذب ہو جائے گا اسی وقت اخلاق حسنہ اس میں جمع ہوں گے۔ انسان کی شکل و صورت اس کی خلقت ہے اور اخلاق اس کی باطنی و معنوی صورت کا نام ہے پس جس طرح انسان کی خلقت نہیں بدل سکتی اسی طرح اس کے اخلاق بھی تبدیل نہیں ہو سکتے۔ اور

دلیل اس پر یہ ارشاد ہے۔

فرغ ربکم من الخلق والخلق والرزق والاجل (۵۷)

تمہارا پروردگار خلق سے، خلق سے، رزق سے اور

(حدیث قدسی) ہے۔ (اس نے تمہارے لئے یہ چیز

تم کو ان سے آراستہ کر دیا ہے۔)

قرآن شریف میں وارد ہے لا تبدیل لخلق اللہ (اللہ کے خلق کے لئے تبدیلی نہیں ہے) صحیح تر بات یہی ہے کہ انسانی خلقت میں تو تبدیلی ناممکن ہے اور اخلاق و اطوار میں تبدیلی ممکن ہے چنانچہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے۔  
حسنوا اخلاقکم اپنے اخلاق کو درست کرو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا کہ اس میں فساد و صلاح کی قبولیت کی استعداد و دیعت فرمادی اس طرح اس کو ادب اور مکارم اخلاق کا اہل بنا دیا، اسکی یہ صلاحیت ایسی ہے جیسے چقماق میں آگ اور کھجور کی گٹھلی میں کھجور کا درخت بن جانے کی صلاحیت موجود ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت و حکمت سے انسان کو یہ صلاحیت اور استعداد عطا فرمائی ہے کہ وہ تربیت کے ذریعہ اس کی اصلاح ہو سکے جس طرح تربیت سے کھجور کی گٹھلی درخت بن جاتی ہے یا جیسے چقماق کو رگڑنے سے آگ پیدا ہوتی ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح نفس انسانی میں بحالت صلاح خیر کی صلاحیت رکھی ہے، اسی طرح بصورت شرفساد کی استعداد رکھی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

ونفس و ماسواھا فاما لھما فجورھا وتقوھا، قد افلح من ذکاھا اس نفس کی قسم: جسے اس (رب) نے ہموار کیا اور  
وقد خاب من دساھا۔ (۵۸)

دو نوں اس میں پیدا کیے ہیں جس نے نفس کو پاکیزہ کیا  
کامیاب ہوا اور جس نے اس کو آلودہ کیا وہ ناکام ہوا۔

مذکورہ بالا آیت میں نفس کو ہموار اور برابر کرنے کا مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں قبول شر و فساد کی صلاحیت برابر برابر رکھی ہے جیسا کہ قد افلح من ذکاھا وقد خاب من دساھا سے مرشح ہے نفس جب پاکیزہ ہوتا ہے تو وہ عقل کی رہنمائی سے اپنی ظاہری اور باطنی حالت درست کر لیتا ہے اور اس کے اخلاق شائستہ ہو جاتے ہیں اور وہ تہذیب و ادب سے آراستہ ہو جاتا ہے، پس ادب فعل میں ان چیزوں کو لاتا ہے جو اس میں بالقوہ موجود ہیں اور یہ اس شخص کے لئے ہے جس میں نیکی کی صلاحیت بالقوہ موجود ہے اور یہ بحیثیت نیکی صلاحیت اللہ تعالیٰ کا فعل ہے وہی پیدا کر سکتا ہے۔ بشر کو اس کے پیدا کرنے پر قدرت حاصل نہیں ہے جس طرح چقماق سے انسان اپنی حکمت اور فعل سے آگ تو نکال لیتا ہے مگر چقماق میں آگ کو بالقوہ موجود رکھنا محض فضل ایزدی ہے (انسان ہر پتھر کو چقماق نہیں بنا سکتا)

اسی طرح آداب کا سرچشمہ صلاحیت پسند طبائع اور فضل خداوندی ہے (انسانی عمل نہیں ہے) چونکہ اللہ تعالیٰ نے صوفیائے کرام کی اچھی عادتوں (اخلاقہ حسنہ) کی تکمیل کر کے ان کے باطن میں یہ استعداد پیدا کر دی ہے کہ وہ اچھی تربیت اور ریاضت سے نفس کی اصلاح کر سکیں (ان چیزوں کو قوت سے فعل میں لاسکیں جو ان کے نفوس میں اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمادی ہے اس پر ممارست اور مداومت سے وہ مہذب اور مودب ہو گئے البتہ بعض حضرات ایسے ہیں کہ ان کو مزید تربیت اور ریاضت کے بغیر تہذیب و ادب حاصل ہوتا ہے جیسا کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ”مجھے اللہ تعالیٰ نے ادب دیا اور اچھی طرح ادب سکھایا، اوبنی ربی فاحسن تادیبی (مگر یہ وصف انبیاء علیہ السلام سے مخصوص ہے) مگر بعض لوگوں کی فطرت میں اس کی بڑی کمی ہوتی ہے اور انہیں زیادہ عرصہ تک تربیت حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے یعنی طویل ممارست سے ان کی سرشت اس نقصان سے پاک ہوتی ہے پس اس لئے مرید شیخ کی صحبت اور تعلیم اس سلسلہ میں بہت مہم و معادن ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قوا انفسکم و اہلیکم نار (۵۹) اے لوگو! تم خود کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ

اس آیت کی تشریح میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں ”تم انہیں دین کی تعلیم دو اور ادب سکھاؤ ایک دوسری روایت میں اس طرح ہے کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ۔ ”میرے رب نے مجھے ۷۲ ادب سکھائے اور پھر مجھے فضائل خلاق (پرکار بند ہونے کا) حکم دیا اور فرمایا درگزر کیا کرو، نیک کام کا حکم دو اور جاہلوں سے کنارہ کشی اختیار کرو۔“

**ادب فہم علم کا ذریعہ ہے:**

شیخ یوسف بن الحسین فرماتے ہیں، ادب سے علم کا فہم ہوتا ہے، علم کے ذریعہ عمل درست ہوتا ہے اور عمل کے ذریعہ حکمت حاصل ہوتی ہے، اور حکمت کے ذریعہ زہد و ترک دنیا حاصل ہوتا ہے، زہد سے آخرت کا شوق پیدا ہوتا ہے اور آخرت کے شوق سے اللہ تعالیٰ اپنی قربت کا مرتبہ عطا فرماتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جب شیخ ابو حفصؒ عراق میں پہنچے تو شیخ جنیدؒ ان کے پاس آئے تو انہوں نے دیکھا کہ ان کے مریدین ادب سے سیدھے کھڑے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی غلطی کا مرتکب نہیں رہا تھا۔ یہ دیکھ کر حضرت جنیدؒ نے کہا اے ابو حفص (اے ابو حفص) تم نے اپنے اصحاب (مریدین) کو ایسا مودب بنایا ہے جسے بادشاہوں کی حضوری میں ہوتا ہے، یہ سن کر ابو حفصؒ نے فرمایا ”اے ابوالقاسم (کفایت حضرت جنیدؒ) بیشک ادب ظاہری، ادب باطنی کا عنوان ہے۔

**آداب شریعت کسی حال میں ساقط نہیں ہوتے:**



شیخ ابو حسین غوریؒ فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے بندہ کے لئے کوئی ایسا مقام، روحانی حالت (یا کیفیت) یا کوئی ایسا علم نہیں ہے جو آداب شریعت کو ساقط کر دے بلکہ اسکے برخلاف شرعی آداب ظاہری حالت کا زیور ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند نہیں فرماتا۔ کہ انسان اپنے اعضا کو محض آداب سے غیر آراستہ رکھتے۔

عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ خدمت کو ادب خدمت سے بالاتر ہے شیخ ابو عبیدہؒ قاسم بن سلام کا ارشاد ہے کہ جب میں مکہ معظمہ میں داخل ہوا تو اکثر میں خانہ کعبہ کے سامنے بیٹھتا اور کبھی ایسا ہوتا کہ میں لیٹ جاتا اور اپنے پاؤں پھیلا دیتا۔ تو عائشہؓ مکہ (جو ایک ولیہ اور خدا رسیدہ خاتون تھیں) میرے پاس تشریف لائیں اور مجھ سے فرمایا کہ تمہارے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تم اہل علم ہو پس میری یہ بات مانو کہ یہاں (خانہ خدا میں) ادب کے ساتھ بیٹھو ورنہ تمہارا نام بارگاہ خداوندی کے دفتر سے کاٹ دیا جائے گا۔

شیخ ابن عطا کا قول ہے کہ نفس بے ادبی کا عادی ہے اور اس کی فطرت ہے مگر بندہ حق کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ادب اختیار کرے، نفس اپنی طینت اور سرشت کے ساتھ مخالفت پر آمادہ ہے (مخالفت کے میدان میں گامزن ہے) اور بندہ اپنی کوشش سے اس کو حسن ادب کی طرف پھیلتا ہے اور جو جدوجہد سے ایسا نہیں کرتا وہ اپنے نفس کو مطلق العنان بنا دیتا ہے اور اس کی نگہداشت نہیں کرتا تو گویا اس طرح اس کی سرکشی اور مطلق العنانی میں اس کی مدد کی اور جس نے اس کی مدد کی وہ اس کا شریک کار ہوا۔

سید الطائفہ شیخ جنیدؒ فرماتے ہیں جو نفس کو اس کی خواہش پوری کرنے میں مدد کرتا ہے وہ اس کے قتل میں شریک ہے کیونکہ بندگی کے لئے ادب ضروری ہے اور سرکشی بے ادبی میں داخل ہے۔

حضرت جابر بن سمرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ اپنے فرزند کو ادب سکھانا، ایک صاع مقدار میں صدقہ دینے سے بہتر ہے، مزید ارشاد فرمایا کہ ”ایک باپ اپنے بیٹے کو ادب سے بہتر اور کوئی تحفہ نہیں دے سکتا“ (بیٹے کو ادب سکھانا بہترین تحفہ ہے)۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ فرمایا ”بیٹے کا باپ پر حق ہے کہ وہ اس کا اچھا نام رکھے اس کو اچھی طرح سے رکھے اور اس کی اچھی تربیت کرے۔“

بندہ ادب کے ذریعہ حق تک پہنچتا ہے!

شیخ ابو علی دقاقؒ کہتے ہیں کہ بندہ حق اپنی طاعت و بندگی کے ذریعہ جنت میں داخل ہوتا ہے اور اطاعت میں ادب اختیار کر کے خدا تک پہنچتا ہے۔ شیخ ابوالقاسم قشیریؒ فرماتے ہیں کہ استاد ابوعلیؒ کسی چیز کا سہارا لیکر نہیں بیٹھا کرتے

تھے ایک دن وہ مجمع میں تشریف فرما تھے میں نے ان کی پیٹھ کے پیچھے تکیہ رکھنا چاہا تا کہ وہ اس کے سہارے سے بیٹھ جائیں مگر وہ تکیہ سے ہٹ گئے مجھے خیال گزرا کہ چونکہ تکیہ پر کوئی خرقہ یا سجادہ بچھا ہوا نہیں اس لئے تکیہ لگانے سے گریز کیا ہے لیکن انہوں نے مجھ سے فرمایا میں سہارا لینا نہیں چاہتا چنانچہ جب میں نے اس بات پر غور کیا تو مجھے یاد آیا کہ واقعی وہ کبھی سہارا نہیں لیتے ہیں۔

شیخ جلال بصریؒ فرماتے ہیں۔ توحید ایمان کے لئے ضروری ہے جس میں توحید نہیں اس میں ایمان نہیں، ایمان شریعت کے لئے ضروری ہے لہذا جہاں شریعت نہیں ہے وہاں نہ ایمان ہے نہ توحید ہے اور شریعت کے لئے ادب ضروری ہے پس جہاں ادب نہیں وہاں نہ شریعت ہے نہ ایمان ہے نہ توحید ہے۔

کسی بزرگ نے فرمایا ہے کہ ادب کو ظاہر و باطن میں اختیار کرو، اگر کسی نے ظاہر اے ادبی کی تو اس کو ظاہر اُسرا ملے گی اور جس نے باطن میں بے ادبی کی اس کو باطن میں سزا بھگتا ہوگی۔

شیخ ابوعلی دقاقؒ کے غلام نے کہا ہے کہ ایک دن میں ایک مرد کی طرف دیکھ رہا تھا، اس حال میں شیخ دقاقؒ نے مجھے دیکھ لیا، انہوں نے مجھ سے کہا تم کو اس فعل کی سزا ضرور ملے گی خواہ وہ کئی سال میں ملے چنانچہ مجھے دس سال بعد یہ سزا ملی کہ میں قرآن حکیم بھول گیا۔

شیخ سری سقطیؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک رات درود کے پڑھنے میں مصروف تھا اور میں نے اپنے پاؤں محراب کی طرف پھیلانے ہوئے تھے پس کسی نے پکار کر مجھ سے کہا کہ جس طرح تم بیٹھے ہو کیا اس طرح بادشاہوں کے سامنے بیٹھ سکتے ہو پس میں نے اپنے پاؤں سمیٹ لئے اور پھر میں نے کہا ”الہی تیری عزت و جلال کی قسم اب میں کبھی پیر نہیں پھیلاؤں گا، شیخ جنیدؒ فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد وہ ساٹھ سال زندہ رہے لیکن اس مدت میں انہوں نے اپنے پاؤں کبھی نہیں پھیلائے نہ رات میں (سوتے میں) نہ دن میں۔

عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں جو ادب سے غفلت برتا ہے اس کو یہ سزا ملتی ہے کہ وہ سنتوں سے محروم ہو جاتا ہے اور جو سنتوں سے غفلت برتا ہے اس کو فرض سے محروم کر دیا جاتا ہے اور فرائض سے سستی و غفلت برتنے والے کو معرفت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

کسی شخص نے حضرت سری سقطیؒ سے صبر کے بارے میں کوئی مسئلہ دریافت کیا تو آپ اس سلسلہ میں گفتگو کرنے لگے، اثنائے کلام میں ایک بچھو آپ کے پاؤں کو ڈنک مارنے لگا لوگوں نے کہا کہ اس کو مار کر ہٹا دیجئے تو آپ نے کہا کہ مجھے شرم آتی ہے کہ میں جس موضوع پر گفتگو کر رہا ہوں۔ یعنی صبر پر اور پھر اسی کے خلاف کام کروں (بچھو کے

ڈنگ مارنے کا بے صبری کا اظہار کروں۔)

حضرت رسول اکرم ﷺ کے ادب کا کیا حال تھا وہ اس روایت سے معلوم ہوگا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے زمین کے مشرق و مغرب کے حصے دکھائے گئے، (زمین کے مشرق و مغارب دکھائے گئے) لیکن باری تعالیٰ کے حضور میں پاس ادب کے باعث حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں نے مشرق و مغرب کو دیکھا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عمل میں ادب کا لحاظ رکھنا قبول عمل کی دلیل ہے۔ شیخ ابن عطاء فرماتے ہیں کہ ادب مستحبات پر موقوف ہے یعنی تم مستحسن امور کی حد پر رہو، لوگوں نے اسکی وضاحت چاہی تو آپ نے کہا کہ تم ظاہر و باطن میں خداوند تعالیٰ کے ساتھ ادب کی رعایت رکھو، اگر تم اس پر کاربند رہو تو تم صاحب ادب یا مودب ہو خواہ تم عجمی ہو! پھر آپ نے یہ شعر پڑھا۔

اذ انطقت جاءت بكل مليحة وان سكنت جاءت بكل ميلة

جب تو بولے کلام شیریں ہو گر نہ بولے، تمام شیریں ہو۔

شیخ حریریؒ فرماتے ہیں کہ ”بیس سال ہو گئے تنہائی میں بھی میں نے اپنے پاؤں نہیں پھیلائے ہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ادب اختیار کرنا افضل و اول ہے۔

شیخ ابوعلیؒ نے کہا ہے کہ ترک ادب راندہ درگاہ ہونے کا موجب ہے پس جس شخص نے فرش پر بے ادبی کی وہ دروازے پر لوٹا دیا گیا اور جس نے دروازے پر بے ادبی کی اس کو جانوروں کی طرح سزا دی جائے گی۔ (۶۵)

### اخلاق صوفیہ کی وضاحت:

صوفیاء کرام کی زندگیاں حضور ﷺ کی سیرت پاک کا مکمل نمونہ ہیں انہوں نے آپ کے اخلاق، حسنہ پر خود بھی عمل کیا اور دوسروں کو بھی اس پر عمل کرنے کی تلقین کی۔ ان اخلاق صوفیہ میں سے بہتر تواضع ہے۔ بندہ کے لیے تواضع سے بہتر کوئی اور لباس نہیں ہے۔ تواضع کے بارے میں سرکار دو جہاں ﷺ کے مندرجہ ذیل ارشادات ہیں۔ تواضع کے بارے میں احادیث نبوی ﷺ:

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا۔ ”بیشک اللہ تعالیٰ نے میری طرف یہ وحی نازل فرمائی۔ تم تواضع اختیار کرو اور کوئی شخص ایک دوسرے پر زیادتی نہ کرے۔ (۶۱)

سرور کائنات ﷺ نے ”قل ان کنتم تحبون الله فاتبعوني“ کی تفسیر میں ارشاد فرمایا یہ اتباع (جس کا حکم دیا گیا ہے) نیکی، تقویٰ، خوف اور تواضع کے ساتھ ہو۔ حضور ﷺ کی تواضع کا یہ عالم تھا کہ آپ آزاد اور غلام سب کی

دعوت قبول فرماتے تھے خواہ وہ دودھ کا ایک گھونٹ یا خرگوش کی ایک ران ہی کیوں نہ ہوتی، آپ (حسب موقع) اس کا صلہ بھی دیتے تھے اور خود بھی اس کو استعمال فرماتے تھے۔ اسی طرح آپ کنیر یا غلام کو جواب دینے میں بھی غرور نہ فرماتے تھے (اس تو اضع سے جواب ارشاد فرماتے تھے۔) (۴۲)

سلیمان بن عمرو بن شعیب سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا۔ تواضع کی چوٹی کی بات یہ ہے کہ جس سے تم ملو اس کو پہلے سلام کرو اور جو تم کو سلام کرے اس کو جواب دو مجلس میں کمتر جگہ پر بیٹھنے میں تم کو عار نہ ہو۔ تم کو یہ خواہش نہ ہو کہ کوئی تمہاری تعریف کرے یا تم پر احسان کرے۔ آپ سے یہ بھی روایت ہے کہ مبارک اور نوید ہے اس شخص کو جو بغیر کوتاہی نقص کے تواضع اختیار کرے اور محتاجی کے بغیر خود کو محتاج جانے۔ (۴۳)

### تواضع کے بارے میں صوفیاء کے اقوال:

شیخ جنیدؒ سے کسی نے سوال کیا کہ تواضع کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ بازوؤں کا جھکانا اور پہلو کا نرم کرنا ہے۔“

حضرت فضیلؒ سے تواضع کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔ ”حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اور حق بات کو کہنا۔“ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ جو شخص اپنے نفس کی قدر و قیمت کا اعتبار کرتا ہے تواضع میں اس کا حصہ نہیں ہے (اس کا تواضع سے کوئی تعلق نہیں ہے)۔

حضرت وہب بن حبیبؒ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں مکتوب ہے۔ ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میں نے آدم کی پشت سے ذروں کو ہر آبد کیا اس وقت میں (حضرت موسیٰ علیہ السلام) کے دل سے زیادہ متواضع کسی قلب کو نہیں پایا اس لئے میں نے ان کو منتخب کر کے ان سے کلام کیا (کلم اللہ بنایا)۔ بزرگوں کا مقولہ ہے، جو اپنے نفس کی پوشیدہ باتوں کو پہچان لیتا ہے وہ کبھی غرور و تکبر نہیں کرتا بلکہ وہ تواضع اختیار کر لیتا ہے اگر کوئی شخص اس کی مذمت کرے تو اس سے وہ نہیں جھگڑتا اور جب کوئی اس کی تعریف کرتا ہے تو وہ خداوند تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے۔

شیخ ابو حفصؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص چاہتا ہے کہ اس کا دل تواضع اختیار کر لے تو اس کو چاہیے کہ صالحین کی صحبت اختیار کرے اور ان کی عزت و حرمت کرے، اس طرح وہ ان صالحین کی شدت تواضع سے جو ان کے نفوس میں موجود ہے، اقتدار کرے گا اور تکبر سے بچ جائے گا (ان کی صحبت میں خود بخود تواضع اختیار کر لے گا)۔

حضرت لقمان (علیہ السلام) نے کہا ہے کہ ہر چیز کے لئے ایک سواری ہے اور عمل کی سواری تواضع ہے۔

## رسول اکرم ﷺ کو تواضع سے حصہ وافر ملا تھا:

ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تواضع سے سب سے زیادہ حصہ ملا تھا، آپ اس کو مقامات قرب میں بھی استعمال فرماتے تھے۔ جیسا کہ حضرت عائشہؓ سے مروی اس طول حدیث سے ثابت ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہے ایک کہ شب میں نے رسول ﷺ کو جب اپنے قریب نہیں پایا تو مجھے نسوانی جذبہ کے تحت خیال گزرا کہ آپ اپنی کسی زوجہ محترمہ کے پاس تشریف لے گئے ہیں، چنانچہ میں اٹھی اور میں نے تمام ازواج مطہرات کے کمرؤں میں آپ کو تلاش کیا لیکن کسی حجرے میں آپ کو موجود نہیں پایا اس کے بعد میں آپ کی تلاش میں مسجد میں گئی تو میں نے آپ کو مثل بوسیدہ کپڑے کے (جو لچھ جاتا ہے) سر لچو دیا اور سجدے کی حالت میں آپ زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا فرما رہے تھے۔

اللہ العالمین! میرا دل اور میرا خیال بھی تیرے حضور میں سر بسجود ہے، میرا دل تجھ پر ایمان لایا ہے اور میری زبان اس کا اقرار کر رہی ہے اور اب میں تیرے حضور میں حاضر ہوں، اے عظمت والے اور اے بڑے بڑے گناہوں کو بخشنے والے خدا: میں تیرے سامنے موجود ہوں۔

حضور ﷺ کا یہ ارشاد فرمانا ”میرا دل اور میرا خیال تیرے حضور میں سر بسجود ہے۔“ تو یہ قول تواضع کی انتہا آپ نے ارشاد فرما کر وجود سے آثار کو اس طرح مٹا دیا کہ ظاہر و باطن میں ایک آن بھی سجدے سے الگ نہیں ہے۔ (لم ۱۴)

### تواضع ایک سعادت ہے:

جب صوفی بساط قرب میں پہنچ کر بھی تواضع خاص سے بہرہ باب نہیں ہوا تو پھر وہ تواضع خلق سے بھی بہرہ مند نہیں ہوگا۔ حقیقت میں یہ ایک سعادت ہے جب یہ کسی کو نصیب ہوتی ہے تو کامل نصیب ہوتی ہے، مختصر یہ کہ تواضع صوفیہ کے فضائل اخلاق میں ایک شریف خلق ہے اور اخلاق کا ایک اہم حصہ ہے۔

صوفیہ کا دوسرا اہم اخلاقی فعل مدارات اور تحلل ہے جس کی بدولت وہ مخلوق کی اذیت کی برداشت کرتے ہیں۔ رسول ﷺ کے تحلل کی ایک مثال یہ واقعہ ہے کہ یہودیوں کے درمیان آپ نے ایک صحابیؓ کو مقتول پایا یا نہمہ آپ نے ان پر نہ تاوان ڈالا اور حکم الہی سے قدم آگے نہیں بڑھایا اور اس قتل کی دیت (یعنی سواونٹ) بھی اپنے پاس سے ادا کی حالانکہ آپ کو اور آپ کے اصحاب کے لئے اس وقت ایک اونٹ بھی بہت اہم تھا تا کہ ان کی بے سروسامانی کچھ کم ہو سکے۔

آپ کے حسن مدار کا یہ عالم تھا کہ آپ نے کبھی کسی کھانے کو برا نہیں کہا اور نہ کبھی کسی خادم کو جھڑکا۔ حضرت

انسؑ سے مروی ہے کہ میں نے رسول ﷺ کی دس برس تک خدمت کی اس طویل عرصہ میں آپ نے مجھے اف تک نہیں کہا اور اگر (آپ کی اجازت کے بغیر) میں کوئی کام کر لیا تو آپ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ یہ کام کیوں کیا۔ رسول ﷺ اخلاق میں سب سے زیادہ بلند تھے آپ کے پاک کف دست سے زیادہ نرم خز (ریشم) و حریر کو بھی نہیں پایا۔ اسی طرح رسول ﷺ کے پاکیزہ پسینے سے زیادہ معطر میں نے مشک یا کسی اور خوشبو کو نہیں پایا۔ (۶۵)

## ایثار:

صوفیائے کرام کا ایک خلق ”ایثار و مواسات“ بھی ہے، اس جذبہ پر ان کو قوت ایمانی، رحم اور شفقت آمادہ کرتی ہے وہ جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہے اس کو قربان کر دیتے ہیں اور جو چیز نہیں ہوتی اس پر صبر کرتے ہیں۔

شیخ بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ بلخ کے ایک نو جوان نے مجھے لا جواب کر دیا۔ ہوا یوں کہ وہ نو جوان حج کے سفر میں ہمارے پاس آیا تھا، اس نو جوان نے مجھ سے پوچھا کہ زہد کسے کہتے ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ ہمیں جو کچھ مل جاتا ہے وہ کھا لیتے ہیں اور اگر نہیں ملتا صبر کر لیتے ہیں۔ اس نو جوان نے کہا کہ ”ہمارے بلخ کے کتے بھی یہی کرتے ہیں، یہ سن کر میں نے پوچھا، تمہارے نزدیک زہد کیا ہے اس نے کہا جب ہمیں کچھ نہیں ملتا تو ہم شکر کرتے ہیں اور اگر کچھ مل جاتا ہے تو اس کو ایثار کرتے ہیں (دوسروں پر صرف کر دیتے ہیں) اس کی یہ بات سن کر میں شکست خوردہ ہو گیا۔

شیخ ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ فراخ دل زاہد میں یہ تین باتیں پائی جاتی ہیں، اس کی یہ تین نشانیاں ہیں، (۱) جمع کروہ چیز خرچ کرتا ہے (۲) گرم شدہ چیز کی تلاش نہیں کرتا اور اپنی غذا اور خوراک دوسروں کو کھلا دیتا ہے۔

## ایثار کی چند مثالیں:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے رسول ﷺ نے نصیر کے دن (بنو نصیر کی جنگ سے مراد ہے) انصار سے فرمایا کہ اگر چاہو تو مہاجرین کو اپنے مالوں اور گھروں میں شریک کر لو پھر تم انکے اس مال غنیمت میں بھی ان کے شریک ہو جاؤ، اور اگر تم چاہو تو تمہارے اموال اور گھر بار تمہارے پاس رہیں گے (مہاجرین ان میں شریک نہیں ہوں گے) لیکن اس صورت میں اس مال غنیمت سے تم کو کوئی حصہ نہیں ملے گا (کہ اس وقت مہاجرین بالکل بے سہارے اور بے سکت ہیں) اس کے جواب میں انصار نے کہا کہ ہم اپنے مہاجر بھائیوں کو اپنے اموال اور گھروں میں برابر کا حصہ دیں گے اور اس کے علاوہ مال غنیمت صرف ان کا حق ہے ہم اپنا حق ان کے حق میں ایثار کرتے ہیں، ہم اس میں حق نہیں لیں گے، ان کے اس ایثار پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (۶۶)

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۶۷) وہ ایثار کرتے ہیں اپنے نفسوں پر خواہ وہ خود حاجت مند

### صحابہ کرام اور بزرگان سلف کا ایثار:

روایت ہے کہ شیخ ابوالحسن انکا کی کے پاس شہر رے کے قریب ایک گاؤں میں تیس سے زیادہ آدمی جمع ہو گئے لیکن اس وقت ان کے پاس صرف چند روٹیاں تھیں ان روٹیوں سے چار پانچ آدمیوں کا پیٹ بھر سکتا تھا لہذا انھوں نے ان سب روٹیوں کے ٹکڑے کئے اور یہ جب کھانے کے لئے بیٹھے تو چراغ گل کر دیا، جب سب کھانا ختم کر چکے تو معلوم ہوا کہ تمام کھانا جوں کاتوں رکھا ہے یعنی ایثار کے باعث اس جماعت میں سے کسی نے بھی نہیں کھایا (ہر ایک نے دوسرے کو کھانے کو موقع دیا اور اس طرح کسی نے بھی نہیں کھایا۔

حضرت حذیفہ الصدوقی فرماتے ہیں کہ میں جنگ یرموک میں اپنے برادر عم زاد کی تلاش میں میدان جنگ میں پھر رہا تھا، اس وقت میری چھاگل میں تھوڑا سا پانی تھا میں نے سوچا تھا کہ شاید اس میں زندگی کی کچھ رقی ہوگی تو میں اس کو یہ پانی پلا دوں گا۔ اور اس کے منہ کو بھی (خون سے) صاف کر دوں گا۔ آخر کار میں اسکے پاس پہنچ گیا تو میں نے اس سے کہا تمہیں پانی پلاؤں تو اس نے اشارے سے کہا ہاں، مجھے پانی پلاؤں انہی میں اس کے برابر جو شخص مجروح پڑا تھا اس کے منہ سے آہ نکلی تو میرے بھائی نے کہا کہ تم میرے بجائے اس زخمی کو پانی پلا دو یہ زخمی ہشام بن العاصؓ تھے جب میں ان کے پاس پہنچا اور میں نے پانی پلانا چاہا اور برابر کے ایک اور زخمی ہشام نامی نے پانی دیکھ کر آہ بھری تو ہشام بن العاصؓ نے کہا کہ تم میرے بجائے اس زخمی کو پانی پلا دو، جب میں پانی لیکر ہشام ثانی کے پاس پہنچا تو وہ دم توڑ چکا تھا اب میں پلٹ کر ہشام بن العاصؓ کے پاس آیا تو وہ بھی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے، اس کے بعد میں اپنے عم زاد کے پاس واپس ہوا تو وہ فوت ہو چکا تھا (اس طرح ہر ایک نے اپنی ذات پر دوسرے کو ترجیح دی اور کوئی بھی پانی نہ چمکا۔

شیخ ابوالحسن بوشنجی سے جو انصاری کے معنی دریافت کئے گئے تو انہوں نے فرمایا کہ میرے نزدیک جو انصاری وہ ہے جس کی تعریف اللہ تعالیٰ نے انصار کے سلسلہ میں کی ہے۔

وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّاءَ وَالْإِيمَانَ (۶۸) یہ وہ لوگ ہیں جو گھروں کو اور ایمان کو (مضبوطی)۔

شیخ ابن عطا فرماتے ہیں کہ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنی سخاوت اور کرم کی وجہ سے ایثار کرتے ہیں وہ خود کتنے ہی فقر و فاقہ میں مبتلا ہوں شیخ ابوحفصؒ کا ارشاد ہے۔ ایثار یہ ہے کہ اپنے روحانی بھائیوں کے حصے کو دنیا اور آخرت کے کاموں میں اپنے حصوں پر مقدم رکھو۔ ایک دوسرے بزرگ کا ارشاد ہے۔

”ایثار اس کسی کو ترجیح نہیں ہے بلکہ اس میں تمام مخلوق کے حقوق، ذاتی حقوق پر مقدم ہوتے ہیں یعنی اس سلسلہ میں بھائی، دوست اور شناسا کا فرق ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔“

شیخ یوسف بن حسن فرماتے ہیں۔ ”جو شخص خود کو کسی چیز کا مالک سمجھے وہ صحیح طور پر ایثار نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اپنی ملکیت کا خیال کر کے اس چیز کا حقدار اپنے آپ کو زیادہ سمجھے گا۔“

ایثار وہی شخص کر سکتا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ تمام چیزیں اللہ کی ملکیت ہیں جس کے پاس جو کچھ ہے بس اتنے کا ہی حقدار ہے پس اگر کسی کو کوئی چیز مل جائے تو اس کے پاس امانت ہے چاہیے کہ وہ اس امانت کو ضرورت مند کے پاس پہنچا دے۔

حقیقی ایثار:

ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ اگر تم اپنے آخرت کے حصے کو اپنے بھائیوں پر قربان کر دو تو وہ حقیقی ایثار ہوگا کیونکہ دنیا تو ایک بہت ہی معمولی سی چیز ہے۔ وہ اس لائق کب ہے کہ وہ ایثار کے شایان شان بن سکے بلکہ اس کے ساتھ تو ایثار کا لفظ بھی استعمال بھی نہیں کرنا چاہیے اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ گزرا ہے، ایک بزرگ نے اپنے روحانی بھائی سے ملاقات کی تو اسی خیال کے تحت ان کے ساتھ زیادہ شگفتہ روی کا اظہار نہیں کیا، ملاقاتی بھائی کو ان کا یہ طرز عمل شاق گزرا تو انہوں نے کہا (برانہ مانو اے بھائی) رسول ﷺ نے فرمایا ہے۔ جب دو مسلمان باہم ملاقات کرتے ہیں تو ان پر رحمت نازل ہوتی ہے اس رحمت کے سوحصوں میں سے نوے حصے اس کو ملتے ہیں جو زیادہ شگفتہ روی ہوتا ہے اور دس اس کے حصے میں آتے ہیں جو کم شگفتہ روی دکھاتا ہے لہذا میں نے کم شگفتگی کا اظہار کر کے یہ چاہا کہ اس نیکی کے ۹۰ حصے تم کو مل جائیں (یعنی تم زیادہ ثواب حاصل کرو)۔

شیخ ابو بکر سعداں فرماتے ہیں کہ جو شخص صوفیائے کرام کی صحبت میں رہنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ وہ بے نفس بے دل اور بے ملک بن کر ان کے ساتھ رہے کیونکہ اگر وہ ان کی صحبت میں رہے گا اور بنیادی اسباب پر رکھے گا تو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے گا، (اس صحبت سے اس کو کچھ فائدہ نہیں پہنچے گا)۔

شیخ المشائخ سہل بن عبد اللہ کا ارشاد ہے۔ ”صوفی وہ شخص ہے جو اپنے خون کو حلال اور اپنی ملکیت کو دوسروں کے لئے مباح تصور کرے۔“ شیخ رویم فرماتے ہیں کہ تصوف کی بنیاد تین خصلتوں پر ہے، ایک فقر اختیار کرنا، دوسرا ایثار و سخاوت کرنا، تیسرا اپنی پسند اور اپنی کوشش کو ترک کرنا۔

جب صوفیائے کرام کے سلسلہ میں حکومت عباسیہ کے پاس شکایت گئی اور ان پر الزامات لگائے گئے تو حضرت



جنید بغدادیؒ تو اپنی فقہ دانی کے باعث عتابِ سلطانی سے بچ گئے لیکن دوسرے مشاہیر مشائخ جیسے شیخ شامؒ، وقامؒ اور شیخ ابوالحسن نوریؒ کو گرفتار کر لیا گیا ان گرفتار شدگان کی گردن اڑانے کا حکم دے دیا اور چھڑا بچھا دیا تو سب سے پہلے شیخ ابوالحسن نوری آگے بڑھے جب ان سے اس سبقت کی وجہ دریافت کی گئی تو فرمایا میں اپنے ان بھائیوں کے لئے اپنی ایک گھڑی کی زندگی کا ایثار کر رہا ہوں (کہ یہ ایک گھڑی اور زندہ رہ لیں)۔

اخوت کی مثال:

ایک دفعہ جناب قیس بن سعد بیمار ہوئے تو ان کے بھائی عیادت کو نہیں آئے (عیادت کرنے میں دیر کی) شیخ نے ان کے نہ آنے کے بارے میں (حیافت کیا، تو لوگوں نے بتایا کہ ان کے ذمہ آپ کا قرض ہے) (اس لیے عیادت کے لئے آنے میں وہ جھجک رہے ہیں) یہ سن کر قیس بن سعد نے فرمایا ایسے مال کا ناس جائے جس نے بھائیوں کو بھائی کی ملاقات سے روک رکھا ہے، اس کے بعد انہوں نے اعلان کر دیا کہ جس شخص پر بھی کا قرضہ ہے وہ معاف کیا جاتا ہے یہ اعلان سن کر اس کثرت سے لوگ شام کے وقت ان کی عیادت کو آئے کہ ان کے گھر کی چوکھٹ ٹوٹ گئی۔

منقول ہے کہ ایک شخص نے اپنے دوست کا دروازہ کھٹکھٹایا، جب صاحب خانہ باہر نکلا اور اس نے پوچھا کس طرح آنا ہوا (یعنی کس غرض سے آئے ہو) تو اس شخص نے کہا کہ میں چار سو درہم کا مقروض ہوں، یہ سن کر صاحب خانہ گھر کے اندر گئے اور چار سو درہم وزن کر کے اس شخص کو دیدیئے (جب وہ شخص لے کر چلا گیا تو وہ شخص (صاحب خانہ) گھر میں روتا ہوا داخل ہوا۔ اس کی بیوی نے پوچھا کہ اگر رقم کا دینا ایسا ہی ناگوار تھا تو اسے منع کر دیتے (اب رونے سے کیا حاصل) اس نے کہا میں تو اس لئے رورہا ہوں کہ مجھے اس کی حالت کی خبر نہیں ہوئی اور اس (بیچارے) کو اپنا حال خود مجھ سے بیان کرنا پڑا۔ (۷۹)

**صوفی وہی بن سکتا ہے جس کی فطرت میں سخاوت داخل ہو:**

صوفی کو ایثار پر اس کے نفس کے طہارت اور طبعی شرافت ہی آمادہ کرتی ہے اللہ کسی کو صوفی اس وقت بناتا ہے جب کہ اس کی فطرت میں سخاوت کا وصف موجود ہو اور اس کی سرشت میں سخاوت کی استعداد پیدا ہو جائے یعنی جو فطرتاً سخی ہے وہ صوفی بن سکتا ہے اس لئے کہ سخاوت کا وصف ایک فطری وصف ہے اور نیک اس کی متضاد صفت ہے یہ بھی ایک نفسانی صفت ہے اور ادا از م نفسانی میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَمَنْ يُّؤَقِ شَحْ نَفْسِهِ فَلَاؤُ الْكَ هُمُ الْمَفْلُحُونَ - (۷۵)

جنہوں نے اپنے نفس کو نیکل سے محفوظ رکھا۔ وہی ہیں

یعنی فلاح کا حکم ان کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہزل و انفاق کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَمِمَّا زَقَنَهُمْ يَنْفَقُونَ هَـ اُولَئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِنْ رَبِّهِمْ ۚ اُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ  
ہم نے جو کچھ ان کو عطا کیا ہے اس میں سے یہ اللہ کی راہ میں خرچہ کرتے ہیں وہ لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں۔ (۷۱)

لفظ ”فلاح“ دونوں جہاں کی سعادت کے لئے ایک جامع لفظ ہے۔ رسول خدا ﷺ نے اپنے ایک ارشاد گرامی میں تین چیزوں کو ہلاک کرنے والے (مہلک) اور تین چیزوں کو نجات بخشنے والا بتایا ہے، حضور ﷺ نے مہلک چیزوں میں اس نخل کو بھی شامل فرمایا ہے جو عادت بن جائے۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انسانی نفس کے لوازم میں نخل اور خود غرضی موجود ہے اس لئے کہ نفس کی عنصری اصل مٹی ہے اور مٹی میں قبض و امساک موجود ہے پس آدمی سے اگر نخل و امساک کا صدور کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے کہ وہ اس کی جبلت ہے، لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ سخاوت اس کی فطرت میں شامل ہو۔  
عفو و درگزر:

عفو و درگزر بھی صوفیوں کے اخلاق سے ہے یعنی ان کے اخلاق کی نمایاں خصوصیت ہے وہ اس خلق کے باعث برائی کا بدلہ بھلائی سے دیتے ہیں۔ حضرت سفیان ثوریؒ کا قول ہے کہ جو تمہارے ساتھ برائی کرے اس کا بدلہ بھلائی سے دو، اسی کا نام احسان ہے اور بھلائی کا بدلہ بھلائی سے دنیا تو ایک قسم کی تجارت ہے اور بازاری لین دین ہے کہ ایک ہاتھ سے دیا اور دوسرے ہاتھ سے لے لیا۔

جناب حسنؒ فرماتے ہیں کہ احسان عام ہونا چاہیے اس میں تخصیص نہیں ہونا چاہیئے جس طرح سورج کی روشنی، ہوا اور بارش ہر ایک کے لئے ہے (عام ہے) کسی کی تخصیص نہیں ہے۔

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا میں نے جنت میں جب اونچے اور شاندار محل (شب معراج میں) دیکھے تو جبریل امین سے پوچھا کہ یہ کن لوگوں کے لئے ہیں۔ جبریل نے کہا یہ ان حضرات کے لئے ہیں جو غصے کو پی جاتے اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ (۷۲)

والكا ظميين الغيظ والعافين عن الناس

(۷۳)

اور غصہ کو دیکھنے والے اور اگرن کو صاف کرنے

والے۔

حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا  
بازاری (ہرجائی) نہ بن جاؤ کہ کہنے لگو اگر لوگ ہمارے  
ساتھ احسان کریں گے تو ہم بھی احسان کریں گے اور اگر وہ ظلم کریں گے تو ہم بھی  
ظلم کریں گے۔ ان کو اس بات کا عادی بناؤ کہ اگر لوگ احسان کریں تو تم  
احسان کرو اور اگر ظلم کریں تو تم (اس کے بدلے) ظلم نہ کرنا۔

کسی صحابیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ حضور! میں ایک شخص کے پاس جب جاتا ہوں تو نہ وہ مجھے اپنا مہمان  
بناتا ہے اور نہ مجھے کھانا کھلاتا ہے، اگر وہ میرے پاس آئے تو کیا میں بھی اس کے ساتھ یہی روش اختیار کروں؟ آپ نے  
ارشاد فرمایا نہیں بلکہ تم اسے کھانا کھلاؤ۔

(۷۴)

خندہ روی اور خندہ پیشانی:

خندہ پیشانی بھی صوفیہ کے اخلاق ہیں صوفی اگر چہ خلوت میں روتا ہے لیکن جب وہ لوگوں کے سامنے آتا ہے تو  
ہشاش بھاش اور شگفتہ رونظر آتا ہے اس کے چہرے کی یہ شگفتگی اس کے انوار قلب کا انعکاس ہے کہ صوفی کے باطن پر  
اللہ تعالیٰ کے ایسے انعامات نازل ہوتے ہیں جن کے باعث اس کا قلب مسرت و انبساط سے لبریز ہو جاتا ہے (اور شگفتہ  
روی اسی کا پرتو ہوتا ہے) جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

(۷۵)

وجوة يومئذ مسفرة ضاحكة مستبشرة۔

(۷۵)

اس دن (بہت سے) چہرے روشن اور ہشاش بھاش ہوں گے

بعض فرماتے ہیں کہ چہرے اس دن اس لئے روشن ہوں گے کہ وہ مدتوں تک اللہ کی راہ میں غبار آلود رہے ہیں  
اور قلب کے نور سے چہروں کا منور ہونا بالکل ایسا ہے جیسے چراغ سے شیشے اور چراغ جگمگانے لگتے ہیں گویا چہرے  
چراغدان ہیں اور دل شیشہ ہے اور روح چراغ ہے (اس کا نور دل اور دل سے چہرے پر پہنچتا ہے) یوں بھی کہہ سکتے ہیں  
کہ روح کے نور سے جب دل کا شیشہ جگمگاتا ہے تو چہرے کے چراغدان بھی نورانی ہو جاتے ہیں پھر جب روحانی مناعہ  
کی لذت سے لطف اندوز ہوتا ہے تو چہرے پر اس کا اثر پڑنا ضروری ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

(۷۶)

تعرف في وجوههم نضرة النعيم

تم ان کے چہروں پر نعمتوں کی تازگی کو پہچان لو گے۔

(یعنی تازگی اور چمک ان کے چہروں پر موجود ہوگی یہ اہل عرب کا محاورہ ہے جب سبزہ ہرا بھرا ہو جاتا ہے اور مکھیاں تازگی سے  
اس موقع پر وہ کہتے ہیں۔ انضرت اللبات۔

”حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے۔ ہر نیکی اور معروف صدقہ ہے اور معروف شے یہ بھی ہے کہ تم اپنے بھائی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملاقات کرو اور یہ بھی نیکی ہے کہ تم ڈول سے اپنے بھائی کے برتن میں پانی ڈالو۔“ (۷۷)

شیخ سعد بن عبد الرحمن زبیدی کا قول ہے مجھے فقرا میں وہ پسند ہے جو ہنس مکھ، نرم خور و شگفتہ رو ہو۔ لیکن ایسا شخص کہ تم اس سے شگفتہ روی اور خندہ پیشانی کے ساتھ ملو اور وہ تم سے ایسی ترش روئی سے پیش آئے گویا وہ تم پر احسان کر رہا ہے تو اللہ تعالیٰ فقرا میں اس جیسے زیادہ نہ فرمائے۔

### رسول اکرم ﷺ کی مزاح کی چند اور مثالیں:

”جناب صہیبؓ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت آپؐ کے سامنے کھجوریں رکھی تھیں اور آپؐ ان میں سے نوش فرما رہے تھے آپؐ نے فرمایا آؤ، کھاؤ! چنانچہ میں کھجوریں کھانے لگا تو آپؐ نے فرمایا تم کھجوریں کھا رہے ہو حالانکہ تم آشوب چشم میں مبتلا ہو۔ میں نے عرض کیا اب میں دوسری طرف چباؤں گا، یہ سن کر آپؐ نے تبسم فرمایا۔“ (۷۸)

”حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول خدا ﷺ نے مجھے ایک دن دوکان والے کہہ کر مخاطب فرمایا (اس میں بھی ایک لطیف و پاکیزہ مزاح کا عنصر ہے)۔“ (۷۹)

”حضرت (ام المؤمنین) عائشہؓ سے دریافت کیا گیا کہ کیا حضور ﷺ کا شانہ نبوت میں بھی جب کہ وہ اکیلے ہوتے اسی طرح (خوش مزاجی کے ساتھ) رہتے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ آپؐ سب سے زیادہ ہنس مکھ، نرم مزاج تھے ہر وقت ہنستے اور مسکراتے رہتے۔“ (۸۰)

”حضرت عائشہؓ ایک دوسرے موقع پر یہ واقعہ سناتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بار میرے ساتھ دوڑ لگائی تو پہلی دفعہ میں آپؐ سے آگے نکل گئی دوسری بار آپؐ آگے نکل گئے اس وقت آپؐ نے فرمایا کہ یہ پہلی بار کا بدلہ ہے۔“

”حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہمارے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان بات چیت ہوتی رہتی تھی آپؐ اکثر میرے چھوٹے بھائی سے (بطور مزاح) اس مقشی عبارت میں کلام فرماتے اور ارشاد فرماتے۔ ”یا اب عمیر ما فعل النغیر“

غیر پدے کو کہتے ہیں۔“ (۸۱)

ظرافت اور مزاح کا فرق:

ظرافت اور مزاح میں فرق ہے کہا جاتا ہے کہ اگر ظرافت اور لطیفہ گوئی میں سنجیدگی کا عنصر شامل ہو تو اس سے (سننے والے) کو غصہ نہیں آتا اور مزاح سے باوجود سنجیدگی کے غصہ آ جاتا ہے یہی سبب ہے، کہ امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نماز میں قہقہہ لگانے کو گناہ قرار دیا ہے اور حکم لگایا ہے کہ اس سے وضو باطل ہو جاتا ہے اور کہا ہے کہ کسی چیز سے خارج ہو جانا (وضو یا نماز سے خارج ہونا) گناہ کا قائم مقام ہے۔

### ترک تکلف صوفیہ کا خلق:

ترک تکلف یا سادگی بھی اخلاق صوفیہ میں سے ہے اس لئے تکلف نام ہے ترفع اور بناوٹ کا یعنی محض دوسروں کی خاطر نفس پر بے جا دباؤ ڈالنا، اس سے وہ دباؤ تکلف پیدا ہوتا ہے جو صوفیہ کے (پاکیزہ) احوال کے بالکل منافی ہے، بلکہ بعض صورتوں میں ایک طرح سے تقدیر سے ٹکراؤ اور اقسام ازل سے عدم رضا کا شائبہ اس کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔

کہا گیا ہے کہ تصوف نام ہے ترک تکلف کا، کیونکہ تکلف سراسر تخلف ہے یعنی صادقین کی شان سے تخلف، تکلف ہے (انسان تکلف کے باعث مخلص بندوں سے ہٹ جاتا ہے) (تخلف من شاء ن الصادقین) حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ میں ایک دفعہ رسول ﷺ کی ایک دعوت ولیمہ میں شامل ہوا جس میں نہ روٹی تھی نہ گوشت تھا۔

### صحابہ کرامؓ کی سادگی:

حضرت جابرؓ کے پاس کچھ احباب تشریف لائے تو انہوں نے ان کے سامنے روٹی اور سرکہ رکھا اور فرمایا! کھاؤ! کیونکہ میں نے رسول ﷺ سے سنا ہے کہ سرکہ بہت اچھا سالن ہے۔ (۸۲)

حضرت سفیان بن سلمہ کہتے ہیں کہ میں سلمان فارسیؓ کے پاس گیا تو انہوں نے نمک اور روٹی لا کر میرے سامنے رکھ دی اور فرمایا کہ اگر رسول ﷺ ہم کو تکلف کرنے سے منع نہ فرماتے تو یقیناً میں تمہارے لئے (کھانے میں) تکلف کرتا (کچھ عمدہ چیزیں تمہیں کھلاتا)۔

تکلف ہر چیز برا ہے جیسے لوگوں کے سامنے لباس میں تکلف کرنا (بغیر اس کے کہ نیت ہو) کلام میں تکلف کرنا۔ اسی طرح بہت زیادہ خوشامد کرنا جو اس زمانے کے لوگوں کا شعار بن گیا ہے۔ چنانچہ اس دور میں چند افراد کے علاوہ کوئی بھی خوشامد سے محفوظ نہیں ہے اب تو یہ حالت ہے کہ بہت سے خوشامدی لوگوں کو یہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ خوشامد کر رہے

ہیں۔ بسا اوقات یہ خوشامد سراسر منافقت بن جاتی ہے اور یہ صوفی کے احوال کے منافی ہے (کسی طرح اس کے شایان شان نہیں ہے)۔

### اس سلسلہ میں سرور ذیشان ﷺ کا فرمان:

حضرت ابو امامہؓ کی روایت ہے کہ رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ حیا اور عجز کلام ایمان کے شعبے میں، یعنی اس کی نشانیاں ہیں اور فحش گفتگو اور چرب زبانی (کثرت کلام) نفاق کی علامتیں ہیں، یہاں ”بیان“ سے مراد کثرت کلام، لوگوں کی خوشامد بجا تعریف اور اپنی زباں دانی کا اظہار ہے اور یہ باتیں اصل صدق کے شایان شان نہیں ہیں۔ (۸۴) حضرت ابن داکلؓ کہتے ہیں کہ میں اپنے ایک دوست کے ہمراہ حضرت سلمان فارسیؓ سے ملاقات کے لئے گیا تو انہوں نے ہمارے سامنے جو کی روٹی اور جو کا نمکین دلیا پیش کیا میرے دوست نے کہا کہ اگر اس دلیہ کے ساتھ پودینہ بھی ہوتا تو یہ اور زیادہ لذیذ ہوتا۔ یہ سن کر حضرت سلمان فارسیؓ گھر سے نکلے اور اپنا لوٹا رہن رکھ کر پودینہ خرید لائے، جب ہم کھانے کھا چکے تو اپنی روزی پر قانع ہوئے تو میرا لوٹا گرویں نہ ہوتا (پودینے کی وجہ سے لوٹا رہن پڑا۔ اس حکایت سے حضرت سلمان فارسیؓ کی طرف سے قولاً اور فعلاً ترک تکلف ثابت ہے۔

### صوفیہ ذخیرہ اندوزی کو پسند نہیں کرتے:

صوفیائے کرام کی ایک اخلاقی خصوصیت یہ بھی ہے کہ کھل کر خرچ کیا جائے اور (مال و متاع) جمع نہ کیا جائے اس کا باعث یہ ہے کہ صوفی خداوند عالم کے لطف و فضل کے خزانوں کو کھلا ہوا دیکھتے ہیں، پس اس مثال اس شخص کی ہے جو ساحل سمندر پر ہوا اپنے مشکیزے اور پکھال میں پانی نہ بھرے (صوفیہ کے سامنے مال و دولت کے انبار ہیں لیکن یہ اپنے لئے جمع نہیں کرتے)۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ دو فرشتے ندا نہ کر رہے ہوں ان میں سے ایک فرشتہ کہتا ہے۔ بار الہا! تو سخاوت کرنے والے کو اس کا بدل عطا فرما اور دوسرا کہتا کہ خداوند اتو بخیل کو ہلاکت میں ڈال! (۸۳)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ کل کے لئے ذخیرہ جمع نہیں فرماتے تھے۔ (۸۵)

ایک دوسری روایت ہے کہ رسول ﷺ کی خدمت میں تین پرندے دکھانے کے لئے بطور ہدیہ بھیجے گئے، آپ کے خادم نے ان میں سے ایک پکا کر آپ کو پیش کیا۔ دوسرے دن آپ کا خادم ان میں سے ایک پرندہ پکا کر لایا تو

رسول ﷺ نے فرمایا میں نے تم کو منع کیا تھا کہ کوئی چیز دوسرے دن کے لئے بچا کر نہ رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہر روز صبح کو روزی عطا فرمادیتا ہے۔ (۸۶)

حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ روایت بھی مروی ہے کہ رسول ﷺ حضرت بلالؓ کے پاس آئے اس وقت ان کے پاس کھجوروں کا ایک ڈھیر موجود تھا، حضورؐ نے فرمایا اے بلالؓ! کیا تم اس سے نہیں ڈرتے جس نے بلالؓ کو نفقہ دیا ہے اور تم اس صاحب عرش سے نہیں ڈرتے کہ وہ اس نفقہ میں کمی کر دے۔ (۸۷)

ابن عبدالعزیزؒ بن محمدؒ نے امام زہری کے براور زادے سے روایت کی ہے کہ روئے زمین پر کوئی کنبہ و قبیلہ یا گھر ایسا نہیں ہے جہاں میں نہ گیا ہوں لیکن کسی کو بھی میں نے رسول ﷺ سے زیادہ (خدا کی راہ میں) اپنا مال خرچ کرنے والا نہیں پایا۔

### قناعت بھی صوفیہ کا ایک خلق ہے:

اخلاق صوفیہ میں قناعت بھی ہے یعنی دنیا کی تھوڑی سی چیز پر بس کرنا، (اس کو کافی سمجھنا) حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ جس نے قناعت اختیار کی اس کو اہل زمانہ سے آرام حاصل ہوا اور اس نے اپنے عہدوں پر غلبہ پایا۔ جناب بشر بن حارث کہتے ہیں کہ قناعت میں بجز عزت کے اگر اور فائدے نہ بھی ہوتے تو صاحب قناعت (قانع) کے لئے یہی بہت کافی تھا۔ جناب بنان بن جہال کہتے ہیں۔

الحر عبد ما طمع و العبد حس ما قنع  
(طمع آزاد بندے کو بھی تو قیدی بناتی ہے قناعت قید ہے۔)

### بزرگوں کے ارشادات قناعت کے بارے میں:

بعض صوفیہ کا ارشاد ہے کہ جس طرح تو قصاص کے ذریعہ اپنے دشمن سے بدلہ لیتا ہے اسی طرح اپنی قناعت سے حرص کا انتقام لے۔ شیخ ابوبکر فراخیؒ فرماتے ہیں کہ دانا وہ ہے جس نے قناعت اور سوچ بچار سے دنیاوی امور کی تدبیر کی اور حرص اور عجلت کے ساتھ اخروی امور کا اہتمام کیا۔ جناب یحییٰ بن معاذ نے کہا ہے جو اپنے رزق پر قانع ہو گیا وہ آخرت کو حاصل کر لے گا اور اس کی زندگی (دنیا) بھی اچھی طرح گزرے گی۔ امیر المومنین علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں، قناعت ایسی تلوار ہے جو کبھی نہیں اچھتی (جس کا دار خالی نہیں جاتا)۔

رسول ﷺ کے ارشادات گرامی !:

عبدالرحمن بن ابی سعیدؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا میں نے رسول ﷺ کا یہ فرماتے سنا ہے اور اس وقت آپ منبر پر تشریف فرما تھے کہ جو قلیل اور کفایت کرنے والی چیز ہے وہ اس چیز سے بہتر ہے جو زیادہ ہو اور لوہو لعب میں مشغول کر دے۔ (۸۸)

رسول ﷺ سے مروی ہے کہ بیشک آپ نے فرمایا جو شخص اسلام لایا اور اس کا رزق اس کے لئے کافی ہو اور اس پر وہ صبر کرے تو وہ کامیاب انسان ہے۔ (۸۹)

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے دعا مانگی اور فرمایا الہ العالمین! آل محمد کے رزق کو قوت بنا دیے (اتنا رزق دے جس کو کھا کر انسان زندہ رہ سکے)۔ (۹۰)

حضرت جابرؓ رسول ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا قناعت ایسا مال ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ (۹۱)

حضرت عمرؓ نے فرمایا، لوگو! تم کتاب اللہ کے ظروف اور حکمت کے چشمے بن جاؤ اور اپنے نفوس کو مردوں میں شمار کرو اور حق اللہ تعالیٰ سے (اپنی روزی) روز کے روز مانگا کرو اور جب تمہارے لئے اس (روزی) میں کثرت نہیں ہوگی تو تم کو کچھ مضرت نہیں پہنچے گی۔

پس صوفی عدل سے اپنے نفس پر غالب ہے اور نفس کی سرشت سے آگاہ ہے، قناعت کے فوائد حاصل کرنا جانتا ہے اور نفس کی اصلاح کی طریقوں سے آگاہ ہے وہ جانتا ہے کہ اس کا مرض کیا ہے اور اس مرض کی دوا کیا ہے۔

ابو سلیمانؒ دارانی کہتے ہیں کہ قناعت رضا سے حاصل ہوتی ہے جس طرح درع زہد سے۔

### صوفیہ کا حلم اور نزاع سے گریز:

صوفیہ کی ایک اخلاقی خصوصیت ہے کہ وہ جھگڑے مٹاتے ہیں اور غیظ و غضب کو ترک کرتے ہیں جب کہ وہ حق کے لیے ہو (دنیاوی معاملات نہ ہوں) وہ نرمی اور تحمل اختیار کرتے ہیں اور اس پر بھروسہ کرتے ہیں جھگڑا کرنے والوں کے نفس میں ہیجان برپا ہو جاتا ہے اور صوفی جب اپنے کسی مخلص اور دوست کے نفس میں اس ظہور پاتا ہے تو وہ اس کا مقابلہ اپنے قلب سلیم کے ساتھ کرتا ہے اور جب نفس قلب حلیم کے مقابل ہوتا ہے تو اس کی یہ وخت دور ہو جاتی ہے اور فتنہ دب جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی تعلیم کے لئے ارشاد فرمایا ہے۔

ادفع بالتي هي احسن فاذا الذين بينك وبينه عداوه كأنه

جس کے عداوت ہے جلد ایک گہرے دوست کی طرح بن جائے

ولی حمیم -

(۹۲)



شیخ ابو حفصؒ فرماتے ہیں کہ ان قلوب میں کینہ کس طرح باقی رہ سکتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ الفت ہے اور جو اس کی محبت میں قدم جمائے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی چھتہ میں غیر متزلزل ہیں اور اس کے ذکر سے مانوس ہیں اس لئے کہ اسے قلوب نفسانی خطرات سے پاک اور طبیعت و سرشت کی تیرگی سے پاک ہیں بلکہ ان کے دل (کی آنکھیں) نور یقین سے سرگیں (سرمد آلود) ہیں پس وہ باہم بھائی بھائی ہو گئے ہیں۔

پس ایسے پاک و صاف قلوب اہل تصوف کے ہیں اور ان لوگوں کے ہیں جو ایک کلمہ پر جمع ہیں اور قدم گاڑے ہوئے ہیں اور جنہوں نے طریقت کی شرائط کا التزام کیا ہے اور تحقیق کے ساتھ حصول کا مرانی پڑٹے ہوئے ہیں (کا مرانی حاصل کر رہے ہیں)۔

### دل اور زبان کی درستی شرط ایمان ہے:

رسول خدا ﷺ نے فرمایا ہے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک اس کا دل اور زبان درست نہ ہو اور نہ کوئی اس وقت تک مومن سمجھا جاسکتا ہے جب تک اس کے پڑوسی اس کے شر سے محفوظ نہ ہوں، غور کیجئے کہ رسول ﷺ نے سلامتی قلب و زبان کو اسلام کو شرط قرار دیا ہے۔ (۹۲) ایک روایت ہے کہ آپ ﷺ کا گزرا ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جو ایک بھاری پتھر کو اٹھا رہے تھے، آپ نے ان سے پوچھا یہ کیا ہے انہوں نے کہا یہ بہت بھاری پتھر ہے (اس کو ہم اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں) آپ نے فرمایا میں تمہیں اس سے بھی بھاری اور سخت چیز سے آگاہ کرتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی سے ناراض ہو لیکن وہ اپنے شیطان اور اپنے بھائی کے شیطان پر غالب آکر اس سے بات چیت کرنے لگے (یہ اس سے بھی اہم اور بڑا کام ہے جو تم کر رہے ہو۔ (۹۳))

### غضب اور غصہ وقار اور حلم کو برباد کرتے ہیں:

وقار اور حلم کا برباد کرنے والا غیظ و غضب ہے اور اس کے باعث انسان عدل و انصاف کی حدوں سے گزر کر ظلم و ستم تک پہنچ جاتا ہے، غضب کے باعث دل مچا خون جوش مارنے لگتا ہے پس اگر کوئی شخص اپنے سے بات پر غصہ کرتا ہے جس پر وہ اپنی بھڑاس نہ نکال سکے۔ تو غیظ و غضب سے جوش مارنے والا خون باہر کی جلد سے آکر دل میں جمع ہو جاتا ہے اور اس سے غم اور حزن کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور مذہب نہائی میں مبتلا ہو جاتا ہے، صوفی ایسی لغویت کی طرف توجہ نہیں دیتا (پس ان پر رنج کرنا بیکار ہے) صوفیا تسلیم و رضا کا پیکر ہے اس کو اطمینان و یقین حاصل ہے، دوسرے کو رنج و الم شک اور

ناگواری کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں جیسا کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے۔ (۹۵)

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے غیظ و غضب کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے صرف تعبیر کا اختلاف ہے۔ یعنی اگر طاقت و کمزور سے جھگڑا کرتا ہے تو غیظ و غضب ظاہر ہو جاتا ہے اور اگر اپنے زیادہ طاقت والے سے اس کا جھگڑا ہے تو وہ اپنے اس غضب کو غم کی مشکل میں چھپا لیتا ہے۔ حزن بھی ایک قسم کا غضب ہے مگر یہ اس وقت ظہور میں آتا ہے جب کوئی دوسرا شخص اس پر غیظ و غضب کرتا ہے (یہ شخص مغضوب و معقوب ہو) اور اگر کسی کو اپنے ایسے برابر والے پر غصہ آئے جس سے انتقام لینے میں تردد ہو تو اس صورت میں کینہ پیدا ہو جاتا ہے (جذبہ انتقام کینہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے) صوفی کا قلب اس کینہ سے پاک و صاف ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

ونز عنما فی صدورہم من غل (۹۶) ہم نے ان کے سینوں سے کینہ کو نکال لیا ہے۔

صوفی کے دل کی سلامتی اور اس کے حال کی درستی کینہ اور دشمنی کے جھاگوں کو اس کے سینے سے اس طرح نکال کر باہر ڈال دیتی ہے جس طرح سمندر اپنے جھاگوں کو باہر پھینک دیتا ہے اور اس کا باعث یہ ہے کہ اس کے دل میں انس اور ہیبت (الہی) کی موجوں کا تلاطم برپا ہے (جس دل میں انس اور ہیبت موجزن ہو وہاں کینہ اور بغض کے جھاگ باقی نہیں رہتے)۔

### مودت اور محبت:

مودت اور باہمی الفت بھی صوفیوں کے اخلاق کا ایک وصف ہے، یعنی برادرانہ موافقت (اتحاد) اور ترک مخالفت! اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کے اصحاب کرامؓ کی اس طرح تعریف فرمائی ہے۔

اشدء علی الکفار رحماء بینہم (۹۷) کافروں پر تو بہت سخت لیکن آپس میں رحم دل ہیں۔

مزید ارشاد فرمایا۔

لو انفقنا ما فی الارض جمیعاً ما الفت بین قلوبہم ولكن اللہ اگر آپ تمام روئے زمین کی چیزیں خرچ کر ڈالتے الف بینہم۔

(۹۸)

درمانِ محبت پیدا کر دی ہے۔

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ”المومن الف مالوف لاخیر فیمن لا یالف ولا یولف“ (۹۹)

یعنی مومن دوسروں سے محبت کرتا ہے اور دوسرے لوگ بھی اس سے محبت کرتے ہیں مگر اس شخص میں کوئی

بھلائی نہیں جو خود محبت کرنے والا ہے اور نہ دوسرے اس سے محبت کرتے ہیں۔

حضور ﷺ کا یہ ایک اور ارشاد ہے کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں۔ دو مومن افراد جب آپس میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو اس وقت ان دو ہاتھوں کی طرح ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کو دھو کر صاف کر دیتے ہیں اور جب وہ مومن افراد ایک دوسرے میں ملیں گے تو ایک دوسرے سے استفادہ کریں گے۔ (۱۰۰) حضور ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ اگر لوگ آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگیں اور محبت کے اسباب کو ترک نہ کر دیں تو پھر ان کو انصاف و عدالت کی ضرورت باقی نہ رہے۔ (آپس میں جھگڑے ہی نہ پیدا ہوں)۔ (۱۰۱)

”حضرت نعمان بن بشیر نے کہا کہ میں نے رسول ﷺ سے سنا ہے کہ فرمایا! آگاہ ہو جاؤ کہ باہمی محبت و مودت میں مسلمانوں کی مثال بدن کی ہے جب بدن کا ایک حصہ بیمار ہو جاتا ہے تو تمام اعضاء بخار میں مبتلا ہو کر جاگتے رہتے ہیں۔ (تکلیف میں مبتلا ہو جاتے ہیں)۔ (۱۰۲) شکر احسان:

احسانات پر شکر گزاری بھی صوفیہ کا ایک خلق ہے کہ وہ احسان کرنے پر اپنے محسن کا شکر ادا کرتے ہیں اور اس لئے دعا کرتے ہیں اور باوجودیکہ ان کو اپنے پروردگار پر اعتمام کلی اور اس کی قدرت پر کامل توکل ہوتا ہے اور ان کے عقیدہ توحید میں صفا کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اور دوسروں سے انہوں نے قطع نظر کر رکھی ہے۔ یعنی صوفیہ نہ دوسروں سے طالب امداد ہوتے ہیں نہ دوسروں سے امید رکھتے ہیں کہ یہ امر عقیدہ توحید کے منافی اور شان توکل کے خلاف ہے۔ اور جو نعمتیں ان کو حاصل ہوتی ہیں ان کو وہ عطیہ خداوندی سمجھتے ہیں کہ اس صورت میں رسول ﷺ کی پیروی ہوتی ہے جیسا کہ اس حدیث شریف سے مظہر ہے کہ رسول ﷺ نے خطبہ میں ارشاد فرمایا۔

”مجھ پر انسانوں میں سے کسی کے احسانات اور حقوق صحبت (حضرت ابوبکرؓ ابن ابی قحافہ سے زیادہ نہیں ہیں، اگر میں کسی کو اپنا دوست بناتا تو ابوبکرؓ کو (ضرور دوست) بناتا۔“

اس سلسلہ میں مزید فرمایا (حضرت ابوبکرؓ کے مال سے زیادہ کسی کے مال سے مجھے نفع نہیں پہنچا۔“ (۱۰۳) کچھ لوگ خلق خدا کے ساتھ بخشش کرنے اور نہ کرنے کے باعث اللہ تعالیٰ سے حجاب میں رہتے ہیں (اس نکتہ کی وضاحت آئندہ کی جائے گی) مگر صوفی کی حالت یہ ہے کہ وہ ابتداء کے حال میں تو مخلوق سے اپنا تعلق

منقطع کر لیتا ہے اور ہر چیز کا تعلق خداوند تعالیٰ ہی سے وابستہ رکھتا ہے (بقدر اس نور توحید کے جو اس کی پیشانی سے نمایاں ہے) لیکن جب وہ توحید کی چوٹی پر پہنچ جاتا ہے تو شکر خالق بجالانے کے بعد شکر مخلوق بھی بجالاتا ہے اور اس وقت وہ ممانعت اور عطا کی حقیقت کو تسلیم کر لیتا ہے۔

”حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جنت میں وہ لوگ سب سے پہلے بلائے جائیں گے جو اللہ تعالیٰ کی حمد کرنے والے ہیں خواہ تکلیف کی حالت میں ہوں یا عالم راحت میں (نفع نقصان ہر حال میں خدا کی حمد بیان کرتے ہیں)۔ (۱۵۴)

### شکر الہی ادا کرنے کے سلسلے میں چند اور احادیث:

حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ ”جس بندے کو نعمت دی جائے اور وہ اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرے تو یہ حمد اس کے لئے افضل ہے۔“ (۱۵۵)

حضور ﷺ کا یہ ارشاد کہ وہ حمد اس کے لئے افضل ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ اس شکر کو زیادہ پسند فرما کر اور یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ یہ شکر اس نعمت سے افضل ہے جو اس کو حاصل ہوتی ہے پس جب صوفیہ نعمتوں پر اپنے منعم حقیقی کا شکر ادا کرتے ہیں تو اس وقت وہ اس محسن انسان کا بھی شکر ادا کرتے ہیں جو اس نعمت کا واسطہ ہے (مجموعہ و سائٹ کے ہے) اور اس کے لئے دعا بھی کرتے ہیں۔ (۱۵۶)

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ جب رسول اکرم ﷺ کچھ لوگوں کے پاس روزہ افطار فرماتے تھے تو ارشاد ہوتا۔ تمہارے پاس روزہ داروں نے روزہ افطار کیا اور نیک بندوں نے تمہارا کھانا کھایا اور (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) تم پر سکون و طمانیت نازل ہوئی۔ (۱۵۷)

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا ”جو کوئی اپنے بھائی سے جزاک اللہ خیرا کہتا ہے تو اس کے معنی ہیں کہ وہ اس کی بھید تعریف کرتا ہے۔ (۱۵۸)

### مسلمانوں کی مقصد براری و حاجت روائی!:

صوفیوں کے پاکیزہ اخلاق میں سے ایک خلق یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائیوں اور اپنے انخوان طریقت کی حاجت براری کے لئے بذل مالی ہی نہیں بلکہ بذل جاہ بھی کرتے ہیں اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لاتے

ہیں پس چاہیے کہ اس جماعت میں جو کوئی علم وسیع کا مالک ہو اور نفس کے عیوب اس کی آفات اور خواہشات سے آگاہی رکھتا ہو تو اپنے اثر سے کام لے کر اور اپنے رسوخ کو استعمال کر کے مسلمانوں کی حاجت روئی کرے، ان کی ضرورتوں کو پورا کرے اور ان کی اصلاح حال میں مددگار ثابت ہو، اس صورت میں صوفی کے لئے تجربی علمی کی ضرورت ہے کیونکہ ایسے کاموں کا مخلوق کی معاشرتی زندگی سے تعلق ہے لہذا اس مقصد میں وہی کامیاب ہو سکتا ہے جو بلند پایہ صاحب معرفت اور ایک علم ربانی ہے (ورنہ علاقہ دنیاوی میں گرفتار ہو جانے کا احتمال ہے)۔

حضرت زید بن اسلمؓ سے منقول ہے کہ ایک نبی اللہ بادشاہ کی رکاب کے ساتھ ساتھ رہتے تھے اور ان کا یہ طرز عمل اس لئے تھا کہ اس طرح وہ خلق خدا کی حاجتیں پوری کیا کرتے تھے۔

شیخ ابو عثمان الحیری کہتے ہیں کہ انسان اس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک اس کے دل میں ان چار چیزوں میں تناسب نہ ہو جائے منع، عطاء، عزت، ذلت، پس ایسا شخص ہی دوسروں کی مقصد براری (ارباب مناصب و سلاطین سے) کر سکتا ہے اور اس کام کے لئے موزوں ہے۔

شیخ سہل بن عبد اللہ تسری فرماتے ہیں کہ انسان اس وقت تک ریاست کو مستحق نہیں ہوتا، جب تک اس کے اندر یہ تین خصلتیں پیدا نہ ہو جائیں۔

- (۱) لوگوں کی جہالت سے قطع نظر کرے اور ان کو اپنی جہالت سے محفوظ رکھے۔
- (۲) جو کچھ لوگوں کے پاس (مال و متاع) ہے وہ ان کے پاس رہنے دے۔
- (۳) جو کچھ اس کے ہاتھ میں ہے دوسروں کے لئے اس کو خرچ کرے۔ (دوسروں پر خرچ کرے اور دوسروں کے مال سے توقع نہ رکھے)۔

ایسی ریاست وہ ریاست و امارت نہیں ہے جو منافعی زہد ہے اور صدق و سلوک کے لئے جس سے بچنا ضروری ہے، بلکہ یہ ریاست ایسی جس کو حق تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی بھلائی کے لئے قائم کیا ہے۔ اس لئے جو صاحب طریقت اور صوفی اس پر قائم ہے وہ اپنے اس قیام سے بھی خداوند تعالیٰ کے ساتھ ہے اور اس کا ضروری حق ادا کرتا ہے اور نعیم الہی کا شکر ادا کرتا ہے۔

## حوالہ جات باب پنجم

- ۱۔ صدیقی، عبد الحمید: انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام، ناشر: اسلامک پبلشنگ ہاؤس شیش محل روڈ لاہور۔ سن اشاعت: اگست ۱۹۹۱ء ص: ۲۰۵-۱۹۳۔
- ۲۔ القرآن حکیم: ۵ (مائدہ): ۱۰۵۔
- ۳۔ القرآن حکیم: ۶ (الانعام): ۱۶۴۔
- ۴۔ القرآن حکیم: ۱۷ (بنی اسرائیل): ۷۔
- ۵۔ ریاض الصالحین، ص: ۳۶۹۔
- ۶۔ صدیقی، عبد الحمید: انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام، ناشر: اسلامک پبلشنگ ہاؤس شیش محل روڈ لاہور۔ سن اشاعت: اگست ۱۹۹۱ء ص: ۲۰۵-۱۹۳۔
- ۷۔ القرآن حکیم: ۸۷ (الاعلیٰ): ۱۵-۱۴۔
- ۸۔ القرآن حکیم: ۲۴ (النور): ۳۷۔
- ۹۔ القادری، محمد طاہر، پروفیسر: حقیقت تصوف، منہاج القرآن پبلی کیشنز، مرکزی سیکرٹریٹ ۳۶۵/ ایم ماڈل ٹاؤن لاہور ص: ۱۰۷-۱۰۶۔
- ۱۰۔ ندوی، علی، ابوالحسن، مولانا: انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال، ناشر: مجلس نشریات اسلام آباد کراچی، ص: ۶۳-۶۲۔
- ۱۱۔ آرنلڈ، پروفیسر، دعوت اسلام، ناشر: محکمہ اوقات پنجاب، لاہور ص: ۲۷۷۔
- ۱۲۔ محمد شفیع، پروفیسر: ”مقالات دینی و علمی“، ناشر: احمد ربانی ریلوے سروس پاکستان، ص: ۹۴۔
- ۱۳۔ دہلوی، نظام الدین، خواجہ، ”فوائد الفوائد“، ناشر: محکمہ اوقاف پنجاب، لاہور ص: ۱۷۲۔
- ۱۴۔ ندوی، علی، ابوالحسن، مولانا: تاریخ دعوت و عزیمت، ناشر: مجلس نشریات اسلام کراچی، ص: ۷۲۔
- ۱۵۔ محمد اکرام، شیخ، ڈاکٹر: آب کوثر، ناشر: فیروز سنز لاہور، ص: ۱۹۴-۷۵۔
- ۱۶۔ ایضاً روڈ کوثر ص: ۸۸-۹۰۔

- ۱۷۔ گیلانی، خورشید احمد، سید: روح تصوف، مطبع: عالمین پبلی کیشنز، پریس ۲۲/۱۰، رئیس گین روڈ لاہور، ص: ۱۰۴۔
- ۱۸۔ نظامی، خلیق احمد، پروفیسر: تاریخ مشائخ چشت، مطبوعہ: دارالمؤمنین اسلام آباد، ص: ۷۵-۷۶-۷۷۔
- ۱۹۔ ندوی، علی، ابوالحسن، مولانا: تاریخ دعوت و عزیمت، ص: ۲۸۰-۲۷۹۔
- ۲۰۔ محمد اکرام، شیخ، ڈاکٹر: آب کوثر، ص: ۳۱۲۔
- ۲۱۔ جیلانی، عبدالقادر شیخ: فیوض یزدانی، مجلس، ۵۱، مطبوعہ علمی کتب خانہ کراچی۔
- ۲۲۔ محمد اکرام، شیخ، ڈاکٹر: آب کوثر، ص: ۳۵۸۔
- ۲۳۔ گیلانی، خورشید احمد: روح تصوف، ص: ۲۶-۱۲۵۔
- ۲۴۔ دہلوی، شہاب: خطہ پاک اوج، ناشر: اردو اکیڈمی بہاولپور، ص: ۲۷۵۔
- ۲۵۔ محمد اکرام، شیخ، ڈاکٹر: آب کوثر، ص: ۶۸-۲۶۷۔
- ۲۶۔ جمالی، حامد بن فضل اللہ: سید العارفین، ناشر: مرکزی اردو بورڈ، ص ۲۳۱+۳-۲۰۱-۲۷-۲۶۔
- ۲۷۔ محمد اکرام، شیخ، ڈاکٹر: رود کوثر، ص: ۸۹-۸۸۔
- ۲۸۔ ندوی، علی، ابوالحسن، مولانا: تاریخ دعوت و عزیمت، ص: ۳۳۵۔
- ۲۹۔ امام اعظم: مسند امام اعظم، ص: ۲۳۲۔
- ۳۰۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، انفاس العارفین، ناشر المعارف لاہور، ص: ۵۵۔
- ۳۱۔ کلیم، محمد دین، تذکرہ مشائخ قادریہ، ناشر: مکتبہ نبویہ لاہور، ص: ۱۷۵۔
- ۳۲۔ گیلانی، خورشید احمد، سید: روح تصوف، ص: ۵۰-۱۴۹۔
- ۳۳۔ القرآن الحکیم: ۷ (الاعراف) ۱۸۵۔
- ۳۴۔ القرآن الحکیم: ۱۷ (بنی اسرائیل) ۲۶۔
- ۳۵۔ بھٹئی، ظہیر الدین، محمد: اسلام دستور حیات۔ مطبع: مکتبہ جدید پریس لاہور، سن اشاعت: ۱۹۹۵ء، ص: ۱۸۔
- ۱۷۔
- ۳۶۔ القرآن الحکیم: ۲۸ (فتح) ۲۹۔
- ۳۷۔ القرآن الحکیم: ۲۴ (نور) ۳۷۔

- ۲۸- ابن ماجہ، محمد بن یزید، ابو عبد اللہ، القزوی، السنن، مہر کتب خانہ، تنص: ۲۸۹
- ۲۹- القرآن الحکیم: ۲۶ (شعراء): ۱۵۹-۱۰۵
- ۳۰- القرآن الحکیم: ۲۶ (شعراء): ۱۲۳-۱۲۷
- ۳۱- القرآن الحکیم: ۲۶ (شعراء): ۱۳۱-۱۳۵
- ۳۲- القرآن الحکیم: ۲۶ (شعراء): ۱۶۰-۱۶۴
- ۳۳- القرآن الحکیم: ۲۶ (شعراء): ۱۸۰
- ۳۴- القرآن الحکیم: ۳۶ (سورہ یسین): ۲۱-۲۲
- ۳۵- نعمانی، منظور احمد، مولانا، معارف الحدیث: ج ۲، ص: ۱۰۹
- ۳۶- دہلوی، شہاب: خطہ پاک اوج، ص: ۲۶۵
- ۳۷- دہلوی، نظام الدین، خواجہ: فوائد الفواد، ص: ۳۷۷-۳۷۸
- ۳۸- جمالی، حامد بن فضل اللہ: سید العارفین، ص: ۲۹-۲۸
- ۳۹- دہلوی، نظام الدین، خواجہ: فوائد الفواد، ص: ۲۱۸-۲۱۹
- ۵۰- نظامی، خلیق احمد، پروفیسر: تاریخ مشائخ چشت، ص: ۱۹۳-۱۳۸
- ۵۱- القرآن الحکیم: ۳ (آل عمران): ۱۳۹
- ۵۲- القرآن الحکیم: ۵ (المائدہ): ۴۵
- ۵۳- افغانی، دین محمد: تجدید الاسلام، مطبوعہ: السلامیہ پریس کونسل، ص: ۴۴-۴۰
- ۵۴- گیلانی، خورشید محمد، سید: روح تصوف، ص: ۲۰۱-۲۰۳
- ۵۵- قول بحوالہ اخبار الاخبار: عبدالحق محدث دہلوی، مشتاق کتب خانہ بوہڑ گیٹ ملتان، ص: ۴۵
- ۵۶- الحدیث، بحوالہ عوارف المعارف، ص: ۲۲۳
- ۵۷- ترمذی، محمد بن عیسیٰ، ابو عیسیٰ، سنن الجامع، ص: ۵۸
- ۵۸- القرآن الحکیم: ۹۱ (التیس): ۱۰-۷
- ۵۹- القرآن الحکیم: ۶۶ (تحریم): ۶
- ۶۰- سہروردی، شہاب الدین، شیخ: عوارف المعارف، مترجم: شمس بریلوی، ناشر: ارشد برادرز کوچہ چیلان دریا گنج



٦١	على، المتقى، الهندي	كنز العمال في سنن الاقوال والافعال ج: ٢، حديث نمبر ٢٣٤٢
٦٢	الحديث	بحواله تفسیر مظہری ج: ١٠، ص: ٢٣٢
٦٣	العجلونی، الحنفی، الحافظ	كشف الخفاء ج: ١، ص: ١٤٦
٦٤	الحديث بحواله عوارف المعارف	مؤلفه شیخ شہاب الدین سہروردی ص: ٣٩٤
٦٥	سہروردی، شہاب الدین، شیخ	عوارف المعارف ص: ٣٩٨-٣٩١
٦٦		كنز العمال في سنن الاقوال والافعال ج: ٤، حديث نمبر ١٣٣٨٥
٦٧	القرآن الحكيم	٥٩ (سورة حشر) ٩
٦٨	القرآن الحكيم	٥٩ (حشر) ٨
٦٩	سہروردی، شہاب الدین، شیخ	عوارف المعارف ص: ٣٩٠-٣٩٠
٧٠	القرآن الحكيم	٥٩ (حشر) ٩
٧١	القرآن الحكيم	٢ (البقره) ٨-٨
٧٢	الترمذی، محمد بن عیسیٰ بن سورہ، ابو عیسیٰ	سنن الجامع باب سنۃ الجنتہ ج: ٢، ص: ٤٨
٧٣	القرآن الحكيم	٣ (آل عمران) ١٣٣
٧٤	العجلونی، الحنفی، الحافظ	كشف الخفاء ج: ١، ص: ٣٢١
٧٥	القرآن الحكيم	٨٠ (عبس) ٣٨-٣٩
٧٦	القرآن الحكيم	٨٣ (المطففين) ٢٣
٧٧		كنز العمال في سنن الاقوال والافعال ج: ٥، حديث نمبر ٥٨٢١
٧٨	ابن ماجہ، محمد بن یزید، ابو عبد اللہ، القزوينی	السنن ابن ماجہ ج: ١، ص: ٣٢١
٧٩	العجلونی، الحنفی، الحافظ	كشف الخفاء ج: ١، ص: ٤٨٥
٨٠	الترمذی:	سنن الجامع باب مزاح في الكلام ج: ٢، ص: ٥٣١
٨١	البخاری، محمد بن اسمعیل، ابو عبد اللہ، امام	الجامع الصحیح ج: ٢، ص: ٥١٢

٨٢	ولي الدين، محمد بن عبد الله، أبو عبد الله، الخطيب	مشكوة المصابيح	ص: ٣١١
٨٣	ديلمي، امام	مسند الفردوس	ج: ١، ص: ٣٣٩
٨٤	القادري، الشيخ	جامع الكلمات	ص: ٣٤٢
٨٥	الحديث بحواله تفسير ابن كثير		ج: ٢، ص: ٣٦
٨٦	الحديث	اخرجه ابن ابي الدنيا في القناعة	ص: ٢٨
٨٧	الحديث، شوكانى، علامه	نيل الاوطار	ص: ١١٢
٨٨	ديلمي، الحافظ، الامام	مسند الفردوس	ص: ١٣٥
٨٩	ابن ماجه، محمد بن يزيد، أبو عبد الله، القزويني	سنن ابن ماجه في ابواب الزهد	ج: ١، ص: ٣١١
٩٠	ايضاً		ص: ٣١٢
٩١	الحديث	بحواله قوت القلوب	ج: ١، ص: ٢٤١
٩٢	القرآن الحكيم		٢١ (تم السجده) ٣٣
٩٣	الحديث	المستمر وك للمحاکم	ص: ٢١٢، حديث نمبر ٢٣٥
٩٤	ابو نعيم، الحافظ	حلية الاولياء	ج: ١٠، ص: ٣٥١
٩٥	على، الممتقى، الحففى	كنز العمال	ج: ٤، حديث نمبر ١٢١٢١
٩٦	القرآن الحكيم		٤ (الاعراف) ٢٢
٩٧	القرآن الحكيم		٢٨ (الحجرات) ٢٩
٩٨	القرآن الحكيم		٨ (انفال) ٦٢
٩٩	على، الممتقى، الهندي،	كنز العمال	ج: ٤، حديث نمبر ١٣٢٥١
١٠٠	الحديث	مشكوة المصابيح	ص: ٢٤٢
١٠١	ايضاً		ص: ٢١

١٠٢	البخاري، محمد بن اسماعيل، ابو عبد الله، امام	الجامع الصحيح / باب صفة المسلم	ج: ١، ص: ١٣١
١٠٣	ايضاً		ج: ٢، ص: ٢٥٢
١٠٣	الحديث	مشكوة المصابيح	ص: ٢٣١
١٠٥	ايضاً		ص: ٢٣٥
١٠٦	ايضاً		ص: ٢٩٩
١٠٧	ايضاً		ص: ٢٠٣
١٠٨	العجلوني، الحافظ، الامام	كشف الخفاء	ج: ٣، ص: ٢٦٢
١٠٩	سهروردي، شهاب الدين، شيخ	عوارف المعارف	ص: ٢٠١-٢٢٢

# باب ششم

معاشی رویوں کی تشکیل میں تصوف کا کردار

## معاشی رویوں کی تشکیل میں تصوف کا کردار

(منفی رویوں کا انسداد اور مثبت رویوں کے حصول کے لئے تصوف کا کردار)

معاش عربی زبان کا لفظ ہے اس کا مادہ ”عاش“ ہے۔ جس کے معنی زندہ رہنے کے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کا مادہ عیش ہے۔ جس کے معنی روزی، خوراک، رزق، گزران کے ہیں۔

عیش کے لفظ سے معیشت ہے جس کے معنی سامان زیست کھانے پینے کی وہ تمام اشیاء جن پر زندگی بسر کی جائے۔

علم معاشیات اصطلاحی طور پر ایسے وسائل کی دریافت کو کہتے ہیں۔ جو دولت پیدا کرنے کے مناسب طریقے اور اس کے خرچ کے صحیح استعمال اور اس کی ہلاکت اور بربادی کے حقیقی اسباب بتا سکیں۔ (۱) کائنات ہست و بود میں ”ایک صالح معاشی نظام“ کی اس لئے ضرورت پیش آتی ہے کہ ہر ایک انسان میں یہ فطری جذبہ موجود ہے کہ اس کو خداوند تعالیٰ کی

بخشی ہوئی زندگی سے فائدہ اٹھانا چاہیے مگر یہ فطری جذبہ جب زندگی کی کشش اور وسائل حیات کی کشاکش میں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں تو قانون فطرت جو خداوند تعالیٰ کی جانب سے تمام کائنات پر حاوی ہے۔ ہر ایک انسان کو اجتماعی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتا ہے لیکن یہ حیات اجتماعی بغیر کسی ایسے نظام کے تصور نہیں ہو سکتا جب تک ان کے درمیان ایسا تعاون و اشتراک موجود نہ ہو جس کی بنیاد عدل و معیشت کی مساوات پر قائم ہوتا کہ وہ صالح معاشی نظام کے لئے کلید بن سکے اور اس قسم کا تعاون و اشتراک جب ہی عالم وجود میں آ سکتا ہے کہ نظام معاشیات میں حسب ذیل اصول کارفرما ہوں۔

۵۔ وہ نظام ہر متعلقہ فرد کی معاشی زندگی کا کفیل ہو اور اپنے دائرہ عمل میں کسی بھی فرد کو معاشی زندگی سے محروم نہ رکھتا ہو۔

۵۔ ایسے اسباب و وسائل کا قلع قمع کرتا ہو جو معاشی دستبرد کا موقع مہیا کر کے افراد انسانی کے درمیان ظلم و استبداد کی راہیں کھولتے اور معاشی نظام کے فساد کا موجب بنتے ہوں۔

۵۔ دولت اور اسباب دولت کو کسی خاص فرد یا محدود جماعت کے اندر سمٹ آنے اور اس فرد یا جماعت کو نظام معیشت پر قابض و مسلط ہونے سے باز رکھتا ہوتا کہ معاشی نظام تمام کائنات انسانی کی فلاح کی بجائے مخصوص طبقوں کے اغراض کا آلہ کار بن کر نہ رہ جائے۔

۵۔ محنت اور سرمایہ کے درمیان صحیح توازن قائم کرنا اور ایک کو دوسرے کی حدود پر غاصبانہ دستبرد سے بچاتا ہو۔ (۲)

## فصل اول

### صوفیاء کے افکار کی روشنی میں تحریک مادیت کے اثرات اور ان کا انسداد

تحریک مادیت یا اشتراک کی انقلاب جو کارل مارکس اور لینن کے فلسفہ اور نظریہ کو مزدوروں، کسانوں اور محنت کشوں کے ہاتھوں عملی جامہ پہنا کر برپا کیا گیا تھا۔

آج کئی ایک ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لے کر ایک طوفان عظیم کی صورت اختیار کر چکا ہے اور جو ممالک آج تک بچے ہوئے ہیں وہ بھی اس سیلاب کے ریلے سے زیادہ عرصے تک محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔ اس کی وجہ معلوم کرنے میں تاریخ ہماری مدد کرتی ہے۔ سرمایہ دار گروہ اور برسر اقتدار طبقہ نے مدتوں سے غریب عوام کو ہر ممکن طریقوں سے دبائے رکھنے کی کوشش کی۔ سرمایہ دار اور برسر اقتدار طبقہ چونکہ قوت کا مالک تھا۔ لہذا غریب مزدور اور کسان طبقہ کی ایک بڑی تعداد تو اپنا خون

پسینہ ایک کر کے کھاتے رہتے اور یہ اوپر کا مختصر گروہ انکی کمائی کو اپنا سمجھ کر بے ڈکار ہضم کرتے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کمانے والے محنت کش تو ذلیل و پسماندہ ہوتے گئے اور ان کی کمائی کو بے ڈکار ہضم کرنے والے دولت و اقتدار کے نشہ میں انسانی اخلاق سے گزر کر کلیوں ناچ گھروں اور قحبہ خانوں میں اپنی رنگ رلیاں مناتے گئے۔ غضب بالاے غضب یہ کہ اس دور میں علم، کلچر اور مذہب کی فوقیت کا جو معیار پیش کیا گیا تھا وہ بھی برسر اقتدار اور مختصر طبقے نے اپنی خوشنودی کی خاطر اپنی مرضی اور خواہشات کے مطابق خود ساختہ طور طریقوں سے اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لئے استعمال کیا۔

لہذا اس سے اگر کوئی سکون اور اطمینان حاصل ہوتا تھا تو اوپر کے طبقے ہی کو حاصل ہوتا تھا۔ علم و عقل کی بلندی اور ذہن کی جلا ہوتی تو اوپر کی طبقہ کی ہوتی، تمدن و تہذیب کی برکتیں پھیلتیں تو صرف ان کے گھروں اور محلوں تک ہی محدود رہتی۔ زمین، جاگیریں، جائیدادیں اور عہدے تقسیم ہوتے تو صرف انہی لوگوں تک محدود رہتے اس کے برعکس محکوموں یعنی غریب مزدوروں کسانوں اور محنت کشوں کو اتنی مشقت کرنی پڑتی کہ انہیں کسی بات کا ہوش تک بھی نہ رہتا اور اگر کبھی کبھار ان کے شعور کی آنکھیں کھل بھی جاتیں تو انہیں پھر سلانے کی خواب آور دواؤں کی کمی نہ تھی۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے کوئی محکوم اگر

پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمران کی سحری

اور اس طرح جب غریب عوام پر ظلم کی انتہا ہو گئی تو ظلم کو ظلم سے توڑنے کا رد عمل کیمونزم کی صورت میں کریملن کی بلندیوں سے نمودار ہوا اس نے انسانیت کے پسماندہ طبقوں کو لٹکارا اور انقلاب کا نعرہ ان الفاظ میں بلند کیا۔ کہ اے غریب مزدوروں، کسانوں اور محنت کشو! مستقبل تمہارا ہے۔ سرفلک عمارتیں اور رزق کی یہ فراوانی آرام و آسائش کے یہ ذرائع تمہاری محنت اور تمہارے خون پسینے ایک کرنے کا نتیجہ ہیں۔ دنیا کی ساری ثروت اور دولت تمہارے ہاتھوں کی کمائی ہے۔ اٹھو اپنے آپ کو منظم کرو۔ آگے بڑھو اور ان غاصبوں سے اپنا حق بزور چھینو یہ ساری متاع تمہاری ہے اس پر قبضہ کرو اور جو شخص تمہارے آڑے آئے اسے ختم کر دو۔ جو علم، کلچر، مذہب اور اخلاق تمہارے سدراہ ہو اس کا انکار کر دو۔ وہ علم ناقابل اعتبار ہے۔ وہ کلچر بیکار ہے۔ وہ مذہب فرسودہ ہے اور اخلاق کا وہ نظام بے معنی ہے جو سرمایہ کے سہارے زندہ ہو اور غریب کو اس کے حق سے محروم کرتا ہو اور ساتھ ہی یہ دعویٰ پیش کر دیا کہ اشتراکیت ہی ایک ایسا فلسفہ ہے کہ جس پر عمل کرنے سے ساری کی ساری خلق خدا بغیر کسی رنگ، نسل، ملک یا مذہب کی تمیز کے آزادی مساوات اور اقتصادی خوشحالی کی نعمتوں سے فیضیاب ہوگی۔

اس آواز میں عام زندگی کی ساری خوبصورتیاں مستقبل کی امیدوں کی رعنا یاں اور سرمایہ دارانہ سامراج کے بوجھ تلے

کراہتے ہوئے انسان کے لئے آگے بڑھنے کی ولولہ انگیزیاں پنہاں تھیں۔ غریبوں کی امیدیں بندھ گئیں۔ ذلیل اور پسماندہ انسان عزت و اقبال کے خواب دیکھنے لگے۔ کم ہمتوں میں جرات اور حوصلہ پیدا ہوا اور اتفاق سے اس وقت غریبوں پسماندوں اور کم ہمتوں کی کثرت تھی۔ چنانچہ سرمایہ داروں کی چکی میں پسے ہوئے محنت کشوں، مزدوروں سرمایہ دارانہ سامراج کے ظلم و ستم کی آگ سے جھلے ہوئے انسانوں نے انقلاب کی یہ آواز سنتے ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اندھا دھند اس کی طرف دوڑ پڑے نتیجہ یہ ہوا کہ آج یہ عالمگیر انقلاب نہ صرف یورپ کے ایک بڑے حصے کو اپنی لپیٹ میں لا چکا ہے۔ بلکہ ایشیائی ممالک میں سے چین جیسی عظیم مملکت کے علاوہ کئی اور ملکوں کو بھی اپنی گرفت میں لے چکا ہے اور بعض کو پھانسنے کے لئے کوشاں ہیں۔

بلکہ واقعات کی رفتار کو دیکھ کر میں تو یہ کہوں گا کہ اگر حالات یہی رہے تو یہ انقلاب یہیں تک محدود نہ رہے گا بلکہ یہ ایک ایسا عالمگیر انقلاب ہوگا جس کا روح زمین پر پھیل جانا ایک حقیقت بن چکا ہے کمیونسٹ ممالک کی دن دگنی اور رات جگنی ترقی اور معاشی خوشحالی کو چھپانا سورج کو دو انگلیوں میں چھپانا ہے۔ کمیونزم نے مزدوروں، محنت کشوں اور غریبوں کے لئے جو معیاری کام کئے ہیں۔ ان کو سرمایہ دارانہ امپیریلیزم کے جھوٹے اور نام نہاد پروپیگنڈہ سے جھٹلایا نہیں جاسکتا ہے۔ اگر ہم امپیریلیزم کے جھوٹے اور نام نہاد پروپیگنڈہ میں آکر کمیونزم کے اس آنے والے عظیم انقلاب سے غافل رہے تو ہمارے مزدور، محنت کش اور غریب عوام ہی ان کے شکار نہ ہوں گے بلکہ ہمارے کالجوں اور مدرسوں کے طالب علم اور دفاتروں کے کلرک بھی اس ریلے میں بہہ جائیں گے۔ اور دیکھتے دیکھتے مذہب اور دین ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے گا اور ان کا اصل عروج اس وقت سے شروع ہوگا جب یہ لوگ ظاہری طور پر دکھاوے یا دھوکہ دینے کی خاطر خدا کے وجود کے قائل ہو جائیں گے اور اسلامی دنیا کی حمایت شروع کر دیں اور سرکاری طور پر مذہب کی آزادی کا اعلان کر دیں گے۔ حالانکہ یہ ان کا سب سے بڑا دخل ہوگا جو اسلامی حکومتوں کو اپنے فریب میں پھنسانے اور ان ملکوں میں پھیل جانے کی خاطر برپا کیا جائے گا۔

میں دنیا جہاں کے امن پسند انسانوں سے یہ کہوں گا کہ تمہیں اس آنے والے عالمگیر انقلاب کی قوت و وسعت، شدت اور سفاکی کا پورا اندازہ نہیں لیکن میں تمہیں بتلاؤں دیتا ہوں کہ اس انقلاب کو قیامت صغریٰ سے کم نہ سمجھو یقیناً یہ حشر برپا کر کے رہے گا۔ اگر تم نے اپنے ملک کے تباہ حال اور بے کس طبقوں کی خبر نہ لی اگر تم نے سرمایہ داروں اور برسر اقتدار کی ساعری کو توڑ کر غریبوں کی مدد نہ کی، اپنے ملک کے باشندوں سے اقتصادی بد حالی دور نہ کی اور انہیں اس حال میں رہنے دیا جس میں وہ صدیوں سے جان توڑ رہے ہیں اگر تم نے اوپر کے لوگوں سے غریبوں مزدوروں اور محنت کشوں کا



غضب شدہ حق واپس نہ دلویا اور وہ حسب سابق جونک بن کر غریب عوام کا خون چوستے رہے۔ اگر تم اپنے ملک کے باشندوں کو اچھی خوراک، اچھی پوشاک اور اچھے مکانات با آسانی مہیا کرنے میں ناکام رہے اور ان بے کس اور تباہ حال لوگوں کو بھوک، جہالت، ذلت، غفونت اور بیماری کی دلدلوں میں بدستور پھسنے رہنے دیا۔ تو یاد رکھو! اشتراکی سامراج کا یہ لادینی فلسفہ جو آگ کی طرح ساری دنیا میں پھیل رہا ہے۔ تمہارے ملک کے تمام مزدوروں، کسانوں، مزارعوں، دکانداروں، دستکاروں، کلرکوں، دفاتر کے ادنیٰ ملازموں غریبوں، محنت کشوں، سکول اور کالج کے طالب علموں بلکہ تمام سیاسی جماعتوں، غریبوں کے مفاد سے دلچسپی رکھنے والے اداروں، انجمنوں، کمیٹیوں، محنت کشوں کی یونینوں، اور دفاتر کے ملازمین کی ایسوسی ایشنوں کو اپنے دل کش وعدوں اور پرفریب بلند بانگ دعوؤں سے تمہارا جانی دشمن بنادے گا۔ کیونکہ غریب انسانیت اب زیادہ دیر تک ظلم نہیں سہہ سکتی۔ اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ اگر تمہاری غفلت سے ان کی دشمنی کی آگ بھڑک اٹھی تو اسکے شعلے نہ صرف تمہیں جلا کر خاکستر کر دیں گے بلکہ تمہارے علم، کلچر اور مذہب کی بھی خیر نہ ہوگی وہ تمہارے علمائے ناجائز حرکتوں اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن جانے کو بہانہ بنا کر تمہارے علم، کلچر اور مذہب سے صاف انکار کر دیں گے۔ اور تمہارے فردا کے رنگین وعوؤں کو فریب سمجھ کر دین سے بے دین ہو جائیں گے۔ اور پھر یہ کمیونزم جو آج تمہارے غریبوں، مزدوروں اور محنت کشوں کو اقتصادی خوشحالی کی ضمانت دے رہا ہے اور مذہب کی آزادی کا اعلان کر رہا ہے۔ کل کو انہی لوگوں کے ہاتھوں تمہارے مذہب، کلچر اور علم کو نیست و نابود کر دے گا اور معاشی خوشحالی کے ساتھ ساتھ اشتراکی سامراج کے فلسفے کو بھی تم پر بزور شمشیر مسلط کر دے گا۔

میرا مقصد یہ نہیں کہ ہم امپیریلزم کا ساتھ دے کر کمیونزم کا مقابلہ کریں یا امپیریلٹ یا کمیونسٹ دونوں کو دشمن بنائیں میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ اسلام وہ مذہب ہے جس کا جواب نہ کمیونزم میں ہے اور نہ ہی امپیریلزم میں۔ تو پھر کیوں نہ ہم اسلامی معاشی انقلاب برپا کر دیں اور نہ صرف غریبوں، محنت کشوں اور مزدوروں کی اقتصادی بدحالی کو دور کریں بلکہ ان کو مراعات بھی دیں جو امپیریلزم اور کمیونزم بھی نہ دے سکتے ہوں تاکہ معاشی خوشحالی کے ساتھ ساتھ دین اور مذہب بھی برقرار رہے۔ اور

”ربنا اتنا فی الدنیا حسنة وفى الآخرة حسنة وقنا عذاب النار“ (۴)

”اے رب ہمیں دنیا میں بھی حسنت عطا فرما اور آخرت کے حسنت بھی۔“

کے حکم خداوندی کے بموجب دنیا و آخرت دونوں جہان کی نعمتوں کے مالک بن سکیں اور انسانیت کے اصل نصب العین کو پا کر رضائے الہی کے صحیح حق دار بن جائیں۔

اور اس میں ہمیں نہ صرف ملت اسلامیہ کو ہی کمیونسٹ سامراج کے اس لادینی فلسفہ اور سرمایہ دار سامراج کی ساحری دونوں سے محفوظ رکھنا یا مسلم ممالک کے مسلمان کسانوں، مزدوروں، محنت کشوں، اور مسلم معاشرے کو ان سیلابوں سے بچانا ہوگا۔ بلکہ تمام بنی نوع انسان کو بھی کمیونزم اور سرمایہ داری کے آہنی پنجے سے نجات دلانی ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ ملت اسلامیہ اور عالم انسانیت کو اتنے بڑے خطرات پیش ہونے کے باوجود مسلمانوں کی کسی جماعت یا مملکت نے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی عملی تجاویز اختیار نہیں کیں۔ اور نہ ہی آج تک مسلمانوں کی طرف سے اسلامی طرز پر معاشی انقلاب برپا کرنے کی کوئی ٹھوس عملی اقدام وجود میں آسکا ہے۔ (م)

طلوع اسلام سے قبل سرزمین عرب میں یہودیوں کا طوطی بولتا تھا۔ اپنی بدکرداریوں اور بد اعمالیوں کے باوجود انہیں یقین تھا کہ نبی آخر الزمان بنی اسرائیل سے پیدا ہوگا لیکن جس روز حضور نبی کریم بنی اسماعیل سے پیدا ہوئے اور بنی اسرائیل سے اعزاز نبوت چھن گیا اس روز اس نے خدائے بزرگ و برتر کے خلاف شیطان کی طرح اسلام دشمنی کا عہد کر لیا۔ اور دنیا میں خدا بیزاری اور اسلام دشمنی کی مختلف النوع تحریکیں چلا کر مسلمانوں کو صراط مستقیم سے منحرف کرنے میں کوشاں ہیں۔

اشتراکی اور سوشلسٹ نظام میں خدا دشمنی اور اسلام دشمنی اور اس کی نشر و اشاعت کے لئے وہی طریقہ کار اپنایا گیا جو شیطان مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لئے اختیار کرتا ہے یعنی وہ جس طرح مولس و ہمدرد بن کر اور سبز باغ دکھا دکھلا کر انسان کو گمراہ کرتا ہے کمیونسٹ اور سوشلسٹ بھی اسی طرح مذہب کا لبادہ اوڑھ کر کبھی ادب کی آڑ میں اور کبھی غربت کے جال میں بیٹھ کر اور کبھی قرآن کریم کا نام لے کر لوگوں کو اس چابکدستی سے فریب دیتے ہیں اور سوشلزم یا کمیونزم کی دلدل میں پھنساتے ہیں کہ بڑے بڑے عالم اور پیران پارساتک ان کے دامن تزییر میں پھنس جاتے ہیں۔

کمیونزم کا نظریہ دنیا کے سامنے سب سے پہلے مارکس نے پیش کیا جو مذہب یا یہودی تھا۔ اس نظریہ کو سوشلزم کا جامہ پہنانے والا لینن اور لینن کا جانشین بھی یہودی تھا۔ روس کا سربراہ برژنیف بھی یہودی تھا۔ روس میں تمام مرکزی اور کلیدی عہدوں پر بھی یہودی فائز ہیں۔ یہودیوں کا عالم گیر سازشی منصوبہ پراٹوکول کے نام سے مشہور ہے جس کے مطابق یہودی ہر وقت اور ہر جگہ تخریب کاری میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ منصوبہ روس میں تیار ہوا جو ایک یہودی مملکت اور سوشلزم کی مرکزی تجربہ گاہ ہے اور جہاں تقریباً چھ سو سال سے دنیا میں سوشلزم پھیلانے اور اسلام کو مٹانے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ ان کوششوں کے باوجود اسلام روس میں بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے جس کی تصدیق خود سوویت یونین کے شائع کردہ اعداد و شمار سے ہوتی ہے جو ۲۴ نومبر ۱۹۸۷ء کو لندن ٹائمز میں نقل ہوئے۔ ان کی رو سے انڈونیشیا، پاکستان

بھارت اور بنگلہ دیش کے بعد سوویت یونین، دنیا کی پانچویں بڑی مسلم طاقت ہے۔ سوویت روس کی ۱۴ کروڑ کی آبادی میں ساڑھے چار کروڑ سے پانچ کروڑ تک مسلمان آباد ہیں۔ اور مسلمانوں کی شرح پیدائش اتنی زیادہ ہے کہ اس صدی کے آخر تک ۱۵ کروڑ روسیوں کے مقابلہ میں وہاں کم از کم ۱۰ کروڑ مسلمان ہوں گے۔

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

اسی لئے اب روس میں سب سے زیادہ تعداد میں قرآن کریم چھپ رہے ہیں بلکہ ۱۹۷۹ء میں روس کے آمر برٹنیف نے تخفیف اسلحہ کانفرنس کے اختتام پر امریکی صدر کارٹر کو یہ کہہ کر خدا کا بھی اعتراف کر لیا کہ ”اگر اس منصوبہ کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچایا گیا تو پھر خدا ہمیں معاف نہیں کرے گا“ اسے کہتے ہیں جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ روسی خلاء باز خلاء کے چکر کاٹنے کے باوجود خدا کو تلاش نہ کر سکے اور روسی آمر خود خدا کا واسطہ دے رہا تھا۔ برٹنیف کے منہ سے خدا کا نام سن کر کارٹر ششدر رہ گیا جو لوگ آج کمیونزم اور سوشلزم کے گیت گاتے اور اس کا خواب دیکھتے ہیں وہ دراصل یہودی طائفہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ یہودیوں کا ایمان روپیہ پیسہ ہے اس لئے انہوں نے دنیا کی دولت اور وسائل پر قبضہ کرنے کے لئے سوشلسٹ نظام حکومت رائج کیا تاکہ کوئی نجی یا ذاتی حیثیت میں امیر کبیر یا دولت مند یا سرمایہ دار نہ رہے بلکہ مملکت کی ساری دولت اور اس کے وسائل پیداوار ”قومی ملکیت“ میں لے کر حکومت کے قبضہ میں دے دیئے جائیں اور ارباب اقتدار خدا بن کر رعایا سے اپنی مرضی کے مطابق کام لیں اور اس کے بدلے اسے روٹی کپڑا مکان دے۔ عوام ایک غلام اور قیدی کی طرح کام کریں۔ اپنے خداؤں یا آمروں کے خلاف لب کشائی نہ کریں۔ جیسا کہ روس میں ہو رہا ہے وہاں آزادی رائے اور آزادی فکر ایک سنگین اور ناقابل معافی ہے۔ حکمران طبقہ ملک کی ساری دولت سمیٹ کر خود عالی شان کوٹھیوں، بنگلوں اور محلوں میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا ہے اور عوام سارا دن قیدیوں کی طرح کھیتوں اور کارخانوں میں کام کر کے اپنے حکام کے لئے دولت پیدا کرتے ہیں اور خود چھوٹیڑیوں میں رہتے ہیں۔ سوشلسٹ دنیا کو مساوات کا درس دیتے ہیں مگر خود مساوات کے قریب نہیں جاتے۔ امیر حکام اور غریب عوام آج بھی روس اور دیگر سوشلسٹ ممالک میں موجود ہیں۔ وہاں بچوں کو پیدا ہوتے ہی والدین سے جدا کر دیا جاتا ہے پھر انہیں لادینی تعلیم و تربیت کے لئے کمیونزم کی سرکاری درسگاہوں میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں انہیں خدا دشمنی اور اسلام بیزاری کے سبق پڑھائے جاتے ہیں جو نہ صرف والدین کی محبت اور شفقت سے محروم رہتے ہیں بلکہ اکثر کو بڑا ہونے کے بعد بھی

یہ پتا نہیں ہوتا کہ وہ کن کی اولاد ہیں یا کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں یا ان کے والدین کہاں رہتے ہیں؟ انہیں جوان ہوتے ہی قیدیوں کی طرح کھیتوں اور کارخانوں میں بھیج دیا جاتا ہے یہ نسل نوسوشلزم کی پیداوار ہوتی ہے۔ روس کے علاوہ دیگر سوشلسٹ ممالک میں بھی قریباً قریباً یہی طریق کار رائج ہے۔

ہمارے ہاں بھی سرخ جنت کے شیدائی ہر شعبہ زندگی میں ملتے ہیں ان کے لئے وہ ارباب علم و دانش نوشتہ دیوار کی حیثیت رکھتے ہیں جو اس جنت سے فرار ہو کر آزاد دنیا میں پناہ لے رہے ہیں۔ روسی سائنسدان، اکیڈمی کے ممتاز رکن اور لینن کے حفاظتی دستہ کے گارڈ کا مریڈ آروشت کو لینن کیونسٹ پارٹی طور و طریق اور وہاں کے جبروتشد سے تنگ آ کر روس سے فرار ہو کر سویڈن میں پناہ گز ہوا اور اپنا پارٹی کارڈ روسی آمر سٹر لیونڈ برٹنیف کو واپس کرتے ہوئے روسی جنت سے نکلنے کی بابت ایک طویل خط بھی لکھا جس میں دوسرے امور کے علاوہ یہ بھی تحریر کیا کہ:

”سوویت یونین میں جو سوشلزم لایا گیا ہے اسے صحیح معنوں میں اصل سوشلزم سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے جہاں روس کے عوام کا خون پہلے بڑے بڑے سرمایہ دار اور زمیندار چوس رہے تھے وہاں اب ان کا خون بڑے بڑے عہدیدار چوس رہے ہیں انہوں نے تمول اور دولت کے سمندر حاصل کر لئے اور خود ان میں غرق ہو گئے ہیں۔ ایسے افراد عوام سے بالکل الگ تھلگ ہیں اور وہ عوام کے مسائل اور پریشانیوں سے قطعاً بے خبر ہیں“

”روس میں جمہوری حکومت کا عشرِ عشر تک نہیں اور صرف ان امیدواروں کو ووٹ دے کر کامیاب بنایا جاتا ہے جن کی اوپر سے نشان دہی کی گئی ہو روس میں کسی طرح کی سیاسی آزادی نہیں ہے ہر قسم کی ہڑتالیں ممنوع ہیں اور ضروری تنظیمیں بھی حکومت کی مٹھی میں ہیں سیاسی بحث مباحثہ کی اجازت نہیں۔ اخباروں اور تحریروں اور تصنیفات پر سخت سنسرشپ عاید ہے نشریات میں شروع سے لے کر اخیر تک جھوٹ سے کام لیا جاتا ہے روس میں انسانی حقوق کی بری طرح پامال کیا جاتا ہے جو افراد حکمران طبقہ سے اختلاف رکھتے ہیں اور اس کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں انہیں نظر بندوں کے کیمپوں یا جیلوں میں ساری عمر سزا پڑتا ہے یا انہیں دماغی مریض قرار دے کر نفسیاتی امراض کے ہسپتالوں میں بھیج دیا جاتا ہے بعض افراد کو اس لئے اذیت ناک سزائیں دی جاتی ہیں کہ وہ مذہبی عقائد رکھتے ہیں۔“

سوویت روس بنے ساٹھ سال گزر چکے ہیں مگر دانشوروں کو کسی طرح کی آزادی حاصل نہیں ہے حتیٰ کہ فنکاروں کو بھی تخلیقی عمل کی آزادی نہیں ہے۔

”انسان کو سب سے زیادہ جس نعمت کی ضرورت ہے وہ آزادی تحریر و تقریر ہے اسے اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق آزادانہ اظہار خیال کر سکنے کی آزادی نہیں۔ اسے یہ حق حاصل ہونا چاہئے اور وہ جہاں چاہے اور جب چاہے

جاسکنے کی آزادی رکھتا ہو مگر ہم سٹالن کے دور کی طرح مجبور بدستور اور محکوم چلے آ رہے ہیں ہم سنسرشپ کے خوف سے اپنے خطوط میں بھی اپنے دل کی بات نہیں لکھ سکتے ہم دوستوں سے بھی ڈرتے ہیں اور الگ تھلگ رہتے ہیں“

کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ والدین سے ان کے بچے تک چھین لئے جائیں اور اپنے کنبے کو دوسرے کنبے کے ساتھ اپنی مرضی کے مطابق نہ رہنے دیا جائے؟ اگر کسی اور کنبے کے افراد سے ملنا ہو تو اجازت حاصل کی جائے ہم ایسی فضا میں کب تک رہ سکیں گے۔“

یہ خط امریکی جریدہ ٹائمز ۱۹۷۷ء میں اور اس کی تلخیص و ترجمہ ماہ مئی ۱۹۷۷ء کے پاکستان کے اردو جرائد میں شائع ہوا۔ سوشلسٹوں نے جس ملک میں قدم رکھا وہاں اپنے متذکرہ بالا نظام کو جاری کر کے تاریخ عالم میں ثابت کر دیا ہے کہ جہاں ہمارا قدم شریف وہاں نہ فصل ربیع نہ خریف۔ آج سرخ سرخ جنت کے خواب دیکھ رہے ہیں اور پاکستان میں ان کی خواہش اور کوشش کے مطابق تخریب کارانہ ذرائع سے پاکستان کو سرخ دیکھنا چاہتے ہیں انہیں کیوبا کا حشر دیکھ لینا چاہئے۔ فائبرڈل کاسٹرونے وہاں سوشلزم کی بنیادیں استوار کرتے ہی سب سے پہلے خالق کائنات اور مذہبی عقائد کو بیک جنبش قلم بدر کر دیا۔ وہاں کے روح رواں کی تھولک چرچوں کو تالے لگوا دیئے ”خدا کی تلاش“ کو بیکار شغل قرار دیا۔ ”مساوات اور سوشلزم“ کی قیود و حدود نے وہاں کی عوام کی زندگی بے کیف اور اجیرن بنادی۔ رہائش، خوراک اور اولاد کی پرورش کی بنیادی سہولتوں سے انہیں محروم کر دیا گیا۔ کیونکہ ان کا اہتمام اب تمام تر سوشلسٹ حکومت کے ہاتھ میں ہے جس نے وہاں یہ حالات پیدا کر رکھے ہیں۔

۱۔ رہائش کے لئے ہمہ قسم عوام کو فلیٹ مہیا کیے جاتے ہیں مگر فلیٹ کے حصول کے لئے وہاں عمر دوام درکار ہے درخواست گزاروں کو اعصاب شکن انتظار کئی کئی برس کرنی پڑتی ہے تب جا کر ایک مختصر سافلیٹ دستیاب ہوتا ہے۔

۲۔ بجلی اور پانی کی سہولت شاذ ہی نظر آتی ہے اگر کبھی آ بھی جائے تو کسی قسم کی خرابی کے لئے پھر درخواست دینی پڑتی ہے اور متعلقہ محکمہ باری آنے پر مرمت کرتا ہے کیونکہ وہاں مرمت کی پرائیویٹ سہولتوں کا کوئی تصور ہی نہیں۔ جو کچھ ہے سرخ سرکار کا ہے اور سرکاری کام سرکاری اوقات میں باری آنے پر ہوتے ہیں جس سے عوام اور ملازم سب دوچار ہیں اور ہمہ وقت گریہ دزاری کرتے رہتے ہیں۔

۳۔ روٹی کا مسئلہ جس کے لئے محنت مشقت کی جاتی ہے اس عقل محدود میں سامنے کے لئے تیار نہیں۔ روٹی، گوشت، ترکاری، گروسری وغیرہ ہر چیز کا راشن کارڈ علیحدہ ہے آپ ایک تک ابھی اپنی مرضی سے نہیں خرید سکتے۔ دفاتر، گرجوں، کارخانوں سے شفٹ ختم کرنے کے بعد لامتناہی طویل قطاروں میں قطار در قطار جنرل اسٹورز ہولوں اور اشیائے

خورد و نوش کی دکانوں کے سامنے لوگ کھڑے ہوتے ہیں کئی کئی گھنٹوں کے بعد باری آتی ہے تب کچھ پلے پڑتا ہے راشن لینے کے بعد پھر وہ کہیں جانے کے نہیں رہتے۔

۴۔ مستورات کو سرنخی پاؤڈر اور خوشبو کے بغیر ہی بسر اوقات کرنی پڑتی ہے یہاں تک کہ زیر جامہ کو بھی فضول خرچی میں شمار کیا جاتا ہے۔ جس کی قیمت اس قدر ہوتی ہے کہ کوئی اس کے خریدنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

۵۔ سوشلزم میں صرف ایک آزادی ہے کہ مرد اور عورت کے غیر ازدواجی اختلاط یعنی گزر بسر پر کوئی پابندی نہیں جس کی وجہ سے حرامی بچے بکثرت پیدا ہو رہے ہیں جن کی پرورش حکومت خود کرتی ہے جہاں طبعی اور اخلاقی قدریں بھی پروان نہیں چڑھ سکتیں۔

۶۔ وہاں شادیوں کا تصور ختم کر دیا گیا ہے۔ کنبہ داری کا وجود ہی نہیں ہے تاکہ یہ اہل مل بیٹھ کر کچھ سوچ ہی نہ سکیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حرامی بچے پیدا ہو کر شتر بے مہار بننے لگے۔ جس پر حکومت کو شادی کی رغبت دلانے کے لئے شادی کا راشن کارڈ جاری کرنا پڑا جس میں ہر شادی کرنے والی کو شب خوابی کا لباس، ہونٹوں کی سرنخی، خوشبودار و مال اور لڑکے کو شب خوابی کا لباس، مزید ایک پتلون قمیض اور تولیہ دیا جاتا ہے۔ جس کی ہمارے ہاں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ مگر سوشلسٹ حکومت میں اسے نعمت غیر مترقبہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لالچ میں نوجوانوں نے شادیاں شروع کر دیں مگر ازدواجی زندگی کا وہاں کوئی تصور موجود نہ ہونے کی وجہ سے جلد جلد طلاقیں ہونی شروع ہو گئیں۔ جس پر کاستر و حکومت نے راشن پر یہ پابندی لگا دی کہ کم از کم ازدواجی زندگی کا وقفہ چھ ماہ کی مدت سے کم ہوا تو شادی کرنے والے راشن کے حق دار نہ ہوں گے۔

چونکہ روس کے اندرونی حالات باہر کی دنیا تک پہنچانے پر پابندی ہے اور باہر کے لوگوں کو روس جیسے سوشلسٹ ممالک کے اندر جانے اور چلنے پھرنے کی آزادی نہیں ہے اس لئے بیرونی دنیا کے کمیونسٹ اور سوشلسٹ ان کے نعروں پر خوش ہو کر اپنا دین و دنیا گنوار ہے ہیں اپنی آخرت تباہ کر رہے ہیں اور پاکستان میں تخریب کاری کے ذریعہ اپنے اور اپنی اولاد کا مستقبل تاریک بنا رہے ہیں۔

## جنسی آزادی:

اشتراکی دنیا میں بالعموم اور سوشلزم کی مرکزی تجربہ گاہ روس میں بالخصوص صرف جنسی آزادی عام ہے جو دوسرے ممالک میں کمیاب ہے کیونکہ کامریڈ لینن نے کہا تھا کہ:

”ہر وہ چیز اخلاقاً جائز ہے جو قدیم اجتماعی نظم کو مٹانے اور محنت کش عوام کو ایک کرنے کے لئے ضروری ہے“

اسی لئے سوویت روس میں حکومت نے جنسی زندگی کی کھلی اجازت دے دی ہے۔ ایک مرد اور عورت اپنی خوشی سے جتنی مدت چاہیں آزادانہ زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ نہ رائے عامہ ان کی راہ میں رکاوٹ ہے نہ حکومت ان پر معترض ہوتی ہے نامور بالٹوئک اینٹون نیہی اوف اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

”معاشرہ کے اونچے طبقہ سے لے کر نچلے طبقہ تک سب پر چھایا ہوا ہے“

جب وہاں اس آزادی پر ضابطہ تعزیرات کے مرتبین نے بھائی اور بہن کے ازدواجی تعلق کو خلاف قانون قرار دینے کے متعلق مختلف ماہرین طب و نفسیات سے مشورے طلب کئے تو انہوں نے متفقہ طور پر فیصلہ دیا کہ:

”تاریخی نسلی اور طبقی لحاظ سے بھائی بہن کا ازدواج نہ ہی صحت عامہ کے لئے ضرر رساں ہے اور نہ آئندہ نسلوں کے لئے نقصان دہ ہے“

اس قسم کے ازدواج روسی قانونی تعزیرات میں کوئی جرم نہیں ہے اسی طرح مرد اور مرد کے مابین ہم جنسی عرصہ دراز سے سوویت روس کی قانونی گرفت سے آزاد کر دی گئی ہے جنسی انار کی پھیلا نے میں وہاں کی مخلوط درسگاہوں کا بھی برابر کا حصہ ہے۔ معروف اشتراکی مصنف پیٹ سلوں اپنی ایک ممتاز تصنیف میں لکھتا ہے کہ:

”یونیورسٹیوں اور اسکولوں میں مرد اور عورتیں یکجا تعلیم پاتے ہیں لڑکے اور لڑکیاں ایک ہی ہوٹل میں ایک ہی کمرہ میں یکجا رہتے ہیں یونیورسٹیوں اور کالجوں میں دونوں صنفیں پوری آزادی سے ایک دوسرے سے ملتی ہیں کوئی نگران نگہدار نہیں ہوتے۔ کوئی سرپرست اور اتالیق نہیں ہوتے۔ آزادی سے ہر موقع محل پر وہ ایک دوسرے کے کمرہ میں آتے جاتے ہیں اکٹھے پڑھتے ہیں، چائے اڑاتے ہیں دوستی گانٹھتے ہیں۔ محبت اور آزاد جنسی ملاپ کرتے ہیں اگر کسی ساتھی طالب علم کی نوازشوں سے یا کسی باہر والے کی مہربانی سے کسی لڑکی کا بچہ پیدا ہو گیا تو طلباء اور فیکلٹی اسے درست نظر سے دیکھتی ہے ان کی نظر میں اس نے کوئی اخلاقی گناہ نہیں کیا“

ہمارا ہوس پرست طبقہ اسی جنسی آزادی کی خاطر اشتراکیت اور سوشلزم کا شیدائی ہے اور پاکستان کو سرخ دیکھنا چاہتا ہے۔ شہر کراچی (پاکستان) کی آگ ان ہی کی لگائی ہوئی بیان ہوتی ہے۔ (۵)

## فصل دوم

صوفیاء کے افکار کی روشنی میں استحصالی رجحانات

کی بجائے احسان و ایثار کا فروغ

## احسان:-

صوفیاء کرام نے مسلمانان عالم کو احسان اور ایثار کا درس دیا ہے۔ چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی میائے سعادت میں لکھتے ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے احسان کرنے کا حکم دیا ہے۔ جیسا کہ اس نے عدل کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور فرمایا ہے۔

ان الله يا مربيا لعدل والاحسان (4) بے شک اللہ تعالیٰ عدل و احسان کا حکم دیتا ہے۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

ان رحمة الله قريب من المحسنين (5) بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمت احسان کرنے والوں کے

جو شخص صرف عدل پر کفایت کرتا ہے وہ اپنے دین کا سرمایہ محفوظ رکھتا ہے مگر فائدہ اور نفع احسان کرنے میں ہے۔

عقل مند وہ ہے جو کسی معاملہ میں بھی آخرت کا فائدہ ہاتھ سے نہ جانے دے اور احسان یہ ہے کہ جس پر تو احسان کرے اسے تو فائدہ پہنچے مگر تجھ پر وہ احسان ضروری اور واجب نہ ہو۔ اور احسان کا درجہ چھ طریقوں سے حاصل ہوتا ہے۔ پہلا طریقہ:-

ضرورت مند خریدار اگر اپنی ضرورت کے تحت زیادہ نفع دینے پر بھی تیار ہو مگر احسان کرنے والا جذبہ احسان کے باعث زیادہ نفع نہ لے۔

حضرت سری سقطیؒ دکان کیا کرتے تھے اور پانچ درہم سینکڑہ سے زیادہ نفع نہ لیتے۔ آپ نے ایک مرتبہ ساٹھ دینار کے بادام خریدے پھر باداموں کا نرخ تیز ہو گیا۔ ایک دلال نے آپ سے مانگے۔ آپ نے فرمایا تریسٹھ دینار میں فروخت کرنا۔ دلال نے کہا کہ اس وقت بادام نوے درہم کے ہیں۔ آپ سستے کیوں فروخت کرتے ہیں۔ فرمایا میں نے طے کر لیا ہے کہ پانچ درہم سینکڑہ سے زیادہ منافع نہیں لوں گا اور میں اپنا ارادہ تبدیل کرنے کو تیار نہیں۔ دلال نے کہا میں آپ کا مال کم قیمت پر فروخت نہیں کرنا چاہتا۔ الغرض دلال فروخت کرنے پر آمادہ نہ ہوا اور حضرت سری سقطیؒ زیادہ منافع لینے پر راضی نہ ہوئے تو احسان ایسا ہوتا ہے۔

دوسرا طریقہ:-

یہ کہ درویش لوگوں کا مال گراں قیمت پر خریدے تاکہ وہ خوش ہوں جیسے بیوہ عورتوں کا ثنوت اور جو بیوہ بچوں



اور فقیروں کے ہاتھوں سے واپس آیا ہو کیونکہ اس طرح کی چشم پوشی صدقے سے بھی زیادہ فضیلت رکھتی ہے اور جو شخص ایسا کرے وہ حضور ﷺ کی دعا لے گا۔ آپ نے فرمایا ہے۔

رحم الله امراء سهل البیع وسهل الشراء۔ (۸) اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم فرمائے جو بیع و شراء میں آسانی

حضرات حسنین کریمین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو شش کرتے کہ جو کچھ خریدتے ارزان خریدتے اور اس میں تکرار و اصرار کرتے لوگوں نے ان سے عرض کی آپ حضرات روزانہ کئی ہزار درہم خیرات کر دیتے ہو۔ معمولی مقدار پر اس قدر تکرار و اصرار میں کیا نکتہ ہے۔ فرمایا ہم لوگ جو کچھ دیتے ہیں راہ خدا میں دیتے ہیں۔ اور خرید و فروخت میں دھوکہ کھانا عقل و مال کے نقصان کا باعث ہے۔

تیسرا طریقہ:-

قیمت لینے میں تین طرح کا احسان کیا جاسکتا ہے۔ ایک کچھ کم کرنے سے دوسرے شکستہ اور کھوٹے درہم لینے سے تیسرے مہلت دینے سے۔

حضور ﷺ نے فرمایا ہے۔ اس شخص پر خدا تعالیٰ کی رحمت نازل ہو جو دینے اور لینے میں آسانی کرے اور فرمایا جو آسانی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے کام آسان کر دیتا ہے۔ اور درویش محتاج کو مہلت دینے سے زیادہ کوئی احسان نہیں لیکن اگر وہ اپنے پاس کچھ نہیں رکھتا تو اسے مہلت دینا واجب ہے۔ اور یہ بات عدل میں داخل ہوگی۔ احسان میں شمار نہ ہوگی۔ اور اگر وہ محتاج نادار نہ ہو مگر جب تک اپنی کوئی چیز خسارے سے فروخت نہ کرے یا جس کی اسے خود ضرورت نہ آئے فروخت نہ کرے اس وقت تک قیمت ادا نہ کر سکتا ہو تو ایسے شخص کو مہلت دینا احسان اور اعلیٰ درجے کی خیرات ہے۔

چوتھا طریقہ:-

قرض ادا کرنا۔ اس میں آسان یہ ہے کہ تقاضے کی ضرورت نہ پڑے اور روپے پیسے کھرا ادا کرے اور جلدی ادا کرے اور خود اپنے ہاتھ سے جا کر دے۔ اسے اپنے گھر نہ بلائے۔

حدیث شریف میں جو شخص قرض لیتا ہے۔ اور یہ نیت کرتا ہے۔ کہ میں اچھی طرح ادا کروں گا تو خدا تعالیٰ اس پر چند فرشتے مقرر فرماتا ہے جو اس کی حفاظت کرتے رہتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اس کا قرض ادا ہو جائے۔

پانچواں طریقہ:-

یہ کہ جس سے لین دین کرے وہ لین دین بیع و شراء کے بعد پشیمان ہو کہ میں نے ایسا کیوں کیا تو چاہیے کہ اس

سودے کو مسخ کر دے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے۔ جو شخص کسی بیع کو مسخ کر دے اور تصور کرے کہ میں نے بیع کی ہی نہیں ہے تو خداوند تعالیٰ اس کے گناہوں کو ایسا جانتا ہے گویا اس نے گناہ کئے ہی نہیں ہیں۔ اگرچہ ایسا کرنا واجب اور ضروری نہیں تاہم اس کا ثواب بہت ہے اور احسان میں داخل ہے۔

### چھٹا طریقہ:-

یہ کہ حاجت مند لوگوں کے ساتھ ادھار فروخت کرنا اگرچہ تھوڑی سی چیز ہی ہو اس نیت سے کہ جب تک انہیں ادا کرنے کی طاقت نہیں میں ان سے قیمت طلب نہیں کروں گا۔ اور جو ان سے تنگ دستی میں ہی مر جائے گا اسے بخش دوں گا تو یہ بھی احسان کی ایک صورت ہے۔

گذشتہ زمانے میں کچھ بزرگ ایسے گزرے ہیں جو یادداشت کی دو فہرستیں رکھتے تھے۔ ایک میں مجہول نام درج کرتے کہ وہ سب درویش اور فقراء۔ اور بعض نیک بخت ایسے بھی ہوتے تھے جو فقراء کا سرے سے نام ہی نہ لکھتے تھے تاکہ اگر وہ مرجائیں تو ان سے کوئی مطالبہ ہی نہ کر سکے۔ اور سلف صالحین کے نزدیک ان لوگوں کا شمار بھی بہترین لوگوں میں نہ ہوتا تھا۔ ہاں ان کی یہ بات بہتر قرار دی جاتی تھی کہ درویشوں کے نام ان سے قرض وصول کرنے کے لئے اپنے پاس درج ہی نہ کرتے پھر اگر وہ فقیر لوگ قرض واپس کرتے تو لے لیتے ورنہ ان سے لینے کی تمنا نہ رکھتے تھے۔ معاملات میں اعلیٰ کردار کے مالک ایسے ایسے اہل دین گزرنے ہیں اور سچے دین داروں کا درجہ اور مقام ان دنیوی معاملات سے معلوم ہوتا ہے۔ دین کی حفاظت کے لئے جو شخص شبہ کے درہم پر بھی لات مار دے درحقیقت ایسا شخص ہی دین داروں میں سے ہے۔ (۹)

اس کے علاوہ کبار صوفیائے کرام نے احسان کے موضوع پر مزید وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ احسان کے دو معنی ہیں۔

(الف) کسی کام کو عمدگی اور خوبصورتی سے کرنا۔ جب کوئی شخص نہایت خوبی اور عمدگی سے کسی کام کو سرانجام دے تو کہا جاتا ہے۔ احسن فلان عملہ۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی یہی مفہوم مراد ہے۔

الذی احسن کل شئی خلقه (۱۰) جو چیز بھی اس نے بنائی، خوب ہی بنائی۔

(ب) دوسرے پر انعام کرنا۔ جب کوئی دوسرے کسی پر مہربانی کرے، اس کے ساتھ نیکی کرے تو کہا جاتا ہے۔ احسن فلان۔ شاعر کا قول بھی اسی مفہوم میں ہے۔

احسن الى الناس تستعبد قلوبهم فطالما استعبد الانسان احسان

تو لوگوں پر مہربانی کر اس طرح تو ان کے دلوں کو اپنا غلام بنالے گا بسا اوقات احسان (لوگوں کے ساتھ حسن سلوک) انسان کو اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے۔ اسلام کی نظر میں احسان کرنے والے، اللہ کے محبوب ہیں وہ انہیں اپنی خصوصی توجہ اور رحمت سے سرفراز فرماتا ہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی رحمت الہی ان سے دور نہیں ہوتی۔  
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

واحسنوا ان الله يحب المحسنين (۱۱)

احسان کا طریقہ اختیار کرو کہ اللہ محسنوں کو پسند کرتا۔

ان رحمة الله قريب من المحسنين (۱۲)

یقیناً اللہ کی رحمت نیک کردار لوگوں سے قریب ہے

احسان کا فائدہ خود محسن کو بھی پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ احسان کا بدلہ احسان سے دیتے ہیں۔

هل جزاء الاحسان الا الاحسان (۱۳)

نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

محسن کا لوگ احترام کرتے ہیں، اس پر اعتماد کرتے ہیں اس سے اس کا مرتبہ بلند ہوتا ہے اور اس کی عزت

بڑھتی ہے۔

ان احسنتم احسنتم لا نفسكم (۱۴)

دیکھو اگر تم نے بھلائی کی تو وہ تمہارے اپنے ہی لیے ہے

اللہ کے ساتھ انسان کا تعلق خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو مگر احسان کے بغیر اس تعلق کی کوئی اہمیت نہیں۔

ومن يسلم وجهه الى الله وهو محسن فقد استمسك بالعروة الوثقى (۱۵)

جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کر دے اور عملاً وہ نیکی کا ایک بھروسے کے قابل سہارا تھا لیا۔

یعنی جو اللہ کے لیے مخلص ہوا اور اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیا اور اس کے ساتھ ساتھ احسان پر بھی کاربند

رہا۔ اس نے اسباب نجات حاصل کر لیے۔ اور بارگاہ الہی میں اس کو رفعت حاصل ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے احسان کی جزاء، بہت جلد، دنیا میں ہی دے دیتا ہے۔

للدین احسنوا في هذه الدنيا حسنة. (۱۶)

نیکی کا کار لوگوں کے لیے اس دنیا میں بھلائی ہے۔

اور آخرت میں اسے کئی گنا زیادہ اجر ملے گا وہ قیامت کی ہولناکیوں سے محفوظ رہے گا۔

من جاء بالحسنة فله عشر امثالها. (۱۷)

جو اللہ کے حضور نیکی لے کر آئے گا اس

کے لیے دس گنا اجر ہے۔

من جاء بالحسنة فله خير منها وهم من فزع يومئذ جو شخص بھلائی لے کر آئے گا اسے اس  
امنون۔ (۱۸)  
سے زیادہ بہتر صلہ ملے گا اور ایسے لوگ اس دن  
خوف اور ڈر سے امن میں ہرگے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے سلسلے میں احسان کرنا فرض قرار دیا ہے جب تم کسی کو قتل کرنے لگو تو حسن کارانہ انداز  
سے قتل کرو۔ جب تم کسی جانور کو ذبح کرنے لگو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو۔ یعنی ہر چیز اور ہر حال میں احسان مطلوب  
ہے۔ (۱۹)  
ایثار:-

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایثار کا ثواب سخاوت سے بہت زیادہ ہے کیونکہ سخاوت تو یہ ہے  
کہ آدمی کو جس چیز کی خود کو ضرورت نہ ہو وہ دوسروں کو دیدے اور ایثار یہ ہے کہ اپنی ضرورت کی چیز دوسرے کی حاجت  
پوری کرنے میں صرف کر دے خواہ اس چیز کا ضرورت مند ہے لیکن اپنی ضرورت پوری نہ کرے اور دوسرے کی ضرورت  
پوری کر دے۔ جس طرح سخاوت کا کمال یہ ہے کہ حاجت کے باوجود دوسرے کو دے دے یعنی ایثار سخاوت کا کمال  
ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایثار کی تعریف یوں کی ہے۔

وَيُؤْتُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلِوَلَدِهِمْ بَهْمِ خَصَاةٍ ۖ  
اور وہ اپنے نفس پر ایثار کرتے ہیں دراصل حالیکہ وہ  
ہیں۔ (۲۵)

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ کسی کو ایک ایسی چیز حاصل ہو اور اس کو اس کی ضرورت ہو اس کا شوق رکھتا ہو تو  
اپنے شوق اور آرزو کو ترک کر کے دوسرے کو دیدے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ بخش دے گا۔ (۲۴)  
حضرت ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے گھر میں ہم نے کبھی تین دن (مسل)  
سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا حالانکہ ہم کھا سکتے تھے۔ لیکن ہم ایثار کیا کرتے تھے۔ (۲۳)  
رسول اکرم ﷺ کے مدارج:-

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ الہی میں عرض کیا کہ یا الہی محمد مصطفیٰ ﷺ کے مدارج مجھ کو بتا  
دے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ تم ان تمام مدارج کو نہیں دیکھ سکو گے۔ البتہ ان کے مدارج میں سے ایک درجہ تم کو  
دکھلاتا ہوں۔ جب وہ درجہ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دکھایا تو وہ اس کے نور اور اس کی عظمت کی تاب نہ لا کر بے

ہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے تو بارگاہ الہی میں عرض کی کہ بارالہا! محمد ﷺ کو یہ درجہ کس عمل کے عوض دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ ”ایثار کے بدلے میں!“ اے موسیٰ علیہ السلام جو بندہ ساری عمر میں ایک بار ایثار کرے تو مجھے اس کا مؤاخذہ کرتے ہوئے شرم آتی ہے اور اس کی جگہ بہشت میں ہوگی جہاں اس کا دل چاہے گا وہ رہے گا۔ رسول اکرم ﷺ نے بحکم خداوندی کفار کی ایذا رسانی سے بچنے کے لئے جب مکہ سے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس رات آپ کی جگہ پر سو گئے تاکہ اگر کفار رسول خدا ﷺ کا قصد کریں تو ان کی جان عزیز حضرت محمد ﷺ پر قربان ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام اور میکائیل علیہ السلام سے فرمایا کہ میں تم دونوں کو ایک دوسرے کا بھائی بناتا ہوں اور ایک کی عمر دوسرے سے دراز تر کر رہا ہوں تم میں کون ایسا ہے جو اپنی عمر دوسرے کو دے دے۔ اس وقت ان دونوں میں سے ہر ایک نے اپنی درازی عمر کی خواہش کی۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم حضرت علی المرتضیٰ کو دشمنوں سے محفوظ رکھو تب یہ دونوں مقرب فرشتے زمین پر اتر آئے اور حضرت جبرائیل علیہ السلام حفاظت کے لئے حضرت علیؑ کے سر ہانے کھڑے ہو گئے اور میکائیل علیہ السلام ان کے پائیں کھڑے ہوئے اور کہتے تھے واہ واہ! اے ابو طالب کے فرزند اللہ تعالیٰ ملائکہ میں آپ کا ذکر بطور فخر کرتا ہے۔ اس آیت کا شان نزول یہی ہے۔

ومن الناس من يشري نفسه ابتغاء مرضات الله (۲۴)

اور لوگوں میں سے وہ جو اپنی جان بیچتا ہے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے۔

## حکایت :-

حضرت شیخ حسن انطاکیؒ کے پاس انتالیس افراد جمع ہوئے۔ اس قدر کھانا موجود نہ تھا جو سب کیلئے کافی ہوتا۔ چند روٹیاں تھیں جن کے ٹکڑے کر کے دسترخوان پر رکھ دیئے گئے۔ اور چراغ بجھا دیا گیا۔ تمام لوگ دسترخوان پر بیٹھے۔ کچھ دیر بعد کھانے سے فارغ ہوئے اور چراغ جلایا تو روٹیوں کے دو ٹکڑے دسترخوان پر موجود تھے۔ ہر شخص نے ایثار کی نیت سے خود کچھ نہیں کھایا تاکہ دوسرا ساقی کھالے۔

حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ جنگ تبوک میں بہت سے مسلمان شہید ہو گئے۔ میرا برادر عم بھی اس جنگ میں شریک تھا۔ میں اپنے بھائی کو تلاش کرتے ہوئے اس کے پاس جا پہنچا وہ دم توڑ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ پانی پیو گے اس نے کہا کہ ہاں! پیوں گا۔ پھر ایک اور زخمی مسلمان کی طرف اشارہ کیا پہلے اس کو پانی پلاؤ میں جب اس زخمی کے پاس پہنچا تو وہ ہشام ابن عاص تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ پانی پی لو ہشام نے میرے چچا زاد بھائی کی طرف اشارہ کیا کہ پہلے اس کو پلاؤ۔ جب میں واپس اپنے بھائی کے پاس پہنچا تو وہ جان جان آفریں کے سپرد کر چکا تھا۔ میں وہاں سے پلٹ کر

ہشام کے پاس آیا کہ اس کو ہی پانی پلا دوں لیکن اتنی دیر میں وہ بھی مر چکا تھا۔ دونوں نے ایثار سے کام لیا۔  
صوفیائے کرام نے ہمیشہ مسلمانوں کو احسان اور ایثار کا درس دیا۔ استحصال اور استحصالی رجحانات سے دور رکھا۔ اللہ تعالیٰ  
ہر مسلمان کو اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین ثم آمین)۔ (۲۲)

صوفیائے کرام کا ایک خلق ”ایثار و مواسات“ بھی ہے، اس جذبہ پر ان کو قوت ایمانی، رحم اور شفقت آمادہ کرتی  
ہے وہ جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہے اس کو قربان کر دیتے ہیں اور جو چیز نہیں ہوتی اس پر صبر کرتے ہیں۔

شیخ بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ بلخ کے ایک نوجوان نے مجھے لا جواب کر دیا۔ ہوا یوں کہ وہ نوجوان حج کے سفر  
میں ہمارے پاس آیا تھا، اس نوجوان نے مجھ سے پوچھا کہ زہد کسے کہتے ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ ہمیں جو کچھ مل جاتا  
ہے وہ کھا لیتے ہیں اور اگر نہیں ملتا صبر کر لیتے ہیں۔ اس نوجوان نے کہا کہ ”ہمارے بلخ کے کتے بھی یہی کرتے ہیں، یہ سن  
کر میں نے پوچھا، تمہارے نزدیک زہد کیا ہے اس نے کہا جب ہمیں کچھ نہیں ملتا تو ہم شکر کرتے ہیں اور اگر کچھ مل جاتا  
ہے تو اس کو ایثار کرتے ہیں (دوسروں پر صرف کر دیتے ہیں) اس کی یہ بات سن کر میں شکست خوردہ ہو گیا۔

شیخ ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ فراخ دل زاہد میں یہ تین باتیں پائی جاتی ہیں، اس کی یہ تین نشانیاں ہیں،  
(۱) جمع کردہ چیز خرچ کرتا ہے (۲) گم شدہ چیز کی تلاش نہیں کرتا اور اپنی غذا اور خوراک دوسروں کو کھلا دیتا ہے۔

### ایثار کی چند مثالیں:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے نصیر کے دن (بنو نصیر کی جنگ سے مراد ہے) انصار  
سے فرمایا کہ اگر چاہو تو مہاجرین کو اپنے مالوں اور گھروں میں شریک کر لو پھر تم انکے اس مال غنیمت میں بھی ان کے  
شریک ہو جاؤ، اور اگر تم چاہو تو تمہارے اموال اور گھر بار تمہارے پاس رہیں گے (مہاجرین ان میں شریک نہیں ہوں  
گے) لیکن اس صورت میں اس مال غنیمت سے تم کو کوئی حصہ نہیں ملے گا (کہ اس وقت مہاجرین بالکل بے سہارے اور  
بے سکت ہیں) اس کے جواب میں انصار نے کہا کہ ہم اپنے مہاجر بھائیوں کو اپنے اموال اور گھروں میں برابر کا حصہ  
دیں گے اور اس کے علاوہ مال غنیمت صرف ان کا حق ہے ہم اپنا حق ان کے حق میں ایثار کرتے ہیں، ہم اس میں حق نہیں  
لیں گے، ان کے اس ایثار پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ

صحابہ کرام اور بزرگان سلف کا ایثار:

(۲۵)

وہ ایثار کرتے ہیں اپنے نفسوں پر خواہ وہ خود حاجت مند  
عند یہ کہوں ہوں

روایت ہے کہ شیخ ابوالحسن انکا کی کے پاس شہرے کے قریب ایک گاؤں میں تیس سے زیادہ آدمی جمع ہو گئے لیکن اس وقت ان کے پاس صرف چند روٹیاں تھیں ان روٹیوں سے چار پانچ آدمیوں کا پیٹ بھر سکتا تھا لہذا انھوں نے ان سب روٹیوں کے ٹکڑے کئے اور یہ جب کھانے کے لئے بیٹھے تو چراغ گل کر دیا، جب سب کھانا ختم کر چکے تو معلوم ہوا کہ تمام کھانا جوں کا توں رکھا ہے یعنی اشیاء کے باعث اس جماعت میں سے کسی نے بھی نہیں کھایا (ہر ایک نے دوسرے کو کھانے کو موقع دیا اور اس طرح کسی نے بھی نہیں کھایا۔

حضرت حذیفہ الصدوقیؒ فرماتے ہیں کہ میں جنگ یرموک میں اپنے برادر عم زاد کی تلاش میں میدان جنگ میں پھر رہا تھا، اس وقت میری چھاگل میں تھوڑا سا پانی تھا میں نے سوچا تھا کہ شاید اس میں زندگی کی کچھ رقی ہوگی تو میں اس کو یہ پانی پلا دوں گا۔ اور اس کے منہ کو بھی (خون سے) صاف کر دوں گا۔ آخر کار میں اسکے پاس پہنچ گیا تو میں نے اس سے کہا تمہیں پانی پلاؤں تو اس نے اشارے سے کہا ہاں، مجھے پانی پلاؤں اے میں اس کے برابر جو شخص مجروح پڑا تھا اس کے منہ سے آہ نکلی تو میرے بھائی نے کہا کہ تم میرے بجائے اس زخمی کو پانی پلا دو یہ زخمی ہشام بن العاصؓ تھے جب میں ان کے پاس پہنچا اور میں نے پانی پلانا چاہا اور برابر کے ایک اور زخمی ہشام نامی نے پانی دیکھ کر آہ بھری تو ہشام بن العاصؓ نے کہا کہ تم میرے بجائے اس زخمی کو پانی پلا دو، جب میں پانی لیکر ہشام ثانی کے پاس پہنچا تو وہ دم توڑ چکا تھا اب میں پلٹ کر ہشام بن العاصؓ کے پاس آیا تو وہ بھی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے، اس کے بعد میں اپنے عم زاد کے پاس واپس ہوا تو وہ فوت ہو چکا تھا (اس طرح ہر ایک نے اپنی ذات پر دوسرے کو ترجیح دی اور کوئی بھی پانی نہ پی سکا۔ (۲۸) شیخ ابوالحسن بوشہریؒ سے جو انمروی کے معنی دریافت کئے گئے تو انہوں نے فرمایا کہ میرے نزدیک جو انمروی وہ ہے جس کی تعریف اللہ تعالیٰ نے انصار کے سلسلہ میں کی ہے۔

والذین تبووا الداء والایمان (۲۷) یہ وہ لوگ ہیں جو گھروں کو اور ایمان کو (مضبوطی) سے پکڑے رہے

شیخ ابن عطا فرماتے ہیں کہ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنی سخاوت اور کرم کی وجہ سے اشیاء کرتے ہیں وہ خود کتنے ہی فقر و فاقہ میں مبتلا ہوں شیخ ابو حفصؒ کا ارشاد ہے۔ اشیاء یہ ہے کہ اپنے روحانی بھائیوں کے حصے کو دنیا اور آخرت کے کاموں میں اپنے حصوں پر مقدم رکھو۔ ایک دوسرے بزرگ کا ارشاد ہے۔

”اشیاء کسی کو ترجیح نہیں ہے بلکہ اس میں تمام مخلوق کے حقوق، ذاتی حقوق پر مقدم ہوتے ہیں یعنی اس سلسلہ میں بھائی، دوست اور شناسا کا فرق ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔“

شیخ یوسف بن حسن فرماتے ہیں۔ ”جو شخص خود کو کسی چیز کا مالک سمجھے وہ صحیح طور پر اشیاء نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اپنی

ملکیت کا خیال کر کے اس چیز کا حقدار اپنے آپ کو زیادہ سمجھے گا۔“

ایثار وہی شخص کر سکتا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ تمام چیزیں اللہ کی ملکیت ہیں جس کے پاس جو کچھ ہے بس اتنے کا ہی حقدار ہے پس اگر کسی کو کوئی چیز مل جائے تو اس کے پاس امانت ہے چاہیے کہ وہ اس امانت کو ضرورت مند کے پاس پہنچا

دے۔ (۲۸)

حقیقی ایثار:

ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ اگر تم اپنے آخرت کے حصے کو اپنے بھائیوں پر قربان کر دو تو وہ حقیقی ایثار ہوگا کیونکہ دنیا تو ایک بہت ہی معمولی سی چیز ہے۔ وہ اس لائق کب ہے کہ وہ ایثار کے شایان شان بن سکے بلکہ اس کے ساتھ تو ایثار کا لفظ بھی استعمال نہیں کرنا چاہیے اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ گوش گزار ہے، ایک بزرگ نے اپنے روحانی بھائی سے ملاقات کی تو اسی خیال کے تحت ان کے ساتھ زیادہ شگفتہ روی کا اظہار نہیں کیا، ملاقاتی بھائی کو ان کا یہ طرز عمل شاق گزرا تو انہوں نے کہا (برانہ مانو اے بھائی) رسول ﷺ نے فرمایا ہے۔ جب وہ مسلمان باہم ملاقات کرتے ہیں تو ان پر رحمت نازل ہوتی ہے اس رحمت کے سوحصوں میں سے نوے حصے اس کو ملتے ہیں جو زیادہ شگفتہ روی ہوتا ہے اور اس کے حصے میں آتے ہیں جو کم شگفتہ روی دکھاتا ہے لہذا میں نے کم شگفتگی کا اظہار کر کے یہ چاہا کہ اس نیکی کے ۹۰ حصے تم کو مل جائیں (یعنی تم زیادہ ثواب حاصل کرو)۔ (۲۹)

شیخ ابو بکر سعدانؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص صوفیائے کرام کی صحبت میں رہنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ وہ بے نفس بے دل اور بے ملک بن کر ان کے ساتھ رہے کیونکہ اگر وہ ان کی صحبت میں رہے گا اور بنیاد اسباب پر رکھے گا تو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے گا، (اس صحبت سے اس کو کچھ فائدہ نہیں پہنچے گا)۔

شیخ المشائخ سہل بن عبد اللہ کا ارشاد ہے۔ ”صوفی وہ شخص ہے جو اپنے خون کو حلال اور اپنی ملکیت کو دوسروں کے لئے مباح تصور کرے۔“ شیخ رویمؒ فرماتے ہیں کہ تصوف کی بنیاد ہی تین خصلتوں پر ہے، ایک فقر اختیار کرنا، دوسرے ایثار و سخاوت کرنا، تیسرے اپنی پسند اور اپنی کوشش کو ترک کرنا۔

جب صوفیائے کرام کے سلسلہ میں حکومت عباسیہ کے پاس شکایت گئی اور ان پر الزامات لگائے گئے تو حضرت جنید بغدادیؒ تو اپنی فقہ دانی کے باعث عتاب سلطانی سے بچ گئے لیکن دوسرے مشاہیر مشائخ جیسے شیخ شامؒ، وقامؒ اور شیخ ابوالحسن نوری کو گرفتار کر لیا گیا ان گرفتار شدگان کی گردن اڑانے کا حکم دے دیا اور چڑا بجھا دیا تو سب سے پہلے شیخ ابوالحسن نوری آگے بڑھے جب ان سے اس سبقت کی وجہ دریافت کی گئی تو فرمایا میں اپنے ان بھائیوں کے لئے اپنی ایک گھڑی



کی زندگی کا ایثار کر رہا ہوں (کہ یہ ایک گھڑی اور زندہ رہ لیں)۔

## اخوت کی مثال:

ایک دفعہ جناب قیس بن سعد بیمار ہوئے تو ان کے بھائی عیادت کو نہیں آئے (عیادت کرنے میں دیر کی) شیخ نے ان کے نہ آنے کے بارے میں دریافت کیا، تو لوگوں نے بتایا کہ ان کے ذمہ آپ کا قرض ہے (اس لیے عیادت کے لئے آنے میں وہ جھجک رہے ہیں) یہ سن کر قیس بن سعد نے فرمایا ایسے مال کا ناس جائے جس نے بھائیوں کو بھائی کی ملاقات سے روک رکھا ہے، اس کے بعد انہوں نے اعلان کر دیا کہ جس شخص پر بھی میرا قرضہ ہے وہ معاف کیا جاتا ہے یہ اعلان سن کر اس کثرت سے لوگ شام کے وقت ان کی عیادت کو آئے کہ ان کے گھر کی چوکھٹ ٹوٹ گئی۔

منقول ہے کہ ایک شخص نے اپنے دوست کا دروازہ کھٹکھٹایا، جب صاحب خانہ باہر نکلا اور اس نے پوچھا کس طرح آنا ہوا (یعنی کس غرض سے آئے ہو) تو اس شخص نے کہا کہ میں چار سو درہم کا مقروض ہوں، یہ سن کر صاحب خانہ گھر کے اندر گئے اور چار سو درہم وزن کر کے اس شخص کو دیدیئے (جب وہ شخص لے کر چلا گیا تو وہ شخص (صاحب خانہ) گھر میں روتا ہوا داخل ہوا۔ اس کی بیوی نے پوچھا کہ اگر رقم کا دینا ایسا ہی ناگوار تھا تو اسے منع کر دیتے (اب رونے سے کیا حاصل) اس نے کہا میں تو اس لئے رو رہا ہوں کہ مجھے اس کی حالت کی خبر نہیں ہوئی اور اس (بیچارے) کو اپنا حال خود مجھ سے بیان کرنا پڑا۔ (۲۵)

## صوفی وہی بن سکتا ہے جس کی فطرت میں سخاوت داخل ہو:

صوفی کو ایثار پر اس کے نفس کے طہارت اور طبعی شرافت ہی آمادہ کرتی ہے اللہ کسی کو صوفی اس وقت بناتا ہے جب کہ اس کی فطرت میں سخاوت کا وصف موجود ہو اور اس کی سرشت میں سخاوت کی استعداد پیدا ہو جائے یعنی جو فطرتاً نخی ہے وہ صوفی بن سکتا ہے اس لئے کہ سخاوت کا وصف ایک فطری وصف ہے اور محفل اس کی متضاد صفت ہے یہ بھی ایک نفسانی صفت ہے اور لوازم نفسانی میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

ومن یوق شح نفسه فإِوُ التَّك هم المفلحون۔ (۲۸)

جنہوں نے اپنے نفس کو محفل سے محفوظ رکھا۔ وہی ہیں فلاح  
یعنی فلاح کا حکم ان کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہڈل و انفاق کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَمِمَّا رَزَقْنَهُمْ يُنْفِقُونَ هَـ اُولَئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَاُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ  
 کرتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کی طرف سے یہ

(۳۲)

پر ہیں اور یہی فلاح یافتہ ہیں۔

لفظ ”فلاح“ دونوں جہاں کی سعادت کے لئے ایک جامع لفظ ہے۔ رسول خدا ﷺ نے اپنے ایک ارشاد گرامی میں تین چیزوں کو ہلاک کرنے والے (مہلک اور تین چیزوں کو نجات بخشنے والا بتایا ہے، حضور ﷺ نے مہلک چیزوں میں اس کجی کو بھی شامل فرمایا ہے جو عادت بن جائے۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انسانی نفس کے لوازم میں کجی اور خود غرضی موجود ہے اس لئے کہ نفس کی عصری اصل مٹی ہے اور مٹی میں قبض و امساک موجود ہے پس آدمی سے اگر کجی و امساک کا صدور کو کی تعجب خیز امر نہیں ہے کہ وہ اس کی جبلت ہے، لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ سخاوت اس کی فطرت میں شامل

(۳۳)

## فصل سوم

### صوفیاء کے افکار کی روشنی میں تحریک مادیت اور ان کا انسداد

تحریک مادیت کا بانی کارل مارکس ہے اس کے بعد اس تحریک کو تقویت زار روس میں بالشویک پارٹی سے ملی۔ لینن نے بھی اس تحریک میں اضافہ کیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اس تحریک کی بنیاد اس فلسفہ پر ہے کہ نجی املاک ممنوع ہوں گی۔ معاشرہ و اجتماع ہی شہریوں کی کفالت پر مامور ہو شہری اپنی ذہانت و اہلیت مشترکہ مفاد کی خاطر صرف کریں گے۔ یوں افراد سے سرمایہ چھین کر حکومتی پارٹی کے پاس اس امر کا مرکز ہونا اور انتہائی آمریت کا نظام نافذ ہو جانا اشتراکیت کا فلسفہ ہے۔ نظام اشتراکیت انتہائی جبر کی صورت اختیار کر کے اشتمالیت کا روپ دھار لیتا ہے۔ نظام اشتمالیات دراصل آج اور اجبر کے باہمی کشمکش کے نتیجہ میں اس وقت وجود میں آتا ہے جب مثلاً کمیونسٹ پارٹی کو کلی طور پر حکومت مل جاتی ہے۔ اور وہ تمام کاروبار حکومت خاص منصوبے کے تحت انجام پاتا ہے۔ واضح رہے کہ اس نظام میں انسان کی حیثیت محض ایک مشین پرزے سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ اس نظام کا اساس مذہب اور اخلاقیات کی سخت مخالفت

(۳۴)

پر فائز ہے۔

مادہ پرستانہ نظریہ:-

یہ ایک خالص مادہ پرستانہ نظریہ ہے۔ اور اس کے نزدیک حقیقت بس وہی کچھ ہے جس کو ہم اپنے حواس خمسہ کے ذریعے معلوم کر سکیں۔ جو حقائق ہمارے حواس کی گرفت سے باہر ہیں وہ تو ہمت و خرافات کا پلندہ ہیں۔ جن کی کوئی حقیقت نہیں۔ چنانچہ اینجلز Engels نے لکھا تھا۔ ”مادہ ہی زندگی کی واحد حقیقت ہے۔“

اس طرح ان مادہ پرستوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ”انسانی ذہن مادے ہی کا ایک مظہر ہے اور اپنے گرد و پیش کے بیرونی مادی ماحول کا عکس“ ان کے خیال میں انسانی روح کی بھی کوئی حقیقت اس کے سوا نہیں ہے کہ یہ خالص مادی حالات کی پیداوار ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مادیت (اشتراکیت) ایک خالص مادہ پرستانہ نظریہ ہے جس کے نزدیک انسانی زندگی کے تمام روحانی مظاہر سامانِ تسخر ہیں اور غیر معقول نظریات اور خیالات کا نتیجہ ہیں۔

### انسانیت کا پست تصور:-

انسانی زندگی اور انسانی سعی و جہد کا یہ اتنا پست اندازہ ہے کہ اسلام کبھی اس سے متفق نہیں ہو سکتا اس کے نزدیک انسان کا مقام بہت اعلیٰ و ارفع ہے اور باوجود یہ کہ اس کا جسم مادی ہے اور وہ زمین پر چلتا ہے اس کی روح اور فکر کی پرواز لامحدود ہے۔ چنانچہ اس کی بنیادی انسانی ضروریات بھی بقول کارل مارکس صرف خوراک، مکان اور جنسی آسودگی ہی تک محدود نہیں۔

### ایک مغالطہ:-

ممکن ہے کہ اس مقام پر بعض قارئین کے اذہان میں یہ سوال پیدا ہو کہ اشتراکیت کا یہ مادہ پرستانہ نقطہ نظر ہماری زندگیوں پر کیونکر اثر انداز ہو سکتا ہے جبکہ ہم اس کے صرف معاشی پروگرام کو اختیار کریں گے اور خدا و رسول کے بارے میں اپنے کسی بنیادی عقیدے اور نظریے سے دستبردار نہیں ہوں گے اور نہ اپنے روحانی نظام کو ترک کریں گے کیونکہ اشتراکیت تو محض معاشی اصلاح کا ایک پروگرام ہے اور اس لحاظ سے اس کا ان چیزوں پر اثر پڑنا ناممکن ہے مگر یہ محض مغالطہ ہے اور خوش فہمی! کیونکہ خود اشتراکیت کے نظریے کے مطابق کسی قوم کا معاشی پروگرام اور اس کے بنیادی عقائد اور نظریات حیات دو الگ الگ چیزوں کا نام نہیں ہوتا بلکہ ان کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے سمجھا ہی نہیں جاسکتا کیونکہ دونوں کی اساس ایک ہی معاشی نظام پر ہوتی ہے جس کا ضمیر خالص مادہ پرستانہ نظریہ حیات سے اٹھتا ہے۔ اس حقیقت کو اشتراکی اہل قلم نے اپنی تحریروں میں وضاحت سے پیش کر دیا ہے اور انہیں تو مارکس اور اینجلز ہی کی تصنیفات پر ایک نگاہ اس حقیقت کو سمجھنے کیلئے کافی ہے۔

## تاریخ کا جدلیاتی تصور:-

اشتراکیت جدلی مادیت میں یقین رکھتی ہے اس کے نزدیک اضداد کی کشمکش، سرمایہ داروں اور مزدوروں کی طبقاتی کشمکش ہی وہ پراسرار عامل ہے جو انسان کی تمام اقتصادی اور مادی ترقی کا اصل باعث ہے۔ اب تک جو ترقی ہوئی ہے وہ اسی طبقاتی کشمکش کا ثمرہ ہے۔ اب تک اپنے ارتقاء کے دوران انسانیت کو جو غلامی، جاگیرداری اور سرمایہ داری کے مختلف ادوار میں سے گزرنا پڑا ہے وہ بھی اس کا نتیجہ ہے۔ اور اسی کے ذریعے وہ اپنی منزل یعنی اشتراکیت انقلاب تک پہنچے گی۔ جدلی مادیت کا یہی وہ نظریہ ہے جس کی روشنی میں اشتراکیت اپنے موقف کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہی وہ نظریاتی بنیاد ہے جس کے پیش نظر انہیں یقین ہے کہ موجودہ نظریاتی جنگ میں بالآخر اشتراکیت ہی کو فتح حاصل ہوگی۔

وہ یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ اشتراکیت اور جدلی مادیت کے اس نظریہ میں ایک (سائنٹیفک) ربط و تعلق ہے جس میں خدا، اس کے رسول یا دین کی کوئی گنجائش سرے سے ہے ہی نہیں کیونکہ ان کے خیال میں یہ ساری چیزیں محض اقتصادی عوامل کی پیداوار ہیں اور اقتصادی پس منظر سے الگ ان کی کوئی مستقل حیثیت اور اہمیت نہیں ہے۔ اس لئے انسانی زندگی کے حقیقی نصب العین کے تعین یا اس کے مظاہر کی تشریح کے نقطہ نظر سے بھی یہ بے کار ہیں۔

زندگی میں اصل قدر و قیمت جو کچھ ہے وہ معاشی وسائل پیداوار کی ہے جن کی تبدیلی سے انسانی زندگی متاثر ہوتی ہے اور اس میں انقلابات جنم لیتے ہیں مگر اس اشتراکیت کی نظریہ کی تغلیط اور تردید اس امر سے بخوبی ہو جاتی ہے کہ اپنے تمام بلند و بانگ دعوے کے باوجود یہ اسلام کے لائے ہوئے انقلاب سے پہلے جزیرہ نمائے عرب میں کسی معاشی انقلاب کی نشاندہی نہیں کر سکتا اور نہ عربوں کے وسائل معاش میں کسی ایسی تبدیلی کو ثابت کر سکتا ہے جس کو پیغمبر اسلام ﷺ کے لائے ہوئے انقلاب کا پیش خیمہ کہا جاسکے۔ اور جو دنیا کو بالکل ایک نئے نظام حیات سے متعارف کرانے کا باعث بنی ہو۔

## بے خدا نظریہ حیات:-

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام اور اشتراکیت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ان کو ایک ہرگز قرار نہیں دیا جاسکتا اسلام کی نظر میں خدا کی رحمت اور شفقت اس کی تمام مخلوقات پر محیط ہے جس سے سب کو یکساں فیض پہنچ رہا ہے اور یہ خدا ہی کی ذات ہے جو اپنے بندوں کی رہنمائی کیلئے پیغمبروں کو بھیجتی رہی ہے تاکہ وہ انہیں اسلام کے صراطِ مستقیم پر جو کہ معاشی

حالات و واقعات سے زیادہ بڑی اور اعلیٰ حقیقت ہے، چلائیں۔

اس کے برعکس اشتراکیت کے نزدیک انسانی ترقی کے تمام مراحل باہم مخالف قوتوں کی کشمکش اور آویزش کا نتیجہ ہیں۔ اس میں مشیت ایزدی یا کسی دوسرے محرک یا عامل کو قطعاً کوئی دخل حاصل نہیں ہے۔ دخل جو کچھ ہے وہ بس اقتصادی یا معاشی حالات اور ان کے دباؤ یا اس کے تحت ابھرنے والی انسانی ضرورتوں کو ہے۔ کوئی مسلمان مسلمان رہتے ہوئے اور اسلام کی حقانیت پر ایمان رکھتے ہوئے اشتراکیت کے اس فلسفہ پر کیسے ایمان لاسکتا ہے اور اس کا مخلص خادم کیسے بن سکتا ہے۔

### اشتراکیت کا منفی نظریہ انسان:-

دوسرا اہم اور نمایاں فرق اسلام اور اشتراکیت میں یہ ہے کہ اشتراکیت کا نظریہ انسان خالصتاً منفی نوعیت کا ہے جس کے مطابق انسان مادی اور اقتصادی حالات و واقعات کے سامنے ایک بے بس کھلونے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ کارل مارکس لکھتا ہے۔

انسان کی سماجی، سیاسی اور ذہنی زندگی ویسی ہی بنتی ہے جیسی کہ مادی حالات اور واقعات اس کو بناتے ہیں۔ انسانی شعور اپنے معاشرتی حالات و واقعات کو پیدا نہیں کرتا بلکہ معاشرتی حالات انسانی شعور کو وجود میں لاتے ہیں۔ (۲۵)

### اسلام کا نظریہ انسان:-

اس کے برعکس اسلام کا نظریہ انسان مثبت انداز کا ہے جس میں انسان ایک آزاد ارادے اور اختیار کا مالک ہے۔ اور سوائے خدائے برتر و بزرگ کی مشیت کے اور کسی کے تابع فرمان نہیں ہے۔ قرآن حکم میں ارشاد باری ہے۔

وسخر لکم مافی السموت وما فی الارض جمیعاً منہ  
اور جتنی چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں ان سب  
کی طرف سے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ (۲۸)

اس طرح اسلام اس حقیقت کو واضح گاف کرتا ہے کہ اختیار اور قوت کے لحاظ سے دنیا میں انسان کو بلند ترین مقام حاصل ہے اور یہاں کی باقی ساری چیزیں اس کی خادم ہیں۔ مثال میں ہم خود اسلام کو پیش کر سکتے ہیں اس کی ترقی جدلی مادیت کے کسی قانون اور اصل کی کبھی پابند نہیں رہی ہے۔ صدر اول کے مسلمانوں نے کبھی لمحہ بھر کیلئے بھی یہ نہیں سوچا ہوگا کہ محض اقتصادی حالات کو انسانی تقدیر کے بنانے میں اصل اور فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے جس کے سامنے بقول مارکس انسان بے بس اور مجبور محض ہے۔ ان مسلمانوں نے اپنے ارادے سے اور شعوری طور پر اپنے اقتصادی نظام کو خدا کی

ہدایت اور اس کے رسول کی رہنمائی کے مطابق استوار کیا۔ یہی حال ان کے دوسرے معاشرتی تعلقات کا بھی تھا چنانچہ جب انہوں نے غلاموں کو آزادی دی تو اس کے پیچھے بھی کوئی اقتصادی اور مادی منفعت کا جذبہ کام نہیں کر رہا تھا بلکہ یہ اسی اسلامی تعلیم کا کرشمہ تھا کہ دنیاے اسلام میں جاگیر دارانہ نظام کبھی قائم نہیں ہوا حالانکہ یہ نظام صدیوں سے یورپ اور دنیا کے دوسرے حصوں میں رائج چلا آتا تھا۔ (۱۷۴)

### اجتماع یا معاشرہ کی مبالغہ آمیز اہمیت :-

تیسری بات یہ کہ جیسا کہ ہم نے ”ذاتی ملکیت“ کے باب میں کہا ہے کسی اقتصادی نظام کو اس کے معاشرتی فلسفہ سے جدا اور الگ کیا ہی نہیں جاسکتا اس لئے اشتراکیت کو بحیثیت ایک نظام معیشت اختیار کرنے کے بعد ہم اشتراکی فلسفہ حیات کو یعنی اس فلسفہ حیات کو جو انسان کو اقتصادیات کا بے بس کھلونا سمجھتا ہے اور صرف اقتصادی عوامل کو تمام معاشرتی انقلابات کی واحد کارفرما قوت مانتا ہے اپنانے سے بچ ہی نہیں سکتے۔ اشتراکی نظام معیشت کا لازمی نتیجہ اشتراکی فلسفہ حیات ہے جس کے نزدیک انسانی زندگی میں اجتماع یا معاشرے ہی کو اصل فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے اور افراد کی حیثیت اس کے بے بس خادموں سے زیادہ نہیں۔

### اسلام میں فرد کی اہمیت :-

اسلامی نظریہ کی رو سے اصل اہمیت معاشرہ کو نہیں فرد کو حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اپنے مقاصد کی تکمیل کیلئے معاشرے کی بجائے مقابلے میں فرد کو اولین اہمیت دیتا ہے کہ گویا وہ فرد کو معاشرے کے باشعور رکن کے اعلیٰ مقام پر فائز دیکھنا چاہتا ہے جو اپنی آزاد مرضی سے اپنی معاشرتی ذمہ داریاں بجالاتا ہے اور اپنے پیشے کا انتخاب کرتا ہے۔ اگر حکمران خدا کی مقررہ حدود سے تجاوز کریں تو اسلام ہر فرد کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ اس کے احکام کی اطاعت سے انکار کر دے۔ ظاہر ہے کہ اسلام کا یہ منشاء کسی ایسے معاشرے میں پورا نہیں ہو سکتا جس میں فرد کو کوئی اہمیت حاصل نہ ہو۔

### معاشرتی تعلقات کی اشتراکی بنیاد :-

آخری بات کہ اشتراکی فلسفہ میں جہاں تک معاشرتی تعلقات اور روابط کی تنظیم اور ترتیب کا تعلق ہے۔ اصل اور اساسی اہمیت صرف اقتصادی عامل کو حاصل ہے۔ انسانی زندگی میں اقتصادیات کو جو اہمیت حاصل ہے اسلام نہ تو اسکی نفی کرتا ہے اور نہ اس کو گھٹاتا ہے لیکن وہ اس خیال کا شدید مخالف ہے کہ زندگی معاشیات کے سوا کچھ بھی نہیں اور نہ اشتراکیت کی طرح یہ سمجھتا ہے کہ اگر انسان کے اقتصادی مسائل حل ہو گئے تو اس کے باقی تمام مسائل خود بخود حل

ہو جائیں گے۔ (۳۸)

## فصل چہارم

### صوفیائے کے افکار کی روشنی میں ارتکاز دولت کی بجائے انتشار دولت

(CIRCULATION OF WEALTH)

اسلامی قوانین میں کوئی ایسا قانون موجود نہیں ہے جس کا مقصد مال و دولت کو چند مخصوص افراد تک محدود رکھنا ہو مگر قرآن حکیم میں صاف اور واضح الفاظ میں یہ ارشاد موجود ہے کہ

کی لا یكون دولة بین الاغنیاء منکم (۳۹) تاکہ دولت تمہارے دولت مندوں میں ہی گردش نہ کرے

یہی وجہ کہ اسلام نے جو قوانین حیات وضع کئے ان کا مقصد یہ ہے کہ دولت کو مسلسل تقسیم اور گردش میں رکھا جائے اسلام کے قانون وراثت کے مطابق ہر مرنے والے کا ترکہ اس کے تمام ورثاء میں خواہ ان کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو تقسیم ہونا چاہئے۔ اسلام میں وراثت کا حقدار کوئی ایک فرد نہیں ہوتا، سوائے ان استثنائی حالات کے جبکہ مرنے والے اور کوئی بھائی بہن یا رشتہ دار موجود نہ ہو، مگر ان استثنائی حالات میں بھی اسلام نے اس امر کا انتظام کیا ہے کہ ساری دولت اور جائیداد کا مالک ایک ہی شخص نہ بن بیٹھے بلکہ اس میں دوسرے مستحقین کیلئے بھی کچھ حصہ نکالا جائے جو مرنے والے سے کسی قسم کی قرابت داری کا تعلق نہیں رکھتے موجودہ زمانے میں جو وراثت ٹیکس پایا جاتا ہے یہ اس کی ابتدائی شکل ہے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

واذا حضر القسمة اولو القربى والیتمی و المساکین اور جب (وارثوں میں ترکہ کے) تقسیم کے وقت (وہ) فارز قوہم و قولو لهم قولاً معروضاً ہوں اور یتیم اور غریب لوگ تو ان کو بھی اس (ترکہ)

بر سے در۔ ان کے ساتھ بھلائی کی بات کرو۔ (۴۰)

یوں اسلام نے ارتکاز دولت سے پیدا ہونے والے مسائل کو حل کیا۔ اسلام کے قانون وراثت کی رو سے جائیداد کسی خاص طبقے کو ورثے میں نہیں ملتی بلکہ میت کے ورثہ میں تقسیم ہوتی ہے اور ان کے بعد یہی دولت اور جائیداد آگے ان کے





ورثاء میں تقسیم ہوتی چلی جاتی ہے چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں دولت کبھی چند افراد کے پاس محدود نہیں رہی بلکہ پورے معاشرے میں مسلسل گردش کرتی رہی ہے۔ (۱۱)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ مال اللہ تعالیٰ کی نعمت اور زندگی کا قوام ہے اس لئے وہ صرف چند لوگوں کے ہاتھوں میں ارتکاز دولت کو قدغن لگاتے ہیں وہ اس ضمن میں ایسے اقدامات پر زور دیتے ہیں جو تقسیم دولت اور اس میں اعتدال کی روح پروان چڑھانے میں مدد و معاون ہوں۔ وہ اقدامات درج ذیل ہیں۔

## ۱۔ اموال غنیمت اور تقسیم دولت :-

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ احوال فنی و غنیمت کی تقسیم کیلئے قرآنی احکام کے مضمرات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

فتخصیص هذه الخمسة بالذكر الاهتمام يشاء نصا والتو خمس کے مصارف کو واضح اور مخصوص طریقے پر شریعہ کید ان لا يتخذ الخمس والفئى اغنياء هم دولة بنیہم فیہملوا لگایا ہے کہ اس کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے اور تاکید بجانب المحتاجين لگایا ہے کہ لوگ محتاجوں کی پرواہ کئے بغیر خمس اور فئے کو آپس میں تقسیم نہ کریں۔

ملکی ذرائع آمدن میں چونکہ اس زمانہ میں غنیمت کے مال کو اہم مقام حاصل تھا آپ نے واضح فرمایا کہ ایسے احوال کا اثر مخصوص طبقہ ہی میں محسوس نہ ہو بلکہ تمام طبقات کو اس سے فائدہ پہنچنا چاہئے دولت کی غیر منصفانہ تقسیم سے جہاں ایک طبقہ معاشی ضروریات سے محروم ہو کر رہ جاتا ہے تو دوسری طرف عیش و عشرت حرص مال، احتکاز و اکتناز کا جذبہ جنم پاتا ہے معاشرہ عملاً دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اس لئے منصفانہ تقسیم دولت کا اہتمام کرنا ریاستی ذمہ داری ہے۔ ایک جگہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

يتأكد استحباب المواساة في هذه فيما كان مملوك وما ليس جو چیزیں کسی کی ملکیت ہوں ان کے بارے میں حض بملوك امره ظاهرة۔ کہ انہیں ہمدردی کے طور پر دوسرے لوگوں کو شریک کرنا

جائے امر مملوک نہ مباح عام چیزوں پر قبضہ کرنا ان کا حکم ظاہر ہے یعنی ظلم نہیں ہے۔

## ۲۔ نظام زکوٰۃ اور تقسیم دولت :-

معاشرے کی فلاح و بہبود کیلئے ضروری ہے کہ دولت کے بہاؤ کا رخ دولت مندوں سے غریبوں کی طرف ہو، عبادت کی رنگ اس کا مستقل نظام زکوٰۃ کی صورت میں ہے زکوٰۃ کی برکت سے امیروں کی دولت غریبوں کی طرف منتقل

ہوتی ہے اس کی حکمت کے بارے میں شاہ صاحب یوں تحریر فرماتے ہیں۔

حضور ﷺ نے صاف اعلان فرمایا

وَيَجْبِرُهُمْ عَلَى الْإِسْلَامِ بِنِهَايَةِ مَا رَجَعَهُ إِلَيْهِمْ وَ إِنَّمَا تَوَخَّذْ مِنْ كَذَلِكَ زَكَاةَ كُلِّ مَنْفَعَةٍ مِنْ أَهْلِ الْمَعَاشِرَةِ كَمَا تَحْتَاجُ فِيهَا إِلَى الْإِسْلَامِ وَ تَقْرِبُ إِلَيْهِمْ مِنَ الْخَيْرِ أَنْقَا ذَا لَمْ مِنَ الشَّرِّ۔ (۲۲)

جو معاشرہ کیلئے رحمت و شفقت کا ذریعہ ہے۔ اور یہی طریقہ ہے۔

لہذا زکوٰۃ اور دوسرے صدقات واجبہ جو مسلم معاشرہ میں گردش سرمایہ کے مؤثر ذرائع ہیں کو منظم کرنا ریاستی ذمہ داری بھی ہے اور ہم سب کا فرض ہے جس سے معاشرہ موجودہ تفاوت اموال پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ اور اعتدال کی راہ مل سکتی ہے یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ معاشرہ خواہ کتنا ہی ترقی یافتہ اور خوشحال ہو جائے اور غربت کے خاتمہ کیلئے کتنی ہی تدابیر بروئے کار لائے۔ تب بھی اس میں نادار اور کسب سے محروم افراد رہ جاتے ہیں ان کی کفالت کیلئے اسلام نے مستقل نظام عبادت کی رنگ میں ”زکوٰۃ“ کا حکم دیا۔ زکوٰۃ دراصل دولت مندوں کے مال میں ڈھائی فیصد سالانہ شرح سے غرباء کا قانونی و آئینی حصہ ہے۔ پھر یہ زرعی زمین کی پیداوار، معدنیات، تجارتی اموال، کارخانوں کی پیداوار سب کو محیط ہے زکوٰۃ کی عدم ادائیگی کی صورت میں حکومت طاقت بھی استعمال کر سکتی ہے اس ضمن میں خلیفہ راشد حضرت ابو بکر صدیقؓ کی سخت گیری مشہور ہے آپ نے تمام مصالح کو بالائے طاق رکھ کر مانعین زکوٰۃ سے قتال کا اعلان فرمایا۔ ابن حزمؒ کا بیان ہے۔

”وَيَجْبِرُهُمُ السُّلْطَانُ عَلَى ذَلِكَ“

یعنی اگر لوگ ناداروں کی ضروریات پورا کرنے میں کوتاہی کریں اور ادائیگی زکوٰۃ میں سستی کا مظاہرہ کریں تو حکومت کو جبر کا حق حاصل ہے البتہ ان میں احوال ظاہرہ اور باطنہ کا فرق ملحوظ ہے۔

۳۔ معدنیات، بڑی چراگاہیں اور تقسیم دولت :-

حضرت شاہ صاحب معدن ظاہرہ کو ایک شخص کے حوالے کرنے کے خلاف ہیں۔ وہ اس سلسلہ میں ایضاً بن حوالہ ماری کا واقعہ یاد دلاتے ہیں۔

حضور ﷺ نے نمک کی ایک بڑی کان انہیں عنایت فرمائی۔ جب لوگوں نے بتایا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ نے تو

انہیں ایک جاری چشمہ عطا کر دیا ہے۔ تو آپ نے اصل حقیقت حال کو پاتے ہی اس نمک کی کان کی واپسی کا حکم فرمایا۔ اس طرح آپ نے بڑی اور عمومی چراگا ہوں پر فرد واحد کے قبضہ جمائے کو منع فرمایا۔ (۳ لم)

اس سلسلہ میں حضرت شاہ صاحب نے حدیث پاک لا حمی الا للہ ولرسولہ سے استدلال کیا۔ اور وہ حدیث جس میں قدرتی پیدائش والی چیزوں پر قبضہ جمائے والوں کی مذمت بیان کی گئی ہے درج ذیل ہے۔

”قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان سے کہے گا کہ میں تمہیں اپنے فضل سے محروم رکھوں گا جس طرح تم نے لوگوں کو اس چیز کے زائد حصے سے محروم رکھا تھا جسے تمہارے ہاتھوں نے نہ بنایا اور نہ تیار کیا تھا۔

## ۴۔ آبپاشی اور تقسیم دولت :-

پانی ایک بیش بہا قدرتی نعمت ہے۔ اس نعمت سے سب کو حصہ ملنا چاہئے۔ پانی پر اجارہ داری مذموم عمل ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں۔

وقضى رسول الله ﷺ في سبيل المهر وزان يمسك حتى يبلغ حضور ﷺ نے مہر وز کے نالے کے متعلق فرمایا کہ  
 الكعبين ثم سيرسل الاعلى على الاسفل ه  
 (۳ لم) کہ اگر کوئی شخص پانی کو اپنے قبضہ میں رکھے گا تو اس کے بعد اوپر والا شخص نیچے والے کیلئے چھوڑ دے۔

چونکہ شرع الاضر فی السلام کے اصول پر کار بند ہے لہذا ہر وہ معاملہ جہاں لوگوں کے یکے بعد دیگرے حقوق کا مسئلہ ہو تو ترتیب کا لحاظ رکھنا حکمت کا تقاضا ہے پھر ایسے معاملات میں باہمی ہمدردی و مواسات سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا لہذا اوپر والا آدمی پانی کی معتد بہ مقدار لے کر اگر پانی نہیں چھوڑتا تو ظاہر ہے یہ ظلم ہوگا۔

## ۵۔ اوقاف اور تقسیم دولت :-

اوقاف سے مراد اموال یا زمینیں یا عمارات ہیں۔ جن کے منافع عام مسلمانوں کے مشترکہ مفاد کیلئے استعمال ہوں اور کسی ایک شخصیت کی ملکیت نہ بن سکیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی صاحب نے اس ضمن میں عہد فاروقی کے ایک واقعہ سے استدلال کیا کہ شام و عراق کی زمینوں کو چند اشخاص کی ملکیت میں دینے کی بجائے تمام مسلمانوں کے انتفاع کیلئے وقف کرنا ہی مناسب عدل تھا واقعہ کے آخری الفاظ یہ ہیں۔

فاذا قسمت ارض العراق و الشام بعلو جهاد فما يسد به اگر عراق و شام کی یہ ارضی اور ان کے مال غنیمت کے الثغور وما يكون للزرية والارامل لهذا البلد وغير ذلك۔ تو سرحدات کی حفاظت کس مال سے کی جائے گی اور بیوہ عورتوں کی کفالت کہاں سے کی جاسکے گی۔

اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ زمین کے وقف سے مقصود بھی مفاد عامہ کا تحفظ ہی ہے۔

## حکام کے طرز عمل کا اثر تقسیم دولت پر:-

حضرت شاہ صاحب امراء و حکام کے سامنے خلفائے اسلام کی عملی زندگی کے نمونے پیش کرتے ہیں جنہوں نے اسلامی حکومت کے کم سے کم ذرائع معاش رکھنے والے شخص کی سطح پر زندگی گزار کر مساوات اور عدل کے نمونے پیش کئے۔

حضرت عمرؓ کی سیرت بیان کرتے ہوئے حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

ایک روز حضرت عمرؓ دیر سے تشریف لائے۔ آپ کے ساتھیوں نے دریافت کیا آج آپ کے تاخیر سے تشریف لانے کی وجہ کیا ہے۔ فرمایا! میں نے کپڑے دھوئے تھے جب وہ سوکھ گئے تو میں تمہارے پاس آ گیا۔ شاہ صاحب کا مقصد یہ ہے کہ حکام میں سادگی ہو تو عوام میں بھی از خود ہوگی اور اسی طرح اخراجات کو کم کیا جاسکتا ہے۔

## میراث اور تقسیم دولت:-

شاہ صاحب نے اسلام کے قوانین میراث کے بارے میں واضح لکھا ہے کہ جو کہ دولت کے ارتکاز کو کم کرنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے اس ضمن میں انہوں نے میراث کے فطری اور عادلانہ ہونے پر فکر انگیز بحث کی ہے اور نظام وراثت کی نگرانی کو حکومت کا فریضہ قرار دیا ہے۔

## اسلام میں تقسیم دولت:

معیشت کے پائیدار استحکام اور افراد معاشرہ کی خوشحالی کا انحصار اسی بات پر رہ جاتا ہے۔ کہ پیدا شدہ دولت کی تقسیم اس انداز میں ہو کہ وسائل چند ہاتھوں میں مرکوز نہ رہ جائیں۔ اور معاشرہ کا ہر فرد معقول معیار پر باوقار طریقہ سے اپنی ضروریات زندگی پوری کر سکے۔ اس مقصد کیلئے اس امر کی ضرورت ہوتی ہے کہ عاملین پیدائش کے معاوضوں کے تعین کے منصفانہ اصول متعین کئے جائیں۔ تاکہ ہر عامل کو اپنی جدوجہد کا منصفانہ معاوضہ مل سکے۔ اسلام میں اس مقصد کے تحت عاملین پیدائش کے معاوضوں کے تعین کے فطری اصولوں یعنی ان کی طلب اور رسد کو آزادانہ طور پر کام کرنے کا

موقع دیا گیا ہے لیکن اس مسئلہ کو مکمل طور پر رسد و طلب کی قوتوں کے سپرد نہیں کیا گیا بلکہ لوگوں کی معاشی فلاح کے حصول کو اصل ہدف قرار دیا گیا ہے اسلام تقسیم دولت میں عدل اور احسان کو کسی حالت میں بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ معاشی عدل کرنے کے لئے گردش دولت کا اصول پیش کرتا ہے۔ اس بنا پر اسلام کا نکتہ نظریہ ہے کہ انسان جائز ذرائع سے حاصل کردہ مال کو اپنی ذاتی ضروریات خریدنے کے لئے صرف کرے اور ضرورت سے زائد مال کسی جائز کاروبار میں لائے اور رشتہ داروں، عزیزوں، یتیموں، بیواؤں اور ضرورت مندوں کی حاجات پوری کرتا رہے۔

اسلام کا نکتہ نظریہ ہے کہ دولت مسلسل گردش کرتی رہے اور کسی ایک یا چند ہاتھوں میں جمع نہ ہونے پائے۔ پھر یہ دولت کسی خاص طبقہ ہی میں گردش نہ کرتی رہے بلکہ معاشرہ کے تمام طبقات اس سے استفادہ کر سکیں۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے روزی کمانے کے حلال ذرائع اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اور ایسے تمام ذرائع کو حرام قرار دیا گیا ہے جس سے کسی فرد یا معاشرہ کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہو۔ دولت کو ایک جگہ جمع ہونے سے روکنے کے لئے اکتنا زر کی مذمت کی گئی ہے۔ (۱۵)

## اکتنا ز:

”اکتنا ز“ کا مادہ ”کنز“ ہے جس کے معنی ہیں ”خزانہ“ وہ مال جو کسی ظرف میں محفوظ کر کے رکھا گیا ہو یا زمین میں دفن کر دیا گیا ہو۔ شرعی اصطلاح میں ”کنز“ کہلاتا ہے جس سے مراد وہ مال ہے جس پر زکوٰۃ ادا نہ کی جائے۔ ”اکتنا ز“ سے مراد یہ ہے کہ دولت کے عظیم الشان خزانے افراد کے پاس جمع ہو جائیں اور ان کے پھیلاؤ اور تقسیم کی کوئی راہ باقی نہ رہے۔

## اکتنا ز کی حرمت:

اسلام میں اکتنا ز کی مذمت کی گئی ہے اور انسان کو دولت جمع کرنے اور سمیٹتے رہنے سے منع کیا گیا قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ:

”جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی سزا سنا دو۔ جس دن (مال) دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا۔ پھر اس سے ان کی پیشانیوں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی۔

رسول ﷺ نے فرمایا:

”جو کوئی سونا اور چاندی جمع کرتا ہے پھر اسے اس کا حق ادا نہیں کرتا قیامت کے دن اس کیلئے آگ کی تختیاں بنائی جائیں گی، انہیں جہنم کی آگ میں گرم کیا جائے گا اور اس کے پہلو، پیشانی اور اس کی پیٹھ کو داغا جائے گا۔“ (۴م)

## حرمت اکتناز کا سبب:

حرمت اکتناز کا سبب یہ ہے کہ لوگوں کو دولت سمیٹنے سے منع کیا جائے تاکہ یہ دولت گردش کرتی رہے اور دوسروں کے کام بھی آئے۔ وہ دولت جس پر زکوٰۃ ادا کی جائے وہ ”کنز“ نہیں کہلاتی۔ مقصد یہ ہے کہ بخل اور خود غرضی سے کام نہ لیا جائے بلکہ اپنی دولت سے دوسروں کو بھی مستفید کیا جائے۔ اسی مقصد کیلئے اسلام نے زکوٰۃ کے علاوہ صدقات و خیرات کی تلقین کی ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ میں بخل سے کام لینے والوں کیلئے قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ:

”جو لوگ مال میں، جو خدا نے اپنے فضل سے ان کو عطا فرمایا ہے، بخل کرتے ہیں اور اس بخل کو اپنے حق میں اچھا نہ سمجھیں بلکہ وہ ان کیلئے برا ہے، وہ جس مال میں بخل کرتے ہیں قیامت کے دن اس کا طوق بنا کر ان کی گردنوں میں ڈالا جائیگا۔“

(۷م)

## فصل پنجم

### صوفیاء کے افکار کی روشنی میں پر تعیش انداز

### زندگی کی بجائے سادگی

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی عیاشانہ تمدن و تکلفانہ زندگی کو نہ صرف قرآن و سنت کے منافی سمجھتے ہیں بلکہ قومی معیشت کے لئے خطرہ خیال کرتے ہیں اور سادہ و متوسط درجہ کی زندگی کو اپنانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ آپ نے بادشاہوں اور وزراء کے نام جو دس نکات پر مشتمل ایک فہمیت نامہ جاری کیا اس میں انحطاط معیشت سے بچاؤ کے حوالے سے ایک حکم یہ ہے۔

آنکہ بادشاہ اسلام و امراء کبار بہ عیش و حرام مشغول یہ کہ شاہ اسلام اور امراء پر تعیش اور حرام زندگی میں نشوند توبہ از گزشتہ توبہ النصوح بہا آرند۔ شغل ہوں توبہ ایسی کہ توبہ النصوح ہو۔

صوفیائے کرام نے ہمیشہ سادگی کو پسند فرمایا کیونکہ ان کی زندگیاں اتباع رسول مقبول ﷺ سے عبارت تھیں۔ سادگی کیلئے صوفیاء لفظ ”فقر“ کو استعمال کرتے ہیں سرکارِ دو جہاں ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا۔

”الفقر فخری“  
(۲۸)  
”فقر میرا فخر ہے۔“

لیکن یاد رکھیے فقر کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ ایک ہے فقر اختیاری

۲۔ دوسرا ہے فقر اضطراری

فقر اختیاری واقعہ قابل فخر ہے مگر فقر اضطراری تو خدا کے عذاب کی شکل ہے۔

فقر اختیاری کا مطلب یہ ہے کہ انسان قییش و تکلف اور آسائش و آلائش کے جملہ لوازمات حاصل ہونے کے باوجود درویشانہ زندگی بسر کرے، دولت جمع کرنے پر ایثار کر دے۔ (۲۹)

اس سلسلہ میں ہمارے سامنے سرور عالم ﷺ کا اسوہ حسنہ ایک نمایاں مثال ہے۔ مدنی زندگی کے آخری دور میں فتوحات و غنائم کے علاوہ خراج کی بڑی مقدار آپ کے ہاں پہنچ رہی تھی مگر اس سب کے ہوتے ہوئے آپ کی زندگی درویشی اور فقری کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ اگرچہ آپ بادشاہ عرب و عجم تھے مگر وہی گھاس پھوس کا چھونپڑا، وہی پیوند لگا لباس، وہی روکھا سوکھا کھانا اور وہی درویشانہ انداز زندگی، ظاہر ہے کہ اگر یہی چیزیں یونہی مسلط ہو جائیں تو ایک عذاب ہیں مگر انہیں از خود اختیار کر لیا جائے تو سراسر سکون و اطمینان ہے۔ سرور عالم ﷺ نے اپنی امت کیلئے فقر و تنگدستی کا اندیشہ محسوس نہیں کیا بلکہ خوش ببری اور قییش کو دین کیلئے فتنہ قرار دیا۔ آپ برابر لوگوں کو قال اور حال سے فقر اختیار کرنے کی تلقین فرماتے رہے اپنا یہ عالم تھا کہ ہفتہ ہفتہ چولہا ٹھنڈا رہتا۔ صاحبزادی کے ہاتھوں میں کام کی کثرت کے باعث آبلے پڑ گئے مگر غلام عطا کرنے کے معاملہ میں بدر کے یتیموں کو ترجیح دی خود فاقے سے رہے مگر کوشش رہی کہ کوئی سائل دروازے سے خالی نہ جانے پائے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرامؓ کی ارواح مقدسہ بھی فقر اختیاری کے قالب میں ڈھل گئی تھیں اور اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دینا ان کا شعار بن گیا تھا۔ سارا دن روزے سے رہے مگر افطار کے وقت جب لقمہ منہ میں ڈالنے والے تھے کہ اچانک سائل کی صدا گونجی۔ لقمہ اٹک گیا اور ماحضر سائل کو پیش کر دیا اور پھر بغیر افطار و سحر کے وہی روزہ رہا۔ دوسرے دن کسی یتیم کی ضرورت مقدم رکھی گئی تیسرے دن قیدی کی حاجت پوری کرنا ضروری سمجھا گیا۔ یہ سب واقعات فقر اختیاری کے عمدہ نمونے ہیں۔

تصوف میں اس فقر کو ایک اہم حیثیت حاصل ہے صوفیائے کرام نے اپنی پوری زندگی میں ہمیشہ متول و قییش پر فقر کو ترجیح دی لیکن یہ غلط فہمی نہ ہونے پائے کہ فقر صرف ترک دنیا و مال کا نام ہے۔ اور اپنے نفس کو خواہ مخواہ دکھ میں رکھنے کا

مقصود ہے بلکہ فقر دراصل دل کے غنا کا نام ہے حقیقی فقیر تب بنتا ہے جب اس کیلئے دنیا و اسباب دنیا کا ہونا نہ ہونا برابر ہو۔ چنانچہ اس ضمن میں حضرت داتا گنج بخش کا یہ فرمان ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ”فقیر کی اصل متاع دنیا کا ترک اور اس سے علیحدگی نہیں بلکہ دل کو اس دنیا کی محبت سے خالی اور بے نیاز کرنا ہے فقروہ ہوتا ہے جو متاع دنیا سے بالکل بے نیاز ہو۔ اس کے پاس خواہ سرے سے کچھ موجود نہ ہو یا اس کے پاس دنیا کے سارے اسباب موجود ہوں۔ دونوں میں سے کسی حالت میں کوئی خلل نہ آئے نہ کسی چیز کے مقصود ہونے پر اسے پریشانی لاحق ہو اور نہ جملہ اسباب موجود ہونے پر وہ اپنے آپ کو دولت مند محسوس کرے۔“

اگر ہمیں نظر دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ فقر کچھ مل جانے پر شکر اور نہ ملنے پر صبر کا نام ہے۔ جب انسان فقر اختیار کر لیتا ہے تو داریں کے دھندوں اور جھیلوں سے نجات پالیتا ہے اور زندگی میں جو سکھ اور چین اسے نصیب ہوتا ہے۔ اسے بادشاہوں نے خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا شیخ ابو بکر وراقؒ نے کتنی خوبصورت بات کہی ہے۔ (۲۹)

”دنیا و آخرت دونوں جہاں میں فقیر کیلئے خوشخبری ہے۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو فرمایا اس لئے کہ دنیا میں بادشاہ اس سے خراج نہیں لیتا آخرت میں خدا حساب نہیں مانگے گا۔“

یہ فقر اور سادگی کی بدولت انعامات حاصل ہیں۔ فقیر اس اعتبار سے لائق تحسین ہے کہ اس کے اور اللہ کے مابین کبھی خلل واقع نہیں ہوتا۔ اور تقرب کی کیفیات میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے کیونکہ دو چیزیں ہی ایسی ہیں۔ جو اس تعلق اور تقرب میں خلل انداز ہوتی ہیں نعمت مل جانے پر غرہ ہونا اور چھن جانے پر شکوہ کرنا۔ فقیر کے ہاں ان دونوں کا گز نہیں ہوتا کچھ نہ ملے تو سکون محسوس کرتا ہے۔ مل جائے تو اپنے لئے کچھ نہیں رکھتا۔ جیسا کہ شیخ ابوالحسن نوریؒ فقیر کی تعریف میں فرماتے ہیں۔

”جب کہ اس کے پاس کچھ نہ ہو تو اسے سکون حاصل ہو۔ اور جب سب کچھ مل جائے تو خرچ کر دے۔“

حضرت شیخ ابوعلی رقاقؒ کے پاس ایک فقیر آیا جس نے ٹاٹ کا کرتہ اور ٹاٹ کی ٹوپی پہن رکھی تھی ساتھیوں میں سے ایک نے تفریح طبع کے طور پر کہا کہ یہ ٹاٹ کتنے میں خریدا ہے فقیر نے جواب دیا۔ دنیا دے کر خریدا ہے اور بیچنے والے نے مجھ سے کہا اسے پھر میرے پاس بیچ دو اور آخرت لے لو مگر میں نے نہیں بیچا۔ ملاحظہ فرمائیں۔ ”ٹاٹ کے کرتے اور ٹوپی کی قیمت“

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز





دنیا اگر فقیر خدا مست کے قدموں میں ہوتی ہے تو پیش نظر آخرت بھی نہیں ہوتی ہے بلکہ اسے پس پشت رکھا جاتا ہے ان کی نگاہ تو صرف مالک دنیا اور مالک یوم الدین پر پڑتی ہے۔ (۵۵)

صوفیائے کرام حضور ﷺ کے اسوہ حسنہ پر عمل کرتے ہوئے ہمیشہ سادگی کو اپنایا اور دوسروں کو بھی اس پر عمل کرنے کی تلقین کی۔ آئیے انہی حضرات کے اقوال کی روشنی میں سادگی کی مزید تعریف اور وضاحت دیکھتے ہیں۔

سادگی کا مضمون اپنے اندر بہت مفہوم لیے ہوئے ہے اس ضمن میں کئی عنوان آتے ہیں عام مفہوم میں سادگی سے مراد زندگی میں دکھاوے اور فضول خرچی سے بچتے ہوئے صرف ضروری چیزوں پر گزارہ کرنا سادگی کہلاتا ہے۔ سادگی کا اصل تعلق دل سے ہوتا ہے حضور ﷺ نے فرمایا کہ مومن سادہ دل اور بلند فطرت ہوتا ہے۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ بہت سادہ زندگی گزارتے تھے۔ حضور ﷺ کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ آپ ﷺ پیوند لگا کر کپڑے پہنتے تھے۔ اپنے کپڑوں کو پیوند بھی خود لگایا کرتے تھے۔ آپ اپنے جوتے مبارک خود مرمت کرتے تھے۔ آپ اپنی بکریوں کا دودھ خود دہتے تھے۔ خانہ کعبہ کی تعمیر از سر نو ہوئی تو اس موقع پر حضور ﷺ اپنے ہاتھ سے گارہ اور مٹی اور پتھر اٹھا اٹھا کر دیتے تھے۔ حضور ﷺ نے جب حضرت معاذ کو یمن کا والی بنا کر بھیجا تو فرمایا کہ عیش و عشرت سے بچ کر رہنا کیونکہ اللہ کے بندے عیش و عشرت والے نہیں ہوتے۔ حضور ﷺ نے ہمیشہ سادگی کا درس دیا ہے خود بھی اسی پر عمل کیا اور دوسروں کو بھی اس کی نصیحت فرمائی ہے۔ آپ ﷺ نے مردوں کو بھڑکیلے لباس اور زیورات پہنے سے منع فرمایا ہے۔ حضور ﷺ نے عورتوں کو با پردہ رہنے اور گھر میں رہنے کا حکم دیا ہے۔ بوجہ مجبوری انہیں باہر جانا بھی پڑے تو ان کے لیے حکم ہے کہ وہ اپنی زینت چھپا کر باہر نکلیں۔ اور بغیر وجہ کے ہار و سنگھار و آرائش سے بچیں۔

حدیث پاک میں ہے۔ ”جو عورتیں نمود و نمائش کے لئے زیور پہنتی ہیں وہ قیامت کے دن ان کے لئے آگ کا طوق بنے گا۔“ حضرت محمد ﷺ کی پیاری بیٹی نہایت سادہ زندگی گزارتی تھی اپنے گھر کا سارا کام خود کرتی تھیں حتیٰ کہ روزانہ آٹا چکی پر خود پیستی تھیں۔ آپ کے ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے تھے۔ گھر کی صفائی اور برتن خود دھوتی تھی۔ جو وقت پختا عبادت الہی میں گزارتی تھیں۔ آپ کا لباس بہت سادہ ہوتا تھا۔

حضرت محمد ﷺ نے اپنی بیٹی کی شادی نہایت سادگی سے کی ان کو جہیز میں چند چیزیں عطا فرمائی جو درجہ ذیل ہیں۔

۱۔ ایک جائے نماز ۲۔ ایک بستر ۳۔ ایک چکی ۴۔ ایک مشکیزہ

۵۔ ایک چادر ۶۔ مٹی کے چند برتن -

اسی طرح حضرت علی بھی انتہائی سادگی سے زندگی گزارتے تھے جب امیر المؤمنین بنے تو عید کے روز جو کی

روٹی کے خشک ٹکڑے پانی میں بھگو کر تناول فرما رہے تھے کہ آپ کے صاحبزادوں نے عرض کی۔ اباجی! آج تو عید کا روز ہے لوگ اچھے لباس اور اچھے کھانے کھا رہے ہیں اور آپ سوکھے ٹکڑے۔۔۔۔۔! آپ نے پر غم آنکھوں سے فرمایا۔ میرے بچو! جو کی روٹی کے یہ خشک ٹکڑے کھا کر بھی اللہ تعالیٰ سے ڈر رہا ہوں کہ کہیں اللہ تعالیٰ اس کا بھی مواخذہ نہ فرمائے کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ میری رعیت میں کوئی ایسا فرد نہ ہو جسے یہ خشک ٹکڑے بھی میسر نہ ہوں۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے جو نمائش اور شہرت کے لیے کپڑے پہنے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے ذلت اور رسوائی کا لباس پہنائے گا۔ (۵۱)

## مذہبی سادگی:

اسلام کی ایک خصوصیت اس کی فطری سادگی ہے جو جدید سائنسی ذہن کے عین مطابق ہے۔ جدید انسان کا ذہن نیچر کے مطالعہ سے بنا ہے۔ اس لیے نیچر میں جو سادگی ہے وہی سادگی جدید ذہن کے لیے بھی پسندیدہ چیز بن گئی ہے۔ جدید ذہن کے لیے وہی مذہب قابل قبول ہو سکتا ہے جس میں فطری سادگی ہو۔ جو مذہب فطری سادگی سے خالی ہو وہ جدید ذہن کے لیے قابل قبول بھی نہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے اسلام کے سوا تمام مذاہب فطری سادگی سے محروم ہو چکے ہیں۔ نظریاتی سادگی سے بھی اور عملی سادگی سے بھی۔

موجودہ مسیحیت جس فلسفیانہ عقیدہ پر قائم ہے وہ تثلیث ہے یعنی تین میں ایک، ایک میں تین۔ ریاضیاتی طور پر یہ بات بالکل ناقابل فہم ہے کہ کوئی چیز بیک وقت ایک بھی ہو اور اسی کے ساتھ تین بھی۔ اس سلسلہ میں ایک دل چسپ واقعہ قابل ذکر ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے ایک عیسائی پروفیسر سے پوچھا گیا کہ تثلیث (Trinity) کا مطلب کیا ہے۔ پروفیسر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:

If you ask me I don't know, if you don't ask I know.

یہودیت ایک اور اعتبار سے غیر سادگی کا منظر پیش کرتی ہے موجودہ بائبل میں عبادت اور قربانی کے مراسم (Rituals) اتنے زیادہ بتائے گئے ہیں کہ عام انسان کے لیے تقریباً ناممکن ہو گیا ہے کہ وہ ان تمام مراسم کی پابندی کرتے ہوئے عبادت اور قربانی کر سکے۔

بائبل کے باب اس قسم کے جزئی مراسم کی تفصیل سے بھرے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر حسب ذیل ابواب ملاحظہ ہوں:

اس کے مقابلہ میں اسلام کی عبادت ظاہری رسمیات سے بالکل خالی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامی عبادت ایک انتہائی سادہ عمل کا نام ہے۔ سرائیڈورڈینی سن راس (E. Dension Ross) نے اسلام کی فطری سادگی کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے کہ اسلامی عقیدہ کی سادگی غالباً اسلام کی اشاعت میں زیادہ بڑا عامل تھی بمقابلہ غازیوں کی تلوار کے:

The simplicity of Islamic creed was probably a more potent

(۳۱) factor in the spread of Islam than the sword of Ghazis.

Introduction of Georec Sale's translation at the Quran P. VII.

اسلام کی یہ سادگی جس نے قدیم زمانہ میں بے شمار انسانوں کو اسلام کی طرف راغب کیا اس کی وہی سادگی مزید اضافہ کے ساتھ جدید انسان کے لیے کشش کا باعث ہے۔ جدید انسان کا فطرت پسند ذہن اسلام کے سوا کسی اور مذہب میں اپنی حقیقی تسکین نہیں پاسکتا۔ (۵۲)

## فصل ششم

# صوفیاء کے افکار کی روشنی میں خود انحصاری

## کفایت شعاری و قناعت

### کفایت شعاری و خود انحصاری:-

صوفیائے کرام نے اپنے عمل سے ثابت کیا کہ اسلام جس قسم کا معاشرہ برپا کرتا ہے اس میں فطری میلانات کو ضرورت سے زائد نہیں ابھارا جاتا یہی وجہ ہے کہ اسلام اپنے پیروکاروں کو دولت کے بارے میں کھلا لائسنس نہیں دے دیتا کہ جس طرح کمائیں اور جس طرح چاہیں اسے خرچ کر ڈالیں بلکہ وہ تمام انسانوں کے اجتماعی مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے احکام و حدود مقرر کرتا ہے اور ہر فرد کے حقوق کے تحفظ کیلئے چند اصول اور ضابطے متعین کرتا ہے جن کی خلاف ورزی کو وہ ناجائز اور حرام ٹھہراتا ہے جس طرح وہ اسباب زندگی جائز اور معروف ذرائع سے حاصل کرنے کی پابندی لگاتا ہے اسی طرح وہ خرچ کی مدات پر اپنے اصولوں کی حکمرانی رکھتا ہے کسی شخص کیلئے یہ آزادی نہیں ہے کہ وہ ان اصولوں کی خلاف

ورزی میں اپنی کمائی ضائع کر کے اور محاسبے سے آزاد اور بے خوف ہو جائے۔ اسلام انسان کی آمد و خرچ کو خدائی احکام کا پابند دیکھنا چاہتا ہے اور اول دن سے وہ یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ انسان کو دنیا میں جو کچھ عطاء کیا گیا ہے ان سب کے بارے میں ایک دن اس سے ضرور باز پرس ہوگی۔

ثم لتسئلن يومئذ عن النعيم۔ (۵۳)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

لا تزول قد ما عبد حتى يسئل عن خمس عن عمره فيما قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی عدالت سے آدمی ادھر اافتاء وعن علمه فيما عمل وعن ماله اين اكتسبه وفيما انفقہ تک کہ اس سے پانچ باتوں کے بارے میں حساب نہیں وعن جسمه فيما ابلاه (۵۴) پوچھا جائے گا کہ عمر کن مشاغل میں گزاری دین کا علم تک عمل کیا مال کہاں سے اور کس طرح کمایا اور کن مضافات پر خرچ کیا۔ جسم کو کس کام میں گھلایا۔

زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو ان پانچ باتوں سے باہر ہو تو اس طرح اس کی پوری زندگی مع اپنے تمام اسباب بقاء و حیات کے اللہ کے سامنے جوابدہ ہوگی انسان کو کبھی غرور بے جا کا شکار نہیں ہونا چاہئے کہ جو دولت و املاک اور جس قدر مادی اسباب و وسائل اسے حاصل ہوں وہ صرف اس کی محنت و صلاحیت اور اس کے ذاتی کمال کا نتیجہ ہیں۔ وہ ہرگز غیر مسئول اور مالک و مختار نہیں ہے کہ جس طرح چاہے جہاں چاہے خرچ کرنے میں آزاد ہو۔ دائرہ اسلام میں آنے کے بعد اس کی آزادی ختم ہو جاتی ہے اس کے احکام کی پابندی کا معاہدہ خود اس نے اپنی مرضی سے اختیار کیا تھا۔ شرعی اصولوں کی خلاف ورزی اور حق داروں کی حق تلفی کے ساتھ حاصل کردہ املاک و اسباب نہ تو رزق کریم ہیں نہ فضل ربی! اخراجات کے سلسلہ میں قرآن ایک معیار پیش کرتا ہے جو انسان کے معاشی و اقتصادی تحفظ کا آئینہ دار ہے۔

والذین اذا انفقوا لم یبرزوا ولم یقتروا وکان بین ذالک جو خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی کرتے ہیں اور عقلی قواماً۔ (۵۵)

اخراجات کے سلسلہ میں یہ احتیاط اور اعتدال قرآنی تعلیم کا نتیجہ ہے۔

ولا تجعل یدک مغلولۃ الی عنقک ولا تبسطها کل البسط تو اپنا ہاتھ گردن سے نہ باندھ رکھ اور نہ ہی کھلا چھوڑا فتقعد ملوما محسورا۔ (۵۶)

درماندہ بن کر رہ جائے۔

ایک حدیث میں رسول ﷺ کا ارشاد ہے۔

الاقتصاد في النفقة نصف المعيشة والتودد الى الناس نصف ضروري اخراجات میں میانہ روی متکفل زندگی کا نصف العقل (۴۷) نفع معیت ہے اگر اس سے الفت و محبت کا رویہ نصف عقل ہے۔

طاقت کے مطابق عمل کرنے کی پالیسی نہایت معقول ہے رسول ﷺ کا ارشاد ہے۔

اكلفوا لان الاعمال ما تطيقون (بخاری) (۴۸) فرائض کے بعد مباح مسائل میں اتنا ہی عمل کا التزام

جس طرح اسلام اتفاق فی سبیل اللہ کے بارے میں بھی التزام ہے

حضرت کعب بن مالکؓ نے جب آنحضرت ﷺ کو عرض کی کہ میں سارا مال اللہ کی راہ میں دینا چاہتا ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں اپنے اور اپنے بچوں کی کفالت کیلئے کچھ رہنے دیں۔ (۴۹) حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

الهدى الصالح و السمى الصالح والاقتصاد جزء من خمسة زندگی میں نیک طور اطوار، اچھا انداز اور معاملات میں وعشرين جزء من النبوة۔ (۵۰) پچیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔

شریعت کے خلاف ناجائز مصارف میں اپنی زندگی کی توانیاں، صلاحیتیں اور اپنی زندگی کا نچوڑ دولت و املاک کی صورت میں خرچ کرنا شیطان کی راہ میں خرچ کرنا ہے اس کی مشہور صورت اسراف ہے قرآن مجید کا ارشاد ہے۔  
كلوا واشربوا ولا تسرفوا انه لا يحب المسرفين۔ (۵۱) کھاؤ اور پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ حد سے کرتا۔

تذیر و اسراف کے کئی درجے ہیں۔

۱۔ اپنی ذات پر خرچ کرنا ہے اور دوسرے حقداروں پر مناسب خرچ نہیں کرتا۔

۲۔ خرچ کے مصارف میں ضرورت یا حد اعتدال سے زیادہ خرچ کرتا ہے۔

۳۔ اپنی عیاشی، فسق و فجور اور فضول خرچیوں پر اڑاتا ہے

اپنی ہی کمائی انسان کیلئے وبال جان بن جاتی ہے جبکہ وہ اپنی کمائی اور دولت کو مہن پسند طریقوں پر خرچ کرے یا اسے روکے رکھے۔ دونوں صورتوں میں وہ خطا کار ہے اور قابل مواخذہ بھی۔

تذیر یہ ہے کہ جہاں خرچ نہ کرنا ہو تو وہاں خرچ کیا جائے۔ یہ بھی مال ضیاع ہے۔ اس بارے میں قرآن کا

نقطہ نظر بالکل واضح ہے۔

ولا تبذر تبذیرا ان المبذیرین کانوا اخوان الشیطین فضول خرچی نہ کرو فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں  
(۶۲)۔

تبذیر کا اصل معنی ہے بکھیر دینا۔ انجام سے ناواقف شخص زمین میں بیج بظاہر بکھیر کر ضائع کر رہا ہے بطور استعارہ  
انجام سوچے بغیر مال فضول ضائع کرنا تبذیر کہلاتا ہے۔

شادی بیاہ، مکان، غذا، رہائش، لباس اور مادی ضروریات کی تکمیل و تزئین میں اپنی حیثیت، طاقت اور موقع  
کی ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا فضول خرچی ہے اور قرآن کی اصطلاح میں سب شیطانی راستے ہیں۔ جن کے ذریعے  
ان کی معاشی اور اقتصادی طاقت یقیناً ضائع ہوتی ہے۔

صوفیائے کرام نے اس لئے فقر کو اختیار کیا۔ ان کی زندگیاں قناعت، کفایت شعاری اور خود انحصاری سے  
عبارت ہیں۔ کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ جو حاصل ہوا اس پر قناعت کی۔ فضول خرچی سے اجتناب کیا۔ جتنا خود  
کما سکے اتنا خرچ کیا اور اسی کو استعمال میں رکھا۔ اسلام کی حدود سے ذرا بھر تجاوز نہیں کیا خود عمل کیا اور دوسروں کو اس پر  
عمل کرنے کا درس دیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ اسلام کی حدود کی اندر رہتے ہوئے حاصل کیا جانے والا مال حلال ہے اور اس  
کے سوا حلال نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جس طرح اسلام نے مال و دولت کے حصول کے طریقوں پر پابندیاں عائد کی  
ہیں اسی طرح اسلام نے اس کے خرچ کرنے کے مصارف پر بھی پابندیاں عائد کی ہیں اور مال کو طیب و حلال بنانے کیلئے  
زکوٰۃ اور انفاق کے طریقے لازم کئے ہیں۔ ان پر عمل کرنے سے اللہ اور رسول کی رضا اور خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔  
انسان ان طریقوں پر عمل کر کے ایک باوقار اور پرسکون زندگی گزار سکتا ہے۔

حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ سے کسی نے تصوف کے بارے میں پوچھا تو فرمایا۔

”اے برادر تفاوت مراتب فقراء اگر امروز اے بھائی اگر تم فقراء کے مدارج

خواہی کہ دریابی بجانب شریعت اونگاہ کن کہ دیکھنا چاہتے ہو تو شریعت پر ان کے

شریعت معیار است۔“ عمل سے ان کا اندازہ لگاؤ کیونکہ اس

بارے میں معیار شریعت ہی ہے۔ واضح ہوا کہ جس چیز کی

قرآن و حدیث نے ممانعت کی وہ صوفیاء کی زندگیوں میں نہیں پائی جاتی۔ خود انحصاری، کفایت شعاری اور قناعت قرآن

کا حکم ہے۔ صوفیاء نے عمل کیا اور دوسروں کو عمل کرنے کی ہدایت فرمائی۔ (۶۲)

قناعت:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

من عمل صالحاً من ذکر او انشی وهو مومن فلنحيينه جس شخص نے مومن ہونے کی حالت میں نیک عمل کیا حیوۃ طیبہ۔ (۶۳)

ہم اسے ضرور اچھی زندگی عطا کریں گے۔

بہت سے اہل تفسیر کا قول ہے کہ حیات طیبہ سے مراد دنیا میں قناعت ہے۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔

القنّاعة كنز لا يفنى۔ (۶۵) یعنی قناعت نہ ختم ہونے والا خزانہ ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ پرہیزگار بنو۔ تم سب سے زیادہ عبادت گزار بن جاؤ گے قانع بنو۔ تم سب سے زیادہ شکر گزار ہو جاؤ گے۔

کہتے ہیں۔ محتاج لوگ مردے ہیں ماسوائے ان کے جن کو اللہ تعالیٰ نے قناعت کی عزت سے زندہ رکھا۔

حضرت بشر حافیؒ فرماتے ہیں کہ قناعت ایک فرشتہ ہے جو مومن کے دل کے سوا کہیں سکونت اختیار نہیں کرتا۔

حضرت ابوسلیمان دارانیؒ فرماتے تھے قناعت اور رضا کا آپس میں وہی تعلق ہے جو ورع اور زہد کا ہے قناعت رضا کی ابتداء ہے اور ورع زہد کی۔

کہتے ہیں کہ جن چیزوں سے انسان کو الفت ہے ان کے نہ ہونے پر بھی سکون ہونے کا نام قناعت ہے۔

حضرت ابوبکر مراغیؒ کہتے ہیں کہ عقلمند وہ شخص ہے جو دنیاوی امور کی تدبیر قناعت اور لیت و لعل کرنے سے کرے اور آخرت

کے امور کی تدبیر حرص اور جلد بازی سے کرے اور دین کے معاملات کی تدبیر علم اور کوشش سے کرے۔ حضرت ابو عبد اللہ

بن خفیفؒ فرماتے ہیں مفتوح چیز کی امید کو ترک کرنے اور موجود چیز کے ساتھ استغناء کرنے کا نام قناعت ہے۔ (۶۶) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

لیرزقنہم اللہ رزقا حسنا۔ (۶۷) اللہ تعالیٰ ان کو ضرور اچھا رزق عطا فرمائے گا۔

اس کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ رزق حسن سے مراد قناعت ہے۔

حضرت محمد بن علی ترمذیؒ فرماتے ہیں جو رزق کسی انسان کی قسمت میں لکھا جا چکا ہے اس پر راضی رہنے کا نام قناعت ہے۔

نیز کہتے ہیں کہ قناعت یہ ہے کہ جو چیز مل گئی ہے اس پر اکتفاء کرے اور جو چیز حاصل نہیں ہوئی اس کا لالچ نہ کرے۔



حضرت وہب فرماتے ہیں۔ عزت اور مال داری دونوں رفیق کی تلاش میں نکلیں انہیں قناعت مل گئی اور وہ وہیں ٹھہر گئیں کہ اب اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ کسی نے کسی سے پوچھا سب سے زیادہ قانع کون شخص ہوتا ہے جواب ملا کہ وہ شخص سب سے زیادہ قانع ہے جو سب سے زیادہ لوگوں کی مدد کرتا ہے اور انہیں کم تکلیف دیتا ہے۔ زبور میں ہے کہ قناعت کرنے والا خواہ بھوکا ہی کیوں نہ ہو مالدار ہوتا ہے۔

حضرت ذوالنون مصری فرماتے ہیں جس نے قناعت کی وہ اپنے اہل زمانہ سے آرام میں رہا اور اپنے ساتھیوں سے سبقت لے گیا۔

حضرت کتائی فرماتے ہیں کہ جس نے حرص کے عوض میں قناعت لی اسے عزت و مروت مل گئی۔

کہتے ہیں کہ ایک شخص نے دانا کو دیکھا کہ جو سبزی پانی کے اوپر گری پڑی تھی وہ اسے کھا رہا تھا اس شخص نے دانا سے کہا کہ اگر تو بادشاہ کی نوکری کر لیتا تو تجھے یہ کھانے کی نوبت نہ آتی۔ دانا نے جواب دیا تو بھی اگر قناعت کرتا تو تجھے بادشاہ کی نوکری کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔

کہا جاتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ نے طمع کا ذکر کرتے ہوئے حضرت خضرؑ کو کہا ”لو شئت لا تخذت علیہ اجرا“ اگر تو چاہتا تو اس کی اجرت لے سکتا تھا۔ حضرت خضرؑ نے جواب میں کہا۔ ”هذا فراق بینی و بینک“ اب میرے اور تمہارے درمیان جدائی ہے۔

نیز کہا جاتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ نے یہ الفاظ کہے تو موسیٰ اور خضرؑ کے درمیان ایک ہرن کھڑا ہو گیا اس وقت دونوں بھوکے تھے موسیٰ کی طرف ہرن کا جو پہلو تھا وہ بھونا ہوا نہ تھا اور جو پہلو حضرت خضرؑ کی طرف تھا وہ بھونا ہوا تھا۔ (۶۸) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

یتان الا برا لفی نعیم۔ (۶۹) بے شک نیک لوگ جنت میں ہوں گے۔

اس آیت میں نعیم کی تشریح میں کہا گیا ہے کہ یہ قناعت ہے۔

**رسول ﷺ کے ارشاد ت گرامی !:**

عبدالرحمن بن ابی سعیدؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا میں نے رسول ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے اور اس وقت آپ منبر پر تشریف فرما تھے کہ جو قلیل اور کفایت کرنے والی چیز ہے وہ اس چیز سے بہتر ہے جو زیادہ ہو اور لہو و لعب میں مشغول کر دے۔ (۷۰)

رسول ﷺ سے مروی ہے کہ بیشک آپ نے فرمایا جو شخص اسلام لایا اور اس کا رزق اس کے لئے کافی ہو اور اس پر وہ صبر کرے تو وہ کامیاب انسان ہے۔ (۷۱)

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے دعا مانگی اور فرمایا الہ العالمین! آل محمد کے رزق کو قوت بنادے (اتنا رزق دے جس کو کھا کر انسان زندہ رہ سکے)۔ (۷۲)

حضرت جابرؓ رسول ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا قناعت ایسا مال ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ (۷۳)  
حضرت عمرؓ نے فرمایا، لوگو! تم کتاب اللہ کے ظروف اور حکمت کے چشمے بن جاؤ اور اپنے نفوس کو مردوں میں شمار کرو اور حق اللہ تعالیٰ سے (اپنی روزی) روز کے روز مانگا کرو اور جب تمہارے لئے اس (روزی) میں کثرت نہیں ہوگی تو تم کو کچھ مضرت نہیں پہنچے گی۔

### بزرگوں کے ارشادات قناعت کے بارے میں:

کسی نے حضرت ابو یزیدؒ سے پوچھا تو اس مقام پر کیونکر پہنچا۔ فرمایا میں نے دنیا کے اسباب کو جمع کر کے قناعت کی رسی سے باندھ دیا پھر صدق کی منجھنق میں رکھ کر ناامیدی کے سمندر میں پھینک دیا لہذا میں آرام میں رہا۔

اخلاق صوفیہ میں قناعت بھی ہے یعنی دنیا کی تھوڑی سی چیز پر بس کرنا، (اس کو کافی سمجھنا)۔ حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ جس نے قناعت اختیار کی اس کو اہل زمانہ سے آرام حاصل ہوا اور اس نے اپنے عہدوں پر غلبہ پالیا۔ جناب بشر بن حارث کہتے ہیں کہ قناعت میں بجز عزت کے اگر اور فائدے نہ بھی ہوتے تو صاحب قناعت (قانع) کے لئے یہی بہت کافی تھا۔ جناب بنان بن حمال کہتے ہیں۔

(طمع، آزاد بندے کو بھی تو قیدی بناتی ہے قناعت  
الحر عبد ما طمع والعبد حر ما قنع  
دلالتی ہے)۔

بعض صوفیہ کا ارشاد ہے کہ جس طرح تو قصاص کے ذریعہ اپنے دشمن سے بدلہ لیتا ہے اسی طرح اپنی قناعت سے حرص کا انتقام لے۔ شیخ ابو بکر فراغی فرماتے ہیں کہ دانا وہ ہے جس نے قناعت اور سوچ بچار سے دنیاوی امور کی تدبیر کی اور حرص اور غلبت کے ساتھ اخروی امور کا اہتمام کیا۔ جناب یحییٰ بن معاذ نے کہا ہے جو اپنے رزق پر قانع ہو گیا وہ آخرت کو حاصل کر لے گا اور اس کی زندگی (دنیا) بھی اچھی طرح گزرے گی۔ امیر المومنین علی ابن ابی طالب کرم اللہ

وجہ فرماتے ہیں، قناعت ایسی تلوار ہے جو کبھی نہیں اچٹی (جس کا وار خالی نہیں جاتا)۔

پس صوفی عدل سے اپنے نفس پر غالب ہے اور نفس کی سرشت سے آگاہ ہے، قناعت کے فوائد حاصل کرنا جانتا ہے اور نفس کی اصلاح کی طریقوں سے آگاہ ہے وہ جانتا ہے کہ اس کا مرض کیا ہے اور اس مرض کی دوا کیا ہے۔  
ابوسلیمانؒ دارانی کہتے ہیں کہ قناعت رضا سے حاصل ہوتی ہے جس طرح درع زہد سے۔ (۱۷۷)

## خلاصہ بحث

## فصل ہفتم

### تصوف کا موجودہ کردار، مسائل اور اصلاحی تجاویز

#### خلاصہ بحث :-

مسلمانان عالم کی اصلاح میں حصہ لینے والوں کی شان احادیث صحیحہ میں اس طرح بیان کی گئی ہے۔ کہ روز قیامت ایسے لوگوں کا مقام و مرتبہ انبیائے کرام کے درجے سے صرف ایک درجہ کم ہوگا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے دین کی خدمت کرنے والوں کیلئے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ وہ ذات انہیں زندگی کے ہر قدم پر اپنی خاص مدد و نصرت سے نوازے گا۔ ظاہر ہے جن خوش نصیبوں کیلئے اللہ تعالیٰ قدم قدم پر مدد کرنے کا وعدہ فرمائے تو پھر انہیں کامیاب و کامران زندگی بسر کرنے میں کیا رکاوٹ پیش آسکتی ہے۔

ہر زمانے میں انسانیت کی رشد و ہدایت کیلئے ہادی اور مصلحین کو ارسال کرتے رہنا اللہ تعالیٰ کی سنت میں شامل ہے اور ہمارے زمانے میں بھی قوم کے احوال کی اصلاح کیلئے مخلص لوگ ہمیشہ سے کوشاں رہے ہیں۔ مگر افسوس کہ دشمنان اسلام بھی ہمیشہ سے مسلمانوں کے ساتھ سامری کا سا کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ اور اہل اسلام کو راہ ہدایت سے دور لے جانے میں اس قدر کامیاب ہو چکے ہیں کہ زوال و انحطاط کا شکار مسلمان کسی دردمندانہ انداز اور پکار پر کان دھرنے کو تیار نہیں۔ یہ دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے کہ نوجوان نسل کے اخلاق و کردار کو بری طرح متاثر کرنے والے الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ مسلمانوں کا بالائی طبقہ اس قدر جوش و خروش کا اظہار کرتا ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے مذہب کے ساتھ ذوق و شوق کی جگہ اب فحاشی، عریانی اور بے حیائی نے لے لی ہے۔ جن لوگوں کا فرض منصبی ایسی بے راہ روی اور بے حیائی کے سیلاب کی روک تھام کرنا تھا وہ خود اس بے حیائی کو فروغ دینے میں مصروف ہیں اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ سعادت عطا فرمائے کہ ہم قوم کیلئے ایسی خدمات سرانجام دے سکیں کہ ہمارے دور میں ہی باطل کو تقویت دینے

والوں کو نابود کیا جاسکے۔ آمین۔

مسلمانوں کی موجودہ حالت زار کی طرف علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

مومن است وپیشہ او آذری

دین و عرفان سر اپا کافری

یہ مومن تو ہے مگر اس کا پیشہ بت پرستی ہے۔ اس کا دین و عرفان سر اپا کافری ہے۔ (۷۵)

صوفیائے کرام جن کی زندگیوں کا مقصد محبت الہی اور معیت الہی ہے۔ اور یہ بات واضح ہے کہ محبت الہی ہو نہیں سکتی جب تک اس کے بندوں سے محبت نہ ہو۔ اور اس محبت کیلئے ضروری ہے کہ ان کے جسم اور روح کی غذا کا سامان فراہم کیا جائے۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ ان حضرات کے آستانوں پر لنگر کا اہتمام بھی ہوتا ہے نیز تعلیم اخلاق کا بھی۔ ان کی زندگیاں خدمت خلق کے لئے وقف تھیں۔ وہ دن رات انسانی دلوں کو رشتہ الفت میں پرونے کیلئے بے چین رہتے تھے۔ کسی کو تکلیف میں دیکھتے تو پریشان ہو جاتے۔ ان کی زندگیوں کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ خدمت خلق کو ان بزرگوں نے اپنی زندگی کا اہم ترین فریضہ بنالیا تھا۔

علم نفسیات میں انسان کی تین کیفیات سے بحث کی جاتی ہے۔ ادراک، احساس اور عمل۔ ہر انسانی فعل، ادراک و احساس کی منزل سے گزرتا ہے۔ سماج اور حکومت، عمل پر مواخذہ کرتے ہیں۔ قانون کی کوئی دفعہ ادراک و احساس کی منزل پر جرائم کا احتساب نہیں کر سکتی۔ صوفیائے کرام کی اصلاح کا بنیادی طریقہ اور اصول یہ تھا کہ انسان کا عمل درست کرنے کیلئے ادراک و احساس کو درست کیا جائے ان کا کہنا تھا کہ ”برا فعل برا ہے لیکن برا خیال اس سے بھی برا ہے۔“ جسم کی جنابت پانی سے دور ہو جاتی ہے لیکن دل کی جنابت دور کرنے کیلئے یہ پانی کافی نہیں۔ وہ آنکھوں کے پانی سے دھلتی ہے اور نالہ ہائے نیم شبی سے اس کے اثرات محو ہوتے ہیں۔

انسان کی صحیح تربیت وہ ہے جو اس کے ادراک، احساس اور عمل کو درست کرے وہ صرف برے عمل ہی سے پرہیز نہ کرے بلکہ برے خیالات اور برے احساسات سے بھی بچے۔

انسان کی جن دو قوتوں کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بہیمی اور ملکوتی کا لقب دیا ہے۔ ان کو حضرت محبوب الہی نفس اور قلب سے تعبیر کرتے ہیں۔

ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ انسان کی کسی فکری یا ذہنی کیفیت کو زبردستی دور نہیں کیا جاسکتا۔ انسان کا جسم زنجیروں سے جکڑا جاسکتا ہے لیکن اس کے ذہن پر پہرے نہیں بٹھائے جاسکتے۔

برائی کو دور کرنے کا سب سے موثر طریقہ قلب کو بیدار کرنا ہے۔ جب قلب قوت حاصل کر لیتا ہے تو نفس کے تقاضے خود بخود خاموش ہو جاتے ہیں قلب صوفیائے کرام کے نزدیک کیا چیز ہے اور کس طرح بیدار ہو سکتا ہے۔ اجمالاً اس ضمن میں صوفیاء کے خیالات یہ تھے۔

۱۔ دل انوار ربانی کا محل ہے۔ معرفت حق اسی کے ذریعے ممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی کو اپنا دار الملک بتایا ہے اور فرمایا ”قلوب احبائى دار ملكى“ میرے محبوب بندوں کے دل میرا گھر ہیں۔ روح الارواح میں رسول پاک ﷺ کی ایک حدیث درج ہے کہ ”القلب بیت الله“ دل اللہ کا گھر ہے۔

۲۔ لیکن ہر انسان کا دل انوار ربانی کا محل نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دل کی مثال آئینہ کی سی ہے جب اس پر حجابات پڑ جاتے ہیں تو وہ نظارہ جمال کے قابل نہیں رہتا۔ (۷۶)

یہ باتیں تمہید آخریری کی ہیں کیونکہ صوفیائے کرام کا مقصد انسان کی اصلاح ہے یہاں اس باب سے بھی یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ صوفیائے کرام نے معاشی لحاظ سے انسان کی صحیح سمت کی طرف رہنمائی فرمائی ہے معاشی حوالے سے صوفیائے کرام نے تحریک مادیت اور اس کے اثرات کا انسداد کیا اور بنی نوع انسان کو بتایا کہ یہ نظام جہاں معاشی حوالے سے غیر موزوں ہے وہاں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جدا کرنے والا ہے۔ مذہب سے دوری سکھاتا ہے۔ صوفیائے کرام نے ہمیشہ استحصالی رجحانات کی نشاندہی کی ہے۔ اور مخلوق خدا کو درس دیا کہ ان سے دور رہو یہ نہ صرف آپ کی زندگی کیلئے ناسور ہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ناراضگی کا بھی باعث ہیں۔

انہوں نے کبھی مال دولت کو جمع نہیں کیا بلکہ جو بھی آیارہ خدا میں خرچ کر دیا یوں بھی سمجھئے کہ ان کی زکوٰۃ یہ نہیں کہ سو پڑھائی روپے دیں بلکہ جو بھی جیب میں ہے سب اللہ کی راہ میں دے دیا جائے مگر دوسروں کو زکوٰۃ و عشر صدقات واجبہ، و صدقات نافلہ وغیرہ دینے کا حکم دیا۔ دیگر رشتہ داروں اور لوگوں کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا تاکہ دولت ایک جگہ جمع نہ ہو بلکہ اسی سے Circulation ہوتی رہے اور یہی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔

ان اللہ کے نیک بندوں نے ہمیشہ سادگی کو پسند فرمایا اور دوسروں کو بھی سادگی سے جینے اور رہنے کا درس دیا۔ اور یہی منشاء خداوندی ہے کہ تعیش کی زندگی نہ صرف یہ کہ انسان کو ہزاروں پریشانیوں میں مبتلا کر دیتی ہے بلکہ مذہب اور اللہ و رسول ﷺ سے بھی دور کر دیتی ہے۔ صوفیائے کرام نے ہمیشہ فقر کی زندگی گزاری ہے اور اسی میں خوش رہے۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی فقر اختیار کرنا قبول فرمایا۔

اسی طرح ان مقدس ہستیوں نے خود بھی قناعت کفایت شعاری اور خود انحصاری پر عمل کیا اور دوسروں کو بھی اس

کا درس دیا۔

الغرض ان حضرات نے ہمیشہ اللہ اور اس کے رسول مقبول ﷺ کے بتائے ہوئے احکامات پر عمل کیا اور مخلوق خدا کی اس نیچ پر تربیت کی ہے۔

### تصوف کا موجودہ کردار:-

آج کے دور میں اسلامی تصوف کی بجائے غیر اسلامی تصوف کا دور دورہ ہے۔ جھوٹی اور بے سند پیری مریدی عام ہے جس نے مسلمانوں کے شیرازہ کو منتشر کر کے انہیں ذہنی پریشانی اور احساس کمتری میں مبتلا کر دیا ہے۔ جس طرح یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اکثر اولیاء اللہ نے اپنی روحانی طاقت اور علوم کے ذریعے سورج، چاند ستارے، آگ، ہوا، پانی اور کائنات کے ایک ایک ذرہ کو باذن اللہ مسخر کر کے روحانی طور پر خلق اللہ ہونے کا عملی ثبوت دیا ہے اور بہت سے حضرات نے حقیقت محمدی ﷺ کو پا کر دنیا کو علوم معرفت اور نور محمدی ﷺ سے منور کر دیا ہے اور عوام الناس کو ان علوم اور روحانی فیض سے مستفیض کیا ہے اسی طرح یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بہت سے نام نہاد اور جھوٹے پیروں اور مرشدوں نے عوام الناس کے بیشتر حصہ کو اپنی پیری مریدی کی آڑ میں من گھڑت اور خود ساختہ طور طریقوں پر ڈال کر قرآن و سنت کے بتلائے ہوئے صراط مستقیم سے بہت دور جا پھینکا ہے۔

آج اگر یہ صاف دل اور سادہ لوح مسلمان غیر شرعی حرکات کے مرتکب ہو کر شرک خفی و جلی میں مبتلا ہو گئے ہیں تو اس کی بھی وجہ یہی انسان نما ابلیس جھوٹے اور کذاب پیر اور ملنگ ہیں جو دراصل استدراج کے مالک ہیں۔ بظاہر مسمر یزم، پناٹزم، جادو اور ٹونگوں کے ذریعے سادہ لوح اور سادہ دل لوگوں کو شریعت اسلامی سے ہٹا کر اپنی طرف راغب کر لیتے ہیں۔ اور پھر خود ساختہ طور طریقوں کو عبادت کے نام سے رائج کر دیتے ہیں اور اس طرح لوگوں کو قرآن و سنت سے ہٹا کر ایسی بدعات میں مبتلا کر دیتے ہیں جو بظاہر تو اچھے کام نظر آویں لیکن حقیقت میں وہ قرآنی احکام سے غفلت میں ڈالنے والے ہوتے ہیں۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ وہ لوگ جو قرآن و سنت کے علاوہ ایسے طور طریقے رائج کر لیتے ہیں۔ جن کے باعث وہ لوگوں کو راہ حق سے ہٹا کر ان خود ساختہ راہوں پر ڈال لیتے ہیں جو مومنین کی مسلک کے خلاف ہوں تو ان پر اللہ ایک شیطان کو مسلط کر دیتا ہے۔ جو انہیں لہو و لعب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اور ان کو بھی مہلت دی جاتی ہے تاکہ چند دن اس دنیا کی رنگ رلیوں میں اپنا جی بہلا لیں مگر ان کا انجام جہنم ہی ہے جو بہت بری جگہ ہے۔

الغرض یہ لوگ خود تو غلط ہوتے ہیں اور ان کو بھی اپنے ساتھ گمراہ کرتے رہتے ہیں بقول شاعر

ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کسی منصب و ولایت کے مالک تو نہیں ہوتے مگر وہ اپنے اندر یہ تصور رکھتے ہیں کہ ہم صاحب ولایت اور منصب ہیں۔

بعض وہ لوگ ہیں جن کے باپ دادا تو اچھے پیر اور ولی اللہ گذرے ہیں لیکن وہ خود کسی ولایت و کرامت کے مالک نہیں ہوتے یا لوگ ان کی تعظیم، تعریف اور توقیر کر کے انہیں اوپر چڑھا دیتے ہیں۔ جن کے باعث وہ خواخواہ ”پدرم سلطان بود“ کی بھول بھلیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور باپ دادا کے نام پر پیری کو سنبھالے رہتے ہیں۔ پھر طرح طرح کی شعبہ بازیوں سے لوگوں کو اپنے گرد جمع کر رکھتے ہیں یا باپ دادوں کے قصے سنانا کر اپنی وقعت اور کبریائی جماتے اور روپے پیسے بٹورتے رہتے ہیں (۷۷)

## مسائل:-

اس جھوٹی اور بے سند پیری مریدی کی بدولت درج ذیل مسائل پیدا ہوئے ہیں۔

- 1:- غیر اسلامی عقائد کی بھرمار ہوئی۔
- 2:- غیر اسلامی تصورات اور افکار پیدا ہوئے ہیں۔
- 3:- یہ غیر اسلامی تصوف بنی نوع انسان کے لئے بمنزلہ ایون ثابت ہوا ہے۔
- 4:- یہ جھوٹا اور غیر اسلامی تصوف نے زندگی کے حقائق سے گریز کا درس دیا ہے۔
- 5:- اس قسم کے تصوف نے مسلمانوں کے قوائے عملی کو مردہ یا کم از کم ضعیف کر دیا ہے۔
- 6:- اس تصوف نے اباحت مطلقہ کا دروازہ کھول دیا ہے۔
- 7:- غیر اسلامی تصوف نے مشرکانہ عقائد کی اشاعت کی ہے۔

بلکہ مجھے کہنے دیجئے کہ غیر اسلامی تصوف وہ ہے جسے اس بوتل سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جس کے لیبل پر شربت

گلاب لکھا ہوا ہو مگر اندر عرق بھنگ و ایون بھرا ہوا ہو۔ (۷۸)

## اصلاحی تجاویز:-

کچھ عرصہ سے مسلمانوں میں تصوف کا صحیح معیار باقی نہ رہ سکا ہے۔ جس کے باعث ہر جھوٹے اور کذاب کو پیر بننے کا موقع مل گیا ہے۔ اور انہی جھوٹے اور کذاب لوگوں نے مسلمان معاشرہ کو شرک میں مبتلا کر دیا ہے۔

لہذا اس بے سند پیری مریدی اور غیر اسلامی تصوف کو ختم کرنے کے لئے مندرجہ ذیل تجاویز پر عمل کیا جائے تو اصلاح ہو سکتی ہے۔

1:- ہر وہ شخص جس کی زندگی قرآن اور سنت کے مطابق نہ ہو۔ اسے اس مسند پر بیٹھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ عوام الناس اس کا محاسبہ کریں۔ حکومت کو بھی چاہیے ایسے لوگوں کو جو اس مسند کے لائق نہیں ہیں اسکی گرفت کریں۔

2- جس شخص کو کسی کامل ولی سے رشد و ہدایت کی اس مسند پر کام کرنے اور بیعت کی اجازت نہ ہو اس کو اس مسند پر بیٹھنے کا کوئی حق نہیں ہے بلکہ اجازت کا ہونا ضروری ہے۔

3- اسلامی تصوف کی اصل غرض و غایت اور صحیح نصب العین دنیا کے سامنے واضح کر دیا جائے تاکہ سچے، اہل علم اور حقیقی صوفیوں کو دعوت و تبلیغ اسلام اور احیائے سنن اور اصلاح عالم کے عظیم کام پر دوبارہ لگایا جاسکے۔ تاکہ وہ اپنے عمل و کردار کو نمونہ بنا کر کشف و کرامات اور علوم ظاہری و باطنی سے غیر اسلامی ادیان پر دین حق کا اظہار کر کے اسلام کی حقانیت کو دنیا پر ثابت کر دیں۔ اور آب کوثر کے اس روحانی چشمہ فیض سے ساری دنیا کو مستفیض کر سکیں۔

4- حکومت وقت کامل صوفیائے کرام کی ایک مجلس شوریٰ قائم کرے تاکہ وہ ہر خانقاہ کے سجادہ نشین کو قرآن و سنت کے معیار پر پرکھے اور اس کو اس مسند پر کام کرنے کی اجازت دے۔

5- ایسے دارالعلوم بنائے جائیں جہاں قرآن و سنت اور فقہ کے علاوہ ہر چہار طریقوں کے اسباق بھی پڑھائے جائیں۔ اور ریاضتیں و مجاہدے کرائے جائیں۔ جب سالک تمام اسباق سلوک میں کامیاب ہو جائے۔ ریاضت اور مجاہدے، چلہ ہائے سلوک میں کامل ہو جائے تو اسے کسی علاقہ یا ملک کے لئے نامزد کر دیا جائے۔ اور اس کے تمام اخراجات حکومت وقت اپنے ذمہ لے تاکہ وہ عوام الناس کو لوٹے اور پیسے بٹورنے کی بجائے صحیح معنوں میں دعوت و تبلیغ الاسلام اور اظہار دین حق کا کام انجام دے سکے۔

6- پیری مریدی کے تمام خود ساختہ طور طریقوں کو بند کر دیا جائے جو قرآن و سنت کے خلاف اور اسلام کے نام پر بدنماداغ ہیں۔ (۷۹)

## تصوف کا از سر نو جائزہ لینے کی ضرورت :-

تصوف میں چونکہ انسانی فطرت کے بعض اہم تقاضوں کا جواب موجود ہے۔ اس لئے اس کی تاریخ میں نشیب و فراز کے ساتھ اس کا دور دورہ تو اسی طرح رہے گا۔ مگر موجودہ فضا کو روح عصر کی پذیرائی کیلئے علمی سطح پر تصوف کے خلاف ظنون و شکوک سے پاک کرنے کی ضرورت ہے تاکہ تہذیب و تمدن کے تقاضاء کے اس مرحلے پر سریت پسندی کے شوق



میں پڑھے لکھے لوگ جب تصوف کی طرف رجوع کریں تو وہ تصوف کے نظریہ و عمل کو معقول انداز میں سمجھ سکیں۔

اس مقصد کے پیش نظر تصوف کے خلاف متذکرہ بالا حلقوں کی طرف سے اٹھائے گئے اعتراضات کا اگر جواب لکھنے کی کوشش کی جائے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے بات شروع کی جائے اور کہاں تحریر و تقریر کو اس بارے میں کسی منطقی انجام تک پہنچایا جائے۔ اعتراضات کے طومار کا یہ حال ہے کہ اگر بیک وقت سب کا جواب لکھنے بیٹھیں تو عبادت میں ارتباط بھی مشکل سے قائم رہ سکتا ہے۔ اس لئے تصوف پر گفتگو کرتے ہوئے ان اعتراضات سے تو قطع نظر کیا جاسکتا ہے۔ جو کم علمی، غلط فہمی یا بدظنی کا نتیجہ ہیں مگر کچھ اعتراضات ایسے بنیادی نوعیت کے ہیں جن کا تعلق بنجیدہ علمی تحقیق سے ہے نیز ان کی نوعیت ان اعتراضات سے نسبتاً مختلف ہے جو فقہاء اور ظاہر پرست علماء کی طرف سے صوفیاء پر کئے جاتے رہے اور جن سے قدیم تذکرے بھرے پڑے ہیں۔

### قابل غور مسائل:-

ہر قسم کے اعتراضات زیر بحث لانے کی بجائے فی الحال یہ ضرور کیا جاسکتا ہے کہ تقاضائے وقت کے پیش نظر تصوف کے صرف ان مسائل پر بات کی جائے جو موجودہ فضا میں جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن میں الجھنیں پیدا کر سکتے ہیں۔

پڑھے لکھے لوگوں میں جو تصوف کا سطحی مطالعہ رکھتے ہیں بد عقیدگی کی یہ صورت پیدا ہوئی ہے کہ ان کے ذہن میں سریت (مسترزم) اور تصوف کا فرق واضح نہیں ہو پاتا۔ حالانکہ اس بات کے سمجھنے کیلئے کچھ زیادہ دقت نظر کی ضرورت نہیں۔ جس طرح مختلف مذاہب کے درمیان کچھ عناصر مشترک نظر آتے ہیں اسی طرح سریت اور تصوف میں بھی کچھ خصوصیات ایک جیسی یا ملتی جلتی ہیں بلکہ اس امر کو اگر یوں پیش کیا جائے تو بات زیادہ واضح ہو جائے گی کہ سریت عام ہے اور تصوف کی اصطلاح اسلام کے سری سلوک کے ساتھ مخصوص ہے بلکہ جیسا کہ تفصیلاً آگے ذکر آئے گا۔ تصوف اسلام کا ہی باطنی رخ ہے۔

کچھ لوگ جنہیں نفسیات سے دلچسپی ہے اور تصوف کے متعلق ان کی معلومات سنی سنائی باتوں تک محدود ہیں جب صوفیوں کی بعض مواجید اور ان کے بعض فوق العبادہ کاموں کو جنہیں عوام بغیر کسی تخصیص اور امتیاز کے کرامت کا نام دے دیتے ہیں پڑھتے یا سنتے ہیں تو ان کا خیال فوراً مسٹرزم، پیناٹرم اور ٹیلی پیٹھی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ صوفیوں کے تجربات کی صحیح نوعیت کو وہ سمجھ نہیں پاتے کہ خود تصوف کا مطالعہ کرنے کا شوق رکھتے ہیں نہ براہ راست صوفیوں کے حلقے میں کبھی بیٹھنے کا موقع پاتے ہیں اس لئے وہ صوفیوں کی تمام مواجید و کیفیات کو محض ایک قسم کے نفسیاتی تجربے خیال کرتے

ہیں۔

سُریت اور تصوف کا علمی ماخذ وجدان اور عقل کل ہے۔ وجدان پر اگرچہ بہت کچھ لکھا جا چکا ہے خاص طور پر جو لوگ اقبال کے افکار کو سنجیدگی سے دورانِ تعلیم یا اس کے بعد مطالعہ کرتے رہے ہیں ان کیلئے اس کا بیان کچھ نیا نہیں ہے۔ لیکن جیسا کہ محمد حسن عسکری مرحوم نے لکھا ہے اس امر کی عام طور پر وضاحت نہیں کی جاتی ہے کہ مغرب والے وجدان کو جبلت کی یہ ایک ترقی یافتہ صورت کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں جب کہ صوفیاء نے عقل کل اور بعض اوقات وسیع اور جامع مفہوم کے لئے ”عشق“ کی اصطلاح استعمال کی ہے جو صوفیاء کے روحانی تجربات کا سبب بنتی ہے۔ اگر وجدان کی اصطلاح پر اسرار کیا جائے تو پھر تصریح ضروری ہے کہ وجدان کا ایک مذہبی و روحانی رخ بھی ہے اور جہاں وجدان ایک لادینی ستری فلسفے کا ماخذ بن سکتا ہے اور بنا ہے وہاں اس کو اگر مذہبی و روحانی رخ کے مقابل کیا جائے تو یہ عقل کل سے جا ملتا ہے اور اس کے ذریعے الہیت کی معرفت کے دروازے کھلتے ہیں۔ اندر کی آنکھ بیدار اور روشن ہو جاتی ہے اور صوفیوں کے تجربات و مشاہدات قابل فہم نظر آتے ہیں۔

موجودہ دور کے متکلمین کے مباحث میں یہ غلط خیال بہت معروف ہے کہ تصوف کے منابع اسلام سے کہیں باہر ہیں (جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے۔ اس میں گزشتہ دور کے مستشرقین کی تحقیق خام کو بھی دخل ہے) اور بقول ان کے اس کے نظریات اور طریق عمل کو رواج اس وقت ہوا ہے جب عجمی لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام کی قبولیت کے باوجود وہ اپنے اپنے مذہب کے سری سلوک کو نہ چھوڑ سکا اور بالآخر ایران اور ہندوستان اور بعد ازاں عالم اسلام میں اس کا رواج عام ہو گیا۔ یہ مسئلہ اگرچہ بالکل نیا نہیں ہے لیکن اب کے صوفی مفکرین کے بعض افکار اور ان کے طرق کے بعض اطوار کو تجزیاتی اور تاریخی رنگ دے کر زیادہ زور سے بظاہر تحقیقی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پہلے اس رنگ میں جس قسم کے اعتراضات تھے وہ متشدد دین اور منکرین تصوف کو چھوڑ کر دیکھا جائے تو محض فروعات سے متعلق ہوتے تھے۔ مگر اب انہی باتوں کو ذرا بل دے کر ایسے پیش کیا جاتا ہے گویا تصوف میں سب کچھ باہر سے آیا ہے اور اسلامی تاریخ کے دائرہ سے باہر کہیں اس کی تہیں کھلی ہیں۔

تصوف کی بعض اصطلاحات بھی مادیت پرستی کے اس دور میں لوگوں کی سوچ میں کھٹکنے لگی ہیں۔ ترک دنیا، زہد و ریاضت، مخالفت نفس اور فنا و فقر وغیرہ کا مفہوم جو صوفیوں کے نزدیک متعین تھا، نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اور ان کے لغوی مفہوم کو سامنے رکھ کر کبھی انہیں غیر انسانی کہا جاتا ہے۔ اور کبھی انہیں غیر اسلامی سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ سب سے زیادہ صوفیوں کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی اصطلاحات کی وضاحت کریں اور ان کی وضاحت بارہا کی گئی ہے لیکن فنا

جیسی قوت بخش روحانی کیفیت کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ یہ ان کی انا کی یا خودی کی موت ہے اور اس کے کردار کی انفرادیت و طاقت ختم ہو جاتی ہے یا جماعت کی سطح پر بے عملی کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی حال دوسری اصطلاحات کا ہے۔ یہ سب کسی زمانے میں مومن کے کردار کی تعمیر اور تکمیل کے بیان میں عام استعمال ہوتی تھیں اور ان سے کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہوتی تھی مگر اب ان کی تاویل محض مسئلے کو الجھانے کیلئے صوفیوں کی تشریحات سے ہٹ کر اپنے طور پر کی جاتی ہے اور اپنے اعتراضات کو تقویت دینے کیلئے بعض منکرین تصوف بار بار انہیں دہراتے نظر آتے ہیں۔ تصوف کی مخالفت کرتے ہوئے یہ خدشہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ اس سے باطن کی طرف رخ مڑ جائے گا۔ اور ظاہری مادی ترقی رک جائے گی لیکن یہ بات فراموش کر دی جاتی ہے کہ تصوف تو ظاہر کی حفاظت کیلئے اور مادی نظام کے توازن کیلئے خاص اہمیت رکھتا ہے ورنہ باطن کو نظر انداز کر کے محض ظاہری ترقی کا نتیجہ تو وہی ہوتا ہے جو مغرب میں ظاہر ہوا ہے، اخلاق فاسد ہوئے اور زندگی کے ہر شعبے میں کجی یا گمراہی کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا ہو گئی۔

اسی کے ساتھ تصوف کے بعض اداروں کے خلاف کد محسوس کی جاتی ہے۔ پرانے ظاہر پسند علماء صوفیوں کی خانقاہوں اور زادیوں کو شریک کا ذمہ دار ٹھراتے تھے اور موجودہ دور کے متکلمین انہیں بیکار اور مذہبی جذبات کے استحصال کے مراکز خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ خانقاہ یا زاویہ ایسی جگہ ہوتی ہے۔ جہاں مسجد، لنگر خانہ، مدرسہ ذکر الہی کے کیلئے خلوت گاہ، اعلیٰ روحانی تعلیم کیلئے مرشد اور صحبت روحانی کیلئے درویش سب موجود ہوتے ہیں ممکن ہے کہ بعض خانقاہیں یہ سب لوازمات نہ رکھتی ہوں یا پرانی روایت کے مطابق کام نہ کر رہی ہوں مگر اس بناء پر ان کو رد تو نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی اصطلاح ہو سکتی ہے اور ان سے وہی کام لیا جاسکتا ہے جو پہلے کبھی لیا جاتا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا گیا یہ ایک بڑی عجیب سی صورت حال ہے کہ تصوف پر لکھنے یا بولنے کی کوشش کی جائے تو پتہ نہیں چلتا کہ کہاں سے بات شروع کی جائے۔ تصوف کی اصطلاح اور اس کی تعریف سے لے کر اس کے مہتممائے مقصود تک اعتراضات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو مختلف الخیال لوگوں یا گروہوں کی طرف سے تصوف کے خلاف تقریر میں ملتا ہے اس لئے تصوف پر عمومی نقطہ نظر سے لکھنے کیلئے بھی بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ اور نہایت سنجیدگی سے سوچنا پڑتا ہے کہ کن کن مسائل کا ذکر کیا جائے۔ بہر صورت متذکرہ بالا سطور میں جدید دور کے پڑھے لکھے لوگوں کے ذہنوں میں جو مسائل تصوف کے بارے میں پیدا ہو رہے ہیں۔ انہیں مختصر بیان کر دیا گیا ہے ان میں سے بعض کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور پڑھے لکھے متین طبقے میں یہ امر تسلیم کیا جا چکا ہے کہ تصوف کے ماخذ قرآن و سنت ہیں۔ اسی کام کو آگے بڑھانے کیلئے آئندہ صفحات یہ بعض اہم مسائل کو کہیں الگ عنوان کے ساتھ اور کہیں ضمناً بیان کی سعی کی گئی ہے

تاکہ بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جاسکے یا جدید دور میں تصوف کے بارے میں ذہنوں میں جواشکال پیدا ہو گئے ہیں ان کو

دور کیا جاسکے۔ (۸۵)

## روحانی تجربات اور مختلف طریقے:-

تصوف میں سلوک روحانی تربیت کا نصاب ہے۔ خواہر دین یعنی فقہ، حدیث اور تفسیر وغیرہ کی تعلیم کے بعد سالکین اس کے مطابق تربیت حاصل کرتے ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ یہ بہت ہی ذہین لوگ ہوتے ہیں۔ مشائخ طریقت میں یہ بات پائی گئی ہے کہ ان میں سے اکثر نے دس برس سے بھی کم عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ اور پندرہ برس کے عمر میں علوم متداولہ میں تعلیم مکمل کر لی تھی۔ اس کے بعد وہ لوگ تصوف اور اس کے سلوک کی طرف متوجہ ہوئے تو ان کے ذہنی و روحانی ارتقاء کی دلیل تھی۔ بعض مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں کئی اولیاء اللہ ظاہری علوم سے بے بہرہ ہیں یا متوسط قسم کی تعلیم پا کر سلوک میں تربیت پاتے رہے۔ ان پر بھی خدا کا یہ فضل ہوا کہ ان کا نور بصیرت انہیں شرعی احکام کی پاسداری سے بے بہرہ نہیں رہنے دیتا تھا۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو چونکہ لوگ طباع اور استعداد میں مختلف ہیں۔ اس لئے ان کے نصاب بھی مختلف ہو گئے سلوک کے مختلف طریقے دراصل نہ صرف مختلف ہم طبع و ہم لیاقت لوگوں کی تربیت کیلئے الگ الگ جاری ہوئے بلکہ ان کے اجراء و نقاد میں زمانے کے تقاضوں کا دخل بھی تھا۔ جن کا ذکر آگے آتا ہے اس لئے سلوک میں ایک کی دوسرے پر فضیلت کی بھی کوئی وجہ نہیں۔ نتیجہ و انجام کے لحاظ سے آخر میں سب خدمت میں بیعت کے لئے حاضر ہوا مگر انہوں نے اس سے کہہ دیا مگر تمہارا حصہ یا نصیب یہاں نہیں ہے تم فلاں بزرگ کے پاس جا کر فیض پاؤ۔ یہ کسی اور کے پاس بھیجنا اس لئے تاکہ اس کی تربیت دوسری جگہ اس کے مزاج اور اہلیت و استعداد کے مطابق بہتر طور پر سرانجام پاسکتی تھی۔

پھر اپنے اپنے طریقے میں سالکین کے سلوک اور روحانی تجربات کی نوعیت عام طور پر ایک جیسی ہوتی ہے مثلاً نقشبندی سلوک میں جسم میں شعور کے چھ مراکز (لطائف ستہ) پر توجہ کرا کر مختلف انوار کی سیر کراتے ہوئے سالک کو آگے لے جاتے ہیں۔

چشتیہ سلوک میں ذکر، سماع اور دیگر ریاضتوں سے گزار کر رہنمائی کرتے ہیں بعض مشائخ نے طویل عرصے کی تربیت کیلئے منازل مقرر کیں۔ جیسے وحشت، غیرت، شہوت اور حیرت کی منزلیں۔ آزمائش اور امتحان کے بعد سالک ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ خلفاء کے لیے تربیت کا یہ عرصہ کئی سالوں پہ محیط ہوتا ہے۔ کبھی مرشد مرید کو چار درجوں سے گزار کر حقیقت کے مرتبہ تک پہنچا دیتا ہے، پہلا درجہ ناسوت ہے۔ ناسوت سے مراد یہ دنیا

ہے۔ اس میں شریعت پر مکمل عمل کے بعد سالک اگلے مرتبہ ملکوت کی طرف بڑھتا ہے۔ یہاں فرشتوں جیسے خصائل یعنی طہارت، عبادت اور پارسائی میں پختگی حاصل کی جاتی ہے۔ اگلا مرتبہ جبروت ہے جس میں قوت و معرفت عطا ہوتی ہے۔ اور چوتھا مرتبہ لاہوت ہے، یہاں سالک میں الہی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں یا وہ الہی اخلاق میں جذبہ ہو جاتا ہے اور حقیقت کو پالیتا ہے۔ قدماء میں سے بعض نے چار مراحل تجویز کئے ہیں جیسے:

اول: سفر اللہ۔ یعنی بندے کا گناہوں سے توبہ کے بعد علم اور عبادت میں مصروف ہو جانا۔

دوم: سفر الی اللہ: یعنی بندے کا اس اسم کی معرفت حاصل کرنا جو اس کا ہے یا جس جس کا وہ مظہر ہے۔ یہ معرفت متعلقہ اسم کے ذکر سے حاصل ہوتی ہے۔

سوم: سفر اللہ۔ یہ عروج کے بعد نزول کا مقام ہے۔ جب سال الہی صفات سے متصف ہو کر تدریس و تبلیغ میں مصروف ہوتا یا اپنے طریقے کا فیض دوسروں تک منتقل کرتا ہے۔

چہارم: سفر فی اللہ۔ یہ بقا کا مقام ہے یعنی اپنے متعلقہ اسم اور اس کی صفات میں استقامت۔ یہ اس بندے کا گویا مقام محمود ہے جو اس کے ازل سے مقدر تھا۔

شیخ الاکبر محمد الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے تمام تعینات و تنزیلات یا کثرت سے گزر کر وحدت و احدیت تک پہنچنے کا سلوک پیش کیا ہے۔ اس کیلئے الگ اذکار اور مراقبات ہیں۔

غرضیکہ طرق کے بانی مشائخ کبار کے ہاں نصاب میں یہ اختلاف ضرور ملتا ہے اس طرح ہر طریقے کی دعائیں، اذکار اور ادو وظائف بھی مخصوص ہیں۔ (ادعیۃ الرسول ﷺ یا ادعیۃ القرآن سب میں عام ہیں البتہ تربیت ان کی بھی مختلف ہو سکتی ہے) ان اور ادو وظائف کے ثمرات متعلقہ طریقوں کے نتائج تعلیم کے کسی اور رد یا وظیفے میں دلچسپی نہ لینی چاہئے کہ اس طریقے کے مخصوص ذوق کی تشکیل میں یہ خارج بھی ہو سکتی ہے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے جن کے ظرف علم میں بہت کشادہ ہوتے ہیں یا عشق میں وارفتگی کی حدود چھوڑے ہوتے ہیں۔ وہ پھر کسی ایک طریقے کے پابند نہیں رہتے۔ ان کا اخلاص اور ان کا شوق انہیں ہر چشمے پر لے جاتا ہے۔ اور وہ ہر گھاٹ کا پانی پیتے ہیں۔ انہیں تصوف میں عام طور پر قلندر کہا جاتا ہے۔ اپنے اپنے سلوک کا ہر منتہی بھی ایک لحاظ سے قلندر ہو جاتا ہے کہ اب وہ دوسرے طرق کے سلوک سے فیض یاب ہونے میں آزاد ہوتا ہے۔

کوئی بھی سلوک ہو اس کا منتہا مقصود قرب و رویت الہی ہے۔ جن سالک انوار الہی کو دیکھتا ہے تو زبان ان کے بیان سے قاصر رہ جاتی ہے۔ اس وقت اس پر صحیح معنوں میں نبی کے علم کی حقیقت کھلتی ہے۔

## عصر جدید میں ترمیم سلوک کی ضرورت :-

اس موقع پر زمانے کے حالات کے مطابق سلوک میں تبدیلی کی طرف اشارہ ذکر کرنا ناگزیر ہے۔ بیان کیا جا چکا ہے کہ طرق میں اختلاف لوگوں کی استعداد اور زمانے کی مقتضیات کی وجہ سے پیدا ہوا۔ چنانچہ اس دور میں بھی مشائخ نے سب سے زیادہ عملی سلوک میں نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی ہے۔ کیونکہ شرعی احکام کی صورتوں کو استحکام کا شرف حاصل ہوتا ہے لیکن تصوف کے عملی شعبہ میں ضرورت اور حالات کے تحت ترمیم و تنسیخ کا عمل جاری رہتا ہے۔ اس کی مثال علم طب کی سی ہے۔ جس کی غرض و غایت یا افادیت انسان کی صحت و تندرستی ہے مگر نئی نئی بیماریوں اور دوائیوں کی ایجاد و دریافت کی بناء پر علاج و پرہیز کے طریقے بدلتے رہتے ہیں۔ اسی طرح تصوف میں مقصد محبت و معرفت الہی ہے مگر اس کے حصول کیلئے مشائخ اپنے علم اور اجتہاد کی بدولت وقتاً فوقتاً سلوک میں ترمیم کو لازم جانتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں حالات بہت بدل گئے ہیں۔ زمانے کے تقاضے اور ہیں اور اس کے ساتھ لوگوں کی طبائع اور استعداد میں بھی فرق آ گیا ہے، اس لئے سلوک بھی ان کے مناسب حال ہونا چاہئے۔ صوفیاء کرام کیلئے یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہر زمانے میں ایسا ہوتا رہا ہے جیسے ابتدائی دور میں قلوب پر خشیت الہی کا تسلط زیادہ تھا، تو محض ریاضیات شاقہ اور مجاہدہ کو اہمیت دی گئی تھی۔ بعد ازاں امام غزالیؒ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، اور شیخ اکبر مکی الدین ابن العربی رحمۃ اللہ علیہم نے علوم و معارف کے دروازے کھول دیئے۔ ان کی تحصیل ضروری قرار پائی۔ یہ گویا تصوف میں فکر و ادراک کا دور تھا۔ پھر ایک دور آیا کہ حضرت خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ نے جذبے کو سلوک پر مقدم کیا تا کہ سالک کیلئے آسانی رواہ پیدا ہوں

ہندوستان میں سماع کے ذریعہ خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خلفاء نے اہل ہند کے مزاج کا رخ بدلا اور سلوک میں سوز و ساز اور ذوق و شوق کا رنگ گہرا کر دیا۔ زمانے کے تقاضے بدلے تو مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے تمام ذوق و شوق کو باطن کی طرف مائل کرنے کی تعلیم دی۔ آپ نے لطائف ستہ میں لطیفہ لقب سے ابتداء کی اور مراقبات کے ذریعہ دوار کی سیر کر کے سلوک کی تکمیل کرائی۔ ظاہر ہے کہ صوفیاء اپنے طرق میں کبھی پہلے متشدد رہے ہیں نہ اب ہیں۔ عصر جدید میں لوگوں کی چال ڈھال، رہن سہن اور فکر و احساس کے طریقوں اور رویوں میں اس قدر انقلاب آیا کہ ارباب علم و معرفت کو تعلیم و تلقین کے طریقے بدلنے پڑ گئے اور محفل تصوف بھی ان حضرات سے خالی ہونے لگی جو پرانے طریقوں کا عالم و عامل یا معلم و مربی تھے۔ اس صدی کے شروع سالوں میں مولوی محمد حسن بجنوری نے مشائخ نقشبندیہ مجددیہ کے ضخیم تذکرہ کے آخر میں طریقہ کے مراقبات اور سیر دوار کے بیان کے بعد لکھا تھا:

”.....مگر واضح ہو کہ ان مقامات عالیہ پر بلا توجہ پیر کامل مکمل کہ جس نے تفصیلاً (یہ مقامات) حاصل نہ کئے ہوں پہنچنا محال ہے۔ اور افسوس کہ اس وقت ایسے بزرگوار النادر کمعدوم کا حکم رکھتے ہیں اور جوشناژ و نادر تھے۔ ان سے بھی زمانہ روز بروز خالی ہوتا جاتا ہے۔ اور قریب ہے کہ تسلیک مقامات مجددیہ مسدود ہو جائے۔

یہ خدشہ اس لئے باعث تشویش تھا کہ حالات و واقعات نے زمانے کی طبیعت تغیر پیا کر چکے تھے اور اب تصوف کے دائرے میں بھی تبدیلی کی ضرورت تھی۔ خدشات تو اپنی جگہ صحیح ہوتے ہیں مگر وہ اللہ تعالیٰ کی اس سنت کی بھی نشاندہی کر رہے ہوتے ہیں کہ جب ایک دروازہ بند ہوتا ہے۔ تو اس کی رحمت کئی دوسرے دروازے کھول دیتی ہے۔ غرض و غایت اللہ کی محبت و معرفت میں کمال ہے خواہ وہ اپنی حدود میں کسی طرح سے اور کسی طریق سے حاصل ہو۔

اب اس صدی کی اختتام تک تو حالات بالکل بدل چکے ہیں لیکن صوفیاء کرام نے سلوک میں تبدیلیوں کی ضرورت پہلے سے محسوس کر لی تھی۔ چنانچہ عرصہ ہوا کہ مشائخ کرام نے اپنے سلوک کے نصاب کو از سر نو مرتب کرنے کی طرح ڈال دی تھی۔ انہوں نے طویل مراقبات اور اوراد کثیر کو خارج کر کے صرف ان دعاؤں اور مراقبوں کو باقی رکھا۔ جو سلوک کے دوسرے اجزاء کے ساتھ مناسبت رکھتے تھے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ فرصت قلیل ہو گئی ہے علم کی کثرت ہے اور لوگوں میں تذبذب، تشکیک اور بد عقیدگی کا دور دورہ ہے اس لئے انہوں نے ایسی راہ اختیار کی۔ جس سے مقصود تک رسائی اور یافت میں آسانی ہو۔

### جدید دور میں مشائخ کا طریق عمل:-

فقیر نے دیکھا ہے کہ اس دور کے مشائخ کرام خواہ وہ کسی بھی روایتی طریق کے متولین میں سے ہوں عام طور پر ایک سا طریقہ تعلیم و تلقین استعمال کر رہے ہیں۔ مثلاً صاحب وقت اور باہمت مشائخ سب سے پہلے توجہ کے ذریعے طالب کے اندر جذبہ کو بیدار کرتے ہیں۔ جذبہ کے ساتھ ادراک کا حاسہ باطنی بھی بیدار ہو جاتا ہے۔ سالک روحانی تجربات سے مستفیض ہو جاتا ہے۔ تشکیک دور ہونے لگتی ہے۔ معرفت کیلئے فہم کھل جاتا ہے اور اس دوران میں صرف وہی اذکار و اوراد تلقین کئے جاتے ہیں جو احوال و کیفیات میں استقامت کے لئے مُمد و معاون ہوتے ہیں۔ اگر مراقبات تجویز کئے جاتے ہیں تو وہ بہت سادہ اور آسان ہوتے ہیں کہ ان سے کشف کیلئے راہ کھلتی ہے اور تشکیک سے نجات ملتی ہے۔

اس دور میں علم کی بڑی کثرت ہے مگر علم میں بے راہ روی بھی اتنی ہی عام ہے جو جہالت سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ اس دور میں اگر کوئی شیخ اپنے پاس کسی آنے والے کے خیال و رجحان کو اپنی فکر، توجہ، سخن، عملی نمونہ یا

اشارات علمی کے ذریعے نیکی اور تقویٰ کے رُخ پر لے آتا ہے تو یہ ایک کارِ عظیم ہے۔

مشائخ کے لئے اب صرف قدیم نصاب سے واقفیت کافی نہیں رہی۔ شیخ کے لئے اب ضروری ہے کہ وہ عالم ہو اور متقی ہو اور صحیح معنوں میں باطن کا معلم ہو۔ جیسا کہ وہ اس دور کے آدمی کو متاثر کر سکے گا۔ اس دور کے شیخ کو معلوم ہونا چاہیے کہ نفسیات کہاں ختم ہوتی ہے؟ اور روحانیت کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ دوسرے مذہب کے سری سلوک کی حدود قیود کیا ہیں؟ اور تصوف میں سلوک کہاں سے شروع ہو کر کہاں تک پہنچتا اور پہنچاتا ہے؟ اس دور میں بقول کسے لوگوں کی زبانیں کھل گئی ہیں لیکن کان اور آنکھ اور دل بند ہیں۔ ضروری نہیں کہ شیخ ہر شخص کے اعتراضات کا جواب دینے میں بیٹھ جائے لیکن اس قدر لازم ہے کہ وہ طالب کے گمان اور شک کو رفع کرے اور سمع و بصر و قلب کے دروازے کھول دے۔ کیونکہ جب تک کوئی دیکھتا، سنتا اور محسوس نہیں کرتا ہے۔ دل سے اسے مان نہیں سکتا۔ چنانچہ آج کل مشائخ کرام سے پہلے جذبہ و وجدان کو ہی انگینت کرتے ہیں۔ طالب کے روحانی تجربات، رویاء اور اس کی واردات و کیفیات کو سمجھتے اور سمجھاتے ہیں اور یوں روحانی شعور کو ترقی دے کر راہ پر ڈال دیتے ہیں۔ اس طرح محبت و معرفت سے اس کا ایمان قوی ہوتا جاتا ہے اور بہت جلد وہ احسان کے بلند مرتبہ تک جا پہنچتا ہے جہاں وہ دیکھ کر عبادت کرتا اور اللہ کے قریب میں ترقی پاتا ہے۔

## حوائجِ عالم

فرمانِ مہرِ عالم: "میرزا یحییٰ خان کمالی نے بعض اوقات عصر حاضر کے مسائل کو پیش نظر رکھ کر 'مطبوعہ حیات' میں

۱۳۰۲

لاہور میں شائع کیا۔

میرزا یحییٰ خان کمالی نے 'مطبوعہ حیات' میں شائع کیا۔

افغانی کے تحت 'مطبوعہ اسلام' میں شائع کیا۔

الرحمن (کشمیر) ۱۳۰۲ (مجلد ۱)



## حوالہ جات

### باب ششم

- ۱ قریشی، حسین احمد، مولانا شاہ ولی اللہ کا نظریہ معیشت اور عصر ص: ۳۴  
حاضر میں اس کی افادیت  
مطبوعہ: ہاجہ حنیف اینڈ سنز لاہور  
۲۰۰۳ء
- ۲ سیوہاروی، حفظ الرحمن، مولانا اسلام کا اقتصادی نظام ص: ۳۴-۳۵  
ناشر، مکتبہ امدادیہ ملتان
- ۳ القرآن الحکیم ۲ (البقرہ) ۲۰۱
- ۴ افغانی، دین محمد، مولانا تجدید الاسلام ص: ۱۸۲-۱۹۶  
مطبوعہ اسلامیہ پریس کوئٹہ
- ۵ عبد الرحمن، منشی مضطرب صدائیں مطبوعہ: اسلامی ص: ۴۵-۴۰  
ادارہ نشر و اشاعت ملتان
- ۶ القرآن الحکیم ۱۶ (النحل) ۹۰
- ۷ القرآن الحکیم ۷ (الاعراف) ۵۶
- ۸ ابن ماجہ، محمد بن یزید، ابو عبد اللہ، اقزوبنی سنن ابن ماجہ ج: ۱، ص: ۵۶
- ۹ غزالی، محمد، امام کیمائے سعادت ناشر مدینہ پبلشنگ ص: ۱۹۰-۲۹۴  
کمپنی۔ ایم اے جناح روڈ کراچی
- ۱۰ القرآن الحکیم ۳۲ (السجده) ۷
- ۱۱ القرآن الحکیم ۲ (البقرہ) ۱۹۵
- ۱۲ القرآن الحکیم ۷ (الاعراف) ۵۶

۵۵ (الرحمن) ۶۰	القرآن الحکیم	۱۳
۱۷ (بنی اسرائیل) ۷	القرآن الحکیم	۱۴
۳۱ (لقمان) ۲۲	القرآن الحکیم	۱۵
۲۷ (نمل) ۳۰	القرآن الحکیم	۱۶
۶ (الانعام) ۱۶۰	القرآن الحکیم	۱۷
۲۷ (نمل) ۸۹	القرآن الحکیم	۱۸
ص: ۱۹۵-۱۹۳	بھٹی، ظہیر الدین، محمد	۱۹
اسلام کا دستور حیات - مطبع مکتبہ		
جدید پریس لاہور ۱۹۹۵ء		
۵۹ (حشر) ۹	القرآن الحکیم	۲۰
ص: ۲۰۱	الحديث بحوالہ عوارف المعارف مؤلفہ سہروردی، شہاب الدین	۲۱
ج: ۲، ص: ۲۰۱	العجلونی، الحافظ، الامام	۲۲
۲۵ (جاثیہ) ۱۳	کشف الخفاء	۲۳
ص: ۲۰۲	القرآن الحکیم	۲۴
۵۹ (حشر) ۹	سہروردی، شہاب الدین، شیخ	۲۵
ص: ۲۴	القرآن الحکیم	۲۶
۵۹ (حشر) ۸	دہلوی، مجددی، شاہ ولی اللہ، محدث	۲۷
ص: ۳۲۹-۳۳۰	القرآن الحکیم	۲۸
ص: ۴۰۰	غزالی، محمد امام	۲۹
ص: ۴۰۳-۴۰۰	الحديث بحوالہ عوارف المعارف	۳۰
	سہروردی، شہاب الدین، شیخ	
	عوارف المعارف	

۵۹ (الحشر) ۷	۳۱ القرآن الحکیم
۲ (البقرہ) ۸، ۴	۳۲ القرآن الحکیم
۱۵۵-۱۵۶ ص اسلام اور جدید ذہن کے شبہات	۳۳ محمد قطب
۱۴۴ ص شاہ ولی اللہ کا نظریہ معیشت اور عصر	۳۴ قریشی، حسین محمد، مولانا
حاضر میں اس کی افادیت	
۶۰-۷۵ ص تقابل ادیان زادیہ پر نثر زار و بازار لاہور	۳۵ محمد سرور
	۳۶ القرآن الحکیم
۸۴-۸۶ ص کشف المحجوب ناشر پبلشنگ کمپنی لاہور	۳۷ بجوری، علی بن عثمان، سید
۲۶۳-۲۶۴ ص رسالہ قشیریہ: مترجم ڈاکٹر پیر محمد حسین	۳۸ قشیری، ابوالقاسم، امام،
ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد	
	۳۹ القرآن الحکیم
	۴۰ القرآن الحکیم
۱۵۶-۱۵۸ ص اسلام اور جدید ذہن کے شبہات	۴۱ محمد قطب
۲۵۳ ص مشکوٰۃ المصابیح کتاب الزکوٰۃ	۴۲ ولی الدین، محمد بن عبد اللہ، ابو عبد اللہ، الخطیب
ج: ۶، حدیث نمبر ۱۳۳۴	۴۳ علی، المتقی، الحنفی،
ج: ۲، ص: ۳۵۶	۴۴ العجلونی، الحنفی، الحافظ
	کفر العمال
	کشف الخفاء

۳۵	قریشی، حسین محمد	شاہ ولی اللہ کا نظریہ معیشت اور عصر حاضر میں اس کی افادیت	ص: ۳۵-۳۰
۴۶	الحديث بحوالہ ریاض الصالحین		ص: ۳۲۸
۴۷	خان، وحید الدین، مولانا	دین کامل	ص: ۳۱۱-۳۱۳
۴۸	نسائی، احمد بن شعیب، الحافظ، جلال الدین	سنن نسائی	ج: ۲، ص: ۳۲۱
۴۹	قریشی، حسین، محمد، مولانا	شاہ ولی اللہ کا نظریہ معیشت اور عصر حاضر میں اس کی افادیت	ص: ۴۵-۱۴۴
۵۰	نعمانی، شبلی	سیرۃ النبی	ص: ۱۵۴-۱۵۳
۵۱	ایضاً		ص: ۱۷۴-۱۷۱
۵۲	Introduction of Georec Salies Translation	At The Quran New York America	P VII
۵۳	القرآن الحکیم		۱۰۲ (التکاثر) ۸
۵۴	بخاری، محمد بن اسماعیل، ابو عبد اللہ، امام	الجامع الصحیح: داد الفکر بیروت	ص: ۳۳۵
۵۵	القرآن الحکیم		۱۷ (بنی اسرائیل) ۲۹
۵۶	القرآن الحکیم		۱۷ (بنی اسرائیل) ۲۹
۵۷	علی، الممتقی، الحنفی، الہندی	کنز العمال	ج: ۲، حدیث نمبر ۱۱۷۲۵

ج: ٢، ص: ٣٣٥	الجامع الصحيح	البخاري، محمد بن اسماعيل، ابو عبد الله، امام	٥٨
ص: ٣٥١	مشکوٰۃ المصابيح باب الصدقة	ولي الدين، محمد بن عبد الله، ابو عبد الله، الخطيب	٥٩
ص: ٢٢٣		رواه زرين بسند صحيح	٦٠
٤ (الاعراف) ٣١		القرآن الحكيم	٦١
١٤ (بنی اسرائیل) ٢٤-٦		القرآن الحكيم	٦٢
ص: ٣٣٦-٣٣٢	رساله قشيره	القشيري، ابو القاسم، امام	٦٣
١٦ (أنمل) ٩٤		القرآن الحكيم	٦٤
ص: ٣٣٣		الحديث بحواله رساله قشيره	٦٥
٣٢٤		الرساله القشيره	٦٦
٢٢ (الحج) ٥٨		القرآن الحكيم	٦٧
ص: ٤٣-٤١	تاريخ مشايخ چشت	نظامي، خليل احمد، چشتي	٦٨
		القرآن الحكيم	٦٩
ج: ٢، ص: ١٤٥	سنن الجامع باب الكفاية	الترمذي، محمد بن عيسى بن سورة، ابو عيسى	٧٠
ص: ٢١١	سنن الكبرى	البهقي، الامام	٧١

ص: ۲۲۱	جامع الصغير	۷۲	السيوطي، الحافظ، الامام
ص: ۲۲۸	السنن ابوداود كتاب التنازع	۷۳	ابوداود، سليمان بن اشعث، بختاني
ص: ۳۳۲-۳۵	عوارف المعارف	۷۴	سهروردي، شهاب الدين، شيخ
ص: ۵۴	تاريخ مشايخ چشت	۷۵	نظامي، خلیق احمد، چشتي، پروفیسر
۱۹۳			
۱۵۲			
ص: ۲۹۰-۹۱	رابطه شيخ مطيع جنگ پبليشرز	۷۶	نقشبندی، عبداللطيف، پير
ص: ۳۹-۴۴	تجديد الاسلام	۷۷	افغاني، دين محمد، مولانا
ص: ۱۰۰-۱۰۱	تاريخ تصوف	۷۸	چشتي، يوسف سليم، پروفیسر
ص: ۴۴-۴۵	تجديد الاسلام	۷۹	افغاني، دين محمد، مولانا
ص: ۱۰۱-۱۰۳	تاريخ تصوف	۸۰	چشتي، يوسف سليم، پروفیسر
ص: ۴۰-۴۵	مقالات تصوف	۸۱	سمنگلي، محمد اسماعيل

# باب ہفتم

موجودہ سائنسی و تکنیکی حالات کے تناظر میں  
انسان کے کردار کی تشکیل اور تصوف

## ”موجودہ سائنسی و تکنیکی حالات کے تناظر میں انسانی کردار کی تشکیل اور تصوف“

تاریخ اقوام عالم اس بات پر شاہد ہے کہ بلند اخلاق کے بغیر نہ صرف یہ کہ کسی قوم کا اقوام عالم کی امامت و قیادت کو اپنے ہاتھ میں لینا محال ہے بلکہ اخلاق رذیلہ کے باعث اس کا امامت و قیادت کے منصب سے بیک بینی و دوگوش ہٹائے جانا بھی اٹل ہے۔ غرض یہ کہ قوموں کے عروج و زوال کا دار و مدار ان کے اخلاق پر ہے۔

لیکن اس تاریخی حقیقت کے باوجود ہم دیکھ رہے ہیں کہ قوموں کا اخلاق دن بدن گرتا چلا جا رہا ہے بد اخلاقی کا طوفان روز افزوں ترقی پر ہے۔ غنڈہ گردی، فسق و فجور، زنا کاری، شراب خوری، رشوت ستانی اور طرح طرح کی حرام خوری کا بازار گرم سے گرم تر ہوتا جا رہا ہے۔ بے غیرتی اور کمینگی عام ہو رہی ہے اور ہو چکی ہے جا بجا بد معاشی کے اڈے کھلے ہوئے ہیں۔ قتل و غارت کے واقعات ترقی پر ہیں، جعل سازی اور چوری سے عوام الناس پر آئے دن تباہی آرہی ہے۔ اغوا، لوٹ مار اور مسلح ڈکیتیوں کی داستانوں سے روزانہ کے اخبارات بھر پور نظر آتے ہیں۔

عدالتوں میں مقدمات بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ دیکھو کی تعداد میں روز بروز اضافے کے باوجود ان کی فرصت کے اوقات کم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ جیلوں میں قیدیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

ان سب سے بڑھ کر جو بات باعث صد پریشانی بنتی جا رہی ہے وہ ان جرائم کی بدولت جنسی بیماریوں کا روز افزوں اضافہ ہونا ہے۔ اقوام عالم کے تمام ڈاکٹروں اور ماہر امراض حیدشہ کا یہ متفقہ اور متحدہ فیصلہ ہے کہ سوزاک، آتشک اور تپ دق جیسی مہلک بیماریوں کی پیداوار کی اصل وجہ معاشرے میں زنا کاری، شراب خوری اور اس قسم کی دوسری بد اخلاقیوں ہیں۔ جو قوم ان بد اخلاقیوں سے پاک ہو کر عمدہ اور احسن اخلاق کو اپنالیتی ہے۔ وہی کامیاب اور کامران اور پرسکون زندگی گزارتی ہے۔ (۱)

جدید انسان ایک عجیب مشکل (Dilemma) سے دوچار ہے۔ اس کے پاس ٹیکنالوجی ہے مگر اس کے پاس فلسفہ حیات نہیں۔ اس کے پاس جسمانی سفر کے لیے مشین ہے مگر اس کے پاس روحانی سفر کے لیے عقیدہ نہیں۔ یہی جدید انسان کا اصل مسئلہ ہے۔ برٹینڈر رسل نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہم بجلی کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہیں۔ صرف یہ کہ اس کو ہم کس طرح اپنے لیے کارآمد بنائیں۔ اس سے زیادہ جاننے کی خواہش بے فائدہ اور مابعد الطبیعیات میں چھلانگ لگانے کے ہم معنی ہے۔



what do we want to know about electricity? Only how to make it work for us to want to know more is to plunge into useless metaphysics.

(۲)

برٹرینڈ رسل اور اس کے جیسے دوسرے بے شمار لوگوں کی اصل مشکل یہ ہے کہ وہ صرف بجلی کیا ہے، کے سوال کو لینا چاہتے ہیں اور ”بجلی کیوں ہے“ کے سوال کو نظر انداز کر دینا چاہتے ہیں۔ مگر انسانی فطرت اس تفریق پر راضی نہیں۔ انسان اپنی فطرت کے تحت مجبور ہے کہ وہ بجلی کو عملاً استعمال کرنے کے ساتھ اس کی حقیقت کو بھی جاننا چاہتا ہے۔ یہ ایک ایسا لازمی سوال ہے جس سے اپنے آپ کو خالی کرنا کسی انسان کے لیے ممکن نہیں۔

نظریاتی سوالات کا جواب معلوم کیے بغیر بھی بجلی ہمارے کارخانوں کو چلاتی ہے اور ہمارے شہروں کو روشن کر رہی ہے۔ مگر انسانی فطرت اس سے انکار کرتی ہے کہ وہ یہیں ٹھہر جائے۔ وہ بجلی کیا ہے ”کے سوال کے ساتھ“ بجلی کیوں ہے“ کے سوال پر بھی غور کرے۔

اسی دوسری چیز کا نام عقیدہ ہے اور انسان عقیدہ (Faith) کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ جدید انسان کی اصل کمزوری یہی ہے کہ اس نے عقیدہ کو کھو دیا ہے۔ اب اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ آج صحیح اور سچا عقیدہ صرف اسلام ہے تو یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ آج کے انسان کو سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ اسلام ہے۔

### سائنسی معیار

دور جدید کا مذہب اسلام ہے۔ اسلام کے سوا کوئی مذہب نہیں جو دور جدید کے معیار پر پورا اتر سکے۔ اس لیے اسلام کے سوا کوئی مذہب نہیں جس کو دور جدید کا مذہب کہنا باعتبار حقیقت درست ہو۔ موجودہ دور سائنسی دور ہے۔ موجودہ دور میں انسان ہر چیز کو اگر سائنسی معیار پر پوری نہ اترے اس کو وہ رد کر دیتا ہے۔

ابتداء میں ہر مذہب سچا مذہب تھا۔ مگر بعد میں ہونے والی انسانی ملاوٹوں کے نتیجے میں مذاہب اس قابل نہ رہے کہ وہ سائنس کے مقابلہ میں ٹھہر سکیں۔ جب کہ اسلام ایک محفوظ دین ہے۔ اور اس بنا پر وہ سائنسی معیار پر صد فی صد پورا اترنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام موجودہ زمانہ میں بلا مقابلہ کامیابی کی پوزیشن میں ہے، بشرطیکہ اسے جدید انسان کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

سائنسی معیار کیا ہے اور غیر سائنسی معیار کیا ہے۔ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے برٹرینڈ رسل نے لکھا ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ حقیقت وہ ہے جو مشاہدہ کے ذریعہ معلوم ہونے لگے کہ وہ جس کو محض

قدیم سندوں کی بنا پر مان لیا جائے۔ مگر یہ مکمل طور پر ایک جدید تصور ہے جو سترھویں صدی سے پہلے بہ مشکل اپنا وجود رکھتا تھا۔

قدیم زمانہ قیاسی معیار پر باتوں کے ماننے کا زمانہ تھا۔ اس لیے قدیم زمانہ میں یہ ممکن تھا کہ جو مذہب بھی رائج ہو اس کو قیاسی مفروضات کی بنا پر درست مان لیا جائے۔ مگر موجودہ زمانہ میں آدمی کسی بات کو صرف اس وقت مانتا ہے جب کہ اس سے متعلق تمام حقائق کا تجزیہ کر کے وہ اس کی معقولیت کو بالواسطہ یا براہ راست طور پر جان چکا ہو۔ یہ وہ معیار ہے جس کو منطبق کرنے کے بعد دوسرے تمام مذاہب اپنے آپ رد ہو جاتے ہیں اس کے بعد صرف اسلام باقی رہتا ہے جو سائنسی معیار پر پورا اترے۔

### مذہب توحید

سائنس نے جو کائنات دریافت کی ہے اس میں مکمل وحدت ہے۔ پوری کائنات یکساں قسم کے قانون کے تحت نظر آتی ہے۔

ایک برطانوی سائنس داں پروفیسر آئن راکس برگ (Ian Roxhurg)

کائنات کیوں اس قدر یکساں ہے۔ (Why is the universe so uniform?) کے زیر عنوان لکھتا ہے۔

The universe is astonishingly uniform. No matter which way we look. the universe has the same constituents in the same proportions. The laws of physics discovered on earth contain arbitrary numbers, like the ratio of the mass of an electron to the mass of a proton, which is roughly 1840 to one. But these turn out to be the same in all places at all times. Why? Did a creator arbitrarily choose these numbers? Or must these numbers have the particular uniform value we observe for the Universe to exist?

سائنس نے جو کائنات دریافت کی ہے وہ کائنات وحدت ہے۔ ایسی کائنات میں صرف توحید کا تصور فٹ بیٹھتا ہے۔ شرک کا تصور سائنسی کائنات کے ساتھ کسی طرح ہم آہنگ نہیں۔

اب مختلف مذاہب کو دیکھئے تو تمام مذاہب مشرکانہ عقائد پر مبنی نظر آتے ہیں۔ پارسی کائنات میں دو خدا مانتے ہیں عیسائیوں کے نزدیک خدا کی تعداد تین ہے، ہندو ازم میں خداؤں کی تعداد کم سے کم ۳۳ اور زیادہ سے زیادہ ۳۳ کروڑ ٹہنائی گئی ہے۔ افریقہ کے قبائلی مذاہب میں ہر چیز خدا ہے، صرف ایک انسان ہے جو اس خدائی میں شامل نہیں، وغیرہ اس کے مقابلہ میں اسلام نہایت واضح اور قطعی طور پر اس بات کا مبلغ ہے کہ خدا صرف ایک ہے۔ یہاں ایک الہ کے سوا اور کوئی الہ نہیں۔

اسلام اور دوسرے مذاہب کے اس فرق کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ جدید سائنسی دنیا میں جو مذہب قابل قبول ہو سکتا ہے وہ صرف اسلام ہے جو خالص توحید کا مذہب ہے۔ دوسرے تمام مذاہب جدید سائنسی دنیا میں غیر مطابق ہو کر رہ گئے ہیں کیوں کہ وہ شرک کی تعلیم دیتے ہیں اور شرک کا سوال جدید سائنس کی دریافت کردہ کائنات کے ساتھ ہم آہنگ نہیں۔

### مشرکانہ مذاہب

اسلام کے سوا دوسرے مذاہب مشرکانہ مذاہب ہیں۔ مشرکانہ مذاہب میں فطرت کے مظاہر کو خدا کا درجہ دیا گیا ہے۔ اور ان کو مقدس سمجھ کر ان کی پرستش کی جاتی ہے۔ شرک دراصل مظاہر فطرت کی پرستش ہی کا دوسرا نام ہے۔ موجودہ زمانہ میں فطرت کے ان مظاہر کی نہایت تفصیلی تحقیق کی گئی ہے۔ اور ان کے بارے میں قطعی معلومات حاصل کی گئی ہیں۔ یہ معلومات ان مظاہر فطرت کی خدائی کو بے بنیاد ثابت کر رہی ہیں۔

مثال کے طور پر ہندو ازم میں چاند کو دیوتا بتایا جاتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں چاند کی علمی تحقیق کی گئی۔ دور بینوں سے اس کا مشاہدہ کیا گیا۔ چاند کی مٹی کوزمین پر لا کر لیبارٹری میں اس کا تجزیہ کیا گیا۔ حتیٰ کہ ستمبر ۱۹۵۹ء میں روس کا راکٹ چاند پر اتر گیا۔ اس کے بعد جولائی ۱۹۶۹ء میں امریکی خلا باز نیل آرم اسٹرانگ نے چاند پر اپنے قدم رکھ دیئے۔ اس طرح آخری طور پر معلوم ہو گیا کہ چاند کوئی دیوتا ہی چیز نہیں ہے۔ وہ محض ریت اور پتھر کا ایک مجموعہ ہے۔

اب ظاہر ہے کہ وہ دین آج کے انسان کا دین قرار پائے گا جو سورج اور چاند کو دیوتا بتا کر اسے پوجنے کے لیے کہتا ہے یا وہ دین جو انسان سے یہ کہہ رہا ہے کہ سورج اور چاند کی پرستش نہ کرو بلکہ تم اس خدا کی پرستش کرو جس نے انھیں پیدا کیا

لا تسجدوا للشمس ولا للمقمر واسجدوا للہ الذی خلقہن، چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ اللہ کو سجدہ کرو جس نے ان کو

حقیقت یہ ہے کہ جدید سائنسی دور میں چاند کی معبودانہ حیثیت ختم ہو گئی ہے آج کا ایک شخص جو چاند کے بارے میں جدید سائنسی نقطہ نظر پر یقین رکھتا ہو وہ اسی کے ساتھ ان مذاہب پر یقین نہیں رکھ سکتا جو چاند کو دیوتا بتاتے ہیں۔ مگر اسلام کے ساتھ یہ مشکل نہیں۔ کیوں کہ اسلام چاند کو اور اسی طرح دوسرے اجرام سموی کو مخلوق بتاتا ہے نہ کہ خالق اور معبود۔

## مذہبی سادگی

اسلام کی ایک خصوصیت اس کی فطری سادگی ہے جو جدید سائنسی ذہن کے عین مطابق ہے۔ جدید انسان کا ذہن نیچر کے مطالعہ سے بنا ہے۔ اس لیے نیچر میں جو سادگی ہے وہی سادگی جدید ذہن کے لیے بھی پسندیدہ چیز بن گئی ہے۔ جدید ذہن کے لیے وہی مذہب قابل قبول ہو سکتا ہے جس میں فطری سادگی ہو۔ جو مذہب فطری سادگی سے خالی ہو وہ جدید ذہن کے لیے قابل قبول بھی نہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے اسلام کے سوا تمام مذاہب فطری سادگی سے محروم ہو چکے ہیں۔ نظریاتی سادگی سے بھی اور عملی سادگی سے بھی۔

موجودہ مسیحیت جس فلسفیانہ عقیدہ پر قائم ہے وہ تثلیث ہے یعنی تین میں ایک، ایک میں تین۔ ریاضیاتی طور پر یہ بات بالکل ناقابل فہم ہے کہ کوئی چیز بیک وقت ایک بھی ہو اور اسی کے ساتھ تین بھی۔

یہودیت ایک اور اعتبار سے غیر سادگی کا منظر پیش کرتی ہے موجودہ بائبل میں عبادت اور قربانی کے مراسم (Rituals) اتنے زیادہ بتائے گئے ہیں کہ عام انسان کے لیے تقریباً ناممکن ہو گیا ہے کہ وہ ان تمام مراسم کی پابندی کرتے ہوئے عبادت اور قربانی کر سکے۔

اس کے مقابلہ میں اسلام کی عبادت ظاہری رسمیات سے بالکل خالی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامی عبادت ایک انتہائی سادہ عمل کا نام ہے۔ سرائیڈورڈینی سن راس (E. Dension Ross) نے اسلام کی فطری سادگی کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے کہ اسلامی عقیدہ کی سادگی غالباً اسلام کی اشاعت میں زیادہ بڑا عامل تھی بمقابلہ غازیوں کی تلوار کے:

The simplicity of Islamic creed was probably a more potent

factor in the spread of Islam than the sword of Ghazis.

اسلام کی یہ سادگی جس نے قدیم زمانہ میں بے شمار انسانوں کو اسلام کی طرف راغب کیا اس کی وہی سادگی

مزید اضافہ کے ساتھ جدید انسان کے لیے کشش کا باعث ہے۔ جدید انسان کا فطرت پسند ذہن اسلام کے سوا کسی اور مذہب میں اپنی حقیقی تسکین نہیں پاسکتا۔

## تاریخی معیار

خدا کی طرف سے جو پیغمبر آئے ان میں سے دو پیغمبر حضرت یوسفؑ اور حضرت موسیٰؑ تھے۔ ان دونوں پیغمبروں کا تعلق مصر کی تاریخ سے ہے۔ اس بنا پر جب بھی ان دونوں پیغمبروں کا ذکر آتا ہے تو قدرتی طور پر مصر کی تاریخ بھی اس سے وابستہ ہو جاتی ہے۔

ان دونوں پیغمبروں کا ذکر بائبل میں بھی ہے اور قرآن میں بھی۔ بائبل جب حضرت یوسفؑ کا ذکر کرتی ہے تو ان کے زمانہ کے بادشاہ کا نام وہ فرعون (Pharoah) بتاتی ہے۔ اسی طرح بائبل میں جہاں موسیٰؑ کا ذکر ہے وہاں بھی ان کے ہم عصر بادشاہ کا نام فرعون بتایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بائبل کے نزدیک حضرت یوسفؑ کے زمانہ میں جو بادشاہ مصر پر حکومت کر رہا تھا وہ بھی فرعون تھا۔

یہ بات جدید تحقیقات سے غلط ثابت ہوئی ہے۔ جدید تحقیقات بتاتی ہیں کہ حضرت یوسفؑ کے زمانہ میں مصر میں ان لوگوں کی حکومت تھی جن کو چرواہے بادشاہ (Hyksos kings) کہا جاتا ہے یہ لوگ اصلاً مصری نہ تھے بلکہ عرب قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ باہر سے آکر مصر میں اسی طرح حکمران بن گئے جس طرح انگریز ہندستان میں ایک عرصہ تک حکمران رہے۔ چرواہے بادشاہوں کا یہ خاندان دو ہزار قبل مسیح سے لے کر پندرہویں صدی قبل مسیح کے آخر تک مصر کے اقتدار پر قابض رہا۔ حضرت یوسفؑ کی وفات کے بعد ایک عرصہ تک یہ خاندان مصر پر حکمران رہا۔ اس کے بعد مصر میں ان کے خلاف بغاوت ہوئی۔ ان کو مصر سے نکال دیا گیا اور ان کی جگہ ایک مصری خاندان کی حکومت قائم ہوئی یہی مصری خاندان ہے جس کے بادشاہوں نے سب سے پہلے فرعون (Pharoah) کا لقب اختیار کیا۔

اس سے ظاہر ہوا کہ بائبل کا بیان جدید تاریخی تحقیقات سے ٹکرا رہا ہے، بائبل حضرت یوسفؑ اور حضرت موسیٰؑ دونوں پیغمبروں کے ہم عصر بادشاہوں کو فرعون کہتی ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ فرعون صرف حضرت موسیٰؑ کے ہم عصر بادشاہ کا لقب تھا نہ کہ حضرت یوسفؑ کے ہم عصر بادشاہ کا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ بائبل جدید تاریخی معیار کا سامنا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

مگر قرآن کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ قرآن میں حضرت یوسفؑ کے زمانہ کے بادشاہ کا بھی ذکر ہے اور

حضرت موسیٰ کے زمانہ کے بادشاہ کا بھی ذکر۔ مگر قرآن انتہائی بامعنی طور پر دونوں کے درمیان فرق کرتا ہے۔ اس نے حضرت یوسفؑ کے ہم عصر بادشاہ کے لیے عزیز کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جس کے معنی حکمران یا ذی اقتدار کے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس قرآن جب حضرت موسیٰؑ کا ذکر کرتا ہے تو وہاں وہ ان کے ہم عصر بادشاہ کو واضح طور پر فرعون کہتا ہے۔ گویا قرآن کے نزدیک حضرت یوسف کے زمانہ میں مصر کا بادشاہ دوسرا تھا اور حضرت موسیٰ کے زمانے میں مصر کا بادشاہ دوسرا۔

اس طرح قرآن مکمل طور پر یہ اہلیت رکھتا ہے کہ وہ جدید علم کا سامنا کر سکے۔ کیوں کہ جدید علمی تحقیقات اور قرآن کا بیان دونوں کامل طور پر ایک دوسرے کے موافق ہیں۔ یہاں آدمی کو یہ ضرورت نہیں کہ وہ قرآن کو ماننے کے لیے جدید علم کو چھوڑنے پر مجبور ہو۔ یا جدید علم کو ماننا اس کے لیے صرف اس وقت ممکن ہو جب کہ وہ قرآن سے دست بردار ہو جائے۔

## اسلام کی برتری

مریم جلیلہ اپنی کتاب (Islam Versus the West) میں رقمطراز ہے۔

اسلام اتنا برحق مذہب ہے کہ دوسرے مذہبوں سے اس کا سادہ تقابل ہی اس کی برتری ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ بائبل ایک قوم کی قومی تاریخ معلوم ہوتی ہے جب کہ قرآن عالم انسانی پیغام دیتا ہے یہودیت کے نزدیک سارا تقدس بس فلسطین کی سرزمین میں ہے جب کہ اسلام کہتا ہے کہ ساری زمین خدا کی زمین ہے۔ یہودیت کے مطابق ان کے مذہب اور فلسطین کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا جب کہ خود حضرت موسیٰؑ کو خدا نے فلسطین سے باہر خطاب کیا اور یہودیوں کی مقدس مذہبی کتاب فلسطین کے باہر مرتب کی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اتنا کامل اور اتنا برحق دین ہے کہ دوسروں کے سامنے صرف اس کو سادہ صورت میں پیش کر دینا کافی ہے۔ بشرطیکہ ہم اس کو کسی ملاوٹ کے بغیر اس کی اصلی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔

## جدید تقاضا

موجودہ زمانہ کے ایک مفکر نے لکھا ہے کہ آج کے انسان کے لیے وہی مذہب قابل قبول ہو سکتا ہے جس کی تعلیمات عالمی ہوں اور جس کا فکر عقلیت پر مبنی ہو:

Universal in content and rational in thought

مذکورہ مفکر کی اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے ہم کہیں گے کہ یہ دونوں صفات آج صرف اسلام کے اندر پائی جاتی ہیں۔ اسلام کے سوا دوسرا کوئی مذہب نہیں جو دور جدید کے اس معیار پر پورا اترے۔

اسلام اپنی ابتدائی ربانی شکل میں آج بھی کامل طور پر محفوظ ہے۔ جب کہ دوسرے مذاہب کا حال یہ ہے کہ بعد کے زمانوں میں ان کے اندر انسانی آمیزش ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنی آفاقیت بھی کھودی اور اسی کے ساتھ اپنی عقلیت بھی۔ انسان کی محدودیت نے خدائی مذہب میں شامل ہو کر خدائی مذہب کو بھی محدود کر دیا۔

یہی وجہ ہے کہ آج ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دوسرے مذاہب میں انسان اور انسان کے درمیان تفریق پائی جاتی ہے چونکہ لوگوں کے درمیان تفریق اور امتیاز موجود تھا۔ انھوں نے اپنی اس عملی حالت کو نظریاتی جواز فراہم کرنے کے لیے اس کو ایک مذہبی چیز بنایا اور پھر اس کو اپنی مذہبی کتابوں میں داخل کر دیا مذہب میں بادشاہ اور رعایا کی تقسیم، آزاد اور غلام کی تقسیم، کالے اور گورے کی تقسیم، اونچی ذات اور نیچی ذات کی تقسیم، امیر اور غریب کی تقسیم، مذہبی پیشوا اور عام انسان کی تقسیم۔۔۔ یہ تمام چیزیں اسی تاریخی غلطی کا نتیجہ ہیں۔

یہی معاملہ عقلیت کا بھی ہے۔ انسان کی عقل محدود ہے۔ وہ حد بندیوں میں رہ کر سوچتا ہے اسلام کے سوا ہر مذہب میں ایسا ہوا کہ بعد کے زمانہ میں اس کے ماننے والوں نے اپنی عقل سے اس میں اضافے کیے۔ ان اضافوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدائی کلام کے ساتھ انسانی کلام شامل ہو گیا۔ اس طرح اس کی ابدیت ختم ہو گئی۔ جو چیز ماضی میں عقلی نظر آتی تھی وہ بعد کے زمانہ میں غیر عقلی ہو کر رہ گئی۔

اب مذاہب کی فہرست میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو اپنی ابتدائی حالت میں محفوظ رہنے کی وجہ سے ان دونوں صفتوں کو اپنے اندر برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اس میں آفاقیت بھی مکمل طور پر ہے۔ اور عقلیت بھی مکمل طور پر۔

اب سوال یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ ماضی میں بلاشبہ مسلمانوں نے بہت بڑی بڑی سائنسی خدمات انجام دی تھیں۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمان سائنس اور صنعت کے میدان میں تمام قوموں سے پیچھے ہو گئے ہیں۔ آج وہ اس حیثیت میں نہیں ہیں کہ خالص سائنسی اور صنعتی اعتبار سے اہل دنیا کے لیے نفع بخش بن سکیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ ابھی تک صنعتی دور (Industrial age) میں بھی داخل نہیں ہوئے۔ جب کہ بقیہ دنیا، ”الوین ٹافلر“ کے الفاظ میں، ما فوق صنعتی دور (Super-industrial age) میں داخل ہو گئی ہے۔

Alvin Toffler, Future Shock, New York, 1971

مگر امت مسلمہ محفوظ آسمانی کتاب کی حامل ہے۔ اس نسبت سے وہ خود بھی ایک محفوظ امت ہے۔ اس محفوظیت کا ایک

پہلو یہ بھی ہے کہ جہاں مواقع بظاہر ختم ہو جائیں وہاں بھی اس کے لیے ایک نیا موقع موجود رہتا ہے۔ خدا نے انسانیت کے لیے عام طور پر اور امت مسلمہ کے لیے خاص طور پر یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ہر ڈس ایڈوائٹج کے ساتھ اس کے لیے ایک ایڈوائٹج ہمیشہ موجود ہے۔ یہی وہ ابدی حقیقت ہے جو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

فان مع العسر يسرا ان مع العسر يسرا 1۔ پس ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ بے شک ہر مشکل (۵)

اللہ تعالیٰ کی یہ سنت موجودہ زمانہ میں پوری طرح ظاہر ہو چکی ہے۔ سائنس اپنی ترقیوں کی انتہا پر پہنچ کر ایک ایسے سنگین مسئلہ سے دوچار ہے جس کا خود اس کے پاس کوئی حل نہیں۔ نہ سائنسی طبقہ سے باہر کوئی گروہ ایسا موجود ہے جو اس مسئلہ کا حل اسے دے سکے۔ یہ صرف ہم مسلمان ہی ہیں جو محفوظ آسمانی کتاب کے حامل ہونے کی وجہ سے اس پوزیشن میں ہیں کہ سائنسی طبقہ کو نیز پوری انسانیت کو اس مسئلہ کے حل کا تحفہ پیش کر سکیں۔

اس معاملہ کی نوعیت سمجھنے کے لیے یہاں میں انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کا ایک پیرا گراف نقل کروں گا۔ اس کے تاریخ سائنس (History of Science) کے مقالہ نگار نے اس سلسلہ میں لکھا ہے۔

Untill recently, the history of science was a story of success. The triumphs of science represented a cumulative process of increasing knowledge and a sequence of victories over ignorance and superstition: and from science flowed a stream of inventions for the improvement of human life. The recent realization of deep moral problems within science, of external forces and constraints on its development, and of dangers in uncontrolled technological change has challenged historians to a critical reassessment of this earlier

(۶) simple faith (16/366)

ابھی حال تک سائنس کی تاریخی کامیابیوں کی کہانی تھی۔ سائنس کی فتوحات میں یہ شمار ہوتا تھا کہ اس نے انسانی معلومات میں اضافہ کیا ہے اور جہالت اور توہم پرستی پر فتح حاصل کی ہے سائنس سے ایجادات کا ایک سیلاب نکلا ہے جس نے انسانی زندگی کو بہتر بنایا ہے۔ مگر حال میں یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ سائنس گہرے اخلاقی سوالات سے دوچار



ہے۔ بے قید ٹیکنالوجی کے خطرات کی وجہ سے اس کی ترقی پر روک لگانے کی باتیں کی جا رہی ہیں۔ یہ صورت حال مورخین کو چیلنج کر رہی ہے کہ وہ ان خیالات کا دوبارہ تنقیدی جائزہ لیں جو ابتداء میں سادہ طور پر قائم کر لیے گئے تھے۔

جدید دنیا کا یہی وہ خلا ہے جہاں مسلمان اپنے نفع بخش ہونے کا ثبوت دے سکتے ہیں، اور اس طرح دوبارہ اپنے لیے سرفرازی کا وہ مقام حاصل کر سکتے ہیں جو انھوں نے دنیا میں کھودیا ہے۔

سائنس کی ابتدائی فتوحات نے بہت سے لوگوں کو اتنا زیادہ متاثر کیا کہ انھوں نے سمجھ لیا کہ اب ہمیں سائنس کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ سائنس ہماری تمام ضرورتوں کے لیے کافی ہے اس سلسلے میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ جولین ہکسلے (۱۹۷۵-۱۸۸۷) نے اس نقطہ نظر کی نمائندگی کرتے ہوئے ایک کتاب شائع کی تھی جس کا نام تھا۔۔۔ انسان تنہا کھڑا ہوتا ہے:

#### Man Stands Alone

اس کے جواب میں کریسی مالین (۱۹۴۶-۱۸۸۴) نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام بامعنی طور پر یہ تھا۔۔۔ انسان تنہا کھڑا نہیں ہو سکتا:

#### Man Does Not Stand Alone

بیسویں صدی کے نصف اول تک انسان کا یہ دعویٰ تھا کہ اس کی سائنس اس کے لیے کافی ہے۔ مگر اسی صدی کے نصف ثانی میں انسان کو اپنی رائے سے رجوع کرنا پڑا۔ اس سے پہلے جو بات کریسی مارلسین جیسے چند مستثنیٰ افراد کہتے تھے، اب وہ عام طور پر لوگوں کی زبانوں سے کہی جا رہی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف انسائیکلو پیڈیا بائیکا کے مذکورہ اقتباس میں کیا گیا ہے۔

جدید انسان کی ذہنی حالت کیا ہے، اس کا ایک نمونہ لارڈ برٹینڈرسل کی نوبل انعام یافتہ شخصیت ہے جس نے مذہب کو سکون تلاش کرنے کے لیے چھوڑ کر سائنس کی رہ لی مگر کامیابی نہ ہوئی آخر میں اس کے اپنے ہاتھ کی شہادت پیش کرتے ہیں۔

The inner failure has made my mental life a perpetual battle (p.727)

اندرونی ناکامی نے میری ذہنی زندگی کو ایک مستقل جنگ میں مبتلا رکھا۔

#### گلیلیو اور سائنس

آپ سائنس کی تاریخ کی کسی کتاب میں گلیلیو (۱۶۴۲-۱۵۶۴) کا باب کھول کر دیکھیں تو وہاں آپ کو اس قسم

کے الفاظ لکھے ہوئے ملیں گئے:

His use of observation, experiment and mathematics

helped lay foundation of modern science.

گلیلیو نے مشاہدہ اور تجربہ اور ریاضی کو جس طرح استعمال کیا اس نے جدید سائنس کی بنیاد رکھنے میں مدد دی۔

گلیلیو کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ اس نے چیزوں کی ابتدائی صفات کو، جو ابعاد (Dimensions) اور وزن (Weight) پر مشتمل ہیں اور جن کی آسانی سے پیمائش کی جاسکتی ہے، ان کو ان ثانوی صفات سے الگ کر دیا جو شکل، رنگ اور بو وغیرہ سے تعلق رکھتی ہیں اور جن کی پیمائش نہیں کی جاسکتی۔ ایک لفظ میں یہ کہ اس نے کمیت کو کیفیت سے جدا کر دیا۔

گلیلیو کے اس فعل نے اس بات کو ممکن بنا دیا کہ آدمی میٹر کو استعمال کر سکے، بغیر اس کے کہ اس نے میٹر کے براہ میں ضروری معلومات حاصل کی ہوں۔ اس طرح فطرت کو کام میں لانے کا دروازہ کھل گیا۔ ٹیکنالوجی کو ترقی ہوئی اور بے شمار نئی چیزیں بننے لگیں جو انسان کے لیے مفید ثابت ہوئیں۔ مگر زیادہ مدت نہیں گزری کہ انسان کا عدم اطمینان ظاہر ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ اس معاملہ میں سائنس داں یا انجینئر کا معاملہ اس جاہل بڑھئی سے کچھ بھی مختلف نہیں جو لکڑی کو کاٹ کر فرنیچر بناتا ہے، اگرچہ وہ لکڑی کی کیمسٹر کے بارہ میں کچھ نہیں جانتا۔

بعد کی تحقیقات نے بتایا کہ گلیلیو نے چیزوں کے جس ظاہری پہلو کو الگ کر کے اس کو سائنس کے مطالعہ کا موضوع بنایا تھا۔ اس کے بارہ میں بھی انسان کی معلومات حد درجہ ناقص ہیں۔ انسان نہ صرف پھول کی ”خوشبو“ سے بے خبر ہے بلکہ پھول کی ”کیمسٹری“ بھی بہت کم اس کے علم میں آتی ہے۔ ایک چیز جس کو متمدن دنیا کا انسان تین سو سال تک علم سمجھتا رہا وہ بھی آخر کار بے علم ثابت ہوا۔ برٹینڈرسل نے اپنے خودنوشت سوانح عمری میں لکھا ہے:

As is natural when one is trying to ignore a profound cause of unhappiness. I found impersonal reasons for gloom. I have been very full has a more or less Platonic philosophy which enabled me to see beauty in the extra-human universe. Mathematics and the stars consoled me when the human world seemed empty of confort. But changes in my philosophy have robbed me of such consolations.

Solipphysics as that of Eddington. It seemed that what we had thought of as laws of nature were only linguistic conventions, and that physics was believed this, but that it became a haunting nightmare, increasingly invading (7)

imagination. میں نے اپنی اداسی کے کچھ غیر شخصی اسباب پال لیے جیسا کہ عام طور پر اس وقت ہوتا ہے جبکہ آدمی ناخوشی کے ایک گہرے سبب کو نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں ۱۹۳۰ء صدی کے ابتدائی سالوں میں ۱۹۳۰ء ذاتی پریشانیوں میں بہت زیادہ مبتلا رہا ہوں۔ مگر اس وقت میں کم وبیش افلاطونی فلسفہ کا قائل تھا جس نے مجھے اس قابل بنائے رکھا کہ میں خارجی دنیا میں حسن کو دیکھ سکوں۔ ریاضیات اور ستاروں نے مجھے اس وقت تسکین دی جب کہ انسانی دنیا آسائش سے خالی نظر آتی تھی۔ مگر میرے فلسفہ میں تبدیلی نے اس قسم کی تسکین کو مجھ سے چھین لیا۔ خودی نے مجھ کو بالکل مضطرب کر دیا۔ خاص طور پر اس وقت جب کہ میں نے طبیعیات کی ان تشریحوں کو پڑھا جو ڈنگن جیسے لوگوں نے کی ہیں۔ مجھ کو نظر آیا کہ جس چیز کو ہم نے فطرت کے قوانین سمجھا تھا وہ محض الفاظ کا معاملہ تھا۔ اور طبیعیات حقیقتہً کسی خارجی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ میں اس کو پوری طرح مانتا ہوں۔ مگر یہ میرے لیے ایک کا بوس بن گیا جو میرا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ میرے تخیلات پر برابر حملہ کر رہا تھا۔

## روحانی تسکین

جوسائنس خارجی دنیا کا علم دینے سے عاجز تھی وہ اس باطنی دنیا کا علم کیا دیتی جس کے بارہ میں اس نے گلیلیو ہی کے زمانہ میں عملی طور پر اپنی نارسائی کا اعلان کر دیا تھا۔ سائنس آدمی کو وہ جھوٹا اطمینان بھی نہ دے سکی جو مادی سطح پر بظاہر ایک انسان کو حاصل ہوتا ہے۔ اور ذہنی اور روحانی سطح کا اطمینان تو نہ اس کے بس میں تھا اور نہ کبھی اس نے اس کو دینے کا دعویٰ کیا۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

الابد کر اللہ تطمئن القلوب۔ (۸)

سن لو کہ اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔

یہی بات بائبل میں ان لفظوں میں بیان ہوئی ہے۔ انسان صرف روٹی ہی سے جیتا نہیں رہتا بلکہ ہر بات سے جو خداوند کے منہ سے نکلتی ہے وہ جیتا رہتا ہے حضرت مسیح نے اسی بات کو ان لفظوں میں فرمایا۔ ”لکھا ہے کہ آدمی صرف

روٹی ہی سے جیتا نہ رہے گا بلکہ ہر اس بات سے جو خداوند کے منہ سے نکلتی ہے“

انسان اپنے ساتھ ایک مخصوص نفسیات رکھتا ہے اس نفسیات سے وہ اپنے آپ کو جدا نہیں کر سکتا۔ یہ نفسیات ایک برتر تسکین کی طالب ہے۔ انسان کو مادی ساز و سامان کے ساتھ ایک عقیدہ اور ایک اصول حیات بھی درکار ہے۔ سائنس نے انسان کو جو کچھ دیا وہ اپنی آخری صورت میں بھی صرف مادی ساز و سامان تھا۔ سائنس انسان کو ایک قابل اعتماد عقیدہ نہ دے سکی۔ یہی وہ کمی ہے جس نے جدید دنیا کے بے شمار لوگوں کو غیر مطمئن کر رکھا ہے۔ باہر سے دیکھنے والوں کو ان کی زندگیاں پر رونق نظر آتی ہیں۔ مگر اندر سے ان کی روح بالکل ویران ہو چکی ہے۔

### اقدار کا مسئلہ

یہ مسئلہ جس سے آج کا انسان دوچار ہے، فلسفیانہ لفظ میں اس کو اقدار کا مسئلہ (Problem of values) کہا جاسکتا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ انسان ایک ذہری مشکل سے دوچار ہے۔ وہ جانتا ہے مگر نہیں جانتا۔ معلومات کے ڈھیر کے درمیان وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ کم سے کم اس پوزیشن میں ہوتا جا رہا ہے کہ یہ فیصلہ کر سکے کہ کیا اچھا ہے اور کیا برا۔ وہ اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی چیز کو اچھا اور کسی چیز کو برا سمجھے وہ اس تمیز کو کسی بھی طرح اپنے آپ سے جدا نہیں کر سکتا۔ مگر جب اپنی عقل یا اپنے علم کے ذریعہ ہو تو اس کو متعین کرنا چاہتا ہے لیکن اس کو متعین نہیں کر پاتا۔ جوزف وڈ کرج نے اپنی کتاب ”دور جدید کا مزاج“ میں اس مسئلہ پر عقلی بحث کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان اگرچہ باعتبار فطرت یہ یقین کرنے کی طرف مائل ہے کہ زندگی کا ایک مقصد ہے اور اچھائی اور برائی کا ایک معیار ہے۔ مگر سائنس اس کا کوئی حتمی جواب نہیں دیتی سائنس کی ترقی اس کو زیادہ سے زیادہ ظاہر کرتی جا رہی ہے کہ ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں اقدار اپنا کوئی موضوعی مقام (Objective Status) نہیں رکھتیں۔ انسان اخلاقی معیاروں کی ضرورت محسوس کرتا ہے جس کے مطابق وہ زندگی گزارے۔ وہ وجدانی طور پر اس کی مستقل تلاش میں ہے۔ مگر سائنس کی دریافت کردہ دنیا میں خیر و شر کے تصورات کی کوئی جگہ نہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان ایک اخلاقی جانور ہے جو ایک ایسی کائنات میں ہے جہاں اخلاقی عنصر کا کوئی وجود نہیں:

Man is an ethical animal in a universe which contains no ethical element.

(9)

انسان چیزوں کی حقیقت کو جاننا چاہتا ہے مگر سائنس اس کو صرف چیزوں کے ڈھانچہ کا علم دیتی ہے۔ انسان دنیا کے آغاز و

انجام کو جاننا چاہتا ہے مگر سائنس اس کو صرف درمیانی مرحلہ کے بارے میں کچھ باتیں بتاتی ہے۔ انسان چیزوں کی معنویت کو دریافت کرنا چاہتا ہے مگر سائنس اس کو صرف اس کی ظاہری ہیئت کا پتہ دیتی ہے۔ انسان پھول کی مہک کو سمجھنا چاہتا ہے مگر سائنس اس کو صرف پھول کی کیمسٹری سے آگاہ کرتی ہے۔ انسان ذہن اور روح کی گہرائی میں اترنا چاہتا ہے مگر سائنس صرف جسم کے مادی اجزاء کا تجزیہ اس کے سامنے پیش کرتی ہے۔ ایک لفظ میں یہ کہ انسان ”خالق“ کے بارہ میں جاننا چاہتا ہے اور سائنس اس کو صرف ”مخلوق“ کے بارے میں بتا کر خاموش ہو جاتی ہے۔

یہی بات ہے جس کو ایک مغربی مفکر نے حسرت کے ساتھ اس فقرہ میں بیان کیا ہے۔۔۔ جو اہم ہے وہ ناقابل دریافت ہے، اور جو قابل دریافت ہے وہ اہم نہیں:

The important is unknowable, and the knowable is unimportant.

### اعلیٰ ذریعہ علم

یہی بے اطمینانی جدید دور کے تمام باشعور انسانوں کا پیچھا کیے ہوئے ہے۔ ان کی اکثریت اگرچہ مذہب کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے مگر انھوں نے یہ بات مان لی ہے کہ جس سائنسی ترقی کو انھوں نے انسانیت کے مسئلہ کا حل سمجھ لیا تھا وہ انسانیت کے مسئلہ کا حل نہ تھا۔ برٹریڈ رسل نے مغربی فکر و فلسفہ پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کے آخر میں ہم اس کے اعتراف کے حسب ذیل کلمات پاتے ہیں:

(Western philosophers) confess frankly that the human intellect is unable to find conclusive answers to many questions of profound importance to mankind, but they refuse to believe that there is some higher way of knowledge, by which we can discover truths hidden from science and the intellect. (10)

مغربی فلسفی کھلے طور پر اقرار کرتے ہیں کہ انسانی عقل کے بس سے باہر ہے کہ وہ ان بہت سے سوالات کا قطعی جواب پاسکے جو انسانیت کے لیے بے حد اہمیت رکھتے ہیں۔ مگر وہ اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں کہ سائنس کے علاوہ علم کا کوئی اور بلند تر طریقہ ہے جس کے ذریعے سے ہم ان سچائیوں کو دریافت کر سکیں جو سائنس اور عقل کی دسترس میں نہیں آتیں

آج کے انسان کو یہی بتانا اس کو سب سے بڑی چیز دینا ہے کہ ہاں، یہاں ایک ایسا بلند تر طریقہ موجود ہے جس کے ذریعہ نامعلوم کو معلوم کیا جاسکے۔ اور وہ الہام خداوندی ہے۔ اور یہ الہام خداوندی جہاں اپنی محفوظ شکل میں موجود ہے وہ قرآن ہے۔

قرآن پوری طرح اپنی اصل حالت میں محفوظ ہے اور تقریباً ڈیڑھ ہزار برس سے مسلسل اپنی صداقت کو ثابت کر رہا ہے،

## داخلی شہادت

اخلاقی یا مذہبی احساس انسان کے اندر بے حد طاقت ور ہے۔ ماضی سے لے کر حال تک کا تجربہ بتاتا ہے کہ یہ احساس کسی طرح انسان کے اندر سے ختم نہیں ہوتا۔ مزید یہ کہ یہ خالص انسانی خصوصیت ہے۔ کسی بھی نوع کے جانور میں اب تک اخلاقی یا مذہبی شعور کا ہونا ثابت نہ کیا جاسکا۔

اخلاقی شعور کو اس دنیا میں بے حد مشکلات کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے۔ طرح طرح کی استثنائی حالات پیش آتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اخلاقی شعور کے تحت عمل کرنے والا موت سے دوچار ہوتا ہے۔ یا برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہم کیوں کر یقین کر سکتے ہیں کہ افادیت کا لحاظ ایک شخص کے اندر ایک اعلیٰ نیکی کے لیے اتنا پر اسرار تقدس پیدا کر سکتا ہے۔ کیا افادیت آدمی کے اندر یہ مزاج پیدا کر سکتی ہے کہ وہ سچائی کو بذات خود مقصود و مطلوب سمجھے اور نتائج کا لحاظ کیے بغیر اس پر عمل کرے۔

The utilitarian hypothesis, which is the theory of natural selection applied to mind, seems inadequate to account for the development of the moral sense. Such being the difficulties with which virtue (or the moral sense) has had to struggle, with so many exceptions to its practice, with so many instances in which it brought ruin or death to its too ardent devotee, how can we believe that considerations of utility could ever induce men to value truth for its own sake, and practice it regardless of consequences.

”ذہن کائنات“ نامی کتاب کا مصنف فریڈ ہائل اپنے قیمتی مطالعہ کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتا ہے کہ اگر زمین کو کسی

مزید اہمیت کا حامل بننا ہے، اور انسان کو کائناتی اسکیم میں کوئی جگہ پانی ہے تو ضرورت ہوگی کہ ہم افادیت کے نظریہ کو مکمل طور پر ترک کر دیں۔ اگرچہ میرا خیال ہے کہ قدیم طرز کے مذہبی نظریات کی طرف واپسی کچھ مفید نہ ہوگی، مگر ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ ایسا کیوں ہے کہ دیس کی تشریح کے مطابق پراسرار تقدس ہمارے اندر موجود رہتا ہے اور دوسری دنیا کی طرف ہمیں اشارہ کرتا ہے کہ کیا ہم اس کی پیروی کریں گے:

If the Earth is to emerge as a place of added consequence, with man of some relevance in the cosmic scheme, we shall need to dispense entirely with the philosophy of opportunism. While it would be no advantage I believe to return to older religious concepts, we shall need to understand why it is that the mysterious sanctity described by Wallace persists within us, backonging us to the Elysian fields, if only we will follow.

(11)

حقیقت یہ ہے کہ مذہب انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ وہ مذہب کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آج کا انسان بھی اتنا ہی زیادہ مذہب کا ضرورت مند ہے جتنا قدیم زمانہ کا انسان تھا۔ مزید یہ کہ سائنس کی طرف سے مایوسی نے اس کو مزید شدت کے ساتھ مذہب کا مشتاق بنا دیا ہے۔ مگر جدید انسان کی مشکل یہ ہے کہ وہ مذہب کے نام سے جس چیز کو جانتا ہے وہ صرف بگڑے ہوئے مذاہب ہیں۔ اور بگڑے ہوئے مذاہب کے ساتھ انسانی فطرت کو مطابقت نہیں۔ جدید انسان جب اندرونی تقاضے سے مجبور ہو کر مذہب کے بارہ میں سوچتا ہے تو اسی بگڑے ہوئے مذہب کی تصویر اس کے سامنے آ جاتی ہے۔ وہ مذہب سے قریب ہو کر دوبارہ مذہب سے دور ہو جاتا ہے۔

اسلام ایک محفوظ مذہب ہے۔ وہ ان خرابیوں سے یکسر پاک ہے جو انسانی ملاوٹ کے نتیجے میں دوسرے مذہبوں میں پیدا ہو گئی ہیں۔ انسان کی فطرت جس مذہب کو تلاش کر رہی ہے وہ حقیقتاً اسلام ہی ہے۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اسلام کو اپنے خود ساختہ جھگڑوں کا عنوان بنائے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اسلام کو دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا، اور اگر پیش کیا تو بگڑی ہوئی خود ساختہ صورت میں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کو اسلام اور دوسرے مذہبوں میں بظاہر کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ اسلام کو اگر اس کی اصل صورت میں آج کے انسان کے سامنے پیش کر دیا جائے تو وہ یقیناً اس کو اپنی طلب کا

جواب پائے گا اور اس کی طرف دوڑ پڑے گا۔

مسلمان سائنس کے میدان میں دوسروں سے ہچکچٹے ہیں مگر عقیدہ (نظر یہ حیات) کے معاملہ میں وہ آج بھی دوسروں سے آگے ہیں۔ وہ جدید دنیا کو وہ چیز دے سکتے ہیں جس کی آج اسے سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ یعنی خدا کی طرف سے آیا ہوا سچا دین، وہ دین جس کے اوپر آدمی اپنے لیے ایک پراعتماد زندگی کی تعمیر کر سکے۔ یہ مقام آج مسلمانوں کے لیے خالی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں وہ اہل عالم کے لیے نفع بخش بن سکتے ہیں۔ اور دوبارہ اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر سکتے ہیں کہ قدرت کا یہ قانون ان کے حق میں پورا ہو۔۔۔۔۔

### واماما ینفع الناس فیما ینفع فی الارض (۱۲)

سائنس نے اس دنیا میں مادی ترقی تو کی ہے لیکن روحانی ترقی نہ ہو سکی جو اصل حیات ہے۔ جس کے بغیر سکون کا حصول ناممکن ہے۔ اسلام نے جہاں عقیدہ دیا، فلسفہ حیات دیا وہاں سب سے بڑی نعمت روحانی تسکین کا سامان فراہم کیا۔ اس نے ایسے انسان تیار کئے جو روحانیت کے علمبردار ہیں۔ جن کی پرواز ایک سائنسدان سے کہیں زیادہ ہے۔ آج کا ترقی یافتہ انسان اس حقیقت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ (۱۳)

## فصل اول

### زوال پذیر ذہنیت کی جگہ خود اعتمادی پیدا کرنا

انسان جب دنیا میں وارد ہوا تو اس کی تعمیر و ترقی کا سامان پہلے سے آراستہ و پیراستہ موجود تھا۔ اس نے صرف اپنی فطری استعداد اور عقل و شعور سے کام لے کر اس سے گھریلو زندگی کا آغاز کیا۔ پھر چند گھرانوں کو ملا کر قبائلی زندگی بسر کرنے لگا۔ اس کے دائرے سے نکل کر شہری زندگی کی بنیاد ڈالی۔ پھر شہروں کو ملا کر ملک اور کئی ممالک کو ملا کر اقلیم بنا ڈالی۔ اس طرح صرف جغرافیائی حدود میں اضافہ نہ ہوا بلکہ انسانی تعلقات و روابط بھی روز بروز بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ساری دنیا ایک عالم گیر برادری اور محلہ کی صورت اختیار کر گئی۔

انسان جوں جوں گھریلو زندگی، قبائلی زندگی، شہری زندگی، ملکی زندگی، اقلیمی زندگی اور عالمی زندگی کی طرف قدم بڑھاتا چلا گیا۔ اسے منزل مقصود، منزل ہادی، مصلح، رہبر اور رسول ملتے چلے گئے جو اس کے ظرف، مزاج، حال اور ماحول کے مطابق اسے آداب زندگی سکھاتے رہے۔ اور درس انسانیت دیتے رہے۔ تاکہ روحانی، اخلاقی اور مواصلاتی طور پر ان کے اندر ایک عالم گیر اجتماعیت پیدا ہو سکے۔ اور دنیا میں ایک ایسا نظام، ایک ایسا تمدن، ایک ایسا آئین اور ایک



ایسا قانون راسخ ہو جائے کہ کالے اور گورے، آقا و غلام، حاکم و محکوم، افراد و قبائل کے فرق کے باوجود وہ سب آپس میں بھائی بھائی بن کر رہ سکیں۔ اور مدارج و مراتب کے فرق کے باوجود انسانیت کے معیار پر برابر اور پورے اتر سکیں۔

## مغربی اصول انسانیت:-

مغربی مفکرین اس بات کے قائل تھے کہ انسان انسانیت سے عبارت ہے۔ اگر انسانیت مٹ جائے تو پھر انسان انسان نہیں رہتا، حیوان بن جاتا ہے۔ درندوں کا روپ دھار لیتا ہے۔ سفاکیت و چنگیزیت پر اتر آتا ہے۔ بربریت اور سامراجیت کی طرف قدم بڑھانے لگتا ہے اور حصول اقتدار و اختیار کیلئے وہ سب کچھ کر گزرتا ہے جس کی مذہب، اخلاق اور قانون اجازت نہیں دیتا۔ اس سے امن عالم تباہ ہو جاتا ہے۔ انسان کا سکون و اطمینان برباد ہو جاتا ہے اور اس کی قلبی راحت و مسرت چھن جاتی ہے۔

اس لئے مختلف ادوار میں مختلف مفکرین نے انسان کو درس انسانیت دینے کیلئے دنیا کے سامنے مختلف اصول و آداب زندگی پیش کئے۔

سقراط:- 404 ق م۔

سقراط نے کہا کہ انصاف پسندی سب سے بڑی نیکی ہے اور بے انصافی عام برائیوں کی جڑ ہے۔ بچپن میں شرم و حیاء، نوجوانی میں اعتدال اور خدا کا ڈر، پیری میں کفایت شعاری اور عاقبت اندیشی بہت ضروری ہے۔

افلاطون:-

افلاطون نے کہا کہ دنیا میں دیانت اور عدل و انصاف قائم کیا جائے۔ افراد دیانت دار ہوں۔ حکومت عادل اور منصف اور مسرت و محبت کا دور دورہ ہو۔

ارسطو:-

ارسطو نے کہا کہ انسان ہر حالت میں اعتدال سے کام لے۔ اعمال صالح کی عادت ڈالے جس طرح وہ اپنی ذات کا دوست ہے۔ اس طرح وہ دوسروں کو بھی دوست رکھے۔

رسپنوز:-

رسپنوز نے کہا کہ انسانی محبت و مسرت اور خوشی میں دوسروں کو بھی برابر کا شریک بنائے۔ نوع انسان سے محبت کرنا خدا سے محبت کرنا ہے اور اسی لئے ہم دنیا میں آئے ہیں۔

## جان لاک:-

ان کا کہنا تھا کہ صداقت اتنی وسیع ہے کہ ہمارا ذہن اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اخلاق مطلق بھی ایک قرین عقل صداقت ہے اور تعمیر اخلاق کے لئے حسن تسلیم و رضا، انصاف محبت، رواداری اور پاسداری کی ضرورت ہے۔

## والٹیئر:-

ان کے نزدیک انسان کے ساتھ انسان کا وحشیانہ سلوک ناقابل برداشت تھا۔ انصاف اور تمام انسانوں کے ساتھ مساویانہ رواداری اس کے نزدیک ایمان کی نشانی تھی اور معاشرتی بے انصافیوں کے خلاف جہاد ضروری تھا۔

## کانٹ:-

کانٹ بھی صداقت پسند تھا اور صداقت سے روشناس ہونے کے لئے سائنس اور فلسفہ دونوں کو ضروری سمجھتا تھا۔ دنیا کو اپنی ”چشم باطن“ سے دیکھے اور خدا کو اپنی اخلاقی قوت اور دنیا کے حسن سے پہچاننے کو دعوت دیتا تھا۔

## ریمرسن:-

ریمرسن یہ چاہتا تھا کہ زندہ رہو۔ زندہ رہنے دو اور زندہ رہنے میں مدد دو۔ اگر انسانیت سے رہنا ہو تو میدان جنگ کے خیموں کو اکھاڑ دو۔ توپوں کو سرٹکوں کے کھمبوں میں ڈھال دو۔ سنگینوں اور برچھیوں کو مچھلیاں پکڑنے کے کانٹوں میں بدل دو اور سپاہیوں کو علمبردار امن بنا دو۔

## نٹشے:-

وہ گو کہ خود غرضی، عیش کوشی اور حصول قوت پر ایمان رکھتا تھا مگر یہ ضرور کہتا تھا کہ مسرت کی جستجو کرو کیونکہ جب سے انسانیت وجود میں آئی ہے اسے کسی قسم کا لطف حاصل نہیں ہوا۔

## ولیم جیمس:-

وہ چاہتا تھا کہ خدا کی مدد سے ایک باعمل زندگی گزارو اور تمہیں جو بصیرت حاصل ہے اسے دنیا کو بہتر بنانے میں لگا دو۔ کیونکہ برائی کے خلاف نوع انسان کی مشترکہ جدوجہد ہی میں زندگی ہے۔

لیکن باوجود اس کے کہ مغرب کے مفکرین نے انسان کی سیرت اور کردار سازی میں بڑا کردار ادا کیا مگر رفتہ رفتہ یہ قوم فریضہ حیات کو بھول گئی۔ اخلاقی شعور کا فقدان ہوا۔ نتیجتاً ہر طرف ابتری اور انارکی پھیل گئی۔

فلسفہ اجتماعیت کے مشہور ماہر ڈاکٹر لیبان نے کہا ہے۔

”ہر قوم میں انقلابات و تغیرات صرف اخلاق کے ذریعے ہوتے ہیں اور وہی اس کے مستقبل کا سنگ بنیاد رکھتے ہیں۔ اور جب کسی قوم کے اخلاق کا شیرازہ بکھر جاتا ہے تو وہ مرجاتی ہے۔“

ہم پر اس وقت یہی مردنی چھائی ہوئی ہے ہم دینی اور اخلاقی اقدار کے احیاء کی بجائے ہر نوع کی برائی میں اضافہ کرنے میں مصروف ہیں ہوس اقتدار اور زر پرستی نے ہمیں کہیں کانہیں رکھا۔

سرکاری اور غیر سرکاری پلیٹ فارموں سے اٹھنے والی ہر آواز اسلام کی داعی ہے مگر اسلام کی دعوت دینے والوں کا اپنا عمل اسلام کے مطابق نہیں۔ اس لئے ان کی آواز صدا بصر اء ثابت ہو رہی ہے۔ روس نظریاتی طور پر خدا کا مخالف ہے اور ہم عملی طور پر احکام خدا کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں۔ اور برملا کہہ رہے ہیں کہ خدائی یا شرعی حدود بہت سخت ہیں۔ یہ نہیں ہونی چاہئیں۔

قرآن کے آئینہ میں اگر بغور دیکھا جائے تو اسلام کی صحیح تصویر نہ تو توحید کے پرستاروں میں نظر آتی ہے اور نہ ہی شیع رسالت کے پروانوں میں۔ ان میں اگر زندگی کی رتن نظر آتی ہے تو وہ صرف مطالبہ بازی کی حد تک ہے۔ ارباب اختیار عوام سے طالب ہیں کہ اپنی زندگیاں اسلامی سانچے میں ڈھالیں۔ مذہبی اور سیاسی جماعتیں حکومت سے خواہاں ہیں کہ وہ آئین اسلام رائج اور نافذ کرے۔ ہماری ساری قوتیں اس کشمکش کی نظر ہو رہی ہیں۔ جس سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا اور نہ ہو سکتا ہے۔

سیرت اور اخلاق کی تعمیر مطالبات سے نہیں ہوا کرتی خود کمر ہمت باندھنے اور حالات کو بدلنے سے ہوا کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تعلیمات قرآن کی نشر و اشاعت کا کام کسی حکومت کے سپرد نہیں کیا تھا کہ وہ انہیں اپنی قوت قاہرہ سے نافذ کرے۔ نہ یہ کام سرمایہ داروں کے سپرد ہوا تھا کہ وہ اپنے سرمایہ ریزوں سے دین پھیلائیں۔ نہ یہ کام علماء و فضلاء کی کسی جماعت کے سپرد ہوا تھا کہ وہ تبلیغ و تلقین کرے اور نہ اس کے لیے کالجوں اور یونیورسٹیوں کا نظام تجویز ہوا تھا کہ وہاں اس کی تعلیم و تربیت دی جائے بلکہ تبلیغ دین کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے فرد واحد کا انتخاب کیا تھا جو سید الانبیاء والمرسلین حضرت محمد ﷺ کے نام سے موسوم تھا۔ اور یہ فریضہ تبلیغ ایسے وقت میں ان کے ذمہ لگایا تھا جب کہ گھر سے باہر تک کا سارے کا سارا ماحول غیر اسلامی اور دشمن جاں تھا۔ حضور ﷺ نے اس وقت اپنے خلق عظیم اور اسوۂ حسنہ کے ذریعے تعلیم قرآن سے لوگوں کو روشناس کرانے کی مہم کا آغاز کیا تھا۔ عوام اور خواص آپ کی ہر ہر ادا کو حرز جاں بناتے گئے اور فرداً فرداً اور عملاً عملاً پیغام قرآن دوسروں تک پہنچاتے گئے۔ لوگ ان کے کردار و اخلاق سے متاثر ہو کر اسی طرح

گروہ درگروہ دائرہ اسلام میں داخل ہوتے گئے حتیٰ کہ حضور ﷺ کے دور پاک میں اسلام 274 مربع میل یومیہ کی تیز رفتاری سے ہر طرف پھیل گیا۔

حضرت عمر فاروقؓ کی زندگی میں تو اتنی تیز رفتاری سے اسلام پھیلا کہ ایک انگریز مفکر کو یہ کہنا پڑا۔

**If Umar had lived for ten years more, there would have been  
Islam in all the World .**

اگر شاہراہ ترقی پر چلنا ہے تو پھر اسوہ حسنہ رسول پاک پر عمل کرنا ہوگا۔ اپنی زوال پذیر ذہنیت کو درست کرنا ہے اور خود اعتمادی پیدا کرنا ہے تو پھر اپنے کردار و اخلاق کو احکام الہیہ اور فرمان رسول پاک کے مطابق ٹھیک کرنا ہوگا۔ اس مرحلہ پر ممکن ہے کہ آپ یہ کہیں کہ ماحول کو ہم نے نہیں بگاڑا ان سینماؤں، منی سینماؤں، عریاں فلموں، آرٹ کونسلوں، نائٹ کلبوں، قحبہ خانوں، شراب خانوں، قمار خانوں اور ان کے سرمایہ دار سرپرستوں نے بگاڑا ہے۔ لہذا پہلے ان پر پابندی لگانی چاہیے۔ یہ مطالبہ ایسا ہے کہ جیسے کفار کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم میں ایسا جذبہ ہی پیدا کیوں کیا جو ہمیں برائی کی طرف راغب کرتا ہے۔ حالانکہ یہ سارا سامان عیش و عشرت اور لہو و لہب قدرت کے اسباب حجت ہیں۔ انہی سے اندازہ ہوگا کہ کون راہ ہدایت پر چلتا ہے اور کون راہ ضلالت اختیار کرتا ہے۔ قدرت کے نظام تکوینی کے تحت ہمارے ایمان و ایقان کے امتحان کے لئے ایسے سامان تعیش پیدا ہوتے رہیں گے۔ ان کے معرض وجود میں آنے کی اطلاع تو صادق امین ﷺ پندرہ سو سال پہلے دے چکے ہیں۔ اس لئے ہمیں فسق و فجور سے گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ ان کا توڑ تلاش کرنا چاہیے۔ اور احسن طریقے سے قوم کو ان کے مفسدات اور خطرات سے آگاہ کرنا چاہیے۔ اسے اس راستے پر چلنے سے باز رکھنا چاہیے۔ اپنے گھروں کے ماحول اور اپنے بچوں کی دینی تعلیم اور ان کے اخلاق و کردار کو اس طرح سنوارنا چاہیے کہ ان میں ایسے مقامات کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی سرے سے جرات ہی نہ رہے اور وہ وہاں تیزی سے آنکھ بچا کر گزر جائیں جیسا کہ قرآن کریم کا تقاضا ہے جب ان کی طرف کوئی التفات نہ کرے گا اور کسی کا دل ان کی طرف راغب نہ ہوگا تو یہ سامان تعیش خود بخود ختم ہوتا چلا جائے گا۔

اس لئے ہمیں دوسروں کی طرف ہاتھ پھیلانے یا نظریں اٹھانے کی بجائے خود اپنے گریباں میں جھانکنا اور اپنے اخلاق و کردار کو سنوارنے کی طرف توجہ دینی چاہیے اور اپنے گھر سے سیرت سازی کی مہم شروع کرنی چاہیے۔ جب تک ہم اپنے آپ کو درست نہیں کریں گے۔ موجودہ معاشرتی خرابیاں قطعاً درست نہ ہو سکیں گی۔ بہتر یہ ہوگا کہ ملک و ملت کی بقاء کیلئے ہمارے تمام رہنمایا قوم باہمی اتحاد، اتفاق، تعاون و تعمیر اخلاق کی ملک گیر مہم چلائیں جب ہم اخلاق

حسنہ کے پیکر ہو جائیں گے تو ذہنیت درست ہوگی۔ خود اعتمادی جیسی اور خوبیوں سے ذہن منور رہے گا۔ (۱۴)  
 صوفیائے کرام جنہوں نے قدم قدم پر اتباع رسول مقبول ﷺ کی۔ ان کی زندگیاں بھی ہمارے لئے مشعل راہ ہیں۔  
 صوفیائے کرام کو اللہ کا قرب کیوں حاصل ہوا اور کامل انسان کیسے بنے اللہ تعالیٰ کی محبت کی بدولت یہ مقام نصیب ہوا۔ محبت  
 کے معنی یہ ہے کہ انسان کی زندگی سٹ کر ایک مرکز پر آجائے اس کا بال بال پکارنے لگے۔

ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العلمین ہ (۱۵) ”بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی  
 ایک جہان کے پروردگار کے لئے ہے۔“

اس کو کوئی ایک لمحہ بھی بغیر اللہ کے چین نہ ملے۔ وہ عملاً اس ارشاد خداوندی کی تفسیر ہو۔

وما خلقت الجن و الانس الا ليعبدون (۱۶) ”میں نے انسانوں کو اور جنوں کو اسلئے پیدا کیا کہ وہ میرے

اس کے نفس کے تقاضے خاموش ہو جائیں۔ رضائے الہی اس کا مقصود ہو۔ وہ اپنے لیے رہنا چھوڑ دے۔ خدا کے لئے  
 جینے لگے۔

### خدا کیلئے جینا:-

کہنے کو تو ایک معمولی سا جملہ ہے لیکن اگر اس پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ارتقاء انسانیت کی آخری منزل یہی  
 ہے۔ ”خدا کیلئے جینے“ کے معنی یہ نہیں کہ انسان دنیا و مافیہا سے قطع تعلق کرے اور ایک گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر عبادت کرنے  
 لگے۔ وہ شادی بھی کرے۔ کھائے بھی اللہ کی مخلوق سے ملے بھی۔ لیکن اس طرح کہ وہ علاقے کے ہجوم اور تعلقات کے  
 اثر و حام میں گرفتار ہو کر اپنے معبود حقیقی کو نہ بھول جائے۔ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں سے مستفید ہو لیکن دنیا کی محبت اس کے  
 دل میں جگہ نہ حاصل کرنے پائے۔ وہ ہر کام میں رضا الہی کا طلبگار ہو۔

خدا کیلئے جینا، نیت کا ایک زبردست انقلاب ہے ایسا انقلاب جو انسانی زندگی کے مرکز و محور کو بدل دیتا ہے۔ انسان کا ہر  
 کام کسی اعلیٰ مقصد کی تکمیل کیلئے ہونے لگتا ہے۔ وہ دنیا کا ہر کام کرتا ہے لیکن اس کی نیت عام انسانوں سے مختلف ہوتی  
 ہے۔ یہ نیت کا وہ انقلاب ہے جو انسان کی زندگی میں ایک بنیادی تغیر پیدا کر دیتا ہے۔ (۱۷)

یہ صوفیائے کرام ہیں جو خود بھی کامل انسان ہیں اور دوسروں کو بھی اپنے رنگ میں رنگتے ہیں۔

اپنی روزمرہ زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا اعتقاد متزلزل ہے عقائد کی پختگی اور ایمان کے رسوخ کی جو

کیفیت ہمارے اسلاف میں تھی اس میں روز بروز تنزل اور بے کیفی طاری ہو رہی ہے نوجوان نسل اسلامی عقائد و نظریات سے دامن چھڑانے میں کوشاں ہے۔ شعائر اسلام اور دینی معاملات سے جو دلچسپی اور شغف پہلے لوگوں کو تھا، وہ موجودہ نسل میں مفقود ہے آج کل دینی و روحانی خانوادوں کی اولاد میں دین اور روحانیت کا اثر برائے نام نظر آتا ہے اور اس طرح ہم امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ دینی اور روحانی اقدار سے بے گانہ ہوتے جا رہے ہیں حتیٰ کہ نوجوان نسل میں تو کسی حد تک دین سے انحراف اور اسلامی تعلیمات سے بغاوت و نفرت کی فضا بھی نظر آتی ہے۔ یہ صورت احوال دینی و روحانی زوال کی عکاسی کرتی ہے۔

دوسرا پہلو اعتقادی و عملی زندگی کا تضاد بلکہ تضادم ہے اور یہ پہلو بھی ہر طرف محیط نظر آتا ہے۔ امت کے بڑے حصے میں اعتقاد و عمل کے مضامین میں ہم آہنگی اور سازگاری کی فضا باقی نہیں ہے۔ ہم جو کچھ جانتے ہیں ہمارے قلوب اس کی تصدیق نہیں کرتے۔ دین کی اساس پر ایمان کا دعویٰ اور اخلاق و روحانیت کی اعلیٰ اقدار سے شیفتگی کے زبانی و مجلسی مظاہر تو ضرور نظر آتے ہیں لیکن یہ سب کچھ مسجد یا مذہبی مجلسوں تک محدود ہے جبکہ زندگی کے عملی معاملات میں جو بازار، عدالت، گھر، سکول اور کاروبار سے متعلق ہیں ان میں ہم عملاً ان تمام ایمانیات اور اقدار کا عملی انکار کر دیتے ہیں اور اس طرح دین سے ہماری شیفتگی کی حقیقت کا تعین کرنے والے زیر لب مسکرا دیتے ہیں۔

جناب شفیض کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی!

گویا جن باتوں کو مانتے اور ان پر عمل پیرا ہونے کا ہم اقرار باللسان کرتے ہیں ان کی تصدیق بالعمل کی بجائے تکذیب بالعمل کے مرتکب ہوتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ، قول و فعل کا یہ تضاد عوام الناس کی زندگیوں میں ہی نہیں بلکہ ”خواص“ کی عملی زندگیوں میں بھی نہایت واضح نظر آتا ہے۔ جو لوگ رہنمائی کی مسندوں پر براجمان ہیں، امت کے مقتداء ہونے کا عملاً ادعا رکھتے ہیں۔ اور بظاہر ان کا لہجہ تلخ تبلیغ دین متین کے لیے وقف ہے وہ بھی قول و فعل کے تضاد میں عوام سے آگے نہیں تو پیچھے بھی ہرگز نہیں ہیں۔ ان کی خوش رنگ اور خوشنما تقریریں، دل کو لبھانے والے خلوص و اللہیت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے اقوال دراصل وہ خواب ہوتے ہیں جن کی تعبیریں ان سے برہم ہوتی ہیں۔ یہ سب کچھ تکمیل مقاصد کی مستور تدبیریں ہوتی ہیں جن سے تقدیریں بھی خفاء ہوتی ہیں۔ ان کا اپنا عمل اس شعر کے مصداق ہوتا ہے۔

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند

چوں خلوت می روند آں کار دیگر می کنند

یہ ایک عملی حقیقت ہے کہ عوام پر رہنمایان دین کے کردار و عمل کا گہرا اثر ہوتا ہے جب یہ لوگ اپنے مقام و مرتبہ

سے نیچے گرتے ہیں تو عوام کی نظر میں ان کا وجود کمرچی کرچی ہو جاتا ہے، ان کی توقیر کو، اپنے جوہر قابل کو چند مادی مفادات کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ اور یہ کائناتی حقیقت ان پر نافذ ہو جاتی ہے کہ

و من لا یکرّم نفسه لا یکرّم  
جو اپنی عزت نہیں کرتا اس کی عزت نہیں کی جاتی۔

رہنمایان دین کے اس رویے کے نتیجے میں دینی اقدار ہم گیر زوال کا شکار ہو جاتی ہیں جس کی عملی صورت ہمارے سامنے ہے اور اس صورت حال کا سب سے زیادہ Credit اسی طبقے کو جاتا ہے بقول شخصے

و ما افسد الدین الا الملوك و احبار سوء و رہبانها  
دین کو بادشاہوں، برے علماء، اور برے رہبان نے تباہ کیا ہے

کیا ہم نے کبھی عقیدہ عمل کے اس تضاد پر غور کیا ہے؟ کیا ہم نے کبھی اس بات پر توجہ دی کہ دینی اور اخلاقی و روحانی اقدار سے ہماری زندگی کیوں دور ہوتی جا رہی ہے؟ ضرورت تو یہ تھی کہ اس زوال کے اسباب و محرکات پر درد دل اور سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جاتا۔ اور مریض سے نفرت کی بجائے مرض سے نفرت کی جاتی ہے اس کا علاج کرنے کی سعی بلیغ کی جاتی لیکن ہم نے وطیرہ اپنایا کہ جہاں کہیں یہ تضاد نظر آیا، مرض کی خوفناک صورت سامنے آئی ہم نے مریض ہی کو فاسق و فاجر اور بے دین و بد عمل قرار دے کر خود کو مریض سے سبکدوش کر لیا اور مطمئن ہو بیٹھے۔

ہم نو جوان نسل کو دین سے گریزاں دیکھتے ہیں کہ وہ ایمانی اخلاقی اور روحانی اقدار سے بے گانہ ہے۔ دین پر عمل پیرا ہونے کی جو تڑپ ان میں نظر آنی چاہیے تھی وہ مفقود ہے تو ہم انہیں ناقابل توجہ سمجھتے ہوئے یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ یہ لوگ دین سے دور جا رہے ہیں۔ دین کے باغی ہیں، انہیں دین سے عناد ہے اور یہ سب قیامت کی نشانیاں ہیں۔ ایسی باتیں بنا کر ہم بزم خویش یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم دین کا دفاع کر رہے ہیں کما حقہ، اس کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ اور ہمیں دین کی بڑی تڑپ ہے۔ حالانکہ اس رویہ سے نہ تو دین اور روحانیت سے بیزار ہونے والوں کو اخلاقی اور روحانی اقدار کی طرف واپس لایا جاسکتا ہے اور نہ ہی عمل و اعتقاد کے تضاد کو ختم کیا جاسکتا ہے اگر ہمیں دینی اقدار سے واقعتاً محبت ہے اور ان کی ترویج کی امنگ ہے تو ہمیں نہایت سنجیدگی اور مثبت انداز فکر کے ساتھ تعصب کی عینک اتار کر تمام صورت حال پر غور کرنا ہوگا اور اس کے اسباب کا کھوج لگانا ہوگا کہ کن تدابیر سے اس بے راہ روی کا مداوا کیا جاسکتا ہے۔

## عملی و اعتقادی زوال اور اس کے اسباب

زوال، پریشانی، ابتلاء اور دین سے بغاوت کی جو صورت ہمیں نظر آ رہی ہے اس کے اسباب و علل کا کھوج لگا کر

علاج کی تدبیر کرنے کے لیے یہ حقیقت ہماری نظروں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ انسانی زندگی کا نظام تین بنیادوں پر استوار ہے۔

1- اعتقاد

2- علم

3- عمل

اور ان تینوں کے مجموعے کا نام دین ہے۔ جب زندگی حقیقی طور پر ان تینوں کے تمام تقاضے پورے کر دے اسی وقت وہ ایک متوازن دینی زندگی کہلانے کی حقدار ہے۔

1- عقائد نظری تعینات ہیں جن کو کسی خارجی ذریعے سے جان کر یا اندرونی سطح پر سوچ بچار کر کے انسان اپنے دل میں جاگزیں کر لیتا ہے اور پھر ذہن ان پر اس قدر جم جاتا ہے کہ وہ نظریات سے بڑھ کر یقینیات کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں مثلاً یہ کہ خدا ایک ہے وہ سب کا خالق و مالک اور پروردگار ہے۔ اس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے انبیاء اور رسل کو مبعوث فرمایا اور ان کے ذریعے ہم پر واضح کر دیا کہ موت کے بعد ہر انسان دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا قیامت آئے گی اور اس دن میزان قائم ہوگی جس میں ہمارے تمام اقوال و افعال کی مثبت اور منفی قدر متعین ہو جائے گی اور پھر اس پر جزا و سزا کا فیصلہ ہوگا جس کے نتیجے میں کوئی محمود ہوگا اور جنت میں جگہ پائے گا اور کوئی مذموم ہوگا اور جہنم کے حوالے کیا جائے گا۔ ہر نفس کو اس کے کئے کا صلہ ملے گا۔ یہ وہ نظری تعینات ہیں جن پر پختہ یقین کر لینے کو اعتقاد سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہی اجزائے ایمان ہیں اور انہیں کو اساسی ایمانیات سے تعبیر کیا جاتا ہے مختلف مذاہب میں عقائد بھی کئی طور پر یا جزئی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ہم اعتقاد کی بنیاد قرآن و سنت کی تعلیمات پر رکھتے ہیں۔ جبکہ دیگر مذاہب کے لوگ اپنی مذہبی کتابوں کی تعلیمات کے مطابق عقائد اختیار کرتے ہیں کسی کا عقیدہ موروثی ہوتا ہے۔ کسی کا علی وجہ البصیرت اگرچہ یہ بصیرت بھی اس کی اپنی ذات تک محدود ہوتی ہے۔

الغرض ہر انسان کچھ مخصوص اور مستقل نظری تعینات پر یقین رکھتا ہے۔ جو اس کے ذہن میں راسخ ہو جاتے ہیں

اور پھر یہی یقین اعتقاد سے موسوم ہوتا ہے۔

2- نظام حیات کی دوسری بنیاد علم ہے۔ علم حاصل کرنے کے کچھ ذرائع ہیں انسان جب عالم رنگ و بو میں قدم رکھتا ہے تو اسے بتدریج حواس نصیب ہوتے ہیں وہ دیکھتا ہے، سنتا ہے، سونگھتا ہے، چھوتا ہے اور چکھتا ہے ان متنوع ذرائع سے اسے شعور کا خام مواد میسر آتا ہے۔ اس خام مواد کو ڈھالنے کا سانچہ یعنی عقل بھی قدرت نے عطا فرمائی ہے ان



ادراکات و حواسات کے ذریعے جو خام مواد عقل کے سانچے پر عطا کی جاتی ہے جن پر خود سانچہ عقل ڈھالا گیا ہوتا ہے یا بالفاظ دیگر عقل کے سانچے میں جو معیارات اور پیمانے ہوتے ہیں انہی پر ادراکات کو جانچ کر ان کا درست اور جائز مقام انہیں دیا جاتا ہے اور اس شکل میں جو معلومات متعین ہو جاتی ہیں انہیں علم کا نام دیا جاتا ہے۔

علم کی بنیاد عام طور پر مشاہدات، تجربات اور ادراکات پر ہوتی ہے۔ گویا علم ایک محل عمل (Forum) ہے جو دنیا میں قدم رکھنے کے بعد انسان کو تجربات، ادراکات اور مشاہدات کی بنیاد پر حاصل ہوتا ہے۔

”اعتقاد“ کسی ہستی، طاقت، واقع یا حقیقت کو مان کر دل و دماغ میں جا گزیں کر لیتا ہے۔ اس طرح انسانی زندگی میں ایک قوت عقیدے کی ہوتی ہے اور دوسری علم کی جو مشاہدات و تجربات کی صورت میں انسان کو حاصل ہوتا ہے گویا عقیدہ مقدم ہے اور علم منوخر۔ اگر علم عقیدے کی درستی پر مہر تصدیق ثبت کر دے تو عقیدے کو پختگی نصیب ہو جاتی ہے اور پھر اسی پختہ بنیاد پر عمل کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

3۔ عمل درحقیقت عقیدہ و علم کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے اگر بد قسمتی سے عقیدہ و علم میں تضاد واقع ہو جائے۔ علم جو کہ ادراک و مشاہدہ سے استوار ہوتا ہے عقیدہ کو مضبوط نہ کر رہا ہو بلکہ علمی سطح پر شک و ریب کی آندھیاں عقیدے کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں تو عقیدے کی فسیل میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ بصیرتوں کی حقیقت اس عقیدے کی کفیل نہیں ہوتی آدمی ہر قدم پر سوالیہ نشان بن جاتا ہے اس کے اندر تشکیک و بے یقینی کی کیفیات ایک طوفان برپا کر دیتی ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ میں نے یہ سمجھ رکھا تھا جبکہ مشاہدہ اس کے الٹ نتائج دے رہا ہے۔ میرا عقیدہ یہ تھا جبکہ تجربہ و مشاہدہ اس کی تصدیق سے گریزاں ہے۔ میرا خیال تو یہ تھا کہ اہل حق دنیا و آخرت دونوں میں سرخرو ہوتے ہیں لیکن علم و مشاہدہ ثابت کر رہا ہے کہ حق کا نام لینے والے ناکامیوں اور نامرادیوں میں گھرے ہوئے دنیا میں ذلیل و رسوا ہو رہے ہیں جبکہ اس کے برعکس باطل کے علمبردار اور کفریہ عقائد کے معتقد دنیا میں کامیاب و کامران ہیں۔

اس مرحلے پر پہنچتے ہی آدمی کے ذہن میں خلش پیدا ہوتی ہے کہ میرے عقیدہ یا علم و مشاہدہ میں سے ایک چیز درست نہیں ہے ورنہ ان میں تضاد واقع نہ ہوتا۔ عقیدے کو اس نے دیکھا نہیں ہوتا بلکہ صرف مانا ہوتا ہے جبکہ علم تجربات و مشاہدات سے وضع ہوتا ہے لہذا علم و مشاہدہ کے مابین اس ٹکڑے سے عقیدہ کمزور اور بے جان ہوتا چلا جاتا ہے جو فرد کی عملی زندگی کو بے یقینی کی ضربوں سے تھس تھس کر کے رکھ دیتا ہے کیونکہ عمل میں عقیدہ کی برقی رو ہوتی ہے تو وہ جگمگاتا ہے اور جب عقیدہ جو کہ عمل کی بنیاد ہے کھوکھلا ہو تو عمل بھی فسیل ریگ ثابت ہوتا ہے جب عقیدہ اختیار کیا جاتا ہے تو اولاً اللہ کے خالق و مالک ہونے کا پختہ یقین دل میں جا گزیں ہوتا ہے، اطاعت کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ بندگی کا جذبہ ابھرتا ہے۔ جوں

جوں ایمان پختہ ہوتا چلا جاتا ہے توں توں ایمان کی پختگی بندے کو اطاعت کے لیے تیار کرتی جاتی ہے اب اللہ کو جو کچھ مان کر اس نے عقیدہ قائم کیا ہے اگر عملی زندگی میں اس کے ثمرات کا مشاہدہ نہ کرے تو عقیدہ و علم میں تضاد پیدا ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اطاعت الہی اور نیک اعمال کا جذبہ مرجھا جاتا ہے اور اس کی حالت گل خزاں رسیدہ کی سی ہو جاتی ہے جو حسن کی رعنائی اور خوشبو کی دلاویزی دونوں سے عاری ہوتا ہے جب عقیدہ ہی گل خزاں دیدہ و آفت رسیدہ ہو تو اس میں سے نیک اعمال کی خوشبو اور حسن کیسے جلوہ گر ہو سکتے ہیں جبکہ عمل کی قوت محرکہ صرف عقیدہ ہے جو خود جاں بلب ہوتا ہے۔

## فصل دوم

### انسانی فکر میں ارتقاء و جمود کا خاتمہ

#### تفکر ہی زندگی ہے:-

آج کی یہ ترقی یافتہ تہذیب اور عظیم الشان تمدن، انسان کی ذکاوت و ذہانت اور اس کی عقل و دانش کا نتیجہ ہے۔ اگر عقل کی یہ بیداری نہ ہوتی تو انسان کبھی قوانین حیات سے آشنا نہ ہو سکتا، وہ اسباب و وجود کو جان سکتا اور نہ کائنات میں کارفرما قوانین المیہ کا ادراک کر سکتا۔ بلکہ شاہراہ ترقی پر وہ ایک قدم بھی نہ چل سکتا اور یوں انسان اسی حالت پر قائم رہتا، جس حالت پر وہ پیدا کیا گیا تھا۔ نہ کوئی تبدیلی ہوتی اور نہ کوئی ترقی۔

مگر عقل فطین نے اپنی کامیاب جدوجہد سے انسان کو ان بندشوں سے آزاد کر دیا جن میں انسان عرصہ دراز سے جکڑ چلا آ رہا تھا۔ عقل نے انسان کو اس قابل کر دیا کہ وہ زمین کا سینہ چیر کر اس کے خزانے باہر نکالے۔ خشک سالی اور قحط پر قابو پائے۔ زمین کی پیداوار میں اضافہ کرے۔ دور دراز کی مسافتوں کو سمیٹ دے۔ تباہ کن بیماریوں میں کمی کرے۔ عقل کے ذریعہ سے ہی انسان نے بحر و بر اور فضا کے متعلق معلومات حاصل کیں اور بالآخر آج انسانی زندگی اس اعلیٰ اور بلند معیار پر پہنچ چکی ہے۔ جس کا ہمارے آباؤ اجداد خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔

#### جمود:-

جس طرح انسانی بدن کے ہر عضو کا کوئی نہ کوئی کام ہے۔ اسی طرح عقل کا کام غور و فکر کرنا ہے۔ اگر عقل، غور و فکر کو ترک کر دیتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عقل کا عمل ختم ہو گیا۔ اور اس نے اپنا فریضہ سرانجام دینا چھوڑ دیا چنانچہ اس کے نتیجہ میں زندگی کی نشوونما رک جائے گی اور جمود، موت اور فنا انسانی زندگی پر حکمران ہوگی۔

اسلام، عقل کو اس کی بندشوں سے آزاد کر کے اس کی ترقی کا خواہاں ہے۔ اسلام نے غور و فکر اور خبر و نظر سے کام لینے کی دعوت دی ہے اور اسے مغز دین اور اصل عبادت قرار دیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قل انظروا ماذا فی السموت والارض (۱۸)

”ان سے کہو کہ دیکھو تو آسمانوں اور زمین میں کیا ہے“

نیز فرمایا۔

قل انما اعظکم بواحدة ان تقوموا لله مثنیٰ وفرادی ثم کہہ دو کہ میں تمہیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں  
تتفکروا۔ (۱۹)

ایک ایک اور دو دو کر کے اللہ کیسے کھڑے ہو جاؤ پھر غور و فکر کرو۔

ابن حبان نے حضرت علیؓ کی روایت پیش کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا۔

لاعبادة کالتفکیر۔ (۲۰)

غور و فکر سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں۔

ابن عباسؓ اور ابو الدرداءؓ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔

حضرت سری سقطیؒ فرماتے ہیں۔

فکر ساعة خیر من عبادة سنة (۲۱)

ایک گھنٹہ کا تفکر، سال بھر کی عبادت سے بہتر ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک رات رسول اللہ ﷺ نے وضوء کیا اور نماز پڑھنی شروع کی ساری رات نماز پڑھتے رہے اور روتے رہے حتیٰ کہ حضرت بلالؓ نے آ کر صبح کی نماز کی اطلاع دی۔ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول ﷺ یہ رونا کیسا؟ اللہ تعالیٰ نے تو آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف کر دیئے ہیں۔ فرمایا کہ

یا عائشة افلا اکون عبداً شکوراً (۲۲)

اے عائشہ! کیا میں شکر گزار بندہ نہ ہوں؟

اور میں ایسا کیوں نہ کروں جب کہ آج ہی کی رات اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ آیتیں نازل کی ہیں۔

ان فی خلق السموت والارض و اختلاف الليل والنهار بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات اور  
لایات لاولی الالباب۔ الذین یدکرون اللہ قیاماً و آنے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ جو کھڑے  
قعود او علی جنوبہم و یتفکرون فی خلق السموت والارض (حال میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمان اور زمین کی  
ربنا ما خلقت هذا باطلا۔ سبحانک فقنا عذاب النار۔ (۲۳) ہمیں کمرے پر دغا را تو نے اس (مخلوق) کو بے فائدہ  
نہیں پیدا کیا ہے۔ تو (قیامت کے دن) ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔



## تقلید غور و فکر کے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ

تقلید، عقل کے استعمال میں رکاوٹ ہے۔ وہ عقل کو استعمال کرنے کا موقع ہی نہیں دیتی۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تعریف کی جو حقائق کی تلاش میں مخلص ہوتے ہیں۔ بحث و تہیص اور تحقیق و تدقیق کے بعد اشیاء کی حقیقت کو پہچان لیتے ہیں۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرم ہوتے ہیں۔ عمدہ اور بہترین چیز کا انتخاب کرتے ہیں اور باقی کو چھوڑ دیتے ہیں۔ ارشاد الہی ہے۔

وبشر عباد الذین یستمعون القول فیتبعون احسنه اولیک میرے بندوں کو بشارت سنادو۔ جو بات کو سنتے اور الذین ھداهم اللہ واولیک ھم اولوا الالباب (۲۷) اچھے اتباع کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت کی۔

اللہ تعالیٰ نے تقلید پرستوں کی سخت مذمت فرمائی ہے جو اپنے دل و دماغ سے سوچنے کی بجائے دوسروں کے دماغ سے سوچتے ہیں۔ قدامت پرستی پر جمے رہتے ہیں۔ آئین نو سے بدکتے اور طرز کہن پر اڑے رہتے ہیں۔ خواہ یہ جدید کتنی ہی واضح، روشن اور بین کیوں نہ ہو وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ ارشاد الہی ہے۔

واذا قیل لهم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما الفینا علیہ اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جو (کتاب) اللہ اباء نا اولو کان اباء ہم لا یعقلون شیاء ولا یتھتدون نے نازل کی اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں (نہیں) بلکہ ہم تو اسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔ بھلا اگر چہ ان کے باپ دادا کسی حق پرستوں اور نہ سیدھے راستے پر ہوں (تب بھی وہ انہوں کی پیروی کریں گے)۔

صوفیائے کرام کا معمول ہے کہ وہ ہر روز غور و فکر کیلئے ایک وقت مقرر کرتے ہیں۔ اور اسی بات کی تلقین اپنے عقیدت مندوں کو بھی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ہر وہ کام جس کا اللہ اور اس کے رسول نے حکم فرمایا ہو وہ سب سے بہتر ہے۔

اجتہاد کا اصول اسلامی فکر کا ایک نہایت اہم پہلو ہے جسے صدیوں تک مسلمانوں نے یوں نظر انداز کیا ہے جیسے انھیں اس اصول سے کچھ سروکار نہ تھا۔ اور جب کوئی قوم اپنے بنیادی اصولوں کی طرف سے غافل ہو جاتی ہے اور ان سے کام نہیں لیتی تو اسے اپنی غفلت کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ ہم یہ قیمت ادا کر رہے ہیں لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ

ہم آنکھیں کھولیں اور ماضی میں کی ہوئی غلطیوں کا علم حاصل کر کے ان کی تلافی کریں اور اصلاح احوال کی طرف صحیح قدم اٹھائیں۔

جو لوگ صدی نصف صدی زندہ رہنے کی خواہش رکھتے ہوں اُن کی بات اور ہے، مگر جو قومیں اور تہذیبیں صدیوں تک یا تا قیامت صفحہ ہستی پر اپنے آپ کو قائم و دائم دیکھنے کی آرزو مند اور دعویدار ہوں، ان کے لیے اور باتوں کے علاوہ ایک نہایت اہم بات یہ ہے کہ وہ ثبات اور تغیر کے باہمی ربط اور ان کی حقیقت کو واضح طور پر جانیں۔ زندگی نہ محض ثبات اور نہ محض تغیر ہے۔ اس کے کچھ عناصر ابدی اور کچھ تبدیلی پذیر ہیں اور کچھ وقت کے ساتھ بدلنے والے اور تغیر پذیر، ان دونوں عناصر پر نگاہ رکھنا مستقل اقدار کی مسلسل حفاظت کرنا اور بدلنے والے پہلوؤں میں حالات اور ضرورت کے مطابق تبدیلی لانا اور تبدیلی قبول کرنا بقا و دوام کی شرط اول ہے۔ محمد عربی صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا لایا ہوا دین ان معنوں میں بھی مکمل ہے کہ اس کے نظام میں ثبات و تغیر دونوں پہلو استقلال اور حرکت کے دونوں رخ موجود ہیں لیکن افسوس کہ اہل اسلام نے اس حقیقت کو نہ پوری طرح سمجھا اور نہ اس سے فائدہ اٹھایا۔ ہمارے زمانے میں حضرت علامہ اقبال جو اسلام کی بقاء اور استحکام کے ایک پر جوش مبلغ اور علمبردار تھے، نظام اسلامی کے اندر تغیر کے اس عنصر میں خصوصی دلچسپی رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے ارباب فکر اس سے پوری طرح آگاہ ہو کر اس کو کام میں لائیں۔ چنانچہ ان کا چھٹا خطبہ اسی موضوع پر ہے جس کے آغاز میں وہ لکھتے ہیں:-

"اسلام کی رو سے تمام زندگی کی روحانی اصل ابدی ہے جو اپنا اظہار تنوع اور تبدیلی میں کرتی ہے۔ لہذا جو معاشرہ حقیقت کے ایسے تصور پر مبنی ہو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ثبات اور تغیر میں تواضع پیدا کرے۔ ضروری ہے کہ اس کے پاس اجتماعی زندگی کو منظم کرنے کے لیے ابدی اصول ہوں کیونکہ مسلسل تبدیلی کی اس دنیا میں ابدی قدروں سے وابستگی ہی ہمیں استقامت بخشنے ہے لیکن ابدی اصولوں کو جب اس طرح سمجھا اور برتا جائے کہ ان سے تبدیلی کے تمام امکانات جواز روئے قرآن اللہ تعالیٰ کی عظیم نشانیوں میں سے ایک ہیں، ختم ہو جائیں، تو یہ اصول زندگی کو جو کہ فطرتاً حرکت قوت ہے، جامد اور بے جان بنا دیتے ہیں۔ سیاسی اور معاشرتی علم میں یورپ اس لیے ناکام ہوا کہ اس نے ابدی اصولوں کی قدر و قیمت نہ جانی اور گزشتہ پانچ سو سال سے اسلام پر اس سبب سے جمود طاری ہے کہ مسلمانوں نے تغیر کی اہمیت کو نہ سمجھا۔"

علامہ اقبالؒ نے اجتہاد کے موضوع پر جن قیمتی خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان کو باہسانی چند حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ لہذا ہم ان کو آئندہ صفحات میں ایک خاص ترتیب سے مطالعہ کرتے ہیں لیکن اس مطالعے سے پہلے مناسب

معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "اجتہاد" پر تھوڑی سی روشنی ڈال دی جائے۔ "اجتہاد" کے لغوی معنی انتہائی کوشش کرنے کے ہیں، لیکن اسلامی فکر کی اصطلاح میں اس کا مطلب اسلامی تعلیمات کی روح کے مطابق کوئی قانون وضع کرنا یا کسی نئی صورت حال میں آزادانہ فیصلہ (فتویٰ) دینا ہے۔ قرآن حکیم کی ایک آیت مبارکہ اس طرف ہماری رہنمائی کرتی ہے۔

والذین جاهدوا فینا لنہدینہم سبیلنا۔ (۲۹)

کے لئے اپنے راہ سیدھے کر دیں گے۔

لیکن ایک حدیث سے اس مسئلے پر بہت واضح روشنی پڑتی ہے۔ حضرت معاذؓ کو جب یمن کا حاکم مقرر کیا گیا تو ان کی روانگی کے وقت حضور نبی کریمؐ نے ان سے دریافت فرمایا کہ اے معاذ! معاملات کا فیصلہ کیسے کیا کرو گے؟ حضرت معاذ نے عرض کیا "یا رسول اللہ! اللہ کی کتاب کے مطابق۔" آپؐ نے فرمایا "اگر کتاب اللہ سے تمہاری رہنمائی نہ ہو تو؟" معاذ نے جواب دیا "تو رسول اللہ کی سنت کے مطابق۔" آپؐ نے فرمایا اور سنت رسولؐ سے بھی رہنمائی میسر نہ آئے تو؟ "حضرت معاذؓ نے جواب دیا پھر میں خود ہی کوئی رائے قائم کرنے کی کوشش کروں گا۔" دوسرے لفظوں میں نئے حالات اور نئی ضروریات میں کتاب و سنت کی روح کی مطابقت میں قانون سازی کرنا اور اجتماعی تنظیم کے نئے ضوابط مقرر کرنا اجتہاد ہے تاکہ زمانے اور ماحول کے اختلاف کے باوجود اسلام کے بنیادی تقاضے پورے ہوتے رہیں اور زندگی کے نظم و ضبط اور ترقی و ارتقاء میں بھی خلل واقع نہ ہو۔ اجتہاد کی یہی افادیت و معنویت تھی جس کی بدولت پہلی صدی ہجری میں جب اسلام کا دائرہ تیزی سے وسیع ہوا اور بڑے بڑے علاقے مفتوح ہو کر مملکت اسلامیہ میں شامل ہوئے تو اسلامی قانون ہر قسم کے نئے حالات کا سامنا کرنے کی پوری طرح اہل ثابت ہوا۔ تھوڑی ہی مدت میں اہل سنت کے چار بڑے فقہی مدرسے وجود میں آ گئے اور قانون سازی کا کام ایسی احتیاط و قابلیت اعتماد اور آزادی فکر کے ساتھ انجام پایا کہ جہاں مسلمانوں کا قدم پہنچا اور اسلامی تعلیمات کی روشنی پھیلی، ساتھ ساتھ نظم و تنظیم اور قاعدے قانون کی نعمت بھی عام ہوتی چلی گئی لیکن ایک مدت کے بعد قانون سازی اور اجتہاد کی یہ زندگی بخش لہر رک گئی اور جو کام پہلے ہو چکا تھا بعد میں آنے والوں نے اس کو کافی وشافی سمجھ لیا۔

اسلامی قانون و فقہ کی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگوں کے نزدیک اجتہاد کے تین درجے تھے: (۱) کامل آزادی کے ساتھ قانون سازی (۲) محدود آزادی جو کسی مخصوص مذہب و فقہ کی حدود کے اندر ہی کام میں لائی جاسکتی ہے اور (۳) وہ مخصوص آزادی جو محض ان مسائل میں استعمال کی جاسکے جن کا فقہ کے بانیوں نے خود کوئی حل تجویز نہ کیا ہو۔ یہ بات یہاں قابل ذکر ہے کہ علامہ اقبالؒ کی تمام گفتگو اجتہاد کے پہلے درجے یعنی کامل آزادی

کے حق کے استعمال سے تعلق رکھتی ہے۔

(۱) علامہ اقبال نے اپنے خطبے کے ابتدائی حصے میں ایک اہم سوال اٹھایا ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جن کے باعث مسلمانوں کے ارباب فکر و عمل نے یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہونا چاہئے، فقہ کے بڑے ائمہ کے بعد عملاً اُسے ایک شجر ممنوع قرار دے لیا۔ حالانکہ زندگی کے بارے میں قرآن حکیم کا جو متحرک نقطہ نظر ہے، اُس کی موجودگی میں مسلمانوں کا یہ رویہ تعجب خیز معلوم ہوتا ہے۔ خود علامہ نے اس صورت حال کے تین اسباب بیان کیے ہیں، جو مختصر اُیوں ہیں:

(۱) عباسیوں کے دور میں معتزلہ اور دوسرے عقلیت پسندوں نے جو طرز عمل اختیار کیا، اس سے عام مسلمان انہیں شک کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ مثلاً قرآن کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے کی بحث نے جو طول کھینچا اور جو تلخی پیدا کی، اُس سے مسلمانوں کے سوا و عظم نے انکار کر دیا اور حضرت ابو ہریرہ جیسے حدیث بیان کرنے والے بزرگ صحابی کو ضعیف قرار دینے میں تامل نہ کیا۔ اس بے روک سوچ بچار سے قدیم طرز فکر کے علمائے سمجھے کہ تحریک عقلیت مسلمانوں میں محض انتشار اور ضعف پھیلانے کا موجب ہوگی۔ لہذا اسلام کو بطور ایک نظام اجتماعیت محفوظ و مستحکم بنائے رکھنے کی فقط یہ صورت ہے کہ شریعت کی سختی کے ساتھ پابندی کا مطالبہ کیا جائے اور نئے قوانین و ضوابط وضع کرنے سے اجتناب برتا جائے۔ یہ احتیاط پسندی قدرتا اجتہاد کی راہ میں ایک زبردست رکاوٹ بن گئی۔

(۲) صوفیانہ تحریک کا فروغ اس رویے کا دوسرا بڑا سبب تھا۔ اس تحریک کے بعض عناصر غیر اسلامی بھی تھے، لیکن جہاں تک اس کے خالص مذہبی پہلوؤں کا تعلق ہے، یہ گویا تصوف خدا پرستی اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر بحث و تکرار کے خلاف اعلان بغاوت تھی۔ حضرت سفیان ثوریؒ کی مثال یہاں قابل ذکر ہے۔ وہ ایک بہت برے فقیہ تھے اور قریب تھا کہ خود ایک فقہ کے مدرسے کے بانی بن جاتے، مگر ان کی طبیعت میں تصوف کا میلان بھی زبردست تھا، لہذا وہ فقہ کی خشک بحثوں سے تنگ آ کر صوفیانہ مشاغل کی طرف ایسے متوجہ ہوئے کہ بالآخر تصوف ہی کے ہو کر رہ گئے اور اس تحریک کے لیے بڑی قوت ثابت ہوئے۔ جہاں تک فکری پہلو کا تعلق ہے، تصوف آزادی خیال ہی کی ایک صورت ہے جو عقلیت سے ایک گونا گونا مماثلت رکھتی ہے۔ تصوف نے ظاہر اور باطن کے فرق پر جو اس قدر زور دیا، تو اس کی بدولت ایک ایسا رویہ پیدا ہوا جو ظاہر سے تعلق رکھنے والی ہر بات کو غیر اہم اور بے حقیقت خیال کرتا تھا اور عام مسلمانوں کی نگاہ میں فقہ بھی بڑی حد تک ظاہر سے تعلق رکھتی تھی۔ اس تحریک میں آزادی فکر اور علائق دنیا سے بے تعلقی کی جو کشش تھی، اس نے مسلمانوں کے بہترین دماغوں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس طرح معاشرت، قانون اور سیاست کے میدان میں دوسرے



درجے کے لوگ رہ گئے۔ ان حالات میں مملکت اور علماء نے عافیت اس میں دیکھی کہ فقہ کے پرانے دستوروں پر سختی سے کاربند رہیں۔

(۳) اس پر مستزاد یہ کہ تیرھویں صدی عیسوی کے وسط میں بغداد کی تباہی کا سانحہ پیش آیا۔ جن مسلمان مورخین نے اس داستان غم کو قلمبند کیا ہے ان سب کے دلوں کی مایوسی اور اسلام کے مستقبل کے بارے میں ان کی ناامیدی ان کی تحریروں سے ظاہر ہے۔ لہذا اس ڈر سے کہ کہیں مسلمان معاشرے میں مزید انتشار اور افتراق راہ نہ پا جائے ختمہ دار لوگوں نے اس شریعت سے وابستگی کو اپنا شعار بنا لیا جو فقہ کے قدیم مدرسوں نے پیش کی تھی۔ وہ معاشرتی تنظیم کی بقا چاہتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے طرز عمل میں ایک حد تک حق بجانب تھے، کیونکہ مروجہ قانون سے وابستگی قومی تنظیم کو برقرار رکھنے میں مددگار ہوتی ہے، لیکن اس طرز عمل کے نقصانات اس کے فائدوں سے کم نہیں ہوتے۔

کسی قوم کی آخری تقدیر کا انحصار تنظیم پر اتنا نہیں ہوتا "جتنا اُس کے افراد کی ذاتی صلاحیت اور انفرادی قوت پر ہوتا ہے۔ ایک بے حد منظم معاشرے میں فرد کی انفرادیت کچلی جاتی ہے۔ وہ اپنے ارد گرد کے تمام معاشرتی فکر کا تو سرمایہ بن جاتا ہے، لیکن اس لین دین میں اپنی خودی، اپنی رُوح کھو بیٹھتا ہے۔ پس ماضی کی تاریخ سے جھوٹی عقیدت اور اس کا مصنوعی احیاء کسی قوم کے زوال کا علاج نہیں ہو سکتا، جیسا کہ عہد حاضر کا ایک مورخ لکھتا ہے: "تاریخ کا فتویٰ یہ ہے کہ پرانے خیالات کسی ایسی قوم میں دوبارہ قوت حاصل نہیں کر سکتے جس نے ایک دفعہ انھیں استعمال کر کے بوسیدہ کر دیا ہو" لہذا کسی قوم کو زوال کے چنگل سے چھڑانے کے لیے صرف ایک ہی موثر صورت ہے اور وہ ہے خود شناس انسانوں کی پرورش اور افزائش۔ ایسے افراد ہی زندگی کی گہرائیوں کا راز کھولتے ہیں۔ یہی ہم پر وہ نئے معیار آشکار کرتے ہیں جن کی روشنی میں ہمیں دکھائی دینے لگتا ہے۔ کہ ہمارا ماحول کلیہ غیر متبدل نہیں اور اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ تیرھویں صدی اور بعد کے فقہاء میں ماضی کے ساتھ جھوٹی عقیدت کی بناء پر حد سے زیادہ تنظیم کا میلان اسلام کی داخلی روح کے منافی تھا۔ امام سیوطیؒ اور امام غزالیؒ نے اس سلسلے میں انتھک محنت کی اور صف اول کے مبلغین میں شامل ہوئے۔

علامہ اقبالؒ نے اجتہاد کی تاریخ پر ایک سرسری سی نظر ڈالتے ہوئے ہمیں بتایا کہ کس طرح علامہ سیوطیؒ اور امام غزالیؒ نے بندھے ٹکے فقہی خیالات کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور شدید مخالفت کے باوجود اپنے لیے اجتہاد کا حق منوایا اور فکر نو کے لیے راہیں کھولنے کی عظیم جدوجہد کی۔ امام سیوطیؒ نے اس بات کے ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ فقہ اسلامی کی تکمیل ہو چکی ہے اور جو کچھ ائمہ کبار لکھ چکے ہیں ہمارے لیے بس وہ کافی ہے۔ انھوں نے نئے حالات میں نئی فقہ مدون کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ انہوں نے اصول اجتہاد پر زور دیا۔ تاہم اس تحریک پر اقبالؒ کی ناقدانہ رائے کا آخری حصہ نہایت

غور طلب ہے:

"داخلی طور پر یہ تحریک بھی ایک قسم کی قدامت پسندانہ تحریک تھی۔ اس لیے کہ ایک طرف تو یہ فقہی مذاہب کی قطعیت کے خلاف بغاوت کرتی ہے اور ذاتی فیصلے کے حق کی شدت سے حامی ہے لیکن دوسری طرف ماضی کے متعلق اس کا نقطہ نظر بھی بالکل غیر ناقدانہ ہے اور فقہی (قانونی) مسائل میں یہ زیادہ تر احادیث پر تکیہ کرتی ہے۔"

(۲) علامہ اقبالؒ نے اپنے اس نہایت فکر انگیز خطبے میں اگرچہ اسلامی تاریخ اور بالخصوص اجتہاد اسلامی کی تاریخ کو پیش نظر رکھا ہے تاہم مضمون کے مجموعی مطالعے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کی زیادہ تر دلچسپی ہمارے جدید مسائل اور اسلامی ممالک کی نئی صورت حال میں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے اس مضمون میں جدید تاریخی پر خصوصی توجہ دی ہے اور اس کے فکری رجحانات کے قدرے مفصل جائزے کو ضروری خیال کیا ہے۔ وہ اس حصہ مضمون کے آغاز میں ہمیں بتاتے ہیں کہ ترکیہ کی حالیہ تاریخ ہمیں اجتہاد کی روح کو سمجھنے میں خاصی مدد دے سکتی ہے اور اگر اس اسلامی ملک کی نئی صورت حال کا گہری نظر سے تجزیہ کیا جائے تو اس کی روشنی میں جدید اسلام کے بہت سے مسائل ہماری سمجھ میں آسکتے ہیں۔

جنگ عظیم اول سے کچھ عرصہ پہلے کی سلطنت عثمانیہ پر نظر ڈالنے سے ہمیں معلوم ہوگا کہ وہاں دو مدرسہ ہائے فکر خصوصیت کے ساتھ سرگرم عمل تھے۔ پہلا گروہ قوم پسندوں کا تھا اور دوسرا گروہ اصلاح مذہب کے علمبرداروں کا، قوم پسند گروہ (نیشنل پارٹی) مذہب کے مقابلے میں ریاست اور سلطنت کو زیادہ اہمیت دیتا تھا اور ریاست کے استحکام کی خاطر چاہتا تھا کہ مذہبی معاملات کو ملکی امور میں دخل انداز ہونے کا کم سے کم موقع دیا جائے۔ آخری تجزیے میں یہ مدرسہ فکر دراصل مذہب اور ریاست کی علیحدگی کا قائل تھا۔ اس مدرسہ فکر پر تنقید کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے پہلے تو اسلامی نقطہ نظر سے دین اور دنیا کی تفریق سے بحث کی ہے اور پھر اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ ترکیہ کے ان قوم پسندوں نے مذہب سمیت باقی تمام امور زندگی پر ریاست کی فوقیت کا تصور کہاں سے اخذ کیا اور کیوں؟

حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم اور حضور رسالت کا اسوہ حسنہ مذہب کی تاریخ میں اس لیے بھی غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں کہ انہوں نے دین و دنیا کی قدیم تفریق کو بیک قلم مٹا کر زندگی کی وحدت کا ایک روشن اور توانا تصور دنیا والوں کو عطا کیا۔ قدیم زمانوں سے یہ خیال انسانی ذہنوں میں راسخ چلا آتا تھا کہ عبادت اور پوجا پاٹ کرنا، مندروں، کلیساؤں اور خانقاہوں میں جا کر چڑھاوے چڑھانا، چلے کاٹنا، دُنیا سے منہ موڑ کر تلاش حق میں جنگلوں کی طرف نکل جانا اور اس طرح کی دوسری مذہبی رسوم کا ادا کرنا تو دینداری ہے، لیکن دُنیا کے دھندوں میں مصروف ہونا، محنت و مشقت کر

کے اپنی مادی زندگی کو آسودہ و خوشحال بنانا، بال بچوں کی دیکھ بھال اور بیوی کی رفاقت کو عزیز جاننا اور دوستوں اور عزیزوں پر توجہ دینا دینداری نہیں، دُنیاداری (مادہ پرستی) ہے اس تفریق کی تہ میں دراصل دنیا کے نجس اور ناپاک ہونے کا تصور کام کرتا تھا۔ اسلام نے اس تصور کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ اس نے دنیا کو عمل گاہ قرار دے کر اس کی حیثیت کو یکسر بدل دیا۔ اسلامی تعلیمات نے ہمیں بتایا کہ عمل کی اصل نیت ہے۔ جس شخص کا عقیدہ درست اور نیت نیک ہے اس کا ہر کام ہر دنیادی فعل دینداری کا عمل ہوگا۔ ایک خدا پرست موحّد کا شادی کرنا، روزی کمانے کے لیے مشقت کرنا، بیوی بچوں کی نگہداشت کرنا، حتیٰ کہ اس کا بازار سے سودا سلف خرید کر لانا بھی عبادت میں داخل ہو سکتا ہے اور ایک ریاکار اور نمائش پسند انسان کی نماز اور خیرات بھی اصل دینداری سے کوسوں دور ہو سکتی ہے۔ اس لحاظ سے ریاست کا قیام اور اس کا استحکام (اگر امن اور بہبود عامہ کی نیت سے ہو) خود ایک دینی کارگزاری ہے، کیونکہ ایسی ریاست اخلاقی و روحانی قدروں کے نفاذ کا ذریعہ ہی تو ہے۔ لہٰذا اسلام کے اندر ریاست اور مذہب کی تفریق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہماری تمام دنیاداری (بشرطیکہ اس کا محرک روحانی و اخلاقی ہو) دینداری کا حکم رکھتی ہے۔ یہاں اقبالؒ نے اس نکتے کی بھی وضاحت کی ہے کہ اسلام میں اگر مذہبی ریاست (تھیوکریسی) ممکن ہے تو انہی معنوں میں کہ اسلامی ریاست کے اغراض و مقاصد اخلاقی و روحانی ہیں ورنہ اسلام میں کسی ایسی مذہبی ریاست کی ہرگز گنجائش نہیں جس پر مذہبی گروہ (علماء) کا قبضہ ہو یا جس کا سربراہ خلیفۃ اللہ بن کر اپنی معصومیت کا جواز پیدا کر لے۔

اس کے بعد علامہ نے بتانے کی کوشش کی ہے کہ دین و دنیا کی علیحدگی کا جو تصور آہستہ آہستہ ترکیہ میں جڑ پکڑ رہا ہے، اس کا مولد و منشایورپ ہے۔

یورپ کا یہ ذہن اس کی صورت احوال میں ایک بنیادی تضاد کی بدولت پیدا ہوا تھا، لیکن اسلام میں وہ تضاد موجود نہیں لہٰذا مسلمانوں کے لیے اس قسم کے کسی تصور کو اپنانے کا جواز نہیں نکل سکتا۔ لکھتے ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ ترکی کے قوم پسندوں نے دین اور دنیا سے الگ ہونے کا تصور یورپ کی تاریخ افکار سیاسی سے لیا ہے۔ قدیم عیسائیت کی بنیاد ایک سیاسی یا مذہبی نظام کی حیثیت سے نہیں رکھی گئی تھی بلکہ اس نجس و ناپاک دنیا میں اس کی صورت ایک خانقہ سلسلے کی تھی جس کا ملکی امور سے کوئی تعلق نہ تھا اور جو عملی طور پر تمام امور میں رومی حاکمیت و اقتدار کو قبول کیے ہوئے تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کے عیسائی ہو جانے پر کلیسا اور حکومت دو جدا گانہ طاقتوں کی حیثیت میں اقتدار کی خاطر ایک دوسرے کے حریف بن گئے ایسی صورت حال اسلام میں کبھی پیدا نہیں ہو سکتی تھی، اس لیے کہ اسلام کی ابتدا ہی ایک معاشرتی نظام کی حیثیت سے ہوئی، جو قرآن کے سیدھے سادے قانونی اصولوں پر مبنی تھا۔

یہ اصول رومیوں کے بارہ اصولوں کی مانند نہ تھا جیسا کہ بعد کے تجربے نے پوری طرح ثابت کر دیا، تشریحی اور توضیحی اعتبار سے اپنے اندر نشوونما کی عظیم صلاحیتیں رکھتے تھے۔ لہذا سلطنت کا قوم پرستانہ نظریہ اس لحاظ سے غلط ہے کہ وہ ایک ایسی شویت کا قائل ہے جو اسلام میں موجود نہیں۔

اوپر جو کچھ بیان ہوا ہے وہ ترکی کے قوم پسندوں کے متعلق تھا۔ اس کے برعکس سلطنت عثمانیہ میں دوسرا طاقور نقطہ نگاہ مجلس اصلاح مذہب کا تھا، جس کی قیادت اس زمانے میں سعید حلیم پاشا (سابق وزیر اعظم ترکیہ) کے ہاتھ میں تھی۔ یہ حضرات اس حقیقت پر زور دیتے تھے کہ آزادی، مساوات اور اتحاد جیسی غیر فانی سچائیوں کی آفاقیت کے لحاظ سے اسلام کا کوئی مخصوص وطن نہیں ہے۔ جس طرح ریاضی کو ہم جرمن ریاضی اور برطانوی ریاضی میں تقسیم نہیں کر سکتے اور جس طرح ہم کیمیا کو فرانسیسی کیمیا اور روسی کیمیا نہیں کہہ سکتے اس طرح ہم عالم گیر اسلام کو جو زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہے، ترکی اسلام ایرانی اسلام یا ہندوستانی اسلام میں منقسم نہیں کر سکتے۔ مجلس اصلاح مذہب، جدید مغربی تہذیب کو جس کی بنیادیں خود غرضی کے تصور پر منقسم ہیں محض بربریت خیال کرتی تھی۔ اس کے نزدیک صنعتی نظام کا فروغ ایسی بداندیشی سے ہو رہا تھا جس سے انسانیت متصادم گروہوں میں بٹ گئی تھی اور مقامی اور غیر انسانی وفاداریاں قوت کے ساتھ ابھر رہی تھیں۔ سعید حلیم پاشا نے اپنی بعض تحریروں میں اس امر پر سخت افسوس ظاہر کیا ہے کہ خود اسلامی معاشرے مقامی اثرات اور قبل از اسلام کی بعض توہم پرستیوں سے متاثر ہو کر انسانی اتحاد کے رشتے کو کمزور کر رہے تھے اور اس سے اسلام کی حقیقی روح خود مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اس حصہ مضمون میں علامہ نے سعید حلیم پاشا کی تحریک جو اقتباس درج کیا ہے اس کی آخری سطریں یوں ہیں:-

"اصول توحید کی بے داغ پیشانی پر کم و بیش "بت پرستی" کی مہر ثبت کر دی گئی ہے اور اسلام کی اخلاقی قدروں کی عالمگیر اور غیر شخصی خصوصیت مقامی رنگوں کی تہ میں غائب ہو گئی ہے۔ اب ہمارے لیے ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ ہم اسلامی روح سے اس کے غلاف کو نوچ پھینکیں جس نے ایک حرکی نظریہ حیات کو ساکن و جامد بنا رکھا ہے اور پھر سے آزادی مساوات اور استحکام کی صداقتوں کو معلوم کریں تاکہ ان کی سادگی اور عالمگیریت کی روشنی میں ہم اپنے اخلاقی معاشرتی اور سیاسی نصب العین کی دوبارہ شیرازہ بندی کر سکیں۔" (۳۰)

## فصل سوم

### فکر انسانی کو ارتقاء کی راہ پر گامزن کرنا

فلاسفہ قدیم و جدید کے افکار کی رو سے حیات و کائنات کی دو توجیہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک توجیہ فطرت کے توسط سے اور دوسری توجیہ ذہن کے توسط سے۔

ذہن کے توسط سے حیات و کائنات کی جو تعبیریں کی جاتی رہی ہیں۔ ان کا ذکر اختصاراً تحریر کیا جاتا ہے۔  
ایڈورڈ ڈیلر نے فلسفہ یونان کی تاریخ کے خاکے میں صراحتاً بیان کیا ہے کہ فلسفہ اپنے خاص مفہوم میں چین، ہندوستان اور یونان میں رواج پاسکا۔

- 1- فلسفہ چین، فلسفہ کم اور باطنیت زیادہ رکھتا ہے اور مذہب سے بھی رابطہ نسبتاً زیادہ ہے۔
- 2- اہل ہند کا فلسفہ مطلق اور آزاد فلسفہ نہیں ہے۔
- 3- یونانی فلسفہ اپنی خصوصیت میں آزاد اور غیر جانبدار ہے۔ چین، ہندوستان اور یونان نے انسانی شعور اور اس کے فکر و عقل کو جس حد تک بڑھایا ہے اس کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

### (الف) قدیم ہند کا فلسفہ:-

ڈاکٹر ایس این داس گپتا نے ہندی فلسفہ پر جو بحث کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قدیم ہند کا فکر و فلسفہ تجسس اور حس سے شروع ہوا اور خرد کی راہ سے تصویریت کی منزل تک پہنچ گیا۔ جہاں حقیقت کا تصور یہ ہے کہ وہ غیر متغیر، مطلق اور ساکن محض ہے۔ زندگی کے دیگر پہلوؤں کو کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ مجرّ ذکر کو اس سے استفادہ ہو سکتا ہے۔

### (ب) تاؤ ازم:-

انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں تاؤ ازم پر جو بحث کی گئی اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قدیم اہل چین کا شعور حیات اہل ہند کی فکری تصویریت سے مبرا نظر آتا ہے۔ یہاں استدلال فکر کی کمی کے باوجود انسانی شعور کی ارتقائی منزل واضح اور نمایاں ہے۔

### (ج) فلسفہ یونان:-

الفرد و بیر نے یونانی فلسفہ کے ادوار پر بحث کی ہے۔

1- ملطی مکتبہ فکر 2- فیثاغورثی فلاسفہ 3- ایلاتی مفکرین 4- سوفسطائی

5- سقراط و افلاطون 6- نوافلاطونیت

1- انہوں نے مبداء اشیاء کے مسئلہ تک اپنی فکر کو محدود رکھا۔

2- تناخ ارواح کا عقیدہ اور عدد کو فطرت اشیاء قرار دینے کے باوجود ان کا نظریہ حیات ایک خاص منزل کی نشاندہی کرتا ہے۔

3- ان کے نزدیک حقیقت غیر متغیر، لامتناہی اور ناقابل تقسیم ہے۔ اشیاء کی کثرت کو رد کیا ہے۔

4- ان کے نزدیک علم اس حد تک قابل قدر ہے کہ زندگی ترتیب میں رکھنے کا ذریعہ بن سکے۔ انسان کے بارے میں ان کا تصور فرد تک محدود ہے۔

5- سقراط کے انسانی فطرت اور خیر و شر کے بارے میں تصورات صوفیہ سے مختلف ہیں۔

افلاطون کے بارے میں برٹریڈ رسل نے کہا کہ ان کا نقطہ نظریہ ہے۔

”حقیقت، اشیائے محسوسات یا مظاہر کا حصہ نہیں بلکہ تصورات اور انکی مثل کا حصہ ہے۔“

6 ان کا فلسفہ یونان کے تین فلاسفر اور افلاطون کے افکار کی نمائندگی کرتا ہے۔

انسانی شعور اور اس کے ارتقاء کا مطالعہ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے شروع کیا گیا تھا کہ ذہن و فکر کے توسط سے حیات و کائنات کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے۔

مختلف مکاتب فکر کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوا کہ ابتداءً ان کی فکر کے دو منہاج مقرر ہو چکے ہیں۔ ایک حقیقت کا حیاتی منہاج اور دوسرا عقلی منہاج۔ یہی دونوں آج بھی قائم ہیں اور مغرب و مشرق کے بہت سے ملکوں کی ذہنی، اخلاقی، سیاسی اور تمدنی زندگی کو متاثر کر رہے ہیں۔

## ذرائع علم:-

اس میں شک نہیں کہ انسانی شعور نے حس اور عقل کی منہاج پر ارتقاء کی منازل طے کی ہیں لیکن محض حس اور خرد کی بنیاد پر دعویٰ آگہی یک طرفہ اور جزئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقت واحدہ کی تعبیر میں ایک دوسرے سے اس قدر متباہن و متضاد ہیں کہ کسی ایک تعبیر کو معتبر خیال کرنا خاصا دشوار ہے۔ اس اعتبار سے ادراک حقیقت کے تمام ذرائع کو اعتدال کے ساتھ استعمال کرنے سے حقیقت کا متوازن اور حکیمانہ تصور ابھر سکتا ہے۔ ایک ذریعہ علم پر انحصار حقیقت سے دور، ادراک تو کجا حقیقت ملتبس ہو جاتی ہے۔ ایسے علم کی ضرورت بھی لاحق رہے گی جو ماورائے احساس و عقل ہو۔ جس کا طرز ادراک اصطلاحی عقل و احساس سے جدا گانہ ہو۔ یہ علم ہے جسے وجدان کہتے ہیں۔

## وجدان بحیثیت ذریعہ علم:-

انسانی شعور اور اس کے ارتقاء کی نوعیت کے بارے میں قطعی رائے کا اظہار کے لئے وجدان کا مطالعہ ضروری ہے۔ حیات و کائنات کے حقائق کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے علم کا مثبت رویہ اختیار کرنا ہی مفید ہے۔ کائنات کے تکوینی نظام پر غور و فکر کرنے کے بعد نہ مابعد الطبیعات سے انکار کی گنجائش ہے نہ باری تعالیٰ کے وجود حقیقی سے۔ اس حقیقت تک رسائی کے لئے فکری منہاج کے اصلاح کی ضرورت ہے۔

بقول اقبالؒ

عقل گواستاں سے دور نہیں  
اسکی تقدیر میں حضور نہیں  
گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور  
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

اقبال کے نزدیک وجدان کی بہت اہمیت ہے تاہم عقل سے بیر نہیں۔ حقائق حیات کی تفہیم میں عقل و خرد کو جو اہمیت حاصل ہے اس کی وہ تائید کرتے ہیں۔

علامہ اقبال نے فلسفیانہ استدلال سے جو نتائج اخذ کئے ہیں۔ رومی اور ابن یمن وجدان اور جاذبہ عشق کے ذریعے وہاں پہنچے ہیں۔

شاہ محمد ذوقی اپنی تصنیف سر دلبراں میں وجد کے بارے میں فرماتے ہیں۔  
وجد: احوال صادقہ جو قلب پر اس وقت وارد ہوں۔ جبکہ قلب شہود میں فانی ہو۔

ان بیانات کی روشنی میں ادراک حقیقت کے لئے وجدان ایسا ہے جس کے ذریعے حقیقت مطلقہ بصورت معروضہ مدرک ہو سکتی ہے۔

علوم کے یہ تمام منابع اور رویے جنہوں نے انسانی شعور کے ارتقاء میں بطور واسطہ کردار ادا کیا ہے۔ تصوف کی اساس اور نوعیت کو متعین کرنے میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے تصوف کا نصب العین عالم انفس و آفاق کے حقائق سے آشنا ہوتے ہوئے ذات کبریا سے قرب حاصل کرنا ہے۔ گویا تصوف نے معروض و موضوع میں فرق پیدا کئے بغیر دونوں کو ایک ہی مسلک میں پرو دیا ہے اور تمام حقیقتوں کو حقیقۃ الحقائق کے جلوؤں میں دیکھا ہے۔ اس معنی میں تصوف کے اصول و عقائد، مبادیات نیز صوفیہ کا مسلک اور طرز احساس اسلام کی بنیادی تعلیم یعنی توحید اور واحدانیت کے نقیض نہیں ہیں بلکہ عین مطابق ہیں اور وحی الہی نے جو راہ مقرر کی ہے اس سے سرمو تجاوز نہیں کرتے۔ (۳۱)

## دعوت فکر کا نتیجہ:-

یہ غور و فکر کی دعوت کا نتیجہ تھا کہ آزادانہ سوچ بچار کا آغاز ہوا۔ عقل نے نظروں تامل سے کام لیا اور علم و فکر کے ماہرین پیدا ہونے لگے۔ عقائد، فلسفہ، فقہ، غرضیکہ ہر علم و فن کے امام پیدا ہوئے۔ جنہوں نے بحث و تدریس اور اجتہاد سے علوم کو جلا بخشی۔ وہ غور و فکر میں پوری طرح آزاد اور خود مختار تھے۔ اس سلسلہ میں کسی قسم کی پابندی ان کے راستے میں حائل نہ تھی۔ اس کے نتیجہ میں اس تہذیب نے جنم لیا، جس پر ہم مسلمانوں کو بجا طور پر فخر ہے اور یہی یورپ کی ترقی اور تمدن کی بنیاد تھی جس کا اعتراف خود یورپ کے دانشور کر رہے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر لیبری نے لکھا ہے۔

”اگر تاریخ کے سٹیج پر عربوں کا ظہور نہ ہوا ہوتا تو جدید یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں کئی صدیوں کی تاخیر ہو جاتی۔“

(۳۲)

حضرت داؤد طائی ایک رات اپنے گھر کی چھت پر ملکوت آسمان میں غور و فکر کر رہے تھے اور روتے جاتے تھے کہ بے اختیار ہو کر پڑوسی کے گھر میں گر پڑے۔ پڑوسی نے تلوار کھینچ لی کہ شاید دشمن ہے۔ دیکھ کر کہا کس نے آپ کو رولایا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ مجھے معلوم نہیں بے ہوش تھا۔ یہ تھا ہمارے بزرگوں کا تفکر۔ (۳۳)

ایمان، مذہبی زندگی کا پہلا اور ابتدائی دور ہے، جب اقوام اور افراد مذہب کے ادا مرونواہی کو بلا چون و چرا اور بلا استفسار و تامل قبول کرتے ہیں۔ انہیں جو حکم دیا جائے اسے بجالاتے ہیں۔ انہیں جس بات سے روکا جائے، اس سے رک جاتے ہیں۔ انہیں جس ایثار و قربانی کی طرف بلایا جائے وہ اس پر بخوشی لبیک کہتے ہیں۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں احکام کی حکمت اور اس کی مصلحت زیر بحث نہیں لائی جاتی، بس ان پر عمل کیا جاتا ہے۔ حکم کیوں دیا گیا اور اس کی تعمیل سے اسے کیا فائدہ پہنچے گا، ایمان والے کو اس سے کچھ سروکار نہیں۔ وہ تو احکام کو عملی جامہ پہنانا اپنی سرخروئی اور سعادت یقین کرتا ہے۔ نظم و ضبط کا یہ رویہ قوموں کی سیاسی و معاشرتی تاریخ میں بلاشبہ مفید نتائج پیدا کرتا ہے، مگر جہاں تک فرد کی باطنی نشوونما اور وسعت کا تعلق ہے یہ چنداں کارگر ثابت نہیں ہوتا۔

اس مرحلے سے گزر کر اقوام اور افراد فکر کی منزل میں داخل ہوتے ہیں، جہاں مذہبی احکام کی حکمت اور افادیت کو سمجھا جاتا ہے اور ان پر غور کیا جاتا ہے اور ان کے بارے میں ذہنی کرید سے کام لینے کی عادت پڑتی ہے۔ اس دور میں ذہنی زندگی اپنے لیے ایک مابعد الطبیعیات پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے جو خدا کے ساتھ کائنات کا ایک مربوط اور منطقی تصور پیش کر سکے۔

تیسرے دور میں مابعد الطبیعیات کی جگہ نفسیات کو حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مذہبی زندگی



حقیقت کا براہ راست مشاہدہ کرنے کو بے قرار ہوتی ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں مذہب انسانی شخصیت میں قوت اور زندگی پیدا کرنے کا دوسرا نام قرار پاتا ہے۔ اس مرحلے پر خودی اختیار اور آزادی کی راہ میں آگے بڑھتی ہے۔ نہ اس طرح کہ وہ شریعت اور قانون سے بے نیاز ہو جائے بلکہ اس طرح کہ شریعت اور قانون کا منبع اس کے شعور کی گہرائیوں سے دریافت ہو۔ یہ آخری خیال علامہ اقبالؒ کے نزدیک اتنا اہم ہے کہ اسے انھوں نے اپنی نظم و نثر دونوں میں متعدد بار دہرایا ہے۔ یہاں صرف ایک شعر پر اکتفا کی جاتی ہے:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہوں زول کتاب

گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف!

اپنے آخری اور ساتویں خطبے میں اقبالؒ نے جس مذہب سے بحث کی ہے وہ یہی تیسرے دور کا مذہب ہے۔ جب صاحب مذہب، صاحب دل، صاحب نظر اور صاحب واردات ہوتا ہے۔ جب مذہب اپنے صحت مند اور سچے روپ میں جلوے دکھاتا ہے۔ جب مذہب حقیقی معنوں میں مذہب ہوتا ہے۔

تاہم اقبالؒ کو احساس ہے کہ جن معنوں میں وہ مذہب کا لفظ (یا اصطلاح) استعمال کر رہے ہیں، بے شمار انسانوں کے نزدیک وہ تصوف ہی ہے، کیونکہ تصوف میں بھی تو مشاہدہ و واردات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ علامہ نے یہاں وضاحت کر دی ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر تصوف کے معنی عافیت کوشی، گوشہ نشینی اور زندگی کے ہنگاموں سے گریز ہے تو ایسا تصوف ان کی گفتگو کا موضوع نہیں۔ ہاں، اگر تصوف کے معنی زندگی کے چیلنج کو قبول کرنا اور فرار کی بجائے فطرت سے مقابلہ کرنا ہے، تو ان کے "مذہب" کو آپ تصوف بھی کہہ سکتے ہیں۔ علامہؒ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اعلیٰ مذہب، جو دراصل ارفع اور وسیع تر زندگی کی تلاش ہے، مشاہدے اور اس کی ناقدانہ پرکھ کا اس وقت سے علمبردار ہے، جب سائنس نے ابھی آنکھ نہ کھولی تھی۔ اس لحاظ سے مذہب سائنس کا حریف نہیں بلکہ اس کا پیشرو ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خطبے کا عنوان "کیا مذہب ممکن ہے؟" علامہ اقبالؒ نے کانٹ کے ایک مضمون کی رعایت سے قائم کیا ہے۔ کانٹ کے مضمون کا عنوان ہے "کیا مابعد الطبیعیات ممکن ہے؟" اس میں کانٹ نے مابعد الطبیعیات کی ماہیت اور اس کے تقاضوں سے بحث کر کے یہ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی تھی کہ مابعد الطبیعیات ممکن نہیں۔ اس سے کانٹ کی غالباً یہ مراد تھی کہ انسانی ذہن ان حقائق کا ادراک کرنے کے قابل ہی نہیں، جن پر مابعد الطبیعیات کی عمارت اُٹھائی جاتی ہے۔ اقبالؒ کو اس سے اتفاق نہیں۔ بالخصوص جب سے جدید سائنس کا مادہ پرستانہ زور ٹوٹا ہے اور ایٹم، توانائی کی لہروں کی صورت اختیار کر چکا ہے اور زمان و مکان کی لامتناہیت کا تصور بھی زائل ہو چکا ہے، ایسی صورت میں

یہ گمان کرنا کہ عقل اور حواس کے علاوہ کوئی اور ذریعہ علم ممکن نہیں، علامہ اقبالؒ کے نزدیک محض ہٹ دھرمی ہے۔ ہاں اس راہ میں ایک وقت ضرور ہے۔ مذہبی واردات کو الفاظ کا جامہ پہنانا آسان نہیں۔ یہ واردات محض احساسات نہیں ہوتے، ان کا معانی میں بدل جانا ممکن ہے، لیکن ان کا ماحقہ، دوسروں تک ابلاغ محال، شاید ناممکن ہے۔ لیکن کیا کوئی ایسی حقیقت، کوئی ایسا واقعہ، کوئی ایسی کیفیت جو لفظوں میں بیان نہ ہو سکے جو زبان کی گرفت میں نہ آئے، لازماً غیر ممکن یا غیر حقیقی ہوتی ہے؟ علامہ کی رائے میں اس طرح کا کوئی نتیجہ نکالنا عقل سلیم اور جدید سائنسی علم دونوں کے منافی ہے۔ کسی شے کا امکان یا واقعیت محض اس بات پر منحصر قرار نہیں دی جاسکتی کہ وہ پوری طرح احاطہ بیان میں لا کر دوسروں تک پہنچائی جاسکے۔

یہاں اقبالؒ ایک اور وقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ صدیوں پہلے ہمارے بزرگ صوفیاء نے روحانی تجربات و واردات کے میدان میں جو کمالات حاصل کیے، اس میں ان کی ثن و ثناء کو بہت دخل تھا۔ وہ نئے راستوں پر چلے، انھوں نے نئی منزلیں دریافت کیں اور وہ ایسے تجربات سے گزرے جن کی کوئی مثال اور نظیر ان کے سامنے نہ تھی۔ دوسرے لفظوں میں اعلیٰ تصوف اور اعلیٰ مذہب نے جو کچھ حاصل کیا، اس میں تقلید کا عنصر کم اور جدت فکر و نظر اور اجتہاد عمل کا حصہ زیادہ تھا، مگر بعد میں آنے والوں میں یہ کیفیت باقی نہ رہی اور وہ اگلوں کے تجربات ہی کے پابند اور نقال ہو کر رہ گئے اور یوں تازگی فکر و نظر ہم سے رخصت ہو گئی۔ یہاں علامہؒ نے ہماری "قدامت پرستی" کو ہمارے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ جب تک صوفیاء ان طور طریقوں سے باہر قدم نہیں رکھیں گے، جو روایت چلے آ رہے ہیں، مذہب کی اصل معنویت جدید تمدن پر روشن نہیں ہوگی اور اس پر طرح طرح کے اعتراضات وارد ہوتے رہیں گے۔ اس ضمن میں علامہؒ فرماتے ہیں:-

"قدامت پرستی کوئی اچھی چیز نہیں۔ اس سے مذہب کی دنیا میں بھی وہی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، جو اعمال انسانی میں کسی اور پہلو سے۔ اس سے خودی کی تخلیقی آزادی سلب ہو جاتی ہے اور اس میں یہ جرات ہی نہیں رہتی کہ عالم روحانیات میں کسی دوسرے راستے سے قدم بڑھا سکے۔ یہ جو سلوک و عرفان کے ان طور طریقوں سے جو عہد متوسط میں صوفیاء نے وضع کیے تھے، اب اس قسم کے افراد پیدا نہیں ہو رہے جو قدیم حق و صداقت کا پھر سے انکشاف کریں تو اس کی سب سے بڑی وجہ بھی ہماری یہی قدامت پسند ہے۔"

اقبالؒ کو تازہ کاری اور نادرہ کاری سے زندگی بھر دلچسپی رہی۔ انھوں نے اپنی ایک رباعی میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ انسان کو اپنی انفرادی حیثیت میں کچھ ایسے بے مثال کام انجام دینے چاہئیں اور ان کی بدولت ایک ایسی منفرد

شخصیت پالینی چاہیے کہ اگر خدا (قدرت) اس کو فنا کرنا چاہے تو اسے اپنے کیے پر افسوس ضرور ہو۔ اعلیٰ مذہب کی دنیا میں بھی اقبالؒ اس نادرہ کاری کے آرزو مند تھے۔ ان کے خیال میں قدرت کی وسعتوں میں اس قدر گنجائش موجود ہے کہ ہر سالک کو کچھ نئی منزلوں سے کچھ تازہ کیفیتوں کی دولت سے مالا مال کر سکے۔ جب مذہب کو بھول کر اس ڈگر پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں، جس پر پہلے لوگ چل چکے تھے، تو ان کا دامن مراد زندگی کے گوہر بیکتا سے خالی رہ جاتا ہے۔ یہاں اقبالؒ ایک بار پھر اس امر پر زور دیتے ہیں کہ اگرچہ مذہبی تجربے کو تمام و کمال بیان کرنا ممکن نہیں، تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ مذہب کی طلب اور حق کی تلاش کا بے سود ہے؟ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مذہبی واردات کا ناقابل بیان ہونا خودی یا روح کی ماہیت کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں ہم بالعموم ایک دوسرے کو اس کی ظاہری شکل و صورت اور عادات و خصائل کی وجہ سے پہچانتے ہیں مگر فرد کی روح میں جھانکنے کا ہم کو شاید ہی کبھی خیال آتا ہے۔ حالانکہ ظاہری شکل و صورت اور عام عادات و خصائل شخصیت کی سطحی پہچان ہے، اس کی معرفت نہیں۔ معرفت ہم کو اس سے تب حاصل ہوتی ہے جب ہم کسی شخص کو ان تصورات کی سطح سے گزر کر جاننے پہچاننے کی سعی کرتے ہیں، جو اس کی ظاہری شکل و صورت اور عادات کی وجہ سے ہم نے اس کے بارے میں قائم کر رکھے ہیں۔ یہی کیفیت اعلیٰ مذہب کی ہے۔ مذہبی زندگی کی معراج دراصل خودی کو اس عمق کے ساتھ جاننا پہچاننا ہے، جو فرد کے بارے میں آسانی کے ساتھ بیان ہونے والے تصورات کی سطح سے گزر کر نصیب ہو۔ یہ ذات حقیقی سے براہ راست ربط ہی کی بدولت ہے کہ خودی پر اس کی بے مثل انفرادیت اس کا روحانی شرف اور اس کی ترقی کا راز کھلتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جس روحانی تجربے سے یہ راز منکشف ہوتا ہے وہ قابل بیان تصوراتی حقیقت ہے ہی نہیں، وہ تو ایک حیاتی حقیقت ہے، جو باطنی انقلاب کے ساتھ ایک ایسے رویے کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے جسے منطقی اصطلاحات کے حال میں گرفتار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ صرف دنیا کو بدلنے یا دنیا کو ہلا دینے والے عمل ہی میں ظاہر ہو سکتی ہے اور فقط اسی صورت میں اس کے بے زبان تجربے کے مشغولات وقت کے دھارے میں رونما ہوتے اور تاریخ کی آنکھ کو موثر طریق پر دکھائی دیتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حقیقت کو تصوراتی طریق سے جاننے کا طریقہ کوئی سنجیدہ طریقہ نہیں سائنس کو اس کی پرواہ کہاں ہے کہ الیکٹرون کوئی حقیقی شے ہے کہ نہیں۔ یہ محض ایک سبب، ایک علامت، ایک روایت بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس مذہب جو اصلاً زندگی گزارنے کا ایک طریقہ ہے، حقیقت سے آشنا ہونے کا بھی واحد سنجیدہ ذریعہ ہے۔ بطور ایک اعلیٰ تجربے کے یہ ہمارے مذہبی تصورات کی اصلاح کرتا ہے یا کم از کم اس عقلی طریقے پر سے ہمارے یقین کو متزلزل تو کر دیتا ہے، جس سے تصورات بنتے ہیں۔ سائنس چاہے تو مابعد الطبیعیات سے بے نیاز ہو جائے یا اسے ایک گونہ شاعری خیال کرے لیکن ایک سچا

دیندار جو کائنات میں اپنے مقام کا متلاشی ہے، اس طرز عمل سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک حقیقت مطلقہ کی ماہیت کا تعلق ہے سائنس کا کچھ بھی دائرہ نہیں، لیکن مذہب کی دنیا میں خودی کی پوری زندگی کا انحصار اس تلاش اور کشف پر ہے۔ انسانی کردار کو جس سے انجام کار صاحب کردار کی تقدیر بنتی ہے۔ مفروضوں پر نہیں اٹھایا جاسکتا۔ ایک غلط تصور فقط ذہن کو گمراہ کرتا ہے۔ ایک غلط فعل پوری شخصیت کو بے آبرو اور انسانی خودی کے پورے ڈھانچے کو مسمار کر کے رکھ دیتا ہے۔ خیال زندگی کو جزو و امتاثر کرتا ہے۔ عمل کا تعلق زندگی سے بہت گہرا اور ہمہ گیر ہوتا ہے۔ اس تعلق کی ابتدا بلاشبہ انفرادی ہوتی ہے، لیکن جب اسے دوسرے افراد حقیقت تک پہنچنے کے وسیلے کے طور پر اختیار کر لیتے ہیں تو اس کی صورت اجتماعی ہو جاتی ہے۔ ہر عہد اور ہر خطے میں پیدا ہونے والے سچے مذہبی لوگوں کی مجموعی شہادت یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ ہمارے نارمل شعور کے پہلو میں شعور کی کچھ اور قسمیں خفتہ ہوتی ہیں۔ اگر شعور کی ان قسموں سے زندگی اور علم بخشنے والے تجربوں کے امکانات پھوٹتے ہیں تو بطور ایک برتر تجربہ حقیقت کے مذہب کا سوال ایک نہایت حق بجانب اور سچا سوال ہے۔

سائنس اور اعلیٰ مذہب کے مقام و مرتبہ پر اس خیال انگیز گفتگو کے بعد علامہؒ نے دو سبب اور بیان کیے ہیں جن کے پیش نظر ہمارے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ ہم سنجیدگی کے ساتھ اس امر پر غور کریں کہ کیا علم کا جو ذریعہ ہمیں سائنس کے طور پر حاصل ہوا ہے، اس کے سوا کوئی اور ذریعہ بھی حقیقت تک پہنچنے کا ہے کہ نہیں اور کیا تمام کی تمام حقیقت عقلی اور سائنسی ذریعہ علم کے دائرے میں سمٹ آئی ہے؟ علامہؒ فرماتے ہیں کہ کوئی قابل ذکر تہذیب ایسی نہیں گزری جس نے ایٹم کے مسئلے پر گہری سوچ بچار سے کام نہ لیا ہو اور مادے کی آخری صورت ذرہ یا جوہر کا کوئی نہ کوئی تصور قائم نہ کیا ہو۔ اس طرح ہمارے سامنے ایک یونانی ایٹم ازم (جو ہریت یا جوہری تصور) ہے۔ ایک ہندو ایٹم ازم ہے، ایک اسلامی ایٹم ازم ہے اور ایک تصور وہ ہے جو عہد حاضر نے جوہری ماہیت یا جوہری طاقت کے بارے میں قائم کیا ہے۔ ریاضی کی بے اندازہ ترقی اور دوسرے وسائل کی موجودگی نے اس باب میں جو مرتبہ عہد ساز کو بخشا ہے۔ ظاہر ہے وہ مرتبہ اس سے پہلے کسی تہذیب کو نصیب نہیں ہوا، لیکن اس سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکلتا کہ اپنے وسائل علم و استدلال کے باعث دور جدید حقیقت کے قریب تر ہے ابھی کل تک ایٹم کے بارے میں اس کے جو تصورات تھے ان پر انحصار کر کے سائنس اور سائنسی ذہن مادہ پرستی پر فخر کر رہا تھا، آج اس عبادت گاہ کے کئی بُت، خود جدید تحقیقات کے ہاتھوں پاش پاش ہو چکے ہیں۔ حتیٰ کہ ہم ایک ایسے مرحلے پر پہنچ چکے ہیں جہاں اس سوال نے ایک نئی معنویت اختیار کر لی ہے کہ کیا عالم کائنات کی واقعی حقیقت یہی ہے کہ وہ بس ایک سلسلہ ہے علت و معلول کا کیا ایسا نہیں کہ حقیقت مطلقہ کسی اور راستے سے بھی ہمارے شعور

میں در آئی ہو؟ کیا فطرت کی تسخیر کا ایک ہی ذریعہ ہے؟ علامہ اقبالؒ یہاں مشہور ریاضی دان پروفیسر ڈنگلٹن کا ایک قول نقل کرتے ہیں۔ اس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

"ہم تسلیم کر چکے ہیں کہ طبیعیات کا مواد حقیقت کا صرف ایک رُخ پیش کر سکتا ہے۔ حقیقت کے دوسرے رُخ سے آشنا ہونے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ یہ نہیں کہہ سکتا طبیعیات کے رُخ کے مقابلے میں دوسرا رُخ ہم سے کم تعلق رکھتا ہے۔ احساسات، مقاصد اور اقدار بھی ہمارے شعور کا اسی طرح جزو لا ینفک ہیں، جس طرح کہ اس کے ذریعے اُبھرنے والے نقوش۔ اگر ہم حسی اثرات کا پیچھا کریں تو ہم سائنس کی خارجی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں اور اگر ہم اپنے وجود کے دوسرے رُخ کا تعاقب کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہم زمان و مکان کی دنیا میں نہیں بلکہ بقیۃا کہیں اور پہنچ چکے ہیں۔

اعلیٰ مذہب کے امکان پر غور کرنے کا ایک سبب (جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے) یہ ہے کہ ہمارا تصور جو ہر ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا ہے، جہاں سے روحانیت کی راہ صاف صاف اور بار بار دکھائی دیتی ہے۔ غور و فکر کرنے والے اصحاب خواہ ان کا تعلق ریاضی و طبیعیات سے ہے خواہ فلسفہ و نفسیات سے حقیقت کے اس محدود جلوے سے مطمئن نہیں ہیں جو انہیں طبیعیات کی آنکھ سے نظر آتا ہے۔ دوسرا محرک اس سوال پر غور کرنے کا یہ ہے کہ سائنس کے بعض نظریات نے انسانوں میں زندگی کا جوش سرد کر کے انہیں یاس کی تاریکیوں میں دھکیل دیا ہے ان حالات میں مذہب گویا ایک عملی ضرورت ہے، جس کی بدولت جدید انسان کو اس کی یاسیت سے نجات دلائی جاسکتی ہے۔ یہاں اقبالؒ نظریہ ارتقاء کی مثال سامنے لاتے ہیں۔ متعدد مسلمان حکماء نے ارتقاء حیات کے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔ ان میں مولانا رومیؒ ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شہرہ آفاق مثنوی میں کئی بار اس سوال پر اظہار خیال کیا ہے کہ ہم پہلے جمادات کی حالت میں تھے۔ اس سے نکلے تو نباتات میں داخل ہوئے۔ اپنی کشمکش اور جوش فلاح کی بدولت نباتات کی سرحدوں کو پار کیا تو حیوانات کے دائرے میں آئے۔ حیوانات سے آگے بڑھے، تو انسانیت کے مقام پر پہنچے اور اب اس منزل سے گزریں گے تو فرشتہ و خدا کی منزل سامنے ہوگی۔ انسان اس وقت جو کچھ ہے آئندہ اس سے بھی بڑا اور زیادہ صاحب حیات ہوگا۔

ولولوں اور نئی امنگوں سے آشنا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ڈارون کا نظریہ ارتقاء زیادہ جامع اور سائنسی مشاہدات کے لحاظ سے زیادہ قرین قیاس ہے۔ تاہم یورپ کی نئی نسل کے اذہان پر اس کا اثر ولولہ انگیز اور حیات بخش نہیں، بلکہ مایوس کن ثابت ہوا ہے۔ ڈارون اور اس کے معاصر انسانوں کو کسی نئی اور برتر منزل سے روشناس کرانے میں ناکام رہے ہیں۔ لہذا اعلیٰ مذہب جو انسانوں کو ابدی اور اعلیٰ ترین نصب العین عطا کرتا ہے اور ان کے دلوں کو گتر ماتا اور ان کی قوت عمل کو

تازہ دم کرتا ہے، آج کے انسانوں کی ایک فوری اور اہم ضرورت ہے۔ ایسا مذہب ہی جدید انسان کا نجات دہندہ ثابت ہو سکتا ہے۔

اس مرحلے پر علامہ اقبالؒ نے ایک طویل پیرا گراف میں مغرب اور مشرق زمانہ متوسط کے تصوف جدید عہد کی دہنیت اور لادین اشتراکیت پر انسان کی روحانی زندگی کے نقطہ نظر سے ایک ایسا جامع اور خیال انگیز تبصرہ رقم کیا ہے، جو ان کی بہترین تحریروں میں جگہ پانے اور ان کے اعلیٰ ترین افکار کا نمائندہ قرار دیے جانے کا مستحق ہے۔ ذیل میں ہم ان موضوعات پر اقبالؒ کے ناقدانہ تبصرے کو مختصراً بیان کرتے ہیں:-

**مغرب:** عصر حاضر کی ذہنی سرگرمیوں سے جو نتائج مرتب ہوئے ہیں، ان کے زیر اثر (مغرب کے) انسان کی روح مردہ ہو چکی ہے اور وہ اپنا ضمیر کھو چکا ہے۔ فکری لحاظ سے وہ خود اپنے وجود سے متصادم ہے اور سیاسی اعتبار سے وہ دوسروں سے برسر پیکار، یعنی اس کے باطن میں بھی تصادم برپا ہے اور اس کے خارج میں بھی۔ سیاسی اور سائنسی وسائل سے حاصل ہونے والی انانیت کے ہاتھوں وہ بے بس ہے اور اقتدار اور سرمائے کی ہوس سے اس کی تمام روحانی پیاس نکل چکی ہے۔ اس کی نظر محض ان حقائق پر ہے جو حواس کے ذریعے اسے دکھائی دیتے ہیں لہذا اس کا تعلق اپنے وجود کی گہرائیوں سے منقطع ہو چکا ہے ہیکسلے نے یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ مادیات کی یہ بے دریغ نشوونما کہیں انسانیت کے رگ و پے کو مفلوج نہ کر دے۔ آج کا مغرب اس اندیشے کو سچ ثابت کر رہا ہے۔

**مشرق:** کچھ ایسی ہی کیفیت مشرق کی ہے۔ زمانہ متوسط میں واضع کیے جانے والے سلوک و عرفان کے وہ طور طریق جن کی بدولت کبھی مذہبی زندگی میں رفعت اور تازگی تھی، آج مرورِ ایام کے ہاتھوں عملاً بے کار ہو چکے ہیں۔ بجائے اس کے کہ یہ طور طریق انسانی قوتوں کو مجتمع کریں اور انھیں زندگی کی جدوجہد کے قابل بنائیں، ان کی تعلیم اب یہ ہے کہ ہم دنیا سے منہ موڑ لیں اور تاریخ کے دھارے سے الگ ہو جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مشرق والے اور بالخصوص مسلمان اس طرز تصوف کے زیر اثر جہالت اور غلامی جیسی برائیوں پر قانع ہیں۔

## مسلمان:

ان حالات میں مسلمان سچے اور اعلیٰ مذہب کی طرف لوٹنے کے بجائے وطنیت کا سہارا لے رہے ہیں، جسے نطشے نے بیماری اور پاگل پن سے تعبیر کیا تھا اور جس کے بارے میں اس کا کہنا تھا کہ اس سے بڑھ کر تہذیب و ثقافت کا اور کوئی دشمن نہیں۔ تاہم مسلمانوں کی یہ روش تعجب خیز نہیں، اس لیے کہ وہ اپنی روحانی زندگی کی طرف سے مایوس ہو چکے

ہیں اور کہتے ہیں کہ مذہب کے ذریعے اب اس کا احیا ممکن نہیں۔ حالانکہ مذہب ہی وہ ذریعہ ہے جس سے افکار و خیالات کی دنیا میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور جس کی بدولت ہم زندگی اور قوت کے دائمی سرچشموں تک پہنچتے ہیں، مگر نیشنلزم کا سہارا لینے والا مسلمان اپنے افکار و خیالات اور احساسات و جذبات کی دنیا تنگ کرتا جا رہا ہے اور مذہب کے بجائے دوسری وفاداریوں کے پیچھے ہے۔

کیا اسلامی فقہ میں ارتقا کی اہلیت موجود ہے؟ اس کا مثبت جواب دینے کے لیے بڑی ذہنی کاوش اور قابلیت کی ضرورت ہوگی اور حضرت عمر فاروقؓ کا ذہن اور جذبہ درکار ہوگا جنہوں نے رسول اکرم ﷺ کے آخری لمحات میں یہ یادگار الفاظ کہے تھے "ہمارے لیے خدا کی کتاب کافی ہے۔"

مسلمانوں کی حد تک ایک خطرہ علامہ اقبال کونسل اور جغرافیائی قومیت کا محسوس ہوتا تھا جبکہ اس کے خلاف انہوں نے زندگی بھر جنگ لڑی تھی اور دوسرا خطرہ ان کے دل میں یہ تھا کہ حریت اور اجتہاد کی اسلامی تحریک کہیں اپنی جائز حدود سے تجاوز نہ کر جائیں۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں ہم اس تحریک کا جو حریت اور آزادی کے نام پر عالم اسلام میں پھیل رہی ہے دل سے خیر مقدم کرتے ہیں لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ آزاد خیالی کی یہی تحریک اسلام کا نازک ترین لمحہ بھی ہے۔ آزاد خیالی کا رجحان بالعموم تفرقہ اور انتشار کی طرف لے جاتا ہے، لہذا نسلیت اور قومیت کے یہی رجحانات جو اس وقت دنیائے اسلام میں ابھرتے نظر آ رہے ہیں، آخر کار اس انسانی وسیع الطبری کولمیا میٹ کر سکتے ہیں جو مسلمانوں نے اپنے دین سے حاصل کی ہے۔ پھر یہ خطرہ بھی ہے کہ ہمارے مذہبی اور سیاسی رہنما حریت اور آزادی کے جوش میں آ کر اگر اس پر کوئی روک نہ عائد کی تو اصلاح کی جائز حدود سے تجاوز کر جائیں۔۔۔ لہذا عالم اسلام کی قیادت اس وقت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے ان کا فرض ہے کہ یورپ کی تاریخ سے سبق لیں۔ انہیں چاہیے کہ اپنے دل و دماغ پر قابو رکھتے ہوئے اصل یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ بحیثیت ایک نظام مدنیت اسلام کے مقاصد کیا ہیں اور پھر آگے قدم بڑھائیں۔

(۳) علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ کیا فقہ اسلامی کی ساخت اپنے اصولوں کی نئی تعمیر کی اجازت دیتی ہے؟ دوسرے لفظوں میں کیا اسلامی قانون میں ارتقاء کی صلاحیت ہے؟ علامہؒ نے بعض یورپی مستشرقین کے حوالے سے اس امر پر زور دیا ہے کہ روح اسلام میں بے اندازہ وسعت اور پلک پائی جاتی ہے۔ سوائے کفر و الحاد کے فکر و نظر کے شاہد ہی کوئی گوشہ صحت مند ایسا ہوگا کہ مسلمانوں کے آس پاس کے معاشروں میں موجود ہو اور انہوں نے اسے جذب کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ اسلام کی یہ خوبی اور صلاحیت قانون کے شعبے میں اور بھی نمایاں رہی ہے لہذا کوئی وجہ نہیں کہ آج کے نئے اور متغیر

حالات میں دین حق کی اس خصوصیت کو بروئے کار نہ لایا جائے اور اسلام کے ان ناقدوں کی علمی تردید مہیا نہ کی جائے جو یہ کہتے ہیں کہ اسلامی قانون جامد و ساکن ہے۔ اپنے اس یقین کے باوصف علامہ اقبالؒ نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ مسلمان عوام فقہ پر ناقدانہ بحث سننے کے لیے ابھی تیار نہیں اور اس قسم کی علمی کوشش ان کی ناراضگی اور ناخوشگوار فرقہ وارانہ بحث و تحیس کا موجب ہو سکتی ہے تاہم میں اس بارے میں اپنی رائے پیش کرنے کی جرات کرتا ہوں۔ اس مقام پر پہلے تو علامہ نے تین بنیادی نکتے بیان کیے ہیں اور اس کے بعد اسلامی قانون کے سرچشموں سے بڑی فکر انگیز بحث کی ہے۔ فقہ اسلامی کے جن مآخذ پر اقبالؒ نے بحث کی ہے وہ ترتیب وار یوں ہیں:

۱۔ قرآن حکیم ۲۔ احادیث ۳۔ اجماع ۴۔ قیاس

جو تین نکتے بطور تمہید کے بیان کیے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

۱۔ پہلی بات جو ہمیں اپنے ذہن میں رکھنی چاہیے یہ ہے کہ ابتدائی دور سے عہد عباسیہ کے آغاز تک قرآن حکیم کے سوا اسلامی قانون تحریری شکل میں موجود نہ تھا۔

۲۔ دوسرے یہ کہ پہلی صدی کے وسط سے لے کر چوتھی صدی کے آغاز تک اسلام میں قریب قریب انیس (۱۹) فقہی مذاہب اور آراء کا ظہور ہوا۔

یہی ایک واقعہ اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے کہ ایک بڑی اور پھیلتی ہوئی تہذیب کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہمارے فقہائے متقدمین نے کس طرح لگا تار محنت سے کام لیا۔ فتوحات کے پھیلاؤ اور اس کے نتیجے میں اسلامی نقطہ نظر میں پیدا شدہ وسعت نے ان فقہاء کو مجبور کر دیا کہ وہ اشیاء کو وسیع منظر کی نگاہ سے دیکھیں اور جو لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے ہیں ان کے مقامی حالات و عادات و خصائل کا مطالعہ کریں مختلف فقہی مذاہب کو اگر ہم اس عہد کی عمرانی اور سیاسی تاریخ کے پس منظر میں بنظر غائر دیکھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ فقہاء اپنی تشریحی کوششوں میں بتدریج استخراجی اسلوب سے استقرائی رجحان تک جا پہنچے ہیں۔

۳۔ تیسرے جب ہم اسلامی قانون کے چار مسلمہ مآخذوں اور ان سے پیدا شدہ اختلافات کا مطالعہ کرتے ہیں، تو ہمیں تسلیم شدہ مذاہب فقہ کی مزعومہ سختی اور تشدد کا کہیں نشان نہیں ملتا اور ارتقائے مزید کا امکان صاف صاف نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔ آئیے! اب ہم فقہ اسلامی کے مآخذوں کے بارے میں اقبالؒ کے خیالات سے آگاہی حاصل کریں۔

اقبالؒ نے اس امر پر زور دیا کہ قرآن کا نقطہ نظر حرکتی ہے اور یہ بات بدیہی ہے کہ حرکتی نقطہ نگاہ رکھتے ہوئے قرآن حکیم ارتقا



کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ زندگی محض تغیر کا نام نہیں ہے۔ اس میں دوام کی عناصر بھی ہیں۔ اس بات کو دوسرے لفظوں میں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ زندگی ماضی کا بوجھ اپنی پشت پر اٹھائے آگے بڑھتی ہے۔ کوئی قوم اپنے ماضی کو پورے طور پر رد نہیں کر سکتی، کیونکہ یہ ماضی ہی ہے، جو اسے اس کی ذات کی شناخت کی عطا کرتا ہے اور اسلام جیسی سوسائٹی میں اس کا خیال رکھنا اور بھی ضروری ہے۔ اسلام اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ایک غیر مقامی معاشرہ ہے۔ اس کا مقصد انسانی اتحاد کا ایک ایسا نمونہ پیش کرنا ہے، جس میں نسل رنگ اور زبان کے تمام امتیازات مٹ چکے ہوں۔

علامہ نے اسلام کے فقہی نظام میں تبدیلی کے آرزو مسلمان کو خبردار کیا ہے کہ اول تو خود زندگی کی خواہش کو ساتھ لے کر چلنے کی ہے، لیکن اسلام کا مزاج اس بارے میں کچھ اور بھی محتاط واقع ہوا ہے۔ نیکی اور خیر کو آپ محض اس لیے نہیں چھوڑ سکتے کہ اس کا تعلق ماضی سے ہے گزشتہ دور کی اچھائیوں اور صحت مند یوں کو برقرار رکھنا کم سے کم اسلام کا منشا ضرور ہے۔ پھر کوئی قوم ماضی کو پورے طور پر رد نہیں کر سکتی۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں۔ جب ہم قرآن میں فقہی اصولوں کی اصل بنیاد پر غور کرتے ہیں تو ہمیں صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ انسانی فکر و عمل کی راہیں بند کرنا تو درکنار خود ان اصولوں کی بے پایانی فکر انسانی کے لیے مہمیز کا کام کرتی ہے۔

فقہائے متقدمین نے اس اصل سے سراغ پا کر متعدد فقہی نظام کھڑے کر دیے اور تاریخ گواہ ہے کہ معاشرتی اور سیاسی قوت کے اعتبار سے اسلام کی نصف کامیابی اور غلبہ انہی ٹھہرا کی قانونی ذہانت پر منحصر تھا۔

لیکن اپنی تمام جامعیت کے باوجود یہ فقہی نظام آخر کار انفرادی تشریحات لحاظ سے حرف آخر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ چونکہ اب زمانہ بدل چکا ہے اور دنیا اسلام ان قوتوں سے جن کو انسانی عقل کی حیرت انگیز ترقی نے پیدا کیا ہے لاچار ہے اس لیے اس طرز عمل کے مزید برقرار رکھنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی ہے۔

"کیا ہمارے ائمہ مذاہب نے کبھی اپنے استدلال اور تشریحات کے بارے میں قطیعت کا دعویٰ کیا تھا؟ ہرگز

نہیں!"

"علامہ اقبال کے خیال میں موجودہ نسل کے آزاد خیال مسلمانوں کا یہ دعویٰ بالکل جائز اور درست ہے کہ انھیں

اپنے تجربات اور زندگی کے بدلے ہوئے حالات کی روشنی میں فقہ کے بنیادی اصولوں کی تشریح جدید کا حق حاصل ہے۔

قرآن کی یہ تعلیم کہ زندگی ارتقاء پذیر اور تخلیق مسلسل کا نام ہے اس بات کو ضروری قرار دیتی ہے کہ ہر نسل کو اپنے مسائل

خود ہی سلجھانے کی اجازت ہونی چاہیے متقدمین کا کام نئی نسلوں کی رہنمائی تو ہو سکتا ہے لیکن اس کام کو ان کے راستے کی رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔"

مختصر یہ کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ نسل کے مسلمان قرآن حکیم کے بنیادی اصولوں کو سامنے رکھ کر اپنے تجربات اور احوال کی روشنی میں اپنے لیے قانون اس طرح وضع کریں کہ قدیم فقہ اُن کی مددگار تو ہو لیکن وہ اُن کے پاؤں کی زنجیر نہ بننے پائے۔

ب۔ جہاں تک قانون سازی (فقہ) کا تعلق ہے۔ احادیث کی حیثیت کیا ہے؟ اس ضمن میں علامہ نے حضرت شاہ ولی اللہ اور امام ابوحنیفہؒ کا ذکر کیا ہے اور بڑی احتیاط مگر اعتماد کے ساتھ یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ شاہ صاحب اور بالخصوص امام ابوحنیفہؒ نے فقہی امور میں حدیث سے بالالتزام استفادہ نہیں کیا۔ علامہ لکھتے ہیں:-

کہ خالص فقہی مفہوم کی احادیث کے متعلق امام ابوحنیفہؒ کا نقطہ نگاہ مجموعی حیثیت سے درست ہے اور جدید آزاد خیالی اگر قانونی مآخذ کی حیثیت سے ان کے بلا امتیاز استعمال کو غیر محفوظ سمجھتی ہے تو ایسا کرنا سنی مذہب کے قانون محمدی کے ایک بزرگترین شارح کی پیروی ہوگا۔"

ج۔ اجماع:۔ اجماع اسلامی قانون سازی میں قرآن و سنت کے بعد جس اصول یا مآخذ کو اہمیت حاصل رہی ہے وہ اجماع ہے۔ علامہ اقبال نے فرمایا کہ عملاً یہ اصول ہماری ملی زندگی میں اس قدر موثر اور کارگر ثابت نہ ہوا جس قدر کہ اسے ہونا چاہیے تھا۔ ان کے نزدیک اس کی وجوہ سیاسی تھیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ میری رائے میں اجماع اسلام کا سب سے بڑا اہم قانونی نظریہ ہے مگر عجیب بات ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں تو یہ اہم نظریہ بڑی علمی بحثوں کا مرکزی موضوع بنا رہا مگر عملی طور پر اس کی حیثیت محض ایک تصور سے آگے نہ بڑھی۔ اموی اور عباسی خلفاء کے مفاد کے عین حق میں یہ بات تھی کہ اگر وہ قوت اجتہاد کو انفرادی مجتہدین کے ہاتھوں میں رہنے دیتے، اور کسی ایسی مستقل مجلس کی تشکیل و قیام کی حوصلہ افزائی نہ کرتے جو بعد میں ان کی اپنی ذات ہی کے لیے ایک طاقتور خطرہ بن جاتی"

موجودہ حالت میں یہ امر قابل اطمینان ہے کہ نئی عالمگیر قوتیں اور اقوام یورپ کا سیاسی تجربہ موجودہ دور کے مسلمانوں پر اجماع کے تصور کی قدر و قیمت اور اس کے امکانات کو عیاں کر رہا ہے۔ اسلامی ممالک میں جمہوریت کی روح کی نشوونما اور قانون ساز مجالس کا تدریجی قیام ترقی کی راہ میں ایک بہت بڑا قدم ہے۔ عصر حاضر میں اجماع کی ایک ہی صورت ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ قوت اجتہاد کو فقہی مذاہب کے انفرادی نمائندوں کے ہاتھوں سے لے کر ایک مسلم مجلس قانون ساز کے سپرد کر دیا جائے جو فقہی مباحث پر ایسے اشخاص کی معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ جو

ماہرین نہ ہونے کے باوجود معاملات میں گہری بصیرت کے حامل ہوں۔ صرف اسی صورت میں ہم اپنے فقہی نظام کی خوابیدہ روح کو فعالیت پر ابھار کر اسے ایک ارتقائی رنگ دے سکتے ہیں۔"

اجماع کے سلسلے میں دو بنیادی سوال سامنے آتے ہیں۔

کیا اجماع قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر سکتا ہے؟

بعض نامور فقہاء کے نزدیک صحابہؓ کا اجماع قرآن کے کسی فقہی اصول کو منسوخ تو نہیں کر سکتا البتہ اس کے اطلاق کی حدود میں کمی و بیشی کر سکتا ہے۔ اہم تر سوال یہ ہے کہ آیا آنے والی نسلیں صحابہؓ کے اجماع (کسی متفقہ رائے) کی مکلف ہوں گی یا نہیں؟ یہاں اقبالؒ نے واقعاتی اور قانونی امور میں تمیز و تفریق کرنے پر زور دیا ہے اگر کوئی واقعہ دور صحابہؓ میں پیش آیا، تو اس کے غلط یا صحیح کو جاننے کے لیے اجماع صحابہؓ نہایت قابل اعتماد ذریعہ ہے لیکن جو امور متغیر زندگی کے احوال سے تعلق رکھتے ہیں ان میں مسلمانوں کی نئی نسلیں صحابہؓ کے اجماع کی پابند نہیں ہو سکتیں۔ یہاں اقبالؒ علامہ کرخیؒ کے موقف کو صحیح مانتے ہیں: کہ بعد کی نسلیں اجماع صحابہؓ کی پابند نہیں ہیں۔ "حضرت کرخیؒ کہتے ہیں:

"سنت صحابہؓ اس وقت ناسخ ہو سکتی ہے جب کوئی مسئلہ قیاس کے ذریعے سے صاف نہ ہو سکے لیکن جو مسائل قیاس کے ذریعے ثابت ہو سکتے ہیں ان میں کسی کی پابندی لازمی نہیں۔"

دوسرا سوال شاید پہلے سے بھی نازک تر ہے۔ کسی جدید اسلامی ملک میں جو مجالس قانون ساز منتخب ہوں گی، اس کے بارے میں یہ اندیشہ ہو سکتا ہے کہ اس کے بیشتر ارکان فقہ اسلامی کی باریکیوں سے واقف نہ ہوں اور قانون سازی کی راہ میں ان سے کچھ لغزشیں سرزد ہو جائیں، اس کے تدارک کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

بہتر صورت یہ ہے کہ علماء خاصی تعداد میں مجلس قانون ساز کے باقاعدہ اور منتخب رکن ہوں تاکہ اسلامی ملکوں میں بھی مسائل پر آزادانہ بحث کے ساتھ بہتر فیصلوں پر پہنچنے کی جمہوری روایت قائم ہو سکے۔ اس ضمن میں اسلامی ممالک کے نظام تعلیم کی اصلاح ہونی چاہیے تاکہ اہل سیاست اور عام تعلیم یافتہ مسلمان اسلام کی روح کو بہتر طور سے سمجھنے کے قابل ہو سکیں۔

د۔ قیاس: قیاس کیا ہے "قانون سازی میں مماثلتوں کی بناء پر استدلال سے کام لینے کا نام ہے۔ اگرچہ

اس پر بڑی بحث و تحقیق ہوئی مگر نتیجہ یہ نکلا کہ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب فقہ اپنے اساسی اصولوں میں خاصا آزاد اور وسیع النظر ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ حنفی فقہ میں تخلیقی مطابقت کی قوت باقی تمام فقہی مذاہب سے زیادہ ہے لیکن اقبالؒ کو اس امر سے اختلاف ہے۔

اس کا نہایت افسوس ہے کہ حنفی فقہ کے موجودہ علمبرداروں کی تنگ نظری اور بے جا تقلید پسندی نے اس فقہ کی وسعت کو محدود کر دیا اور اس کے اندر کی تخلیقی قوت اپنے ماننے والوں کے ہاتھوں فنا ہو کر رہ گئی۔

یہاں اقبالؒ نے قاضی شوکانیؒ اور سرخسیؒ کے حوالے سے اس بات پر پھر اپنے تعجب اور افسوس کا اظہار کیا ہے کہ صدیوں سے عام مسلمانوں میں یہ عقیدہ راسخ کیا جا رہا ہے کہ اسلام میں مزید اجتہاد کی گنجائش اور ضرورت نہیں ہے، حالانکہ اجتہاد کا اصول ہماری ترقی اور ارتقاء کی ضمانت ہے اور اس بات پر زور دیا کہ جو لوگ اجتہاد کی راہ میں سنگ گراں بن کر حائل ہو رہے ہیں ان کا کردار منفی اور نقصان دہ ہے۔ قاضی شوکانیؒ کا جو اقتباس علامہ نے درج کیا، اس کا اردو ترجمہ یوں ہے:

"باب اجتہاد کا بند ہو جانا ایک خالص افسانہ ہے، جسے کچھ تو اسلام میں فکر قانونی کے جمود نے پیدا کیا اور کچھ اس ذہنی کاہلی نے گھڑ لیا جو خاص طور پر روحانی زوال کے دور میں بڑے بڑے مفکرین کو قابل پرستش سمجھنے لگتی ہے۔"

(۲۵) "لیکن آج کل کے حنفیوں نے خود اپنے مذہب کی روح کے عین برعکس امام ابوحنیفہؒ اور ان کے جانشینوں کی تصریحات کو ٹھیک اسی طرح اٹل اور ناقابل رد و بدل تسلیم کر لیا ہے، جس طرح امام ابوحنیفہؒ کے ابتدائی ناقدین نے ٹھوس واقعات پر دیے ہوئے فیصلوں کو ابدی بنالیا تھا۔"

علامہ اقبالؒ نے جہاں مسلمانوں کو حریت فکر اور جرات عمل کا مشورہ دیا ہے

"اس مختصر سی بحث سے آپ پر واضح ہو گیا ہوگا کہ نہ تو اساسی اصولوں میں اور نہ ہی فقہی نظاموں کی ساخت میں ہمارے موجودہ طرز عمل کے لیے کوئی وجہ جواز موجود ہے۔ عقل و فکر کی تیز روشنی اور نئے تجربات کی قوت سے مسلح ہو کر دنیائے اسلام کو چاہیے کہ جرات و ہمت کے ساتھ تشکیل جدید کا کام سرانجام دے لیکن یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ تشکیل نو زندگی کے جدید حالات و کوائف کے تحت محض مطابقت پیدا کرنا ہی نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ اہم کام ہے۔"

اقبالؒ نے انسانی ارتقاء کے لیے بعض امور کو ضروری قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ آج انسانیت کو تین چیزوں کی

اشد ضرورت ہے؛

اول۔ کائنات کی روحانی تعبیر۔

دوم۔ فرد کی آزادی

سوم۔ ایسے آفاقی قوانین کی تدوین جو روحانی بنیادوں میں انسانی معاشرے کے ارتقاء کا سامان

کر سکیں۔

بقول اقبال! آج کا یورپ انسان کی اخلاقی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے کیونکہ وہ ایسی نارو  
اجہورتیوں پر مشتمل ہے جن کی غایت امیروں کے مفاد میں اور غریبوں کے استحصال میں ہے۔  
پاکستان کے ارباب علم و قیادت کا یہ نہایت اہم فریضہ ہے کہ وہ اپنے لیے فکر و عمل کی راہیں متعین کرتے وقت  
علامہ کے افکار عالیہ کو سامنے رکھیں اور جہاں تک ممکن ہو ان سے فائدہ اور فیضان حاصل کریں۔ (۳۴)

## فصل چہارم عصر حاضر کے عمومی حالات کے تناظر میں انسانی کردار کی تشکیل اور تصوف

اسلام دور جدید کے انسان کی ہر گراہی کو دور کرتا ہے۔ وہ زندگی کے کسی مخصوص پہلو کی اصلاح کو کافی خیال نہیں  
کرتا بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ اور عمل کے ہر گوشہ کے لئے اصلاحی تدابیر رکھتا ہے۔ اس وجہ سے اس کا ایک خاص نظام  
تمدن۔ ایک الگ نظام معاشرت اور ایک جداگانہ نظریہ سیاست و حکومت ہے۔ یہاں مذہب اور تہذیب و تمدن یا اخلاق  
اور اجتماعی زندگی کوئی الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ سب ملکر ایک مجموعہ بناتے ہیں جنہیں ”الاسلام“ کے نام سے موسوم  
کیا جاتا ہے۔

یہاں ایک ہی طریقہ فکر اور ایک ہی نظریہ حیات ہے۔ جو زندگی کے سارے گوشوں پر حاوی ہے۔ ممکن ہے مذہب کا یہ  
تصور بعض افراد کے لئے مانوس نہ ہو مگر یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ مغربی زندگی جب تک اپنے ہاں دین و دنیا  
کی دو جگہ کو ختم نہیں کرتی وہ کبھی چین اور آرام کا سانس نہیں لے سکتی۔ یہ ایک تضاد ہے جس نے اسکی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا  
ہے۔ اور اگر کوئی دین اس سے اُسے نجات دلا سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ اسلامی تہذیب ہی وہ طرز زندگی ہے جس  
میں نہ صرف حیات انسانی کے سارے گوشوں سے متعلق ہدایت و رہنمائی ملتی ہے بلکہ انسان کے باطنی محرکات پر بھی پوری  
پوری توجہ صرف کی گئی ہے۔ اس نے جہاں انسان کے خارجی نظام سے بحث کی ہے وہاں انسان کے داخلی احساسات کو  
بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اسلام نے انسانی زندگی کے سارے پہلوؤں کو اپنی تحویل میں لیکر ان کے اندر معنوی ربط پیدا کر دیا  
ہے۔ صوفیائے کرام کو اسلام سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ صوفی وہی ہے جو مذہب اسلام کا علمبردار ہو اور اس پر پورا پورا عمل  
کرتا ہو۔ (۳۵)

اسلامی فکر عالم بشریت میں ایک انقلابی فکر تھی۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ روایت فکر سے متصادم ہوتی ہے۔ اسلام کو اپنے تصور اقدار کی فوقیت اور افادیت پر اصرار ہے۔ اسلام جہاں جہاں بھی پہنچا ہے وہاں کے رائج الوقت نظریات اور طرز زندگی سے اس کا تصادم ہونا ایک فطری عمل تھا۔ اسلام کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اپنے نظریے کی سیادت پر کامل یقین رکھتے ہوئے بھی کسی تہذیبی جارحیت کی دعوت نہیں دیتا بلکہ اس کا کہنا یہ کہ اسلام نور ہدایت ہے جسے ظلمت سے ممتاز کیا گیا ہے۔

قد تبیین الرشید من الغی - (۳۶) ہدایت کو گمراہی سے ممتاز کیا گیا ہے۔

وہ اس پر تو سمجھوتہ کر سکتا ہے کہ تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین لیکن اس پر مفاہمت نہیں ہو سکتی کہ مسلمانوں کے لئے حقوق العباد اور حقوق اللہ کے معیار مقرر کرنے میں کوئی دوسرا نظریہ زیادہ مفید، جامع اور آئین فطرت سے زیادہ قریب ہو سکتا ہے۔

جس طرح اسلام کے دوسرے پہلوؤں کو ہدف بنایا گیا ہے۔ اسی طرح اسلام کے روحانی پہلو یعنی تصوف کو نشانہ بنایا گیا ہے۔

مغربی علماء نے کلچر کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک کو وہ مادی کلچر کہتے ہیں اور دوسرے کو روحانی کلچر۔ اسلام اور دوسرے مذاہب کے طرز فکر میں ایک نمایاں فرق ہے کہ وہاں روحانی کلچر، مادی کلچر کے تابع ہوتا ہے۔ لیکن اسلام کے ہاں مادی کلچر روحانی کلچر کے تابع ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ہمارے مشائخ خانقاہوں میں بیٹھ کر بھی زندگی کے ہر شعبہ پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ وہ صرف اپنی نجات کے طالب نہیں ہوتے بلکہ پورے معاشرے کی فلاح و نجات چاہتے ہیں اور یہی تصوف کا مقصد ہے۔ اس وقت مغرب میں روحانی تربیت کی شدید پیاس ہے۔ ان حالات میں صوفیائے کرام کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنا پیغام ان ممالک

میں لیکر جائیں۔ اسلام کی خدمت بھی ہوگی۔ تبلیغ حق بھی اور نئی سماجی تبدیلیوں کی طرف ایک مثبت قدم بھی۔

صوفیائے کرام نے ہمیشہ شریعت کی بالادستی کو صدق دل سے تسلیم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت چراغ دہلویؒ نے ایک موقع پر فرمایا۔

”مسلم پیر حجت نمی شود: دلیل از کتاب و سنت می باید“

”مرشد کا مسلک میرے لیے دلیل نہیں ہے بلکہ میرے لیے دلیل قرآن و سنت ہے۔“

صوفی کا عالم شریعت ہونا ضروری ہے۔ تاکہ مرید کو نامشروع طبقتوں سے روک سکے۔ انفرادی اور اجتماعی طور پر معاشرے

کو ہر شر و فساد سے محفوظ رکھنا اسکی ذمہ داری ہے۔

آج کی دنیا کو اقتصادی اور مادی اعتبار سے تین طبقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1۔ ایک سائنسی اور تکنیکی اعتبار سے ترقی یافتہ ہے۔

2۔ دوسری میں قدرتی وسائل کی کمی نہیں تکنیکی وسائل کم ہیں۔

3۔ تیسری وہ جن کا بڑا حصہ دونوں طرح کے وسائل سے محروم ہے۔

یہ تقسیم روحانی اور اخلاقی سے بھی ہو سکتی ہے کیونکہ خیر و شر کے پیمانے بھی ہر ملک کے علیحدہ ہیں۔

قرآن کریم نے خیر و شر کی تقدیر کے لئے لفظ ”مثقال ذرۃ“ استعمال کیا ہے۔ صوفیاء نے انسان کو عالم صغیر کہا ہے۔ جو کچھ اس کائنات میں ہے وہ سب کچھ انسان میں رکھ دیا گیا ہے۔ افراد کے تصورات کی طرح قوموں اور ملکوں کے تصورات خیر و شر بھی مختلف ہیں۔ کہیں یہ اختلاف ہمارے نظریاتی بنیاد کی وجہ سے ہے۔ مثلاً ایک صوفی بڑی رقت سے دعا مانگتا ہے۔

اللّٰهُمَّ اَحْيِيْنِيْ مُسْكِيْنًا وَّ اَمْتِنِيْ مُسْكِيْنًا وَاَحْشِرْنِيْ فِيْ زَمْرَةِ اَئِمَّةِ الْمُرْتَدِّينَ اَوْ جِيْنَا مُسْكِيْنًا حَالَتِمْ اَوْ اَمْتِنِيْ مُسْكِيْنًا  
المساكين۔ (۳۷)

حشر مکی جماعت میں ہو۔

مغرب کے ترقی یافتہ ممالک میں کوئی یہ دعا نہیں مانگے گا سوال یہ ہے کہ ہمارے رسول پاک ﷺ نے یہ دعا کیوں مانگی اور ہمیں اس دعا میں کیفیت کیوں محسوس ہوتی ہے اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ ہمارا مادی کلچر روحانی کلچر کا تابع ہے۔ دوسرے کے دکھ کو اپنا سکھ بنا لینا تو سب جانتے ہیں مگر انسانیت کی معراج یہ ہے کہ دوسرے کے دکھ کو اپنا دکھ بنا لیا جائے۔ اس کے نمونے حضور ﷺ کی سیرۃ طیبہ اور صوفیائے کرام کی زندگی میں بکثرت ملتے ہیں۔ دوسروں کے دکھ کا اثر اپنے دل پر کس طرح ہوتا ہے۔

فکر جدید نے بہت زور مارا تو (Telepathy) کا نظریہ ہاتھ آ گیا مگر اس نکتے کی وضاحت خواجہ نظام الدینؒ نے فرمائی جو ایک صوفی ہی کہہ سکتا ہے۔ فرمایا کہ جب روح قوی ہو جاتی ہے تو وہ قلب کو جذب کر لیتی ہے۔ اور قلب جو قوی ہوتا ہے تو وہ قالب کو بھی جذب کر لیتا ہے۔ اس اتحاد کی وجہ سے جو کچھ قلب پر گذرتی ہے اس کا اثر قالب پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ فرمایا اب اس ایک ملفوظ کی روشنی میں وہ دعا مانگیے۔

”اللّٰهُمَّ اَحْيِيْنِيْ مُسْكِيْنًا وَّ اَمْتِنِيْ مُسْكِيْنًا وَاَحْشِرْنِيْ فِيْ زَمْرَةِ الْمَسْكِيْنِ۔“

تو معلوم ہوگا کہ یہ انسانیت کی معراج پر پہنچنے کی دعا مانگی جا رہی ہے۔

بابا فرید کسی کو دعا دیتے تو فرماتے۔

”خداائے عزوجل ترا در دے دہد“

”اللہ تعالیٰ تجھے درد عطا کرے۔“

یہ درد کا رشتہ وہ ہے جو ساری انسانیت کو ایک شیرازے میں باندھ سکتا ہے۔

حضرت شاہ غلام علی دہلوی نے فرمایا ”دنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت ہر چند روز کار و نادر ہونا ہوتا ہے۔ پھر آدمی نارمل ہوتا ہے۔ مگر تصوف میں عمر بھر کا رونا ہے۔ اس کے لئے بڑا دل گردہ چاہیے۔

دور حاضرہ کے انسان کے کردار کو ایک صوفی کے کردار سے اتنی بھی نسبت نہیں جو ایک چیونٹی کو ہاتھی سے ہے یا زمین کو آسمان سے۔ صوفی اپنے کردار کی وجہ سے اللہ کا مقرب بندہ بن جاتا ہے۔ (۳۸)

## فصل پنجم

عالم اسلام کے استحکام و بقاء کے لئے مطلوبہ

انسانی کردار اور تصوف

مسلمان جو پیدائشی سپاہی تھا۔ آج سپاہیانہ زندگی سے غافل ہو کر سستی اور کامیابی کا شکار ہو گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آجکل کی جنگوں میں صرف فوجیں ہی ایک دوسرے سے لڑا کرتی ہیں۔ اور جن ممالک کے پاس زیادہ اسلحہ اور سامان حرب ہوگا۔ وہ غالب و کامران ہوں گے۔ دنیا میں جتنی جنگیں لڑی جا چکی ہیں ان سے ثابت ہو چکا ہے کہ فتح کا سہرا صرف اسی قوم کے سر ہے جس کے عوام میں نہ صرف دفاعی جنگوں میں دشمن کا مقابلہ کرنے اور اس کا گور یا لڑائی کے ذریعے ناک میں دم کرنے اور شکست فاش دے دینے کی صلاحیت اور اہلیت موجود ہو۔ بلکہ جارحانہ حملوں میں بھی دشمن کو گھٹنوں کے بل جھکا دینے یا اس کا قصہ ہی پاک کر دینے میں اپنے لشکر جبار کی پشت پران کا اتنی ہاتھ ہو۔ جرمنی اور روس کی جنگ نے ہمیں یہ سبق سکھا دیا ہے کہ اگر دشمن کی فوجیں چاہیں تو ماسکو اور سالن گراڈ جیسے مضبوط اور اہم شہروں میں بھی داخل ہو جاتی ہیں۔ اگر قوم میں دفاعی صلاحیت اور سپاہیانہ زندگی موجود ہو تو شکست بھی فتح سے تبدیل ہو سکتی ہے۔ یہ سب کچھ اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ عوام کو رضا کارانہ طور پر ان جدید قسم کے آلات جنگ اور جدید عسکری تقاضوں سے بہرہ ور اور واقف کر دیا جائے۔ ورنہ عین وقت پر جبری بھرتی بھی کھول دی جائے پھر بھی کچھ نہیں بن سکتا۔ جو لوگ جدید قسم کے جنگی ہتھیاروں اور ان کے طریقوں سے ناواقف ہوں گے بلکہ عمر بھر راکفل اور ریوا لور تک کے استعمال سے بھی



محروم رہے ہوں گے تو وہ موجودہ زمانے کے جدید آلات سے لیس قوموں کا مقابلہ کسی طرح کر سکیں گے۔  
یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مقبول ﷺ نے یہ تعلیم دی ہے کہ وہ ہر مسلمان کے دل میں جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا کرتے جاویں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

ياايهاالذين امنوا هل ادلكم على تجارة تنجيكم من عذاب "اے مومنو! کیا میں تم کو ایک ایسی سوداگری نہ بتلا دوں الیم۔ تومنون بالله و رسوله و تجاهدون في سبيل الله عذاب سے بچائے (عذاب الیم سے دنیوی عذاب بھی باموالکم و انفسکم ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون جن کے ہاتھوں غلام قوموں کو ملا کرتا ہے) اس سے بچنے کے یغفر لکم ذنوبکم و یدخلکم جنت تجری من تحتها الانهر تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی بات مان لو اور و مساکن طيبة فی جنت عدن ط ذلك الفوز العظيم و اخري اور جاننے جہاد کر لو یہ تمہارے لئے بہت بہتر ہے اگر تم یحبونہا نصر من الله و فتح قريب و بشر المومنین۔ تمہارے گناہ معاف فرمادے گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل فرمائے گا جو نیچے نہریں جاری ہوں گی اور تمہیں عمدہ اور پاکیزہ (۳۹)

عمر عدن میں ہوں گے۔ یہ بڑی کامیابی ہے اور ایک:  
»دوسری بات جس کو تم پسند کرتے ہو اور وہ اللہ کی مدد اور جلد فتح یاب کرنا ہے! مومنو! ان انعامات خداوندی کی خوش خبری سنا دیجئے

قرآن نے بار بار مسلمانوں کو یہ تلقین کی ہے کہ وہ ہر وقت دشمنوں کے مقابل میں تیار رہیں۔ بلکہ خدا کے ہاں ایمان اور محبت خداوندی کا صحیح معیار یہ ہے کہ اس کی راہ میں جان اور مال سے جہاد کیا جائے اور دشمن کے مقابلے میں جان پر کھیل کر اور مال کو قربان کر کے مصائب کا پیہم مقابلہ کیا جائے۔ (۴۰)

اسلام کے نظام تربیت سے ایک صالح اور عابد انسان ہوتا ہے۔ اس انسان کی پوری خصوصیات واضح نہیں ہوتیں۔ بلکہ اس سلسلہ میں جہاں اس میں جہاد فی سبیل اللہ کا وصف ہو وہاں تقویٰ، خشوع اور حیا کا عنصر بھی پایا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

ان اکرمکم عند الله اتقاکم۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ  
وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ (۴۱)

سینماہم فی وجوہہم من اثر السجود (۴۲) سجد کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں۔

ان المسلمین و المسلمات والمومنین و المومنات ”یقیناً جو مرد اور جو عورتیں مسلم ہیں، مومن ہیں، مطہر  
والقانتین و القانتات والصدقین و الصادقات ہیں، صابر ہیں، اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں، صدقہ  
والصبرین و الصابرات والخاشعین و الخاشعات رکھنے والے ہیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرے  
المتصدقین و المتصدقات والصائمین و الصائمات کثرت سے یاد کرنے والے ہیں۔“  
والحافظین فروجهم و الحافظات و الذاکریں اللہ  
والذاکرات۔ (۴۳)

اللہ تعالیٰ نے ایک مقام پر باکردار اور صالح انسان کی تعریف فرمائی۔  
قل للمومنین یغضوا من ابصارهم ویحفظوا فروجهم ذالک ”اے نبی ﷺ مومن مردوں سے کہہ کہ اپنی نظریں  
انکی لهم ان اللہ خبیر بما یصنعون وقل للمومنات یشرموا شرمگاہوں کی حفاظت کریں یہاں کے لئے زیادہ پاکیزہ  
یغضضن من ابصارهن ویحفظن فروجهن۔ (۴۴) عمل کرتے ہیں۔ اللہ اس سے باخبر ہے اور اے نبی ﷺ  
دو اپنی نظریں بچا کر رکھیں! اپنی شرمگاہوں کی حفاظت  
کریں  
حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔

”حیاء ایمان کا حصہ ہے۔“ (۴۵)

اب ہمارے سامنے ایک شخص آتا ہے جس کے چہرے سے تقویٰ اور خشوع ظاہر ہوتا ہے اور جس کی حرکات سے نرمی،  
سکون اور حیاء ظاہر ہوتی ہے مگر اس کا سکون دھوکہ دینے والا نہیں ہے۔ اور اسکی حیاء کمزوری کی علامت نہیں ہے۔ وہ اپنا  
سر صرف خدائے واحد کے سامنے جھکاتا ہے اور صرف خدا سے ڈرتا ہے جبکہ غیر اللہ کے سامنے وہ قوی، مضبوط اور پر عزم  
ہے اور اپنے دین کے معاملہ میں بڑا سخت اور شدید ہے۔  
اللہ تعالیٰ نے کامل مسلمان کی تعریف فرمائی۔

محمد الرسول اللہ والذین معه اشداء علی الکفار رحماء محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو لوگ ان کے  
بینهم تراهم رکعاً سجداً یبتغون فضلاً من اللہ ورضواناً بڑے سخت اور آپس میں رحم دل ہیں۔ اللہ ان سے  
سیماهم فی وجوہهم من اثر السجود۔ (۴۶)

نہ تو اسکی سخت دلی رحم دلی میں حارج ہے اور نہ اسکی رحم دلی سخت گیری میں رکاوٹ ہے۔ اسکی ہر خوبی اپنی جگہ اور

اپنے مقام پر درست ہے اور اس میں اس قدر لچک ہے کہ وہ ہر موقع کے لحاظ سے موقف اختیار کر لیتا ہے اور قوت و طاقت کو اور رحم دلی اور سخت گیری کو اپنے مقام پر استعمال کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کافروں اور منافقوں کے بارے میں رسول ﷺ کو ارشاد فرمایا گیا۔

ياايها النبي جاهد الكفار والمنافقين واغلظ عليهم۔ (۴۷) اے نبی! کفار اور منافقین دونوں کا پوری قوت سے مقابلہ کر اور سختی سے پیش آؤ۔

اور مومنین کے بارے میں یہ ارشاد ہوا کہ

فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظ القلب " یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے لافضو امن حولك ہوئے ہو ورنہ اگر کہیں تم تند خو ہو اور سنگ دل ہوئے گے تو دشمنوں سے چھٹ جاتے (۴۸)

کفار کے بارے میں سخت رویہ اختیار کرنے کی وجہ طبیعت کی سخت گیری اور درشتگی نہیں ہے کہ یہ صفات پسندیدہ نہیں ہیں اور ظاہر ہے کہ اللہ کا رسول اس قسم کی صفات سے بلند ہے بلکہ کفار کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنے کی وجہ شر کے مقابلے میں قوت استعمال کرنا ہے جو خیر کے حصول کے لئے ناگزیر ہے اور مومن کا اصل مقصد ہی خیر کا حصول ہے۔ اور وہ ہر ممکن طریقے سے خیر کے مقصد کو حاصل کرتا اور شر کو دفع کرتا ہے۔ کبھی وہ محض کلمہ طیبہ سے شر کو دفع کرتا ہے۔

ادفع بالتي هي احسن فاذا الذي بينك وبينه عداوة كانه ولي تم بدى كوا س نكي سے رفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو۔  
حمیم (۴۹) ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی وہ جگری دوست بن گئے

ادفع بالتي هي احسن السيئة (۵۰) ”برائی کو اس طرح رفع کرو جو بہترین ہو“

کبھی نصیحت سے شر کی مدافعت کی جاتی ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

ادع الى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة " اے نبی! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو کے ساتھ۔“ (۵۱)

کبھی یہ وسائل کامیاب نہیں ہوتے تو سختی اور درشتگی ضروری ہو جاتی ہے۔ اور اس وقت سخت روش اختیار کرنا ہی درست اور موزوں ہوتا ہے۔ مومن تمام حالات میں قوی اور تمام کیفیات میں بلند ہوتا ہے۔ رب کائنات کا ارشاد پاک ہے۔

ولا تهنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان كنتم مومنين۔ (۵۲) دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو۔ تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو

مومن خوشی اور مسرت کے لمحات میں چھوٹی خوشی سے سرشار اور تکبر اور غرور کو پسند نہیں کرتا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

ولا تصعد خدك للناس ولا تمش في الارض مرحا ه ان الله " اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کرو۔ زمین میں اگر لایحب كل مختال فخور واقصد في مشيك واخفض من اور فخر جتانے والے کو پسند نہیں کرتا۔ اپنی چال میں صوتك ان انكر الا صوات لصوت الحمير۔ (۵۳) آواز ذرا پست رکھ۔ سب آوازوں سے زیادہ بری آواز

سکھ کی آواز ہے۔

ان آیات میں تواضع، اعتدال اور میانہ روی کی تلقین کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ درحقیقت اصل عزت اللہ پر ایمان اور اپنے نفس کو غیر اللہ کے سامنے جھکنے کی ذلت سے بچانا ہے اور اپنے نفس کو ہر برائی، گندگی اور آلودگی سے محفوظ رکھنا ہے۔ مومنین کی یہ عزت اور یہ رفعت سر بلندی اور فتح و کامرانی کے موقع ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ ہر وقت اور ہر موقع پر ہے۔ (۵۴)

یہ ہیں ایک صالح انسان کے کردار کی تجلیاں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مادی ترقی میں وہ خلاء میں پرواز کے تجربے کر رہا ہے۔ مگر یہ انسان کی ترقی نہیں اس کے علم و فن کی ترقی ہے۔ انسان کی ترقی کا دار و مدار تو تعمیر انسانیت پر ہے۔ روح کی مسرت پر ہے۔ قلب کی راحت پر ہے۔ یہ نعمتیں مادہ پرستی سے حاصل نہیں ہوتیں خدا پرستی سے حاصل ہوتی ہیں۔

دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

انسان نے جب سے مذہب اور دین سے منہ موڑا ہے اور صوفیائے کرام کی صحبت کی بجائے بے جان، بے حس اور بے روح مشینوں کی صحبت اختیار کی ہے تب سے ماہر انسانیت ڈاکٹر لورین آئرلے کے قول کے مطابق انسان انسان نہیں رہا بلکہ حیوان بن رہا ہے کیونکہ انسانی معاشرے سے محبت مٹتی چلی جا رہی ہے۔ کم سے کم محنت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا جذبہ بڑھتا جا رہا ہے۔ جس سے تن آسانی اور سہل نگاری پیدا ہو رہی ہے۔ انسان بے خیر بے رحم، طاقت و تشدد کا آلہ اور روز افزوں اخلاقی بے یقینی اور روحانی پستی کا مظہر بن رہا ہے۔ اس نے سورج کی شعاعوں کو تو گرفتار کر لیا ہے لیکن زندگی کی شب تاریک کو نہ کر سکا۔

جب انسان اس حقیقت کو جان لے گا تو اس وقت انسان صحیح معنوں میں ترقی کر سکے گا۔ عالم اسلام کے استحکام اور بقاء کے لئے صوفیائے کرام جیسے کردار اور عمل کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا

فرمائے۔ (۵۵)

ہم دیکھتے ہیں کہ عام طور پر انسان پیدا ہوتا، بڑا ہوتا، جوان ہوتا ہے اور پھر پڑھاپا پورا کرنے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اکثر لوگ اس دنیا میں اپنی عمر عزیز مال و دولت کے حصول میں صرف کر دیتے ہیں اور وہ اس بات کا احساس نہیں کرتے کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی کا آغاز ہونے والا ہے جس کی پہلی منزل قبر ہوتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ انسان کی خواہشات کو فقط قبر کی مٹی ہی بند کر سکتی ہے۔ جو لوگ صرف مال کے ہی طلب گار ہیں ان کے ایمان کو دنیا کی طلب اس طرح چٹ کر جاتی ہے جس طرح آگ لکڑی کو ختم کر دیتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جس شخص کی ساری ہمت دنیا کی طلب کے لئے ہو اس کی خدا کے نزدیک کچھ قدر و منزلت نہیں رہتی۔

حضرت بشر حافیؒ نے فرمایا کہ جو دنیا میں مال جمع کرتا رہا اس کے نیک اعمال بھی اسے فائدہ نہ دیں گے۔ حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ دنیا کے ناپسندیدہ ہونے کی علامت یہی کافی ہے کہ وہ نا اہل لوگوں کے پاس ہوتی ہے۔ ابوالدرداءؒ نے فرمایا کہ دنیا کے ذلیل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ آدمی اس کی محبت سے گناہ گار ہوتا ہے۔ ابو حازمؒ فرماتے ہیں کہ تھوڑی سی دنیا آخرت کے بہت سے کاموں سے باز رکھتی ہے۔ ایک صوفی کا قول ہے جو تھوڑی روزی پر راضی ہوا اللہ تعالیٰ اس کے تھوڑے اعمال سے راضی ہو جاتا ہے۔ وہب بن منہؒ فرماتے ہیں کہ جس کا دل دنیا کی چیزوں سے خوش ہوتا ہے وہ عقلمندی سے دور ہوتا ہے اور جس نے اپنی شہوات کو پاؤں تلے روندنا تو شیطان اس کے سائے سے بھی ڈرتا ہے۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نیکو کاروں کو دنیا سے دور رکھتا ہے تاکہ ان کی آزمائش کرے اور دشمنوں کو دنیا کی وسعتیں دیتا ہے۔ (۵۶)

اصل زندگی کیا ہے؟

عام لوگ نہیں سمجھ سکتے کہ اصل زندگی کیا ہے یعنی زندگی کو کس شکل و صورت میں گزارنا اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کے عین مطابق ہے۔ عوام الناس کے رجحانات کے مطابق اصل زندگی یہ ہے کہ بچہ پیدا ہو تو اس کی پرورش اس انداز میں کی جائے کہ وہ بڑا ہو کر انگریزی اسکول میں پڑھے اور زمانے کے ان تمام تقاضوں کو پورا کرے جن کے حصول سے لوگوں میں عزت و احترام پایا جاتا ہے۔ اس تربیت میں ظاہری چمک، تیزی طبع، امارت، وزارت اور صدارت جیسی چیزیں مطمح نظر ہوتی ہیں۔

## حوالہ جات باب ہفتم

- ۱۔ افغانی، دین محمد: تجدید الاسلام، مطبوعہ اسلامیہ پریس کوئٹہ۔ ص: ۱۱۵-۱۱۳۔
- ۲۔ Burtrand Russel: The Impact of science on Society. London, 1970. P. 93
- ۳۔ Ian Roxburg: Why is the Universe so Uniform۔
- ۴۔ القرآن حکیم: ۴۱ (حم السجدہ): ۳۷۔
- ۵۔ القرآن حکیم: ۹۳ (انشراح): ۶-۵۔
- ۶۔ Fnsychlopedix of Britranica, 1984, London History of Science V.16, P.366.
- ۷۔ Bertrand Russell: Autobiography, Unoin Paperbacks London 1978, PP, 392-93
- ۸۔ القرآن حکیم: ۱۳ (رعد): ۲۸۔
- ۹۔ Joseph Wood krutch: The Modern Temper, New-Yark 1929, P. 16.
- ۱۰۔ Bertrand Russell: A History of Western Philosophy. 1979, P 789.
- ۱۱۔ Fred Hole: The Interlligent Universe, Michael Joseph London 1983, P. 251.
- ۱۲۔ القرآن حکیم: ۱۳ (رعد): ۱۷۔
- ۱۳۔ خان وحید الدین، مولانا: دین کامل، مطبوعہ عصمت اسلم پرنٹرز، ص: ۳۱۷-۳۰۷۔
- ۱۴۔ منشی عبدالرحمن: مضطرب صدائیں، ناشر: طیب اکیڈمی بیرون بوہڑ گیٹ ملتان، ص: ۳۳۰-۳۲۸۔ ص: ۶۴-۶۱۔
- ۱۵۔ القرآن حکیم: ۶ (انعام): ۱۶۲۔
- ۱۶۔ القرآن حکیم: ۵۱ (ذاریات): ۵۶۔
- ۱۷۔ نظامی، خلیق احمد، پروفیسر: تاریخ مشائخ چشت، مطبوعہ مطبع دارالمومنین اسلام آباد، ص: ۳۷-۳۵۔ ص: ۱۹۳۔

- ۱۸۔ القرآن الحکیم ۱۰ (یونس) ۱۰۱
- ۱۹۔ القرآن الحکیم ۳۳ (سباء) ۴۶
- ۲۰۔ الحدیث، کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال، ج: ۳، حدیث نمبر ۵۷۱۱
- ۲۱۔ سیوطی، جلال الدین: الجامع الصغیر، ج: ۱، ص: ۱۱۳
- ۲۲۔ الترمذی، محمد بن عیسیٰ بن سورہ، ابو عیسیٰ: سنن الجامع، ج: ۲، ص: ۱۸۷
- ۲۳۔ القرآن الحکیم ۳: (آل عمران): ۹۱-۹۰
- ۲۴۔ القرآن الحکیم ۳۶: (یٰسین): ۴۶
- ۲۵۔ القرآن الحکیم ۱۲: (یوسف): ۲۶
- ۲۶۔ القرآن الحکیم ۷: (اعراف): ۱۷۹
- ۲۷۔ القرآن الحکیم ۳۹: (زمر): ۱۸-۱۷
- ۲۸۔ القرآن الحکیم ۲: (البقرہ): ۱۷۰
- ۲۹۔ القرآن الحکیم ۲۹: (التکوٰت) ۶۹
- ۳۰۔ بھٹی، ظہیر الدین، محمد: اسلام دستور حیات، ص: ۲۸-۲۹
- ۳۱۔ محمد عثمان، پروفیسر: فکر اسلامی کی تشکیل نو، مطبوعہ: سنگ میل پبلیکیشنز لاہور، ص: ۱۶۵-۱۵۱
- ۳۲۔ لطیف اللہ، پروفیسر: تصوف اور سیریت، مطبوعہ: مکتبہ جدید پریس لاہور، سن اشاعت ۱۹۹۶ء، ص: ۲۶-۲۸
- ۳۳۔ بھٹی، ظہیر الدین، محمد: اسلام دستور حیات، ص: ۳۵
- ۳۴۔ محمد عثمان، پروفیسر: فکر اسلامی کی تشکیل نو، ص: ۲۱۹-۱۹۶
- ۳۵۔ غزالی، محمد، امام، کیمیائے سعادت، ص: ۸۶۱
- ۳۶۔ القرآن الحکیم: (البقرہ): ۲۵۶
- ۳۷۔ ابن ماجہ، محمد بن یزید، ابو عبد اللہ، القزوی، سنن، مہر کتب خانہ، تن، مقدمہ، ص: ۳۰۴
- ۳۸۔ صدیقی، عبد الحمید: انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام، ناشر: اسلامک پبلشنگ ہاؤس لاہور، سن اشاعت ۱۹۹۱ء، ص: ۱۹۳
- ۳۹۔ القرآن الحکیم ۶۱ (سورہ صف) ۱۳-۹

- ۴۰۔ محمد قطب، اسلام کا نظام تربیت، ترجمہ: پروفیسر ساجد الرحمن صدیقی، ص: ۱۷-۱۵
- ۴۱۔ القرآن الحکیم ۴۹ (حجرات) ۱۳
- ۴۲۔ القرآن الحکیم ۴۸ (فتح) ۲۳
- ۴۳۔ القرآن الحکیم (احزاب) ۳۵
- ۴۴۔ القرآن الحکیم (نور) ۳۱-۳۰
- ۴۵۔ ولی الدین، محمد بن عبد اللہ، ابو عبد اللہ، الخطیب: مشکوٰۃ المصابیح، ص: ۴۳۱
- ۴۶۔ القرآن الحکیم: (الفتح) ۲۹
- ۴۷۔ القرآن الحکیم: (تحریم) ۹
- ۴۸۔ القرآن الحکیم (آل عمران) ۱۵۹
- ۴۹۔ القرآن الحکیم (حم سجدہ)
- ۵۰۔ القرآن الحکیم (آل عمران) ۱۳۹
- ۵۱۔ القرآن الحکیم (نحل) ۱۲۵
- ۵۲۔ القرآن الحکیم (آل عمران) ۱۳۹
- ۵۳۔ القرآن الحکیم (سورہ لقمان) ۱۹-۱۸
- ۵۴۔ محمد قطب: اسلام کا نظام تربیت، مطبع: میٹروپریٹرز لاهور، ص: ۲۶۸-۲۶۴
- ۵۵۔ عبد الرحمن، منشی: مضطرب صدائیں، ناشر: ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان، ص: ۳۹۶-۳۳۲
- ۵۶۔ عطارد، شیخ: تزکرة الدینیہ، مطبعہ دار الفکر، اردو بازار، ص: ۱۶۵-۱۵۶



# باب ہشتم

عصر حاضر میں تصوف کے کردار میں حائل مشکلات اور ان کا تدارک

## عصر حاضر میں تصوف کے کردار میں حائل مشکلات اور ان کا تدارک

تصوف کے بارے میں ہر دور میں آراء کا اختلاف رہا ہے اور اس کی حقیقت سمجھنے میں عام آدمی کو دشواریوں کا سامنا رہا ہے۔ اس لئے اس کا تعلق قیل و قال سے نہیں بلکہ اس کا ادراک خالصتاً قلبی واردات اور حال سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک صاحب علم جو پوری طرح قوت اظہار سے متصف ہو، استدلال کی فراوانی کے ساتھ بھی تصوف کو سمجھانے کی کوشش کرے تو اس صورت میں بھی یہ ضروری نہیں کہ سننے والے پر تصوف کے اسرار و رموز پوری طرح منکشف ہو جائیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ ایک فرد خود تجربہ و شہود کی منزل سے گزرا ہو۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ خود اس راستے کا سالک محض علمی اصطلاحات کے ذریعے ایک عام آدمی کے ذہن تک اپنے تجربات و واردات کو پہنچا سکے۔ اس کے لئے بہر صورت اس راستہ کا سفر از بس ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تصوف ہمیشہ ان لوگوں کے مابین مابہ النزاع رہا ہے جو اسکے مالمہ و ماعلیہ سے نا بلند تھے۔

گذشتہ ڈیڑھ صدی کے دوران میں ایک ایسی صورت حال پیدا ہوئی۔ جس نے ان مسائل کو مزید الجھا دیا۔ اس سے مراد مغربی افکار کی وہ یلغار ہے جو مستشرقین کے ذریعے عالم اسلام پر ہوئی۔ مسلم ممالک میں سیاسی زوال کے ساتھ فکری و عملی سوتے بھی خشک ہوتے گئے اور مسلم قوم تحقیقی میدان میں بھی اہل مغرب کی دست نگر بن گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تصوف کے مسائل سمجھنے کے لئے بھی مستشرقین کی تحریریں سند مانی جانے لگیں۔ اس صورت حال میں ایسی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں جن کا بروقت تدارک نہ ہو سکا اور وقت گزرنے کے ساتھ ہمارے قومی شعور کا حصہ بن گئیں۔

ایسی ہی غلط فہمیوں میں خود ایک تصوف کی تعریف اور اس کا صحیح تصور ہے۔ مغرب میں پہلے سے ایک لفظ *Mysticism* مروج تھا چنانچہ اسلامی تصوف کا ترجمہ کرتے وقت اس لفظ کو جس کو سریت کہتے ہیں۔ استعمال کیا گیا۔ اس ترجمہ کے بعد سریت کا جو مفہوم مغرب میں معروف تھا وہ از خود تصوف سے منسوب کر لیا گیا۔ پھر جب اہل مغرب کی تحریریں، مشرق میں پہنچیں تو تصوف اپنا اصلی مفہوم کھو بیٹھا اور اسے وہی معانی پہنائے جانے لگے جو سریت سے مختص تھے۔ آج اسلامی تصوف پر جو اعتراضات بھی کئے جاتے ہیں ان کا تجزیہ کیا جائے تو بالعموم ان کے پیچھے یہی غلط فہمی کارفرما نظر آئے گی۔

## مغرب میں رجحان کی تبدیلی:-

سائنس کے بے حد بے حساب کمالات کے ساتھ انسانی اذہان میں انقلاب برپا ہوا۔ قدریں، قانون، قاعدے اور رسوم سب متاثر ہوئیں۔ اور ذاتی افق بدل گئے۔ یوں سرسری طور پر بھی اگر دنیا کی موجودہ حالت پر نگاہ ڈالی جائے۔ تو ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ

اس پورے کرۂ ارض کی جاندار مخلوق تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے۔ جہاں بٹن دبانے سے پوری دنیا کو مٹایا جاسکتا ہو۔ وہاں رہنے والوں کی ذاتی کیفیت سمجھ میں آسکتی ہے۔ وہ جنہیں آسائش و رہائش کی ایسی سہولتیں میسر ہوں کہ پہلے زمانے کے جلیل القدر بادشاہوں کو بھی میسر نہ تھیں۔ اب رات دن جنگ اور موت کے خوف میں مبتلا ہیں۔

ظاہر میں جو مفہوم ہو سکتا تھا وہ تو یہی تھا جس کا ظہور ہو چکا اور باطن سے اب تک یہ لوگ غافل رہے ہیں۔ اگر باطن پر انہوں نے نظر ڈالی بھی سہی تو اسے ظاہر کی عینک سے ہی دیکھا یعنی تصوف کی اصلاح میں نفس سے آگے نہ جاسکے۔ چنانچہ نفسیات کے بارے میں جو کچھ نئی باتیں دریافت ہوئیں۔ ان کی حیثیت نفسیاتی الجھنوں سے زیادہ نہیں۔ ان سے پیچیدگیوں میں اضافہ ہی ہوا۔ ان سے زندگی کی مشکلات کا حل نڈل سکا۔

اس پورے عرصہ میں سائنس نے ظاہر سے سروکار رکھا اور باطن کو نہ صرف نظر انداز کیا گیا بلکہ اس کے ساتھ ایک قسم کی محاصرت کا رویہ اختیار کیا۔ چنانچہ اس صدی کے اوائل میں ظاہر پرستی اپنے نقطہ عروج کو چھونے لگی تھی اور مافوق الطبیعیات اور خاص طور پر سریت اور تصوف کے خلاف رد عمل اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا حتیٰ کہ مذہب کے ادا مرنوا ہی کو بھی جو ظاہر سے تعلق رکھتے ہیں اضافی حیثیت دی گئی یا بیکار سمجھا گیا۔ دراصل وہ تمام علوم جن کا تعلق باطن سے ہے نظر انداز کر دیے گئے۔ طبعیاتی سائنس کے تجربات اور اسکے نتائج ہی علم کی بنیاد قرار دیے گئے اور اس رجحان کو خرد افروزی کا خوبصورت نام عطا ہوا۔

یہ درست ہے کہ اسی پوری مدت میں مذہب کا وجود برقرار رہا گو اس کے متعلق نہ صرف بدعقیدگی پیدا ہوئی بلکہ اس کے محرکات بھی ظاہر میں تلاش کرنے کی کوششیں ہوئی جن سے ایمان متزلزل ہو گئے۔

اس دوران دنیا بھر کے سریت پسند اور صوفی جوتوں کر کے اپنے اسالیب اور طرق سے وابستہ رہے تو یہ ان کی ہمت تھی گو ان کے صومعے اور حجرے نیم ویران ہو گئے اور عوام ان کے طور و طریق سے برگشتہ ہو گئے کیونکہ غالب رجحان دنیا بھر کے لوگوں کا مادیت اور ظواہر کی طرف ہی رہا۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ دنیا میں کوئی ایسا معاشرہ نہ رہا اور کوئی ایسی جماعت نہ رہی جس کی ثقافت جدید دور کی ظاہر پرستی کے اس رجحان کی دستبرد سے بچ سکی ہو۔

مگر اب جب اہل مغرب کو سائنس کے کمالات نے اس درجے تک پہنچا دیا ہے کہ وہ اپنی ہی بنائی ہوئی مشینوں سے خوف کھانے لگے اور دوشدید مہلک جنگوں سے دوچار ہو کر انہوں نے ان کی تباہ کاریوں کو دیکھ لیا تو ان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی ہے کہ اب تک جو محض ظاہر اور ظاہر کے کمال پر وہ بھروسہ کرتے آئے تھے۔ ناکافی ہے بلکہ اس بھروسے کو لیکر وہ اگر مزید آگے بڑھے تو ہلاکت اور موت کو منظر پائیں گے۔

### اہل مغرب کی موجودہ سریت پسندی:-

ایک وقت تھا کہ لوگ سائنسدانوں کو مستقبل کے حکمران تصور کرنے لگے تھے پھر جب ان سے مایوس ہوئے تو سیاستدانوں کو جب الوطنی اور دانائی کا اجارہ دار سمجھنے لگے تھے مگر جلد ہی ان کی ہوس اقتدار نے ان کے بھی پول کھول دیے اور اس کا نتیجہ ہے کہ اب ان ملکوں میں جہاں ظاہر کے یہ دانا آزمائے جا چکے ہیں لوگ پھر سری علوم کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔

مشرق کے وہ لوگ بھی جو کبھی یورپ اور امریکہ نہیں گئے تھے۔ اہل مغرب کی اس بے چینی اور روحانی اضطراب کو ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ یہ جو مشرق وسطیٰ سے لیکر مشرق بعید تک کے شہروں اور قصبوں میں مغرب کی نئی نسل کی جوان لڑکیاں اور لڑکے بال بڑھائے اور کبھی کبھی چرس پیتے گھومتے نظر آتے ہیں۔ اس پریشانی، حیرانی اور اندر کی بے اطمینانی کے غماز ہیں۔ جوان لوگوں کو نت نئے ملکوں میں کسی موزوں اور متوازن اسلوب زندگی کی تلاش میں لئے پھر رہی ہے۔

مغرب کی اس نئی نسل نے اپنے اپنے ملکوں میں مادیت اور اسکی ترقیوں کی انتہاء بھی دیکھی اور اس کے ساتھ مسلمہ اخلاقی اقدار کا حشر بھی دیکھ لیا۔ نری مادیت جب اپنی انتہاء کو پہنچی ہے تو بجائے خود ایک ایسا مذہب بن گئی ہے جس کا کوئی آئین نہیں اور اگر اس کے کچھ اصول ہیں تو وہ ہیں۔ حرص، ہوس، اقتدار، ظلم اور ہر قسم کی بد معاشی اور بد خصالی۔ اس صورت حال سے گھبرا کر یہ جوان لوگ گھروں سے نکل کھڑے ہوئے ہیں انہوں نے مادی نظام اور سائنسی تجربات اور ان پر مبنی علوم کا دائرہ مکمل ہوتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔ اب وہ نئے دائرے میں داخل ہو رہے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ نیا دائرہ جو کچھ بھی ہوگا اب سے متعلق نہ ہوگا بلکہ اس کا تعلق باطن سے ہوگا۔ مشکل یہ پیش آرہی ہے کہ اس نسل کا اعتبار تمام موجودہ رسمی علوم سے اٹھ چکا ہے اور اگر وہ اپنے ہی تجربات پر انحصار کرتے ہوئے کسی نئے سری سلوک کا اپنے لئے انتخاب کریں گے تو اس کے لئے وقت درکار ہوگا۔ ابھی وہ اس لحاظ سے عبوری دور میں ہیں اور ان کے رجحان کا رخ واضح ہے۔ نہ یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کی یہ سریت پسندی اور باطن سے دلچسپی انہیں کہاں لے جائے گی۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ایسے سری سلوک کو اسلوب حیات کے طور پر اپنالیں۔ جس سے ظاہر کا توازن بھی برہم نہ ہو

اور ایسا بھی ممکن ہے کہ وہ اس عبوری دور کے اضطراب و انتشار پر ہی ٹھہر جائیں اور ان کا حشر بھی وہی ہو جو ایک پریشان خیال نشہ پرست قوم کا ہوتا ہے۔

نئی نسل کی اس سرگرائی اور سرگردانی کی جو سروے رپوٹوں یورپ اور امریکہ کے محلوں میں بھی چھپی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کہیں تو ان اکتائے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں نے ایسے کمیونس (Communes) بنا رکھے ہیں جہاں وہ ہر قسم کی ظاہر پابندیوں سے بے نیاز مادر پدر آزاد زندگی بسر کر رہے ہیں اور بعض حالتوں میں انہیں یہ خبر نہیں ہوتی کہ وہ خوش ہیں یا دکھی۔ کہیں ان لوگوں نے ہندو جوگیوں کی سی مشقیں کرنے کے لئے آشرم کھول رکھے ہیں اور معمولی سی مشقوں اور منٹروں کو ہی سب کچھ جانتے ہوئے ہندوستان نثر اد پندتوں کے قدموں میں بیٹھنے کو ہی بڑی سعادت خیال کئے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگوں نے ذہنی نفسیات میں معلومات کے لئے فوق الحی اور اک اور سری و باطنی تجربات میں دلچسپی لینا شروع کر دی ہے اور کچھ ہندوؤں اور بدھوں کے باقاعدہ سری سلوک اور مسلمانوں کے تصوف میں پناہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ (۱)

## فصل اول

### مسائل و مشکلات

مغرب کی موجودہ سریت پسندی جس کا کوئی خاص رخ ہمارے سامنے نہیں آیا جب ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کو متاثر کرے گی تو کیا اس سے ہمارے ذہنی انتشار میں اضافہ تو نہیں ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ لازماً ذہن اور دماغ ایک نئے خلیجان میں مبتلا ہوں گے۔

دوسرا مسئلہ یہ کہ مغرب سائنس اور ٹیکنالوجی میں انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ اب باطنی ادراک اور سری تجربوں کا احساس ہونے لگا ہے۔ اگر ہم نے کسی غیر متعین سری سلوک کی طرف متوجہ کی تو نہ ادھر کے رہیں گے اور نہ ادھر کے رہیں گے۔ لہذا اہل مشرق کو خاص کر مسلمانوں کو ایسے باطنی سلوک کی ضرورت ہے جو ان کی ظاہری ترقی کے خلاف نہ ہو۔ (۲)

صحیح اسلامی تصوف کی راہ میں جو مشکلات اور مسائل حائل ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

- |                           |                              |
|---------------------------|------------------------------|
| ۱۔ فرقہ بندی              | ۲۲۔ اسمعیلیہ نے ایک لفظ کے   |
| ۲۔ شخصیت پرستی            | باطنی اور ظاہری معانی کا     |
| ۳۔ تجسم                   | فتنہ کھڑا کیا جس کی وجہ سے   |
| ۴۔ حلول یا اوتار کا عقیدہ | یہ باطنیہ فرقہ مشہور ہو گیا۔ |

- ۵۔ رجعت کا عقیدہ ۲۳۔ باطنیت کے اثرات تصوف پر۔
- ۶۔ الوہیت ۲۴۔ دور حاضر میں صوفیاء کا کاردار (۳)
- ۷۔ تنازع ارواح کا عقیدہ غلو
- ۸۔ تشبہ (۴) ۲۵۔ مغربی افکار کی وہ یلغار جو مستشرقین کے ذریعے عالم اسلام پر ہوئی۔
- ۹۔ مشیت ایزدی میں تبدیلی ۲۶۔ تصوف ہمیشہ ان لوگوں کے باطنی فرقہ
- ۱۰۔ تحریک ملاحدہ (۵) ۲۷۔ مابین مابہ النزاع رہا جو اس کے مالہ و ماعلیہ سے تابلد تھے۔
- ۱۱۔ اباحت مطلقہ ۲۸۔ سریت اور تصوف کے فرق کا واضح نہ ہونا۔ (۶)
- ۱۲۔ قرامطہ کی تبلیغی مساعی ۲۹۔ بے سند اور جھوٹی پیر مریدی کا ہونا۔
- ۱۳۔ بیکتاشی فرقہ ۳۰۔ خاتقاہی نظام کی جگہ درگاہی نظام۔
- ۱۴۔ نور بخشی سلسلہ ۳۱۔ درگاہوں کو میراث بنالینا
- ۱۵۔ تدسیس ۳۲۔ سجادہ نشین حضرات کا قرآن و سنت اور علم تصوف سے عاری ہونا۔
- ۱۶۔ الحاقی عبارات منجانب باطنیہ ملاحدہ زنا و قہ ۳۳۔ راہبانہ کردار کی تصوف میں آمیزش۔
- ۱۷۔ قلندری و ملائی درویش ۳۴۔ بدعات کا داخل ہونا۔
- ۱۸۔ فرقہ اسمعیلیہ کا طائف جھٹاشین ۳۵۔
- ۱۹۔ اکابر اہلسنت کی تصانیف ۳۶۔
- ۲۰۔ کتب تصوف میں تدیس و تحریف و تدیسی الحاقی عبارات ۳۷۔
- ۲۱۔ سبائیہ اور قرامطہ نے بعض صوفیوں کو اپنی جماعت کا فرد ظاہر کیا۔

- ۵۔ مغربی افکار کی وہ یلغار جو مشتر یقین کے ذریعے عالم اسلام ہوگی۔
- ۵۔ سریت اور تصوف کے فرق کا واضح نہ ہونا۔
- ۵۔ درگا ہوں کو موروٹی بنالینا
- ۵۔ علم تصوف نیز قرآن و سنت کے علم سے عاری ہونا۔
- ۵۔ بدعات کا داخل ہونا۔
- ان وجوہات کی بناء پر صحیح اسلامی تصوف کی معرفت کا موقع کما حقہ نہیں مل رہا ہے۔

## فصل دوم

### ان مسائل کا پس منظر

- 1۔ گذشتہ ڈیڑھ صدی کے دوران میں ایک ایسی صورت حال پیدا ہوئی جس نے ان مسائل کو مزید الجھا دیا۔ اس سے مراد مغربی افکار کی وہ یلغار ہے جو مشتر یقین کے ذریعے عالم اسلام پر ہوئی۔ مسلم ممالک میں سیاسی زوال کے ساتھ فکری و عملی سوتے بھی خشک ہو گئے۔
- اور مسلم قوم تحقیقی میدان میں بھی اہل مغرب کی دست نگر بن گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تصوف کے مسائل سمجھنے کے لئے بھی مشتر یقین کی تحریریں سند مانی جانے لگیں۔
- 2۔ تصوف کے بارے میں ہر دور میں آراء کا اختلاف رہا ہے اور اسکی حقیقت سمجھنے میں عام آدمی کو دشواریوں کا سامنا رہا ہے اس لئے کہ اس کا تعلق قیل و قال سے نہیں بلکہ اس کا ادراک خالصتاً قلبی واردات اور حال سے ہے۔ اس کو وہی سمجھ سکتا ہے جو اس کے مالہ و ماعلیہ سے واقف ہو اور چونکہ لوگ نہیں جانتے اس کے مالہ و ماعلیہ کو! اس لئے ان کے درمیان وجہ نزاع رہا ہے۔
- 3۔ اہل مغرب کے غلبہ کی وجہ سے سریت کا تصوف پر گہرا اثر رہا ہے۔ اسلئے یہ بات بھی اسلامی تصوف کے پھلنے پھولنے میں مانع رہی ہے۔
- 4۔ عقیدہ باطنیت کا تصوف پر گہرا اثر ہوا ہے۔ باطنی عقیدہ کے علمبردار ہر لفظ کے دو معنی بتاتے تھے کہ ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن، جو باطن ہے وہ حقیقت ہے۔ اس طرح لوگوں نے ان سے بہت اثر لیا۔ انہوں نے تصوف کو ڈھال بنایا اور کہنے لگے کہ اصل مذہب یہی ہے۔ اور پھر اسکی اپنے عقائد کے مطابق جو کہ فاسد تھے تاویلیں کرنے لگے۔ اس

طرح سے اصل تصوف کی صورت بگڑ گئی۔

5۔ حضرت عثمان غنیؓ کے دور تک ایک ہی عقیدہ تھا۔ آپ کی خلافت کے آخری ایام میں ایک یہودی النسل عبداللہ ابن سبائے مدینہ منورہ آکر اسلام بظاہر قبول کیا جیسا کہ یہودیوں کی عادت تھی۔ اس کے بعد اس شخص کی وجہ سے رافضی عقیدہ معرض وجود میں آیا۔ اس نے الوہیت علیٰ کے عقیدہ کی بنیاد ڈالی۔ چونکہ ولایت کے سلسلے حضرت علیؓ سے جاری تھے۔ منبع تصوف آپ تھے اس لئے اس قسم کے غلط پیروکاروں کے عقائد کی تصوف میں آمیزش ہو گئی حالانکہ حضرت علیؓ نے ہی اس بد بخت عبداللہ ابن سبا کو مروا دیا تھا۔

6۔ جہلاء کے مسند تصوف پر بیٹھنے سے قرآن و سنت کے منافی امور داخل ہو گئے۔ جاہل صوفی اپنی آراء کو تصوف کہنے لگے۔ اس طرح سے ان کے پیروکاروں نے جاہل صوفی کی ہر بات جو کہ غیر شرعی ہوتی اس کو حق سمجھنے لگے۔ اس سے تصوف کی ایک الگ بگڑی صورت معرض وجود میں آئی۔ صوفی اگر نماز نہ پڑھتا تو مرید کہتے مدینہ میں پڑھا آیا ہے۔ اس قسم کی خرافات نے حقیقی تصوف میں جنم لیا۔

7۔ ایسے صوفی مسند ارشاد پہ بیٹھ گئے جو اس کے اہل نہ تھے کسی کامل صوفی سے نہ ہی سند مجازلی اور نہ تصوف کی الفب کی تعلیم حاصل کی۔ بس بال بڑھائے۔ کپڑے لمبے اور رنگین پہن لیا۔ ہر قسم کا جادو اور ٹونے ٹونے کر کے اپنی دکانداری بنالی۔ ایسے جھوٹے صوفیوں اور پیروں نے بھی تصوف کی اصل صورت کو بگاڑ دیا ہے۔

8۔ دور اول کے اسلامی تصوف نے علوم فطرت میں تحقیق کی راہ ہموار کی تھی مگر دوسرے دور کا تصوف علوم فطرت میں تحقیق کے لئے سد راہ بن گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں تصوف میں غلو کا پہلو بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ سائنس خالق واقعی کو غور و فکر کا موضوع بناتی ہے۔ اسکے برعکس غلو آمیز تصوف خواب، مکاشفہ اور پراسرار مظاہر میں گم ہونے کا نام ہے۔

9۔ خانقاہی نظام میں مدرسہ اور سلوک کے ادارے قائم تھے جن میں اسلامی تصوف کو سبقاً پڑھایا بھی جاتا تھا اور پھر ریاضتیں اور مجاہدے بھی کرائے جاتے تھے۔ اسلئے اسلامی تصوف کی اصل ہیئت نہیں بگڑی مگر جب سے یہ نظام زوال پذیر ہوا اور اسکی جگہ مجاہدوں نے لی تو تصوف کی روح باقی نہ رہی بلکہ ان مجاہدوں کی الٹی چالوں کو تصوف کا نام دے دیا گیا۔

خانقاہ سے لوگوں کو کچھ ملتا تھا جبکہ درگاہیں لوگوں کو لوتی ہیں۔

10۔ درگاہیں موروٹی بنادی گئی ہیں۔ نسل در نسل آرہے ہیں۔ بڑوں کی کمائی کھا رہے ہیں۔ چاہے مرنے والے بزرگوں نے اجازت نہ بھی دی پھر بھی مسند پر بیٹھ کر چند خوشامدیوں کے اپنی من گھڑت کمالات نشر



کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ بھی اصل تصوف کو بگاڑنے میں شامل ہیں۔

11۔ آج کل جتنے موروثی سپاہ نشین حضرات بزرگوں کی مسند پر بیٹھے ہیں۔ علم سے فارغ ہوتے ہیں۔ قرآن و

سنت کا ہویا تصوف کا۔ ایسے جاہل لوگوں نے اپنا من گھڑت تصوف بنا رکھا ہوتا ہے۔ جو حقیقی تصوف کی راہ میں آڑ ہے۔

12۔ آج کل اکثر راہبوں اور برہمنوں کے ٹوٹکے اور علاج اسلامی تصوف میں داخل ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ جاہل

پیر تعویذ دے گا تو ساتھ ڈھیر دشرطیں لگا دے گا۔ کہ گائے کا گوشت نہیں کھانا ہے۔ سودک والے گھر نہیں جانا۔ پہلے

دھاگے سے تعویذ باندھنا ہے۔ وغیرہ وغیرہ جبکہ اصل تصوف میں ان چیزوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

13۔ جہلاء پیروں کی وجہ سے بے شمار بدعات سیہ تصوف میں گھس آئی ہیں۔ پیر خود بدعت کا مرتکب ہوتا رہتا ہے

پھر مرید تو از خود ہوگا بلکہ وہ تو عین اسلام سمجھ کر اپنا تار ہے گا۔

یہ ہیں وہ مشکلات جو تصوف کی راہ میں حائل ہیں اب ان کا پس منظر بیان کیا جاتا ہے۔ تاکہ مزید وضاحت

ہو جائے۔ اس سے پیشتر کہ مندرجہ بالا عنوانات کے تحت ان کا پس منظر بیان کیا جائے یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ

چوتھی صدی ہجری کے بعد جو غیر اسلامی اور عجمی تصوف عین اسلامی تصوف میں گھس آیا وہ اسلامی تصوف کی ضد تھا۔

ہمارے اکابر صوفیہ کرام نے اس کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور مسلمانوں کو اس کے مفاسد سے آگاہ کر کے

بلا خوف و لومۃ لائم اپنا فرض منصبی انجام دیا بہر کیف جس طرح بعض مسلمانوں کی گمراہی سے اسلام پر کوئی حرف نہیں آ سکتا

اس طرح بعض صوفیوں کی گمراہی سے اسلامی تصوف مورد طعن نہیں بن سکتا۔ غیر اسلامی یا عجمی تصوف کی اشاعت کے

اسباب مندرجہ ذیل ہیں۔ (۱۴)

### ۱۔ فرقہ بندی:

حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت کے وسط تک مسلمانوں میں کوئی فرقہ نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں

مسلمانوں کو حزب اللہ قرار دیا گیا ہے۔

اولئك حزب الله الا ان حزب الله هم یہ لوگ اللہ کے گروہ ہیں بیشک اللہ کے گروہ ہی کامیاب

المفلحون (۷) ہیں۔

ظاہر ہے کہ اگر کسی فوج یا جماعت میں تفرقہ پیدا ہو جائے تو اس کا خاتمہ یا مغلوب ہو کر غلام ہو جانا اور اپنی ہستی

سے محروم ہو جانا یقینی ہے اس لیے از روئے عقل و نقل، مسلمانوں میں پیدا کوئی فرقہ پیدا ہی نہیں سکتا تھا اور اسی لیے

اللہ نے قرآن حکیم میں بار بار مسلمانوں کو متنبہ فرمایا ہے کہ دیکھو اپنے اندر فرقہ بندی، گروہ بندی، تششت، افتراق، یا پارٹی بازی کورہ نہ دینا ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ بخوف طوالت صرف چند آیتوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

۱۔ واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا۔ اے مسلمانو! تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور مختلف فرقوں میں منقسم مت ہو۔ (۸)

۲۔ ولا تكونوا كالذین تفرقوا واختلّفوا من اور اے مسلمانو! ان لوگوں (یہود و نصاری) کی طرح مت ہو جانا جو مختلف فرقوں میں بٹ گئے اور جنہوں نے اللہ

کی طرف سے واضح دلیلیں آ جانے کے بعد بھی آپس میں اختلاف کیا (اور اس اختلاف کی وجہ سے ان میں عقائد کی خرابیاں پیدا ہو گئیں)

۳۔ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذهب ریحکم اے مسلمانو! آپس میں نزاع (جھگڑا) مت کرو کیونکہ نزاع سے تفرقہ پیدا ہوگا اور فرقہ بندی سے تمہارے اندر

بزدلی پیدا ہوگی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور دشمن کے مقابلے میں ثابت قدم

رہو۔

اس آخری آیت سے فرقہ بندی کی مضرت کے علاوہ یہ بھی ثابت ہوا کہ قرآن کا نازل کرنے والا مسلمانوں کو ایک متحد الخیال اور متحد المقصد فوج کے افراد قرار دیتا ہے۔ جن کے حق میں اختلاف سم قاتل سے بھی زیادہ مہلک ہے اسلئے انہیں متنبہ کرتا ہے کہ دیکھنا کہیں آپس میں نزاع کورہ نہ دینا اور فرقوں میں منقسم نہ ہو جانا، کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری جماعت کے اندر مختلف الخیال گردہ (فرقے) پیدا ہو جائیں گے اور فرقہ بندی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم آپس میں لڑو گے اور آپس کی لڑائی کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ دشمنوں کے دلوں سے تمہارا رعب اٹھ جائے گا۔

فی الجملہ ان آیات سے ثابت ہو گیا کہ قرآن حکیم مسلمانوں کو اللہ کی فوج قرار دیتا ہے اور اس کی مزید تائید اس آیت سے ہوتی ہے۔

اولئک حزب الشیطن الا ان حزب الشیطن ہم یہ لوگ شیطان کے گروہ ہیں اور ہو جاؤ کہ شیطان کے الخسرون (۱۱)

گردہ کے لوگ گھائے میں رہیں گے۔

یہ حقیقت کہ قرآن کی رو سے (اللہ کی نگاہ میں) مسلمان قوم یا ملت اسلامیہ، اللہ کی فوج ہے اس آیت سے بھی ثابت ہوتی ہے۔

ان الله يحب الذين يقاتلون في سبيله صفا كما بلا شبه الله محبت کرتا ہے ان لوگوں سے جو اس کی راہ میں، اس طرح صف باندھ کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی نہم بنیان مرصوص۔ (۱۲)

عمارت ہیں۔

چونکہ مسلمان اللہ کی فوج ہیں اسی لئے ان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ دشمنان اسلام کا مقابلہ کرنے کے لیے تیاری سے غافل نہ ہوں۔

واعد والهم ما استطعتم من قوة ومن رباط اے مسلمانو! دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیاری الخیل ترہبون بہ عدوا للہ وعدوکم۔ (۱۳) کرو جس قدر تمہیں ممکن ہو سکے یعنی مادی قوت فراہم کرو اور گھوڑے باندھو (یعنی پلٹن اور رسالے تیار کرو۔)

اس سلسلے میں قول فیصل یہ ہے کہ اللہ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور مالوں کو جنت کے عوض خرید لیا ہے چنانچہ اللہ نے فرمایا۔

ان الله اشترى من المؤمنين انفسهم وما اموالهم في سبيل الله جنت کے بدلے میں خرید لیا ہے (اب یہ کام صرف یہ ہے فیکتلون و یقتلن۔ (۱۴) کہ) وہ اللہ کی راہ میں لڑیں گے (جس کا نتیجہ لازمی طور پر یہ ہوگا کہ) وہ قتل کریں گے اور قتل ہو جائیں گے۔

قرآن مجید میں اس نوعیت کی آیتیں بہت سی ہیں۔ ایضاً مقصد کے لئے اتنی ہی آیتیں کافی ہیں۔ قرآن حکیم نے مسلمانوں کی ایذازی صفت یہ بیان کی ہے۔

محمد رسول الله والذين معه اشداء على حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں ان کی شناخت یہ ہے کہ وہ کافروں پر سخت اللفار رحماء بینہم۔ (۱۵)

ہیں (مگر) آپس میں رحیم ہیں۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ فرقہ بندی، اسلام کی ضد ہے کیونکہ فرقہ بندی کا لازمی نتیجہ آپس کا نزاع ہے۔ بلاشبہ قرآن حکیم نے مسلمانوں کو خدائی فوج قرار دیا ہے یعنی ان کا کام یہ ہے کہ وہ دنیا سے برائی کو مٹائیں اور

نیکی کی اشاعت کریں۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ

کنتم خیر امة اخرجت للناس تا مرون اے مسلمانو! تم دنیا میں بہترین جماعت ہو جو انسانوں کو  
بالمعروف و تنہون عن المنکر و تومنون باللہ نیکی کا حکم دو گے اور برائیوں سے منع کرو گے۔

(۱۶)

یہ آیتیں صدر اول کے مسلمانوں کے سامنے تھیں اور حضور انور ﷺ ۲۳ سال کی مدت میں ان کی اندر وحدت  
افکار و کردار پیدا کر دی تھی۔ تمام مسلمانوں کے سامنے ایک ہی مقصد تھا اور ایک ہی نصب العین تھا یعنی اعلاء کلمۃ الحق۔ اللہ  
کے کلمے (قرآن) کو دنیا میں بلند کرنا ان کا جینا اور مرنا سب اللہ ہی کے لیے تھا۔

## ۲۔ شخصیت پرستی:

اللہ سے بڑھ کر فطرت انسانی کا عالم اور کون ہو سکتا ہے؟ انسان کی یہ فطرت ہے کہ اگر وہ کسی شخصیت کو اپنا  
مقصود بنا لے اور اس کے لیے اپنی زندگی بسر کرنے لگے تو رفتہ رفتہ وہ خدا پرستی سے بیگانہ ہو جاتا ہے کیونکہ جب غیر اللہ مطمح  
نظر اور مقصود حیات بن گیا تو تو اللہ خدا بخود نگاہ اور دل و دماغ سب سے اوجھل ہو جائے گا شخصیت پرستی چونکہ شرک عظیم  
ہے اس لیے مسلمان مسلمان نہیں رہ سکتا مشرک ہو جائے گا۔

اس لیے قرآن نے شخصیت پرستی کا خاتمہ کر دیا۔ اور یہ بات واضح ہے کہ قرآن سے بڑھ کر کسی الہامی یا آسمانی  
کتاب نے شخصیت پرستی کی تردید نہیں کی۔

## ۳۔ تجسم:

کسی انسان کی پرستش کی بنیاد یہ عقیدہ ہے کہ اس انسان میں الوہیت کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اسی عقیدے نے  
رفتہ رفتہ تجسم یا حلول کے عقیدے کی شکل اختیار کر لی۔ دنیا میں جن جن انسانوں کی پرستش کی گئی ہے پہلے ان میں الوہیت  
تسلیم کی گئی ہے پھر ان کی پرستش شروع ہوئی اس لیے قرآن شریف نے شخصیت پرستی کا جس خوبصورتی سے سد باب کیا  
ہے وہ مذاہب عالم کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔

(۱) مسلمانوں کو حکم دیا کہ آنحضرت ﷺ کی رسالت سے پہلے آپ کی بشریت اور عبدیت کا اقرار کریں۔

اشہد ان محمدا عبده و رسوله اس کلمہ شہادت میں عبدہ پہلے ہے رسول بعد میں ہے۔

(ب) قل انما انا بشر مثلكم۔ (۱۷)  
اے رسول آپ اعلان کر دیجئے کہ میں تمہاری ہی طرح  
ایک بشر ہوں۔

(ج) وما محمد الا رسول قد خلت من قبله اور حضرت محمد (ﷺ) نہیں ہیں مگر رسول، ان سے پہلے  
الرسول ط افان مات او قتل انقلبتم على اعقابكم۔  
پا جائیں یا قتل ہو جائیں تو (اے مسلمانو) کیا تم اپنی  
ایڑیوں پر پھر جاؤ گے یعنی اسلام چھوڑ دو گے؟ (۱۸)

اس نص صریح سے ثابت ہوا کہ اسلام کی روح خدا پرستی ہے شخصیت پرستی نہیں ہے اور نہ ہی اسلام عقیدہ تجسم  
اور الوہیت کی اجازت دیتا ہے۔

اسلام کی تاریخ میں حضرت ابوبکر صدیق اکبرؓ کو یہ فخر حاصل ہے کہ سب سے پہلے انھوں نے مسلمانوں کو اس  
حقیقت سے آگاہ کیا کہ اسلام شخصیت پرستی کا نام نہیں ہے بلکہ خدا پرستی کا نام ہے یعنی مسلمان کا مقصود مطلوب صرف اللہ  
ہے جو حقیقی لایموت ہے۔

جب سالم بن عبید کے ذریعہ حضرت ابوبکرؓ کو حادثہ رحلت سرور عالم ﷺ کی خبر پہنچی تو آں جناب فوراً  
گھوڑے پر سوار ہو کر کا شانہ نبوت میں تشریف لائے۔ آں حضرت ﷺ کے جسد اطہر کے قریب کھڑے ہو کر رخ روشن  
سے چادر اٹھائی۔ پیشانی مبارک پر بوسہ دیا۔ گریہ کنائں آپ ﷺ کو مخاطب کر کے یوں گویا ہوئے:  
”میرے ماں باپ آپ ﷺ پر فدا ہوں آپ ﷺ زندگی میں بھی پاک و صاف رہے اور اب موت کے بعد  
بھی پاک و صاف ہیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ اللہ آپ کو ہرگز دو موتیں نہیں دے گا وہ  
موت جو اللہ نے آپ کے لئے مقدر کر دی تھیں وہ تو آپ کو آہی گئی“ یہ کہہ کر مسجد نبوی میں تشریف لائے یہاں  
عجیب کھرام مچا ہوا تھا فاروق اعظمؓ کہہ رہے تھے کہ حضور ﷺ کی وفات نہیں ہوئی صدیق اکبرؓ نے انہیں سمجھایا اور کہا کہ  
بیٹھ جاؤ وہ بیٹھ گئے تو حضرت صدیق اکبرؓ نے تقریر شروع کی حمد و ثناء کے بعد فرمایا:

الا من كان يعبد محمداً فان محمداً قد مات جو شخص حضرت محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا وہ سن لے کہ بلاشبہ  
ومن كان يعبد الله فان الله حي لا يموت۔ قال آں حضرت ﷺ وفات پاگئے لیکن جو شخص اللہ کی عبادت  
اللہ انک میت وانہم میتون۔ وما محمد الا کرتا ہے اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ بے شک زندہ ہے  
رسول قد خلت من قلبه الرسل افان مات او جسے کبھی موت نہیں آئے گی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ  
”محمد (ﷺ) نہیں ہیں مگر اللہ کے ایک رسول ہیں۔ ان  
قتل انقلبتم الخ۔ (۱۹)

سے پہلے بھی بہت سے۔ رسول گذر چکے ہیں پس اگر ان کو  
موت آجائے یا وہ قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں  
کے بل، پیچھے کو لوٹ جاؤ گے؟ (اسلام نرگھر دو گے؟) اور  
جو شخص ایسا کرے گا تو وہ اللہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا اور  
اللہ شکر کرنے والوں کو عنقریب جزا دے گا!

یہ تقریر سن کر حاضرین پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے لیکن ساتھ ہی انہیں ایسا معلوم ہوا کہ یہ آخری آیت گویا  
انہیں معلوم ہی نہ تھی۔ اب حضرت صدیق اکبرؓ نے اس کی تلاوت کی تو ان کی آنکھوں سے پردہ اٹھ گیا اور یہ آیت اس قدر  
مؤثر ثابت ہوئی کہ ہر شخص اس کی تلاوت کر رہا تھا۔

خلاصہ کلام اس کے سرکارِ دو عالم ﷺ اور حضراتِ شیخینؓ نے زبانی تعلیم اور اپنے طرزِ عمل سے بنیادی حقیقت  
مسلمانوں کے دلوں میں جا گزریں کر دی تھی کہ فرقہ بندی اسلام کی ضد ہے اور مسلمانوں کی حیات اجتماعی کے حق میں سم  
قاتل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ نبوی ﷺ اور عہدِ خلافتِ شیخینؓ میں کوئی فرقہ موجود نہ تھا اور اس وحدتِ فکر و عمل ہی کا یہ ثمرہ  
تھا کہ مسلمانوں نے خلافتِ شیخینؓ اور حضرت عثمانؓ کی خلافت کے ابتدائی دور میں عدیم المثال کامیابی حاصل کی جس کی  
تفصیل تاریخ اسلام کے صفحات سے واضح ہو سکتی ہے یہ کامیابی اس قدر حیرت انگیز ہے کہ آج تک بہت سے غیر مسلم  
مورخین کے لئے ایک عقدہ لایخیل بنی ہوئی ہے۔ اقبالؒ نے اسی عقدے کو اس شعر میں حل کیا ہے۔

وحدت افکار و کردار آفریں      تا شوی اندر جہاں صاحب نگیں۔

۴۔ الوہیت:

حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری دور میں یمن کے ایک یہودی عبد اللہ ابن سباء نے منافقانہ طور پر اسلام

قبول کیا۔

چونکہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ عبداللہ ابن سبا کوئی تاریخی شخصیت نہیں ہے اس لئے اس کی فتنہ پردازی کی داستان قلمبند کرنے سے پہلے چند تاریخی شواہد پیش کرنا ضروری ہیں تاکہ اس کی شخصیت متحقق ہو جائے۔

۱۔ مہدی تو حیدی پوری (پیر مذہب شیعہ) نجات الانس (جامی) کے مقدمے میں پر لکھتا ہے۔ (۲۰)

”اولیں کسیکہ نسبت الوہیت بحضرت امیرداد، پہلا شخص جس نے حضرت امیر کو

عبداللہ ابن سبا بود کہ در زمان آنحضرت الوہیت سے نسبت دی عبداللہ ابن

زندگی میگرد۔“ سبا تھا جس نے آنحضرت کے زمانے

میں زندگی بسر کی۔“

۲۔ ڈاکٹر کلین (KLEIN) ”الابانہ عن اصول الدیانہ“ کے انگریزی ترجمے کے مقدمے میں (ص ۸۱۷) پر لکھتا

ہے۔ ”عبداللہ ابن سبا یہودی نو مسلم نے جب حضرت علیؑ سے ملاقات کی تو ان سے یہ کہہ کر مخاطب ہوا ”انت انت“

اس جملے سے اس کا مطلب یہ تھا کہ تو خدا ہے، یہ سن کر حضرت علیؑ نے اسے جلاوطن کر دیا کیونکہ ان کی رائے میں یہ جملہ

کفر صریح تھا۔ (۲۱)

## ۵۔ رجعت کا عقیدہ:

سرولیم مور Muir اپنے کتاب ”الخلافۃ“ میں لکھتے ہیں۔

عبداللہ ابن سبا جسے عام طور سے ابن سوداء کہتے تھے، بصری میں آکر اسلام قبول کیا لیکن بہت جلد یہ حقیقت

آشکار ہو گئی کہ وہ دراصل حکومت وقت کے خلاف شدید باغیانہ خیالات رکھتا تھا۔ چنانچہ انہیں باغیانہ خیالات کی وجہ سے

اسے بصرہ، کوفہ اور دمشق سے پے در پے جلاوطن کیا گیا۔ انجام کار مصر میں اسے گوشہ عافیت میسر آ گیا اور یہاں بیٹھ کر

اس نے عجیب و غریب بلکہ ہوشربا اور سراسر اسلام کے خلاف عقائد کی اشاعت شروع کی مثلاً

(۱) حضرت عیسیٰؑ کی طرح آنحضرت ﷺ بھی دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے

(ب) فی الحال حضرت علیؑ آنحضرت کے وصی، وارث یا جانشین ہیں۔

(ج) حضرت عثمانؓ (نعوذ باللہ منہ) غاصب ہیں۔

مصر میں ان عقائد کو بہت جلد قبولیت حاصل ہو گئی۔

اس نے مسلمانوں سے کہا کہ یہ بات صداقت سے کس قدر بعید ہے کہ ایک مسلمان اس بات پر تو ایمان رکھتا

ہے کہ مسیح دوبارہ دنیا میں آئیں گے لیکن آنحضرت (ﷺ) کی رجعت کا انکار کرتا ہے۔ حالانکہ خدا نے قرآن مجید میں اعلان فرمایا ہے کہ وہ دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے۔ علاوہ ازیں ایک ہزار انبیاء ایسے گذرے ہیں جن میں ہر نبی ایک وصی تھا۔ لہذا حضرت علیؑ آنحضرت ﷺ کے وصی ہیں۔ جس طرح آنحضرت ﷺ خاتم الانبیاء ہیں اسی طرح حضرت علیؑ خاتم الاوصیاء ہیں۔ (۲۲)

ہالشر اپنی تصنیف ”شیعان ہند“ میں (ص ۱۵) پر لکھتا ہے۔

۶۔ حلول یا اوتار کا عقیدہ:

قرآن نے شخصیت پرستی کا خاتمہ کر دیا کسی انسان کی پریش کی بنیاد یہ عقیدہ ہے کہ اس انسان میں الوہیت کا رنگ پایا جاتا ہے اسی عقیدہ نے رفتہ رفتہ حلول یا اوتار کے عقیدہ کی شکل اختیار کی۔ مہدی کے عہد حکومت میں المقتع نے خروج کیا۔ ابن خلقان نے اپنی مشہور تالیف ”وفیات الاعیان“ میں لکھا ہے کہ المقتع کا اصلی نام عطاء تھا اس نے جادو اور طلسمات میں مہارت حاصل کی اور خدائی کا دعویٰ کر دیا۔ اس نے اپنے پیروؤں سے کہا کہ سب سے پہلے خدا نے آدم میں حلول کیا (یہی وجہ ہے کہ فرشتوں نے اسے سجدہ کیا)۔ الغرض خدا اسی طرح تمام انبیاء میں حلول کرتا کرتا ابو مسلم خراسانی کے جسم میں داخل ہوا اور اس کی وفات کے بعد اب خدا نے میرے اندر حلول کیا ہے۔ ایسا عقیدہ رکھنے والا اسلام کی نظر میں مشرک ہے۔

۷۔ سبائے:

پروفیسر عباس اقبال، معلم دارالمعلمین عالی طہران، اپنی تالیف ”خاندانِ نوبختی“ میں لکھتا ہے۔ کہ اولیں فرقہ غلاۃ، طرفدارانہ عبداللہ بن سباء پیش از ہر کس باظہار طعن ابو بکر و عمر و عثمان پر داختم و معتقد بحیات جاوید و رجعت حضرت علی و الوہیت او بودہ اند۔ امیر المؤمنین علی عبداللہ بن سباء را بقتل رساند، فرقہ نصیریہ از باز ماندگان سبائے بودہ اند۔

لفظی ترجمہ یہ ہے کہ: سبائے غالی فرقوں میں سے سب سے پہلا فرقہ ہے، یہ لوگ عبداللہ بن سباء کے طرفدار تھے جنہوں نے سب سے پہلے (حضرات) ابو بکر و عمر و عثمان پر طعن کا اظہار کیا اور یہ لوگ حضرت علی کی حیات جاوید اور رجعت (دوبارہ دنیا میں واپسی) اور الوہیت کے معتقد تھے۔ امیر المؤمنین علیؑ نے عبداللہ بن سباء کو قتل کر دیا۔ فرقہ نصیریہ کے افراد، اسی فرقہ سبائے کے باقی ماندہ افراد میں سے تھے۔ (۲۳)

عبداللہ بن سباء پہلا شخص ہے جو امامت علیؑ کی فرضیت کا قائل ہوا اور غلاۃ کے مختلف فرقے اسی منحزل شخص کی تعلیمات سے پیدا ہوئے۔ اس کی رائے میں۔



(۱) حضرت علیؓ مقتول نہیں ہوئے۔

(۲) اور ان میں الوہیت کے اجزاء میں سے ایک جزء موجود تھا۔ رعد ان کی آواز ہے اور برق ان کا تازیانہ ہے۔  
ان شواہد کا مطالعہ کرنے کے بعد کسی شخص کو اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کوئی تاثر نہ ہوگا کہ عبداللہ ابن سباء تاریخ اسلام میں پہلا شخص ہے جس نے مسلمانوں میں فتنہ و فساد کا بیج بویا۔

## ۸۔ ملاحدہ، قرامطہ:

حضرت جعفرؓ کے قلعین میں سے دو گروہ پیدا ہو گئے۔

۱۔ جس نے ان کے چھوٹے بیٹے حضرت موسیٰ کاظم کو ان کا جانشین تسلیم کیا وہ آگے چل کر امامیہ اثنا عشریہ کے نام سے مشہور ہوئے۔

۲۔ جنہوں نے ان کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل کو ان کا جانشین تسلیم کیا وہ آگے چل کر اسمعیلیہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ ہمیں اس وقت اسی دوسرے گروہ کی مختصر داستان لکھنی مقصود ہے۔

یہ فرقہ اگرچہ شیعیت ہی کی ایک شاخ ہے مگر جن لوگوں نے اس فرقے کی رہنمائی کی انہوں نے اسے ایک تخریبی تحریک بنا دیا۔

تاریخ اسلام میں اس تحریک کو ملاحدہ، باطنیہ، تعلیمیہ اور قرامطہ کے رسوائے عالم کے لقب سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ یہی فرقہ دنیائے اسلام میں غیر اسلامی تصوف کا بانی ہے۔

اسی فرقے نے شروع سے عبداللہ ابن سباء کے غالی عقائد (عقیدہ الوہیت علی ورجعت و تناخ ارواح و حلول) ہی اختیار کر لیے تھے۔ پروفیسر براؤن لکھتا ہے۔ 'جو عقائد غلاۃ شیعہ میں مشترک ہیں وہ حسب ذیل چار عقائد ہیں: (۲۳)

۱۔ تشبیہ (خدا کا انسانی شکل میں ظہور)

۲۔ مشیت ایزدی میں تبدیلی (بداء)

۳۔ امام کی واپسی (رجعت)

۴۔ تناخ (ایک امام کی روح کا دوسرے یعنی جانشین کی شخصیت میں حلول کرنا) (۲۴)

## ۹۔ باطنی فرقہ:



حمدان بن اشعث تھا یہ دراصل ایک عراقی کاشتکار تھا چونکہ اس کی ٹانگیں بہت چھوٹی تھیں اس لیے اسے قرمط کہتے تھے۔ اس نے اسمعیلی مذہب کو باطنی تحریک میں تبدیل کر دیا کیا۔ اور اسی لیے اسمعیلی باطنی فرقہ اس کے نام سے موسوم ہو گیا۔

## ۱۰۔ اباحت مطلقہ:

مقریزی اور نویری لکھتے ہیں کہ تحریک ملاحدہ میں آخری درجے تک پہنچنے کے بعد طالب کے لیے اباحت مطلقہ کا دروازہ کھل جاتا تھا اور عقائد کے لحاظ سے وہ شخص فلسفہ مشائیں کا پیرو بن جاتا تھا۔ وہ مذہب اسلام سے بیگانہ ہو جاتا تھا اور فلسفی بن جاتا تھا۔ بلکہ اس کا مذہب مختلف عقائد و افکار کا مجموعہ بن جاتا تھا۔

## ۱۱۔ مشیت ایزدی میں تبدیلی:

ملاحدہ کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت علیؑ خدا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر کلین Klein نے لکھا ہے۔ کہ عبداللہ بن سباء جب حضرت علیؑ سے ملاقات کی تو ان سے یہ کہہ کر گھٹنے مبارک بوسا۔ انت، انت، اس جملے سے اس کا مطلب یہ تھا کہ تو خدا ہے یہ سن کر حضرت علیؑ نے اس کو کجلا وطن کر دیا۔ مگر وہ بد بخت خود بھی اور اس کے پیروں کا بھی ایسی عقیدے پڑے رہے۔ رعد کی آواز کو حضرت علیؑ کی آواز کہتے تھے۔

## ۱۲۔ تشبہ: (خدا کا انسانی شکل میں ظہور)

ملاحدہ فرقہ کے ایک شخص المقتع نے خدائی کا دعویٰ کیا اس نے اپنے پیروں کا روں سے کہہ کہ سب سے پہلے خدا نے آدم میں حلول کیا یہی وجہ ہے کہ فرشتوں نے اسے سجدہ کیا۔ الغرض خدا اسی طرح تمام انبیاء میں حلول کرتا کرتا ابو مسلم خراسانی کی جسم میں داخل ہوا اس کی وفات کے بعد اب خدا نے میرے اندر حلول کیا ہے۔ (۲۵)

## ۱۳۔ تناسخ ارواح کا عقیدہ:

یہ بھی تحریک ملاحدہ کے بانی المقتع اور قرامطہ کے بانی حمدان کا عقیدہ تھا کہ حضور ﷺ کی روح امام مہدی میں آئے گی۔ اور ہرنبی کی روح اس کے خلفاء میں بدلتی رہی ہے۔ بلکہ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ حضور ﷺ کی روح ہم میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اور یہ عقیدہ باطل ہے۔

## ۱۴۔ قرامطہ کی تبلیغی مساعی:

جس زمانے میں قرامطہ نے اپنی تبلیغی سرگرمیاں شروع کیں مسلمانوں میں تصوف کا آغاز ہو چکا تھا اور مختلف سلسلے قائم ہو چکے تھے۔ قرامطہ نے صوفیوں کے حلقوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو صوفی ظاہر کیا۔ یعنی تصوف کے لباس میں صوفیوں کو گمراہ کرنا شروع کیا اور اسلامی تصوف میں غیر اسلامی عقائد کی آمیزش کر کے ایران میں اس غیر اسلامی تصوف کی بنیاد رکھ دی۔ جو رفتہ رفتہ تمام مسلمانوں میں شائع ہو گیا اور اسلامی تصوف کے ساتھ اس طرح مخلوط ہو گیا کہ اسلامی اور غیر اسلامی تصوف میں امتیاز کرنا عوام کے لیے ناممکن ہو گیا کیونکہ جاہل عوام ہر زمانے میں اور ہر ملک میں دین اسلام کی حقیقت سے بیگانہ رہے ہیں۔ عبداللہ ابن میمون القداح نے اسمعیلی فرقہ کی اصلاح کی اور ان کو منظم کیا تو اس جماعت کے پوشیدہ طریق پر تبلیغ کرنے والوں کو یہ نصیحت کی کہ جب وہ مسلمانوں سے ملیں تو اپنے آپ کو صوفی ظاہر کریں تاکہ کسی کو ان پر شبہ کرنے کو موقع نہ مل سکے۔ ۱۵۔ بیکتاشی فرقہ:

”اس سلسلے کا بانی حاجی بیکتاش دلی تھا جو ۱۲۸۱ء، ۶۸۰ھ میں خراسان (اسمعیلی دعاۃ کے مراکز) سے اناطولیا میں آیا تھا۔

اس نے ۱۳۳۲ء، ۶۳۸ھ میں وفات پائی ترکوں میں اس کے سلسلے کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اس سلسلے کے عقائد حسب ذیل ہیں:

- (۱) اللہ حقیقت کا واحد ہے۔
- (۲) محمد ﷺ اور علیؑ دونوں اللہ کے مظاہر خاص ہیں۔
- (۳) اللہ، محمد ﷺ اور علیؑ تینوں میں عینیت کا علاقہ ہے۔
- (۴) محمد ﷺ اور علیؑ درحقیقت ایک ہیں یا ایک شخص کے دو نام ہیں۔

ان چار عقیدوں سے اس بات کا ہندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ اس سلسلے کے صوفیوں کو اسلام سے کتنا تعلق تھا۔ (۲۶)

## ۱۶۔ نور بخشی سلسلہ:

نور بخشیہ فرقے کا بانی سید محمد بن عبداللہ تھا جو ۹۵ھ، ۱۳۹۳ء میں قاسم (کوہستان) میں پیدا ہوا تھا۔ جوانی میں خواجہ اسحاق نطنازی کے ہاتھ پر بیعت کی خواجہ صاحب امیر کبیر سید علی ہمدانی کے خلیفہ تھے خواجہ اسحاق نے سید محمد کو، نور

بخش کا لقب عطا کیا۔ نور بخش نے دعویٰ کیا کہ مجھے امام جعفر صادقؑ سے روحانی فیض حاصل ہوا ہے۔ اس کی تعلیمات میں شیعہ عقائد کا رنگ نمایاں ہے اس سلسلے کے افراد خلفائے ثلاثہؑ کی شان میں گستاخی کرتے تھے۔ لیکن نور بخش نے امام مہدی المنتظرؑ ہونے کا دعویٰ بھی کیا تھا۔ اس لیے شیعہ بھی اسے ناپسند کرتے تھے۔

کشمیر میں اس سلسلے کو شمس الدین نے شائع کیا یہ شخص اپنے وطن شولغان (ایران) سے چل کر پہلے ملتان آیا پھر ۱۵۰۲ء میں کشمیر پہنچا۔ کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد بلتستان میں نور بخشی عقائد کی تبلیغ کی پھر کشمیر واپس آیا اور کشمیر کے چک حکمران خاندان مسلک کو شیعہ مسلک کا پیرو بنایا۔

ان تصریحات سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ قرامطہ نے تصوف کے لباس میں اپنے مسلک کی تبلیغ کی اور تصوف میں ایسے عقائد داخل کر دیئے جو قرآنی تعلیمات کے خلاف ہیں۔

## ۱۶۔ تدسیس، الحاقی عبارات:

ایک طرف قرامطہ نے صوفیوں کے لباس میں مسلمانوں کو غیر اسلامی تصوف سے مانوس کر دیا۔ دوسری طرف مسلمان صوفیوں کی تصانیف میں نہایت چابکدستی کے ساتھ اپنے عقائد داخل کر دیئے۔ عربی میں اس کو تدسیس کہتے ہیں

باطنیہ، ملاحدہ اور زنا و قہ نے سب سے پہلے امام احمد بن حنبلؒ، پھر امام غزالیؒ کی تصانیف میں اپنی طرف سے تدسیس کی۔ اس فرقے نے بہت سی روایات وضع کر کے مسلمانوں میں شائع کر دیں۔ مثلاً جب جنگ احد میں آنحضرت ﷺ زخمی ہو گئے اور جسم سے خون بہنے لگا تو جبریل نے آکر آپ سے کہا کہ ”ناو علیاً“ والی دعا پڑھی یعنی علیؑ کو پکارو۔ جب آپ نے یہ دعا پڑھی تو علیؑ فوراً آپ ﷺ کی مدد کے لیے آئے اور کفار کو قتل کر کے آپ کو اور تمام مسلمانوں کو قتل ہونے سے بچالیا۔ ارباب علم جانتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے جنگ احد میں اس قسم کی کوئی دعا نہیں پڑھی۔ (۲۷)۔

قرامطہ نے فصوص الحکم، فتوحات مکیہ، مثنوی مولانا روم احیاء العلوم اور دوسری مشہور کتابوں میں اپنی طرف سے عبارتیں اور اشعار داخل کر دیئے بلکہ بہت سی کتابیں خود لکھ کر بعض بزرگوں کے نام منسوب کر دیں۔ مثلاً ایک دیوان حضرت علیؑ سے منسوب کر دیا۔ بہت سی رباعیات مختلف صوفیوں سے منسوب کر دیں۔ مثلاً یہ مشہور رباعی حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ سے منسوب کر دی۔

شاہ است حسینؒ بادشاہ ہست حسینؒ دین است حسینؒ دیں پناہ ہست حسینؒ

حقا کہ بنائے لالہ ہست حسینؑ

سردار دنداد دست در دست یزید

قراٹھ نے بہت سی غزلیں مولانا روم کے دیوان میں شامل کر دیں جس کا نام دیوان شمس تبریز ہے

## ۱۔ قلندری و ملامتی درویش:

قراٹھ نے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لئے جہاں اور ہتھکنڈے استعمال کیے وہاں یہ حربہ بھی استعمال کیا کہ اپنی مجلسوں میں مسلسل اس گمراہ کن عقیدے کی تبلیغ کی کہ ”شریعت اور طریقت دو جدا گانہ چیزیں ہیں اور جب ایک شخص طریقت کے دائرے میں قدم رکھتا ہے تو اس کے لیے شریعت کی پابندی لازمی نہیں رہتی۔ جی چاہے پابندی کرے جی چاہے نہ کرے۔

اس تعلیم کا نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ مسلمانوں میں قلندری اور ملامتی درویشوں کی جماعتیں پیدا ہو گئیں ان دونوں جماعتوں کے افراد، پابندی شریعت سے آزاد رہتے تھے بلکہ اس آزادی میں فخر محسوس کرتے تھے اور تحقیر شریعت کو اپنے لیے طغرائے امتیاز بناتے تھے۔

قلندروں کی جماعت نے سیاحت اور صحرا نوردی کو اپنا شعار بنالیا، کیونکہ اس طرح سیر و تفریح کے مواقع بھی بآسانی میسر آ سکتے تھے اور جدوجہد کے بغیر زندگی بسر ہو سکتی تھی۔

رہے ملامتی فرقے کے لوگ تو انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کو سب سے زیادہ ضعف پہنچایا کیونکہ دین کی بنیاد ہی منہدم کر دی انہوں نے ہر اس فعل کا ارتکاب کیا، جس کی شریعت نے ممانعت فرمائی ہے قراٹھ نے ان کو یہ نکتہ عجیبہ جسے ابلیسی ذہانت کا شاہکار کہنا زیادہ مناسب ہوگا، سمجھایا کہ

۱۔ تصوف کا مقصود ہے نفسِ امارہ کو مغلوب کرنا۔

۲۔ اس کے مغلوب کرنے کا ایک طریقہ اس کی تذلیل بھی ہے۔

۳۔ اس لیے ایسے کام کرو جن کی وجہ سے لوگ تمہیں برا کہیں۔

۴۔ جب لوگ تمہیں برا سمجھیں گے، گالیاں دیں گے، دین اسلام سے خارج کر دیں گے تمہارا سوشل بائیکاٹ

کریں گے، تو یقیناً نفسِ امارہ نفسِ مطمئنہ میں تبدیل ہو جائے گا۔

چونکہ اتباع شریعت نفس پر گراں ہے اس لیے یہ ”ملامتی طریقہ“ بہت جلد مقبول ہو گیا اور آج بھی ہندو پاکستان

کے مختلف شہروں میں آپ کو ایسے لوگ مل سکتے ہیں جو

۱۔ اعلانیہ شریعت اور طریقت میں تفریق کرتے ہیں اور ”پیر“ ہونے کے باوجود نہ نماز پڑھتے ہیں نہ روزہ رکھتے ہیں نہ اتباع شریعت کرتے ہیں اس لیے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ ”جو صوفی شریعت اور طریقت میں فرق کرے وہ صوفی نہیں ہے بلکہ فرقہ باطنیہ سے تعلق رکھتا ہے۔“

### ۱۸۔ فرقہ اسمعیلیہ کا طائفہ حشاشین:

فرقہ اسمعیلیہ میں وہ طائفہ جو حشاشین کے نام سے بدنام ہے اس کے افراد بھی ہمیشہ صوفیوں ہی کے لباس میں ظاہر ہوتے تھے اور جب وہ صوفیہ کے عقائد بیان کرتے تھے تو اپنے عقائد بھی شامل کر دیتے تھے اور اسی طرح عقیدہ شخصی، عقیدہ صوفیہ بن جاتا تھا۔ چنانچہ متاخرین ان کے ایسے اقوال کی تاویل کرتے تھے، مثلاً شیخ عزیر نسفی اس بات کا قائل ہے کہ مرد عارف کی روح اس کی وفات کے بعد کالمین کے بدن میں داخل ہو جاتی ہے۔ ملا ہادی سبزواری اس کے غیر اسلامی عقیدے کا نام ”تناسخ مجازی“ رکھ کر شیخ کی براءت کی کوشش کی ہے حالانکہ یہ عقیدہ صریحاً تناسخ ارواح کا عقیدہ ہے جو کفر ہے۔ (۲۸)

### اکابر اہل سنت کی تصانیف میں تدلیس و تدسیس،

جب اسلام میں مختلف فرقے پیدا ہوئے تو آغاز ہی سے انہیں ایران میں اپنے پیرو کثیر تعداد میں مل گئے دراصل اسلامی فرقوں کی تاسیس کا سہرا ایرانیوں کے سر ہے اس کی دلیل بالکل واضح اور روشن ہے ایرانی باشندے عربوں کے تسلط سے پہلے بارہ سو سال تک دنیا میں بڑے جاہ و جلال کے ساتھ زندگی بسر کرتے چلے آ رہے تھے۔ اس لئے انہیں اپنے ادب پر خلفائے دمشق یا خلفائے بغداد کی حکمرانی کسی طرح پسند یا گوارا نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہر ایرانی ایک اصول اپنی طرف سے وضع کرتا تھا اور ایک گروہ اس کا نام لیتا اور یہ سلسلہ نویں صدی تک جاری رہا۔ (۲۹)

پانچویں صدی تک بیشتر اہل ایران حنفی تھے یا شافعی تھے۔ طبرستان میں زیدیہ فرقہ اکثریت میں تھا۔ سبزواری کے علاقے میں شیعہ جعفریہ کا غلبہ تھا۔ قزوین میں اسمعیلیہ کا زور تھا۔ کرامیہ فرقہ جنوبی خراسان معوف تھا۔ صوفیہ اپنے آپ کو ان فرقوں سے مافوق سمجھتے تھے اور کسی کی مخالفت نہیں کرتے تھے مشہور صوفی عبداللہ انصاری حنفی تھے ان کے علاوہ چھٹی صدی تک تمام صوفیہ حنفی تھے۔

مولف ”مجالس المؤمنین“ نے جو شیعہ تراشی میں مشہور ہے عطار کو شیعہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور دلیل میں وہ

اشعار پیش کئے ہیں جو انہوں نے علی ابن طالب کی منقبت میں لکھے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے ہر "چہار یار" کی مدح کی ہے۔ اور دونوں گروہوں کے تعصب کو رد کیا ہے۔ طہران میں عطار کی بعض مثنویوں میں سے پہلے تین خلفاء کے مناقب اسی لئے حذف کر دیا گیا ہے۔ ایرانی شیعہ دورہء صفویہ سے پہلے، تینوں خلفاء کی شان میں بدزبانی نہیں کرتے تھے۔ عطار نے ہم مثنوی میں چار یار کی مدح کی ہے اگرچہ موجودہ نسخوں میں مدح خلفاء کو حذف کر دیا گیا ہے مگر قلمی نسخوں میں مدح موجود ہے مثلاً اسرار زمانہ میں مرقوم ہے:

سپیر صدق را خورشید انور      امیر المومنین صدیق اکبرؑ  
شریعت را نخستین قرۃ العین      رفیق مصطفیٰ و ثانی اثنین  
قلمی نسخے میں ایک شعریوں ہے

سوار دیں پسر عم پیہر      شجاع شرع و صاحب حوض کوثر  
لیکن طہران کے مطبوعہ نسخے میں اسے اس طرح تبدیل کیا گیا ہے:-  
خصوص آں وارث دین پیہر      چراغ شرع و صاحب حوض کوثر  
مصیبت نامہ عطار کے قلمی نسخے میں یہ اشعار موجود ہیں:

تابنی صدیق را محرم گرفت      صبح صادق جملہ عالم گرفت  
مرده ای کہ رود بروئے خاک      ہست از قول بنی صدیق پاک

مدح صدیقی میں ۱۲۷ اشعار ہیں، مدح فاروقی میں ۱۲۲ اشعار ہیں۔ مدح عثمانی میں ۱۲۷ اشعار ہیں، لیکن اسی مصیبت نامہ کا جو ایڈیشن ۱۳۵۴ء میں طہران سے شائع ہوا ہے۔ اس میں ان کو حذف کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ اس میں شک نہیں ہے کہ عطار سلسلہ کبیرویہ سے متعلق تھے اور شیخ نجم الدین کبریٰ کے معتقد تھے۔ (اہل سنت میں سے تھے نہ کہ شیعہ)

عطار سے ۶۶ کتابیں منسوب ہیں۔ لیکن ان میں سے صرف دس کتابیں ان کی مصنفہ ہیں:-

خسر و نامہ، مختار نامہ، اسرار نامہ، مصیبت نامہ، دیوان، جواہر نامہ، شرح القلب الہی نامہ، پند نامہ، منطق الطیر۔

جو کتابیں ان میں سے منسوب ہیں ان میں سے ایک کتاب کا نام جواہر الذات ہے یہ کتاب ۱۳۵۵ھ میں طہران سے شائع ہوئی تھی لیکن اس کتاب کے مصنف نے اکثر مقامات پر اظہار تشیع کیا ہے اس لئے کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ یہ کتاب جو عطار کی تصنیف ہو۔ اسی طرح حلاج نامہ بھی عطار کی تصنیف نہیں ہے تیسری کتاب جو عطار سے منسوب ہے



اس کا نام ہی فصل ہے۔ "گویندہ اس کتاب ہم شیعہ بودہ" اس کتاب کے اس شعر سے ثابت ہے کہ اس کا مصنف وہی ہے جس نے جواہر الذات لکھی ہے۔ وہ شعر یہ ہے۔

بجوہر ذات گفتم ایں معانی تو می باید کہ ایں معنی بدانی لسان الغیب نہیں ہے کیونکہ اس میں یہ اشعار مندرج ہیں:-

شیعہ پاک است عطار اے پسر      جنس ایں شیعہ بجان خود بخیر

ماز فاروق اے التجار کندہ ایم      پے ز نورین شامبریدہ ایم

پروفیسر نفیسی نے آخر میں یہ فیصلہ صادر کیا ہے۔

در ہر صورت بیچ ترویدے نیست کہ مردے بودہ است جلال۔ در قرن نہم، کہ خود را فرید الدین عطار می خواند و در مشہدی

زیست و چندیں کتب ست و بے مغز مانند اشتر نامہ، بلبل نامہ، جواہر الذات، حلاج نامہ، خیاط نامہ، کنز الاسرار، لسان

الغیب، مظہر العجائب ساختہ کہ بیچ وجہ از فرید الدین عطار نیشاپوری، نیست ۱۰۶۔

جو نسخہ جواہر الذات کا میری نظر سے گزرا ہے اس میں سے صرف دو شعر ذیل میں درج کرتا ہوں جس سے پوری کتاب

کا اندازہ ہو جائے گا اور یہ بات بھی واضح ہو جائیگی کہ یہ شعر حضرت شیخ فرید الدین عطار نیشاپوریؒ اپنے قلم سے ہرگز نہیں

لکھ سکتے تھے:-

۱۔ یعنی حضرت فاروق اعظمؓ      ۲۔ یعنی حضرت عثمان ذوالنورینؓ

محمد را شناس ایں جا خدا تو      و گر نہ او فتیاندر بلا تو علی با مصطفیٰ ہر دو خدا بند

شعروں کے مضمون سے صاف ظاہر ہے کہ ان کا کہنے والا عبداللہ ابن جاکا مخلص پیرو تھا اور طائفہ ضالہء باطنیہ یا قرامطہ

سے تعلق رکھتا تھا۔

میں نے پروفیسر سعید نفیسی کی محققانہ تصنیف سے یہ اقتباسات اس لیے درج کیے ہیں کہ ناظرین پر یہ حقیقت واضح ہو

جائے کہ:

## ۲۰۔ کتب تصوف میں تدلیس و تدسیس تحریف و تدسیس الحاقی عبارات:

قرامطہ نے صوفی بن کر اپنے عقائد باطلہ کو اسلامی تصوف کے ساتھ اس طرح مختلط کر دیا کہ عوام کے لیے

امتیاز بین الحق والباطل ناممکن ہو گیا۔

تصوف کی جس قدر کتابیں نظر سے گذریں۔ اکثر و بیشتر کتابوں میں ایسی روایات موجود پائیں جو نہ عقلاً صحیح

ہیں نہ عقلاً بلکہ ان کی لغویت اظہر من الشمس ہے چنانچہ آئندہ اوراق میں اس کی متعدد مثالیں درج کی جائیں گی اس

موقع پر میں اس حقیقت کے اظہار سے باز نہیں رہ سکتا کہ دشمنان اسلام نے کتب تصوف کے علاوہ مسلمانوں کے مذہبی ادب کے ہر شعبے میں اپنے عقائد شامل کر دیئے ہیں اور اسلام کی تاریخ کو تو خاص طور سے تدسیس و تحریف و تدلیس کا ہدف بنایا ہے۔ اس تمہید کے بعد اب میں تصوف کی مختلف کتابوں سے اپنے دعوے کے ثبوت میں شواہد پیش کرتا ہوں۔

(۱) حدیقتہ الحقیقتہ: مصنفہ حکیم سنائی غزنوی:

"سنائی پہلا شاعر ہے جس نے تصوف کے مضامین کو فارسی میں نظم کیا۔

چونکہ اس نے اپنے عقائد کی تفصیل میں دوستی آل علیؑ میں غلو کے علاوہ آل ابوسفیان کے ساتھ دشمنی کا اظہار بھی کیا تھا اس لیے علماء نے اس کی تکفیر کی اور اس کی کتاب کو کتاب گمراہی قرار دیا۔ اور اس حد تک مخالفت کی کہ بہرام شاہ سلطان غزنوی نے اسے قید کر دیا۔ زمانہ تصنیف (چھٹی صدی ہجری) سے اب تک اس کتاب میں "تحریفات و تصرفات فراداں" ہو چکی ہے۔ (صدلب) مختلف قلمی نسخوں میں اشعار کی تعداد مختلف ہے بعض نسخوں میں پانچ ہزار ابیات ہیں بعض میں چھ ہزار اور بعض میں دس ہزار ہیں۔ (صدلب) اس کتاب کے دو نسخے ایسے نہیں ملتے جن میں موافقت ہو اور یہ اختلاف کبھی اس حد تک نظر آتا ہے کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ (صلط) قلمی نسخہ موسومہ "مناقب امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب واولادہ الحسنؑ والحسینؑ کا اضافہ کیا گیا ہے قلمی نسخہ موسومہ "اور بعض دوسرے نسخوں میں فصل حرب جمل" موجود نہیں ہے۔

مقدمہ نگار مذکور نے حواشی میں صد ہا اختلافات کی نشاندہی کی ہے جنہیں بخوف طوالت نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ ایضاً مقصد کے لیے یہی دو حوالے کافی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی سبائی نے مناقب علیؑ واولادہ اور حرب جمل کا اپنی طرف سے اضافہ کر کے سنائی کی شخصیت اور اس کی کتاب دونوں کو محل شک کے باعث تصبیح اور موجب لومۃ لائم بنادیا۔ یعنی ایک تیر سے تین شکار کیے۔ اس تدسیس و تحریف و حذف و اضافہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ پوری کتاب پا یہ اعتبار سے ساقط ہو گئی۔

۱ تنقید و تبصرہ سے پہلے ناظرین اس بات پر غور کریں کہ اس روایت کا ناقل کون ہے؟ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء۔ وہ کس سے نقل کر رہے ہیں؟ اپنے پیرومرشد شیخ المشائخ حضرت فرید الدین گنج شکر سے اب وہ کون سا چشتی ہو گا جسے ان خرافات کی صحت میں شک ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہی ہے کہ یہ روایت از اول تا آخر کذب و افتراء اور بہتان ہے کیونکہ۔

۱۔ آنحضرت ﷺ کی وفات بلا شک و شبہ اھ میں ہو گئی تھی۔

ب۔ امیر یزیدؓ کی ولادت ۲۶ھ میں ہوئی تھی۔

لہذا ثابت ہوا کہ یہ افسانہ سراسر جھوٹا ہے۔ کسی سبائی نے یہ لغو اور من گھڑت داستان ملفوظات میں شامل کر دی ہے تاکہ مسلمان بالعموم اور چشتی افراد بالخصوص اس شخص کو دوزخی یقین کر لیں جس کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے یہ بشارت دی تھی کہ پہلا لشکر جو قیصر روم کے شہر پر حملہ آور ہوگا مغفور ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ بشارت آپ ﷺ نے وحی الہی کی بنا پر دی تھی۔ اس لیے اسکی صداقت میں کوئی شک نہیں ہے۔ اب سنیے کہ جس لشکر نے سب سے پہلے قیصر کے شہر پر حملہ کیا تھا اس کی قیادت امیر یزیدؓ نے کی تھی اور حضرت حسینؓ کے علاوہ بہت سے صحابہؓ نے اسی لیے باشتیاق تمام اس جہاد میں شرکت کی تھی کہ حضور انور ﷺ نے مجاہدین کے جنتی ہونے کی بشارت دے دی تھی۔ دیگر صحابہؓ کے ساتھ حضرت حسینؓ نے بھی اسی شخص کے اقتدا میں نمازیں پڑھی تھیں جسے مسلمان کہلانے والے دوزخی سمجھتے ہیں۔ کیا خدا کی شان ہے! جسے حضور ﷺ مغفور قرار دیں۔ آپ کے نام لیوا اسے ملعون کہتے نہیں تھکتے۔

خیر یہ تو ایک سخن گسترانہ بات تھی۔ میں نے اپنا دعویٰ ثابت کر دیا کہ جو ملفوظات بزرگان دین سے منسوب ہیں وہ کلیتہً قابل اعتماد نہیں ہیں۔ ان میں سبائیوں نے جھوٹی روایات اپنی طرف سے داخل کر دی ہیں۔ (۳۰)

## جامی پر دست درازی

(۳) سنائی عطار، اور رومی کے بعد صوفیانہ ادب میں جامی کا نام معروف ترین ہے۔ کہ ان کا شمار سلسلہ نقشبندیہ کے مشائخ میں ہوتا ہے تمام تذکرہ نویسوں نے انہیں اہل سنت میں شمار کیا ہے۔ انہوں نے اپنی اکثر تصانیف میں خلفائے اربعہؓ کی مدح کی ہے مثلاً:-

کے ثانی اثنین در کنج غار	کہ چوں مار شد ناوک جاں شکار
دوم آنکہ از سکہ عدل اوست	کزیں گوند دنیا و دین سرخ روست
سوم شرم گیتی کہ شد بے قصور	ز شمع نبوت نصیبش دونور
چہارم کہ آں ابر دریا نثار	غم او کرم برقی او ذوالفقار

مثنوی خردنامہ اسکندری

لیکن ان تصریحات کے باوجود بعض لوگوں نے ان کو مائل بہ تشیع قرار دیا ہے اور بعضوں نے ان کو اہل تقیہ میں شمار کیا ہے چنانچہ محمد حسین الحسینی خاتون آبادی لکھتا ہے:-

ان تمام دلائل کے باوجود ان کے ناصبی ہونے پر شاہد ہیں ہم ان کو اہل تقیہ میں شمار کر سکتے ہیں یعنی وہ دل میں شیعہ تھے مگر زبان اور قلم سے اپنے آپ کو سُنی ظاہر کرتے تھے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ جامی شروع میں سُنی تھے مگر آخر میں شیعہ ہو گئے تھے۔ مقدمہ نگار (ہاشم) لکھتا ہے کہ "یہ بات بھی غلط ہے کیونکہ خروناہ اسکندری" آخر عمر میں لکھی تھی مگر اس میں بھی انہوں نے خلفائے اربعہ کی مدح کی ہے "یہی مقدمہ نگار ۱۹۸ پر پھر لکھتا ہے کہ "چونکہ جامی نے حضرت علیؑ کی مدح میں قصائد لکھے ہیں اور بعض غزلوں میں بھی ان کی توصیف کی ہے اس لیے بعض لوگوں نے انہیں روش امامیہ اور تشیع سے منسوب کر دیا ہے۔"

خلاصہ کلام اس کے جامی کے بارے میں حسب ذیل خیالات ظاہر کئے گئے ہیں۔

(۱) بعض انہیں سُنی کہتے ہیں اور سُنی بھی نقشبندی۔

(۲) بعض نے انہیں مائل بہ تشیع لکھا ہے۔

(۳) بعض کا خیال ہے کہ وہ ساری عمر تقیہ فرماتے رہے۔

(۴) بعض کا فیصلہ یہ ہے کہ شروع میں سُنی تھے لیکن قبل وفات شیعہ ہو گئے تھے۔

میرا مقصد اس بحث سے یہ واضح کرنا ہے کہ سبائیہ باطنیہ اور دشمنان صحابہؓ نے مشہور صوفیوں کے عقائد میں دیدہ و دانستہ ایسے شبہات پیدا کر دیئے ہیں جن سے ان کے عقیدت مندوں کے قلوب میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ وہ یا تو تقیہ کرتے تھے یا مائل بہ تشیع تھے اور اس طرح انہیں انکے (اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ قدرتی طور پر ان کا میلان بھی تشیع کی طرف ہو جائے گا) آبائی مذہب سے برگشتہ کرنا آسان ہو جائیگا۔

## ۲۱۔ سبائیہ اور قرامطہ نے بعض صوفیوں کو اپنی جماعت کا فرد ظاہر کیا

سبائیہ اور قرامطہ نے صوفیوں کی تصانیف میں تدسیس کے علاوہ، اپنی تصانیف نظم و نثر میں ان میں سے بعض کو اپنی جماعت کا فرد ظاہر کر کے، اہل سنت کی نگاہوں میں ان کی دینی حیثیت کو مشکوک اور محل نظر بنا دیا۔ بخوف طوالت صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔

خواجہ عبداللہ نصاریٰ ہروی جو منازل السائرین کے مؤلف ہیں۔ پانچویں صدی کے مشاہیر صوفیوں میں سے ہیں۔ لیکن ایک اسماعیلی شاعر نے اپنے دیوان میں ان کی مدح کی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ادارہ نشریات اسماعیلیہ بمبئی نے غالباً ۱۹۳۵ء میں خاکی خراسانی اسماعیلی کا دیوان شائع کیا تھا جسے پروفیسر آئی ویناف (IVANOW) نے مرتب کیا ہے۔ پروفیسر مذکور اپنے مقدمے میں لکھتا ہے۔

اگرچہ اسمعیلی دعا کو بہت ستایا گیا مگر ان کی دعوت کا تصوف پر بہت اثر مرتب ہوا اور تصوف عرصہ دراز تک ان کے خیالات سے فیض یاب ہوتا رہا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسمعیلی دعا نے اپنے خیالات کی اشاعت کیلئے تصوف کو آلہ کار بنایا یعنی صوفیوں کے لباس میں اپنے عقائد کی اشاعت کی۔

## باطنیت

گمراہی کے دروازوں میں سے سب سے زیادہ خطرناک اور مضرت رساں دروازہ جو باطنیہ نے کھولا وہ یہ تھا کہ ہر لفظ کے ایک ظاہری معنی ہوتے ہیں اور ایک حقیقی یا باطنی۔ انہوں نے الفاظ کے اس باطنی پہلو پر اس قدر زور دیا کہ ان کا اصلی نام اسمعیلیہ غیر معروف ہو گیا اور وہ باطنیہ کے نام سے مشہور ہو گئے۔ بہر کیف انہوں نے کہا کہ اسی طرح قرآن وحدیث کے الفاظ کے بھی دودو معنی ہیں ایک ظاہری دوسرے باطنی اور ان کو آپس میں وہی نسبت ہے جو پوست (ظاہر) کو مغز سے ہے۔ جبلاء صرف ظواہر (ظاہری معنی) سے آگاہ ہیں۔ حقائق یا باطنی معانی کو صرف اہل اسرار جانتے ہیں جو شخص ظواہر میں گرفتار ہے وہ شریعت کی پابندیوں میں جکڑا ہوا ہے اور دین کی نہایت نیچی سطح پر ہے جو شخص اہل باطن کی صحبت میں رہ کر حقائق سے آشنا ہو جاتا ہے وہ شریعت کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کی اس آیت کا یہی مفہوم ہے وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ یعنی رسول اللہ ﷺ اس بوجھ سے نجات دلاتا ہے۔ جس کے تلے وہ (عوام) دبے ہوئے تھے اور وہ طوق اتارتا ہے جو ان کی گردنوں میں پڑے ہوئے تھے۔

باطنیہ نے اپنی اس بنیادی تعلیم کو عوام کے سامنے صوفی بن کر پیش کیا۔ رفتہ رفتہ جاہل صوفیوں نے پہلے ظاہر اور باطن کی تفریق کا اصول اختیار کیا پھر اس کے منطقی نتیجے کو بھی قبول کر لیا۔ یعنی انہوں نے شریعت اور طریقت میں تفریق کر دی اور کہنے لگے کہ شریعت کا حکم کچھ اور ہے اور طریقت کا حکم کچھ اور ہے۔ آخر کار انہوں نے باطنیہ کی اس تعلیم کو بھی تسلیم کر لیا کہ جب سالک کو معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ قید شریعت سے آزاد ہو جاتا ہے اور پانے اس باطل عقیدے پر اس آیت سے استدلال کیا۔ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ۔ اور اس کا ترجمہ اس طرح کیا، صرف اس وقت تک اپنے رب کی عبادت کر جب تک تجھے یقین حاصل نہ ہو۔ جب معرفت یا یقین حاصل ہو جائے تو اتباع شریعت کی حاجت نہیں ہے۔

## ۲۲۔ باطنیت کے اثرات تصوف پر:

باطنیت کی اسی تدبیس کی بدولت صحیح اسلامی (قرآنی) تصوف کی ساتویں صدی ہجری میں ایسی قلب ماہیت ہو چکی تھی۔ کہ تصوف اور تشیع مترادف الفاظ بن گئے تھے۔ چنانچہ حیدر علی آملی صاحب تفسیر بحر الابحار نے لکھا ہے ”تصوف طریقہ مرتضوی است و تصوف و تشیع یک معنی دارد“ (۳۱)

ڈاکٹر احسان اللہ لکھتے ہیں کہ ”ولایت از آن خدا است و بر آن اس شہادت هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلَّهِ الْحَقِّ ط (۵۷-۴۴) (۱) از خدا مُصطفیٰ ﷺ و در اس حقیقت جامعیت است، علی وفاطمة تا حضرت قائم ثانی عشر، یک پایہ اور ارائے یک پایہ اند، چنانچہ رسول ﷺ فرمود (۱) اول ما خلق الله نوری (ب) انا و علی من نور واحد (شاعرے اس حدیث را چنین نظم کرده است) اصول تصوف مؤلفہ ڈاکٹر احسان اللہ اتخزی ص ۲۹)

علی و مصطفیٰ ہجود و دیدہ! ز یک نور جلیل اند آفریدہ

ہر مومن متقی اللہ کا ولی (دوست) ہے اور اللہ اس کا ولی (دوست) ہے۔ باز آدم بر سر مطلب آیت زیر بحث سے پہلے اللہ نے دو آدمیوں کی مثال بفرض تذکیر

بیان کی ہے جن میں سے ایک کو اللہ نے باغ اور دولت دی جس پر اس نے تکبر کیا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے اسے ان نعمتوں سے محروم کر دیا اس نے کہا يَا لَيْتَنِي لَمْ أُشْرِكْ بِرَبِّي أَحَدًا پھر آگے آیت میں اللہ فرماتا ہے کہ کوئی جماعت اسے مدد نہ دے سکی اور نہ وہ خود بدلہ لے سکا۔ اس کے بعد یہ آیت ہے کہ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلَّهِ الْحَقِّ یعنی حقیقت یہ ہے کہ حکمرانی، کارسازی اور نصرت یہ ساری باتیں صرف اللہ کے لیے ثابت ہیں جو الحق یعنی سچا اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ اب قارئین خود ہی فیصلہ کر لیں کہ اس آیت کو سبائیوں کی موہومہ ولایت سے کیا تعلق ہے لیکن اس فرقے نے باطنی مفہوم متخرج کرنے کے لیے پہلے تاویل کا دروازہ کھولا۔ پھر تاویل کے ذریعے سے پورے قرآن کو بازیچہ اطفال بنا دیا۔ اس کی مثالیں سبائے باطنیہ قرامطہ کے لٹریچر سے بآسانی مل سکتی ہیں۔

چونکہ باطنیہ کے تمام بنیادی عقائد (BASIC DOCTRINES) قرآنی تعلیمات کے خلاف ہیں اس لیے انہوں نے سب سے زیادہ توجہ اس بات پر مبذول کی کہ جس طرح ہو سکے اہل سنت کو قرآن سے بیگانہ بنا دیا جائے تاکہ غیر قرآنی عقائد کو قبول کر سکیں اس مقصد کے لئے انہوں نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ تصوف کا لباس زیب تن کیا اور صوفی بن کر اپنے عقائد و عوام اہل سنت میں شائع کر دیئے۔ دوسرا کام یہ کیا کہ علم الاعداد ایجاد کر کے اسے حضرت علیؑ سے منسوب کر دیا۔ ہر عدد کو خاص تاثیر کا حامل قرار دیا اور تعویذ و طلسم لکھ کر عوام میں تقسیم کرنا شروع کئے۔

عقیدہ باطنیت کا تصوف پر گہرا اثر ہوا ہے۔ باطنی عقیدہ کے علمبردار ہر لفظ کے دو معنی بتاتے تھے کہ ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن، جو باطن ہے وہ حقیقت ہے۔ اس طرح لوگوں نے ان سے بہت اثر لیا۔ انہوں نے تصوف کو ڈھال بنایا اور کہنے لگے کہ اصل مذہب یہی ہے۔ اور پھر اسکی اپنے عقائد کے مطابق جو کفاسد تھے تاویلیں کرنے لگے۔ اس طرح سے اصل تصوف کی صورت بگڑ گئی۔

### ۲۳۔ مغربی افکار کی وہ یلغار جو مستشرقین کے ذریعے عالم اسلام پر ہوئی:

گذشتہ ڈیڑھ صدی کے دوران میں ایک ایسی صورت حال پیدا ہوئی جس نے ان مسائل کو مزید الجھا دیا۔ اس سے مراد مغربی افکار کی وہ یلغار ہے جو مستشرقین کے ذریعے عالم اسلام پر ہوئی۔ مسلم ممالک میں سیاسی زوال کے ساتھ فکری و عملی سوتے بھی خشک ہو گئے۔

اور مسلم قوم تحقیقی میدان میں بھی اہل مغرب کی دست نگر بن گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تصوف کے مسائل سمجھنے کے لئے بھی مستشرقین کی تحریریں سند مانی جانے لگیں۔

۲۴۔ تصوف ہمیشہ ان لوگوں کے مابین مابہ النزاع رہا جو اس کے مالہ و ماعلیہ سے نابلد تھے۔

تصوف کے بارے میں ہر دور میں آراء کا اختلاف رہا ہے اور اسکی حقیقت سمجھنے میں عام آدمی کو دشواریوں کا سامنا رہا ہے اس لئے کہ اس کا تعلق قیل و قال سے نہیں بلکہ اس کا ادراک خالصتاً قلبی واردات اور حال سے ہے۔ اس کو وہی سمجھ سکتا ہے جو اس کے مالہ و ماعلیہ سے واقف ہو اور چونکہ لوگ نہیں جانتے اس کے مالہ و ماعلیہ کو! اس لئے ان کے درمیان وجہ نزاع رہا ہے۔

### ۲۵۔ سریت اور تصوف کے فرق کا واضح نہ ہونا۔

اہل مغرب کے غلبہ کی وجہ سے سریت کا تصوف پر گہرا اثر رہا ہے۔ اسلئے یہ بات بھی اسلامی تصوف کے پھلنے پھولنے میں مانع رہی ہے۔

### ۲۶۔ دور حاضر کے صوفیاء کا غلو

حضرت عثمان غنیؓ کے دور تک ایک ہی عقیدہ تھا۔ آپکی خلافت کے آخری ایام میں ایک یہودی النسل عبداللہ ابن سبائے مدینہ منورہ آ کر اسلام بظاہر قبول کیا جیسا کہ یہودیوں کی عادت تھی۔ اس کے بعد اس شخص کی وجہ سے رافضی عقیدہ معرض وجود میں آیا۔ اس نے الوہیت علی کے عقیدہ کی بنیاد ڈالی۔ چونکہ ولایت کے سلسلے

حضرت علی سے جاری تھے۔ منہج تصوف آپ تھے اس لئے اس قسم کے غلط پیروکاروں کے عقائد کی تصوف میں آمیزش ہو گئی حالانکہ حضرت علیؑ نے ہی اس بد بخت عبداللہ ابن سبا کو مروادیا تھا۔

## ۲۷۔ سجادہ نشین حضرات کا قرآن و سنت اور علم تصوف سے عاری ہونا۔

جہلاء کے مسند تصوف پر بیٹھنے سے قرآن و سنت کے منافی امور داخل ہو گئے۔ جاہل صوفی اپنی آراء کو تصوف کہنے لگے۔ اس طرح سے ان کے پیروکاروں نے جاہل صوفی کی ہر بات جو کہ غیر شرعی ہوتی اس کو حق سمجھنے لگے۔ اس سے تصوف کی ایک الگ بگڑی صورت معرض وجود میں آئی۔ صوفی اگر نماز نہ پڑھتا تو مرید کہتے مدینہ میں پڑھ آیا ہے۔ اس قسم کی خرافات نے حقیقی تصوف میں جنم لیا۔

## ۲۸۔ بے سند اور جھوٹی پیرمیدی کا ہونا۔

ایسے صوفی مسند ارشاد پہ بیٹھ گئے جو اس کے اہل نہ تھے کسی کامل صوفی سے نہ ہی سند مجازی اور نہ تصوف کی الف ب کی تعلیم حاصل کی۔ بس بال بڑھائے۔ کپڑے لمبے اور رنگین پہن لیا۔ ہر قسم کا جادو اور ٹونے ٹونکے کر کے اپنی دکانداری بنالی۔ ایسے جھوٹے صوفیوں اور پیروں نے بھی تصوف کی اصل صورت کو بگاڑ دیا ہے۔ دور اول کے اسلامی تصوف نے علوم فطرت میں تحقیق کی راہ ہموار کی تھی مگر دوسرے دور کا تصوف علوم فطرت میں تحقیق کے لئے سد راہ بن گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں تصوف میں غلو کا پہلو بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ سائنس حقائق واقعی کو غور و فکر کا موضوع بناتی ہے۔ اسکے برعکس غلو آمیز تصوف خواب، مکاشفہ اور پراسرار مظاہر میں گم ہونے کا نام ہے۔

## ۲۹۔ خانقاہی نظام کی جگہ درگاہی نظام کی ترویج:

خانقاہی نظام میں مدرسہ اور سلوک کے ادارے قائم تھے جن میں اسلامی تصوف کو سبقتاً پڑھایا بھی جاتا تھا اور پھر ریاضتیں اور مجاہدے بھی کرائے جاتے تھے۔ اسلئے اسلامی تصوف کی اصل ہیئت نہیں بگڑی مگر جب سے یہ نظام زوال پذیر ہوا اور اسکی جگہ مجاوروں نے لی تو تصوف کی روح باقی نہ رہی بلکہ ان مجاوروں کی اٹلی چالوں کو تصوف کا نام دے دیا گیا۔

خانقاہ سے لوگوں کو کچھ ملتا تھا جبکہ درگاہیں لوگوں کو لٹتی ہیں۔

## ۳۰۔ درگاہوں کو میراث بنالینا:



درگا ہیں موروٹی بنادی گئی ہیں۔ نسل در نسل آرہے ہیں۔ بڑوں کی کمائی کھا رہے ہیں۔

چاہے مرنے والے بزرگوں نے اجازت نہ بھی دی پھر بھی مسند پر بیٹھ کر چند خوشامدیوں کے اپنی من گھڑت کمالات نشر کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ بھی اصل تصوف کو بگاڑنے میں شامل ہیں۔

### ۳۱۔ سجادہ نشین حضرات کا قرآن و سنت اور علم تصوف سے عاری ہونا۔

۱۱۔ آج کل جتنے موروٹی سجادہ نشین حضرات بزرگوں کی مسند پر بیٹھے ہیں۔ علم سے فارغ ہوتے ہیں۔ قرآن و سنت کا ہویا تصوف کا۔ ایسے جاہل لوگوں نے اپنا من گھڑت تصوف بنا رکھا ہوتا ہے۔ جو حقیقی تصوف کی راہ میں آڑ ہے۔

### ۳۲۔ راہبانہ کردار کی تصوف میں آمیزش۔

آج کل اکثر راہبوں اور برہمنوں کے ٹوٹکے اور علاج اسلامی تصوف میں داخل ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ جاہل پیر تعویذ دے گا تو ساتھ ڈھیروں شرطیں لگا دے گا۔ کہ گائے کا گوشت نہیں کھانا ہے۔ سودک والے گھر نہیں جانا۔ پہلے دھاگے سے تعویذ باندھنا ہے۔ وغیرہ وغیرہ جبکہ اصل تصوف میں ان چیزوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

### ۳۳۔ بدعات کا داخل ہونا

جہلاء پیروں کی وجہ سے بے شمار بدعات سیہ تصوف میں گھس آئی ہیں۔ پیر خود بدعت کا مرتکب ہوتا رہتا ہے پھر مرید تو از خود ہوگا بلکہ وہ تو عین اسلام سمجھ کر اپنا تار ہے گا۔

یہ ہیں وہ مشکلات جو تصوف کی راہ میں حائل ہیں اب ان کا پس منظر بیان کیا جاتا ہے۔ تاکہ مزید وضاحت ہو جائے۔ اس سے پیشتر کہ مندرجہ بالا عنوانات کے تحت ان کا پس منظر بیان کیا جائے یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ چوتھی صدی ہجری کے بعد جو غیر اسلامی اور عجمی تصوف عین اسلامی تصوف میں گھس آیا وہ اسلامی تصوف کی ضد تھا۔

ہمارے اکابر صوفیائے کرام نے اس کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور مسلمانوں کو اس کے مفاسد سے آگاہ کر کے بلا خوف و ہمتہ لائیم اپنا فرض منصبی انجام دیا بہر کیف جس طرح بعض مسلمانوں کی گمراہی سے اسلام پر کوئی حرف نہیں آ سکتا اس طرح بعض صوفیوں کی گمراہی سے اسلامی تصوف مورد طعن نہیں بن سکتا۔ غیر اسلامی یا عجمی تصوف کی اشاعت کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں۔ (۳۲)

## تذاریک

۱۔ پہلی تینوں شقوں کا جواب یہ ہے کہ جب تک ہم نے اہل مغرب کی غلامی سے نجات حاصل نہیں کی ان

مشکلات سے جو سریت کی صورت میں ہیں یا مغربی افکار کی وجہ سے ہیں چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔ ہمیں صحیح تصوف پر عمل کرنے کیلئے ان سے نجات حاصل کرنا ہوگی۔

۲۔ باطنیت، رافضیت اور بدعات سے نجات کیلئے ضروری ہے کہ ہم قرآن و سنت پر عمل کریں۔ انشاء اللہ ان بدعقیدگیوں اور بدعات سے نجات پا کر صحیح اسلامی تصوف پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔

۳۔ بے پناہ پیری مریدی، موروثی سجادگی اور درگاہی نظام کا خاتمہ کر کے پھر سے خانقاہی نظام قائم کیا جائے۔ جہاں صحیح معنوں میں صوفی تیار ہوتے تھے۔ ان غلط قسم کے اداروں کو حکومت وقت ختم کرے اور صدیوں کی تربیت کیلئے ادارے قائم کرے جہاں سلوک کی تعلیم کا بندوبست ہو۔ ریاضت، مجاہدے اور مراقبے کرائے جاتے ہوں۔ تب یہ غلط قسم کا نظام ختم ہو سکتا ہے۔

۴۔ ایک صوفی کیلئے قرآن و حدیث کا بہت بڑا عالم ہونا ضروری ہے۔ پھر راہ سلوک کی منازل طے کرنے کیلئے باقاعدہ کسی کامل صوفی کی بارگاہ میں تعلیم تصوف حاصل کرے۔ پھر فارغ ہونے کے بعد کسی شہر میں بیٹھ کر رشد و ہدایت کی تعلیم دے۔ اس طریقے سے صحیح اسلامی تصوف کی ترویج ہو سکتی ہے اور امت مسلمہ دینی و دنیوی لحاظ سے عروج حاصل کر سکتی ہے۔ (۳۳)

تصوف میں چونکہ انسانی فطرت کے بعض اہم تقاضوں کا جواب موجود ہے۔ اس لئے اس کی تاریخ میں نشیب و فراز کے ساتھ اس کا دور دورہ تو اسی طرح رہے گا۔ مگر موجودہ فضا کو روح عصر کی پذیرائی کیلئے علمی سطح پر تصوف کے خلاف ظنون و شکوک سے پاک کرنے کی ضرورت ہے تاکہ تہذیب و تمدن کے تقاضا کے اس مرحلے پر سریت پسندی کے شوق میں پڑھے لکھے لوگ جب تصوف کی طرف رجوع کریں تو وہ تصوف کے نظریہ و عمل کو معقول انداز میں سمجھ سکیں۔

اس مقصد کے پیش نظر تصوف کے خلاف متذکرہ بالا حلقوں کی طرف سے اٹھائے گئے اعتراضات کا اگر جواب لکھنے کی کوشش کی جائے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے بات شروع کی جائے اور کہاں تحریر و تقریر کو اس بارے میں کسی منطقی انجام تک پہنچایا جائے۔ اعتراضات کے طومار کا یہ حال ہے کہ اگر بیک وقت سب کا جواب لکھنے بیٹھیں تو عبادت میں انضباط بھی مشکل سے قائم رہ سکتا ہے۔ اس لئے تصوف پر گفتگو کرتے ہوئے ان اعتراضات سے تو قطع نظر کیا جاسکتا ہے۔ جو کم علمی، غلط فہمی یا بد فہمی کا نتیجہ ہیں مگر کچھ اعتراضات ایسے بنیادی نوعیت کے ہیں جن کا تعلق بنجیدہ علمی تحقیق سے ہے نیز ان کی نوعیت ان اعتراضات سے نسبتاً مختلف ہے جو فقہاء اور ظاہر پرست علماء کی طرف سے صوفیاء پر کئے جاتے رہے اور جن سے قدیم تذکرے بھرے پڑے ہیں۔

## قابل غور مسائل :-

ہر قسم کے اعتراضات زیر بحث لانے کی بجائے فی الحال یہ ضرور کیا جاسکتا ہے کہ تقاضائے وقت کے پیش نظر تصوف کے صرف ان مسائل پر بات کی جائے جو موجودہ فضا میں جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن میں اٹھیں پیدا کر سکتے ہیں۔

پڑھے لکھے لوگوں میں جو تصوف کا سطحی مطالعہ رکھتے ہیں بد عقیدگی کی یہ صورت پیدا ہوئی ہے کہ ان کے ذہن میں سریت (مسترزم) اور تصوف کا فرق واضح نہیں ہو پاتا۔ حالانکہ اس بات کے سمجھنے کیلئے کچھ زیادہ وقت نظر کی ضرورت نہیں۔ جس طرح مختلف مذاہب کے درمیان کچھ عناصر مشترک نظر آتے ہیں اسی طرح سریت اور تصوف میں بھی کچھ خصوصیات ایک جیسی یا ملتی جلتی ہیں بلکہ اس امر کو اگر یوں پیش کیا جائے تو بات زیادہ واضح ہو جائے گی کہ سریت عام ہے اور تصوف کی اصطلاح اسلام کے سری سلوک کے ساتھ مخصوص ہے بلکہ جیسا کہ تفصیلاً آگے ذکر آئے گا۔ تصوف اسلام کا ہی باطنی رخ ہے۔

کچھ لوگ جنہیں نفسیات سے دلچسپی ہے اور تصوف کے متعلق ان کی معلومات سچی سنائی باتوں تک محدود ہیں جب صوفیوں کی بعض مواجید اور ان کے بعض فوق العبادہ کاموں کو جنہیں عوام بغیر کسی تخصیص اور امتیاز کے کرامت کا نام دے دیتے ہیں پڑھتے یا سنتے ہیں تو ان کا خیال فوراً مسٹرزم، ہینا ٹرم اور ٹیلی پیٹھی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ صوفیوں کے تجربات کی صحیح نوعیت کو وہ سمجھ نہیں پاتے کہ خود تصوف کا مطالعہ کرنے کا شوق رکھتے ہیں نہ براہ راست صوفیوں کے حلقے میں کبھی بیٹھنے کا موقع پاتے ہیں اس لئے وہ صوفیوں کی تمام مواجید و کیفیات کو محض ایک قسم کے نفسیاتی تجربے خیال کرتے ہیں۔

سریت اور تصوف کا علمی ماخذ وجدان اور عقل کلی ہے۔ وجدان پر اگرچہ بہت کچھ لکھا جا چکا ہے خاص طور پر جو لوگ اقبال کے افکار کو سنجیدگی سے دوران تعلیم یا اس کے بعد مطالعہ کرتے رہے ہیں ان کیلئے اس کا بیان کچھ نیا نہیں ہے۔ لیکن جیسا کہ محمد حسن عسکری مرحوم نے لکھا ہے اس امر کی عام طور پر وضاحت نہیں کی جاتی ہے کہ مغرب والے وجدان کو جبلت کی یہ ایک ترقی یافتہ صورت کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں جب کہ صوفیاء نے عقل کلی اور بعض اوقات وسیع اور جامع مفہوم کے لئے ”عشق“ کی اصطلاح استعمال کی ہے جو صوفیاء کے روحانی تجربات کا سبب بنتی ہے۔ اگر وجدان کی اصطلاح پر اسرار کیا جائے تو پھر تصریح ضروری ہے کہ وجدان کا ایک مذہبی و روحانی رخ بھی ہے اور جہاں وجدان ایک لادینی ستری فلسفے کا ماخذ بن سکتا ہے اور بنا ہے وہاں اس کو اگر مذہبی و روحانی رخ کے مقابل کیا جائے تو یہ عقل کلی سے جا

ملتا ہے اور اس کے ذریعے الہیت کی معرفت کے دروازے کھلتے ہیں۔ اندر کی آنکھ بیدار اور روشن ہو جاتی ہے اور صوفیوں کے تجربات و مشاہدات قابل فہم نظر آتے ہیں۔

موجودہ دور کے متکلمین کے مباحث میں یہ غلط خیال بہت معروف ہے کہ تصوف کے منابع اسلام سے کہیں باہر ہیں (جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے۔ اس میں گذشتہ دور کے مستشرقین کی تحقیق خام کو بھی دخل ہے) اور بقول ان کے اس کے نظریات اور طریق عمل گمراہی کا دواج اس وقت ہوا ہے جب عجمی لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام کی قبولیت کے باوجود وہ اپنے اپنے مذہب کے سری سلوک کو نہ چھوڑ سکا اور بالآخر ایران اور ہندوستان اور بعد ازاں عالم اسلام میں اس کا رواج عام ہو گیا۔ یہ مسئلہ اگرچہ بالکل نیا نہیں ہے لیکن اب کے صوفی مفکرین کے بعض افکار اور ان کے طرق کے بعض اطوار کو تجزیاتی اور تاریخی رنگ دے کر زیادہ زور سے بظاہر تحقیقی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پہلے اس رنگ میں جس قسم کے اعتراضات تھے وہ متشددین اور منکرین تصوف کو چھوڑ کر دیکھا جائے تو محض فروعات سے متعلق ہوتے تھے۔ مگر اب انہی باتوں کو ذرا بل دے کر ایسے پیش کیا جاتا ہے گویا تصوف میں سب کچھ باہر سے آیا ہے اور اسلامی تاریخ کے دائرہ سے باہر کہیں اس کی تہیں کھلی ہیں۔

تصوف کی بعض اصطلاحات بھی مادیت پرستی کے اس دور میں لوگوں کی سوچ میں کھٹکنے لگی ہیں۔ ترک دنیا، زہد و ریاضت، مخالفت نفس اور فنا و فقر وغیرہ کا مفہوم جو صوفیوں کے نزدیک متعین تھا، نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اور ان کے لغوی مفہوم کو سامنے رکھ کر کبھی انہیں غیر انسانی کہا جاتا ہے۔ اور کبھی انہیں غیر اسلامی سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ سب سے زیادہ صوفیوں کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی اصطلاحات کی وضاحت کریں اور ان کی وضاحت بارہا کی گئی ہے لیکن فنا جیسی قوت بخش روحانی کیفیت کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ یہ ان کی انا کی یا خودی کی موت ہے اور اس کے کردار کی انفرادیت و طاقت ختم ہو جاتی ہے یا جماعت کی سطح پر بے عملی کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی حال دوسری اصطلاحات کا ہے۔ یہ سب کسی زمانے میں مومن کے کردار کی تعمیر اور تکمیل کے بیان میں عام استعمال ہوتی تھیں اور ان سے کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہوتی تھی مگر اب ان کی تادیل محض مسئلے کو الجھانے کیلئے صوفیوں کی تشریحات سے ہٹ کر اپنے طور پر کی جاتی ہے اور اپنے اعتراضات کو تقویت دینے کیلئے بعض منکرین تصوف بار بار انہیں دہراتے نظر آتے ہیں۔ تصوف کی مخالفت کرتے ہوئے یہ غرضہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ اس سے باطن کی طرف رخ مڑ جائے گا۔ اور ظاہری مادی ترقی رک جائے گی لیکن یہ بات فراموش کر دی جاتی ہے کہ تصوف تو ظاہر کی حفاظت کیلئے اور مادی نظام کے توازن کیلئے خاص اہمیت رکھتا ہے ورنہ باطن کو نظر انداز کر کے محض ظاہری ترقی کا نتیجہ تو وہی ہوتا ہے جو مغرب میں ظاہر ہوا ہے، اخلاق فاسد ہوئے اور

زندگی کے ہر شعبے میں کچی یا گراہی کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا ہوگئی۔

اسی کے ساتھ تصوف کے بعض اداروں کے خلاف کد محسوس کی جاتی ہے۔ پرانے ظاہر پسند علماء صوفیوں کی خانقوں اور زادیوں کو شریک کا ذمہ دار ٹھراتے تھے اور موجودہ دور کے متکلمین انہیں بیکار اور مذہبی جذبات کے استحصال کے مراکز خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ خانقاہ یا زاویہ ایسی جگہ ہوتی ہے۔ جہاں مسجد، لنگر خانہ، مدرسہ ذکر الہی کے کیلئے خلوت گاہ، اعلیٰ روحانی تعلیم کیلئے مرشد اور صحبت روحانی کیلئے درویش سب موجود ہوتے ہیں ممکن ہے کہ بعض خانقاہیں یہ سب لوازمات نہ رکھتی ہوں یا پرانی روایت کے مطابق کام نہ کر رہی ہوں مگر اس بناء پر ان کو رد تو نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی اصطلاح ہو سکتی ہے اور ان سے وہی کام لیا جاسکتا ہے جو پہلے کبھی لیا جاتا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا گیا یہ ایک بڑی عجیب سی صورت حال ہے کہ تصوف پر لکھنے یا بولنے کی کوشش کی جائے تو پتہ نہیں چلتا کہ کہاں سے بات شروع کی جائے۔ تصوف کی اصطلاح اور اس کی تعریف سے لے کر اس کے مںہائے مقصود تک اعتراضات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو مختلف الخیال لوگوں یا گروہوں کی طرف سے تصوف کے خلاف تقریر میں ملتا ہے اس لئے تصوف پر عمومی نقطہ نظر سے لکھنے کیلئے بھی بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ اور نہایت سنجیدگی سے سوچنا پڑتا ہے کہ کن کن مسائل کا ذکر کیا جائے۔ بہر صورت متذکرہ بالا سطور میں جدید دور کے پڑھے لکھے لوگوں کے ذہنوں میں جو مسائل تصوف کے بارے میں پیدا ہو رہے ہیں۔ انہیں مختصراً بیان کر دیا گیا ہے ان میں سے بعض کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور پڑھے لکھے ممتین طبقے میں یہ امر تسلیم کیا جا چکا ہے کہ تصوف کے ماخذ قرآن و سنت ہیں۔ اسی کام کو آگے بڑھانے کیلئے آئندہ صفحات یہ بعض اہم مسائل کو کہیں الگ عنوان کے ساتھ اور کہیں ضمناً بیان کی سعی کی گئی ہے تاکہ بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جاسکے یا جدید دور میں تصوف کے بارے میں ذہنوں میں جو اشکال پیدا ہو گئے ہیں ان کو دور کیا جاسکے۔ (۳۴)

## نتائج بحث

الحمد للہ! مقالہ ”ہذا بعنوان ”جدید عصری مسائل کے حل میں تصوف کا کردار“ مکمل ہوا۔

اب اس کا مختصر خلاصہ پیش کرتا ہوں۔

زیر نظر مقالہ آٹھ ابواب، مقدمہ اور خلاصہ بحث پر مشتمل ہے۔ اس میں دین اسلام کے تیسرے

شعبے کیفیات روحانیہ (احسان) کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

ان ابواب سے قبل ایک مقدمہ پیش کیا گیا ہے جس میں تصوف کی اہمیت کو اور مقام صوفی کی عظمت کو بیان کیا گیا ہے۔ مختصر اُیہ بتایا گیا ہے کہ جب تک مسلمان تصوف پر عمل پیرا رہے، دنیا میں ان کی عظمت کے ڈنکے بجتے رہے۔ تصوف کہ علم سے دوری ان کے زوال بنی۔ غیر مسلم بالخصوص مستشرقین نے تصوف کو بدنام کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ مگر جس کی حفاظت اللہ رب العلیٰ کرے ان کو کون ختم کر سکتا ہے۔ اس میں یہ واضح کیا گیا کہ جب بھی اسلام کی ناؤ ڈوبنے لگی تو صوفیاء نے ہی اسے غرق ہونے سے بچایا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اپنے تو اپنے غیروں نے بھی اس بات کو تسلیم کیا چنانچہ ایچ آر گب جیسے یورپی دانشور کے یہ الفاظ اس سلسلے میں واضح ثبوت ہیں۔

”تاریخ اسلام میں بارہا ایسے مواقع آئے ہیں کہ اسلام کے کلچر کا شدت سے مقابلہ کیا گیا لیکن اس کے باوجود مغلوب نہ ہو سکا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ صوفیاء کا انداز فکر فوراً اس کی مدد کو آ جاتا تھا اور اس کی تانی قوت و توانائی بخش دیتا کہ کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہ کر سکتی۔ اس کے بعد پہلے باب میں تصوف کی تعریف، آغاز، پس منظر اور اس کے مقصد کے بارے میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں اصلاحی پہلو سے تصوف کے تاریخی کردار اور دیگر مذاہب کے راہبانہ کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس وضاحت کے بعد ان مذاہب کے درمیان فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ تاکہ اسلامی تصوف کی فضیلت اور امتیازی شان واضح ہو جائے۔

پھر دوسرے باب میں جدید عصری مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان مسائل کو چار حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصے کی لگ فصل بنادی گئی ہے۔

پہلی فصل میں دینی اور روحانی مسائل کی وضاحت کی گئی ہے۔ دیگر مذاہب اور لادینی تحریکوں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح تصوف اسلامی نے ان کا رد کیا اور کیا اس کے اثرات مرتب

ہوئے ہیں۔

دوسری فصل میں فکری مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان فکری مسائل کو تصوف کی روشنی میں کس طرح حل کیا گیا ہے۔ ان مسائل پر اسلامی تصوف کا کیا اثر ہوا ہے۔ تیسری فصل میں معاشرتی مسائل کو آشکار کیا گیا مثلاً خاندانی مسائل، گروہی تعصبات، لسانی، علاقائی، نسلی و مذہبی تعصبات، ذہنی دباؤ جیسے مسائل کو تصوف کی روشنی میں حل کیا گیا ہے۔ چوتھی فصل میں معاشی مسائل کو بیان کیا گیا کہ جو اس وقت دنیا کو درپیش ہیں اور ان کا حل تصوف کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔

### تیسرا باب

نفس انسانی کی تربیت اور اصلاح فکر کے بارے میں ہے۔ اسکی بھی تین فصلیں بنادی

ہیں۔

پہلی فصل میں انسانی زندگی پر عقائد اسلامی کے اثرات کا تصوف کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔ اور یہ بتایا گیا کہ ان سے ہمارے نفس اور فکر کی اصلاح کے لئے کیا کیا تجاویز اور کاوشیں ہونی چاہیں۔ تاکہ ان کے اثرات سے مطلوبہ مقاصد حاصل ہو سکیں۔

دوسری فصل میں ان رجحانات کو بیان کیا گیا ہے۔ جو مذہب بیزار ہیں۔ ان کے انسداد میں تصوف کا کیا رول ہے۔ اس کو واضح کیا گیا ہے۔

تیسری فصل میں سکون قلب کے حصول میں تصوف کی رہنمائی کرتا ہے۔ اسکی وضاحت کی گئی ہے نیز نفس کی تربیت اور فکری اصلاح پر تصوف کے علمی اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں اصلاحی تجویز پیش کی گئی ہیں۔

### چوتھا باب

مسلمانوں کے علمی و تعلیمی مسائل سے متعلق ہے۔ اس میں صوفیائے کردار تصوف کی

روشنی میں اجاگر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے اس موضوع کو پانچ فصلوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

- 1۔ اس فصل میں علم کی اہمیت کو تصوف کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے۔
  - 2۔ دوسری فصل میں جہالت کی مذمت میں صوفیاء کے نقطہ نظر کو بیان کیا گیا ہے
  - 3۔ تیسری فصل میں صوفیاء کرام کی فکری اور عملی اعتبار سے علم کی اشاعت کے بارے میں کاوشوں کا ذکر کیا گیا ہے۔
  - 4۔ چوتھی فصل میں تصوف کی روشنی میں علم کے مقاصد کے تعین کا اظہار کیا گیا ہے۔
  - 5۔ پانچویں فصل میں شعبہ تعلیم و علم میں صوفیاء کے کردار کا ناقدا نہ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔
- پانچواں باب :-

اس باب میں انسانی زندگی کی فعالیت کے اسلامی تصور کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں تصوف کا کیا کردار رہا ہے۔

اس کی وضاحت کی گئی ہے۔

اس باب کو بھی چار فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے تاکہ اس موضوع کی ہر شق کو تصوف کی روشنی میں واضح کیا جاسکے۔

- 1۔ پہلی فصل میں ایک اچھے اور کامل انسان کے صحیح مقام کے شعور کی وضاحت کی گئی ہے۔
- 2۔ دوسری فصل میں ”منزل اور مقام“ کے حصول میں جس کردار کی ضرورت ہے۔ اس کے شعور کی بیداری میں صوفیائے کرام کے کردار کی وضاحت کی گئی ہے۔
- 3۔ تیسری فصل میں صوفیاء نے جو بامقصد زندگی گزارنے اور نصب العین متعین کرنے پر زور دیا ہے۔ اسکی وضاحت کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی سے بے مقصدیت کے خاتمہ کی وضاحت کی گئی ہے۔



4۔ چوتھی فصل میں کسی جائز کام میں جرأت سے ہاتھ ڈالنے کی صلاحیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں صوفیاء کرام کی تعلیمات کے اثر کو بیان کیا گیا ہے۔ اس باب میں مذکور تمام پہلوؤں کا موجودہ صورت حال سے موازنہ اور ان کی اصلاح کی تجاویز بیان کی گئی ہیں۔

### چھٹا باب

یہ باب معاشی رویوں کی تشکیل کے بارے میں ہے اس میں تصوف کے کردار کی وضاحت کی گئی ہے۔

اسکے منفی رویوں کے انسداد اور مثبت رویوں کے حصول میں صوفیاء کرام کی کوششوں کی صراحت کی گئی ہے۔

اسکی وضاحت کے لیے اس باب کو بھی سات فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

1۔ پہلی فصل میں تحریک مادیت کے اثرات کی وضاحت کی گئی ہے۔ اور پھر تصوف کی روشنی میں ان کے انسداد کے طریقے بیان کئے گئے ہیں۔

2۔ دوسری فصل میں بتایا گیا ہے کہ صوفیائے کرام نے استحصالی رجحانات کی جگہ احسان اور ایثار کا لوگوں کو درس دیا ہے تاکہ وہ نہ صرف صحیح مسلمان بلکہ کامل انسان بن سکیں۔

3۔ تیسری فصل تحریک مادیت اور ان کے انسداد کے بارے میں ہے جس میں صوفیائے کرام کے موقف کو بیان کیا گیا ہے۔

4۔ چوتھی فصل میں یہ بتایا گیا ہے کہ صوفیاء نے ارتکاز دولت کی نفی کی ہے اور اس فعل کو حقیر جانا ہے۔ بلکہ انتشار دولت کا بنی نوع انسان کو درس دیا ہے۔ تاکہ دولت کسی ایک ہاتھ میں جمع نہ ہو جائے جو کہ اسلام کے احکامات کے منافی ہے

- 5۔ پانچویں فصل میں عیش و عشرت کی زندگی کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں تصوف کی روشنی میں صوفیاء کی سادگی اور سادہ زندگی کے اثرات کی وضاحت کی گئی ہے۔
- 6۔ چھٹی فصل میں اسراف، تیزیر اور دوسروں کے دست نگر ہونے کی نفی کی گئی ہے۔ اور صوفیاء کے کردار کی روشنی میں خود انحصاری کفایت شعاری اور قناعت کا درس دیا گیا ہے۔
- 7۔ ساتویں فصل میں اس ساری بحث کا خلاصہ۔ تصوف کے کردار اور مسائل کے بارے میں صراحتاً ذکر کیا گیا اور اس سلسلہ میں اصلاحی تجاویز بھی بیان کی گئی ہیں۔

### ساتواں باب

اس باب میں سائنسی اور تکنیکی حالات کے تناظر میں انسانی کردار کی وضاحت کے ساتھ اس پر تصوف کے اثرات کو بیان کیا گیا ہے۔ اس باب کو بھی پانچ فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تاکہ اس سلسلہ میں اس موضوع کی اچھی طرح وضاحت ہو سکے۔

اس باب کی پہلی فصل میں آج کے سائنسی اور تکنیکی دور میں ایک انسانی ذہن کے زوال پذیر ہونے کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح اس میں خود اعتمادی پیدا ہوئی اور وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہوا۔ اور تصوف کی روشنی میں کردار کی اصلاح اور خود اعتمادی جیسے عناصر کو پیدا کرنے کے بارے میں وضاحت کی گئی ہے۔

2۔ دوسری فصل میں انسان کے فکر میں جو جمود طاری ہو چکا ہے۔ تصوف کی روشنی میں اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ کس طرح اس جمود کا خاتمہ کیا جائے اور فکر انسانی کے ارتقاء کی تجاویز کو زیر بحث لایا گیا۔

3۔ تیسری فصل میں فکر انسانی کو ترقی کی راہ پر چلانے کے سلسلہ میں تصوف کے کردار کی وضاحت کی گئی ہے۔

4۔ چوتھی فصل میں عام انسان کے کردار کی بات کی گئی ہے اور صوفیاء کے کردار کی روشنی میں اسکی اصلاح کی طرف نشاندہی کی گئی ہے۔

5۔ پانچویں فصل میں عالم اسلام کے استحکام اور بقاء کے لئے جس کردار اور عمل کی ضرورت ہے اس کا درس دیا گیا ہے۔ تاکہ مسلمانان عالم اس پر عمل کر کے باصلاحیت انسان بن سکے۔

آٹھواں باب :-

اس باب میں عصر حاضر میں تصوف کے کردار میں حائل مشکلات کا تذکرہ کیا گیا ہے اور ان کے تدارک کی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔

اس باب کو بھی تین فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ آخر پر ایک پانچویں فصل مصادر و مراجع کی بیان کی گئی ہے۔

1۔ پہلی فصل میں تصوف کی راہ میں درپیش مسائل و مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو اسلامی تصوف کی راہ میں حائل ہیں۔

2۔ دوسری فصل میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ یہ مسائل جو درپیش ہوئے یا مشکلات حائل ہوئی ہیں۔ ان کا پس منظر کیا ہے۔

3۔ تیسری فصل میں ان کے تدارک کو ختم کرنے کے ذرائع کو بیان کیا گیا ہے۔

اس تمام بحث کا لب لباب یہ ہے کہ انسانی زندگی اور اس کو درپیش مسائل جن کی مختلف نوعیتیں ہیں۔ اپنے اندر مختلف نظریات اور عقائد کو لیے ہوئے تھے۔ ان کو اس نظریہ اور عقیدہ اور علم کی روشنی میں دیکھنا جسے علم تصوف کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور جو مذہب اسلام کی روح ہے۔ اس پر عمل کر کے نہ صرف ہم اپنی زندگیاں دنیوی اعتبار

سے سنوار سکتے ہیں بلکہ دینی اعتبار سے بھی کامیاب اور اللہ کی بارگاہ میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔

تصوف وہ علم ہے جس سے تزکیہ نفوس اور تصفیہ اخلاق اور ظاہر و باطن کے احوال پہچانے

جاتے ہیں تاکہ سعادتِ ابدی حاصل ہو۔ نفس کی اصلاح ہو اور رب العلمین جل شانہ کی رضا اور اس کی معرفت حاصل ہو اور تصوف کا موضوع تزکیہ و تصفیہ اور تعمیرِ باطن ہے اور اس کا مقصد ابدی سعادت کا حصول ہے۔

ایسے عظیم، اہم اور اصلاحی کام از خود نہیں ہوتے بلکہ اس کے پیچھے ایک جذبہ کارفرما ہوتا ہے جو ہر کسی کو اپنی زندگی میں ایک نہ ایک ایسا موقع دیتا ہے۔ جس سے اس کے دل میں ایک عظیم بھلائی اور کارِ خیر کی تمنا پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس کے دل میں یہ خواہش کروٹیں لیتی ہے کہ میں دنیا میں ایک بہترین کام کر جاؤں۔ یہ بات علیحدہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو چند مجبور یوں کے باعث اس قابل نہ سمجھے کہ وہ بھی ایک عظیم بھلائی کا کام کر سکے گا۔ لیکن میرا ایمان ہے کہ اگر وہ اس امنگ کو جو اس کے دل میں کسی بھلائی کرنے کیلئے پیدا ہوئی ہے۔ مضبوطی سے پکڑے اور اس کی طرف کچھ دھکیاں دیکر اسے عملی جامہ پہنانے کی سعی کرے۔ تو یقیناً اس کے سامنے ایک اعلیٰ ترین مقصدِ حیات افشا ہوگا۔ اور وہ ضرور ایک عظیم بھلائی کا موجب بن سکے گا۔ والذین جاہدوا فینا لنہدینہم سبلنا۔ (۳۵) ارشادِ خداوندی ہے کہ جو لوگ محمد میں کوشش کرتے ہیں یعنی میری تلاش و جستجو کرتے کرتے ہیں ضرور ان کیلئے اپنے راستے کھول دیتا ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ جب کسی کے دل میں بھلائی کے سبکی کام کو کرنے کی تمنا پیدا ہوتی ہے یہ اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر خاص رحمت اور فضل ہے۔ جس نے اس کی روح کو اتنی قابلیت بخشی کہ وہ نیکی کی طرف راغب ہو۔ اور یہ داعیہ جو اس کے اندر سے اسے کسی کارِ خیر کیلئے پکارتا ہے۔ اس کے رب کی طرف سے اس کے جذبہ عمل کا امتحان ہے۔ گویا معبود اپنے عبد کو آزماتا ہے آقا اپنے غلام کا امتحان لینا چاہتا ہے۔ یا محبوب اپنے عاشق کو پرکھ رہا ہے۔ مگر اس داعیہ کے ذریعے اس کی آزمائش کچھ ایسے غیر محسوس طریقے پر ہوتی ہے۔ اور اس کی قربانی کا اندازہ کچھ ایسے عجیب طریقے پر کیا جاتا ہے۔ کہ اسے خود بھی یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ آیا یہ واقعی قدرت کی طرف سے میرا امتحان ہوتا ہے یعنی اس کے دل میں القا کر دیا جاتا ہے کہ اگر تو اس کارِ خیر کو کر جائے تو شاید تیرا اللہ تجھ سے راضی ہو جائے۔ اور اس کا قرب تجھے نصیب ہو اور اگر ہر کارِ خیر میں رضائے الہی کو اپنا نصب العین بنایا تو پھر قدرت دیکھتی ہے کہ ایک عبد اپنے معبود کی رضا کی خاطر کس قدر

قربانی دینے کو تیار ہے پس یہی وہ امتحان ہے جس کیلئے حضرت ابراہیمؑ جیسی جلیل القدر ہستی سے بھی اپنے والدین خوش واقارب ملک ووطن اور بیوی بچے بلکہ جان تک کی قربانی طلب کی گئی تھی۔

در اصل فطرت کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ کسی مقصد کے حصول کیلئے صرف ربانی جمع خرچ پر انسان کو نہیں رہنے دیتی بلکہ وہ یہ دیکھا کرتی ہے کہ خود انسان اپنے مقصد کو حاصل کرنے کیلئے کس قدر سعی کرتا ہے۔ اور یکسوئی کے ساتھ اس کے حصول کیلئے متفکر رہے گا تو ضرور اپنے مقصد میں کامیاب رہے گا۔ بسا اوقات تو یوں بھی ہوتا ہے کہ بعض لوگ اپنے مقاصد کے حصول کیلئے کچھ ہاتھ پیر بھی مار لیتے ہیں لیکن جب انہیں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ جی توڑ جاتے ہیں اور پھر ناامیدی میں مبتلا ہو کر کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ پھر بعض نا عاقبت اندیش لوگ تو دوسروں کو اپنی زبر افشانی کا نشانہ بتاتے ہیں۔ بڑوں تک کو گالیاں دیتے ہیں۔ اور بعضے قومی صوبائی اور لسانی تعصبات میں مبتلا ہو کر دین اور روحانیت سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ اور ایک ایسی زندگی اختیار کر لیتے ہیں جو انہیں بلند مرتبات تک پہنچا دیتی ہے۔ کئی لوگ غم غلط کھرنے کیلئے منشی اشیاء کا استعمال شروع کر دیتے ہیں۔ اور بعض لوگ گانا سننے اور سینما دیکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ لیکن عبد میں جب ان کو عادت پختہ ہو جاتی ہے تو یہ چیزیں نہ صرف ان کی صحت کو کمزور کر دیتی ہے۔ بلکہ ان کی مالی حالت بھی مزدوری آ جاتی ہے اور پھر وہ جائز و ناجائز طریقوں سے روپے پیسے بٹورنے اور خواہ مخواہ کی بری حرکتوں میں پھنس جاتے ہیں جو انہیں ذلالت کی زندگی تک پہنچا دیتے ہیں۔

بعض لوگ تو بالکل ہی دنیا کے کاموں سے جی چھوڑ جاتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے بے کار ترین لوگوں میں شمار ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ نہ صرف زمین پر ہی بوجھ ہوتے ہیں بلکہ قوم، ملک اور خاندان پر بھی بوجھ ہو جاتے ہیں۔ پھر بعضوں کی نوبت تو بھکاری پن تک پہنچ جاتی ہے۔ اور بعضوں کا دماغ ہی جواب دے جاتا ہے۔

اور اسی طرح دنیا میں ایسے بھی بہت سے انسان موجود ہیں جن کے دماغوں میں بت اعلیٰ قسم کے خیالات چکر کاٹتے ہیں وہ اپنے ذہنوں میں بلند ترین مقاصد چھپائے رکھتے ہیں۔ لیکن اگر انہوں نے ان مقاصد کے حصول کیلئے کوئی جدوجہد نہیں کی۔ تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہمیں دنیا

کے دہندوں و سے نجات مل جائے۔ یا یہ کہ پیٹ کا مسئلے میں حائل نہ ہو۔ یہ بیوی بچے نہ ہوں اس ملازمت کیلئے جانے کا خطرہ نہ ہو۔ افلاس کا ڈر نہ ہو۔ بیماری کا خوف نہ ہو حکومت کا ڈر نہ ہو۔ یا یہ پیسے کی کمی نہ ہو تو ہم ضرور اپنے مقصد حیات میں کامیاب ہو جائیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے اور اس میں ذرہ برابر بھی مبالغہ نہیں کہ کام کرنے والوں نے دنیا کے بڑے بڑے کام تکالیف و مصائب اور رنج و الم کے ہجوم میں گھرا کر گئے ہیں۔ جن جوانمردوں اور دانشوروں نے قوموں کی ناؤ پار لگائی ہے اور قوموں کو ترقی کے بام عروج تک پہنچایا ہے۔ وہ اکثر فراغت والے طبقے میں سے نہیں تھے۔ بلکہ ان کو لوگوں میں سے تھے جو ضروریات زندگی کے حصول کیلئے دھکے کھاتے اور سخت جدوجہد کرتے رہے ہیں۔

غرض یہ دنیا کہ تمام قابل ترین ہستیوں کی زندگیوں پر اگر ہم غور کریں تو شاذ و نادر ہی ہمیں کوئی ایسی ہستی ملے گی جس نے تکلیفوں اور مصیبتوں کے بغیر ہی قوم کی کوئی خدمت کی ہو۔ لیکن اس کے برعکس اس کے مثال آپ کو عام ملے گی کہ جو لوگ فرصت اور فراغت کے متمنی ہیں اور جن کا اپنے متعلق یہ خیال ہے کہ اگر انہیں فرصت مل جائے تو وہ کار نمایاں کریں گے جب انہیں فرصت ملتی ہے تو وہ کچھ کرتے کراتے نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ انسان تب ہی اپنے مقصد حیات میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اور تب ہی وہ کوئی کار نمایاں انجام دے سکتا ہے۔ جب اس کے دل میں کوئی ٹھوس نصب العین جگہ کرے اور اس کے دماغ میں قوم کی اصلاح اور بھلائی کیلئے کسی کار خیر کا تصور آ جائے اور وہ اسی وقت سے جس حال میں بھی ہو۔ اپنی استطاعت کے مطابق اس کیلئے جدوجہد شروع کر دے۔ تاریخ ہمیں بتلاتی ہے کہ اکثر نہایت ہی حسین و لطیف کمالات ایسے مردوں اور عورتوں نے حاصل کئے ہیں جو مصائب و مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔ اور جنہیں روزمرہ کی دکھ بھری زندگی میں اطمینان و سکون کا سانس لینے کی مہلت نہیں ملی اور بعض بہترین و عظیم ترین کتابیں شدید ترین افلاس اور مصیبت کے ایام میں لکھی گئی ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ مقصد حیات ایک ابدی شے ہے جو حالات کی وجہ سے فنا نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس کی پیاس بجھ سکتی ہے، چاہے انسان پر کیسے ہی حالات کیوں نہ آ جائیں۔ البتہ اگر انسان اس کے حصول میں مستقل مزاجی کو چھوڑ دے۔ تو معمولی سی بات بھی اس کیلئے بہانہ بن جاتی ہے۔ اور پھر وہ نہ صرف اپنے

مقصد حیات کو کھوجاتا ہے بلکہ روحانی قابلیت کے امتحان میں ناکام ہو کر اپنے آپ کو اسفل میں گرا دیتا ہے۔  
دراصل انہی امتحانات میں ثابت قدم رہنے اور مستقل مزاجی سے اپنے نصب العین کی طرف

بڑھنے کا سب انبیاء کا سبق انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہمیں دے گئے ہیں۔ (۲۶)

حضرت ابراہیم علیہ السلام آگ میں ڈالے گئے ملک و ملت اور خویش و اقارب سے علیحدہ کئے گئے طرح طرح کی تکلیفیں اور ایذائیں پہنچائی گئیں۔ مگر وہ اپنے اپنے نصب العین سے ہرگز نہ ہٹے۔ خود رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جب قریش نے طرح طرح کی ایذائیں پہنچائیں۔ اور حد درجہ تنگ کیا تو آنجناب علیہ الصلوٰۃ والسلام فداہ ابی دمی نے فرمایا کہ اگر میرے ایک ہاتھ پر سورج رکھ دیا جائے اور دوسرے پر چاند تب بھی میں حق کی بات سے نہ ہٹوں گا اور اپنے مقصد حیات کو نہ چھوڑوں گا اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سنت اور ان کا اسوہ حسنہ مسلمانوں پر فرض کر دیا ہے۔ اور اس ابراہیمی اور محمدی ﷺ سنت کو جگر گوشہ رسول ﷺ نے میدان کربلا میں زندہ پائندہ کر رکھا یا۔ آپ ﷺ اپنے آخری خطبے میں یزیدی فوج کو یوں مخاطب کرتے ہیں۔ یزید کی بیعت تو ناممکن ہے میں نے مسلمانوں کے لئے صبر و استقلال۔ استقامت و ایثار خود خداری کی بنیاد رکھ دی ہے۔ اور میں تمہیں اعلانیہ کہتا ہوں کہ تمہاری توقعات پوری نہ ہو سکیں گی، اور دنیا بہت جلد تمہیں اپنا کرشمہ دکھلا دیگی۔ خدا اس دن کے لیے مجھے زندہ نہ رکھے کہ میں چند روزہ زندگی کی خاطر ایک فاسق و فاجر کی بیعت کر لوں۔ اور بنو فاطمہ کے دامن پر سیاہ داغ لگا دوں۔ خداوند قدوس کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ایک باضمیر انسان بنایا۔ مجھے خطرہ تھا۔ کہ میرا ضمیر کہیں میرے معصوم بچوں کی محبت اور شفقت کی بنا پر دھوکہ نہ دے دے۔ لیکن یہ اس پاک ماں کے پاک دودھ کا اثر تھا۔ کہ جھوٹی توقعات اور فانی ضروریات حقیقت کے سامنے مغلوب ہو گئے۔ اور اب میں خداوند تعالیٰ کے حضور میں سرخروئی کے ساتھ جا رہا ہوں۔

غرض یہ ہے کہ اگر انسان روزمرہ کی زندگی کے جھیلوں میں رہ کر اس اضطراری حالت کو جو اس کے دل و دماغ میں تفکرات، تصورات، احساسات اور جذبات کی صورت میں پیدا ہوتی ہے۔ عملی صورت دینے کی سعی کرے اور پھر اپنے اس مقصد کے لیے سروٹھڑ کی بازی لگا دے۔ تو اس کا نصب العین قوم کا نصب

العین بن سکتا ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ وہ ایک ایسی پر زور طاقت کا روپ اختیار کرے۔ جو ایک مرتبہ تمام دنیا کو ہلا دے اور تمام دنیا اس کے اس کارنامہ پر انگشت بدندان رہ جائے۔ پس انہی امیدوں کو لیکر خدائے رحمان و رحیم کے نام سے میں میدان عمل میں قدم رکھ رہا ہوں۔

در اصل میرے حالات بھی بعض وجوہات کی بنا پر ان افراد سے مماثلت رکھتے ہیں جو مصائب و مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔ اور جنہیں روزمرہ کی مصروفیتوں سے سرکجانے کی بھی فرصت نہ ملتی تھی۔ بلکہ میں تو روزمرہ کی زندگی کے جھمیلیوں کے علاوہ ایک ایسا گمنام اور بے مایہ شخص ہوں جو نہ صرف ادبی دنیا میں طفل مکتب کے برابر ہوں۔ بلکہ دینی علوم میں بھی وہ مہارت اور ملکہ نہیں رکھتا کہ جس کی ضرورت ہے البتہ کتب اسلامیہ کے مطالعہ کا شوق ہے جو شاید اسی جذبہ کامرہون منت ہے جو بچپن سے دل میں لیے پھرتا ہوں۔ اور وہ دین اسلام کو تمام دنیا کے ادیاں پر غالب کرنے کا جذبہ ہے کہ جس نے نہ صرف میری ساری زندگی کو دینی جذبات و احساسات سے بھر دیا ہے۔ بلکہ میرے سینے میں، ایسا ٹھاٹھیں مارتا ہوا بحر بے کراں موجزن کر دیا ہے۔ جس کی آغوش میں کئی سیلاب اور طوفان چھپے ہوئے ہیں۔ اور جو فرن اول کے اسلام کی احیاء کے کئی انقلابات کو برپا کرنے والا ہے۔

دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ مجھے ہمیشہ دین اسلام کی خدمت کی توفیق عطا فرمائیں۔ اور صوفیائے کرام کے مسلک اور مذہب اور ان کے مشن کی خدمت کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین ثم آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ۔



## نتائج بحث

زیر نظر مقالہ سات ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں دین اسلام کے تیسرے شعبے کیفیات روحانیہ کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

ان ابواب سے قبل ایک مقدمہ پیش کیا گیا ہے جس میں تصوف کی تعریف آغاز، پس منظر، مقصد کے بارے میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں اصلاح پہلو سے تصوف کے تاریخ کردار اور دیگر مذاہب کے راہبانہ کردار اور اس کے درمیان فرق کو واضح کیا گیا ہے۔

اسکے بعد پہلے باب میں جدید عصری مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان مسائل کو چار حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصہ کو ایک فصل بنادی گئی ہے۔

پہلی فصل میں دینی اور روحانی مسائل کی وضاحت کی گئی ہے۔ دیگر مذاہب اور لادینی تحریکوں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح تصوف اسلامی ان کا رد کیا اور کیا کیا اس کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

دوسری فصل میں فکری مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان فکری مسائل کو تصوف کی روشنی میں کسی طرح حل کیا گیا ہے۔ ان مسائل نے تصوف سے کیا اثر لیا ہے۔

تیسری فصل میں معاشرتی مسائل کو آشکار کیا گیا ہے۔ مثلاً خاندانی مسائل گروہی تعصبات، لسانی، علاقائی، نسلی، مذہبی،

تعصبات، ذہنی دباؤ جیسے مسائل کو تصوف کی روشنی میں حل کیا گیا ہے۔

چوتھی فصل میں معاشی مسائل کو بیان کیا گیا کہ جو اس وقت دنیا کو درپیش ہیں اور ان کا حل تصوف کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔

## دوسرا باب

نفس کی تربیت اور اصلاح فکر میں ہے۔

اسکی بھی تین فصلیں بنا دی ہیں۔

پہلی فصل میں انسانی زندگی پر عقائد اسلامی کے اثرات کا تصوف کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان سے ہمارے نفس اور فکر کی اصلاح کے لئے کیا تجاویز بیان کی گئی ہیں اور ان کے کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

دوسری فصل میں ان رجحانات کو بیان کیا گیا ہے۔ جو مذہب بیزار ہیں۔ ان کے انسداد میں تصوف کا کیا رول ہے۔ اس کو واضح کیا گیا ہے۔

تیسری فصل میں سکون قلب کے حصول میں تصوف کیا رہنمائی کرتا ہے۔ اسکی وضاحت کی گئی ہے نیز نفس کی تربیت اور فکری اصلاح پر تصوف کے علمی اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں اصلاح تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں۔

## تیسرا باب

مسلمانوں کے علمی و تعلیمی مسائل سے متعلق ہے۔

اس کا بھی تصوف کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں اس بات کو بھی پانچ فصلوں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

1- اس فصل میں علم کی اہمیت کو تصوف کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے۔

2- دوسری فصل میں جہالت کی مذمت میں صوفیاء کے نقطہ نظر کو بیان کیا گیا ہے

3- تیسری فصل میں صوفیاء کرام کی فکری اور عملی اعتبار سے علم کی اشاعت کے بارے میں کاوشوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

4- چوتھی فصل میں تصوف کی روشنی میں علم کے مقاصد کے تعین کا اظہار کیا گیا ہے۔

5- پانچویں فصل میں شعبہ تعلیم و علم میں صوفیاء کے کردار کا ناقدانہ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں انسانی زندگی کی فعالیت کے اسلامی تصور کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں تصوف کا کیا کردار ہے۔

اس کو بیان کیا گیا ہے۔

اس باب کو بھی چار فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے تاکہ اس موضوع کی ہر شق کو تصوف کی روشنی میں واضح کیا جاسکے۔

- 1- پہلی فصل میں ایک اچھے اور کامل انسان کے صحیح مقام کے شعور کی وضاحت کی گئی ہے۔
- 2- صحیح منزل اور مقام کے حصول میں جس کردار کی ضرورت ہے۔ اس کے شعور کی بیداری میں صوفیائے کرام کی وضاحت کی گئی ہے۔
- 3- صوفیاء نے جو بامقصد زندگی گزارنے اور نصب العین متعین کرنے پر زور دیا ہے۔ اسکی وضاحت کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی سے بے مقصدیت کے خاتمہ کی وضاحت کی گئی ہے۔
- 4- چوتھی فصل میں کسی جائز کام میں جرأت سے ہاتھ ڈالنے کی صلاحیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں صوفیاء کرام کی تعلیمات کے اثر کو بیان کیا گیا ہے۔ اس باب میں مذکور تمام پہلوؤں کا موجودہ صورت حال سے موازنہ اور ان کی

۱

صلاح کی تجاویز بیان کی گئی ہیں۔

پانچویں باب میں جو معاشی رویوں کی تشکیل کے بارے میں ہے اس میں تصوف کے کردار کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس کے منفی رویوں کے انسداد اور مثبت رویوں کے حصول میں صوفیاء کرام کی کوششوں کی صراحت کی گئی ہے۔ اسکو بھی سات فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

- 1- پہلی فصل میں تحریک مادیت کے اثرات کی وضاحت کی گئی ہے۔ اور پھر تصوف کی روشنی میں ان کے انسداد کے طریقے بیان کئے گئے ہیں۔
- 2- دوسری فصل میں بتایا گیا ہے کہ صوفیائے کرام نے استحصالی رجحانات کی جگہ احسان اور ایثار کا لوگوں کو درس دیا ہے۔
- 3- تیسری فصل تحریک مادیت اور ان کے انسداد کے بارے میں ہے صوفیائے کرام کے موقف کو بیان کیا گیا ہے۔
- 4- چوتھی فصل میں یہ بتایا گیا ہے کہ صوفیاء نے ارتکاز دولت کی نفی کی ہے اور انتشار دولت کی اجازت دی۔ خود بھی عمل کیا دوسروں کو بھی اسی کا درس دیا ہے۔

5- پانچویں فصل میں عیش و عشرت کی زندگی کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں تصوف کی روشنی میں صوفیاء کی سادگی اور سادہ زندگی کے اثرات کی وضاحت کی گئی ہے۔

6- چھٹی فصل میں اسراف، تمیز اور دوسروں کے دست نگر ہونے کی نفی کی گئی ہے۔ اور صوفیاء کے کردار کی روشنی میں خود انحصاری کفایت شعاری اور قناعت کا درس دیا گیا ہے۔

7- ساتویں فصل میں اس ساری بحث کا خلاصہ۔ تصوف کے کردار اور مسائل کے بارے

میں صراحتاً ذکر کیا گیا اور اس سلسلہ میں اصلاحی تجاویز بیان کی گئی ہیں۔

چھٹے باب میں سائنسی اور تکنیکی حالات کے تناظر میں انسانی کردار کی وضاحت کے ساتھ اس پر تصوف کے اثرات کو بیان کیا گیا ہے۔ اس باب کو بھی پانچ فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تاکہ اس سلسلہ میں اس موضوع کی اچھی طرح وضاحت ہو سکے۔

اس باب کی پہلی فصل میں آج کے سائنسی اور تکنیکی دور میں ایک انسان میں ذہنیت زوال پذیر ہے۔ کردار میں خامیاں ہیں اس میں تصوف کی روشنی میں کردار کی اصلاح اور خود اعتمادی جیسے عناصر کو پیدا کرنے کے بارے میں وضاحت کی گئی ہے۔

2- دوسری فصل میں انسان کے فکر میں جو جمود طاری ہو چکا ہے۔ تصوف کی روشنی میں کس طرح خاتمہ کیا جائے اور اس کے ارتقاء کی تجاویز کو زیر بحث لایا گیا۔

3- تیسری فصل میں فکر انسانی کو ترقی کی راہ پر چلانے کے سلسلہ میں تصوف کے کردار کی وضاحت کی گئی ہے۔

4- چوتھی فصل میں عام انسان کے کردار کی بات کی گئی ہے اور تصوف کی روشنی میں اسکی اصلاح کی طرف نشاندہی کی گئی ہے۔

5- پانچویں فصل میں عالم اسلام کے استحکام اور بقاء کے لئے جو مسلمانوں کا کردار مطلوب ہے اس پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کا تصوف کی روشنی میں موازنہ کیا گیا ہے۔

ساتویں باب میں عصر حاضر میں تصوف کے کردار میں حائل مشکلات کا تذکرہ کیا گیا ہے اور ان کے تدارک کی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔

اس باب کو بھی تین فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ آخر پر ایک پانچویں فصل مصادر و مراجع کی بیان کی گئی ہے۔

1- اس فصل میں تصوف کی راہ میں درپیش مسائل و مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو اسلامی تصوف کی راہ میں حائل

ہیں۔

2- دوسری فصل میں اسی بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ یہ مسائل جو درپیش ہوئے یا مشکلات حائل ہوئی ہیں۔ ان کا پس منظر کیا ہے۔

3- تیسری فصل میں ان کے تدارک اور ختم کرنے کے ذرائع کو بیان کیا گیا ہے۔

اس سارے بحث کا لب لباب یہ ہے کہ انسانی زندگی اور اس کو درپیش مسائل جن کی مختلف نوعیتیں ہیں۔ اپنے اندر مختلف نظریات اور عقائد کو لیے ہوئے تھے۔ ان کو اس نظریہ اور عقیدہ اور علم کی روشنی میں دیکھنا جسے علم تصوف کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور جو مذہب اسلام کی روح ہے۔ اس پر عمل کر کے نہ صرف ہم اپنی زندگیوں کو دنیوی اعتبار سے سنوار سکتے ہیں بلکہ میں بھی کامیاب اور اللہ کی بارگاہ میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔

تصوف وہ علم ہے جس سے تزکیہ نفوس اور تصفیہ اخلاق اور ظاہر و باطن کے احوال پہنچانے جاتے ہیں تاکہ سعادت ابدی حاصل ہو۔ نفس کی اصلاح ہو اور رب العالمین جل شانہ کی رضا اور اس کی معرفت حاصل ہو اور تصوف کا موضوع تزکیہ و تصفیہ اور تعمیر باطن ہے اور اس کا مقصد ابدی سعادت کا حصول ہے۔ دلائل السلوک، ص: 16- (۲۷)

## حوالہ جات باب ہشتم

- ۱۔ ہمدانی، احمد سعید، پروفیسر: عصر جدید اور مسائل تصوف، ناشر: ناشاد پبلی کیشنز، ۶۵ ریگل پلازہ کوئٹہ، ص: ۲۳-۱۱
- ۲۔ خان، وحید الدین، مولانا: فکر اسلامی، ناشر: دارالتذکیر رحمٰن مارکیٹ غزنی اسٹریٹ اردو بازار لاہور، ص: ۱۲۸
- ۳۔ افغانی، محمد دین: تجدید الاسلام، مطبع: اسلامیہ پریس کوئٹہ، ص: ۶۶
- ۴۔ چشتی، یوسف سلیم، پروفیسر: تاریخ تصوف، ناشر: دارالکتب اردو بازار لاہور، ص: ۱۰۳-۱۰۰
- ۵۔ ایضاً اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش: مطبع: افضل شریف پریس لاہور، ص: ۵۰-۲۹

- ۶۔ ہمدانی، احمد سعید، پروفیسر: عصر جدید اور مسائل تصوف، ص: ۳۴-۱۸
- ۷۔ القرآن الحکیم: ۵۸ (المجادلہ): ۲۲
- ۸۔ القرآن الحکیم: ۳ (آل عمران): ۱۰۳
- ۹۔ القرآن الحکیم: ۳ (آل عمران): ۱۰۵
- ۱۰۔ القرآن الحکیم: ۸ (الانفال): ۴۶
- ۱۱۔ القرآن الحکیم: ۵۸ (المجادلہ): ۱۹
- ۱۲۔ القرآن الحکیم: ۶۱ (الصف): ۴
- ۱۳۔ القرآن الحکیم: ۸ (الانفال): ۶۰
- ۱۴۔ القرآن الحکیم: ۹ (توبہ): ۱۱۱
- ۱۵۔ القرآن الحکیم: ۴۸ (الفتح): ۲۹
- ۱۶۔ القرآن الحکیم: ۳ (آل عمران): ۱۱۰
- ۱۷۔ القرآن الحکیم: ۱۸ (الکہف): ۱۱۰
- ۱۸۔ القرآن الحکیم: ۳ (آل عمران): ۱۴۴
- ۱۹۔ چشتی، یوسف سلیم، پروفیسر: اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش، مطبع: افضل شریف شریف پریس

سن اشاعت ۱۹۹۷ء، ص: ۲۰

- ۲۰۔ توحید پوری، مہدی: مقدمہ نجات الانس، ص: ۲۹
- ۲۱۔ ڈاکٹر کلین Klein مترجم: البائتہ عن اصل الدیانہ، مطبوعہ لندن، ص: ۸۱۷
- ۲۲۔ سر ولیم مور Mnir: الخلافۃ، مطبوعہ لندن، ص: ۲۱۶
- ۲۳۔ عباس اقبال، پروفیسر: نوبختی، طہران، ص: ۲۵۷
- ۲۴۔ براؤن، پروفیسر: ایران کی ادبی تاریخ، مطبوعہ لندن، ج ۱، ص: ۳۱۱
- ۲۵۔ ڈاکٹر جے کے برج Birge در ویشوں کا بیکتاشی سلسلہ، مطبوعہ: ہارٹ فرڈ U.S.A، ص: ۱۳۲-۱۳۷
- ۲۶۔ محبت الحسن، پروفیسر: کشمیر زیر نگین سلاطین، مطبوعہ: کشمیر، سن اشاعت ۱۹۳۷ء، ص: ۲۸۸-۲۸۳
- ۲۷۔ شعرانی، عبدالوہاب، الیواقیت والجوہر، مطبوعہ: مصر، سن اشاعت ۱۳۵۱ھ، ص: ۷
- ۲۸۔ سبزواری، ہاری، ملاً: اسرار الحکم، ج اول، کتب خانہ محمودی طہران ۱۳۳۷ھ، ص: ۲۳۸
- ۲۹۔ نفیسی، سعید، جستجو در احوال و آثار، فرید الدین نیشاپوری، ص: ۹۱
- ۳۰۔ غزنوی، سنائی، حکیم: حدیقۃ الحقیقۃ، مطبوعہ: طہران، ۲۵۵
- ۳۱۔ احسان اللہ، ڈاکٹر، استخری: اصول تصوف، ص: ۲۰
- ۳۲۔ چشتی، یوسف سلیم: اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش، مطبوعہ: افضل شریف پریس،

ص: ۱۲۸-۱۰۰

۳۳۔ افغانی، دین محمد: تجدید الاسلام، اسلامیہ پریس کوئٹہ، ۱۹۷۳ء، ص: ۳۵

۳۴۔ خان، اللہ یار، مولانا: دلائل السلوک، ص: ۱۶

۳۵۔ القرآن الحکیم: ۲۹ (العنکبوت): ۶۹

۳۶۔ افغانی، دین محمد: تجدید الاسلام، ص: ۶۲

۳۷۔ اشتر یار خان، مولانا، دلائل السلوک، ص: ۱۶

## مصادر و مراجع

مصنف	کتاب	مطبع	سن اشاء
۱۔	القرآن الحکیم		
۲۔ ابن کثیر، عماد الدین، اسماعیل	تفسیر القرآن العظیم	دار التراث قاہرہ	۱۹۸۰ء
۳۔ القرطبی، محمد بن احمد	الجامع لاحکام القرآن	انتشارات ناصر خسرو، طهران ایران	۱۳۸۷ھ
۴۔ ابن عربی، محی الدین	تفسیر القرآن الکریم	ایضاً	ایضاً
۵۔ الشیخ، اسماعیل حقی	تفسیر روح البیان	مکتبہ اسلامیہ کوئٹہ	۱۴۰۵ھ
۶۔ البخاری محمد بن اسماعیل	الجامع الصحیح	مصطفی البابی الحلی	۱۹۵۶ء
۷۔ مالک، امام	الموطا	طبع منیریہ	۱۹۳۱ء
۸۔ مسلم بن الحجاج	الجامع الصحیح	محمد بن علی صبیح و اولادہ	۱۳۳۲ھ
۹۔ الترمذی، محمد بن عیسیٰ	جامع السنن	مطبع منیری، مصر	۱۹۳۱ء
۱۰۔ ابو داؤد، السجستانی	السنن	مطبع السعاده، مصر	۱۹۵۰ء
۱۱۔ النسائی، احمد بن شعیب	السنن	المطبعة المصریہ	۱۹۳۰ء
۱۲۔ ابن ماجہ، محمد یزید	السنن	عیسیٰ البابی الحلی	۱۹۵۳ء
۱۳۔ الخطیب، محمد بن عبد اللہ	مشکوٰۃ المصابیح	کتب خانہ رشیدیہ دہلی	۱۹۴۰ء
۱۴۔ القسطلانی، احمد بن محمد	ارشاد الساری لشرح صحیح البخاری	دار الفکر استنبول	۱۳۰۴ھ
۱۵۔ ثناء اللہ پانی پتی	التفسیر المکرمہ	مجلس اشاعت علمی، حیدر آباد دکن	سن
۱۶۔ ابن عربی، محی الدین	الفتوحات المکیہ	دار الکتب العربیہ، مصر	۱۳۲۹ھ
۱۷۔ ابن عربی، محی الدین	فصوص الحکم	دار الاحیاء الکتب العربیہ، مصر	۱۳۶۵ھ
۱۸۔ القشیری، عبد الکریم	الرسالۃ القشیریہ	دار التالیف، مصر	۱۳۶۴ھ
۱۹۔ طوسی، ابوالنصر سراج	کتب اللمع فی التصوف	مطبع دار المعارف، مصر	۱۳۱۷ھ
۲۰۔ نادیم سیتا پوری	تخلیص مقدمہ ابن خلدون	مطبع فیروز سنز لمیٹڈ لاہور	۱۹۹۲ء
۲۱۔ عبد الحمید صدیقی	اسلامک پیٹنگ ہاؤس شیش محل	اگست ۱۹۹۱ء	
	لاہور		
۲۲۔ پروفیسر عبد الماجد	اسلام اور عصر حاضر کے مسائل و حل	گنج شکر پرنٹرز، لاہور	۲۰۰۳ء



۲۳۔ پروفیسر محمد طاہر القادری	حسن احوال، سلوک تصوف کی تربیت کی عملی ہدایات	منہاج القرآن پرنٹرز، لاہور	۱۹۹۳ء
۲۴۔ مذہب اور جدید چیلنج	مولانا وحید الدین خان	فضلی سنٹر لمیٹڈ، اردو بازار لاہور	۱۹۹۰ء
۲۵۔ حضرت شیخ بدر الدین اسحاقؒ	ملفوظات حضرت شیخ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ	مکتبہ فریدیہ، ساہوال	
۲۶۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی	قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل	قومی پریس، لاہور	۱۹۸۹ء
۲۷۔ پروفیسر محمد معین الدین دادا کی	مجلس صوفیہ	نفیس اکیڈمی، کراچی	۱۹۸۸ء
۲۸۔ حضرت مفتی ولی حسن صاحب ٹوکی	تذکرہ، اولیائے پاک و ہند	اشرف برادران سلیم الرحمن	۱۹۹۹ء
۲۹۔ پروفیسر محمد طاہر القادری	منہاج العقائد	منہاج القرآن پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۹۳ء
۳۰۔ ادیس شاہ، مترجم: عیسیٰ خان جلالزئی	صوفیاء کرام کا طریقہ علم و زندگی	دعا پبلی کیشنز ۲۵ سی لوہر، مال لاہور	۲۰۰۲ء
۳۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	ترکیہ و احسان یا تصوف و سلوک	تشکیل پرنٹنگ پریس، کراچی	
۳۲۔ موسیٰ خان جلالزئی	فلسفہ تصوف	دعا پبلی کیشنز ۲۵ سی لوہر مال لاہور	۲۰۰۲ء
۳۳۔ سید خورشید احمد گیلانی	روح تصوف	عالمین پبلی کیشنز پریس ۲۲/۱۰	۱۹۸۱ء
		ریلیگیئن روڈ لاہور	
۳۴۔ اعلیٰ حضرت عالیجناب الحاج ڈاکٹر شفیع محمد اللہ دتتا طالب کنجاہی نقشبندی مجددی جماعتی	تصوف	شرکت پرنٹنگ پریس نسبت روڈ لاہور	۱۹۸۴ء
۳۵۔ کپتان واحد بخش سیال ربانی	مشاہدہ حق	ایور گرین پریس ۴ چیمبر لین روڈ لاہور	۱۹۸۳ء
۳۶۔ محمد قطب	اسلام اور جدید ذہن کے شبہات	الہدیر پبلی کیشنز ۳ راحت مارکیٹ اردو بازار لاہور	
۳۷۔ حضرت علامہ مولانا اللہ یار خان	ذلائل السلوک	ادارہ تالیفات اویسیہ مرشد آباد میاں والی	۱۹۹۲ء

- ۳۸۔ ڈاکٹر عبدالرشید  
۳۹۔ مولانا وحید الدین خان  
۴۰۔ امام ہمام حجۃ الاسلام حضرت  
امام غزالی
- ۴۱۔ پروفیسر احمد سعید ہمدانی  
۴۲۔ سید مناظر احسن الگیلانی  
۴۳۔ حکیم الامت مجدد الملت  
حضرت مولانا اشرف علی تھانوی  
۴۴۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق
- ۴۵۔ محبوب سبحانی قطب ربانی شیخ  
عبدالقادر جیلانی
- ۴۶۔ پروفیسر ڈاکٹر عبدالرشید  
۴۷۔ مفتی محمد رفیع عثمانی  
۴۸۔ خلیق احمد نظامی
- ۴۹۔ سید احمد عروج قادری  
۵۰۔ مولانا الحاج کیتان واحد بخش  
سیال چشتی صابر
- ۵۱۔ منشی عبدالرحمن خان  
۵۲۔ مولانا وحید الدین خان  
۵۳۔ پروفیسر لطیف اللہ  
۵۴۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی  
۵۵۔ مولانا وحید الدین خان
- ۵۶۔ پروفیسر محمد عثمان
- اسلامی تصوف اور صوفیائے سرحد  
تجدید دین  
منہاج العابدین
- عصر جدید اور مسائل تصوف  
اسلامی معاشیات  
الکشف عن مہاتمات التصوف  
من کی دنیا
- غنیۃ الطالبین (اردو)
- اسلامی تصوف اور صوبہ سرحد  
فقہ اور تصوف ایک تعارف  
تاریخ مشائخ چشت
- اسلامی تصوف  
مقائیس المجالس  
مضطرب صدائیں  
مذہب اور سائنس  
تصوف اور سریت  
مآثر الکرام  
اسلام اور عصر حاضر
- فکر اسلامی کی تشکیل نو
- اظہر عزیز پرنٹرز، اسلام آباد  
فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ کراچی  
اشرفی آفٹ پرنٹرز دیوبند
- ناشاد پبلشرز ۲۵ ریگل پلازہ، کوئٹہ  
رازقی مشین پریس حیدر آباد دکن  
کتب خانہ مظہری گلشن اقبال نمبر ۲  
کراچی  
غلام علی پرنٹرز، اشرفیہ پارک فیروز  
پور روڈ لاہور  
مکتبہ رحمانیہ، لاہور
- طاہر سنز اردو بازار کراچی  
احمد پرنٹنگ کارپوریشن کراچی  
مکتبہ عارفین ناشران و تاجران  
کتب، رقیہ بلڈنگ پاکستان چوک  
کراچی  
زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور  
الفیصل ناشران و تاجران کتب  
غزنی اسٹریٹ اردو بازار، لاہور
- طیب اکیڈمی بیرون بوہڑ گیٹ ملتان  
اے این اے پرنٹرز، لاہور  
مکتبہ جدید پریس، لاہور  
مشہور آفٹ پریس، کراچی  
فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ اردو  
بازار، کراچی  
پرنٹر آر پرنٹرز، لاہور
- ۱۹۸۸ء  
۱۹۹۲ء  
۱۹۹۸ء  
۱۹۹۷ء  
۱۹۹۵ء  
۱۹۹۷ء  
۱۹۸۸ء  
۱۹۹۶ء  
۱۹۸۳ء  
۱۹۹۰ء  
۱۹۸۷ء

۵۷۔ خواجگان چشت	ہشت بہشت	مکتبہ جام نور، نئی دہلی
۵۸۔ مولانا عبد الماجد دریابادی	تصوف اسلام	ناشران قرآن لمیٹڈ اردو بازار، لاہور
۵۹۔ حضرت مجدد الف ثانی الشیخ احمد سرہندی	مکتوبات امام ربانی (اردو ترجمہ)	مشہور آفسٹ پریس، کراچی ۱۹۷۳ء
۶۰۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی	تاریخ تصوف	دارالکتاب، اردو بازار، لاہور
۶۱۔ ظہور الحسن شارب	خمن خانہ تصوف	لیاقت شاہد پریس، لاہور
۶۲۔	فیروز اللغات (اردو جدید)	فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور، راولپنڈی، کراچی
۶۳۔ مولانا وحید الدین خان	اسلام اور عصر حاضر	۱۹۸۶ء فضلی سنز لمیٹڈ کراچی
۶۴۔ پیر عبد اللطیف خان نقشبندی	بیعت کی تشکیل اور تربیت	۱۹۹۳ء جنگ پبلشرز پریس ۳۳ اسر آغا خان روڈ لاہور
خلیفہ مجاز نیریاں شریف	کشف المحجوب (اردو)	لعل اشار پرنٹرز، لاہور
۶۵۔ زبدۃ العارفین ابوالحسن سید علی بن عثمان ہجویری	اسلام اور دستور حیات	۱۹۹۵ء غلام علی پرنٹرز، جامع اشرفیہ اچھرہ، لاہور
۶۶۔ محمد ظہیر الدین بھٹی	اسلام اور عصر رواں	۱۹۸۸ء ماس پرنٹرز، ناظم آباد، کراچی
۶۷۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق	سیر تصوف	۱۹۹۶ء جنگ پبلشرز پریس ۳۳ اسر آغا خان خان روڈ، لاہور
۶۸۔ فاضل جلیل پیر طریقت	اللہ رابطہ شیخ	۱۹۸۳ء وفاق پریس، لاہور
۶۹۔ مولانا درویش محمد یعقوب مصطفائی	امداد السلوک	۱۹۸۸ء اے اینڈ ایس پرنٹرز، ناظم آباد، کراچی
۷۰۔ شیخ قطب الدین دمشقی	سیر تصوف	۲۰۰۱ء المحزن پرنٹرز کراچی
۷۱۔ مولانا درویش محمد یعقوب مصطفائی	الدین القیم	نقیس اکیڈمی آفسٹ پرنٹرز، کراچی ۱۹۸۰ء
۷۲۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی	جوامع الکلم	زابد بشیر پرنٹرز، لاہور ۱۹۹۷ء
۷۳۔ سید محمد اکبر حسینی	اسلام	
۷۴۔ حضرت امام غزالی		

- ۷۵۔ پیر عبداللطیف خان نقشبندی      ید اللہ فوق اید بہم بیعت کی تشکیل اور تربیت      جنگ پبلشرز پریس ۳۳ سر آغا خان روڈ، لاہور      ۱۹۹۵ء
- ۷۶۔ ڈاکٹر غلام قادر لون      مطالعہ تصوف      عصمت اسلم پرنٹرز، اردو بازار لاہور      ۱۹۹۷ء
- ۷۷۔ شیخ عبدالرحیم      سیر الاقصاب / چشت تذکرہ خواجگان      سعیدی قرآن محل۔ کراچی      ۱۹۷۲ء
- ۷۸۔ سید قطب شہید      اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل      میٹروپرنٹرز، لاہور      ۱۹۸۶ء
- ۷۹۔ مولانا محمود اشرف عثمانی      ارشادات مجدد الف ثانی      ادارہ اسلامیات ۱۹۰، انارکلی لاہور      ۱۹۹۶ء
- ۸۰۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد سرور      اسلام اور جدید ریاستی نظام      زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور      ۱۹۸۱ء
- ۸۱۔ حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی      فتوح الغیب      مشہور آفسٹ پریس کراچی      ۱۹۸۱ء
- ۸۲۔ حضرت امام غزالی      اخلاص کی حقیقت      زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور      ۱۹۹۵ء
- ۸۳۔ فقیر ذوالفقار احمد نقشبندی      تصوف سلوک      شنگریلا پرنٹرز، فیصل آباد      ۱۹۹۵ء
- ۸۴۔ علامہ ابن عبدالبر اندلسی      العلم والعلماء      طبع المطبعة العربیہ لیک روڈ لاہور      ۱۹۹۵ء
- ۸۵۔ علامہ شبلی نعمانی      الغزالی یعنی امام بن محمد غزالی کی سوانح عمری      پاکستان ٹائمز پریس لاہور      ۱۹۹۵ء
- ۸۶۔ شیخ بدر الدین اسحاق      اسرار الاولیاء (اردو)      مکتبہ فریدیہ جناح روڈ ساہیوال      ۱۹۹۵ء
- ۸۷۔ امام ابو حامد محمد الغزالی      کیمیائے سعادت      مکتبہ رحمانیہ اقراء سنٹر اردو بازار لاہور      ۱۹۹۵ء
- ۸۸۔ حضرت شہاب الدین سہروردی      عوارف المعارف      ارشد برادر سونیوالان، نئی دہلی      ۱۹۸۲ء
- ۸۹۔ مولانا عبدالرحمن      نجات الاس      مشہور آفسٹ پریس کراچی      ۱۹۸۲ء
- ۹۰۔ مولانا عبدالحق حقانی      حجۃ اللہ البالغہ      جنرل پرنٹرز ریٹی روڈ لاہور      ۱۹۸۲ء
- ۹۱۔ حضرت امام غزالی      مذاق العارفین      ملک سراج الدین اینڈ سنز، کشمیری بازار لاہور      ۱۹۸۲ء

- ۹۲۔ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی  
۹۳۔ مولانا عزیز الرحمن دانش  
امدادی
- ۹۴۔ دین محمد افغانی  
۹۵۔ مولانا منظور احمد نعمانی  
۹۶۔ آغا عبدالحی جان چشموی  
۹۷۔ ڈاکٹر ظہور الحسن شارب
- اسلام کا اقتصادی نظام  
تصوف عصر جدید میں
- تجدید الاسلام  
معارف الحدیث  
مقدمہ تصوف یعنی ارشاد السالکین  
دبستان صوفیہ المعروف بہ تصوف  
کے خانوادے
- مکتبہ امدادیہ  
احمد پرنٹنگ کارپوریشن کراچی  
۱۹۹۶ء
- اسلامیہ پریس کونسل  
عمر فاروق اکیڈمی، لاہور  
احقر خاک پائیک از خادمان چشموی  
تعریف پرنٹرز لاہور  
۱۹۹۶ء
- ۹۸۔ خواجہ عثمان ہردانی  
انیس الارواح  
ندائے غیب ترجمہ فتوح الغیب
- ادارہ قافی پبلیکیشنز ذوالقرنین  
چیمبرز گیت روڈ لاہور
- ۹۹۔ پیر غوث الاعظم سید  
عبدالقادر جیلانی  
۱۰۰۔ امان اللہ خان ارمان سرحدی  
۱۰۱۔ ڈاکٹر پیر محمد حسن
- غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی  
کے سوانح حیات  
خزینہ معارف
- شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز لاہور،  
پشاور، حیدر آباد، کراچی  
پرنٹکس دربار مارکیٹ لاہور
- ۱۹۷۱ء

## BIBLIOGRAPHY

OCTOBER 1995

### ISLAM

A SELECTED BIBLIOGRAPHY OF MATERIAL AVAILABLE IN  
THE LIBRARY BOOKS.

(1) ABDALATI, HAMMUDAH. ISLAM IN FOCUS INDIANAPOLIS:  
AMERICAN TRUST PUBLICATION, 1975.211 P.

(2) AHMMAD, AKBARS. RELIGION AND POLITICS IN MUSLIM  
SOCIETY: ORDER AND CONFLICT IN PAKISTAN.  
NEW YORK: CAMBRIDGE UNIVERSITY PRESS, 1983.215 P.

(3) ALI, ABDULLAH YUSAF. THE HOLY QURAN: NEXT,  
TRANSLATION AND COMMENTRY. LAHORE: SH: MUHAMMAD  
ASHRAF, 1938. 2VOLS.

(REF 297 KOR).

(4) ALI, HASHM AMIR. THE MESSAGE OF THE QURAN  
PRESENTED IN PRESPECTIVE. RUTLAND.C.E. TUTTEL CO, 1974.  
(VARIOUS PAGINGS).

(5) APPLEBY, R. SCOTT. RELIGIUOS FUNDAMENTALASIM ND  
GLOBAL CONFLI T NEW YORK: FORGN POLICY ASSOCIATION,  
1994. 79 P.

(297. 917 APP)

(6) AYOUB, MUHAMMAD. ED. THE POLITICS OF ISLAMIC  
REASSERTION. NEW YORK :ST. MARTIN'S PRESS , 1981. 298 P.

(320. 917 POL)

(7) BULLIET RICHARDW. ISLAM : THE VIEW FROM THE EDGE.  
NEW YORK: COLUMBIA UNIVERSITY PRESS, 1994. 236 P.

(297 BULL)

(8) BUTTERWORTH, CHARLES E. AND I .WILLIAM ZARTMAN,  
EDS. POLITICAL ISLAM. NEWBURY PARK: SAGE, 1992. 232 P.

(REF 297 POL)

(9) DONOHUE, JHON J. AND LOHN L. ESPOSITO, EDS. ISLAM IN  
TRASITION: MUSLIM PERSPECTIVES. NEW YORK: OXFORD  
UNIVERSITY PRESS, 1982 .322 P.

(297 ISL)

(10) ESPOSITO, JHON L, ED. ISLAM AND DEVELOPMENT:  
RELIGION AND SOCIOPLITICAL CHANGE, SYRACUSE:  
SYRACUS UVIVERSITY PRESS, 1980. 268 P.

(297 ISL)

(11) EPOSITO, JHON, L .THE ISLAMIC THREAT: MYTH OR REALITY? NEW YORK: OXFORD UNIVERSTIY PRESS,1992. 243 P.  
( REF 297 ESP)

(12) GIBB, SIR HAMILTON ALEXANDER ROSSKEEN.  
MODREN.TRENDS IN ISLAM. NEW YORK: OCTAGONBOOKS,  
1972. 141 P.

(297 GIB)

(13) HODGSON, MARSHALL G.S. THE VENTURE OF ISLAM:  
CONSCIENCE AND HISTORY IN A WORLD CIVILIZATION.  
CHICAGO: UNIVERSITY OF CHICAGO PRESS, 1974 .3 VOLS.

(REF 297 HOD)

(14) HUNTER, SHIREEN T, ED. THE POLITICS OF ISLAMIC  
REVIVAL PRESS. 1988. 303 P.

(297 POL)

(15) KELSAY, JHON. AND JAMES TURNER JOHSON. EDS. JUST  
WAR AND JIHAD: HISTORICAL AND THEORETICAL  
PRESPECTIVE ON WAR AND PEACE IN WESTERN AND ISLAMIC  
TRADITIONS. NEW YORK: GREENWOOD PRESS, 1991. 254 P.

(297. 72 JUS)

(16) LAWRENCE,RUCE, B ,ED .THE ROSE AND THE ROCK :  
MYSTICAL AND RATIONAL ELEMENTS IN THE INTELLECTUAL  
HISTORY OF SOUTH ASIAN ISLAM. DUHAM: DUKE  
UNIVERISTY PRESS, 1979. 200 P.

(REF303.48LEW)

(17) LEWIS,BERNED.ISLAM ANDTHE WEST.  
NEWYORK :OXFORD UNIVERSITY PRESS, 1993.

(REF 303. 48 LEW)

(18) LEWIS, BERNARD, THE POLITICAL LANGUAGE OF ISLAM,  
CHICAGO: UNIVERSITY OF CHICAGO PRESS, 1988. 168 P.

(297 LEW)

(19) MACEOCIN, DENIS, AND AHMAD AL-SSHAHI, EDS ISLAM  
IN THE MODREN WORLD. NEW YORK : ST.MATIN;S, 1983.148 P.

(297 ISL)

(20) MERNISSI, FATIMA. ISLAM AND DEMOCRAY: FEAR OF  
THE MODERN WORLD MASSACHUSETTS: ADDISON WESLY,  
1992, 195 P.

(909. 0974 MER)

(21) PIPES, DANIEL. IN THE PATH OF GOD: ISLAM AND  
POLITICAL PROCESS. NEW YORK: BASIC BOOKS, 1983 373 P.

(297. 19. PIP)

(22) PISCATORI, JAMES P. ED. ISLAM IN THE POLITICAL  
PROCESS. NEW YORK: CAMBRIDGE UNIVERSITY PRESS,  
1983 239 P.

(297. 19 ISL0

(23) SHAIKH, FARZANA, ED. ISLAM AND ISLAMIC GROUPS: A WORLDWIDE REFERENCE GUIDE. DETROIT: LONG AMN, 1992. 316 P.

(REF 297 ISL)

(24) SMITH, WILFERD CANTWELL. MODREN ISLAM IN INDIA : A SOCIL ANALYSIS. NEW DELHI: USHA PUBLICATION, 1979. 396 P.

(297. 19 SMI)

(25) SONN, TAMARA, THE STATE AND ISLAM :THE CHALLENGE OF PULITICAL LEGITIMACY IN THE MUSLIM WORLD BOLUDER:WESTVIEW PRESS, 1990 226 P.

(REF 297 SON)

(26) VON GRUNEBAUM, GUDTAVE E. UNITY AND VARIETY IN MUSLIM CIVILIZATION : UNIVERSITY OF CHICAGO PRESS, 1955. 385 P.

(953 VON )

(27) WEISS, ANITA M, ED. ISLAMIC REASSERTION IN PAKISTAN: THE APPLICATION OF ISLAMC LAWS IN MODERN STATTE. NEW YORK: SYRACUSE UNIVERSITY PRESS, 1986. 146 P.

(305. 6 ISL)

(28) WELCH, ALFORD T, AND PIERRE CACHIA, EDS. ISLAM : PAST INFLUENCE AND PRESENT CHLLINGE. ALBANY : STATE UNIVERSITY OF NEW YORK PRESS, 1979. 359 P.

(297 ISL)

### **ARTICLES & PAMPHLETS**

- (1) AL-AZM, SADIK J. "ISLAMIC FUNDAMENTALISM, RECONSIDERED: A CRITICAL OUT LINE OF PROBLIMS, IDEAS AND APPROACHES, PART II" SOUTH ASIA BULLETIN 14, NO. 1 (1994):73-98.
- (2) AHMED AKBER S. " PSOTMODERNIST PRCEPTONS OF ISLAM ASIAN SURVERY 31,NO 3 (MARCH 1991): 213-213
- (3) AMUZEEGAR JAHAGIR. "THE TRUTH AND ILLUSION OF ISLAMIC FUNDAMANTALISM." SAIS REWIEW 13 NO 2. (SUMMER-FALL1993): 127-139
- (4) AYABI NAZIH N, " STATE ISLAM AND COMMUAL PLURALITY" THE ANNALS 524 (NOVEMBER 1992): 38-4
- (5) BULLIET, RICHERD W, " THE FUTURE OF THE ISLAMIC MOVEMENT." FOREIGN AFFAIRS 72, NO. 5(NOVEMBER = DECEMBER 1993): 38-44
- (6) BUTTERWORTH, CHARLES E. " POLITICAL ISLAM : THE ORIGIN. THE ANNALS 524 (NOVEMBER 1992): 26-37



- (24) WORMSER, RENE, "THE LEGAL SYSTEM OF ISLAM." AMERICAN BAR ASSOCIATION JOURNAL 64 (SEPTEMBER 1978): 1359-1361
- (25) WRIGHT, ROBIN. "THE ISLAMIC RESURGENCE: A NEW PHASE." CURRENT HISTORY 85, NO.508 (FEBRUARY 1988): 53-56
- (26) ZARTMAN, I, WILLIAM "DEMOCRACY AND ISLAM: THE CULTURAL DIALECTIC." THE ANNALS 524 (NOVEMBER 1992): 181-191.

## MAGAZINES

AMERICAN JOURNAL OF ISLAMIC SOCIAL SCIENCE

TRI-ANNUAL

JOINTLY PUBLISHED BY THE ASSOCIATION OF MUSLIM SOCIAL SCIENTISTS (AMSS) AND THE INTERNATIONAL INSTITUTE OF ISLAMIC THOUGHT (IIIT) THIS JOURNAL PROVIDES A FORUM FOR DISCUSSION AND DEBATES ON THE ISLAMIZATION OF KNOWLEDGE, AND THE DEVELOPMENT OF METHODOLOGY FOR RECONSTRUCTION OF ISLAMIC THOUGHT MARKED BY THE DEVELOPMENT OF ACTIVITIES BETWEEN VARIOUS ORGANIZATIONS AND INSTITUTIONS AROUND THE WORLD. JOURNAL OF SOUTH ASIAN AND MIDDLE EASTERN STUDIES QUARTERLY PUBLISHED BY THE PAKISTAN-AMERICAN FOUNDATION OF VILLANOVA UNIVERSITY. PROVIDES ANALYSIS OF POLITICAL ECONOMIC AND SOCIAL DEVELOPMENT IN THE MODERN ISLAMIC AND NON-ISLAMIC SOCIETIES IN SOUTH ASIA, THE MIDDLE EAST AND NORTH AFRICA MUSLIM WORLD.

QUARTERLY

A JOURNAL DEVOTED TO THE STUDY OF ISLAM AND THE CHRISTIAN MUSLIM RELATIONSHIP IN THE PAST AND PRESENT. IT OFFERS A VARIETY OF ARTICLES IN ISLAMIC THEOLOGY, LITERATURE, PHILOSOPHY AND HISTORY. THE JOURNAL IS DEDICATED TO CONSTRUCTIVE INTERRELIGIOUS THOUGHT AND INTERPRETATION. IT ALSO CONTAINS BOOK REVIEWS, CURRENT NOTES AND A SURVEY OF PERIODICALS.